نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد دوم

از رشحات قلم

حضرت علامہ مولانا

عبد الرزاق بھترالوی حطاروی

ناشر

ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

نجوم الفرقان فی تفسیر القرآن

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمٰی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد دوم

از رشحات قلم

محقق اہلسنت
استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا
عبد الرزاق بھترالوی حطاروی
مدظلہ العالی

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

نام کتاب　**نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن**

تالیف　حافظ **عبدالرزاق** چشتی بھترالوی

کمپوزنگ　**ضیاء العلوم** کمپوزنگ سنٹر سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی

کمپیوٹر گرافکس　قاضی محمد یعقوب چشتی، اظہر اقبال اعوان

بار طباعت　اوّل　تاریخ اشاعت مارچ 2004ء

ناشر　**سید شہاب الدین شاہ**

ضیاء العلوم پبلی کیشنز 128 بازار تلواڑاں راولپنڈی

0333-5166587-051-4450404-FAX-051-4580404

Email: ziauloom@isb.paknet.com.pk

ملنے کے پتے

☆ ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور، اردو بازار کراچی

☆ مکتبہ رضویہ　نزد ستا ہوٹل گنج بخش روڈ لاہور

☆ فرید بک سٹال　اردو بازار　لاہور

☆ جامع مسجد غوثیہ　ایف سکس ون　اسلام آباد

☆ مکتبہ تنظیم المدارس　جامعہ نظامیہ لوہاری گیٹ　لاہور

☆ مکتبہ غوثیہ　محلہ فرقان آباد سبزی منڈی کراچی

☆ مکتبہ برکاتیہ　گنج بخش روڈ　لاہور

☆ احمد بک کارپوریشن　کمیٹی چوک　راولپنڈی

☆ نیو مکتبہ ضیائیہ　بوہڑ بازار　راولپنڈی

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم وعلی آله واصحابه اجمعین

۲۵ رجب مطابق ۳/ اکتوبر ۱۴۲۳ھ کو مولانا علی احمد سندیلوی کے ہمراہ حضرت استاذ العلماء والفضلاء مولانا علامہ سید حسین الدین شاہ مدظلہ العالی کے یاد فرمانے پر فقیر جامعہ رضویہ ضیاء العلوم، سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی حاضر ہوا اور حسب فرمان ''درس بخاری شریف'' کے پروگرام میں مختصر سا خطاب کیا۔ یہ حضرت شاہ صاحب کی عنایت اور نوازش ہے اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔

اسی موقع پر حضرت مولانا سید شہاب الدین شاہ صاحب نے مجھے فاضل جلیل حضرت علامہ عبدالرزاق بھترالوی حفظہ اللہ تعالیٰ کی تازہ تصنیف ''نجوم الفرقان'' من تفسیر آیات القرآن'' جلد اوّل کا ایک نسخہ عنایت کیا، اس کے جستہ جستہ مقامات کے مطالعہ سے دلی مسرت ہوئی، یہ ۴۲۴ صفحات اور بڑی تقطیع پر مشتمل ہے اس میں تفسیر قرآن پاک کا مقدمہ اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔

علامہ بھترالوی صاحب کہنہ مشق مدرس، محقق فاضل اور کتب کثیرہ کے مصنف ہیں اس سے پہلے نورالایضاح، تلخیص المفتاح، سراجی، قدوری اور کنز الدقائق پر عربی زبان میں حواشی لکھ کر علمی دنیا میں اپنا نام متعارف کرا چکے ہیں۔ اب انہوں نے بجا طور پر تفسیر لکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس جلد میں بیش بہا معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت وتندرستی کے ساتھ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

استاذ الاساتذہ، فخر اہل سنت مولانا سید حسین الدین شاہ مدظلہ العالی کے پیش لفظ نے اس کتاب کی اہمیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی نے علامہ بھترالوی کی دیگر تصانیف کی طرح اس کتاب کو بھی دیدہ زیب اور عمدہ معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اراکین ادارہ بھی مصنف کے ساتھ ساتھ مستحق صد تبریک وتحسین ہیں۔

والسلام

محمد عبدالحکیم شرف قادری

سورۃ البقرۃ

سورۂ بقرہ کا نام ''بقرہ'' اس لئے رکھا گیا کہ اس میں بنی اسرائیل کے ایک مقتول کے قاتلوں کا پتہ چلانے کے لئے رب تعالیٰ نے بقرہ (گائے) کو ذبح کر کے اس کے گوشت کا ٹکڑا مارنے کا حکم دیا کہ مقتول زندہ ہو کر اپنے قاتلوں کا خود بتائے گا۔

اس واقعہ کے ذکر کی وجہ سے نام سورۃ البقرۃ رکھ لیا گیا۔

سورۃ بقرہ مدنیہ ہے۔ اس میں آیات دو سو چھیاسی ہیں۔ چھ ہزار اکیس کلمات ہیں۔ پانچ ہزار پانچ سو حروف ہیں۔ یہ سورۃ سب سورتوں سے بڑی ہے۔ اس سورۃ میں آیۃ مداینۃ سب آیتوں سے بڑی آیت ہے اس ایک آیت میں بیس حکم پائے گئے ہیں۔ اس سورۃ میں جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں اتنے کسی اور سورۃ میں بیان نہیں ہوئے۔ (از عزیزی پ ۱ ص ۷۹)

علامہ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: اس سورۃ میں ایک ہزار اوامر، ایک ہزار نواہی، ایک ہزار احکام، ایک ہزار خبریں پائی گئی ہیں (قرطبی ج ۱ ص ۱۵۲)............ اس سورۃ میں پندرہ مثالیں ہیں۔

(روح المعانی ج ص ۹۹)

اس سورۃ پاک میں علوم کے کتنے خزانے ہیں؟ صرف اس سے اندازہ کریں کہ بے شمار مسائل وعلوم اس میں ذکر ہیں:

"تعلمها عمر رضي الله عنه بفقهها وما تحتوي عليه في اثنتي عشرة سنة، وابنه عبد الله في ثماني سنين" (قرطبی)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورۃ کے علوم و مسائل کو بارہ سالوں میں حاصل کیا، اور آپ کے بیٹے عبداللہ نے آٹھ سالوں میں''

ذرا غور تو کریں! کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان عربی نہیں تھی کہ آپ عربی الفاظ کا ترجمہ پڑھ رہے تھے۔ نہیں نہیں بات اصل میں یہ تھی کہ پڑھنے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے اور پڑھانے والے نبی کریم ﷺ تھے۔ کتنے مسائل، کتنے علوم آپ کو پڑھائے گئے ان کو وہ جانیں جنہوں نے

پڑھایااوروہ جانیں جنہوں نے پڑھا۔

اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ حضرت عبداللہ ابن عمر کا علم سورۃ بقرہ کے متعلق بنسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کم تھا کیونکہ تھوڑے عرصہ میں تھوڑے علوم حاصل کئے اور حضرت عمر نے زیادہ عرصہ میں زیادہ علوم حاصل کئے۔

سورۃ بقرہ کےاورنام: اس سورۃ کاایک نام''فسطاط'' بھی ہےجس کامعنی ہے''خیمہ'' اس میں زیادہ احکام جمع ہونے اوراس کی عظمت کے پیش نظراس کانام فساط رکھا گیا۔ایک اورنام اس کا ''سنام القرآن'' ہے یہ بھی بلندی اور عظمت کی وجہ سے ہی نام رکھا گیا ہے کیونکہ ''سنام'' ہر چیز کے بلند حصہ کوکہا جاتا ہےجیسا کہ اونٹ کی کوہان کوبھی سنام کہا جاتا ہے۔ (از الاتقان ج ۱ ص ۵۴)

فضائل سورۃ بقرۃ:

''عن ابی هريرة قال بعث رسول الله ﷺ بعثا وهم ذوو عدد وقدم عليهم احدثهم سنا لحفظه سورة البقرة وقال له اذهب فانت اميرهم'' (ترمذی)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایارسول اللہ ﷺ نے چندلوگوں کو(کہیں) بھیجاان کا امیر ان میں سے چھوٹی عمر والے کو بنایا۔ارشادفرمایا جاؤتم ان کے امیر ہو اس لئے کہ اسے سورۃ بقرہ یادتھی''

''عن ابی امامة الباهلی قال سمعت رسول الله ﷺ يقول اقرء وا سورة البقرة فان اخذها بركة و تركها حسرة ولا يستطيعها البطلة ، قال معاوية بلغنی ان البطلة ، السحرة'' (مسلم)

''امامہ باھلی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کوفرماتے ہوئے سنا سورۃ بقرہ پڑھو اس کے پڑھنے میں برکت ہے اس کے چھوڑنے میں حسرت ہے جادوگر اس کی طاقت نہیں رکھیں گے''

حدیث کے ایک راوی نے بطلہ کی وضاحت سحرہ (جادوگر) سے کی۔

'' عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال لا تجعلوا بيوتكم مقابر ان الشيطن ينفر من البيت الذی تقرأ فيه سورة البقرة '' (مسلم)

''حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ جس گھر میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے بیشک شیطان اس سے بھاگ جاتا ہے''

" عن سهل بن سعد قال قال رسول الله ﷺ ان لكل شئ سناما و ان سنام القرآن سورة البقرة ومن قرأها في بيته ليلا لم يدخل الشيطن بيته ثلاث ليال ومن قرأها نهارا لم يدخل الشيطن بيته ثلاثة ايام قال ابو حاتم البستي قوله ﷺ لم يدخل الشيطن ثلاثة ايام اراد مردة الشياطين "

(صحیح البستی)

''سہل ابن سعد کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز کی کوئی بلندی ہوتی ہے۔ قرآن پاک کی بلندی سورۃ بقرۃ ہے۔جس نے اسے رات کو اپنے گھر میں پڑھا اس کے گھر میں تین راتیں شیطان داخل نہیں ہوگا اور جس نے اسے دن کو پڑھا سکے گھر تین دن شیطان داخل نہیں ہوگا۔ ابو حاتم بستی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ شیطان سے مراد سرکش شیطان ہیں''

" عن الشعبي قال قال عبد الله من قرأ عشر آيات من سورة البقرة في ليلة لم يدخل ذلک البيت شيطان تلک الليلة حتى يصبح اربعا من اولها و آية الكرسي و آيتين بعدها و ثلاثا خواتيمها ، اولها لله ما في السموات "

(دارمی)

''شعبی سے مروی ہے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس شخص نے سورۃ بقرہ کی دس آیات رات کو پڑھیں اس تمام رات صبح تک شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوگا۔ وہ دس آیتیں یہ ہیں پہلی چار آیتیں اور آیۃ الکرسی اور اس کے بعد دو آیتیں اور آخری تین آیتیں جن کی پہلی آیت لله ما في السموات سے شروع ہو رہی ہے''

" وعن الشعبي عنه ، لم يقربه ولا اهله يومئذ شيطان ولا شئ يكرهه ، ولا يقرأن على مجنون الا افاق "

(دارمی)

''حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ہی شعبی نے روایت ذکر کی (کہ جس شخص نے مذکورہ دس آیات بقرہ کی پڑھیں) اس کے اور اس کے اھل وعیال کے قریب اس دن شیطان نہیں آئے گا اور بھی کوئی ناپسندیدہ چیز ان کو لاحق نہیں ہوگی۔ اگر سورۃ بقرہ کو مجنون پر پڑھا جائے تو مجنون کو افاقہ ہوگا''

راقم کے نزدیک پڑھنے والا باکمال ہو اور زبان با اثر ہو تو یقیناً قرآن پاک کا اثر عظیم تر ہوگا ورنہ یہ صورت ہوگی:

میں جب کہتا ہوں یا الٰہی میرا حال دیکھ　　حکم ہوتا ہے پہلے اپنا نامہ اعمال دیکھ

لبید بن ربیعہ زمانہ جاہلیت کے شعراء سے ہیں انہوں نے زمانہ اسلام کو پایا صدق دل سے

اسلام کو قبول کرلیا اسلام میں آ کر انہوں نے شعر کہنے چھوڑ دیئے دو شعر صرف ان کے زمانہ اسلام میں ملتے ہیں وہ یہ ہیں:

الحمد للہ اذ لم یاتنی اجلی

حتی اکتسیت من الاسلام سر بالا

الحمد للہ ! میری موت (کفر میں) نہیں آئی یہاں تک کہ میں نے اسلام کا لباس پہن لیا

ما عاتب المرء الکریم کنفسه

والمرء یصلحه القرین الصالح

انسان اپنی ذات کی طرح ہی کسی کریم انسان پر عتاب نہ کرے۔ نیک ساتھی ہی انسان کو نیک بناتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں لبید کو شعر سنانے کے لئے کہا تو انہوں نے سورۃ بقرہ کی تلاوت شروع کر دی۔ آپ نے فرمایا میں نے تمہیں شعر سنانے کے متعلق کہا ہے۔ تو لبید نے جواب دیا:

" ما کنت لا قول بیتا من الشعر بعد اذ علمنی اللہ البقرۃ و آل عمران "

''جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کا علم دیا اسکے بعد میں نے شعر نہیں کہے''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس قول پر تعجب کرتے ہوئے ان کے حصہ میں جو دو ہزار درہم عطیہ تھا اس پر پانچ سو درہم اور بڑھا کر عطا فرمائے۔ (ماخوذ از قرطبی)

سورۃ بقرہ میں اہم مسائل:

مؤمنین، کفار و منافقین کا ذکر، جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر، آدم علیہ السلام کی تخلیق اور جنت میں رہنا اور جنت سے باہر آنا، موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا ذکر، گائے کے ذبح کا واقعہ، ہاروت و ماروت کا واقعہ، نبی کریم ﷺ کو راعنا کہہ کر پکارنے سے منع کرنا، ابراہیم علیہ السلام کا ذکر، تحویل قبلہ، شہید کی زندگی، قصاص، رمضان، حج، حیض، قسم، طلاق، ازواج کا نفقہ، جالوت کو داؤد علیہ السلام کا قتل کرنا، نذر، بیع سلم، رھن، ربوا جیسے اہم مسائل سب سورۃ بقرہ میں ہی مذکور ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر "تیسیر الرحمن" میں بسم اللہ کی تفسیر ہر سورۃ سے پہلے اسی کے مناسب بیان کی۔ سورۂ بقرہ سے پہلے ان الفاظ سے تفسیر بیان کی۔

" باسم الله الذی تجلی بذاته وصفاته فی کتابه الشامل علی بیان کمالاته الرحمن بنفی الریب عنه بجعله معجز اللکل الرحیم بجعله هدی للمتقین "

" اللہ کے نام سے شروع جس کی ذات وصفات کی تجلیات اس کی کتاب میں پائی گئی ہیں وہ کتاب جو اس کے کمالات کے بیان پر مشتمل ہے وہ ذات رحمٰن ہے کہ اس نے کتاب سے شک کی نفی فرمائی اور کتاب کو معجزہ بنایا جس کے مقابلہ سے سب عاجز آگئے وہ رحیم ہے کہ اس نے کتاب کو متقین کے لئے ہدایت بنایا"

الٓمٓ " الله ورسوله اعلم بمراده " ان الفاظ مبارکہ کی مراد کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔ بعض سورتوں کی ابتداء میں جو اس قسم کے الفاظ آئے ہوئے ہیں ان کو "حروف مقطعات" کہا جاتا ہے ان کو علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھا جاتا ہے۔ یعنی یوں پڑھا جاتا ہے۔ الف، لام، میم۔ یہ متشابہات سے ہیں۔ "متشابہ" اسے کہا جاتا ہے جس کی مراد کو پہچاننے کی امید ختم ہو جائے، جو بہت زیادہ خفاء میں ہو، جس کے ظاہر ہونے کی امید بالکل نہ پائی جائے۔

متشابہ کا حکم یہ ہے کہ عقیدہ یہ ہو کہ ان سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے۔ ہمیں ان کا علم قیامت تک حاصل نہیں ہو سکے گا۔

" واما بعد القيمة فيصير مكشوفا لكل احد ان شاء الله تعالى "

لیکن قیامت کے بعد ان شاء اللہ ہر ایک پر منکشف ہو جائیں گے۔

" وهذا فی حق الامة واما فی حق النبی علیه السلام فکان معلوما والا تبطل فائدة التخاطب ویصیر التخاطب بالمهمل کالتکلم بالزنجی مع العربی "

متشابہات کی مراد کا علم حاصل نہ ہونے کا تعلق امت سے ہے البتہ نبی کریم ﷺ کو یقیناً

علم تھا ورنہ آپ سے خطاب کا کوئی فائدہ نہ ہوگا یہ تو ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ مہمل سے خطاب کرنا مثلاً زنگی جو عربی نہ جانتا ہو اس سے عربی میں خطاب مہمل بے مقصد ہوگا۔

اگر نبی کریم ﷺ کو متشابہات کا علم حاصل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا خطاب (معاذ اللہ) مہمل اور بے مقصد ہو جائے گا۔ (از نور الانوار ص ۹۳)

متشابہات میں نبی کریم ﷺ کے علم کی نفی دراصل رب تعالیٰ کی توہین ہے:

" واما بالنسبة الیٰ النبی ﷺ فمعلوم وقت نزول القرآن بلا تفرقة بینه وبین سائر القرآن کیلا یلزم السفه لان التخاطب بما لا یفهم المخاطب سفه " (حاشیه اصول شاشی ص ۲۵)

نبی کریم ﷺ کو قرآن پاک کے نازل ہوتے وقت ہی علم حاصل ہو جاتا خواہ وہ متشابہات ہوں یا غیر متشابہات ورنہ سفاہت (بیوقوفی) لازم آئے گی اس لئے کہ ایسے شخص سے خطاب کرنا جو اس خطاب کو سمجھ ہی نہ سکے بے وقوفی ہوا کرتی ہے۔ خدارا انصاف کیجئے خدا سے ڈرئے کیا یہ کہنا رب تعالیٰ کی شان ہے؟ کہ متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور کسی کو بھی حاصل نہیں یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ بھی نہیں جانتے۔

یہ خدا کی شان بیان کی یا حقارت؟ کیا یہ توحید ہے یا توہین؟ نام نہاد توحیدیو! ذرا جہالت کا کپڑا سر سے اتار کر علم کی ہوا بھی لگنے دو۔ ذہن وضمیر سے جہالت کے زنگ کو دور کر کے علم کی روشنی سے چمکا دو۔ آؤ شمع رسالت کے پروانوں سے توحید سیکھو! پھر کہیں توحیدی ہونے کا دعویٰ تمہارا سچا ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ کو متشابہات کا علم نہیں تھا تو اس سے نبی کریم ﷺ کی شان میں تو کوئی فرق لازم نہیں آئے گا۔ لیکن معاذ اللہ رب تعالیٰ کی شان میں گستاخی لازم آئے گی۔ رب تعالیٰ کی توہین ہوگی گویا کہ تم نے اپنی ہی زبان سے (معاذ اللہ) رب تعالیٰ کو سفیہ (بے وقوف) کہہ دیا کیونکہ اگر نبی کریم ﷺ نہیں جانتے آپ میں سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی تو رب تعالیٰ نے آپ پر متشابہات کو نازل ہی کیوں کیا۔ مخاطب نہ سمجھ سکے تو سفاہت کی نسبت متکلم کی طرف ہوتی ہے مخاطب کی شان میں کوئی فرق لازم نہیں آتا۔

اعتراض: تم نے کہا ہے کہ متشابہات کا علم نبی کریم ﷺ کو حاصل ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ﴾ متشابہات کی تاویلات کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں۔ تمہارا یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ نبی کریم ﷺ کو علم حاصل ہے۔

جواب: تفصیلی بحث تو ان شاء اللہ اسی آیت کریمہ کی وضاحت میں آئے گی البتہ اختصار سے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ وقف ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر ہے یا کہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ پر ہے۔ پہلا قول احناف کا ہے اور دوسرا امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تو "راسخون فی العلم" (علم میں پختگی رکھنے والے حضرات) کو بھی متشابہات کا علم حاصل ہے تو یقیناً نبی کریم ﷺ کو علم حاصل ہونا ہی ہے۔

ہمارے نزدیک اگر چہ عطف "الا اللہ" پر ہے لیکن پھر بھی یہ حکم امت کے لئے ہے۔ نبی کریم ﷺ کو علم حاصل ہے آیۂ کریمہ کا مفہوم یوں ہوگا "وما یعلم تاویلہ بدون الوحی الا اللہ" متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے دوسرا کوئی بھی بغیر وحی کے علم نہیں رکھتا "فالنبی ﷺ کان عالما بتاویلہ بالوحی لاغیرہ" نبی کریم ﷺ کو علم وحی کے ذریعے حاصل تھا۔ آپ کے بغیر کسی اور کو اس کا علم حاصل نہ ہو سکا:

> "متشابہات القرآن ومستودعات اسرارہ فانھا سر بین اللہ ورسولہ لا یعلمھا احد غیرہ"
>
> قرآن پاک کے متشابہات اور اس میں ودیعت رکھے گئے اسرار اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان راز ہیں ان کو اور کوئی نہیں جانتا۔ اگر نبی کریم ﷺ کو بھی علم حاصل نہ ہو تو رب تعالیٰ اور آپ کے درمیان راز کیسے ہوں گے؟

فائدہ جلیلہ:

> "ثم اعلم ان الکلام فی العلم الکسبی واما العلم الکشفی الغیر الاختیاری فلو حصل لبعض الاولیاء الکرام فلا امتناع فیہ"
>
> "ابھی تک جو بحث بیان کی گئی اس کا تعلق علم کسبی سے تھا لیکن علم کشفی غیر کسبی، غیر اختیاری اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اگر بعض اولیاء کرام کو بھی حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی مانع نہیں"

متشابہات کی دو قسمیں:

ایک قسم متشابہات کی یہ ہے کہ ان کا معنی ہی معلوم نہ ہو وہ یہی حروف مقطعات ہیں اور دوسری قسم یہ ہے کہ ان کا لغوی معنی تو معلوم ہو لیکن ان کی مراد صرف رب تعالیٰ کو ہی معلوم ہو۔ جیسے ﴿ یَدُ اللهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ☆ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ ﴾ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہاتھ اور چہرے سے پاک ہے اسی طرح ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی ﴾ بھی متشابہ کی اسی قسم میں داخل ہے کیونکہ استواء کا ایک معنی بیٹھنا بھی ہے رب تعالیٰ عرش پر بیٹھنے سے پاک ہے۔

(ماخوذ از نور الانوار مع قمر الاقمار ص ۹۳، ۹۴)

تنبیہ : بعض اہل علم نے حروف مقطعات کو متشابہات میں داخل نہیں کیا بلکہ انہوں نے کہا کہ یہ رمز ہیں یعنی اشارات ہیں بعض مطالب کی طرف۔ ان حضرات میں سے بعض نے الف سے مراد ''انا'' (میں) لیا ہے۔ لام سے مراد ''اعلم'' (میں جانتا ہوں) اور ''میم'' کا مطلب ''مرادہ'' لیا ہے یعنی میں ہی ان کی مراد جانتا ہوں۔ (قمر الاقمار برنور الانوار ص ۹۴)

بعض نے کہا الف سے مراد ''الله'' لام سے مراد جبریل میم سے مراد محمد مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بواسطہ جبرائیل قرآن پاک محمد ﷺ پر نازل کیا۔ بعض نے کہا الف سے مراد ''اللہ'' لام سے مراد ''لطیف'' میم سے مراد ''مجید'' ہے مطلب یہ ہوا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے میں اللہ بھی ہوں لطیف بھی اور مجید بھی۔ بعض نے کہا الف سے مراد ''انزلت'' لام سے مراد ''لوح'' میم سے مراد ''محفوظ'' مطلب یہ ہوا'' انزلت علیک هذا الکتاب من اللوح المحفوظ '' میں نے آپ پر یہ کتاب لوح محفوظ سے نازل کی۔

لیکن خیال کریں کہ ان حضرات کو بھی آخر کار یہی کہنا پڑتا ہے کہ حقیقی مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔ (از قرطبی)

جو معنی بھی لیا جائے اسی پر اہل علم کے اقوال ملتے ہیں۔ خواہ متشابہات سے بنائیں اور ان کو اسرار کہیں یا رمز بنائیں اور ان کے معانی کا اعتبار کریں۔

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ حروف مقطعات متشابہات سے ہیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں عام لوگوں کو سمجھانے کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے معانی سمجھائے گئے ہاں البتہ نبی کریم ﷺ کے کامل متبعین میں سے جسے چاہے رب تعالیٰ علم عطا فرما دے یہ کوئی بعید نہیں:

" قال البغوی قال ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ فی کل کتاب سر وسر اللہ تعالی فی القرآن اوائل السور "

بغوی رحمہ اللہ نے کہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر کتاب (خط) میں راز ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے راز قرآن پاک میں سورتوں کی ابتداء میں ہیں۔

" وقال علی رضی اللہ عنہ ان لکل کتاب صفوۃ وصفوۃ ھذا الکتاب حرف التھجی "

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر کتاب (خط) میں کچھ برگزیدہ، منتخب، چنے ہوئے مضامین ہوتے ہیں اس کتاب (قرآن پاک) میں چنے ہوئے (سورتوں کے اول میں) حروف تہجی ہیں۔

" وحکاہ الثعلبی عن ابی بکر وعن علی و کثیر " ثعلبی حضرت ابوبکر، حضرت علی اور کثیر حضرات (صحابہ کرام) سے نقل کیا ہے کہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں۔ سمرقندی نے یہی قول حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے۔ قرطبی نے یہی قول سفیان ثوری، ربیع ابن خثیم، ابوبکر ابن انباری، ابن ابی حاتم اور محدثین کی ایک جماعت سے نقل کیا سجاوندی نے کہا کہ اول زمانہ سے یہی منقول ہوتا چلا رہا ہے:

" انہا سر بین اللہ وبین بنیہ صلی اللہ علیہ وسلم وقد یجری بین المحرم کلمات معمیات یشیر الی اسرار بینھما "

کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کریم ﷺ کے درمیان راز ہیں عام طور پر یہی طریقہ چلا آرہا ہے کہ ایک دوسرے کے محرم راز آپس میں جب خط وکتابت کرتے ہیں تو ان میں کچھ راز کے الفاظ لکھتے ہیں۔

(از مظہری)

بین المحبین سر لیس یفشیہ ، قولہ ولا قلم للخلق یحکیہ

ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کے درمیان راز ہوتے ہیں ان کو افشاء نہیں کرسکتا۔ نہ کوئی قول اور نہ ہی قلم کہ وہ مخلوق کے سامنے بیان کئے جائیں

" اذ ارباب الذوق یعرفونھا وھم کثیرون فی المحمدین والحمد للہ "

ارباب ذوق ہی ان کے معانی کو جانتے ہیں وہ نبی کریم ﷺ کے متبعین میں الحمد للہ بہت حضرات موجود ہیں۔

نجوم سماء کلما انقض کوکب　　　بدا کوکب تاوی الیہ کو اکبہ

(غلامانِ مصطفیٰ) آسمان کے ستارے ہیں جب بھی کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے دوسرا ستارہ اس کی جگہ قائم ہوجاتا ہے بلکہ ایک کی جگہ کئی قائم ہوجاتے ہیں۔

ہمیں اگران کی مراد کا نہ پتہ چل سکے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس میں عظمت قرآن پاک سمجھ آئے گی کہ ہمیشہ کے لئے دل ان کی طرف متوجہ رہیں گے کاش کہ یہ سمجھ آجائے پھر جب تھک ہار کر یہ کہا جائے گا کہ یہ تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں تو کیا خوب مقام قرآن ذہن میں منقش ہوگا ہمارے لئے تو اتنا ہی ضروری ہے:

" ویکون من ذلک ظهور کمال الانقیاد من المأمور للآمر ونهایة التسلیم والامتثال للحکیم القادر "

کامل طور پر ہماری طرف سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پائی جائے ان رازوں کو تسلیم کرلیں اور رب تعالیٰ جو حکیم وقادر ہے اسی کے اوامر کی فرمانبرداری کریں اور یہ ایمان رکھیں کہ نبی کریم ﷺ جب پتھروں کا کلام سنتے سمجھتے ہیں۔ ہرن کی بات، اونٹ کی بات، درختوں کی بات کو سنتے اور جانتے ہیں تو وہ کون سی مشکل ہے کہ آپ کو متشابہات کا علم حاصل نہ ہو۔　(از روح المعانی)

آیئے علامہ آلوسی کی اس عبارت کو دیکھیں کیا خوب فیصلہ کن بات آپ نے بیان کی:

" فلا یعرفه بعد رسول الله ﷺ الا الاولیاء الورثة فهم یعرفونه من تلک الحضرة وقد تنطق لهم الحروف کما تنطق لمن سبح فی کفه الحصی "　(روح المعانی)

ان حروف کے معانی رسول اللہ ﷺ جانتے ہیں اور ان کے بعد اولیاء کرام کو نبی کریم ﷺ کے حضور سے علم حاصل ہوتا ہے کبھی یہ حروف خود بول کر اولیاء کرام کو اپنے مطالب سے آگاہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ یہ حروف نبی کریم ﷺ کو بول کر اپنے مطالب اسی طرح بیان کرتے ہیں جیسا کہ آپ کے ہاتھ مبارک میں کنکریوں نے

تسبیحات پڑھیں"

" وروی عن ابن عباس انا من الراسخین فی العلم وانا فمن یعلم تاویله "

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں بھی ﴿ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ سے ہوں میں بھی ان کی تاویلات کو جانتا ہوں''

رمز کہنے والے حضرات کی جو تاویلیں پہلے ذکر کی ہیں وہ تمام تفسیر ابن عباس میں بھی موجود ہیں۔ ان حضرات نے ہی حروف مقطعات کو سورتوں کے نام بھی کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی بھی کہا ہے جیسا کہ ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ کہتے تھے "یا کھیعص اغفرلی "

" وعن الربیع بن انس کھیعص معناه من یجیر علیه ولا یجار علیه "

ان کا معنی (اور وہ پناہ دیتا ہے اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دیتا) بعض حضرات نے کہا یہ قرآن پاک کے اسماء گرامی ہیں۔

(از مظهری)

مفتی محمد شفیع صاحب (دیوبندی) لکھتے ہیں ہوسکتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو جس کی تبلیغ امت کے لئے روک دی گئی ہو۔ آگے چل کر لکھتے ہیں اور بعض اکابر علماء سے جو ان حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل وتنبیہ اور تسہیل مقصود ہے یہ نہیں کہ مرادِ حق تعالیٰ یہی ہے اس لئے اس کو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

(معارف القرآن ج اول ص ۱۰۷)

راقم کی مکمل بحث کو مفتی صاحب کے قول سے تائید مل گئی کاش کہ ان کے متبعین کو بھی سمجھ آجائے۔ اپنے ہی اکابرین کی بات کو یہ لوگ کیوں نہیں مانتے؟ اس کا پتہ نہیں۔

تاہم راقم نے معتبر تفاسیر اور کتب اسلاف سے جو بحث نقل کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یقینی طور پر علم تھا۔ لیکن مفتی صاحب نے کہا ہوسکتا ہے علم ہو یہ وجہ فرق بھی ہے ان کے اور راقم کے نظریات میں۔

﴿ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴾

''وہ بلندرتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں اس میں ہدایت ہے ڈروالوں کو''

''یہ وہ بلندمرتبہ کتاب ہے کوئی شک کی گنجائش نہیں اس میں پرہیزگاروں کیلئے ہدایت ہے''

ذٰلِکَ: اشارہ بعید ہے جس کا معنی ہوتا ہے وہ "ذالک الکتاب" کی اصل عبارت یا تو اس طرح ہے "ھذا الکتاب ھو القرآن" یہ کتاب وہ قرآن ہے یا اس کا مفہوم یہ ہے "ھذا الکتاب الذی وعدتک به" یہ وہ کتاب ہے جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں تمہاری طرف ایسے کتاب نازل کروں گا جسے پانی نہیں مٹا سکے گا بار بار لوٹانے سے وہ پرانی نہیں ہوگی۔

مطلب یہ تھا کہ قرآن پاک کو کوئی ختم نہیں کر سکے گا اس کو مومنوں کے سینوں میں محفوظ کردوں گا اس کا میں خود محافظ ہوں۔ایک ہی بات کو بار بار کرنے سے ذوق ختم ہوجاتا ہے لیکن قرآن پاک وہ کتاب ہے جو بار بار پڑھنے سے بار بار سنانے سے بار بار بیان کرنے سے ذوق میں اضافہ کرتی ہے۔

جب قرآن پاک نازل ہوا تو فرمایا "ذالک الکتاب" جس کا مطلب یہ ہے "ھذا ذلک الکتاب الذی وعدتک به" یہ وہی کتاب ہے جس کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں ''اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک رسول مبعوث کروں گا اور اس پر ایک کتاب (قرآن) نازل کروں گا۔

جب نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی وہاں بہت تعداد میں یہود تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلایا:

> "ذالک الکتاب" ای ھذا الکتاب الذی وعدت به علی لسان موسٰی ان انزله علی النبی الذی ھو من ولد اسمعیل" (از خازن)
>
> ''یہ وہی کتاب ہے جس کا میں نے تمہارے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے وعدہ کیا تھا کہ میں اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے آنے والے اپنے نبی پر نازل کروں گا''

ایک قول یہ ہے "هذا القرآن الذی انزلته علیک بالمدنیة ذلک الکتاب الذی وعدتک ان اوحیه الیک بمکة" جب مدینہ طیبہ میں قرآن پاک کا کچھ حصہ نازل ہوا تو فرمایا گیا یہ وہی کتاب جس کا میں نے تم سے مکہ میں وعدہ کیا تھا کہ میں تمہاری طرف وحی نازل کروں گا۔

ایک اور قول یہ ہے " ذالک ، اشارة الی اللوح المحفوظ " یہ وہی کتاب ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔ کسائی رحمہ اللہ نے کہا " ذالک ، اشارة الی القرآن الذی فی السماء لم ینزل بعد " یہ وہ کتاب ہے جو آسمان دنیا میں اتار دی گئی لیکن ابھی تک آپ پر مکمل نازل نہیں ہوئی۔

مبرد نے کہا اس کا مطلب یہ ہے:

" هذا القرآن ذلک الکتاب الذی کنت تستفتحون به علی الذین کفروا "

" یہ قرآن وہی کتاب ہے جس کے ذریعے (جس کا نام لے کر واسطہ دے کر) تم کافروں پر فتح طلب کرتے تھے"

تمام اقوال سے عظیم قول:

" ذالک الی هذا ... الخ ، اشار بذالک الی ان حق الاشارة ان یؤتی بها للقریب وانما اتی بما یدل علی البعید للتعظیم لکون القرآن مرفوع المرتبة وعظیم القدر " (صاوی)

یعنی صاحب جلالین نے "هــذا" کا لفظ ذکر کر کے اشارہ کیا ہے کہ یہاں حق یہ تھا کہ اشارہ قریب ہوتا لیکن اشارہ بعید لایا "تعظیم کیلئے" اس لئے کہ قرآن پاک رفیع القدر اور عظیم القدر ہے۔

" او تعظیمه بالبعد نحو الم ذلک الکتاب تنزیلا لبعد درجته ورفعة محله منزلة بعد المسافة " (مختصر المعانی)

یعنی مسند الیہ کو معرفہ اشارہ بعید کے ساتھ لانے کا یہ فائدہ ہے وہ بلندی رتبہ اور رفعت مقام پر ایسی ہی دلالت کر رہا ہے جس طرح مسافۃ بعید پر دلالت کرتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ یہی بیان کرتے ہیں:

" ذلک الکتاب " یعنی: است آں کتاب کہ بسبب علو درجہ کمال خود

ودقت اسرار ودقائق خود از وہم وفہم سامعان غائب واز حامی جولان افکار وانظار بعید واست لهذا در حق او آکتاب گفته میشود که دلالت بربعد دارد نه ایں کتاب که دلالت بر قرب مسیکند۔ (عزیزی)

یعنی وہ کتاب کہ اپنے کمال درجہ کی بلندی کی وجہ سے اور اپنے دقیق اسرار کی وجہ سے سامعین کی فہم سے دور ہے اور فکر ونظر کی پہنچ سے دور ہے اسی وجہ سے " ذلک " لایا گیا ہے جس کا معنی ہے ''وہ'' یہ اشارہ بعید کا ہے قریب کا اشارہ ''ھذا'' نہیں لایا جس کا معنی ہے ''یہ''۔

سبحان اللہ قرآن پاک کی عظمت کو کوئی بیان کرسکتا ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ جس طرح بعید کا اشارہ مکان کی دوری پر دلالت کرتا ہے اسی طرح شان کی دوری، بلندی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا اشارہ قریب کی جگہ بعید لاکر رب تعالیٰ نے قرآن پاک کی بلندی رتبہ اور عظیم القدر ہونے کو بیان کردیا۔

الْکِتَابُ: کتب کے بہت سے معانی ہیں:

(۱) چمڑے کو چمڑے سے ملا کر سینا، جس طرح کہا جاتا ہے "کتبت السقاء" میں نے مشکیزہ کو سیا

(۲) لکھنا، کہا جاتا ہے "کتبت بالقلم" میں نے قلم سے لکھا۔

(۳) کتاب، صحیفہ جیسے ﴿قال انی عبد اللہ آتنی الکتاب﴾ بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے کتاب دی۔

(۴) فرض کرنا، تقدیر جیسے ﴿کتب علیکم الصیام﴾ تم پر روزے فرض کئے گئے۔

(۵) حکم، جیسے ﴿واولو الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ﴾ اولوالارحام بعض بعض سے اولیٰ (بہتر) ہیں اللہ کے حکم میں۔

(۶) بنانا، ثابت کرنا جیسے ﴿فاکتبنا مع الشاھدین﴾ ہمیں شاہدین کی جماعت میں کردے۔

(۷) نامہ اعمال جیسے "مال ھذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا" یہ کیسا نامہ اعمال ہے جو کسی چھوٹی چیز یا بڑی چیز کو نہیں چھوڑتا مگر یہ کہ اسے شمار کرلیتا ہے۔

(۸) لوح محفوظ "ان ذلک فی کتاب" یہ لوح محفوظ میں ہے۔

(۹) علم، تحقق، اعتقاد (۱۰) مکاتب بنانا۔ (۱۱) جمع کرنا۔ (ازمفردات راغب)

قرآن پاک کو کتاب کہنے کی وجہ:

چونکہ ایک معنی ہے جمع کرنا جیسے لشکر کو کتیبہ کہا جاتا ہے۔اس معنی کے لحاظ سے قرآن پاک کو کتاب اس لئے کہا گیا ہے:

" لکونه مسائل مجتمعه وعلوما جمة اجتمع بعضها مع بعض "

کہ اس میں بہت مسائل جمع ہیں اور وافر مقدار میں علوم اس میں پائے گئے ہیں۔گویا کہ مسائل وعلوم بعض، بعض کے ساتھ جمع ہیں۔رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے ﴿ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین﴾ کوئی تر اور خشک چیز ایسی نہیں جو کتاب مبین میں نہ ہو۔

(از شیخ زادہ)

لکھنے والا معنی لیا جائے تو پھر بھی یہی مطلب ہوگا کہ اس میں بہت علوم ومسائل لکھے ہوئے ہیں۔ الکتاب میں الف لام حقیقۃ پر دلالت کر رہا ہے اور کتاب سے مراد جنس کتاب اب معنی اسطرح ہوا "ان ذلک هو الکتاب الکامل" یہی کتاب کامل کتاب ہے۔جس طرح کہا جاتا ہے "هو الرجل ای الکامل فی الرجولیة" وہی مرد ہے یعنی اچھی خصال اس میں ہی پائی گئی ہیں لہذا کامل مرد وہی ہے۔ جب ہم نے یہ معنی مراد لے لیا کہ کامل کتاب صرف قرآن پاک ہی ہے تو پتہ چل گیا "کأن ماعداه من الکتب فی مقابلته ناقص" کہ اسکے ماسوا تمام کتابیں اس کے مقابل ناقص ہیں۔

(از کبیر، ابو سعود)

اعتراض: قرآن پاک کے بغیر باقی کتابوں کو ناقص کہنا تو کسی طرح بھی درست نہیں کیونکہ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ آسمانی کتب ناقص ہوں انکو ناقص کہنا کیسے صحیح ہے؟

جواب: ناقص کا معنی "گھٹیا" نہیں بلکہ کم ہونا ہے۔علامہ رازی رحمہ اللہ پر اعتراض کرنے کی غلطی کا سبب ہی یہ ہے کہ ناقص کا معنی "گھٹیا" سمجھ لیا گیا ہے۔مطلب بہت ہی واضح ہے کہ قرآن پاک کے بغیر دوسری تمام کتب غیر آسمانی ناقص ہیں۔ان کے مضامین کم ہیں یہاں معنی کم شان کرنا بھی صحیح نہیں کہ ان کی شان قرآن پاک کی شان سے کم ہے بلکہ سب ہی عظیم الشان ہیں لیکن آسمانی کتب

کے مجموعی مضامین بھی قرآن پاک میں موجود ہیں اوران سے زائد بھی موجود ہیں اب مطلب یہ ہوا کہ قرآن پاک کے بغیر دوسری آسمانی کتب بلند شان رکھنے کے باوجود مضامین ان کے کم ہیں:

" ذالک الکتاب البعید درجة کماله لجمعه ما فی الکتب الالهیة قبله مع رفعه کل ریب "

یہ کتاب تمام کتب الاھیہ سے بلند مرتبہ ہے کیونکہ ان کے مجموعی مضامین کو بھی شامل ہے اوراس میں شک کی بھی نفی پائی گئی ہے کیونکہ شک کی نفی پر دلائل قائم ہیں۔شبہات کے دور ہونے پر قرآن پاک کا معجزہ ہونا بھی دلالت کر رہا ہے اوراسی قرآن کے ذریعے پہلی کتب کی تصدیق پائی گئی اور پہلی کتب میں تحریف پائی گئی قرآن پاک تحریف سے محفوظ ہے۔ (از تبصیر الرحمن)

اب بات سمجھ میں آ گئی کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے اورابوسعود رحمہ اللہ نے قرآن کو کامل کتاب بیان کر کے تفسیر کا حق ادا کر دیا ہے کہ قرآن کتنی عظیم کتاب ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ سے عظمت اور کمال سمجھ میں آ رہا ہے۔

فائدہ جلیلہ : اصولِ احکامِ دین چار چیزیں ہیں۔کتاب،سنت،اجماع،قیاس۔بعض احکام دین کتاب اللہ سے ثابت ہیں۔جیسے نماز،روزہ اورزکوۃ کی فرضیت اورخنزیر کی حرمت اوربعض احکام سنت (نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال) سے ثابت ہیں جس طرح نماز جنازہ کا فرض (کفایہ) ہونا اور گدھے کا حرام ہونا۔

بعض احکام اجماع امت سے ثابت ہیں جیسے ام ولد کی بیع کا حرام ہونا اور دو غلامہ کے ساتھ ملک یمین کی وجہ سے وطی کا حرام ہونا۔بعض احکام قیاس سے ثابت ہیں جیسے شراب کی حرمت پر باقی نشہ آور چیزوں کی حرمت کو قیاس کیا گیا ہے۔لیکن تمام دلیلوں کی اصل کتاب اللہ (قرآن پاک) ہی ہے۔

کیونکہ قیاس وہ معتبر ہے جو کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ یا اجماع سے حاصل ہو۔

اجماع وہ معتبر ہے جو کتاب اللہ اور سنت کے تابع ہو اور سنت چونکہ نبی کریم ﷺ کے اقوال اور افعال کو کہا جاتا ہے نبی کریم ﷺ کی نبوت قرآن پاک سے ثابت ہے قرآن پاک آپ کا معجزہ ہے تو اس سے واضح ہو گیا کہ چار دلیلوں میں اصل کتاب اللہ ہی ہے اور باقی اسی کے تابع ہیں۔ (از عزیزی)

﴿ لَارَيْبَ فِيْهِ ﴾

(۱) ''شک کی جگہ نہیں اس میں (۲) اس میں شک کی گنجائش نہیں''

یہاں نفی میں عموم پایا گیا ہے کیونکہ نکرہ پر حرف نفی آئے تو وہ عموم پر دلالت کرتا ہے اسی وجہ سے ''ریب'' مبنی برفتحہ ہے ''ریب'' کے تین معنی ہیں۔

(۱) ریب بمعنی شک، جیسا کہ عبداللہ ابن زبعری نے کہا:

لیس فی الحق یا امیمة ریب انما الریب مما یقول الجهول

اے امیمہ حق میں شک کی گنجائش نہیں ہوتی شک وہاں ہوسکتا ہے جہاں جہلاء کا کلام ہو

(۲) ریب بمعنی تہمت جیسا کہ جمیل نے کہا:

بثینة قالت یاجمیل اربتنی فقلت کلانا یا بثین مریب

بثینہ نے کہا اے جمیل تم نے مجھ پر تہمت لگائی تو میں نے کہا ہم میں سے ہر ایک تہمت لگانے والا ہے

(۳) ریب بمعنی حاجت، جیسا کہ کعب ابن مالک انصاری فرماتے ہیں:

قضینا من تهامة کل ریب وخیبر ثم اجمعنا السیوفا

ہم نے ہر حاجت کو پورا کر دیا مقام تہامہ میں اور خیبر میں پھر ہم نے اپنی تلواروں کو جمع کر لیا

(از قرطبی)

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا ریب اصل میں مصدر ہے کہا جاتا ہے ''رابنی الشئی'' فلاں چیز نے مجھے ریب میں ڈال دیا۔ ریب اگر شک کے معنی میں مشہور ہے لیکن اصل میں اس کا معنی نفس میں قلق اور اضطراب پایا جانا چونکہ شک میں بھی قلق (بے اطمینانی) اور اضطراب پایا جاتا ہے اس لئے ریب کا معنی شک کر لیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے ''دع ما یریبک الی ما لا یریبک'' جو چیز تمہارے نفس کے لئے قلق واضطراب کا ذریعہ بنے اسے چھوڑ دو اس پر عمل کرو جو اضطراب کا سبب نہ بنے۔ یعنی جس چیز کے بارے میں شک ہو کہ یہ حلال ہے یا حرام تو وہ باعث اضطراب ہے اطمینان قلب اس میں نہیں پایا جاتا اس لئے اسے چھوڑ دیا جائے اور جس چیز کے حلال

ہونے میں یقین ہوگا اس میں اطمینان حاصل ہوگا وہ سکون قلب، اطمینان قلب کا سبب بنے گی اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

ایک اور حدیث شریف میں ارشاد ہے " فان الصدق طمانینة والکذب ریبة " بیشک سچ اطمینان ہے اور جھوٹ اضطراب ہے جب ریب کا اصل معنی اضطراب ہے تو یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے "ریب الزمان "، جس کا معنی مراد ہوتا ہے زمانے کے مصائب چونکہ وہ بھی دل کے اطمینان وسکون کو ختم کر دیتے ہیں اور اضطراب کا سبب بنتے ہیں۔ (بیضاوی بمع شیخ زادہ)

یہ بھی خیال رہے کہ شک دو نقیضوں میں کسی ایک کو ترجیح نہ دے سکنے کو کہا جاتا ہے۔

مقام توجہ: لاریب کہا ہے لاشک نہیں کہا اس لئے کہ اس میں بہت وسیع مضامین کو پیش کر دیا گیا کہ قرآن پاک میں شک کی گنجائش نہیں۔ قرآن پاک میں یہ تہمت نہیں لگائی جاسکتی کہ (معاذاللہ) یہ نبی کریم ﷺ نے اپنی طرف سے پیش کیا قرآن پاک لوگوں کی ناجائز حاجات کو پورا نہیں کرتا۔ قرآن پاک میں اطمینان پایا گیا قلق واضطراب نہیں پایا گیا۔ قرآن پاک میں حوادثات زمانہ نہیں پائے گئے کہ حوادثات زمانہ کی وجہ سے اس میں کوئی تغیر وتبدل پایا گیا ہو۔ قرآن پاک میں کوئی ایسی وجوہ نہیں پائی گئی جن سے دل میں پریشانی پائی جائے اور وہ غیظ وغضب کا سبب بنیں۔ یہ اتنے فوائد لاریب سے حاصل ہوئے جو "لاشک" سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

اعتراض: تم نے بیان کیا ہے کہ ﴿ لَا رَیْبَ فِیْهِ ﴾ میں عموم نفی ہے جس کا معنی یہ ہے کہ قرآن پاک میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں یعنی شک کا کوئی ایک فرد بھی نہیں پایا گیا یہ کہنا کیسے صحیح ہے؟ جب کہ مرتابین کثیر تعداد میں پائے گئے ہیں رب تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا...... الخ ﴾

قانون یہ ہے کہ کثرت مرتاب مستلزم ہے کثرت ریب کو یعنی شک کرنے والے تب ہی زیادہ ہوں گے جب اس میں شک زیادہ ہوگا۔ جب کوئی ایک بھی شک کرنے والا ہو تو شک کی کلی طور پر نفی نہیں ہو سکتی۔

جواب: یہاں یہ مراد نہیں کہ اس میں کوئی شک کرنے والا نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن پاک

وحی الٰہی سے نازل ہوااس پر واضح اور روشن دلائل موجود ہیں جب کوئی عقلمند اسمیں غور کرے تو وہ کبھی اسمیں شک نہیں کرسکتا " حیث خرج عن کونه مظنة للریب " کیونکہ شک کی جگہ سے نکل گیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی وجہ سے حق اور سچ ہے اسمیں کوئی عقل مند شخص تو شک نہیں کرسکتاہاں کوئی اپنے جہالت ،ضد، حسد، عناد اور کفر کی وجہ سے شک کرے تو اسکے شک کرنے کی وجہ سے قرآن پاک میں شک نہیں آجائے گا اسکا شک کرنا ہی باطل ہے۔ (از شیخ زادہ)

کنزالایمان کا کمال:

ابھی تک جو بحث کی گئی کہ "ذالک "اشارہ بعید کالا کر قرآن پاک کی عظمت کا ذکر کیا گیا یا ابھی جو سوال و جواب ذکر کیے گئے اسکو دیکھتے ہوئے تراجم کو دیکھیں تو یقیناً اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ کنزالایمان منفرد اور امتیازی شان رکھنے والا نظر آئے گا۔تراجم دیکھیے خود فیصلہ کیجیے یقیناً آپکو پتہ چلے گا کہ دو لفظوں سے بہت بڑے بحثیں سمیٹ کر ترجمہ میں سمو دی گئیں۔

﴿ الٓمّٓ ☆ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ ﴾

ترجمہ	مترجم
☆ یہ کتاب کہ کوئی شبہ اس میں نہیں	(عبد الماجد دریا آبادی)
☆ اس کتاب میں کچھ شک نہیں	(محمود الحسن صاحب)
☆ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں	(اشرف علی صاحب)
☆ اس کتاب میں کچھ شک نہیں	(شاہ عبد القادر صاحب)
☆ یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں	(مودودی صاحب)
☆ یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں	(شاہ رفیع الدین صاحب)
☆ وہ بلند مرتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں اس میں	(مولانا احمد رضا خان بریلوی)

راقم نے اپنے ترجمہ میں ایک اور اشارہ کر دیا:

ابھی تک جو اعتراض نقل کیا گیا ہے اسکا ایک جواب نقل کیا ہے لیکن اسکا ایک اور جواب یہ دیا گیا ہے:

" وقیل معناه لا ریب فیه للمتقین وهدی حال من الضمیر المجرور والعامل فیه الظرف الواقع صفة للمنفی " (بیضاوی)

بعض حضرات نے کہا " للمتقین " خبر ہے " لا " کی اور " هدی " حال ہے " فیه " کی مجرور ضمیر سے اور عامل اس میں ظرف ہے جو منفی (ریب) کی صفت ہے۔

اب جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ شک کی نفی تمام لوگوں سے نہیں بلکہ متقین سے ہے اب مطلب یہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں متقین کو دراں حالیکہ اس میں ہدایت ہے۔ پہلا جواب جو زیادہ مشہور اور قوی اور زیادہ صحیح ہے اسکے مطابق راقم کے ترجمہ کو یوں پڑھیں " یہ وہ بلند مرتبہ کتاب ہے کوئی شک کی گنجائش نہیں اس میں۔ پرہیز گاروں کیلئے ہدایت ہے" اور دوسرا جواب جو کم مشہور ہے اور " قیل " سے تعبیر کر کے اس کا کچھ ضعف بھی بیان کیا گیا ہے اسکے مطابق راقم کا ترجمہ یوں پڑھیں یہ وہ بلند مرتبہ کتاب ہے کوئی شک کی گنجائش نہیں اس میں پرہیز گاروں کے لئے۔ ہدایت ہے (اس میں)۔

علمی نکتہ:

مسند کی تقدیم تخصیص پر دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے جنتی شراب طہور کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا" لا فیها غول " صرف جنتی شراب میں مستی نہیں (غول کا معنی سر درد، اعضاء کا بوجھل ہونا، مراد مست ہونا) " بخلاف خمور الدنیا فان فیها غولا " بخلاف دنیا کے شراب کے اس میں مستی پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ﴿لَا رَیْبَ فِیْهِ﴾ کہا گیا ہے لیکن ﴿لَا فِیْهِ رَیْبَ﴾ نہیں کہا گیا" لئلا یفید تقدیمه علیه ثبوت الریب فی سائر کتب الله " تاکہ مسند کی تقدیم سے تخصیص والا معنی لے کر یہ نہ ثابت ہو کہ شائد اللہ تعالیٰ کی باقی کتب میں شک پایا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتب شک سے پاک ہیں۔

سبحان اللہ قرآن پاک کتنی عظیم کتاب ہے جس کی وضاحت و بلاغت کی کوئی حد نہیں۔

(از مختصر المعانی)

﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾

"پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے"

"ھدایة" کے دو معنی ہیں ایک راہ دکھانا، دوسرا منزل مقصود تک پہنچانا۔

اعتراض: پہلے معنی پر اعتراض یہ ہوگا کہ قرآن پاک تو تمام لوگوں کو راہ دکھانے کے لئے نازل ہوا ہے صرف متقین سے اس کو خاص کیسے کیا گیا ہے۔

پہلا جواب: ھدایة کا معنی یہاں مقصود تک پہنچانے والا لیا گیا ہے کیونکہ یہی معنی "ضلالة" کا مقابل ہے اللہ تعالیٰ کے قول میں یہی مذکور ہے "انک لعلی ھدی او فی ضلال مبین" کیونکہ مھدی اسے کہا جاتا ہے جو مطلوب تک ہدایت حاصل کرلے "واختصاصه بالمتقین لانهم المهتدون به والمنتفعون بنصبه" ہدایت کو متقین سے اسی وجہ سے خاص کیا گیا کہ قرآن پاک کے ذریعے ہدایت کو انہوں نے ہی قبول کیا اور وہ دلائل جو اللہ تعالیٰ نے مقصود تک پہنچانے کے قائم فرمائے ان سے نفع انہوں نے ہی حاصل کیا۔

دوسرا جواب: ھدایة کا معنی تو راہ دکھانا ہے اسی لئے دوسرے مقام پر قرآن پاک کی صفت ان الفاظ مبارکہ سے کی "ھدی للناس" قرآن پاک لوگوں کو راہ دکھاتا ہے یہ عام ہے سب مومنوں اور کافروں کو شامل ہے یعنی قرآن پاک اگرچہ تمام مومنوں اور کافروں کے لئے ھادی بن کر آیا لیکن اس راہ پر چلے فقط مومنین، متقین اسی لئے متقین کا ذکر کیا۔

اس مسئلہ کو یوں سمجھیں کہ جس طرح غذا بدن کی مصلحت کے لئے ہوتی ہے لیکن اسی شخص کو غذا نفع دیتی ہے جس کو صحت حاصل ہو مریض کو نفع مند نہیں ہوتی اسی طرح جن لوگوں کو عقل سلیم حاصل ہوئی کفر ونفاق کے زنگ سے ان کی عقل محفوظ رہی آیات میں تدبر کیا معجزات کو دیکھا نبوت کو پہچانا اور ایمان لایا انہوں نے قرآن پاک سے نفع حاصل کیا۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے یہ مسئلہ بہت واضح ہو جاتا ہے:

﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾

''اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لئے شفا ہے اور رحمت ہے اور اس سے ظالموں کو نقصان ہی بڑھتا ہے''

یعنی مومن قرآن پاک کے احکام پر عمل کر کے اور قرآن کے مطابق اپنے اعتقادات درست کر کے رحمت کے مستحق ہوتے ہیں اور جسمانی اور روحانی امراض سے شفا حاصل کر لیتے ہیں لیکن کافر اپنے کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے نقصان میں رہتے ہیں۔ جتنا زیادہ آیات کا انکار کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ ان کو خسارہ ہوتا ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی مع شیخ زادہ)

اعتراض: تمام قرآن پاک کو کیسے ہادی کہا گیا ہے جب کہ اس میں مجمل اور متشابہ بھی ہیں ان سے تو کوئی راہنمائی نہیں ملتی۔

جواب: مجمل پر توقف کرنا کہ شریعت کی طرف سے جو بیان آئے گا وہی مراد ہوگی اور متشابہ پر ایمان رکھنا کہ جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہی درست ہے یہی ہدایت ہے ایمان حاصل ہونے سے بڑھ کر اور کیا ہدایت حاصل ہوگی۔ (ماخوذ از بیضاوی)

اعتراض: متقین تو پہلے ہدایت پر ہوتے ہیں جن حضرات کو ہدایت حاصل ہو ان کو پھر ہدایت دینے کا کیا مطلب؟

جواب: " هدى للمتقين الى الصائرين الى التقوى بامتثال الاوامر واجتناب النواهي اشار بذالک الى ان فى الكلام مجاز الاول الى المتقين فى علم الله او من يؤول الى كونهم متقين " (جلالين مع الصاوى)

یا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ قرآن پاک ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں متقین ہیں اور یا یہ مطلب ہے کہ جو آئندہ اوامر پر عمل کر کے اور نواہی سے اجتناب حاصل کر کے متقی بننے والے ہیں ''متقین'' جمع ہے متقی کی اصل ماخذ تقویٰ اور متقی کا وقی ہے۔ دینی مدارس میں پڑھنے والے چھوٹی کلاسوں کے بچے بھی جانتے ہیں کہ باب افتعال کے فاء کلمہ میں واؤ اور یا (ہمزہ سے بدل نہ

ہو) آئے تو اس واؤ اور یا کو تا سے بدل کرادغام کر دیتے ہیں اس طرح اوتقاء سے اتقاء بن گیا موتقی سے متقی بن گیا "وقی" کالغوی معنی بچنا ہے۔لیکن اھل شرع کے نزدیک تقویٰ یہ ہے "ھی صیانة عما یضرہ فی الآخرة لا مطلق الصیانة" کہ ایسی چیزوں سے بچنا جو آخرت میں نقصان دہ ہوں۔ مطلقاً کسی نہ کسی چیز سے بچنے کا نام شریعت میں تقویٰ نہیں۔

خیال رہے کہ آخرت میں نقصان دینے والی چیزوں سے انسان اسی وقت اجتناب کرے گا جب اس کے دل میں خوف خدا ہوگا اسی لئے تقویٰ کا معنی ڈرنا بھی کیا جاتا ہے اور پرہیز کرنا بھی معنی کیا جاتا ہے اسی لئے متقی کو پرہیزگار کہا جاتا ہے۔

تقویٰ کے تین درجے: تقویٰ عوام، تقویٰ خواص، تقویٰ اخص الخواص۔

تقویٰ عوام: دائمی عذاب سے بچنا یعنی شرک سے باز رہنا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَالْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ سے یہی معنی سمجھ آ رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث پاک اسی مفہوم کی تائید کر رہی ہے آپ نے فرمایا:

"المتقی من یتقی الشرک والکبائر والفواحش وعلیه قوله تعالیٰ والزمهم کلمة التقوی"

متقی وہ ہوتا ہے جو شرک، کبیرہ گناہوں اور فواحش سے اجتناب کرے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَالْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ اسی پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ آیۂ کریمہ میں کلمۃ التقویٰ سے مراد کلمہ توحید ہے اور وہ کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" ہے اگر شرک سے بچنے کا نام تقویٰ نہ ہوتا تو کلمہ توحید کو کلمہ تقویٰ نہ کہا جاتا۔

تقویٰ خواص: ہر گناہ والے کام سے بچنا، یہاں تک کہ بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ صغائر سے بھی پرہیز کرنا تقویٰ کی اسی قسم میں داخل ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے یہ تقویٰ بھی سمجھ میں آ رہا ہے اور شریعت میں یہی تقویٰ زیادہ مشہور ہے وہ ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے:

﴿وَلَوْاَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾

"اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور ڈرتے تو ضرور ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے"

چونکہ اس آیت میں پہلے "امنوا" ذکر ہوا جس کا مطلب ہی شرک سے بچنا ہے پھر

"واتقوا" ذکر کیا تو یقیناً اس کے معنی میں شرک سے بچنے کے معنی میں زیادتی بھی ہے وہ یہی ہے کہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔

تقوی اخص الخواص: ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کیطرف کامل متوجہ ہونے میں رکاوٹ بنے اس سے اجتناب کرنا اور کامل طور پر دنیا سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھ آ رہا ہے:

﴿ یا ایُّھا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقَاتِہٖ ﴾

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

صوفیاء کرام اولیاء عظام اسی کو تقوی حقیقی کہتے ہیں ان کے نزدیک یہی مطلوب ہوتا ہے۔
(ماخوذ از بیضاوی مع شیخ زادہ)

تقویٰ کے اسی مقام کو استاذی المکرّم حضرت مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی غالباً حضرت عبدالعزیز دباغ رحمہ اللہ کے قول سے بیان فرماتے تھے۔ "طالب الدنیا مؤنث و طالب العقبی مخنث و طالب المولیٰ مذکر" دنیا کا طلبگار عورت کے مقام پر ہے آخرت کا طلب گار یعنی جنت کی طلب کرنے والا اور جہنم سے بچاؤ کا طلب گار خنثٰی کی مثال ہے اور مولیٰ کو طلب کرنے والا مذکر ہے۔ کیونکہ جب صرف یہ طلب ہو کہ مولیٰ تو راضی ہو جا تو رب تعالیٰ کی رضا جب حاصل ہو گی تو دنیا میں رحمت کے دروازے بھی کھل جائیں گے اور جہنم سے بچنا بھی نصیب ہو گا اور جنت بھی حاصل ہو گی:

تجھ کو تجھی سے مانگ کر مانگ لی ساری کائنات ، مجھ سا کوئی گدا نہیں تجھ سا کوئی بادشاہ نہیں

شائد اسی قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت محمد بخش کھڑی شریف والے نے فرمایا:

ہر مشکل دی کنجی یارو مرداں دے ہتھ آئی ، مرد دعا کرن جس ویلے مشکل رہے نہ کائی

یعنی آپ نے بھی اولیاء کرام کو مرد کہا ہے کیونکہ حقیقت میں مرد ہیں ہی وہی خصوصاً داڑھی منڈانے والے تو نظر ہی مؤنث آتے ہیں۔

تنبیہ: بعض حضرات نے تقوی کی تیسری قسم شبہات سے بچنا بیان کیا ہے۔ اس لئے راقم کے خیال میں اگر یوں تقسیم کر دی جائے تو ممکن ہے کہ اہل علم اس کی تائید کر دیں۔ تقوی عوام شرک سے بچنا،

تقوی خواص بالاعم، گناہوں سے بچنا، تقوی خواص بالاخص، شبہات سے بچنا، تقوی اخص الخواص، رب سے توجہ ہٹانے والی چیزوں سے بچنا۔

احادیث مبارکہ سے وضاحت: حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ ابن مسعود اور کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ یعنی نورا للمتقین " یعنی اس مقام میں ہدایت کا معنی نور ہے مفہوم پھر بھی یہی ہوگا کہ قرآن پاک ان کے لئے سیدھی راہ روشن کرتا ہے کہ اس پر چل کر کامیابی حاصل کریں اور تقوی والے ہو جائیں:

☆ " عن ابن عباس قال هدى للمتقين قال هم المومنون الذين يتقون الشرک بی ويعملون بطاعتی "

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ھدی للمتقین میں جن متقین کا ذکر ہے یہ وہ ہیں جن کے متعلق رب تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ مومنین وہ لوگ ہیں جو مجھ پر ایمان لانے اور مجھ سے ڈرنے کی وجہ سے شرک سے اجتناب کرتے ہیں اور میری طاعت کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

اس حدیث سے تقوی کا وہ معنی کامل طور پر سمجھ آ گیا جو پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ تقوی کی قسموں میں سے ایک ''تقوی خواص'' ہے۔

☆ " عن ابن عباس للمتقين قال الذين يحذرون من الله عقوبته فی ترک ما يعرفون من الهدى ويرجون رحمته فی التصديق بما جاء به "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ میں جن لوگوں کا ذکر ہے یہ وہ ہیں۔ جو ہدایت کے راستہ کو پہچان کر اس سے دور رہنے سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور (رسول اللہ ﷺ رب تعالیٰ کی طرف سے) جو لایا ہے اس کی تصدیق کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید کرتے ہیں۔

یہ تقوی بھی خواص کا ہی ہے کیونکہ گناہوں سے اجتناب کرنا اور رحمت باری تعالیٰ کی امید ''تقوی خواص'' ہی ہے۔

☆ " عن الحسن البصری قوله للمتقين قال اتقوا ما حرم الله عليهم وادوا ما افترض عليهم "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بھی متقین کے متعلق کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام کی ہیں اور ان کو ادا کرتے ہیں جو رب تعالیٰ نے ان پر فرض کی ہیں۔

☆ " **عن عطیة السعدی قال قال رسول الله ﷺ لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع مالاباس به حذرا مما بأ س به** "

عطیہ سعدی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ متقین کے درجہ میں اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کو بھی چھوڑ دے جن میں حرج تو نہیں لیکن (ان کو اس لئے چھوڑ دے) تا کہ حرج والی چیزوں سے بچ جائے۔

یہ تقوی شبہات سے بچنے کے قریب ہے کیونکہ جس طرح جانوروں کو چرانے والے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ زمین میں کسی کے کاشت شدہ فصل کو بچانے کے لئے اپنے جانوروں کو اس زمین کے اردگرد لگی باڑ، حد بندی کے قریب بھی نہ جانے دے۔ اسی طرح وہ کام جو جائز تو ہے لیکن اسی کے ساتھ متصل آگے ناجائز کام کی ابتداء ہو رہی ہو تو اس ناجائز کام سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی حد پر واقع ہونے کے ڈر سے جائز کام کو بھی چھوڑ دے تا کہ اسے تقوی حاصل ہو۔

☆ ''ایک مرتبہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تقوی کیا ہے؟ انہوں نے کہا " **اما سلکت طریقا ذاشوک قال بلی قال فما عملت قال شمرت واجتهدت قال فذلک التقوی** " کیا تم کبھی کانٹوں والے راستے پر نہیں چلے آپ نے فرمایا کیوں نہیں انہوں نے کہا تم وہاں کیا کرتے ہو تو آپ نے کہا کہ میں وہاں اپنے کپڑے سمیٹ لیتا ہوں یعنی جہاں تک ممکن ہو کپڑوں کو اوپر چڑھا لیتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ ان سے بچ جاؤں ابی ابن کعب نے کہا کہ یہی تقوی ہے۔ یعنی گناہوں سے بچنے میں مکمل کوشش کرنا تا کہ کہیں گناہوں میں ملوث نہ ہو یہ تقوی ہے۔ ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کے اسی قول کو دیکھتے ہوئے ابن معتز نے یہ کہا:

" خل الذنوب صغیر ها ، وکبیرهاذاک التقی ، واصنع کماش فوق ارض ، الشوک یحذر ما یری ، لا تحقرن صغیرة ، ان الجبال من الحصی "

''چھوڑ دے گناہوں کو چھوٹے ہوں یا بڑے یہی تقویٰ ہے تو ایسے کر جیسے کانٹوں والی زمین پر چلنے والا جب کانٹے دیکھتا ہے تو ان سے بچتا ہے۔ چھوٹے گناہوں کو حقیر نہ سمجھ بیشک پہاڑ چھوٹے چھوٹے سنگریزوں سے ہی بنے ہیں'' (ابن کثیر بحذف)

" التقوی فیها جماع الخیر کله وهی وصیة الله فی الاولین والآخرین وهی خیر ما یستفیده الانسان "

تقویٰ میں ہر قسم کی بھلائیاں جمع ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگلے اور پچھلے تمام لوگوں کو تقویٰ کی نصیحت کی گئی انسان جن چیزوں میں فائدہ سمجھتا ہے ان سے تقویٰ بہتر ہے۔

ابوالدرداء کو جب کہا گیا کہ تمہارے دوست تو شعر بھی کہتے تھے کیا تم بھی کوئی اپنا شعر سنا سکتے ہو؟ تو آپ نے یہ شعر بیان کئے:

یرید المرأ ان یؤتی مناه ویابی الله الا ما اراده

یقول المرأ فائدتی ومالی وتقوی افضل ما استفادا

انسان چاہتا ہے کہ اسے ممنوع چیزیں دی جائیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ انکار کرتا ہے وہی عطا کرتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے انسان کہتا ہے اس میں میرا فائدہ ہے یہ میرا حال ہے۔ حالانکہ تقویٰ ہی افضل ہے ان چیزوں سے جن کو وہ فائدہ مند سمجھتا ہے

☆ " عن ابی امامة عن النبی ﷺ انه کان یقول ما استفاد المؤمن بعد تقوی الله خیرا له من زوجة صالحة ان امرها اطاعته وان نظر الیها سرته وان اقسم علیها ابرته وان غاب عنها نصحته فی نفسها وماله " (ابن ماجه)

ابوامامہ نے کہا بیشک نبی کریم ﷺ فرما رہے تھے اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے بعد انسان اپنے فائدہ کے لئے کوئی چیز طلب کرے جو اس کے لئے بہتر ہو تو وہ نیک زوجہ ہے۔ اگر یہ اسے کوئی حکم دے وہ اس کی اطاعت کرے اگر یہ اسے دیکھے تو وہ اسے خوش کرے اگر یہ اس پر کوئی قسم اٹھا دے تو وہ اسے پورا کرے (یعنی اگر یہ کہہ دے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ میری زوجہ یہ کام کرے گی وہ کام ناجائز نہ ہو تو عورت اس طرح کام کر کے خاوند کی قسم کو پورا کر دے) اور اگر یہ غائب ہو جائے تو وہ اپنے نفس اور اپنے خاوند کی مال کی حفاظت کرے۔ (از قرطبی)

فائدہ عظیمہ : تمام لوگ عاقبت کے لحاظ سے سات قسم ہیں کیونکہ یا تو وہ سعید (نیک بخت) ہوں گے اور یا وہ شقی (بد بخت) ہوں گے۔ جو سعید ہوں گے ان کی پھر دو قسمیں ہیں ایک اصحاب یمین جن کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ دوسرے وہ جو ان سے بھی بلند مرتبہ والے ہوں گے جن کو السابقون المقربون کہا گیا ہے رب تعالیٰ نے ان تینوں قسموں یعنی اصحاب شمال، اصحاب یمین السابقون المقربون کا ذکر ان آیات مبارکہ میں کیا:

۞ وَكُنْتُمْ اَزْوَاجاً ثَلَاثَةً ☆ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ☆ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ☆ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ☆ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ☆ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ☆ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۞

''اور تم تین قسم کے ہو جاؤ گے تو داہنی طرف والے کے داہنی طرف والے، اور بائیں طرف والے کے بائیں طرف والے اور جو سبقت لے گئے وہ تو سبقت ہی لے گئے وہی مقرب بارگاہ میں چین کے باغوں میں''

شقی لوگ اصحاب شمال ہوں گے یعنی ان کے بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال ہوگا اصحاب شمال کی پھر مختلف قسمیں ہیں ان میں سے کچھ ''مطرودون'' ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے متعلق عذاب دینے کا اللہ تعالیٰ کا وعدہ ثابت ہو چکا ہے ایسے لوگوں کا ذکر اس آیت میں کیا گیا: ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ اور تحقیق ہم نے جہنم کے لئے پیدا کئے بہت سے جن اور انسان۔ اسی طرح حدیث قدسی میں بھی ان لوگوں کا ذکر کیا گیا" ھؤلاء خلقتھم للنار ولا ابالی" یہ لوگ ہیں جن کو میں نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔

اصحاب شمال میں سے ایک گروہ وہ ہے جسے ''منافقون'' کہا جاتا ہے منافق وہ لوگ ہیں جن کو پیدائشی فطرت کے لحاظ سے تو اس قابل بنایا گیا تھا کہ یہ اپنے دلوں کو نور ایمان سے منور کر لیں لیکن رذیل کاموں (یعنی منافقت) اور گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ان کے دل زنگ آلود ہو گئے وہ چوپاؤں والے اعمال (کھانے اور شہوات) اور درندوں والے اعمال (درندگی، چیر پھاڑنے) میں مبتلا ہو گئے شیطان کے مکر وفریب کے جال میں پھنس گئے یہاں تک کامل گناہگاروں والی ہیئت ان میں راسخ (پختہ) ہوگئی۔ ان کے نفسوں میں جو ملکہ یعنی نور ایمان کو حاصل کرنے والی جو استعداد پائی گئی تھی وہ

تاریک ہوگئی ان کے دلوں پر تاریکیوں کے انبار لگ گئے۔

وہ اس کیفیت سے متحیر (حیران) اور بھٹکنے والے ہو کر " لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلا " (نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے) کا مصداق بن گئے ان کے اعمال برباد ہو کر رہ گئے قیامت کے دن ندامت کی وجہ سے اور رب تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے سر جھکائے ہوں گے یہ لوگ سب سے زیادہ شدید عذاب میں مبتلا ہوں گے رب تعالیٰ نے ان کے عذاب کو یوں ذکر فرمایا ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ بیشک منافق دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے۔ یہ لوگ پہلے درجہ والے یعنی ''مطرودون'' سے بہت ہی برے حال میں ہوں گے۔

دو فریق اصحاب یمین اور اصحاب دنیا میں سے بعض وہ ہوں گے جن کو "اھل فضل وثواب" کہا جائے گا یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے ایمان لایا اور اچھے عمل کیے کہ جنت مل جائے وہ جنت کی امید رکھنے والے ہوں گے اور اس پر راضی بھی ہوں گے ان کے متعلق ہی رب تعالیٰ نے فرمایا "فوجدوا ما عملوا حاضرا" اپنے اعمال (کے بدلہ) کو سامنے پالیں گے۔

البتہ ان کے مدارج جنت میں ان اعمال کے مطابق ہوں گے۔ اعمال کے درجات کی بلندی جنت میں بلندی مرتبت کا سبب بنے گی۔

ان اصحاب یمین اور اصحاب دنیا میں سے ہی بعض وہ لوگ ہوں گے جن کو ''اھل رحمۃ'' کہا جائے گا یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے نفوس کی سلامتی پر باقی رہیں گے ان کے دل صاف ہوں گے ان کو اپنے اعمال کے کمالات کے مطابق درجات حاصل نہیں ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت کے مطابق مدارج حاصل ہوں گے۔ یعنی جس طرح رب تعالیٰ کا فضل ہوگا کسی پر کم اور کسی پر زیادہ اسی کے مطابق ان کے درجات ہوں گے۔

ان اصحاب یمین اور اصحاب دنیا میں سے ہی بعض . ے اھل عفو' ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے نیک اور برے عمل ملے جلے ہوں گے۔

اھل عفو کی پھر دو قسمیں ہیں ایک وہ ہوں گے جن کو صحیح عقیدہ پر قائم رہنے اور گناہوں پر جمے نہ

رہنے اور کم لغزش کے واقع ہونے اور توبہ کرنے کی وجہ سے مکمل طور پر معاف کردیا جائے گا ان لوگوں کے حق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ﴾ ان لوگوں کی غلطیوں کو رب تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا۔

دوسرے وہ لوگ ہوں گے جن کو کچھ دیر کے لئے عذاب دیا جائے گا کیونکہ ان کے معاصی (گناہ) ان میں راسخ تھے۔ یہاں تک کہ جب یہ اپنے گناہوں کی میل کچیل سے پاک ہوجائیں گے تو ان کو نجات دے دی جائے گی یہ اصحاب عدل وعقاب ہوں گے ان لوگوں کے متعلق ہی رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْ ہٰٓؤُلَآءِ سَیُصِیْبُہُمْ سَیِّاٰتُ مَاکَسَبُوْا﴾

وہ لوگ جو ان میں سے (اپنی جانوں پر) ظلم کرنے والے ہوں گے ان کو انکے کسب کردہ گناہ پہنچیں گے (یعنی وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے) لیکن البتہ پھر انکو رحمت اپنے دامن میں لے لی گی۔

السابقون المقربون اللہ تعالیٰ کے محبوب لوگ ہیں۔ان کے پھر دو درجے ہیں۔ایک تو وہ ہیں، جن کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا:﴿ جَاہِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ﴾ کہ انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا جیسا جہاد کرنے کا حق ہے یہی وہ لوگ ہین جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جیسا رجوع کرنے کا حق ہے ان کو ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ کی ہدایت دی۔محبوبین کا ایک اور درجہ یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ازلی طور پر ہی چن لیا محبوب بنالیا اور صراط مستقیم کی ہدایت دی مقربین کے یہ دونوں درجے ''اہل اللہ'' کہلاتے ہیں۔

نتیجہ یہ حاصل ہوا: عاقبت کے لحاظ پر بندوں کی ابتدائی طور پر تین قسمیں ہیں اصحاب الشمال، اصحاب الیمین ،السابقون المقربون اصحاب الشمال کی دو قسمیں مطرودون (یعنی کفار) اور منافقون

اصحاب یمین کی چار قسمیں ہیں: اہل فضل وثواب ،اہل رحمۃ ،اہل عفو،اصحاب عدل وعقاب۔

اس طرح دو اور چار مل کر کل چھ قسمیں ہوئیں۔ساتویں قسم السابقون المقربون ہیں جن کو محبوبین خدا کہاجاتا ہے

اب توجہ فرمائیں: قرآن پاک تمام لوگوں کو راہ دکھانے کے لئے آیا ہے اسی وجہ سے

اس کی شان میں "ھدی للناس" کہا گیا ہے لیکن اس کی ہدایت کو دو گروہوں کی قسمت میں قبول کرنا نہیں وہ دونوں فرقے اشقیاء کے ہیں جن کو اصحاب شمال کہا گیا ہے ان میں سے مطرودون یعنی کفار کے دل تو کفر کے زنگ سے سیاہ ہو چکے ہیں ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ان کے دلوں میں ہدایت کو قبول کرنے کی استعداد ہی ختم ہو چکی ہے۔ دوسرا فرقہ منافقین کا ہے انہوں نے بھی اپنے فاسد اعتقاد کی وجہ سے اپنی استعداد کو زائل کر دیا ہے لہٰذا وہ بھی ہمیشہ جہنم میں رہنے والے ہیں وہ بھی ہدایت کو قبول کرنے والے نہیں۔ باقی پانچ فرقے ہدایت کو قبول کرنیوالے ہیں وہی ﴿ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ کا مصداق ہیں البتہ ان کو تقوی کے مختلف مدارج حاصل ہیں۔

مقربین ومحبوبین اگرچہ رب تعالیٰ کے پسندیدہ ہوتے ہیں لیکن وہ بھی کتاب اللہ کی ہدایت کے محتاج ہوتے ہیں اس لئے کہ اور ہی زیادہ رب تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنے کے محتاج ہوتے بلکہ فناء فی اللہ کے درجہ کے حصول کے محتاج ہوتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا محبوب کون ہو سکتا ہے ان کے متعلق بھی رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿کَذٰلِکَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَکَ﴾ اسی طرح ہم آپ کے دل کو اس کے ذریعے ثابت کرتے ہیں اور ارشاد فرمایا:

﴿وَکُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَکَ﴾

"ہم آپ پر رسولوں کی خبریں بیان کرتے ہیں اس کے ذریعے آپ کے دل کو ثابت رکھتے ہیں"

واضح ہوا کہ محبوبین بھی قرآن پاک اور رب تعالیٰ کی ہدایت کے ذریعے اور بلند درجات رکھتے ہیں۔ اب نتیجہ واضح ہو گیا کہ دو بدبخت گروہوں کے بغیر پانچ قسم کے لوگوں کے دلوں فطرت اصلیہ باقی رہتی ہے ان کو ہدایت قبول کرنے کی استعداد حاصل ہوتی ہے۔ وہ شرک کے زنگ سے محفوظ ہوتے ہیں شک وشبہ سے انکے دل پاک وصاف ہوتے ہیں ان کے نفوس پاکیزہ ہوتے ہیں ان کا نور فطری باقی ہوتا ہے انہوں نے یوم میثاق کا وعدہ توڑا نہیں ہوتا لہٰذا وہ ہدایت کو قبول کرتے ہیں۔ ان کو تقوی کے ان کے مراتب کے مطابق مدارج حاصل ہوتے ہیں بس یہی تقوی مقدمہ ایمان ہے کیونکہ اسی میں شرک سے بچنا بھی ہے شرک سے اجتناب کے بغیر ایمان کا حصول نہیں۔

(از ابن عربی)

﴿ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰـھُمْ یُنْفِقُوْنَ ☆ وَالَّـذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ج وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ﴾

☆ وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں، اور نماز قائم رکھیں، اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں۔ اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا، اور آخرت پر یقین رکھیں۔

☆ اور وہ غیب پر ایمان لائے ہیں۔ اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو رزق ہم نے ان کو دیا اس سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ جو ایمان لائے ہیں اس پر (اے محبوب) جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو نازل کیا گیا، آپ سی پہلے، اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔"

متقین کی صفات: یہاں سے متقین کی صفات بیان کی گئی ہیں کہ متقی وہ لوگ ہیں۔ جو غیب پر ایمان لا چکے ہوں ہمیشہ کے لئے نماز ادا کرنے کے پابند ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو رزق دیا ہے اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ بھی کرتے ہیں اور جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا اس پر بھی ان کا ایمان ہو اور آپ سے پہلے انبیاء کرام پر جو نازل ہوا اس پر بھی ان کا ایمان ہو اور آخرت پر بھی کامل یقین رکھتے ہوں۔ یہ تمام متقین کی صفات اس وقت معتبر ہوں گی جب کہ یہ کہا جائے کہ متقی وہ ہوتا ہے جو نیکیوں پر عمل کرنے والا ہو اور برائیوں کو چھوڑنے والا ہو۔ فعل یا تو دل سے متعلق ہوگا یا ظاہری اعضاء سے دل سے جس فعل کا تعلق ہے وہ ﴿ اَلَّـذِیْنَ یُؤْمِـنُـوْنَ بِالْغَیْبِ ﴾ میں ذکر ہے اسی کے ضمن میں شرک کو چھوڑنا بھی ثابت ہوگا اور وہ فعل جن کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہے ان کی بنیاد نماز، زکواۃ اور صدقہ ہیں۔

اس لئے کہ عبادات یا بدنیہ ہیں ان میں اعلیٰ نماز ہے اور عبادات یا تو مالیہ ہیں ان میں سے اعلیٰ

زکوۃ ہے اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الصلوۃ عماد الدین" نماز دین کا ستون ہے اور ارشاد فرمایا "الزکوۃ قنطرۃ الاسلام" زکواۃ اسلام کا پل ہے۔ نماز کے ضمن میں بھی برائیوں کا چھوڑنا ثابت ہو جائے گا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے بچاتی ہے یہ قول اکثر حضرات کا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ سے لے کر هُمْ یُوْقِنُوْنَ تک متقین کی صفات ہیں اور متقین کی تفسیر ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف:

"والاقرب ان لا تکون ھذہ الاشیاء تفسیرا لکونھم متقین" (ماخوذ از کبیر)

زیادہ قریب بات یہ ہے کہ ان اشیاء کو متقین کی تفسیر نہ بنایا جائے اس لئے کہ کمال سعادت اس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک برائیوں کو نہ چھوڑے اور نیکیوں پر عمل نہ کرے۔ برائیوں وغیرہ کو چھوڑنا تقوی ہے اور فعل کا تعلق دل سے ہوا تو ایمان اور ظاہری اعضاء سے ہوا تو نماز، زکواۃ، تقوی کو پہلے ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ انسان کا دل تختی کی مثال ہے جس پر عقائد صحیحہ کے نقش ثابت کرنے ہیں وہ اس وقت تک نہیں منقش نہیں ہوں گے جب تک فاسد الفاظ سے تختی صاف نہیں ہوگی اسلئے واضح ہوا کہ تقوی یعنی غیر مناسب چیزوں کو چھوڑنا پہلے ہے اور مناسب چیزوں کو حاصل کرنا بعد میں ہے۔

ایمان کی تعریف:

"الایمان فی الشرع ھو التصدیق بما جاء به الرسول ﷺ من عند الله تعالیٰ"

شرع میں ایمان اس چیز کا نام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا اس کی تصدیق کرنا یعنی ایمان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہے میں اسے دل سے تسلیم کرتا ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت انبیاء کرام کی نبوت ملائکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق تمام آسمانی کتب، آخرت پر اجمالی طور پر ایمان کافی ہے۔

تفصیلی طور پر نماز، نماز کے اوقات، نماز کی رکعتیں وغیرہ کو جاننا ان پر عمل کرنا عملیات میں داخل ہو جائے گا۔

تصدیق کیا ہے؟ " التصديق اذعان حكم المخبر وقبوله وجعله صادقا "

تصدیق یہ ہے کہ خبر دینے والے کے حکم کو یقینی طور پر مان لینا جائے اور خبر دینے والے کو سچا ماننا۔ چونکہ ایمان تصدیق ہے ایمان کا لفظ امن سے ہے کہا جاتا ہے " امنت زيدا " میں نے زید کو امن دیا۔ تو گویا کہ ایمان کا مطلب ہوگا " آمن به آمنه التكذيب والمخالفة " فلاں پر ایمان لایا کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اسے تکذیب اور مخالفت سے امن دیا۔

لفظ ایمان کبھی بلا واسطہ متعدی ہوتا ہے جیسا کہ آمنہ لیکن اس میں معنی امن دینا ہے اور کبھی لام کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے جیسا کہ " وما انت بمؤمن لنا " اسی طرح کبھی باء کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے " ان تؤمن بالله " ان دونوں صورتوں میں ایمان بمعنی تصدیق کے ہوتا ہے۔

حدیث جبریل میں ایمان کی تعریف سے بھی واضح ہوگا کہ مطلب وہی ہے جو بیان کیا گیا کہ ایمان " التصديق بما جاء به الرسول من عند الله تعالىٰ " ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے جب سائل نے کہا " اخبرني عن الايمان " مجھے ایمان کے متعلق خبر دو۔ تو اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر وتؤمن بالقدر وشره " (بخاری ومسلم)

" کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاؤ اور تم ہر خیر وشر کی تقدیر پر ایمان لاؤ "

یہ بھی خیال رہے کہ صرف دل میں یہ آ جانا کہ خبر سچی ہے خبر دینے والا سچا یہ اس وقت تک تصدیق نہیں جب تک کہ اسے تسلیم نہ کیا جائے تصدیق کا معنی فارسی میں ہے " گرویدن " یعنی بغیر تکبر، بغیر عناد بغیر انکار کے تسلیم کر لینا۔

ملک المدرسین کا ارشاد: استاذ استاذی حضرت علامہ حافظ عطا محمد بندیالوی رحمہ اللہ فرماتے تھے

کہ منطق کے بغیر ایمان ہی نہیں ابھی علامہ تفتازانی رحمہ اللہ کا قول دیکھ کر یہ یاد آیا:

"وهو ای المعنی الذی یعبر عنه بگر ویدن معنی التصدیق المقابل التصور حیث یقال فی اوائل علم المیزان العلم اما تصور و اما تصدیق"

"تصدیق کا معنی جو "گرویدن" کیا ہے یہ وہی معنی ہے جو اس تصدیق کا ہے جو تصور کے مقابل ہے جس کا منطق کے ابتداء میں ذکر کیا جاتا ہے کہ علم یا تصور ہے یا تصدیق"

ملک المدرسین رحمہ اللہ کا قول واضح سمجھ آ گیا کہ ایمان بغیر تصدیق کے نہیں اور تصدیق منطق کا مسئلہ ہے مؤمن ہونے کا دعویٰ بھی ہو منطق کی مخالفت بھی ہو عقل سے بعید ہے راقم نے تو یہی سمجھا جن کو منطق آتی نہیں وہی مخالفت کرتے ہیں۔ ورنہ استاذی المکرم حضرت مولانا محمد اشرف سیالوی فرماتے ہیں۔ منطق کے بغیر مولوی خشی ہوتا ہے یعنی ادھورا مولوی ہوتا ہے۔ اکثر کتابوں کو نہیں سمجھ سکتا۔

(ماخوذ از شرح عقائد مع نبراس)

تصدیق کی چھ قسموں میں سے ایک مقبول:

سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ نے واں بھچراں میں مولوی حسین علی دیوبندی سے سوال کیا (جب وہ بڑے متکبرانہ انداز پر مناظرہ کا چیلنج کر رہا تھا) کہ مولوی صاحب آیت مبارکہ ﴿قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر آپ کا ایمان ہے؟ مولوی صاحب نے کہا جی ہاں آپ نے فرمایا ایمان نام ہے۔ "تصدیق بما جاء به النبی ﷺ" کا اور تصدیق کی چھ قسمیں ان میں سے ایک مقبول ہے اور پانچ مردودہ کیا کیا ہیں؟ پھر حضرت پیر صاحب نے تھوڑی سی وضاحت اور فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے علم "ما کان و مایکون" کے قائلین (جن کو وہ مولوی صاحب کافر کہتے تھے) آپ کے نزدیک اگر بالفرض مسلمان ہیں تو نزاع ہی نہیں اور اگر (تمہارے عقیدہ کے مطابق) وہ کافر ہیں تو کفر ایمان کی ضد ہے اور ایمان تصدیق ہے اور تصدیق چھ قسم ہے جن میں سے ایمان شرعی میں صرف ایک معتبر اور باقی مردود ہیں۔ ان کی آپ تفصیل بیان کریں کہ جو لوگ نبی کریم علیہ السلام کے علم "ما کان و مایکون" کے قائل ہیں آپ ان کو کافر کس وجہ سے کہتے ہیں وہ کون سی تصدیق پائی گئی ہے جس کی وجہ سے تم ان کو کافر کہہ رہے ہو۔ مولوی صاحب

جواب نہ دے سکے وہاں سے چلتے بنے۔ استاذ الاساتذہ، رئیس المحققین، استاذی المکرم حضرت علامہ محب النبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حضرت پیر صاحب نے متوسلین کی درخواست پر چھ قسموں کا ذکر فرمایا جن کا ماخذ حضرت شیخ اکبر رحمہ اللہ کی تصنیفات فتوحات مکیہ وغیرہ ہیں۔

(۱) **تصدیق بذاتہ** یعنی کسی صفت یا کسی دلیل کے بغیر ہی تسلیم کر لینا اور اس پر یقین رکھنا۔

(۲) **تصدیق بنعت ذاتہ** کسی صفت کو دیکھ کر اقرار کرنا اور تصدیق کرنا جیسا کہ کافروں سے زمین و آسمان کے خالق کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ کہتے ''خالق اللہ ہے'' رب تعالیٰ نے اسے ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ اگر آپ ان سے سوال کریں زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے ''اللہ'' (نے ہی پیدا کیا)۔

(۳) **تصدیق بحالہ** مثلاً ایک تکلیف پیش آئی جو خدا کا نام لینے سے ٹل گئی اس سے ایک حال پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے دل خود بخود (اس حال کی وجہ سے) تصدیق کرنے لگا۔

(۴) **تصدیق بربہ** یہ دیکھ کر کہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا رب ہے اس کی ربوبیت عامہ کو دیکھ کر تصدیق کر لی۔

(۵) **تصدیق بنعت ربہ** رب تعالیٰ کی ربوبیت خاصہ کو دیکھ کر تصدیق یعنی یہ خیال کرنا کہ مجھ پر رب تعالیٰ کا کتنا احسان ہے اور فلاں شخص پر کتنا احسان اس خاص ربوبیت کو دیکھتے ہوئے تصدیق کر لینا۔

(۶) **تصدیق بامر ربہ** اللہ تعالیٰ کے حکم کو ماننا اور اسی حکم کی وجہ سے تصدیق پائی جائے اور یقین کر لے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے مصطفےٰ کریم ﷺ نے پیش فرمایا ہے اسے تسلیم کرنا ہے یہی آخری تصدیق معتبر ہے اسی کا نام ایمان ہے پہلی تمام تصدیقات کفار کو بھی حاصل رہیں لیکن وہ مومن نہ بن سکے۔ (ماخوذ از مہر منیر ص ۴۴۰)

تنبیہ: اگر فرض کیا کہ کوئی شخص تصدیق کرتا ہے ان تمام امور کی جو نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کی طرف سے لائے اور زبان سے اقرار بھی کرتا ہے اور ان پر عمل بھی کرتا ہے لیکن کافروں کی خاص

کفریہ علامات کو اگر وہ بھی اپنے کام میں لاتا ہے تو اسے کافر کہا جائے گا جس طرح کوئی شخص اپنے اختیار سے بت کو سجدہ کرے اس میں کوئی جبر اکراہ نہیں پایا گیا تو اسے کافر ہی کہا جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے اپنے اختیار سے ''زنار'' باندھا تو اسے بھی کافر ہی کہا جائے گا (زنار بالضم والتشدید) یہ ایک دھاگہ ہوتا جو کافر لوگ اپنے آپ کی پہچان کرانے کے لئے گردن میں ڈالتے ہیں۔

الاقرار باللسان کا حکم: زبان سے ایمان لانا اور اقرار کرنا ایمان کے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے اس میں دو مذہب ہیں ایک یہ ہے کہ تصدیق بالقلب (دل سے تسلیم کرنا) کی طرح ہی اقرار باللسان بھی ایمان کا رکن ہے البتہ فرق یہ ہے کہ تصدیق ایسا رکن ہے جو کسی وقت بھی سقوط کا احتمال نہیں رکھتا لیکن اقرار اکراہ (جبر) کی صورت میں ساقط ہو جاتا ہے۔

یعنی جب کافر کو قتل کرنے یا کسی عضو کے کاٹنے کی دھمکی دے کر کلمہ کفر زبان پر جاری کرنے کا کہیں تو مؤمن اپنے آپ کو بچانے کی غرض سے کلمہ کفر زبان پر جاری کر دے تو اس کے لئے جائز ہے تاہم اگر صبر کرے اور اسے قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہوگا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ .... الخ ﴾

اس آیت کریمہ میں کفر کرنے پر عذاب عظیم کی وعید بیان کی گئی لیکن جبریہ طور پر کفر کو زبان پر لانے کو عذاب عظیم سے مستثنیٰ قرار دیا۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ رکن تو صرف تصدیق ہی ہے۔ البتہ اقرار کو دنیا میں احکام ایمان جاری کرنے کیلئے شرط قرار دیا گیا ہے کیونکہ تصدیق دل کا کام ہے اس پر اطلاع ممکن نہیں اسی لئے اگر کوئی ظاہری طور پر ایمان کا دعوی کرے تو اسے مؤمن کہا جائے گا خواہ اسکے دل میں ایمان نہ ہو۔ اگرچہ دل میں ایمان نہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں کافر ہوگا لیکن اس کے ظاہری ایمان کی وجہ سے مؤمن اسے صاحب ایمان ہی سمجھیں گے اسے کافر سمجھ کر قتل نہیں کریں گے۔ اسکے مال کے ایسے ہی محافظ ہوں گے جس طرح حقیقی مومن کے مال کے محافظ ہوں گے۔ اس کی نماز جنازہ ادا کریں گے اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کریں گے اگر کسی شخص کے دل میں تصدیق پائی جائے۔ لیکن زبان سے ایمان کا اقرار نہ کرے تو اس پر ایمان کے احکام دنیا میں جاری نہیں کیے جائیں

گے اگر چہ اللہ کے ہاں وہ مومن شمار ہوگا اعمال کے نہ کرنے کی اگر سزا دینا مشیت ایزدی میں ہوتو پھر بھی آخر کار اسے جنت میں داخل کر دیا جائے گا یہی مذہب حضرت شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا ہے۔

ایمان اور اسلام ایک کیسے؟ جب یہ لحاظ کیا جائے کہ اسلام کا معنی خضوع اور تسلیم کرنا ہے اور احکام کو قبول کرنا ان پر یقین کرنا ہے۔ تصدیق کا بھی یہی مطلب ہوگا اس معنی کے لحاظ پر ایمان اور اسلام ایک ہی ہیں اس پر یہ آیت دلالت کر رہی ہے:

﴿ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾

کیونکہ اس آیت میں لوط علیہ السلام کے ساتھ ان کے اہل جو مؤمن تھے ان کا ذکر کیا گیا ہے ان کو ہی مومن بھی کہا گیا ہے اور ان کو مسلمان کہا گیا ہے یہ مذہب اشاعرہ کا ہے۔

ایمان اور اسلام میں فرق کیسے؟ جب اسلام کا معنی صرف زبان سے اقرار کیا جائے۔ اور ظاہری طور پر تسلیم کرنا مراد لیا جائے اور ایمان کا معنی دل سے ماننا کیا جائے تو اب اسلام اور ایمان میں فرق ہوگا اس پر یہ آیت دلالت کر رہی ہے ﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا ﴾ اعراب نے کہا ہم نے ایمان لایا اے محبوب تم فرماؤ تم نے ایمان نہیں لایا لیکن تم کہو ''ہم نے اسلام لایا'' اسی طرح ایمان اور اسلام کی بھی علیحدہ علیحدہ تشریح کی گئی ہے۔

حدیث عمر میں رسول اللہ ﷺ نے جبرائیل کو سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے فرمایا جبریل نے کہا ''یامحمد اخبرنی عن الاسلام'' اے محمد ﷺ مجھے اسلام کے متعلق خبر دیں۔ تو آپ نے فرمایا:

'' اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ
وَتُؤْتِي الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً''

''تم یہ شہادت دو کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور تم نماز ادا کرو اور زکواۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو اور اگر تمہیں طاقت حاصل ہو تو بیت اللہ شریف کا حج کرو''

جب جبرائیل نے کہا ''فاخبرنی عن الایمان'' آپ مجھے ایمان کے متعلق خبر دیں تو آپ نے ارشاد فرمایا:

'' اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ

خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ"

"یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر قیامت کے دن پر اور خیر و شر کی تقدیر پر ایمان رکھو"

اس حدیث سے بھی پتہ چلا کہ ایمان تصدیق کا نام ہے اور اسلام ظاہری تسلیم اور اعمال کا نام ہے یہ مذہب ماتریدیہ کا ہے لیکن راقم کے نزدیک یہ اختلاف فقط معنی کے اعتبار کا ہے جب اسلام کا معنی انقیاد و اذعان (تسلیم کرنا، یقین کرنا) کیا جائے تو ایمان اور اسلام ایک ہوگا اور جب اسلام کا مطلب صرف تسلیم کرنا لیا جائے اور ایمان کا معنی یقین کرنا لیا جائے تو فرق ہوگا۔ اسلئے کبھی ایمان اور اسلام ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی علیحد علیحدہ معانی میں۔ (از شرح عقائد نبراس)

غیب کیا ہے: کلام عرب میں غیب کہتے ہیں "کل ماغاب عنک" (ہر وہ چیز جو تم سے غائب ہو) کو۔ اسی طرح سورج کے غروب ہونے پر بولتے ہیں "غابت الشمس اور تغیب الشمس اسی طرح وہ عورت جس کا خاوند اس سے غائب ہو جائے اسے "مغیبہ" کہا جاتا ہے اسی طرح پست زمین کو "غیبہ او غیابہ" کہا جاتا ہے اور گھنے جنگل کو "غیابہ" کہا جاتا ہے کہ ان میں انسان یا حیوان گم ہو جاتا ہے۔ (قرطبی)

غیب سے مراد: جو چیز حواس اور عقل میں نہ آ سکے اس میں کامل طور پر غیبت پائی جاتی ہے۔

غیب کی دو قسمیں:

(۱) غیب کی ایک قسم یہ ہے کہ اس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو سکے اسے ہی اللہ تعالیٰ نے مفاتح الغیب سے تعبیر فرمایا ارشاد باری تعالیٰ ہے "وعندہ مفاتیح الغیب لا یعلمها الا هو" غیب کی چابیاں اسی کے پاس ہیں۔ انہیں کوئی نہیں جانتا سوائے اس کے۔

(۲) اور دوسری قسم غیب کی وہ ہے جس پر دلیل قائم ہو سکے جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات اور نبوت اور اس سے متعلق احکام، شرائع، یوم آخرت اور اس کے احوال یعنی بعث، نشور، حساب، جزاء وغیرہ یہاں غیب سے مراد یہی قسم ہے۔ (روح البیان)

غیب کی ایک اور تقسیم: "واعلم ان الغیب غیبان غیب غاب عنک وغیب غبت عنه"
جان لے کہ بیشک غیب کی دو قسمیں ہیں ایک یہ ہے کہ جو تجھ سے غیب ہو اور دوسری یہ ہے کہ تو اس سے غائب ہو۔ پہلی قسم کا غیب یعنی جو تجھ سے غائب ہے وہ ہے عالم ارواح اس لئے کہ تو اس میں بحثیت روح کے موجود تھا جب رب تعالیٰ نے ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ (کیا میں تمہارا رب نہیں) کہا اس وقت بھی تو موجود تھا رب تعالیٰ کے خطاب کو سن رہا تھا آثار ربوبیۃ کا مشاہدہ کر رہا تھا ملائکہ موجود تھے انبیاء واولیاء کی ارواح کا تجھے تعارف کرایا گیا لیکن یہ سب کچھ تجھ سے غائب ہیں کیونکہ تیرے سامنے ظاہر تو وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کو تو عقل اور حواس سے پہچانے عقل اور حواس کا تعلق عالم اجسام سے ہے۔

دوسری قسم جس سے تو غیب ہے وہ رب تعالیٰ کی ذات ہے جو تیری شہ رگ سے بھی زیادہ تیرے قریب ہے رب تعالیٰ نے فرمایا "نحن اقرب الیه من حبل الورید" لیکن تو اس سے دور ہے یعنی وہ تجھے جانتا ہے کہ تو کہاں ہے لیکن تو نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے اس لئے کہ وہ مکان سے پاک ہے یہاں غیب کا یہی معنی ہے کہ تو رب تعالیٰ کو نہ جاننے کی وجہ سے اس سے دور ہے گویا کہ تو اس سے غیب ہے ورنہ رب تعالیٰ سے غیب ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (تاویلات نجمیہ حاشیہ جلالین)

اس مضمون کو شیخ سعدی رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا:

یار نزدیک تر از من بمن است ویں عجب ترکه من ازوے دورم (گلستان)
میرا یار مجھ سے بھی میرے زیادہ نزدیک ہے لیکن تعجب اس پر ہے کہ میں اس سے دور ہوں

تنبیہ: غیب کی پہلی تقسیم میں پہلی قسم جو بیان کی گئی کہ جس پر کوئی دلیل قائم نہ کی جا سکے۔ اسکے متعلق تفسیر صاوی میں ذکر ہے "وما لم یدل علیه دلیل کالساعة ووقت نزول المطر ومافی الارحام......الخ" غیب کی وہ قسم جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو سکے اس کی مثال قیامت، بارش کے نازل ہونے کا وقت، ماں کے پیٹ میں کیا ہے کسی کی موت کہاں آئے گی اور کل کیا ہوگا۔ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کو رب تعالیٰ نے "مفاتیح الغیب" سے تعبیر فرمایا ہے لیکن انکا علم ذاتی طور پر تو کسی کو حاصل نہیں البتہ رب تعالیٰ کی عطاء سے نبی کریم ﷺ کو انکا بھی علم حاصل ہے مشکوۃ کی شرح اشعۃ اللمعات

میں دوسری ہی حدیث کی شرح کو دیکھیں۔ مزید وضاحت انشاءاللہ کسی اور جگہ پر ذکر ہوگی۔

ایمان بالغیب: غیب پر ایمان کا مطلب کیا ہے یہاں تین چیزیں معتبر ہیں یہ تینوں کا مجموعہ مراد لیا گیا ہے:

(۱) جب ''بالغیب'' کو بواسطہ حرف جر "یؤمنون" کا مفعول بنایا جائے اور ''باء'' کو تعدیت کے لئے مانا جائے تو اب معنی یہ ہوگا "یؤمنون بماهو غائب عنهم" اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ان سے غائب ہے۔ یعنی اس صورت میں غیب صفت ہے "مؤمن به" (جس چیز پر ایمان لانا ہے) کی نہ کہ مؤمن (ایمان لانے والے) کی اسی طرح جب ''باء'' مصاحبۃ کی ہو تو اس صورت میں بھی غیب سے مراد "مؤمن به" ہوگا یعنی جس چیز پر ایمان ہے وہ غائب ہے۔ (بیضاوی ،شیخ زادہ)

وہ کیا چیز غائب ہے جس پر ایمان لانا متقین کی صفت ہے؟ اس میں مختلف قول ہیں لیکن وہ تمام ہی مراد ہیں بعض نے کہا غیب سے مراد ''قضاء وقدر'' ہے یعنی تقدیر پر ایمان رکھنا ایمان بالغیب ہے۔ بعض نے کہا اس سے مراد قرآن پاک اور اس میں جو غیوب مذکور ہیں یعنی قرآن پاک اور اس میں غیبی علوم جن کا ذکر ہے ان پر ایمان رکھنا ایمان بالغیب ہے۔

بعض نے کہا ہر وہ چیز جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے لیکن وہ لوگوں سے غیب ہیں ان تمام پر ایمان لانا، ایمان بالغیب ہے جیسا کہ علامات قیامت، عذاب قبر، حشر و نشر، صراط (پل صراط) میزان اور جنت و دوزخ پر ایمان لانا۔

" قال ابن عطية وهذه الاقوال لاتتعارض بل يقع الغيب على جميعها " ابن عطیہ نے کہا کہ ان تمام اقوال میں کوئی تعارض (اختلاف) نہیں بلکہ تمام پر غیب کا بولا جانا صحیح ہے اور تمام ہی ایمان بالغیب میں داخل ہیں۔ (از قرطبی)

تنبیہ: اللہ تعالیٰ غیب ہے یا نہیں؟ بعض حضرات نے کہا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا بھی ایمان بالغیب ہے بعض حضرات نے کہا کہ اللہ تعالیٰ پر غیب کا اطلاق صحیح نہیں۔ اصل میں یہ اختلاف اس پر مبنی ہے کہ غیب کیا ہے بعض نے کہا غیب اسے کہا جاتا ہے کہ جو وقتی طور پر تو سامنے نہ ہو لیکن سامنے ہو سکے اس لحاظ

پر تو اللہ تعالیٰ اور اسکی صفات غیب نہیں کیونکہ دنیا میں عام آدمیوں کے سامنے آنے کا تصور نہیں۔

لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہ قید لگانی "کہ غیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ سامنے بھی آ سکے" درست نہیں کیونکہ متکلمین حضرات فرماتے تھے "**ھذا من باب الحاق الغائب بالشاھد**" اس غائب سے مراد وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات لیتے ہیں لہذا صحیح قول یہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لانا بھی ایمان بالغیب ہی ہے۔ (از کبیر)

اس اختلاف کی ایک اور وجہ بھی ہے کہ بعض حضرات نے غیب اور غائب میں فرق بیان کیا ہے کہ غیب وہ ہے "**مالا تراہ انت**" جسے تو نہ دیکھ سکے اور غائب وہ ہے "**مالا یراک ولا تراہ**" جو تجھے نہ دیکھ سکے اور تو اسے نہ دیکھ سکے۔ اس معنیٰ کے لحاظ پر اللہ تعالیٰ پر غیب کا اطلاق صحیح ہے لیکن غائب کا اطلاق صحیح نہیں۔ (از روح المعانی)

لیکن راقم کے نزدیک یہ فرق کرنا کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا اس لئے کہ غیب مصدر کو معنی للفاعل ماننے سے خود بخود غیب بمعنی غائب ہی ہوگا صحیح وجہ وہ ہی جو کبیر سے بیان کر دی۔

(۲) اگر "بالغیب" کو "ملتبسین" مقدر کے متعلق کر کے حال بنایا جائے تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا "**انھم لیؤمنون غائبین عنکم لا کالمنافقین**" یعنی متقین وہ لوگ ہیں جو بیشک ایمان لاتے ہیں تم سے غائب ہو کر بھی منافقوں کی طرح نہیں کہ "**واذا لقوا الذین آمنوا قالوا آمنا**" ایمان والوں سے ملیں تو کہیں کہ ہم ایمان لائے اور "**واذا خلوا الی شیاطینھم قالوا انامعکم**" کافروں سے ملیں تو کہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

(۳) بعض حضرات نے کہا کہ غیب سے مراد قلب (دل) ہے کیونکہ وہ بھی مستور ہوتا ہے اب معنی یہ ہوگا "**یؤمنون بقلوبھم لا کمن یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم**" کہ وہ دل سے ایمان لاتے ہیں ان لوگوں (منافقین) کی طرح نہیں جو منہ سے کہتے ہیں اور دل سے نہیں مانتے۔

حاصل کلام: اب تک کی گئی بحث سے حاصل یہ ہوا کہ متقین کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ وہ دل سے ظاہر طور پر یعنی لوگوں کی موجودگی میں اور غیب طور پر یعنی لوگوں کی غیر موجودگی میں

ہراس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جن کا نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا ہے بیشک انہیں وہ نظر آ رہیں۔

فائدہ: ایمان کی دو قسمیں ہیں تقلیدی اور تحقیقی پھر تحقیقی کی دو قسمیں ہیں استدلالی اور کشفی پھر یہ دونوں یعنی استدلالی اور کشفی علم کی کسی حد پر رکتے ہیں یا نہیں۔ استدلالی جو علم کی ایک حد تک رک جائے اسے علم الیقین کہتے ہیں کشفی جو علم کی ایک حد تک رک جائے اس کی پھر دو قسمیں ہیں عینی جو آنکھوں سے نظر آئے یعنی مشاہدہ کیا جائے پھر مانا جائے یہ عین الیقین ہے ایک اور قسم ہے حقی جسے شہود ذاتی کہا جاتا ہے وہ چیز بذاتہ خود حاضر ہو جائے اسے حق الیقین کہا جاتا ہے۔

یہ علوم غیبیہ نہیں کہلاتے بلکہ غیبیہ وہ ہیں جو کسی حد پر نہ رکیں ان کا تعلق دل سے ہے مشاہدہ سے نہیں پھر دل کو یہ علوم غیبیہ اس وقت حاصل ہوں گے جب وہ سعادات کی طرف میلان کرتے ہوئے صرف سعادات باقیہ کی طرف میلان کرے سعادات بدنیہ خارجیہ جو انسان کو دنیا کی طرف بھی مشغول کر دیں ان سے احتراز حاصل ہو۔

(از ابن عربی)

ایمان بالغیب کی افضلیت پر احادیث:

"عن عبد الرحمن بن یزید قال کنا عند عبد اللہ بن مسعود جلوسا فذکرنا اصحاب النبی ﷺ وماسبقونا بہ فقال عبد اللہ ان امر محمد ﷺ کان بینا لمن راہ والذی لا الہ غیرہ ما آمن احد قط ایمان افضل من ایمان بغیب ثم قرأ الم ذلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب الی قولہ المفلحون ...... وھکذا رواہ ابن ابی حاتم وابن مردویہ والحاکم فی مستدرکہ من طرق عن الاعمش بہ وقال الحاکم صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ" (ابن کثیر)

"عبدالرحمٰن ابن یزید نے کہا کہ ہم عبداللہ ابن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ہم نے نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرام اور اپنے سے پہلے گزرے ہوئے حضرات کا ذکر کیا تو عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جن لوگوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہے ان کے سامنے تو آپکا معاملہ بہت واضح تھا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں کسی شخص کا ایمان اسکے ایمان سے افضل نہیں جس کا ایمان بالغیب

ہو پھر آپ نے اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے " الٓمّ ذٰلِکَ الْکِتَابُ " سے لے کر " اُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ " تک آیات کو پڑھا"

کیونکہ ان آیات میں ایمان بالغیب کی فضیلت بیان کی گئی ہے:

☆ " عن بن محیریز قال قلت لابی جمعة حدثنا حدیثا سمعته من رسول الله ﷺ قال نعم احدثک حدیثا جیدا تغدینا مع رسول الله ﷺ ومعنا ابو عبیدة بن الجراح فقال یارسول الله هل احد خیر منا اسلمنا معک وجاهدنا معک قال نعم قوم من بعدکم یؤمنون بی ولم یرونی " (ابن کثیر)

ابن محیریز نے کہا میں نے ابو جمعہ کو کہا کہ ہمیں کوئی حدیث بیان کریں جو تم نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو انہوں نے کہا ہاں میں تمہیں ایک عمدہ حدیث (جسے تم تابعین یقیناً زیادہ پسند کرو گے) بیان کرتا ہوں ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں صبح کا کھانا کھایا ہمارے ساتھ ابو عبیدہ ابن جراح بھی تھے انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا ہم سے بھی بہتر کوئی ہوگا کہ ہم نے آپ کی موجودگی میں اسلام قبول کیا آپ کی معیت میں جہاد کیا؟ آپ نے فرمایا ہاں (تم سے بہتر) وہ قوم ہے جو مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔

" عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال قال رسول الله ﷺ ای الخلق اعجب الیکم ایمانا قالوا الملائکة قال ومالهم لایؤمنون وهم عند ربهم قالوا فالنبیون قال ومالهم لایؤمنون والوحی ینزل علیهم قالوا فنحن قال ومالکم لاتؤمنون وانا بین اظهرکم قال فقال رسول الله ﷺ الا ان اعجب الخلق الیّ ایمانا لقوم یکونون من بعدکم یجدون صحفافیها کتاب یؤمنون بما فیها " (ابن کثیر)

" عمرو ابن شعیب اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم مخلوق میں سے کس کے ایمان پر تعجب کرتے ہو صحابہ کرام نے عرض کیا فرشتوں کے ایمان پر آپ نے فرمایا کہ انہیں کیا تھا کہ وہ ایمان نہ لائے جب کہ وہ اپنے رب تعالیٰ کے حضور تھے پھر صحابہ کرام نے عرض کیا کہ انبیاء کرام کے ایمان پر آپ نے فرمایا کہ انہیں کیا تھا کہ وہ ایمان نہ لاتے جب ان کے پاس وحی نازل ہوتی پھر صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم ہوں گے (یعنی ہمیں اپنے ایمان لانے پر تعجب ہے) آپ نے فرمایا

تمہیں کیا تھا کہ تم ایمان نہ لاتے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں راوی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خبردار بیشک سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں کے ایمان پر ہے جو میرے بعد ہوں گے صرف قرآن کو کتابی شکل میں دیکھ کر اس کے احکام پر ایمان لے آئیں گے''۔

تنبیہ: یہ خیال رہے کہ کسی غیر صحابی کو صحابی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں کیونکہ حالت ایمان میں ایک لحہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گزارنا پھر اسی پر دنیا سے رخصت ہونا تمام عبادات سے عظیم تر ہے ہاں البتہ بعد میں آنے والوں کا ایمان لانا جب کہ نبی کریم ﷺ کو دیکھا نہیں آپ کے معجزات وکمالات کو نہیں دیکھا یہ باعث تعجب ہے درحقیقت یہ بھی کمال میرے پیارے مصطفی ﷺ کا ہی ہے کہ تا قیامت آپ سے محبت کرنے والے آپ کی ذات پر گرویدہ رہیں گے نہ دیکھنے کے باوجود ایمان لائیں گے ان کا اس طرح ایمان لانا یقیناً قابل تعریف ہے۔

نتیجہ یہ نکلا: نبی کریم ﷺ نے جو تعلیم فرمائی جو ہدایت دی اس کے مطابق ہی ایمان لانا ایمان بالغیب ہوا آپ کی تعلیمات سے ہٹ کر کسی چیز کو صرف عقل سے ماننے کا نام ایمان ہی نہیں۔ ایمان بالغیب تو بعد کی بات ہے۔

"**ویقیمون الصلوۃ**" یہاں سے متقین کی دوسری صفت بیان کی جارہی ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ پہلی صفت بیان کی وہ ایمان بالغیب رکھتے ہیں یعنی ایمان تمام اعمال کے لئے اصل ہے کیونکہ ایمان کے بعد ہی اعمال کی کوئی حیثیت ہوسکتی ہے:

" من اخل بالاعتقاد وحده فهو منافق ومن اخل بالاقرار فهو كافر ومن اخل بالعمل فهو فاسق "

جس شخص نے زبان سے تو اقرار کیا لیکن اعتقاد نہ رکھا وہ منافق ہے، جس نے اقرار ہی نہیں وہ کافر ہے خواہ دل میں اعتقاد بھی نہ ہو اور زبان سے اقرار بھی نہ ہو وہ عند اللہ بھی کافر ہے اور دنیاوی احکام کے لحاظ سے بھی کافر ہے خواہ دل میں اعتقاد ہو لیکن زبان سے اقرار نہ ہو وہ بھی دنیاوی احکام کے لحاظ سے تو کافر ہی ہے البتہ عند اللہ مؤمن ہوگا تاہم اقرار نہ کرنے کی وجہ سے اور اعمال کے نہ پائے جانے کی وجہ سے درجہ فسق میں ضرور ہوگا۔ اور اگر زبان سے اقرار بھی ہو دل میں اعتقاد بھی صرف اعمال میں کوتاہی کرتا ہو تو اسے فاسق کہا جائے گا۔

اقامۃ الصلوۃ کے چند معانی: (۱) اگر یہ لفظ مراد لیا جائے " اقام العود " سے (لکڑی کو درست کرنا) تو اس وقت معنی ہوگا نماز ادا کرتے وقت تعدیل ارکان سے صحیح طور پر ادا کرنا نماز کے فرائض، سنن، مستحباب میں خلل نہ واقع ہونے دینا۔

(۲) اگر یہ ماخوذ ہو " قامت السوق " سے تو اس صورت میں معنی مراد ہوگا ہیشگی کرنا، یعنی متقین کی ایک علامت یہ ہے وہ نماز ہمیشہ پابندی سے ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ اور وہ لوگ اپنی نمازوں پر محافظت رکھتے ہیں اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ وہ لوگ اپنے نمازیں ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔ اسی معنی پر دلالت کر رہے ہیں۔

قامت السوق اسی وقت بولتے ہیں جب بازار جاری ہو کیونکہ قامت السوق کا عربی میں معنی "نفقت السوق" کرتے ہیں جو کاسد کا مد مقابل لفظ ہے یعنی نفق میں جاری ہونا جید ہونا اور کاسد کا معنی کھوٹا ہونا۔ گویا کہ جب نمازوں پر ہیشگی کرے گا تو اس کا عمل جاری رہے گا اور جب نمازوں کو ضائع کرے گا تو اس کا عمل کھوٹا ہوگا۔

(۳) کہا جاتا ہے " قامت الحرب علی ساقها " جنگ بھرپور جاری ہے اس کے مقابل لفظ استعمال ہوتا ہے " قعد عن الامر " اس نے اپنے معاملات میں سستی کر دی۔ اس معنی کے لحاظ سے مطلب ہوگا کہ وہ نماز ادا کرنے مین چستی سے کام لیتے ہیں کوئی سستی نہیں کرتے۔ (از کبیر)

تمام معانی کو جامع عبارت:

" ویقیمون الصلوۃ ای یداومون علیها فی مواقیتها بحدودها و اتمام ارکانها و حفظها من ان یقع فیها خلل فی فرائضها وسننها و آدابها " (خازن، و کذا فی معالم التنزیل)

وہ نماز قائم کرتے ہیں یعنی تمام نمازوں کو اپنے اپنے اوقات میں ہمیشہ ادا کرتے ہیں ان کی حدود کا لحاظ کرتے ہیں یعنی اس طرح نماز ادا کرتے ہیں جیسا کہ نماز ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں نماز کے ارکان کو مکمل طور پر ادا کرتے ہیں اور نماز کے فرائض، سنن اور مستحبات میں کوئی خلل واقع نہیں ہونے دیتے۔

صلوۃ کے معانی: راقم کو خوب یاد ہے جب کہ راقم جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور میں زیر تعلیم تھا۔

ایک مرتبہ جامعہ میں حضرت قمر الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی رحمہ اللہ تشریف لائے۔ راقم کے استاذ مکرم حضرت مولانا محمد اشرف مدظلہ العالی آپکے مرید ہونے کے وجہ سے سیالوی کہلاتے ہیں۔ استاد محترم وہاں جامعہ میں اس وقت مدرس تھے۔ حضرت قمر الاسلام کی آمد پر استاذی المکرم حضرت مولانا مفتی محمد حسین رحمہ اللہ مہتمم جامعہ نعیمیہ نے تمام طلباء کوایک جگہ جمع کر کے حضرت کی زیارت اور آپ کے ارشادات گرامی کو سننے کا اہتمام فرمایا۔ اس مختصر خطاب میں حضرت قمر الاسلام رحمہ اللہ نے فرمایا ''صلوۃ'' کے بیاسی معانی مجھے یاد ہیں۔ سبحان اللہ! کتنی عظیم علمی شخصیت تھی آپ بالواسطہ میرے استاذ مکرم بھی ہیں اور میرے مرشد بھی کیونکہ استاذی المکرم آپ کے شاگرد بھی ہیں اور مرید بھی راقم گولڑوی ہونے کی وجہ سے بالواسطہ سیالوی بھی ہے۔

یہاں راقم قرطبی سے چند معانی نقل کر رہا ہے:

(۱) صلوۃ بمعنی دعاء ...... نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ '' **اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب فان کان مفطرا فلیطعم و ان کان صائما فلیصل** '' جب کسی شخص کو طعام کی دعوت دی جائے تو وہ قبول کرے اگر روزہ دار نہیں تو کھانا کھالے اور اگر روزہ دار ہے تو (اس شخص کیلئے) دعاء کرے۔ بعض حضرات نے اس حدیث پاک میں ''**فلیصل**'' کا معنی یہ کیا ہے کہ اس کے گھر دو رکعت نفل ادا کر کے لوٹ آئے۔ اسی طرح قرآن پاک میں ''**وصل علیھم**'' بھی دعا کے معنی میں استعمال ہے۔

(۲) صلوۃ بمعنی نماز ...... قرآن پاک میں اس معنی میں بہت جگہ استعمال ہے۔ ''**واقیموا الصلوۃ**'' نماز قائم کرو۔

(۳) صلوۃ بمعنی رحمت ...... جیسا کہ حدیث شریف میں ہے ''**اللھم صل علی محمد**...... الخ'' اے اللہ محمد ﷺ پر رحمت بھیج۔

(۴) صلوۃ بمعنی عبادت ...... جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿وَمَا كَانَ صَلوٰتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ﴾ یہاں صلوۃ بمعنی عبادت ہے۔

(۵) صلوۃ بمعنی نوافل ...... ''**وامر اھلک بالصلوۃ**'' یہاں صلوۃ نوافل ادا کرنے کے معنی

میں استعمال ہے۔

(۶) صلوۃ بمعنی تسبیح...... " فلولا انہ کان من المسبحین " اس آیت میں اگرچہ تسبیح بمعنی صلوۃ کے استعمال ہے لیکن اسی طرح صلوۃ کا معنی بھی تسبیح آیا ہوا ہے۔

(۷) صلوۃ بمعنی قراءت...... جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "ولا تجھر بصلوتک" اس مقام پر صلوۃ قراءۃ کے معنی میں استعمال ہے۔

(۸) صلوۃ بمعنی تحریک الصلوین...... نماز پڑھتے ہوئے رکوع وغیرہ میں جاتے ہوئے انسان چونکہ اپنی ٹانگوں وغیرہ کو ہلاتا ہے۔

کیونکہ تحریک الصلوین کا زیادہ مشہور معنی سرین کے دوطرفوں کو ہلانا لیکن صحیح یہ ہے کہ ران سے لے کر ٹخنے تک تمام ٹانگ کو شامل ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے گھوڑ دوڑ میں دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو مصلی کہا جاتا ہے گویا کہ پہلے نمبر والے گھوڑے کے پچھلے حصہ پر دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کا سر ہوتا ہے۔

(۹) صلوۃ بمعنی دم کی اصل...... جب صلوۃ کا لفظ "صلا" سے ماخوذ ہو تو معنی یہ ہوگا "مغرز الذنب من الفرس" گھوڑے کی دم جہاں سے شروع ہوئی، اسی معنی کے لحاظ پر بھی دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو مصلّی کہا جائے گا کہ اس کا سر اگلے گھوڑے کی دم کی اصل پر ہوتا ہے۔

اسی معنی کے لحاظ سے صلوان کا معنی اثنان آتا ہے اسی معنی پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی دلالت کر رہا ہے "سبق رسول اللہ ﷺ وصلی ابوبکر وثلث عمر" رسول اللہ ﷺ سبقت لے گئے دوسرے مرتبہ پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رہے اور تیسرے مرتبہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔

اس ارشاد گرامی میں "صلی" دوسرے مرتبہ پر آنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلے تشریف فرما تھے آپ کے تشریف لے جانے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے آپ کے تشریف لے جانے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔

(۱۰) بمعنی لازم پکڑنا لفظ بولا جاتا ہے "صلی بالنار" اس نے آگ کی حرارت کو لازم پکڑا۔ چونکہ نمازی بھی عبادت کو اس طریقہ پر لازم پکڑتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا

اس لئے اسے مصلی کہا جاتا ہے۔

(۱۱) بعض حضرات نے کہا یہ ماخوذ ہے "صلیت العود بالنار" سے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب لکڑی کو آگ سے نرم کیا جائے اور پھر اسے سیدھا کیا جائے۔ چونکہ نمازی بھی رب تعالیٰ کی محبت کی حرارت سے اپنے آپ کو گرم کرتا اور نرم کرتا ہے اس طرح وہ سیدھی راہ پر قائم رہتا ہے لہٰذا اسے مصلی کہا جاتا ہے۔

(از قرطبی)

(۱۲) ازالہ حرارت کہا جاتا ہے "صلی الرجل" یعنی اس شخص نے اپنے نفس سے "صلاء" کو اس عبادت کے ذریعے زائل کر دیا "صلاء" جہنم کی بھڑکائی ہوئی آگ کو بھی کہا گیا۔

(۱۳) صلوۃ بمعنی مقام عبادت جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ ﴾

اس مقام صلوات عبادت کے مقامات پر بولا گیا ہے۔

فائدہ: مقام مدح میں صلوۃ کے ساتھ اقامت کا ذکر ہے "یقیمون الصلوۃ ...... واقیموا الصلوۃ ...... والمقیمین الصلوۃ" یہ مومنین کی شان میں الفاظ مبارکہ ہیں کہ وہ نماز کو ان کے حقوق کا لحاظ کرتے ہوئے ادا کرتے ہیں اور جہاں صرف صلوۃ کا ذکر ہے وہاں منافقین کا ذکر ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ اسی طرح فرمایا ﴿وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى ﴾ یہی وجہ ہے کہ روایت میں آتا ہے "ان المصلین کثیر والمقیمین لھاقلیل" بیشک نمازی تو بہت ہیں لیکن نماز کے قائم کرنے والے کم ہیں۔

(مفردات راغب)

یہاں نماز سے کون سی نماز مراد ہے؟

" واختلف فی المراد بالصلوۃ ھنا فقیل الفرائض وقیل الفرائض والنوافل معا وھو الصحیح لان اللفظ عام والمتقی یاتی بھما " (قرطبی)

اگرچہ اختلاف تو ہے کہ بعض حضرات نے کہا اس نماز سے مراد فرض نماز ہے اور بعض نے کہا مراد عام ہے فرائض اور نوافل دونوں ہی مراد ہیں اور یہی صحیح قول ہے کیونکہ اس مقام پر متقین کی علامات کا ذکر

ہو رہا ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں چونکہ متقین فرائض اور نوافل دونوں عبادات ہی کرتے ہیں بلکہ اعلیٰ تقویٰ ہے ہی یہ کہ فرائض کے ساتھ نوافل بھی ادا کئے جائیں۔

نماز کی افضلیت پر احادیث مبارکہ:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ الصلوات الخمس والجمعة الى الجمعة ورمضان الى رمضان مكفرات لما بينهن اذا اجتنبت الكبائر "

(مسلم، مشكوة كتاب الصلوة)

" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ نمازیں اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک درمیان والی خطاؤں کو مٹا دیا جاتا ہے بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے"

وضاحت حدیث: نماز ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے صغیرہ گناہوں کو معاف فرماتا ہے ایک جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد دوسرے جمعہ کی نماز ادا کرنے پر درمیان والے دنوں کے صغیرہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں ایک رمضان کے روزے رکھنے کے بعد دوسرے رمضان کے روزے رکھنے سے درمیان والے وقت کے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ لیکن کبیرہ گناہوں سے اجتناب ضروری ہے کبیرہ گناہ صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں عبادات سے نہیں۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَائِرَ مَاتُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ اگر تم کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو گے جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہاری سیآت (صغیرہ گناہوں) کو معاف کر دیں گے۔ یعنی مراد یہ ہے:

" ان ما بينهن من الذنوب كلها مغفور الا الكبائر لايكفرها الا التوبة اوفضل الله تعالىٰ "

(مرقاة ج ۲ ص ۱۱۰)

یعنی ان عبادات سے درمیانی اوقات سے صغائر گناہ تو معاف ہوں گے لیکن کبیرہ گناہ صرف توبہ سے یا اللہ تعالیٰ کے فضل سے معاف ہوسکیں گے۔

☆ " عن ابی هريرة قال رسول الله ﷺ ارأيتم لو ان نهرا بباب احدكم يغتسل فيه كل يوم خمسا هل يبقى من درنه شئى قالوا لايبقى من درنه شئى قال فذلك مثل الصلوات الخمس يمحو الله بهن الخطايا " (بخارى، مسلم، مشكوة)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم مجھے خبر دو بیشک کسی ایک شخص کے دروازہ پر نہر ہو وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ غسل کرے کیا اس کی میل (اس کے جسم پر) باقی رہ جائے گی؟ صحابہ کرام نے کہا (اس کے جسم پر) کوئی میل باقی نہیں رہے گی آپ نے فرمایا پانچ نمازوں کی یہی مثال (ہر روز جو شخص پانچ نمازیں ادا کرتا ہے) اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اس کے (صغیرہ) گناہ مٹا دیتا ہے۔

وضاحت حدیث: حدیث شریف میں لفظ استعمال ہوا ہے '' ارأیتم '' اس کا معنی ہے اخبرونی مجھے خبر دو اس طرح مشبہ بہ میں ''کل یوم '' (ہر دن) لفظ استعمال ہوا ہے لیکن مشبہ میں مراد '' کل یوم ولیلة '' ہے یعنی ہر دن رات میں پانچ نمازیں جو ادا کرے۔ اصل قانون ہی یہ ہے کہ جس کو تشبیہ دی جائے (مشبہ) اور جس سے تشبیہ دی جائے (مشبہ بہ) کا جمیع وجوہ میں برابر ہونا ضروری نہیں بلکہ بعض وجوہ سے تشبیہ کافی ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں گناہوں کو میل سے تشبیہ دی گئی کیونکہ گناہ انسان کے ظاہر اور باطن کو مکدر کر دیتے ہیں گویا کہ گناہ میل سے بھی زیادہ گندے ہوتے ہیں اس لئے کہ میل تو صرف ظاہر کو آلودہ کرتی ہے لیکن گناہ ظاہر اور باطن دونوں کو ہی آلودہ کر دیتے ہیں۔

نماز کو نہر کے صاف اور شفاف پانی سے تشبیہ دی گئی۔ یعنی جس طرح جاری نہر کا صاف اور شفاف پانی میل کو دور کرتا ہے اسی طرح نماز انسان کے گناہوں کی گندگی کو دور کرتی ہے بلکہ نماز میں فوقیت (بلندی کمال) یہ پائی گئی کہ نماز ظاہر اور باطن کو صاف اور پاک کرتی ہے جب کہ پانی صرف ظاہر کو صاف اور پاک کرتا ہے۔ (از مرقاۃ)

سبحان اللہ اے مسلمان! تو کتنا خوش بخت ہے کہ نماز فرض ہونے کے باوجود صرف تیرے ذمہ قرض کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ تجھے بلند مرتبہ عطا کرتی ہے اور کمالات کی بلندی عطا کرتی ہے۔ اور گناہوں سے پاک کرتی ہے۔

☆ '' وعن انس قال جاء رجل فقال یارسول اللہ انی اصبت حدا فاقمه علی قال ولم یساله عنه وحضرت الصلوة فصلی مع رسول اللہ ﷺ فلماقضی النبی ﷺ الصلوة قام

الرجل فقال یارسول اللہ انی اصبت حدا فاقم فی کتاب اللہ قال الیس قد صلیت معنا قال نعم قال فان اللہ قد غفرلک ذنبک اوحدک" (بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب الصلوۃ)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص آیا اس نے کہا یارسول اللہ میں نے حد کو پالیا ہے آپ پر مجھ پر حد قائم کردیں۔ آپ نے اس سے کچھ نہ پوچھا یہاں تک کہ نماز کا وقت ہوگیا اس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں نماز ادا کی جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو وہی آدمی پھر کھڑا ہوا عرض کیا یارسول اللہ میں نے حد کو پالیا آپ اللہ کی کتاب کے مطابق مجھے حد لگادیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی؟ اس نے کہا ہاں (یارسول اللہ نماز تو آپ کے ساتھ ادا کی) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے گناہ کی مغفرت کردی ہے راوی کو شک ہے کہ یا آپ نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری حد کو معاف کردیا۔

وضاحت حدیث: صحابی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں نے وہ گناہ کرلیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر حد لگائی جاسکتی ہے لیکن یہ صحابی کی اپنی سوچ تھی کہ انہوں نے صغیرہ گناہ کو قابل حد سمجھ لیا تھا۔ "ولم یسأله" نبی کریم ﷺ نے اس صحابی سے سوال ہی نہیں کیا کہ تم نے جرم کیا کیا ہے آپ کے نہ پوچھنے کی یہ وجہ تھی "لانه علیه السلام عرف ذنبه وغفرانه بطریق الوحی" بیشک نبی کریم ﷺ نے اس کے گناہ اور مغفرت کو وحی کے ذریعے پہچان لیا تھا۔

یعنی بہت واضح بات ہے کہ صحابی نے اپنے کسی صغیرہ گناہ (بغیر شہوت بوسہ وغیرہ کو) کبیرہ سمجھا اور خیال کیا کہ شائد یہ حد لگانے کا سبب ہے لیکن نبی کریم ﷺ کے دل میں رب تعالیٰ کی طرف سے القاء کردیا گیا کہ اس کا گناہ صغیرہ ہے یہ تو آپ کے ساتھ نماز ادا کرنے سے معاف کردیا جائے گا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور وجہ بیان کی ہے کہ صغائر جس طرح نیکیوں سے معاف کردیئے جاتے ہیں "وکذا ماخفی من الکبائر" اسی طرح جو مخفی کبائر ہیں ان کو بھی نیکیوں کے ذریعے مٹادیا جاتا ہے اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اس شخص اس کے جرم کے متعلق وضاحت نہیں طلب کی ہوگی تاکہ یہ مخفی رہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم بھی عام ہے "ان الحسنات یذهبن السیاٰت" بیشک نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی عام ہے

"اتبع السیئة الحسنة تمحها" کہ گناہ ہوجائے تو اس کے بعد نیک عمل کر دتا کہ وہ گناہ مٹ جائے "واما ماظهر منها وتحقق عند الحاكم فليس يسقط حدها الا التوبة" لیکن جو گناہ کبیرہ ظاہر ہوجائے یا حاکم کے پاس وہ ثابت ہوجائیں ان کی حد سوائے توبہ کے ساقط نہیں ہو سکتی۔

(مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۲)

راقم کے نزدیک قاضی عیاض رحمہ اللہ کے ان آخری الفاظ سے مطلب اخذ کرتے ہوئے اگر اس طرح بیان کیا جائے کہ پہلے قول کے مطابق ہی یہ بھی ہوجائے تو زیادہ مناسب ہے۔ گویا کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا کہ صغائر تو نیکیوں سے معاف ہوجاتے ہیں لیکن کبائر جو قابل حد ہیں جب وہ مخفی ہوں تو حاکم ان کو ظاہر کرنے اور کریدنے سے اجتناب کرے اور اس شخص کی نیکیوں کی وجہ سے اس سے حد ساقط رہے گی کیونکہ حد کے ثابت کرنے کے لئے جرم کا ثابت ہونا ضروری جرم مخفی رہا لہٰذا حد ساقط رہی۔ اگر کبیرہ ظاہر ہو یا وہ شخص خود یا گواہ اسے ظاہر کردیں اور اس پر حد بھی ثابت ہو رہی ہو تو حد کو نافذ کردیا جائے نبی کریم ﷺ کا نہ پوچھنا تعلیم امت کے لئے بھی ہو اور آپ کو مطلع بھی کردیا گیا ہو دونوں چیزوں کا ایک ہی وقت پایا جانا منع نہیں اس طرح بیان کرنے سے تقریباً حدیث پاک کی وضاحت میں مختلف قول نہیں ہوں گے بلکہ مطلب ایک ہی ہوگا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

☆ "عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله ﷺ خمس صلوات افترضهن الله تعالیٰ من احسن وضوأهن وصلاهن لوقتهن واتم ركوعهن وخشوعهن كان له على الله عهد ان يغفر له ومن لم يفعل فليس له على الله عهد ان شاء غفر له وان شاء عذبه"

(رواہ احمد وابوداود وروی مالک والنسائی نحوہ مشکوۃ کتاب الصلوۃ)

عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ نمازوں کو اللہ تعالیٰ نے فرض کیا جس شخص نے ان کے لئے اچھی طرح وضو کیا اور ان کو وقت میں ادا کیا اور ان کا رکوع مکمل کیا اور خشوع کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر عہد ہے کہ اس کی مغفرت فرمائے گا۔ اور جس نے ایسا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر کوئی عہد نہیں ہاں رب تعالیٰ چاہے تو مغفرت فرمادے اور چاہے تو عذاب دے۔

وضاحت حدیث: جس آدمی نے اچھی طرح وضو کیا یعنی وضو کرتے وقت وضو کے فرائض اور وضو کی سنتوں کا لحاظ کرتے ہوئے وضو کیا۔ نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کیا یعنی مستحب اوقات میں ادا

کیا مکروہ اوقات میں نہ ادا کرے۔ رکوع کو مکمل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ رکوع کی شرط اور سنت فعلیہ اور سنت قولیہ کو مکمل کیا رکوع کی شرط یہ ہے پیٹھ کو جھکایا جائے سنت فعلیہ یہ ہے کہ پیٹھ کو ہموار کرے پیٹھ بالکل سیدھی برابر ہو ٹیڑھی اور کبڑی نہ ہو۔ یہ سب بغیر عذر کے عذر ہو تو جس طرح رکوع کر سکے اسی طرح صحیح ہے۔ سنت قولیہ یہ ہے کہ کم از کم تین مرتبہ "سبحان ربی العظیم" کہے نمازوں کو خشوع سے ادا کرے خشوع کیا ہے؟" الخشوع حضور القلب وطمانینة القلب" خشوع یہ ہے کہ دل حاضر رہے اور دل میں اطمینان پایا جائے اسی طرح ظاہری اعضاء میں بلاوجہ حرکت نہ پائی جائے جب یہ تمام چیزیں پائی جائیں گی تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کی مغفرت کرے گا لہٰذا اگر چہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم تو نہیں لیکن اس نے خود مغفرت کا وعدہ کر رکھا ہے اور وہ مغفرت اپنے وعدہ کے مطابق اپنی مہربانی سے کرے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص ان مذکورہ چیزوں پر عمل نہیں کرتا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا کوئی وعدہ نہیں کر رکھا ہے چاہے تو اسے معاف کر دے اور چاہے تو عذاب دے۔

(از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۴)

☆ "عن ابن مسعود قال سالت النبی ﷺ ای الاعمال احب الی اللہ تعالیٰ قال الصلوۃ لوقتها قلت ثم ای قال بر الوالدین ثم ای قال الجهاد فی سبیل اللہ قال حدثنی بهن ولو استزدته لزادنی" (بخاری مسلم مشکوۃ کتاب الصلوۃ)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تمام اعمال سے اللہ تعالیٰ کا کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے فرمایا نماز وقت میں ادا کرنا میں نے کہا پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا والدین کی فرمانبرداری کرنا میں نے کہا پھر کونسا؟ آپ نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا آپ نے ان کو مجھ پر بیان فرمایا اگر میں اس سے زیادہ طلب کرتا آپ زیادہ بتاتے۔

وضاحت حدیث: نماز کو وقت میں ادا کرنے کا وہی مطلب ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مستحب اوقات میں نمازوں کو ادا کیا جائے نہ کہ مکروہ اوقات میں۔ یہ حدیث ان علماء کی دلیل ہے جنہوں نے فرمایا " ان الصلوۃ افضل العبادات بعد الشهادتین " کہ بیشک نماز تمام عبادات سے شہادتین کے بعد افضل ہے اور اسی کے مطابق ایک اور صحیح حدیث ہے "الصلوۃ خیر موضوع ای خیر عمل وضعه اللہ لعباده لیتقربوا الیه به" نماز بہتر موضوع ہے بہتر موضوع کا کیا

مطلب؟ موضوع کا یہاں یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو عمل وضع کئے ہیں کہ ان کے ذریعے وہ میرے قریب ہو جائیں ان تمام اعمال سے نماز افضل ہے "قلت ثم ای " (میں نے کہا پھر کون سا) اس مقام پر " ثم " کا لفظ تراخی زمان کے لئے استعمال نہیں بلکہ تراخی رتبہ کے لئے استعمال ہے یعنی میں نے کہا نماز کے بعد کون سا عمل افضل ہے یوں نہیں ترجمہ کیا جائے گا کہ میں نے کہا نماز ادا کرنے کی کچھ دیر کے بعد کون سا عمل ادا کیا جائے یہ ترجمہ اس وقت کیا جاتا جب " ثم " تراخی زمان پر دلالت کرتا" قال بر الوالدین ، الی او احدهما " آپ نے فرمایا والدین کی فرمانبرداری۔

خیال رہے کہ اکثر اوقات والدین زندہ ہوتے ہیں اس لئے دونوں کا ذکر کر دیا جاتا ہے ورنہ والدین میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہو تو اس کا یہی حکم ہے اس حدیث پاک کا مفہوم رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے مطابق ہے ﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ آپ کے رب نے حکم دیا کہ نہ عبادت کرو کسی کی سوائے اس کے اور والدین سے احسان کرو:

" ولذا قیل من صلی الصلوات الخمس و دعا للوالدین بالمغفرة عقیب کل صلوة فقد ادی حق اللہ وحق والدیه "

اسی وجہ سے کہا گیا ہے جس شخص نے پانچ نمازیں ادا کیں اور والدین کے لئے ہر نماز کے بعد مغفرت کی دعا کی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کیا اور والدین کا بھی حق ادا کیا۔ یعنی اپنی طاقت کے مطابق اس نے رب تعالیٰ اور اپنے والدین کا حق ادا کیا ورنہ حقیقت میں نہ تو رب تعالیٰ کا حق ادا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی والدین کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔

تنبیہ : احادیث میں اعمال کی افضلیت کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا اس حدیث میں نماز کو اولیت دی گئی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ذکر کیا گیا "ای العمل خیر" رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا یا رسول اللہ کون سا عمل بہتر ہے؟ تو آپ نے فرمایا " ایمان باللہ وجهاد فی سبیل اللہ " اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ جب آپ سے سوال کیا گیا "ای

الناس افضل " لوگوں میں سے کون سا شخص افضل ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "رجل مجاھد فی سبیل اللہ " وہ شخص تمام سے افضل ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔

بظاہر ان احادیث میں تعارض پایا گیا ہے لیکن ان تمام میں وجہ توفیق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر شخص کو جواب اس کے حال کے مطابق اور وقت کی ضرورت کے مطابق دیا یعنی جب دیکھا کہ یہ شخص جہاد میں جانے کی طاقت نہیں رکھتا تو آپ نے اس شخص کے لئے نماز کی افضلیت ذکر فرمائی اسی طرح جب دیکھا کہ اب وقتی طور پر جہاد کی ضرورت نہیں اور سائل کا مطلب یہ ہے کہ میرے لئے اب کون سا عمل افضل ہے تو اس وقت بھی نماز کو افضل بیان فرمایا لیکن جب دیکھا کہ سوال کرنے والا جہاد میں جانے کی طاقت رکھتا ہے اور جہاد کی اب ضرورت بھی ہے تو اس وقت آپ نے جہاد کا افضل ہونا ذکر فرمایا۔

یہ بالکل اسی طرح با محاورہ وقتی ضرورت یا کسی شخص کے حال کو دیکھ کر آپ نے ارشادات فرمائے جیسا کہ کوئی شخص بہت باتیں کرنے کی عادت رکھتا ہو یا وہ وقت خاموشی سے عبادت کرنے کا ہو یا کوئی شخص ایسا کلام کر رہا ہو جو اس کی شان کے لائق نہیں یا اس بات کو ظاہر کرنا مناسب نہیں تو ان صورتوں میں کہا جاتا ہے "لاشئی افضل من السکوت " خاموشی سے افضل اور کوئی چیز نہیں۔ اور جب کوئی صاحب عالم شخص ہو ضرورت ہو کہ یہ کوئی بات کرے وہ خاموش ہو تو اس وقت کہا جاتا ہے "لاشئی افضل من الکلام " کلام سے افضل کوئی چیز نہیں۔ احادیث پر اعتراض کرتے رہنا کہ ان میں تعارض پایا گیا ہے یہ درست نہیں بلکہ احادیث کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۲، ۱۱۳)

☆ " عن ابی ذر ان النبی ﷺ خرج زمن الشتاء و الورق یتھافت فاخذ بغضنین من شجرۃ قال فجعل ذلک الورق یتھافت قال فقال یا اباذر قلت لبیک یارسول اللہ قال ان العبد المسلم لیصلی الصلوۃ یرید بھا وجہ اللہ فتھافت عنہ ذنوبہ کما تھافت ھذا الورق عن ھذہ الشجرۃ رواحمد " (مشکوۃ کتاب الصلوۃ)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ سردی کے موسم میں نکلے پتے گر رہے تھے آپ نے درخت کی دو ٹہنیوں کو پکڑا پتے (اور زیادہ تیز رفتاری سے) گرنے شروع ہو گئے آپ نے فرمایا اے ابوذر میں نے عرض کیا "لبیک یارسول اللہ " آپ نے فرمایا بیشک مسلمان

بندہ جب نماز ادا کرتا ہے اور اس میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے گناہ اس طرح گرتے ہیں جس طرح اس درخت کے پتے گر رہے ہیں۔

وضاحت حدیث: موسم خزاں جس میں درختوں کے پتے از خود گرنا شروع ہو جاتے ہیں اس موسم میں نبی کریم ﷺ گھر سے کہیں باہر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ درخت کے پتے گر رہے ہیں آپ نے درخت کی دو ٹہنیوں کو پکڑ کر ذرا حرکت دی تو پتے خشک ہونے کی وجہ سے جلدی جلدی سے گرنا شروع ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ جس طرح یہ پتے بڑی تیزی سے گرنا شروع ہوئے اسی طرح مسلمان بندہ جب اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے نماز ادا کرتا ہے تو اس کے گناہ گرتے ہیں۔

یہاں بظاہر وہم ہوتا ہے کہ کسی کے درخت کو ہلانا اور پتے گرانا تو جائز نہیں نبی کریم ﷺ نے کیسے درخت کی ٹہنیوں کو پکڑ کر پتوں کو گرایا؟ تو اس کا جواب ذکر کرتے ہوئے علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فاخذ بغصنين من شجرة اى مباحة او مملوكة له عليه الصلوة والسلام او لمن يظن رضاء بذلک "

آپ کے درخت کی دو ٹہنیوں کے پکڑنے میں جس درخت کا ذکر ہے وہ یا تو مباح تھا یعنی جنگلی درخت جس کا کوئی مالک نہ ہو اس میں ہر آدمی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ درخت نبی کریم ﷺ کی اپنی ملکیت میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کا ہو جس کے متعلق نبی کریم ﷺ کو معلوم ہو کہ یہ مجھے منع نہیں کرے گا۔

" لبیک " اصل میں " الب لک البابین " ہوتا ہے جو تکرار اور تکثر کو چاہتا ہے اس لئے اس کا معنی یہ ہوگا "اجابة لک بعد اجابة " آپ کی بات کو قبول کرنے کے بعد پھر قبول کرتا ہوں اور یا یہ معنی ہوگا "اقامة علی طاعتک بعد اقامة " آپ کی طاعت پر قائم ہونے کے بعد پھر قائم ہوں۔ مشہور معنی اس کا یہ ہے "حاضر جناب" اس کا مطلب بھی یہ ہوتا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد پھر حاضر ہوں یعنی یوں سمجھیں کہ " لبیک " کہنے والا یوں کہتا ہے کہ آپ مجھے ایک مرتبہ بلا رہے ہیں لیکن میں آپ کے ارشاد پر عمل پیرا ہوں صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار حاضر

ہونے کے لئے تیار ہوں۔

نماز ادا کرنے سے مراد یہ ہے " لیصلی الصلوة بشرائطها وارکانها " کہ مسلمان بندہ نماز ادا کرے تو اس میں شرائط اور ارکان کا خصوصی طور پر لحاظ کرے ان میں کمی واقع نہ ہونے دے "یرید بها وجه الله " یعنی خالص طور پر اللہ تعالیٰ کی رضاء کی طلب پائی جائے چرچا کرنا مقصود نہ ہو دکھاوا، ریاکاری نہ ہو نماز ادا کرنے میں اپنے دنیاوی اور اخروی مقاصد نہ ہوں۔

(از مرقاة ج ۲ ص ۱۱۷، ۱۱۸)

" عن عبد الله بن عمرو بن العاص عن النبی ﷺ انه ذکر الصلوة یوما فقال من حافظ علیها کانت له نورا وبرهانا ونجاة یوم القیامة ومن لم یحافظ علیها لم تکن له نورا ولا برهانا ولا نجاة وکان یوم القیامة مع قارون وفرعون وهامان وابی بن خلف " (رواه احمد والدارمی والبیهقی فی شعب الایمان، مشکوة کتاب الصلوة)

حضرت عبد اللہ ابن عمرو ابن عاص بیان کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کا ذکر کیا آپ نے فرمایا جس شخص نے نماز کی حفاظت کی نماز اس کے لئے قیامت کے دن نور اور برہان اور نجات ہوگی جس نے نماز کی حفاظت نہ کی اس کے لئے نور، برہان اور نجات نہیں ہوگی قیامت کے دن وہ شخص قارون اور فرعون اور ہامان اور ابی ابن خلف کے ساتھ ہوگا۔

وضاحت حدیث: " انه ذکر الصلوة یوما " یعنی نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کی فضیلت اور شرافت کا ذکر کیا " کانت له نورا وبرهانا ونجاة " نماز اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگی یعنی اس انسان کے آگے آگے نور کی حیثیت سے ہوگی اس کے سامنے خود ہی مقامات روشن ہوں گے اسے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نور سے مراد یہ ہے کہ اس کے ایمان میں نماز کی وجہ سے نورانیت زیادہ ہوگی "برهانا" برہان کا مطلب یہ ہے کہ نماز قیامت کے دن اس شخص کے لئے دلیل بنے گی کہ اس نے تمام طاعات پر عمل کیا۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ برہان کا یہ مطلب ہے کہ اس کے کمال عرفان پر واضح دلیل ہوگی۔

راقم کے نزدیک نور اور برہان کے دونوں معنی بیک وقت مراد لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ ان کے

اجتماع میں کوئی ممانعت نہیں "نجاۃ " نماز اس شخص کو قیامت کے دن عذاب سے نجات دے گی۔

فائدہ: " وکذلک نور وبرهان ونجاة له فی القبر کما ورد فی الاحادیث فان مات فقد قامت قیامته " نماز انسان کے لئے قبر میں بھی نور، برہان اور نجات ہوگی جیسا کہ احادیث میں وارد ہے کہ جو شخص فوت ہو جاتا ہے اس پر قیامت قائم ہو جاتی ہے۔ قیامت کے دن بھی پہلے تمام پر موت آئے گی پھر ان کو اٹھایا جائے گا اسی طرح موت کے بعد بھی قبر میں جسم سے روح کا تعلق قائم ہوتا ہے اور منکر نکیر اس سے سوال کرتے ہیں۔ نماز نہ ادا کرنے والا نور، برہان اور نجات سے محروم ہوگا اسے قارون، فرعون، ہامان اور ابی ابن خلف کا ساتھ حاصل ہوگا۔ اس سے تعریض (اشارہ) کے طور پر یہ سمجھا دیا گیا کہ نماز پڑھنے والے حضرات صراط مستقیم پر ہوں گے ان کو انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کا قرب حاصل ہوگا۔

یہی مطلب ہے کہ بے نماز لوگوں کو قارون، فرعون، ہامان اور ابی ابن خلف کا قرب حاصل ہوگا۔ تشبیہ صرف اس میں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے معاف نہ کیا تو ان کو عذاب ہوگا ورنہ مؤمنین خواہ گنہگار بھی ہوئے ان کی آخر کار بخشش ہوگی کافر ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے۔

فرعون خدائی کا دعویدار تھا، ہارون اس کا وزیر تھا۔ قارون وہ شخص تھا جس نے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینے سے انکار کر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے بمع مال کے زمین میں دھنسا دیا۔ ابی ابن خلف یہ وہ بدبخت مشرک ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے احد میں قتل کیا تھا۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۸)

بچوں کی نماز کی رغبت دلائی جائے:

" عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال قال رسول الله ﷺ مروا اولادکم بالصلوة وهم ابناء سبع سنین واضربوهم علیها وهم ابناء عشر سنین وفرقوا بینهم فی المضاجع "

(رواہ ابوداؤد۔ مشکوۃ کتاب الصلوۃ)

" عمرو ابن شعیب اپنے باپ دادا سے بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور ان کو مارو جب وہ دس سال کے ہو جائیں اور ان کے لیٹنے کے مقامات علیحدہ علیحدہ کر دیں "

وضاحت حدیث: اولاد جمع ولد کی ہے ولد مشترک ہے مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہے اس لئے حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اپنے بچوں اور بچیوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں "لتعادوا ویستأنسوا بھا" تاکہ ان کو نماز کی عادت پڑ جائے اور نماز سے محبت ہو جائے۔ دس سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز نہ ادا کرنے پر سرزنش کی جائے یعنی ان کو نماز کا حکم دو ان سے نماز ادا کراؤ خواہ تمہیں سرزنش ہی کیوں نہ کرنی پڑے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بالغ ہو جاتے ہیں یا بالغ ہونے کے قریب ہوتے ہیں اگر ان کو نماز چھوڑنے پر نہ پوچھا گیا تو وہ اسی طرح بے نمازی ہی ہو جائیں گے۔ دس سال کی عمر میں بچوں اور بچیوں کو علیحدہ علیحدہ سلایا جائے ایک جگہ یعنی ایک ہی چارپائی ایک ہی بستر پر ان کو سونے کی اجازت نہ دی جائے یہ حکم عام ہے خواہ بچے بہن، بھائی ہوں یا اجنبی ہوں۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۵)

ڈنڈے سے مارنا جائز نہیں: ادب سکھانے، نیک کاموں کی ترغیب کے لئے برے کاموں سے اجتناب کے لئے ماں، باپ کے لئے جائز ہے کہ وہ اولاد کو معمولی ماریں اور ان کی سرزنش کریں اور یہی صورت استاذ کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ ادب سکھانے اور اچھی تربیت کے لئے شاگرد کو معمولی مارے اور سرزنش کرے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ضرب استاذ بہ از مہر ما در وپدر" استاذ کی مار، ماں، باپ کے پیار سے بہتر ہے لیکن یہ مار ہاتھ سے ہو تربیت کے لئے سرزنش کے طور پر ڈنڈے سے ظالمانہ انداز پر مارنا منع ہے۔

"وان وجب ضرب ابن عشر بید لا بخشبة ای عصا اوسوط او غیرہ لحدیث مروا اولادکم بالصلوة وهم ابناء سبع واضربوهم وهم ابناء عشر ولایجاوز الثلاث وکذا المعلم لیس له ان یجاوزها قال علیه الصلوة والسلام لمرداس المعلم ایاک ان تضرب فوق الثلاث فانک ان ضربت فوق الثلاث اقتص الله منک" (درمختار، شامی ج ۱ ص ۲۵۸)

اگرچہ دس سال کے بچے ہو جائیں تو انکو نماز نہ ادا کرنے پر مارنا جائز ہے لیکن یہ مار ہاتھ سے ہو ڈنڈے کوڑے وغیرہ سے نہ ہو۔ مطلقاً مارنا تو حدیث پاک سے ثابت ہو گیا کہ بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور نماز نہ ادا کرنے پر انکو مارو جب وہ دس سال کے ہو جائیں۔

حضرت علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مارنا بھی ہاتھ سے ہے اور وہ بھی دو تین تھپڑ سے زیادہ نہ ہوں ماں باپ کیلئے بھی یہی حکم اور استاذ کیلئے بھی یہی حکم ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بچوں کو پڑھانے والے ایک استاذ مرداس کو کہا کہ تم تین ضربوں (تھپڑ) سے زیادہ مارنے سے اپنے آپکو دور رکھو اگر تم نے تین مرتبہ سے زیادہ مارا تو اللہ تعالیٰ تم سے بدلہ لے گا۔ ان احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کتنا خوبصورت ضابطہ بیان کیا جو والدین اور اساتذہ کیلئے مشعل راہ ہے۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو فاصد کہ جراح و مرہم نہ است

درشتی نگیرد خرد مند پیش
نہ سستی کہ نازل کند قدر خویش

نہ مر خویشتن را فزونی نہد
نہ یک بار تن در مذلت دہد

یعنی سختی اور نرمی دونوں کو ساتھ ساتھ رکھنا بہتر ہے
پچھوا لگانے والا زخم بھی کرتا ہے اور مرہم بھی لگاتا ہے
عقلمند آدمی بہت زیادہ سختی نہیں کرتا
اور اتنی زیادہ نرمی بھی نہیں کرتا کہ اس کی قدر و منزلت ہی کم ہو جائے

اپنے آپ کو بہت زیادہ آدم خور بھی نہ بناؤ
اور بہت زیادہ نرم ہو کر اپنے آپ کو ذلیل بھی نہ کرو

استاذ کے لئے یہی ایک اعلیٰ سبق ہے کہ ڈرائے، دھمکائے، سرزنش کرے، احساس دلائے اور شفقت بھی کرے اپنا رعب جمانے کے زعم باطل میں طلباء کی نظروں سے نہ گر جائے اور ان کی در پردہ گالیوں کا مستحق نہ بن جائے۔

نماز کی فضلیت میں اور احادیث مبارکہ:

"عن عمارة بن روبية قال سمعت رسول الله ﷺ يقول لن يلج النار احد صلى قبل طلوع

شمس وقبل غروبها یعنی الفجر والعصر" (رواہ مسلم ۔ مشکوۃ باب فضائل الصلوۃ)

"عمارہ ابن رویبہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا کہ کوئی ایک آگ میں داخل نہیں ہوگا جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے نماز ادا کی اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے نماز ادا کرے یعنی فجر اور عصر کی نماز ادا کرے"

وضاحت حدیث: دو وقتوں کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا کیونکہ ان دو وقتوں میں نماز ادا کرنا بہت مشکل ہے کہ صبح جاگنا خاص کر کے گرمیوں میں صبح نیند سے اٹھنا اور سردیوں میں صبح وضو کرنا بظاہر مشکل کام ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر یہ کوئی مشکل نہیں وہ بخوشی نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح عصر کی نماز اس لئے مشکل ہے کہ دن ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے ہر شخص اپنے کام کو ختم کرنے کی فکر میں ہوتا ہے لیکن یہ نماز بھی اللہ کے بندوں پر کوئی بھاری نہیں۔ جب یہ دو نمازیں انسان ادا کرے گا تو یقیناً دوسری نمازیں بھی خوشی خوشی سے ادا کرے گا۔ ان دو نمازوں کو خصوصی طور پر ذکر کرنے کی ایک اور وجہ یہ ہے:

" هذان الوقتان مشهودان يشهدهما ملائكة الليل وملائكة النهار ويرفعون فيهما اعمال العباد "

ان دونوں وقتوں میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں دن کے اعمال لکھنے والے فرشتے عصر کی نماز میں شریک ہوتے ہیں اور رات کے اعمال لکھنے والے بھی عصر کی نماز میں موجود ہوتے ہیں دن والے چلے جاتے ہیں رات والے رہ جاتے ہیں اسی طرح رات والے فرشتے صبح کی نماز ادا کر کے جاتے ہیں اور دن والے بھی اس میں آجاتے ہیں اور بندوں کے اعمال رب کے حضور پہنچاتے ہیں اور وجہ یہ بھی ہے کہ ان دو وقتوں میں نماز پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے اور نیکی کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

تنبیہ: اگر کسی کے ذمہ حقوق العباد ہوئے تو وہ معاف نہیں ہوں گے کیونکہ صحیح حدیث میں مذکور ہے:

" ان من المسلمين من يأتي يوم القيامة وله صلوة وصيام وغيرهما وعليه ظلامات للناس فياخذون اعماله ماعدا الصوم لاختصاص عمله به تعالىٰ فاذا لم يبق له عمل وضع عليه من سياتهم ثم يلقى في النار " (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۴۲)

''بیشک مسلمان قیامت کے دن حاضر ہوں گے ان کے پاس نمازیں ، روزے اور عبادات ہوں گی ان میں سے اگر کسی کے ذمہ لوگوں کے حقوق ہوئے تو اس شخص کی عبادات ان لوگوں کو دے دی جائیں گی جن کے حقوق اسکے ذمہ ہیں البتہ روزے اس سے نہیں لئے جائیں گے کیونکہ وہ خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتے ہیں''

اگر اس کے نیک عمل باقی نہ رہے اور حقوق نہ ختم ہوئے تو ان حقوق والے لوگوں کے گناہ اس کے پلڑہ میں ڈال دیئے جائیں گے پھر اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ جس حدیث سے وضاحت کی جارہی ہے اسی سے یہ بھی سمجھ آگیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ لیس بمعنی الدخول ﴿ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک شخص کا جہنم کی آگ سے ورود ہوگا اس کا مطلب دخول نہیں بلکہ گزرنا ہے۔ یعنی پل صراط جہنم پر ہوگا اسی کے اوپر سے ہر شخص کو گزرنا ہوگا اس سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ ہر شخص نے جہنم میں داخل ہونا ہے۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۴۲)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ یتعاقبون فیکم ملائکة باللیل و ملائکة بالنهار ویجتمعون فی صلوة الفجر وصلوة العصر ثم یعرج الذین باتوا فیکم فیسالهم ربهم وهو اعلم بهم کیف ترکتم عبادی فیقولون ترکناهم وهم یصلون واتیناهم وهم یصلون "
(بخاری ، مسلم ، مشکوة باب فضائل الصلوة)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے آگے پیچھے رہتے ہیں وہ فجر کی نماز میں اور عصر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں پھر وہ جنہوں نے تمہارے پاس رات گزاری ہوتی ہے۔ جب وہ آسمان پر جاتے ہیں تو رب تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے حالانکہ وہ خود بھی جانتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے؟ تو وہ کہتا ہیں ہم نے ان کو نماز پڑھتے ہوئے چھوڑا جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے وہ اس وقت بھی نماز ادا کر رہے تھے۔

وضاحت حدیث: "یتعاقبون فیکم" کا اگر چہ مطلب ہے آگے، پیچھے آنا لیکن یہاں مراد ہے آگے پیچھے رہنا کیونکہ رات والوں کی موجودگی میں صبح کی نماز میں دن والے آجاتے ہیں لیکن چونکہ رات والے چلے جاتے ہیں اور دن والے موجود رہتے ہیں اس لئے وہ ان کے پیچھے رہتے ہیں اسی طرح دن والوں کی موجودگی میں رات والے عصر کی نماز میں آجاتے ہیں لیکن دن والے چلے جاتے ہیں

رات والے ان کے پیچھے رہتے ہیں۔ یا تعاقب کا مطلب ہے نزول کے لحاظ سے آگے پیچھے ہوتے ہیں اگر چہ دونوں ہی صبح اور عصر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں رات والے فرشتے رات بھر رہتے ہیں اور صبح کی نماز ادا کر کے جاتے ہیں دن والے فرشتے دن بھر رہتے ہیں اور عصر کی نماز ادا کر کے جاتے ہیں۔ جس طرح رب تعالیٰ رات والے فرشتوں سے پوچھتا ہے اسی طرح دن والوں سے بھی پوچھتا ہے۔ نمازی کتنا خوش قسمت ہے کہ اس کی نماز کی گواہی دونوں گروہ فرشتوں کے دے رہے ہیں خواہ وہ رات والے ہوں یا دن والے ہوں۔

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لو يعلم الناس ما فی النداء والصف الاول ثم لم يجدوا الا ان يستهموا عليه لا ستهموا ولو يعلمون ما فی التهجير لا ستبقوا اليه ولو يعلمون ما فی العتمة والصبح لا توهما ولوحبوا " (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب فضائل الصلوۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر لوگوں کو ندا اور صف اول کے متعلق معلوم ہو جائے تو کوئی بھی سوائے قرعہ اندازی کے نہ پاسکتا اگر ان کو نیکی کا کام جلدی کرنے کے متعلق معلوم ہو جاتا تو وہ اس کی طرف جلدی کرتے اگر ان کو عشاء اور صبح کی نماز کے متعلق معلوم ہو جاتا تو وہ اس کی طرف آتے خواہ ان کو گھسٹتے ہوئے کیوں نہ چلنا پڑتا۔

وضاحت حدیث: ندا سے مراد اذان دینا اور اقامت کہنا ہے یعنی اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ اذان اور اقامت میں کتنا عظیم ثواب ہے تو ہر شخص کوشش کرتا کہ میں ہی اذان دوں اور میں ہی اقامت کہوں اس طرح ثواب کے حصول میں لوگ آگے آگے بڑھتے نوبت قرعہ اندازی کی درپیش آجاتی۔ اسی طرح صف اول کے ثواب کا کسی کو پتہ چلتا تو اس میں بھی لوگ بڑھ چڑھ کر پہنچنے کی کوشش کرتے کسی کو سوائے قرعہ اندازی کے جگہ نہ ملتی۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ مقصد تو اذان سن کر جلدی مسجد میں آنا ہے۔ مسجد میں آنا اس وقت جب اقامت ہو رہی ہو صفوں کو چیرتے ہوئے جگہ ہو یا نہ آگے گھسنے کی کوشش کرنا اس میں کون سا ثواب ہے؟

" ولو يعلمون ما فی التهجير ، ای فی المسارعة الى الطاعة من الفضلية والكرامة ، لا ستبقوا ای لبادروا اليه "

اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ نیکی کے کاموں کی طرف جلدی کرنے میں کیا فضیلت اور کرامت ہے تو وہ جلدی جلدی سے اس کام کی طرف پہنچتے اور سرانجام دیتے۔ صبح اور عشاء کی نمازوں کا ذکر فرمایا کہ اگر ان دونوں نمازوں میں اجر وثواب کا لوگوں کو پتہ چلتا تو وہ ان نمازوں کے لئے آتے خواہ وہ بچوں کی طرح گھسٹ کر چلنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ ان دو نمازوں کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں وقت نیند اور غفلت کے ہوتے ہیں ان اوقات میں نماز ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۴۴)

فائدہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا "المؤذنون اطول الناس اعناقا یوم القیامة" قیامت کے دن اذان دینے والے لوگوں سے زیادہ مرتبہ والے ہوں گے۔

وضاحت حدیث: "اطول الناس اعناقا" کا ظاہر طور پر معنی یہ ہے کہ وہ لوگوں سے لمبی گردنوں والے ہوں گے لیکن اس کا ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہے وہ کئی معنی ذکر کئے گئے تقریباً سب کا مطلب زیادہ مرتبہ لیا جا سکتا ہے۔ ایک معنی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اعمال زیادہ ہوں گے کیونکہ کہا جاتا ہے " لفلان عنق من الخیر " فلاں کو بھلائی کا حصہ حاصل ہے یا اس کا عمل خیر پر مبنی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ زیادہ امید رکھنے والے ہوں گے اس لئے کہ جو زیادہ امید رکھتا ہو وہ لوگوں کی طرف گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن جب لوگ مصیبت اور پریشانی میں ہوں گے اذان دینے والے گردن اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے ہوں گے کہ ابھی ہمیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملتی ہے۔ اور یہ معنی لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہونا اس لئے کہ گردن اس وقت لمبی ہوتی ہے جب قد بھی لمبا ہو لمبے قد والا بلند چیز کے قریب ہوتا ہے اس طرح بلا تشبیہ وتمثیل اذان دینے والا اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے جو بلند مرتبہ والا ہے اور معنی یہ مراد لیا گیا ہے کہ لمبی گردن سے مراد پریشان وشرمندہ نہ ہونا کیونکہ پست قد والا اور چھوٹی گردن والا شرمندہ رہتا ہے گویا کہ مطلب یہ ہوا کہ اذان دینے والا قیامت کے دن مطمئن ہوگا نادم نہیں ہوگا۔ اسی طرح لمبی گردن کا یہی معنی مراد لیتے ہوئے کہ اسے کوئی شرمندگی نہیں ہوگی اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ پسینہ سے شرابور ہوں گے پسینہ ان کی گردنوں سے بہہ رہا ہوگا اس وقت اذان دینے

والے اس پسینہ سے محفوظ ہوں گے۔ اور معنی یہ مراد لیا گیا ہے کہ اذان دینے والے قیامت کے دن رئیس ہوں گے عرب عام طور پر سردار حضرات کی تعریف طول العنق (لمبی گردن والے) سے کرتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے "جاء عنق من الناس" لوگوں کی ایک جماعت آ گئی یعنی عنق جماعت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ اذان دینے والوں کی جماعتیں بڑی ہوں گی کیونکہ جن لوگوں نے ان کی اذان سن کر جماعت میں شرکت حاصل کی وہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ جتنے معانی بیان کیے ہیں ان تمام کا تقریباً مطلب یہی ہے کہ اذان دینے والے بلند مرتبہ والے ہوں گے۔

(از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۵۸)

فائدہ: نماز کے بغیر چند اور مقامات میں بھی اذان کہنا مستحسن ہے:

"یسن لغیر الصلوۃ کالاذان فی آزان المولود الیمنی والاقامۃ فی الیسری ویسن ایضا عند الھم وسوء الخلق لخبر الدیلمی عن علی رضی اللہ عنہ رانی النبی صلی اللہ علیہ وسلم حزینا فقال یا ابن ابی طالب انی اراک حزینا فمر بعض اھلک یؤذن فی اذنک فانہ درأ الھم قال فجربتہ فوجدتہ کذلک"

''نماز کے بغیر بچے کے دائیں کان میں کہنا اور بائیں میں اقامت کہنا سنت ہے غم کے وقت یا بدخلق کے کان میں اذان کہنا سنت ہے۔ دیلمی نے بیان کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے نبی کریم ﷺ نے غم کی حالت میں دیکھا تو آپ نے فرمایا اے ابن ابی طالب میں تمہیں غمناک دیکھ رہا ہوں تم اپنے گھر والوں میں سے کسی کو کہو وہ تمہارے کان میں اذان کہے بیشک اس سے غم دور ہوتا ہے دیلمی نے فرمایا میں نے اس کا تجربہ کیا ایسے ہی پایا''

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جتنے بھی روایت کرنے والے ہیں سب نے اس کا تجربہ کیا ایسے ہی پایا:

"وروی الدیلمی عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ من ساء خلقہ من انسان او دابۃ فاذنوا فی اذنہ"

دیلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی آپ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے اخلاق برے ہوں خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور جانور ہو اس کے کان میں اذان کہو۔

فائدہ عظیمہ: حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کے اذان کہنے سے آپ کو ایمان ملا محبت رسول اللہ ﷺ ملی۔ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں چند آدمیوں کے ساتھ نکلا ہم کسی راستے پر تھے تو رسول اللہ ﷺ کے مؤذن نے نماز کے لئے اذان کہی ہم نے جب مؤذن کی اذان سنی ہم نے اس سے اعراض کیا پھر ہم نے بطور مزاح اذان کی نقل اتارنی شروع کر دی۔ نبی کریم ﷺ نے سنا تو آپ نے ہماری طرف چند صحابہ کو بھیجا (وہ ہمیں پکڑ کر لے گئے) نبی کریم ﷺ کے سامنے انہوں نے ہمیں بٹھا دیا آپ نے فرمایا تم میں سے میں نے کس کی آواز کو سنا جو اپنی آواز کو بلند کر رہا تھا ان لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا وہ سچے بھی تھے آپ نے دوسرے میرے ساتھیوں کو چھوڑ دیا مجھے اپنے پاس رکھ لیا اور آپ نے مجھے کہا تم کھڑے ہو اور اذان کہو میں کھڑا ہوا مجھے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی چیز ناپسند نہیں تھی اور جس چیز کا آپ مجھے حکم دے رہے تھے اس سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ناپسند نہیں تھی۔ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہو گیا آپ نے خود مجھے اذان کہلانی شروع فرمائی آپ نے فرمایا تم کہو:

" اللّٰه اكبر ، اللّٰه اكبر ، اللّٰه اكبر ، اللّٰه اكبر ، اشهد ان لا اله الا اللّٰه ، اشهد ان لا الـه الا اللّٰه ، اشهد ان محمد رسول اللّٰه ، اشهد ان محمد رسول اللّٰه"

(ابومحذورہ نے شہادتین کے الفاظ آہستہ کہے تھے) تو آپ نے فرمایا بلند آواز سے کہو

" اشهد ان لا الـه الا اللّٰه ، اشهد ان لا الـه الا اللّٰه ، اشهد ان محمد رسول اللّٰه ، اشهد ان محمد رسول اللّٰه ، حي على الصلوة ، حي على الصلوة ، حي على الفلاح ، حي على الفلاح ، اللّٰه اكبر ، اللّٰه اكبر ، لا اله الا اللّٰه "

جب میں نے اذان ختم کر لی آپ نے مجھے بلایا مجھے ایک تھیلی دی جس میں کچھ چاندی تھی پھر آپ نے اپنا ہاتھ ابومحذورہ (یعنی میرے) کی پیشانی پر رکھا پھر آپ نے اسکے چہرہ پر سینہ کے درمیان پھیرا

پھر جگر پر پھیرا پھر رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ ابو محذورہ کی ناف پر پہنچا پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" بارک اللہ لک وبارک علیک فقلت یا رسول اللہ امرتنی بالتاذین بمکة قال نعم قد امرتک فذهب کل شئی کان لرسول اللہ ﷺ من کراهیة وعاد ذلک کله محبة لرسول اللہ ﷺ "

اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے میں نے کہا یا رسول اللہ کیا آپ مجھے حکم دیتے ہیں کہ میں مکہ میں بھی اذان کہوں؟ آپ نے فرمایا ہاں میں تمہیں حکم دیتا ہوں (ابو محذور کہتے ہیں) نبی کریم ﷺ کی ناپسندیدگی جو بھی مجھے حاصل تھی وہ ختم ہوگئی اور مجھے رسول اللہ ﷺ سے محبت ہوگئی میں رسول اللہ ﷺ کے عامل عتاب ابن اسید کے پاس مکہ میں آ گیا وہاں ان کی معیت میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق نماز کی اذان کہی۔ (ابن ماجہ ص ۵۲)

سبحان اللہ ابو محذورہ نے طنز کے طور پر صحابہ کرام کی نقل اتارتے ہوئے اذان کہی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو رسول اللہ ﷺ کی دعا اور ہاتھ پھیرنے کی برکت سے رسول اللہ ﷺ کی محبت عطا کر دیا بغض دل سے نکال دی کفار کی محبت جاتی رہی مسلمانوں کی محبت حاصل ہوگئی۔

وضاحت حدیث: ''عبد'' سے مراد مسلمان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا مسلمان ہی ہوگا اس لئے کہ عبادت وہی معتبر ہے جو کامل ایمان کے بعد ہو یعنی ظاہری طور پر بھی ایمان ہو اور باطنی طور پر بھی پھر عبادت کرے " بین العبد وبین الکفر " کا یا تو یہ مطلب ہے "مقاربته " یعنی جو شخص نماز چھوڑنے کا عادی ہو جائے وہ کفر کے قریب ہوتا ہے اس لئے کہ ممکن ہے وہ کسی وقت نماز کی فرضیت کا ہی انکار کر کے کافر ہو جائے یا معنی یہ ہو جائے " ترکها وصلة بینه وبینه " نماز کا چھوڑنا مسلمان بندے کو کفر تک پہنچانے کا ذریعہ ہے وجہ وہی جو پہلے بیان ہوئی کہ نماز ہمیشہ چھوڑنے کی عادت انسان کو رب تعالیٰ سے بے خوف کر دیتی ہے جب رب تعالیٰ کا خوف ہی نہ رہا تو یقیناً اس کی زبان سے لغویات کا نکلنا جو کفر تک پہنچائیں عین ممکن ہے۔ یا یہ معنی ہو جائے کہ "فعل الصلوة حاجز بین العبد والکفر " نماز ادا کرنا مسلمان اور کفر کے درمیان رکاوٹ ہے کہ نماز ادا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے فضل سے کفریات سے محفوظ رہتا ہے اب اسی سے واضح ہو جائے گا کہ نماز کو چھوڑنا اس رکاوٹ کو

توڑنا ہے۔یا یہ معنی ہو جائے:

"ترک الصلوۃ بالحد الواقع بینهما فمن ترکها دخل الحد وحام حول الکفر ودنامنه"

نماز اسلام اور کفر کے درمیان حد ہے۔جس نے نماز کو چھوڑنے کی عادت بنالی وہ اس حد تک پہنچ گیا کفر کے اردگرد پھرنے لگا اور کفر کے قریب ہو گیا۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۳)

☆ "الصلوۃ عماد الدین فمن اقامها فقد اقام الدین ومن ترکها اوهدمها فقد هدم الدین"

نماز دین کا ستون ہے۔جس نے نماز کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا۔جس نے نماز کو چھوڑا اس نے دین کو منہدم کر دیا۔واضح ہوا کہ نماز کو چھوڑنے سے دین کی بربادی ہے نماز ادا کرنے سے ہی دین کا قیام ہے قیامت کے دن حقوق العباد میں سے سب سے پہلے ناحق خون (قتل کرنے) کے متعلق سوال ہوگا اور حقوق اللہ میں سے سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال ہوگا:

روز محشر که جان گداز بود — اولین پرسش نماز بود

قیامت کے دن جب جان پگھلنے والی ہوگی — سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال ہوگا

نماز رحمت کی طلب، مصیبت کا حل:

بارش نہ ہو رہی ہو تو نماز استسقاء پڑھی جائے، تاریکی چھا جائے، آندھی، طوفان پر ہو تو نوافل ادا کئے جائیں، سورج کو گرہن لگ جائے تو نماز کسوف ادا کی جائے، چاند کے گرہن کے وقت نماز خسوف ادا کی جائے کسی کام میں تردد ہو کہ یہ کام کریں یا نہ کریں تو اسکے حل کیلئے نماز استخارہ ادا کی جائے

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ ہمیں نماز استخارہ تمام کاموں کے لئے سکھاتے تھے جیسا کہ قرآن پاک کی سورتیں ہمیں سکھاتے تھے اور فرماتے تھے جب بھی تم میں سے کسی ایک کو کوئی کام درپیش ہو تو وہ پہلے دو رکعت نفل ادا کرے پھر یہ دعاء پڑھے:

"اللهم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسالک من فضلک العظیم فانک تقدر ولا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب اللهم ان کنت تعلم ان هذا الامر خیر لی فی دینی ومعاشی وعاقبة امری اوقال عاجل امری وآجله فاقدره لی ویسره لی ثم

بارک لی فیہ وان کنت تعلم ان هذا الامر شرلی فی دینی ومعاشی وعاقبة امری اوقال عاجل امری وآجله فاصرفه عنه واصرفنی عنه واقدرلی الخیر حیث کان ثم رضنی به ''

تنبیہ: دو رکعت نفل جب ادا کرے تو پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد **قل یاایھاالکفرون** سورۃ پڑھے اور دوسری رکعت میں سورۃ **قل ھو اللہ احد** پڑھے جب دعا استخارہ پڑھے تو اس دعا کے شروع میں اور آخر میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد پڑھے پھر نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے پھر دعا کرے آخر میں بھی ایسا ہی کرے پھر باوضو ہو کر قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر سو جائے اگر دل مطمئن ہو کہ یہ کام مجھے کرنا چاہیے تو سمجھ لے کہ وہ کام کرنا بہتر ہے اس لئے وہ کام کر لے اور اگر دل مطمئن نہیں ہو رہا تو سمجھے کہ یہ کام بہتر نہیں اس لئے اس کام سے اجتناب کرلے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ دعا پڑھتے وقت خط کشیدہ الفاظ ''او قال '' دونوں جگہ نہ پڑھے باقی تمام دعاء پڑھ لے زیادہ تفصیل راقم کے نورالایضاح کے حاشیہ ذریعۃ النجاح میں طلباء کرام دیکھیں۔

امت مصطفیٰ ﷺ کی خوش بختی:

نبی کریم ﷺ کو معراج کی رات پچاس نمازوں کا حکم دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہوتے رہے نمازیں معاف ہوتی رہیں۔ پانچ رہ گئیں لیکن تعداد کے لحاظ پر اگرچہ نمازیں کم ہو گئیں ثواب کے لحاظ پر رب تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کے لئے کوئی کمی نہیں کی۔ بلکہ یہ فرمایا '' **من جاء بالحسنة فله عشر امثالها** '' جو شخص ایک نیکی کرے گا اس کو ثواب دس کا ہوگا۔ یعنی ایک نماز ادا کرنے سے ثواب دس کا اور پانچ ادا کرنے سے ثواب پچاس کا ہی عطا کروں گا پیارے نبی کے واسطہ سے پیارے نبی کی پیاری امت کا کتنا عظیم مرتبہ ہے اور کتنی خوش بختی ہے۔ مقام تعجب یا مقام افسوس یہ ہے کہ کچھ لوگ انبیاء کرام کو معاذ اللہ مردہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے لیکن نمازیں وہ بھی پانچ ہی ادا کرتے ہیں پچاس نہیں ادا کرتے پانچ نمازیں ادا کر کے کبھی ہوش وحواس کو قائم رکھتے ہوئے سوچ تو لیا کریں کہ پچاس سے پانچ تو موسیٰ علیہ السلام کی مہربانی سے ہوئیں موسیٰ علیہ السلام اگر نبی کریم ﷺ کو بار بار رب تعالیٰ

کے حضور نہ بھیجتے تو پانچ کیسے ہوتیں۔

☆ "الصلوة معراج المؤمنين" "نماز مومنوں کی معراج ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں دیکھیں اتنی بات عرض کرنی مقصود ہے کہ اے امت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء اپنی خوش بختی کو دیکھ کر تجھے نماز ادا کرتے ہوئے تجلیات باری تعالیٰ کا شرف حاصل ہوتا ہے اور تجھے اپنے محبوب ﷺ کا معراج یاد آتا ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اور تجھے کیا قسمت حاصل ہوگی کہ تو رب تعالیٰ کی عبادت بھی کر رہا ہے اور اپنے یار (مصطفیٰ کریم ﷺ) کی اداؤں کو بھی اپنا رہا ہے۔ نماز ادائے یار کی یاد کیسے؟ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صلوا كما رأيتموني اصلي" تم نماز ایسے ادا کرو جیسے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔

واضح ہوا کہ نماز اپنے محبوب ﷺ کے طور طریقہ کا نام ہے اور نماز میں وہی یاد تازہ ہوتی ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ کی یہ خصوصیت ہے کہ انہیں پانچ نمازیں حاصل ہوئیں اور کسی امت کو پانچ نمازیں حاصل نہیں ہوئیں:

نماز فجر: حضرت آدم علیہ السلام نے صبح ہونے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ادا کی کیونکہ انہوں نے جنت میں رات نہیں دیکھی تھی۔ (شامی جلد اول)

نماز ظہر: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ادا کی جب کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی جان محفوظ رہی اور قربانی کا ثواب بھی حاصل ہوگیا اور دنبہ بطور قربانی مل گیا اس کا شکریہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ظہر کی نماز ادا کر کے کیا۔

نماز عصر: حضرت عزیر علیہ السلام نے ادا کی جب کہ آپ کو سو برس کے بعد زندہ کیا گیا۔

نماز مغرب: حضرت داؤد علیہ السلام نے استغفار کی قبولیت کے شکر ادا کرتے ہوئے ادا کی اس لئے کہ آپ کی استغفار کی قبولیت کا وقت مغرب تھا۔

نماز عشاء: حضور ﷺ نے ادا کی یہ نماز حضور ﷺ کی خصوصیت ہے جس طرح پانچ نمازیں ادا کرنا آپ کی خصوصیت ہے۔

(از تفسیر الحسنات)

نماز فرشتوں کی عبادت کا مجموعہ:

فرشتوں میں سے بعض وہ ہیں جو قیام کی حالت میں ہی فقط رب تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں ان کو رکوع وسجود وغیرہ حاصل نہیں بعض فرشتے صرف رکوع کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں ان کو قیام اور سجدہ حاصل نہیں بعض فرشتے صرف سجدہ کی حالت میں رب تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں ان کو قیام اور رکوع حاصل نہیں۔ بعض فرشتے صرف تسبیح وتہلیل سے رب تعالیٰ کو یاد کر رہے ہیں۔

اے نبی کریم ﷺ کے امتی کبھی تو نے غور بھی کیا ہے کہ تجھے نماز جیسی عظیم عبادت حاصل ہے جس میں قراءت بھی ہے تسبیحات بھی ہیں رب تعالیٰ کی ثناء بھی ہے مصطفیٰ کریم ﷺ پر صلوۃ وسلام بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر سلام بھی ہے اس میں قیام بھی ہے رکوع بھی ہے سجود بھی ہے قعدہ بھی ہے۔

واضح ہوا کہ فرشتوں کی مجموعی عبادت یا اُن کی مجموعی عبادت سے بھی بڑھ کر تجھے عبادت حاصل ہے اسی کا نام نماز ہے۔ (از نعیمی)

نماز تمام مخلوق کی عبادت کا مجموعہ:

انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لئے اسے تمام مخلوق کی عبادات حاصل ہیں کیونکہ درخت ہمیشہ قیام کر کے رب تعالیٰ کو یاد کر رہے ہیں اور چوپائے ہمیشہ رکوع کی حالت میں رب تعالیٰ کو یاد کر رہے ہیں اور سانپ، بچھو وغیرہ سجدہ کی حالت میں رب تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں اور مینڈک قعدہ کی حالت میں رب تعالیٰ کی یاد کر رہے ہیں۔ انسان جب نماز ادا کرتا ہے تو اسے تمام مخلوق کی مجموعی عبادات حاصل ہو جاتی ہیں۔ تمام مخلوق کا رب تعالیٰ کو یاد کرنا رب تعالیٰ نے خود ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ ہر چیز رب تعالیٰ کی تسبیح وحمد بیان کرتی ہیں۔ (از نعیمی)

حاتم زاہد رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

کسی شخص نے حاتم زاہد سے سوال کیا کہ تم نماز کس طرح ادا کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا نماز کے وقت کے قریب آنے پر اچھی طرح وضو کرتا ہوں پھر نماز ادا کرنے کی جگہ آ کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور دل

میں یہ تصور کرتا ہوں کہ کعبہ میری نظر کے سامنے ہے اور مقام ابراہیم کو میں دیکھ رہا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ میرے پاس ہے جو میرے حال کو دیکھ رہا ہے اور میں یوں خیال کرتا ہوں کہ میرے قدم پل صراط پر ہیں جنت میری دائیں طرف ہے اور جہنم میری بائیں طرف ہے اور ملک الموت (عزرائیل) میرے پیچھے کھڑا ہے ۔ اور جو نماز بھی ادا کرتا ہوں اسے آخری نماز سمجھتا ہوں پھر تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کرتا ہوں پھر قرآن پاک کے الفاظ کے معانی پر غور کرتے ہوئے قراءت کرتا ہوں بڑی عاجزی سے رکوع کرتا ہوں ۔ عجز وانکساری سے سجدہ کرتا ہوں اور نماز کی قبولیت کی امید رکھتے ہوئے تشہد پڑھتا ہوں اور سنت کے مطابق سلام پھیرتا ہوں ۔ پھر نماز سے فارغ ہونے پر نماز کی قبولیت کی امید کرتا ہوں لیکن مردود ہونے کا خوف بھی کرتا ہوں ۔

(از روح البیان)

سبحان اللہ ایمان کامل ہے ہی یہی " الایمان بین الخوف والرجاء " ایمان امید اور خوف کے درمیان ہے ۔ اللہ تعالیٰ کرے ہمیں بھی اسی طرح نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل ہو جائے جیسا کہ حاتم زاہد رحمہ اللہ کو حاصل تھی ۔

نماز ذریعہ ولایت:

" عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله تعالٰی قال من عادی لی ولیا فقد آذنته بالحرب وماتقرب الی عبدی بشئی احب الی مما افترضت علیه ومایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببته فاذا احببته فکنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها ۔ رواه البخاری " (مشکوۃ باب ذکر اللہ عزوجل)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے میرے ولی سے دشمنی کی میں اسے لڑائی کا یقین دلاتا ہوں اور جب میرا بندہ میرے قریب ہوتا ہے ان چیزوں سے جو میں نے اس پر فرض کیں وہ میرا محبوب ہوتا ہے اور نوافل کے ذریعے میرا بندہ میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی بصر بن جاتا ہوں جس وہ دیکھتا ہے اور میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے ۔

وضاحت حدیث: "من عادی" سے مراد اذیت پہنچانا "ولیا" سے مراد اللہ تعالیٰ کی ولیوں میں سے کوئی ایک ولی یعنی جس شخص نے میرے ولیوں میں سے کسی ایک ولی کو ایذاء پہنچائی "فقد آذنته ای اعلمته" میں نے اسے بتادیا علم دے دیا یقین کرادیا یعنی "اعلمته بمحاربتی ایاه لاجل ولی" میں نے اسے بتادیا ہے کہ میری لڑائی اس سے ہے کیونکہ اس کی لڑائی میرے ولی سے ہے یا یہ مطلب ہے "اعلمته بمحاربته ایای" کہ میں نے اسے یہ یقین کرادیا ہے بتادیا ہے کہ تیری لڑائی میرے ساتھ ہے کیونکہ اس کا میرے ولی کو ایذاء پہنچانا مجھے ایذا پہنچانا ہے میرے ولی سے دشمنی میرے ساتھ دشمنی ہے اور میرے ولی سے لڑنا میرے ساتھ لڑنا ہے" وما یتقرب عبدی" میں "عبدی" سے مراد مومن بندہ ہے جس طرح غلام اپنے آقا کی خدمت کرکے اس کا قرب حاصل کرتا ہے اسی طرح مومن اللہ تعالیٰ کے فرائض ادا کر کے اس کا قرب حاصل کرتا ہے اور پھر نوافل کے ذریعے اور زیادہ قرب حاصل کرنے کی کوشش میں رہتا ہے وہ شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے تو دور ودراز سے سن لیتا ہے کیونکہ اس کے کانوں میں طاقت ربی جلوہ گر ہوتی ہے یہی کیفیت اسے دیکھنے، پکڑنے اور چلنے میں بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

نماز کے متعلق بحث پہلے ہی طویل ہوگئی اس لئے قرطبی میں جن مسائل کا ذکر کیا گیا ہے ان سے صرف نظر کر رہا ہوں فقہی مسائل فقہ کی کتب میں دیکھے جائیں اور غیر مقلدین سے اختلافی مسائل راقم کی کتاب "نماز حبیب کبریا" میں دیکھے جائیں۔

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾

"اور جو ہم نے ان کو رزق دیا اس سے وہ خرچ کرتے ہیں"

"مِمَّا" اصل میں "من ما" ہے "من" اگر تبعیضیہ ہو تو ترجمہ وہی ہوگا جو بھی نقل کیا جا چکا ہے یعنی وہ اپنے رزق سے بعض مال خرچ کرتے ہیں بہتر یہی ہے کہ تمام مال خرچ کر کے خود مانگنا نہ شروع کر دے لیکن یہ حکم عام لوگوں کے لئے ہے۔ جو لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح کامل طور پر اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنے والے ہوں وہ تمام کا تمام مال خرچ کر دیں تو ان کے لئے یہی

بہتر ہوگا اس لئے کہ وہ بعد میں پیشمان نہیں ہوں گے کسی سے نہیں مانگیں گے۔ اس صورت میں "من" ابتدائیہ ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ "جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں" "ما" میں تین احتمال ہیں:

(۱) موصولہ ہو (۲) موصوفہ ہو (۳) مصدریہ ہو۔ (از بیضاوی)

ر ز ق: جب راء پر فتحہ (زبر) ہو تو مصدر ہوگا اور راء کے نیچے کسرہ (زیر) ہو تو اسم ہوگا جس کا معنی ہوگا عطا کیونکہ مصدر کی صورت میں معنی ہوگا عطا کرنا ﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ جو ہم نے ان کو عطا کیا یعنی رزق کا لغوی معنی ہے "حظ، نصیب" حصہ۔ یہ مال کو بھی شامل ہے اور غیر مال کو بھی جس طرح کہا جاتا ہے "اللھم ارزقنی ولد اصالحا او زوجۃ صالحۃ" اے اللہ مجھے نیک اولاد عطا فرما اے اللہ مجھے نیک زوجہ عطا فرما۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "اللھم ارزقنی عقلا اعیش بہ" اے اللہ مجھے عقل عطا فرما جس کے ذریعے میں زندگی گزار سکوں۔

تنبیہ: ہر وہ مال جو انسان کو حاصل ہے وہ رزق ہے خواہ حلال ہو یا حرام ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ زمین میں ہر چلنے والی چیز کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لیا۔ جب ہر ذی روح چیز کا رازق اللہ تعالیٰ ہے تو یقیناً حرام کو بھی رزق کہا جائے گا کیونکہ کئی لوگ زندگی بھر چوری، ڈاکہ وغیرہ حرام طریقہ سے مال حاصل کرتے ہیں۔

ہاں البتہ حرام کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کرنا ادب کے خلاف ہے جس طرح کہ یہ تو کہا جا سکتا ہے "خالق المخلوقات" تمام مخلوق کو پیدا کرنے والا اس کے ضمن میں تو تمام مخلوق چھوٹی، بڑی عظمت والی یا رذیل آ گئی ہے۔ لیکن علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا ہو تو عظمت والی چیزوں کا ذکر ہوگا یوں تو کہا جا سکے گا "خَالِقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" زمین و آسمان کا خالق اسی طرح یہ کہنا صحیح ہے "خالق المحدثات" تمام کائنات کا خالق" یہ کہا جائے تو درست ہے "خالق العرش والکرسی" عرش اور کرسی کا خالق۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں "خالق الکلاب والخنازیر" کتوں اور خنزیروں کا خالق حالانکہ رب تعالیٰ ان کا خالق تو ہے لیکن صرف گھٹیا چیزوں کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کرنا اس کی عظمت شان کے خلاف ہے۔

اب اس بحث کے بعد ایک حدیث پاک کو سمجھنا آسان ہو جائے گا اور معتزلہ کی دلیل کا رد بھی ہو جائے گا۔ حضرت صفوان ابن امیہ کہتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے آپ کے پاس عمرو ابن قرہ آیا اس نے کہا یا رسول اللہ:

" ان الله کتب علی الشقوة فلا ارانی ارزق الا من دفی بکفی فائذن لی فی الغناء من غیر فاحشة فقال علیه السلام لااذن لک ولا کرامة ولا نعمة کذبت.ای عدو الله لقد رزقک الله رزقا طیبا فاخترت ما حرم الله علیک من رزقه مکان مااحل الله من حلاله اما انک لوقلت بعد هذه المقدمة شیا ضربتک ضربا وجیعا "

" بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے لئے بدبختی کو لکھ دیا ہے میرا رزق صرف دف بجانے میں ہے اس لئے آپ مجھے گانا گانے کی اجازت فرمائیں فحش گانا نہیں ہوگا نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دیتا یہ کوئی عزت والا کام نہیں اور نہ ہی یہ نعمت ہے اے اللہ تعالیٰ کے دشمن تم نے جھوٹ بولا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حلال رزق عطا فرمایا لیکن تم نے حلال رزق کے بدلے حرام کو پسند کر لیا ہے اگر تم نے اس بیان کے بعد پھر ایسا کہا تو تمہیں بہت شدید مارا جائے گا "

معتزلہ نے اسی حدیث کو دلیل بنایا تھا کہ حرام رزق نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حرام کو رزق کہنے پر ناراضگی کا اظہار فرمایا لیکن ابھی تک جو بحث بیان کی اس سے واضح ہو گیا کہ حرام رزق کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کرنا اس کی شان عظمت کے لائق نہیں اگر چہ ہے تو رزق۔

اسی حدیث سے ایک اور مسئلہ واضح ہو گیا کہ انسان فاعل مختار ہے اپنے اختیار سے اچھائی یا برائی کرتا ہے اسی پر جزاء خیر اور سزا کی دارومدار ہے۔ (از کبیر)

رزق حرام کے صدقہ کا کوئی ثواب نہیں:

حرام اگر چہ رزق ہے لیکن رزق حلال کے صدقہ کا ثواب ہے " لو عمل الخیر بمال مغصوب لا ثواب الغاصب فیه لانه آثم " (از روح المعانی) غصب کئے گئے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کا غاصب کو کوئی ثواب حاصل نہیں ہوگا اس لئے کہ اس کا غصب کرنا گناہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے

فرمایا " لایقبل اللہ صدقۃ من غلول " مال غنیمت میں خیانت کر کے صدقہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں فرماتا اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ان اللہ طیب لا یقبل الاطیبا " بیشک اللہ تعالیٰ طیب ہے طیب کے بغیر کسی اور چیز کو قبول نہیں فرماتا۔

معتزلہ نے ان احادیث کو دلیل بنایا ہے کہ حرام رزق نہیں لیکن جب یہ واضح ہوگیا کہ حرام رزق ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی راہ میں ثواب کی غرض سے صدقہ کرنا درست نہیں تو اسی سے معتزلہ کا رد بھی ہوگیا (از کبیر)

ینفقون: انفاق سے لیا ہوا ہے انفاق کا معنی ہے ''مال کا ہاتھ سے نکالنا'' " نفق المبیع نفاقا " اس وقت بولتے ہیں جب کسی چیز کے خریدار بہت ہو جائیں یعنی ایک دوسرے کے ہاتھ سے نکالنا چاہتے ہیں " نفقت الدابۃ " بولتے ہیں جب کہ جانور مر جائے اور اس کی روح نکل جائے۔ اسی سے لیا ہوا ہے "ان تبتغی نفقا فی الارض "تو زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرلو۔ اس میں بھی ایک طرف سے داخل ہونا دوسری جانب سے نکلنا ہوتا ہے۔

عربی کا شاندار ضابطہ:

ہر وہ کلمہ جس کے فاء کلمہ میں نون ہو اور عین کلمہ میں فاء ہو اس کا معنی ہوتا ہے جانا، نکلنا، نفق الشی، کسی چیز کا ختم ہونا نفق البیع بیع کا رائج ہونا یعنی زیادہ خریداروں کا پایا جانا۔ انفق، خرچ کرنا۔ نفل، عطیہ دینا۔ نق، جھاڑنا یعنی تنکے وغیرہ ہٹانا۔ نقض القدر ہنڈیا کا زور سے ابلنا یعنی پانی وغیرہ کا باہر نکلنا۔ نفث منہ سے تھوک پھینکنا۔ نفج خرگوش یا جنگلی چوہے کا دوڑ کر نکل جانا۔ نفح، ہوا کا چلنا، رگ سے خون نکلنا۔ نفخ، پھونکنا۔ نفد، ختم ہونا۔ نفذ، جاری کرنا تیر کو شکار سے پار کرنا۔ نفر، بھاگنا۔ نفس، سانس نکالنا۔ نفش، روئی کا دھنا اور روئی کے ذرات کا اڑنا۔ نفص، پیشاب کرنا۔ نفطت القدر ہنڈیا کا جوش مارنا۔

اتنے عظیم ضوابط کسی زبان میں نہیں ملیں گے جو عربی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ (از بیضاوی ومنجد)

اصل مسئلہ کی طرف توجہ کریں:

قرآن پاک کا ہدایت ہونا متقین کے لئے ذکر فرمایا پھر متقین کی علامات کو ذکر فرمایا ان میں

سے دو کے متعلق کچھ وضاحت کر دی ایک ایمان بالغیب اور دوسری نماز قائم کرنا اب تیسری علامت متقین کی ذکر کی جارہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے خرچ کرتے ہیں۔

یہاں کون سا خرچ کرنا مراد ہے:

بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد زکوۃ ہے اس لئے کہ پہلے نماز قائم کرنے کا ذکر کیا اور اس کے بعد مال خرچ کرنے کا ذکر کیا قرآن پاک میں بہت سے مقامات ہیں جہاں نماز قائم کرنے اور زکواۃ ادا کرنے کو ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے کہیں فرمایا "اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ" کہیں فرمایا "واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ" کہیں فرمایا یقیمون الصلوۃ ویؤتون الزکوۃ، "روی عن ابن عباس لمقارنتها" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما سے بھی یہی ذکر کیا گیا ہے اور آپ نے بھی یہاں سے مراد زکوۃ ہی لیا ہے دلیل ان کی بھی یہی ہے کہ نماز قائم کرنے کے ساتھ مال کا خرچ کرنا ذکر فرمایا ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ یہاں سے مراد مرد کا اہل وعیال پر خرچ کرنا ہے" روی عن ابن مسعود لان ذلک افضل النفقة" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے افضل خرچ کرنا بیان فرمایا ہے۔

مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" دینار انفقته فی سبیل اللہ و دینار انفقته فی رقبة و دینار تصدقت به علی مسکین و دینار انفقته علی اهلک اعظمها اجرا الذی انفقته علی اهلک "

ایک دینار تم نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا ایک دینار تم نے غلام آزاد کرانے میں خرچ کیا ایک دینار تم نے مسکین کو بطور صدقہ دیا اور ایک دینار تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا تو اس پر تمہیں عظیم اجر حاصل ہوگا جو تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ اس وقت ہے جب اہل وعیال پر خرچ کرنا ضروری ہو وہ اس کے محتاج ہوں تو ان کا نفقہ اس پر فرض ہے فرض کی ادائیگی پہلے ہے نفل بعد میں اور اپنے ہی اہل وعیال پر خرچ کرنے میں صلہ رحمی بھی پائی گئی لیکن جب اہل وعیال محتاج نہیں ان کا مال ان کی کفایت کر رہا ہو تو اب

سے دو کے متعلق کچھ وضاحت کر دی ایک ایمان بالغیب اور دوسری نماز قائم کرنا اب تیسری علامت متقین کی ذکر کی جارہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے خرچ کرتے ہیں۔

یہاں کون سا خرچ کرنا مراد ہے:

بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد زکوۃ ہے اس لئے کہ پہلے نماز قائم کرنے کا ذکر کیا اور اس کے بعد مال خرچ کرنے کا ذکر کیا قرآن پاک میں بہت سے مقامات ہیں جہاں نماز قائم کرنے اور زکواۃ ادا کرنے کو ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے کہیں فرمایا "اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ" کہیں فرمایا "واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ کہیں فرمایا یقیمون الصلوۃ ویؤتون الزکوۃ ، "روی عن ابن عباس لمقارنتها" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی ذکر کیا گیا ہے اور آپ نے بھی یہاں سے مراد زکوۃ ہی لیا ہے دلیل ان کی بھی یہی ہے کہ نماز قائم کرنے کے ساتھ مال کا خرچ کرنا ذکر فرمایا ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ یہاں سے مراد مرد کا اہل وعیال پر خرچ کرنا ہے" روی عن ابن مسعود لان ذلک افضل النفقة" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے افضل خرچ کرنا بیان فرمایا ہے۔

مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" دینار انفقته فی سبیل الله و دینار انفقته فی رقبة و دینار تصدقت به علی مسکین و دینار انفقته علی اهلک اعظمها اجرا الذی انفقته علی اهلک "

ایک دینار تم نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا ایک دینار تم نے غلام آزاد کرانے میں خرچ کیا ایک دینار تم نے مسکین کو بطور صدقہ دیا اور ایک دینار تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا تو اس پر تمہیں عظیم اجر حاصل ہوگا جو تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ اس وقت ہے جب اہل وعیال پر خرچ کرنا ضروری ہو وہ اس کے محتاج ہوں تو ان کا نفقہ اس پر فرض ہے فرض کی ادائیگی پہلے ہے نفل بعد میں اور اپنے ہی اہل وعیال پر خرچ کرنے میں صلہ رحمی بھی پائی گئی لیکن جب اہل وعیال محتاج نہیں ان کا مال ان کی کفایت کر رہا ہو تو اب

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا نفلی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان فرائض ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور فرائض ادا کرنے کے بعد نوافل ادا کر کے ہمیشہ عادت بنا کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے والا اور ہی زیادہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفلی صدقہ ادا کرنے کی طاقت نہ ہو تو پہلے فرض اور واجب ذمہ داریوں کو پورا کرے۔

☆ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" افضل دینار ینفقه الرجل دینار ینفقه علی عیاله و دینار ینفقه الرجل عي دابته في سبیل الله عزوجل و دینار ینفقه علی اصحابه في سبیل الله "

" افضل وہ دینار ہے جو انسان نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا بنسبت اس دینار کے جو اللہ تعالیٰ کی راہ کے لئے (جہاد کے لئے) سواری خریدنے پر خرچ کیا اور بنسبت اس دینار کے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کیا"

☆ ابوقلابہ نے کہا کہ ابتدا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے سے کی جائے پھر ابوقلابہ نے کہا " ای رجل اعظم اجرا من رجل ینفق علی عیال صغار بعضهم او ینفعهم الله به ویغنیهم " وہ کون سا شخص ہوگا جس کا مرتبہ عظیم ہوگا اس شخص سے جو اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرتا ہے کہ ان کو یہ مال کفایت کر جائے۔ وہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں اور ان کو اللہ تعالیٰ اس مال کے ذریعے نفع دے اور بے پرواہ کر دے " وقیل المراد صدقة التطوع " بعض حضرات نے کہا کہ یہاں صدقہ سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ اس پر ضحاک کی یہ دلیل ہے کہ زکوۃ جہاں بھی مراد ہے وہاں لفظ زکوۃ ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اور جہاں زکوۃ کا لفظ نہیں ذکر وہاں احتمال ہوگا کہ یہاں سے مراد فرض صدقہ ہے یا کہ نفلی لیکن جب " انفاق " ذکر ہوگا وہاں مراد نفلی صدقہ ہی ہوگا۔

بعض حضرات نے کہا یہاں خرچ کرنے سے مراد زکوۃ کے علاوہ حقوق واجبہ ہیں جن کا تعلق مال سے ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ ذکر فرمایا تو واجب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے لیکن لفظ زکوۃ ذکر نہیں فرمایا تو پتہ چل گیا کہ زکوۃ کے علاوہ دوسرے مالی حقوق واجبہ ہیں۔

صحیح قول یہ ہے: " هو عام وهو الصحیح " خرچ کرنے سے مراد عام ہے جو زکوۃ

اور دوسرے وجوبی صدقات اور نفلی صدقات کو شامل ہے یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ (از قرطبی)

تمام اقوال کو جامع قول: یعنی جو ابھی بیان کیا کہ مراد عام ہے یہی قول تمام اقوال کو جامع ہے ان تمام اقوال کے لئے جامع عبارت ملاحظہ ہو:

" ینفقون ای یخرجون ویتصدقون فی طاعة الله تعالیٰ وسبیله ویدخل فیه انفاق الواجب کزکوة والنذر والانفاق علی النفس وعلی من تجب نفقته علیه والانفاق فی الجهاد اذا وجب علیه والانفاق فی المندوب وهو صدقة التطوع ومواساة الاخوان وهذه کلها مما یمدح بها " (خازن)

ینفقون کا معنی ہے نکالنا یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا اور اس کی طاعت کے لئے خرچ کرنا یہاں جو مراد ہے وہ عام ہے صدقات واجبہ اور مستحبہ دونوں کو شامل ہے واجب طور پر خرچ کرنا جیسے زکوۃ، نذر اپنی ذات پر خرچ کرنا اور جن لوگوں کا خرچ اس کے ذمہ ہے ان پر خرچ کرنا اور جب اس پر جہاد فرض ہو تو جہاد کے لئے خرچ کرنا۔ مستحب طور پر خرچ کرنا ہر قسم کے نفلی صدقات اور اپنے اقرباء اور اپنے مومن بھائیوں کی امداد کے لئے خرچ کرنا۔ ان تمام قسم کے خرچ کرنے کی تعریف قرآن وحدیث میں بیان کی گئی ہے یعنی ان پر انسان کو اجر عظیم حاصل ہوتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سات قسم کا مال خرچ کرنا شریعت میں عبادت ہے:

(۱) فرض زکوۃ ادا کرنا نقد مال سے جب وہ نصاب کو پہنچ جائے اور سال اس پر گزر جائے مویشیوں اور مال تجارت سے زکوۃ ادا کرنا اور زمین کی پیداوار سے عشر ادا کرنا (تفصیل فقہی کتب میں دیکھی جائے)۔

(۲) صدقہ فطر، رمضان میں ادا کردے یا شوال کا چاند دیکھنے پر ادا کردے عید کی نماز سے پہلے ادا کرنا بہتر البتہ بعد میں ادا ہو سکے گا۔

(۳) خیرات یعنی سوال کرنے والوں کو دینا، مہمانوں کو کھانا کھلانا ضعیف اور یتیم لوگوں کی امداد

کرنا اور قرض دینا یہ تمام قسم کے نفلی صدقات ہیں جو زکوۃ کے علاوہ ہیں۔

(۴) مال کو اللہ کی راہ میں وقف کرنا مسجد بنانا، دینی مدارس بنانا، پل بنانا، کنواں بنانا، مہمانوں یعنی مسافروں کے لئے سرائے بنانا۔

(۵) حج کے لئے مال خرچ کرنا جب کہ اس کے پاس اتنا مال ہو جو اس کے آنے جانے اور وہاں رہنے کے اخراجات کے لئے کافی ہو اور جتنا وقت اس کا حج پر صرف ہو اتنے وقت کے لئے اس کے اہل وعیال کا خرچ بھی موجود ہو۔

(۶) جہاد کے لئے مال خرچ کرنا کیونکہ جہاد کے لئے ایک درہم خرچ کرنا سات سو درہم اور جگہ پر خرچ کرنے کے برابر ثواب حاصل کرتا ہے

(۷) نفقات واجبہ، یعنی زوجہ پر خرچ کرنا، چھوٹی اولاد پر خرچ کرنا اور اپنے محارم کی مجبوری اور معذوری کے وقت اپنی طاقت کے مطابق ان پر خرچ کرنا۔ (از عزیزی)

نتیجہ واضح ہوا اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا قابل مدح اور علامت تقویٰ ہے اور بخل سے کام لینا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں نہ خرچ کرنا قابل مذمت ہے۔

سخاوت کی تعریف اور بخل کی مذمت پر احادیث مبارکہ:

”عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لو كان لي مثل احد ذهبا لسرني ان لا يمر علي ثلاث ليال وعندي منه شئي الا شئي ارصده لدين“ (رواه البخاری، مشكوة باب الانفاق وكراهية الامساس)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میرے پاس احد (پہاڑ) کے برابر سونا ہو تو مجھے یہ پسند ہے کہ اس پر تین راتیں نہ گزرنے پائیں کہ میرے پاس اس میں سے کچھ باقی رہے ہاں البتہ اتنا مال صرف باقی رہے جس سے میں قرض ادا کردوں“

جنت کے وسط میں پہنچنے سے پہلے ہی روزہ داروں کو شراب طہور پلا کر سیراب کر دیا جائے گا ان کی پیاس کو ختم کر دیا جائے گا۔ چونکہ انہوں نے دنیا میں پیاس کو برداشت کیا تھا جنت میں ان کو یہ انعام دیا جائیگا۔

(از مرقاۃ ج۴ص ۲۰۱،۲۰۲)

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی بہت واضح ہے سخاوت کی تعریف حدیث پاک سے عیاں ہورہی ہے کہ نبی کریم ﷺ اسے پسند فرماتے تھے کہ اگر مجھے احد پہاڑ کے برابر سونا مل جائے تو وہ میرے پاس یوں ہی تین راتیں نہ رہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے ہاں البتہ اتنا مال میرے پاس باقی رہ جائے جس سے میں اپنا قرض ادا کرسکوں۔

فائدہ: قرض کی ادائیگی کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے پاس رکھنے کی تمنا کر کے اس مسئلہ کی طرف اشار کر دیا:

"ان اداء الدين مقدم على الصدقة و كثير من جهلة العوام وظلمة الطغام يعملون الخيرات والمبرات والعمارات وعليهم حقوق الخلق ولم يلتفقوا اليها"

بیشک قرض ادا کرنا صدقہ سے پہلے ہے عوام میں کثیر طور پر جہلاء اور بہت سے کمینے ظالم لوگ نیکی کے کاموں میں اور مساجد مدارس وغیرہ کی تعمیر میں خرچ کرتے رہتے ہیں حالانکہ ان پر لوگوں کے حقوق ہوتے ہیں جن کی وہ پرواہ نہیں کرتے فرائض کو پیچھے کر دینا اور نوافل کو مقدم کرنا سوائے جہالت کے اور کچھ نہیں:

"وهكذا كثير من المتصوفة غير العارفة يجتهدون فى الرياضات وتكثير الطاعات والعبادات وما يقومون بما يجب عليهم من الديانات"

اسی طرح بہت سے جاہل صوفیاء ریاضت میں کوشش کرتے ہیں بڑی طاعت کرتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں لیکن یہ سب نفلی کام کرتے ہیں دین میں واجب کاموں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور ان کو ادا نہیں کرتے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۸۴)

اس لئے علماء، طلباء، صوفیاء کے لئے ضروری ہے کہ وہ محافل کو قائم کریں تو نماز کے وقت نماز ادا کریں اتنی لمبی محافل نہ ہوں کہ لوگ نماز پڑھے بغیر چلے جائیں اکثر طور پر یہ خامی دیکھنے میں آتی ہے جس کی طرف توجہ کی بہت ضرورت ہے۔

☆ "عن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ مامن يوم يصبح العباد فيه الاملكان ينزلان فيقول احدهما اللهم اعط منفقا خلفا ويقول الآخر اللهم اعط ممسكا تلفا"

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الانفاق.....الخ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسا دن نہیں جس کی صبح کو بندوں کے پاس دو فرشتے نہ نازل ہوتے ہوں ان میں سے ایک کہتا ہے اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ بخیل کے مال کو ہلاک کر۔

وضاحت حدیث: جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اس کے لئے نازل ہونے والے دو فرشتوں میں سے ایک رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے اے اللہ اسے اس کا عظیم بدلہ عطا فرما یعنی اسے اچھا بدلہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عطا فرما۔ یہ دعا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے ﴿وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَھُوَ یُخْلِفُہٗ وَھُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ﴾ اور جو چیز تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو وہ اس کے بدلے اور دے گا اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے مال خرچ نہیں کرتا بخل سے کام لیتا ہے اس کے لئے دوسرا فرشتہ یہ دعا کرتا ہے اے اللہ اس کے مال کو برباد کر دے۔ اس دعا کا ایک مطلب تو یہ ہی ہوسکتا ہے کہ اس کا مال ظاہری طور پر برباد ہو جائے اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے مال میں خیر و برکت ختم ہو جائے۔ (از مرقاۃ ج۴ ص۱۸۴)

☆ "عن اسماء قالت قال رسول اللہ ﷺ انفقی ولا تحصی فیحصی اللہ علیک ولا توعی فیوعی اللہ علیک ارضحی ما استعطت" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب انفاق الخ)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم خرچ کرو شمار نہ کرو اللہ تعالیٰ تم پر شمار کرے گا روک کر نہ رکھو اللہ تعالیٰ تم پر روک کر رکھے گا عطا کرو جتنی تمہیں طاقت ہو۔

وضاحت حدیث: حضرت اسماء بنت صدیق رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو۔

لا تحصی: تم شمار نہ کرو اس کے مختلف معانی معتبر ہیں ایک تو یہ کہ تم مال زیادہ سے زیادہ رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو باقی جمع کر کے نہ رکھو اس لئے جو مال جمع ہوتا ہے انسان اسے گنتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم جو مال بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دو اسے زیادہ سمجھو گن گن کر نہ دو کیونکہ جب تم یہ سمجھو گی کہ یہ مال تو تھوڑا ہے تو اس طرح تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرسکو گی۔

راقم کے نزدیک تیسرا معنی یہ ہے کہ تم مال کو رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس لئے نہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسا دن نہیں جس کی صبح کو بندوں کے پاس دو فرشتے نہ نازل ہوتے ہوں ان میں سے ایک کہتا ہے اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ بخیل کے مال کو ہلاک کر۔

وضاحت حدیث: جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اس کے لئے نازل ہونے والے دو فرشتوں میں سے ایک رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے اے اللہ اسے اس کا عظیم بدلہ عطا فرما یعنی اسے اچھا بدلہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عطا فرما۔ یہ دعا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے ﴿وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُه‘ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ اور جو چیز تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو وہ اس کے بدلے اور دے گا اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے مال خرچ نہیں کرتا بخل سے کام لیتا ہے اس کے لئے دوسرا فرشتہ یہ دعا کرتا ہے اے اللہ اس کے مال کو برباد کر دے۔ اس دعا کا ایک مطلب تو یہ ہی ہوسکتا ہے کہ اس کا مال ظاہری طور پر برباد ہو جائے اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے مال میں خیر و برکت ختم ہو جائے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۸۴)

☆ "عن اسماء قالت قال رسول الله ﷺ انفقي ولا تحصي فيحصي الله عليك ولا توعي فيوعي الله عليك ارضحي ما استطعت" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب انفاق ... الخ)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم خرچ کرو شمار نہ کرو اللہ تعالیٰ تم پر شمار کرے گا روک کر نہ رکھو اللہ تعالیٰ تم پر روک کر رکھے گا عطا کرو جتنی تمہیں طاقت ہو۔

وضاحت حدیث: حضرت اسماء بنت صدیق رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو۔

لا تحصي : تم شمار نہ کرو اس کے مختلف معانی معتبر ہیں ایک تو یہ کہ تم مال زیادہ سے زیادہ رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو باقی جمع کر کے نہ رکھو اس لئے جو مال جمع ہوتا ہے انسان اسے گنتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم جو مال بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دو اسے زیادہ سمجھو گن کر نہ دو کیونکہ جب تم یہ سمجھو گی کہ یہ مال تو تھوڑا ہے تو اس طرح تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر سکو گی۔

راقم کے نزدیک تیسرا معنی یہ ہے کہ تم مال کو رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس لئے نہ

گنوکہ اتنا مال رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا تو باقی تھوڑا رہ جائے گا اس طرح تم اللہ کی راہ میں مال تھوڑے سے تھوڑا خرچ کرسکوگی۔

فیحصی اللہ علیک: اللہ تعالیٰ تم پر شمار کرے گا اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ رب تعالیٰ تمہارے رزق میں کمی کردے گا اس سے برکت اٹھ جائے گی یعنی تمہیں مال تھوڑا تھوڑا گن گن کردے گا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ قیامت کے دن تم سے حساب لے گا تمہارے خرچ کیے ہوئے مال کو شمار کرے گا اور کہے گا کہ میں نے تمہیں کثیر مال عطا کیا تھا تم نے میری راہ میں قلیل مال کیوں خرچ کیا۔

ولا توعی فیوعی اللہ علیک: ایعاء کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو برتن یا تھیلے وغیرہ میں محفوظ کرلینا۔ مطلب یہ ہوا کہ جو مال اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد جو تم سے بچتا ہے اسے محفوظ ہی نہ کرلو فقراء کو اس سے نہ روکو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے لئے فقراء کو مال دو اگر تم نے مال کو جمع کرکے رکھا فقراء کو نہ دیا تو اللہ تعالیٰ بھی تم پر اپنے فضل کو دروازے بند کرکے مال کو محفوظ کرلے گا۔

ارضحی ما استطعت: رضح کا معنی " قلیل عطیه " یعنی تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو بیشک وہ قلیل ہی تمہاری استطاعت کے مطابق ہو " ولا تجعلیه حقیرا فانه ربما یکون عند الله کثیرا وفی میزان القبول کبیرا " تم تھوڑے مال کو حقیر نہ سمجھو (اس لئے کہ خلوص ومحبت سے تھوڑا مال رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا ہوا) اللہ تعالیٰ کے ہاں کثیر ہوتا ہے اور قبولیت کا درجہ عطا کرتے ہوئے اسے میزان میں بھاری سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا یعنی ذرہ بھر نیکی کا کام بھی ضائع نہیں ہوگا بلکہ اس کا بھی عظیم اجر دیا جائے گا جو انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ﴾ اور اگر کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر ہو تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔ مطلب یہی ہے کے نیکی کا عمل تھوڑا سمجھ کر اس سے پیچھے نہ ہو بلکہ یہ سمجھا جائے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم اجر حاصل ہوگا اور اس کے دربار میں شرف قبولیت اسے حاصل ہوگا۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے

﴿وَاِنْ تَکُ حَسَنَةً یُّضَاعِفْهَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ اور اگر کوئی نیکی ہو تو اسے دونی کرتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا ثواب دیتا ہے۔

تھوڑے سے تھوڑا مال خرچ کرنے کا حکم حضرت اسماء کو دے کر آپ نے ایک اور مسئلہ کو طرف اشارہ بھی فرمادیا کہ عورت اپنے خاوند کا مال اس کی اجازت کے بغیر صرف اتنا ہی دے سکتی ہے جتنا عام عادت کے مطابق ہوتا ہے کہ کسی فقیر کو معمولی چیز دے دی جاتی ہے کہ یہ دروازہ سے خالی نہ لوٹے لیکن زیادہ مال اگر خرچ کرنا ہے تو زوج کی اجازت لینی ضروری ہوتی ہے۔ ہاں اگر خاوند کی طرف سے زوجہ کو اپنے مال میں تصرف کرنے کی بلا روک، ٹوک اجازت ہے تو وہ جتنا چاہے خرچ کرسکتی ہے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۸۵)

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ السخی قريب من الله قريب من الجنة قريب من الناس بعيد من النار والبخيل بعيد من الله بعيد من الجنة بعيد من الناس قريب من النار ولجاهل سخی احب الی الله من عباد بخيل " (رواہ الترمذی، مشکوۃ باب الانفاق)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخی اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا جنت کے قریب ہوتا ہے لوگوں کے قریب ہوتا ہے آگ سے دور ہوتا ہے اور بخیل اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے جنت سے دور ہوتا ہے آگ کے قریب ہوتا ہے اور البتہ جاہل سخی اللہ تعالیٰ کو عابد بخیل سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔

وضاحت حدیث: السخی : سخی سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرے۔

قریب من الله : اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ اس کی رحمت کے قریب ہوگا اور یا یہ مطلب ہے کہ " قریب منه فی التخلق بصفة الكرم " وہ رب تعالیٰ کی صفت کرم کو حاصل کرنے کے قریب ہے۔ یعنی سخی کا کتنا عظیم مقام ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی صفت کرم کا مظہر ہے رب تعالیٰ کریم ہے ذاتی طور پر اور اس نے اپنی عطاء اور اپنے فضل سے اپنے بندے کو بھی کریم بنا دیا ہے۔

قریب من الجنة : جنت کے قریب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ سخی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کر کے اپنے ذمہ وجوب کو ادا کر رہا ہے لیکن "یوجب له حسن المال" اس کے لئے یہ اچھے

انجام کا سبب ہے۔

قریب من الناس : لوگوں کے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فقراء پر احسان کر کے ان کے وہ قریب ہو جاتا ہے "وفی الحقیقه هم الناس "حقیقت میں لوگ یعنی انسان فقراء ہی ہیں۔ اور ایک مطلب یہ بھی ہے کہ سخاوت کر کے انسان عوام اور خواص کے قریب ہوتا ہے اس لئے کہ سخی سے ہر شخص محبت کرتا ہے بیشک کسی کو اس کی سخاوت سے فائدہ نہ بھی حاصل ہو جس طرح عادل کی عدالت سے کوئی فائدہ حاصل کرے یا نہ کرے لیکن ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے۔

بعید من النار : سخی آگ سے دور ہوتا ہے:

" لان السخی لم یرتض باخذ مال الحرام وصرفه فی غیر المقاصد العظام والا فیکون مسرفا ولذا قیل لاخیر فی سرف ولا سرف فی الخیر "

اس لئے کہ سخی حرام مال حاصل کرنے کو پسند نہیں کرتا اور مقصد کے بڑے کاموں کے بغیر خرچ نہیں کرتا ورنہ وہ اسراف کرنے والا ہوگا سخی نہیں ہوگا اسی وجہ سے بیان کیا گیا ہے کہ اسراف میں نیکی نہیں اور نیکی میں اسراف نہیں۔

ولجاهل سخی......الخ : البتہ جاہل سخی اللہ تعالیٰ کے عابد بخیل سے زیادہ محبوب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سخی جو فرائض تو ادا کرتا ہے لیکن نوافل نہیں ادا کرتا البتہ وہ علم بھی نہیں رکھتا کہ اس کے ذمہ مالی وجوب کیا ہے اور مستحب کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ہر راہ میں مال خرچ کرتا رہتا ہے وہ اس عابد سے بہتر ہے جو فرائض ادا کرنے کے بعد نوافل بھی ادا کرتا ہے لیکن بخیل ہے حقوق مالیہ ادا نہیں کرتا خواہ وہ عابد عالم ہی کیوں نہ ہو۔

سخی افضل کیوں؟ " لان ترک الدنیا راس کل عبادة " اس لئے کہ دنیا کو چھوڑنا تمام عبادات کی سردار عبادت ہے چونکہ سخی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے خود دنیا کے مال سے محبت نہیں کرتا۔ بخیل کی مذمت کیوں بیان ہوئی؟ "لان حب الدنیا راس کل خطیئة " اس لئے کہ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی اصل ہے چونکہ بخیل رب تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے رب تعالیٰ کی راہ میں ہی اس لئے نہیں خرچ کر رہا کہ اسے دنیا کے مال سے محبت ہے۔

تنبیہ: " من قام بالفرائض وترک النوافل افضل ممن قام بالنوافل وترک الفرائض واکثر الناس مبتلون بهذا البلاء "

جو شخص فرائض کو ادا کرے اور نوافل نہ ادا کرے وہ افضل ہے اس شخص سے جو نوافل ادا کرتا ہے لیکن فرائض کو چھوڑتا ہے اکثر لوگ اس میں مبتلاء ہیں کہ وہ فرائض ادا کرتے کا لحاظ نہیں کرتے نوافل ادا کرنے کے درپے ہوتے۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ جو لوگ فرائض ادا کر کے نوافل بھی ادا کرتے ہیں وہ خوش قسمت ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بھی ہوتے ہیں ان کی عبادت " نور علیٰ نور " ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شرعی قوانین کی پاسداری کرنا ان کے مطابق چلنا ہی کامیابی ہے اور وہی شخص "واصل الی اللہ " ہوتا ہے اپنی مرضی سے راہیں متعین کرنا باعث خسارہ ہے "ولـذا قال بعض العارفين انما حرموا الوصول بتضييع الاصول " اسی وجہ سے کسی عارف نے کیا خوب کہا کہ وہ لوگ جو اصولوں کو ضائع کر دیتے ہیں وہ رب تعالیٰ کے قرب تک پہنچنے سے بھی محروم رہتے ہیں۔

(از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۸۹)

اتنی بات واضح ہے: کہ ﴿ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا متقین کی علامت ہے مال خرچ کرنے کی کئی قسمیں ہیں لیکن ان پر صدقات واجبہ اور مستحبہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں اس لئے ابھی زکوۃ کی تعریف اور احکام یا صدقہ فطر کی تعریف اور احکام کی بجائے صرف صدقہ کی فضیلت کے متعلق یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ سلسلہ تحریر جاری رکھنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے عطاء فرمائی تو انشاء اللہ آگے مناسب مقامات پر ہر ایک کی تعریف بیان ہوتی رہے گی۔

صدقہ کی فضیلت میں احادیث مبارکہ سے:

" عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ اعبدوا الرحمن واطعموا الطعام وافشوا السلام تدخلوا الجنة بسلام "

(رواه الترمذی وابن ماجه، مشکوة باب فضل الصدقة)

" حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رحمٰن کی عبادت کرو اور طعام کھلاؤ اور سلام عام کرو سلامتی سے جنت میں داخل ہو جاؤ "

وضاحت حدیث: رحمٰن جس نے قرآن سکھایا صرف اسی ذات کی عبادت کرو اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ اور عوام وخواص کو طعام کھلاؤ طعام کھلانے میں ریا کاری، نام ونمود اپنا چرچا کرنا مقصود نہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی مقصود ہو اور مومنوں کو سلام کہو خواہ تمہاری ان سے جان پہچان ہو یا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کے بہتر مقام میں داخل کرے گا جس کا نام دار السلام ہوگا وہاں جنتی ایک دوسرے کو سلام کا تحفہ پیش کریں گے۔

☆ "عن انس قال رسول اللہ ﷺ ان الصدقة لتطفی غضب الرب وتدفع میتة السوء"
(رواہ الترمذی، مشکوۃ باب فضل الصدقة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ رب تعالیٰ کے غضب کو ختم کرتا ہے اور خاتمہ کی برائی کو مندفع کرتا ہے۔

وضاحت حدیث: میتة، میم کے نیچے کسرہ (زیر) ہے اصل میں" موتة" واؤ ساکن ما قبل میم مکسور، واؤ کو یا سے بدل دیا انسان پر موت کے وقت جو حالت ہوتی ہے اسے میتة کہا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ کے غضب (کی آگ) کو بجھا دینے کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ اس کے پاس مکروہ چیزوں کے نازل ہونے کو منع کرتا ہے اور مردہ ہونے کی حالت کی برائی کو مندفع کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے سوء خاتمہ سے محفوظ رکھتا ہے "سوء" کو سین کی زبر اور پیش دونوں سے پڑھا گیا ہے۔ مکروہ چیزوں سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ چیز ہر وہ حالت جس کی وجہ سے انسان بے خوف نہ ہو سکے اور جس کی آخرت میں تعریف نہ کی جا سکے ان سے صدقہ انسان کو محفوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ فقر جو انسان کے صبر سے بالاتر ہو اور ایسی مصیبتیں جو انسان کی پریشان حالی کا سبب بنیں اور ایسے درد جو انسان کی بے قراری کا سبب بنیں اور ایسی تنگ حالی جو انسان کے لئے رب تعالیٰ کی نعمتوں کے کفران (ناشکری) کا سبب بنیں صدقہ ان سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے سوء خاتمہ سے مراد عذاب قبر عذاب آخرت ہے یعنی صدقہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور صدقہ کی برکت سے قبر کے عذاب اور آخرت کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۴۰۸)

☆ "عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من تصدق بعدل تمرة من کسب طیب ولا یقبل اللہ الا الطیب فان اللہ یتقبلها بیمینه ثم یربیها لصاحبها کما یربی احدکم

فلوہ حتی تکون مثل الجبل" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب فضل الصدقۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسب حلال سے ایک کھجور کی مقدار صدقہ کیا "اللہ تعالیٰ صرف حلال مال ہی قبول کرتا" تو بیشک اللہ تعالیٰ اس صدقہ کو اپنے دائیں ہاتھ (جواس کی شان کے لائق ہے) سے قبول فرماتا ہے پھر اس صدقہ کو صدقہ کرنے والے کے لئے بڑھاتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی ایک اپنے گھوڑے کے بچے کو پالتا ہے یہاں تک کہ وہ احد پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے۔

وضاحت حدیث: "عدل" عین پر فتح اور کسرہ دونوں سے آتا ہے معنی برابر ہونا یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرے۔ خواہ کھجور ہو یا کھجور کے برابر مقدار میں کوئی اور چیز ہو یا کھجور کی قیمت کے برابر کوئی اور چیز ہو۔ البتہ وہ صدقہ کے طور پر دیا ہوا مال رزق حلال، کسب حلال ہو خواہ وہ اپنی صنعت سے حاصل ہو یا تجارت سے یا زراعت سے یا کسی نہ کسی طرح مزدوری وغیرہ سے کسب کیا ہوا ہو خواہ بطور وراثت ملا ہو خواہ بطور ہبہ ملا ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں دست قدرت سے قبول کرتا ہے یعنی اسے حسن قبولیت عطا فرماتا ہے اور وہ صدقہ کامل طور پر رب تعالیٰ کی رضامندی پر دلالت کرتا ہے "لان الشئی المرضی یتلقی بالیمین فی العادۃ" اس لئے کہ جو چیز پسند ہو مرضی کے مطابق ہو اسے ہی دائیں ہاتھ سے قبول کرنے کی عادت پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس صدقہ کو بڑھاتا ہے یعنی اس میں خیر و برکت عطا فرماتا ہے وہ صدقہ جو کھجور کی طرح تھا قیامت کے دن اس کا ثواب احد پہاڑ کی طرح میزان میں ہوگا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ صدقہ ہی پہاڑ کی طرح نظر آئے کہ اس نے پہاڑ کی طرح اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا ہے۔

" فلو، بفتح الفاء ویضم وبضم اللام وتشدید الواو ای المهر وهو ولد الفرس" فا پر فتح (زبر) ہے اور ضمہ (پیش) بھی آجاتا ہے لام پر ضمہ ہے اور واؤ پر شد ہے اس کا معنی گھوڑے کا بچہ۔ نبی کریم ﷺ نے تھوڑے صدقہ کو رب تعالیٰ کی طرف سے بڑھانے کو تشبیہ سے سمجھایا کہ جس طرح تم گھوڑے کے چھوٹے سے بچے کو پالتے ہو تو وہ بڑا جسیم قد آور گھوڑا بن جاتا ہے اسی طرح رب تعالیٰ کے حضور تمہارا رزق حلال سے خلوص سے صرف رب تعالیٰ کی رضاء کی خاطر دیا ہوا

صدقہ عظیم ہو جائے گا۔

"ولا یقبل اللہ الا طیبا" یہ جملہ معترضہ ہے جو شرط اور جزا کے درمیان واقع ہے "وفیہ اشارۃ الی ان غیر الحلال غیر مقبول وان الحلال المکتسب یقع بمحل عظیم" اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو مال حلال نہیں ہو گا وہ رب تعالٰی کے حضور قبول نہیں ہو گا اور جو حلال طریقہ سے حاصل کیا ہو گا اسی کا صدقہ کرنا عظیم درجہ رکھے گا۔

علامہ علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ عارف باللہ ولی علی متقی رحمہ اللہ علیہ بیان فرماتے کہ ایک بزرگ شخص اپنے کسب سے مال حلال حاصل کرتے تھے تہائی حصہ صدقہ کرتے تہائی حصہ اپنے آپ پر اور اہل وعیال پر خرچ کرتے اور تہائی حصہ اپنے ذریعہ کسب پر خرچ کرتے یعنی کسب کے آلات وغیرہ خریدنے اور ان کو درست کرنے پر خرچ کرتے ان کے پاس ایک دنیادار شخص آیا اس نے کہا اے شیخ میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں مجھے کوئی مستحق شخص بتائیں۔ انہوں نے کہا۔ جو مال حلال طریقہ سے حاصل ہو وہ جب خرچ کیا جائے تو خود بخود وہ مستحق کے پاس ہی جاتا ہے اس غنی شخص نے پھر پوچھا کہ آپ مجھے کوئی مستحق بتائیں انہوں نے فرمایا تم جاؤ اور جس شخص سے بھی تمہاری ملاقات ہو اور تمہارا دل اس کی طرف میلان کرے کہ اس پر مہربانی کرنی چاہیے وہی مستحق ہو گا وہ شخص وہاں سے نکلا اس نے ایک فقیر کو دیکھا جو بہت بوڑھا اور نابینا تھا اس نے اسے مال دے دیا۔ دوسرے دن یہ شخص وہاں سے گزرا تو اس نے سنا کہ وہ نابینا کسی دوسرے کو بتا رہا ہے کہ کل ایک شخص نے مجھے پیسے دیئے تھے جس سے مجھے بڑی بساطت حاصل ہوئی میں نے ان پیسوں سے گذشتہ رات شراب پیا اور رات ایک گانا گانے والی عورت کے پاس گزاری۔ وہ غنی شخص اپنے شیخ کے پاس آیا ان کو واقعہ بتایا کہ میں نے جسے کل پیسے دیئے تھے وہ مستحق نہیں تھا۔ شیخ نے اپنے کسب سے حاصل کیے رزق حلال سے اس غنی کو ایک درہم دیا کہ تم جاؤ گھر سے باہر نکلنے کے بعد جو شخص تمہیں سب سے پہلے ملے یہ درہم اسے دے دینا وہ شخص شیخ کا درہم لے کر چلا سب سے پہلے جس پر اس کی نظر پڑی وہ بظاہر فقیر نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ یوں سمجھ آ رہا تھا کہ اس کی حالت بہتر ہے۔ اس شخص نے اسی درہم دینے سے پہلے تو خوف کیا کہ یہ مستحق نہیں لیکن پھر شیخ کے کہنے کے مطابق اس غنی شخص نے اسے وہ درہم دے دیا۔

جب اس نے اس شخص کو درہم دیا تو وہ اپنے راستہ پر واپس لوٹ پڑا غنی بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا اس نے دیکھا کہ وہ شخص ایک بیابان خراب سی جگہ میں ایک دروازہ میں داخل ہوا اور دوسری طرف سے نکل کر شہر کی طرف چلا غنی نے اس خراب بیابان چار دیواری میں داخل ہو کر دیکھا کہ وہاں اور تو کچھ نہیں البتہ ایک کبوتر مردہ حالت میں پڑا ہے اس غنی نے اس شخص کو قسم دلا کر اس کا حال پوچھا جب میں نے تمہیں درہم دیا تو تم وہاں سے ہی کیوں لوٹ پڑے اور اس خراب جگہ میں داخل ہونے کا کیا مطلب ہے کبوتر مرا ہوا کیسے ہے وغیرہ؟ اس شخص نے بتایا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جو بہت زیادہ بھوک میں مبتلا تھے ہم حالت اضطراب میں تھے جس حال میں مردہ جانور کھانا بھی جائز ہے۔ میں گھر سے نکل کر ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا مجھے ایک مردہ کبوتر مل گیا جو میں نے اس بیابان جگہ سے اٹھایا تھا وہ لے کر جا رہا تھا کہ اسی کو کھالیں گے جب اللہ تعالیٰ نے ایک درہم عطا فرما دیا تو میں اس کبوتر کو یہاں رکھنے کیلئے آ گیا جو اس نے پکڑ کر غالباً کسی کپڑے وغیرہ میں چھپا رکھا تھا۔ اب اس غنی پر شیخ کے کلام کی حقیقت واضح ہوگئی کہ حرام کی کمائی کمال جسے مستحق سمجھ کر دیا تھا وہ عیاش نکلا مستحق نہیں تھا اور حلال کی کمائی کا مال جسے غیر مستحق سمجھ کر دیا وہ ایسا مستحق تھا جیسا ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔ سبحان اللہ صاحب بصیرت حضرات کو اللہ تعالیٰ نے کیسا ہی بلند مقام دیا ان کی نظر ولایت کہاں تک کام کرتی ہے اور ان کی نصیحت کا انداز کیا ہی خوب ہوتا ہے۔

(از مرقاۃ ج ۴ ص ۱۹۹، ۲۰۰)

تنبیہ: جہاں بھی رب تعالیٰ کے لئے اعضاء کا ذکر ہے جس طرح یہاں ہے ﴿یَتَقَبَّلُهَا بِیَمِیْنِهٖ﴾ دائیں ہاتھ سے قبول کرتا ہے اور ﴿یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ جس طرف منہ پھیرو اللہ تعالیٰ کا چہرہ اسی طرف ہے۔ اس قسم کے تمام الفاظ متشابہات سے ہیں حقیقی مراد ان کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں ہاں البتہ یہ معنی کیا جائے دائیاں ہاتھ جو اس کی شان کے لائق ہے یا یوں کہا جائے اس کا دائیاں دست قدرت تو کسی حد تک درست ہے۔

فائدہ جلیلہ:

"وفی حدیث زهیر قال قال رسول اللہ ﷺ ان المقسطین عند اللہ علی

منابر من نور عن یمین الرحمن عزوجل و کلتا یدیه یمین الذین یعدلون فی حکمهم و اهلیهم وماولوا " (مسلم ج ۲ ص ۱۲۹ باب فضیلة الامیر العادل)

"حضرت زہیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک وہ لوگ جن کو ولایت حاصل ہے وہ اپنی رعایا وغیرہ اور اپنے اہل پر حکم اور فیصلہ کرنے میں انصاف کرتے ہیں وہ لوگ (قیامت کے دن) رحمٰن عزوجل کی دائیں جانب نورانی منبر پر ہوں گے اللہ تعالیٰ کی دونوں طرفیں یمین (دائیں) ہی ہیں"

وضاحت حدیث: "ما ولوا" واؤ پر فتحہ اور لام پر ضمہ اور لام مخففہ ہے یعنی جن لوگوں پر ان کو ولایت حاصل ہے "مقسطون" کا معنی ہے عدل کرنے والے لیکن یہ معنی اس وقت ہوگا جب کہ یہ لفظ قسط بکسر القاف سے لیا ہوا ہوگا اسی معنی پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے لیکن جب قسط بفتح القاف یا قسوط اصل ہو تو پھر معنی ہوتا ہے ظلم کرنا اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس معنی پر بھی دلالت کر رہا ہے "واما القاسطون فکانوا لجهنم حطبا" لیکن ظالم لوگ جہنم کا ایندھن ہوں گے "منابر" منبر کی جمع ہے بلند ہونے کی وجہ سے منبر کہا جاتا ہے نور کے منبر پر ہونے کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو منازل رفیعہ عطا فرمائے گا اور دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ حقیقی منبروں پر ہوں گے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیقی منبر معنی لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس میں بلند مرتبہ والا معنی بھی پایا گیا ہے "یمین الرحمن" رب تعالیٰ کی دائیں طرف اس میں اختلاف ہے کہ اس کا معنی کیا کیا جائے اتنا اتفاق ہے کہ اس کا ظاہری معنی مراد نہیں:

" وان منهم من قال نؤمن بها ولا نتکلم فی تاویله ولا نعرف معناها "

بیشک بعض حضرات نے کہا ہے کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں ہم اس کی تاویل بیان نہیں کرتے اور اس کا معنی مرادی ہم نہیں جانتے البتہ اتنا ہمارا عقیدہ ہے کہ اس کا ظاہری معنی مراد نہیں وہی معنی مراد ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے یہ مذہب جمہور سلف صالحین اور کچھ متکلمین کا ہے "والثانی انها تتاول علی ما یلیق" دوسرا مذہب یہ ہے کہ ایسی تاویل کر لی جائے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے یہ مذہب اکثر متکلمین کا ہے اسی مذہب کے مطابق قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں

" ان المراد بکونهم عن الیمین الحالة الحسنة و المنزلة الرفیعة " بیشک ان کا رب تعالیٰ کے دائیں طرف ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اچھی حالت اور بلند مراتب میں ہوں گے " قال ابن عرفة یقال اتاه عن یمینه اذا جاء من الجهة المحمودة " ابن عرفہ نے کہا ہے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے وہ دائیں طرف سے آیا لیکن اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ قابل تعریف جہت سے آیا:

" والعرب تنسب الفعل المحمود الی الیمین وضده الی الیسار قالوا والیمین ماخوذة من الیمن "

عرب حضرات اچھے کام کو یمین (دائیاں) کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس کی ضد کو یسار (بائیاں) کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ کہتے ہیں یمین ماخوذ ہے یمن سے جس کا معنی ہے برکت۔

اسی حدیث اور اس کی اس تشریح (یمین سے مراد فعل محمود اور اس کی ضد یسار ہے) کو مدنظر رکھتے ہوئے محب رسول صاحب حسنات رفیعہ، شفیق ومہربان، محسن عظیم، رئیس المحققین، عظیم المدققین، اشرف المدرسین، استاذی المکرم حضرت علامہ ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی فرماتے تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں کا ذکر ہو تو یوں کہو آپ کا دایاں ہاتھ اور آپ کا دوسرا ہاتھ بائیاں ہاتھ نہ کہو اس لئے کہ بائیں ہاتھ میں اکثر طور پر طاقت کی کمی ہوتی ہے اور شان کی کمی پر بھی دلالت کرتا ہے نبی کریم ﷺ کے دونوں ہاتھ ہی یمین ہیں۔

سبحان اللہ کیا ایمان ہے کیسا شاندار عقیدہ کیسی پختہ محبت حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثناء کے ساتھ ہے کاش کہ میرے استاذ محتشم نے جب ہمیں پڑھاتے ہوئے یہ نصیحت فرمائی تھی ہمارے لئے دعا بھی فرمادیتے کہ یا اللہ ان میرے تلامذہ کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما بہت کوشش کرتا ہوں کافی حد تک اس پر عمل بھی کرتا ہوں لیکن کبھی بھول کر بائیاں بھی کہہ دیتا ہوں اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ما نقصت صدقة من مال وما زاد الله عبدا بعفو الا عزا وما تواضع احمد الله الا رفعه الله " (رواه مسلم مشکوة باب فضل الصدقة)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کا مال صدقہ سے کم نہیں ہوتا اور کسی بندے کو اللہ تعالیٰ عفو سے زائد نہیں کرتا مگر یہ کہ اسے بڑھاتا ہے اور کوئی ایک اللہ تعالیٰ کے لئے عجز اختیار نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو بڑھاتا ہے۔

وضاحت حدیث: انسان کا مال صدقہ ادا کرنے سے بظاہر جو کم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرما دیتا جس کی وجہ سے اس کا مال بڑھ جاتا ہے کبھی کبھی ظاہری طور پر مال کے بڑھنے اور عطیہ کے ملنے کو انسان خود دیکھ بھی لیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اسے عظیم ثواب عطا فرما دیتا ہے۔ جب کوئی انسان کسی سے انتقام لینے کی قدرت رکھتا ہے پھر معاف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے عزت عطا کرتا ہے۔ دلوں میں اس کی عظمت پیدا کر دیتا ہے۔ اسے عظیم ثواب عطا کر کے اسے بلند مرتبہ عطا کر دیتا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے عجز و انکساری سے کام لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ دنیا اور آخرت میں بلند کر دیتا ہے۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۰۰)

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من انفق زوجين من شئى من الاشياء فى سبيل الله دعى من ابواب الجنة وللجنة ابواب فمن كان من اهل الصلوة دعى من باب الصلوة ومن كان من اهل الجهاد دعى من باب الجهاد ومن كان من اهل الصدقة دعى من باب الصدقة ومن كان من اهل الصيام دعى من باب الريان فقال ابوبكر ماعلى من دعى من تلك الابواب من ضرورة فهل يدعى احد من تلك الابواب كلها قال نعم وارجو ان تكون منهم " (بخاری، مسلم مشکوۃ باب فضل الصدقة)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زوجین (ایک دوسرے پر) جو مال اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے خرچ کرتے ہیں، ان کو جنت کے دروازوں سے بلایا جائے گا نمازی کو باب الصلوٰۃ سے بلایا جائے گا اور جہاد کرنے والے کو باب الجہاد سے بلایا جائے گا۔ صدقہ کرنے والے کو باب الصدقۃ سے بلایا جائے گا اور روزہ داروں کو باب الریان سے بلایا جائے گا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تمام دروازوں سے بلائے جانے کی ضرورت تو نہیں کیا کسی کو تمام دروازوں سے بھی بلایا جائے گا تو آپ نے فرمایا ہاں اور میں امید کرتا ہوں تم ان سے ہی ہو گے۔

وضاحت حدیث: زوجین (خاوند زوجہ) جب اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے پسند فرماتا ہے جنت کے تمام دروازوں سے ان کو داخل ہونے کی اجازت ہوگی اور ہر دروازہ سے بلاوہ آئے گا۔ جنت کے آٹھ دروازے ہیں ہر دروازہ کا عبادت کی مناسبت سے نام رکھا گیا ہے چار کا ذکر اس مذکور حدیث میں ہے اور چار کا ذکر دوسری احادیث میں۔

باب الصلوة ، باب الجهاد ، باب الصدقة ، باب الريان ، باب التوبة ، باب الرياضين ، باب الکاظمین الغیظ و العافین عن الناس اور باب الضحی ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام باب الضحیٰ ہے جب قیامت کا دن ہوگا تو پکارنے والا پکارے گا " این الذین کانوا یداومون علی صلوة الضحی هذا بابکم فادخلوه برحمة الله " کہاں ہیں وہ لوگ جو چاشت کی نماز ہمیشہ ادا کرتے تھے یہ تمہارا دروازہ ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس میں داخل ہو جاؤ۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا سب دروازوں سے داخل ہونے کی ضرورت تو نہیں اس لئے کہ مقصد تو جنت میں داخل ہونا ہے خواہ ایک سے داخل ہو جائے یا سب سے داخل ہونے کی اسے اجازت ہو۔ لیکن کوئی خوش قسمت ایسا بھی ہوگا جسے ہر دروازہ سے بلایا جائے وہ جس دروازہ سے داخل ہو جائے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہاں یعنی ایک جماعت کثیر نمازیں (نوافل) ادا کرنے کی وجہ سے اور زیادہ جہاد کرنے کی وجہ سے اور کثیر روزے (نفلی اور فرض) رکھنے کی وجہ سے اور ہر قسم کی نیکیاں کرنے والے حضرات کو تعظیم و تکریم کے طور پر ہر دروازہ سے داخل ہونے کی اجازت ہوگی اور ہر دروازہ سے ان کو بلایا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں امید کرتا ہوں (اے ابوبکر) تم بھی ان میں سے ہی ہوگی " لانه رضی الله عنه کان جامعا لهذه الخيرات کلها " اسلئے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام نیکیاں کرنے والے تھے اس لئے ان کو تمام دروازوں سے داخل ہونے کے لئے بلایا جائے گا۔ ویسے عام طور پر جو عبادت کوئی کرے گا اسی کے مناسب دروازہ کا جو نام ہوگا اسی سے اس شخص کو بلایا جائے گا ستر ہزار خوش قسمت وہ لوگ ہوں گے جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ روزہ داروں کے جنت میں داخل ہونے والے دروازہ کو باب الریان کہنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریان ضد ہے عطشان کی عطشان معنی پیاسا اور ریان کا معنی سیراب۔

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من اصبح منكم اليوم صائما قال ابوبكر انا قال فمن تبع منكم اليوم جنازة قال ابوبكر انا قال فمن اطعم منكم اليوم مسكينا قال ابو بكر انا قال فمن عاد منكم اليوم مريضا قال ابوبكر انا فقال رسول الله ﷺ ما اجتمعن فی امری الادخل الجنة "

(رواه مسلم مشکوة باب فضل الصدقة)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے آج صبح روزہ کس نے رکھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے آپ نے فرمایا تم میں سے آج جنازہ کے ساتھ کون گیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں۔ آپ نے فرمایا تم میں سے آج مسکین کو کھانا کس نے کھلایا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے آپ نے فرمایا تم میں سے آج مریض کی عیادت کس نے کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص میں یہ تمام (چار چیزیں) جمع نہیں ہوتیں مگر یہ کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اس حدیث شریف میں بھی صدقہ کی فضیلت واضح ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تمام امت سے افضل ہونا بھی واضح ہے ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے دروازہ پر حاضر ہوئے دروازہ کھٹکٹایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مــن'' کون انہوں نے عرض کیا ''انا'' آپ نے فرمایا ''انــا انــا'' میں میں یعنی آپ نے ناپسند فرمایا کہ ''انـا'' کہا جائے بلکہ نام لیا جائے۔ یہ صورت اس وقت ہے جب آدمی سامنے نہ ہو جب سامنے ہو پھر پوچھا جائے یہ کام کس نے کیا ہے وہ کہے ''انا'' میں نے یہ جائز ہے کیونکہ اس میں کوئی اشتباہ نہیں۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۰۲)

فائدہ عظیمہ: زیر بحث آیۃ کریمہ سے ہی یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ فوت شدہ حضرات کے لئے صدقہ کرنا اور ان کو ثواب پہنچانا بھی اس میں داخل ہے کیونکہ صدقہ مطلقاً ذکر ہے جو وجوبی اور نفلی کو شامل ہے۔ فوت شدہ حضرات کے لئے صدقہ کرنا مستحب ان کو ثواب پہنچانا مستحب ہے یہی تحقیق غزالی دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر التبیان مع البیان میں فرمائی ہے۔ راقم نے ایصال ثواب ''مستحب'' ہے ایک رسالہ آج سے تین سال پہلے لکھا تھا یہاں عوام الناس کے فائدہ کے لئے اس سے ایصال ثواب کی بحث کو شامل کیا جا رہا ہے۔

بحث ایصال ثواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے!

﴿ وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴾

اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے، عرض کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہمیں بخشش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دل میں والوں کی طرف سے کینہ نہ رکھ

اے رب ہمارے! بے شک تو نہایت مہربان رحم والا ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا ہے۔

" واعلم ان هذه الآيات قد استوعبت جميع المؤمنين لانهم اما المهاجرون او الانصار او الذين جاؤا من بعدهم و بين ان فى شان من جاء من بعد المهاجرين والانصار ان يذكر السابقين وهم المهاجرون والانصار بالدعاء والرحمة فمن لم يكن كذالک بل ذكرهم بسوء كان خارجا جملة اقسام المؤمنين بحسب نص هذه الآية "

بے شک یہ آیات (یعنی تین آیات ایک یہ اور دو اس سے پہلی آیتیں مسلمانوں کی تمام قسموں کو حاوی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے مسلمانوں یعنی مہاجرین وانصار (اور تمام پہلے گزرے ہوئے مسلمانوں) کیلئے دعا کریں ایصال ثواب کریں۔ ان کیلئے رحمت طلب کریں جو اس طرح نہیں کرتے بلکہ پہلے مسلمانوں کو برائی سے یاد کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کی تمام قسموں سے خارج ہیں۔

اس حکم پر یہ آیت کریمہ صراحۃً دلالت کر رہی ہے، قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے واضح ہوا کہ مسلمانوں کو حقیقی معنی میں مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے سے پہلے گزرے ہوئے تمام مسلمانوں کے لئے دعا کریں اور ان کے لئے دعا مغفرت طلب کریں۔

بے شمار احادیث سے بھی یہ واضح ہے کہ فوت شدہ بھائیوں کو ثواب پہنچایا جائے اور ان کیلئے دعا مغفرت کی جائے۔

" عن ابى هريرة قال اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الامن ثلاثة الامن صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له "

(مسلم ج ۲، باب ما يلحق من الثواب بعد وفات)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہو جاتا ہے اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ سوائے تین چیزوں کے۔ یعنی سوائے صدقہ جاریہ یا علم جس سے لوگ نفع حاصل کر رہے ہوں۔ یا نیک اولاد جو اس کے حق میں دعا کر رہے ہوں۔

اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہو گیا، کہ فوت شدہ انسان کے لئے دعا کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ اس کے اعمال کی ترقی اور مغفرت اور بلندی درجات کا ذریعہ ہے۔

اسی حدیث کی شرح میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں!

" وفیه ان الدعاء یصل ثواب الی المیت و کذلک الصدقة وهما مجمع علیهما "

اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہوا کہ بے شک دعا کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔اسی طرح صدقہ کا ثواب بھی،ان دونوں کے ثواب کے پہنچنے پر اجماع امت ہے۔

" ان من البر بعد البر ان تصلی لأبویک مع صلاتک و تصوم لهما مع صومک " (مسلم ج اول باب بیان الاسناد من الدین)

بے شک نیکی کے بعد نیکی یہ ہے کہ تم اپنی نماز کے ساتھ والدین کے لئے بھی نماز (نوافل) پڑھو اور اپنے روزہ کے ساتھ اپنے والدین کے لئے (نفلی) روزے بھی رکھو (ان کا ثواب پہنچاؤ)۔

اس حدیث کی شرح میں نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

" عن بعض اصحاب الکلام من ان المیت لا یلحقه بعد موته ثواب فهو مذهب باطل قطعا و خطأ بین ،مخالف النصوص الکتاب والسنة واجماع الامة فلا التفات الیه "

بعض اصحاب کلام نے کہا کہ میت کو اسکی موت کے بعد ثواب نہیں پہنچتا یہ مذہب یقیناً باطل ہے قران پاک،حدیث پاک اور اجماع امت کے خلاف ہے۔اسکی طرف بالکل توجہ نہ کی جائے۔

نیز علامہ نووی اس کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں۔

" وذهب جماعات من العلماء الی انه یصل الی المیت ثواب جمیع العبادات من الصلوة والصوم والقراءة وغیره ذلک "

علماء کی کثیر جماعتوں کا موقف یہ ہے کہ میت کو تمام عبادات کا ثواب پہنچتا ہے۔خواہ نماز ہو،یا روزہ ہو،تلاوت قرآن پاک ہو یا ان کے بغیر اور عبادات ہوں۔

گویا اس مسئلے میں کل دو مذہب ہو گئے ایک باطل مذہب کہ میت کو ثواب نہیں پہنچتا اور دوسرا علمائے حق کا مذہب کہ میت کو ثواب پہنچتا ہے۔

" قال النووی فی الاذکار قال محمد بن احمد المروزی سمعت احمد بن حنبل یقول اذا دخلتم المقابر فاقرء وا بفاتحة الکتاب والمعوذتین وقل هو الله احد واجعلوا ثواب ذالک لاهل المقابر فانه

یصل الیهم والمقصود من زیارة القبور للزائر الاعتبار وللمزور الانتفاع بدعائه "

محمد بن احمد مروزی فرماتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو فرماتے سنا کہ جب تم قبرستان میں داخل ہو تو سورۂ فاتحہ، سورۃ اخلاص، سورۃ فلق اور سورۃ الناس پڑھ کر ثواب قبرستان والوں کو پہنچاؤ، کیونکہ ان کو ثواب پہنچتا ہے۔

قبروں کی زیارت میں مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ زیارت کرنے والا عبرت حاصل کرے اور جن کی زیارت کی جائے انہیں دعا سے نفع حاصل ہو۔

" واخرج الخلال فی الجامع عن الشعبی قال کانت الانصار اذا مات لهم المیت اختلفوا الی قبره یقرؤن القرآن " (مرقات ج ۴ ص ۱۸۱)

شعبی سے مروی ہے کہ انصار کا اگر کوئی شخص فوت ہو جاتا تو وہ اسکی قبر پر جا کر قرآن پاک پڑھتے تھے۔

" واخرج ابو محمد السمرقندی فی فضائل قل هو الله احد عن علی مرفوعا من مر علی المقابر وقرء ﴿ قل هو الله احد الخ ﴾ احدی عشرة مرة ثم وهب اجره للاموات اعطی من الاجر بعدد الاموات " (مرقات ج ۴ ص ۸۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ مرفوع حدیث مروی ہے کہ جو شخص قبرستان سے گزرے اور گیارہ مرتبہ ''قل هو الله احد'' پڑھے پھر اس کا ثواب فوت شدہ حضرات کو پہنچائے تو فوت شدہ لوگوں کی تعداد کے مطابق اجر دیا جائے گا۔ (یعنی ہر شخص کو مکمل ثواب حاصل ہوگا۔ اور پڑھنے والے کو بھی جتنے زیادہ ہوں گے اتنا زیادہ اجر حاصل ہوگا)۔

" واخرج ابو القاسم سعد بن علی الزنجانی فی فوائده عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ من دخل المقابر ثم قرأ فاتحة الکتاب وقل هو الله احد والهکم التکاثر ثم قال انی جعلت ثواب ما قرأت من کلامک لاهل المقابر والمؤمنین والمؤمنات کانوا شفعاء له الی الله تعالٰی "

(مرقات ج ۴ ص ۸۱،۲۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قبرستان میں داخل ہوا پھر سورۃ فاتحہ پڑھی اور ''قل هو الله احد'' اور ''الهکم التکاثر'' سورۃ پڑھی پھر کہا میں نے جو کلام پڑھی ہے۔ اس کا ثواب میں قبرستان کے مومن مرد اور عورتوں کو پہنچاتا ہوں۔ تو تمام لوگ (جن کو

یہ ثواب پہنچائے گا) اس کے شفیع ہوں گے۔

" عن ابی ھریرۃ ان رجلا قال للنبی ﷺ ان ابی مات وترک مالا ولم یوص فھل یکفر عنہ ان تصدق عنہ (ان تصدق عنہ) قال نعم "

(مسلم باب وصول ثواب الصدقۃ الی المیت)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بے شک ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میری والدہ اچانک فوت ہوگئیں کوئی وصیت نہیں کر سکیں، میرا گمان یہ ہے کہ اگر وہ کلام کر سکتیں تو صدقہ کی وصیت ہی کرتیں۔ کیا انہیں اس کا ثواب ملے گا کہ میں ان کی طرف سے صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔

ان دونوں حدیثوں کے ترجمہ سے ہی بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ صدقہ کا ثواب میت کو ملتا ہے اور حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ نے "باب" کا نام (عنوان) ہی ایسا رکھا ہے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ اس باب میں وہ احادیث ذکر ہوگی جن سے یہ ثابت ہوگا کہ میت کو صدقہ کا ثواب پہنچتا ہے

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مقام پر فرمایا!

" وفی ھذا الحدیث جواز الصدقۃ عن المیت واستحبابھا وان ثوابھا یصلہ وینفعہ وینفع المتصدق ایضا وھذا کلہ اجمع علیہ المسلمون " (نووی شرح مسلم جلد ثانی ۲۹)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا جائز اور مستحب ہے اور بے شک اس صدقہ کا ثواب اسے پہنچتا ہے اور میت کو اس کا نفع حاصل ہوتا ہے اور صدقہ کرنے والے کو بھی اس کا نفع حاصل ہوتا ہے۔ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

مباح بہ نیت تقرب مستحب ہو جاتا ہے:

وصیت کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"والثلث کثیر انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تذرھم عالۃ یتکففون الناس ولست تنفق نفقۃ تبتغی بھا وجہ اللہ الا اجرت بھا حتی اللقمۃ تجعلھا فی فی امراتک " (مسلم ج ۲، کتاب الوصیۃ)

تہائی حصہ کی وصیت بہت ہے۔ بے شک اگر تم ورثاء کو غنی چھوڑ جاؤ، تو یہ بہتر ہے اس سے کہ تم

انہیں حاجتمند چھوڑ جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔تم اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے جو مال بھی خرچ کرو گے۔اس کا تمہیں ضرور اجر ملے گا۔ یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی زوجہ کے منہ میں ڈالو گے۔اس کا ثواب بھی تمہیں ملے گا۔

یہ حدیث جس کا کچھ حصہ نقل کیا گیا ہے۔اس کی شرح میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے چند مسائل نقل کیے ہیں۔

☆ " وفی هذا الحديث حث على صلة الارحام والاحسان الى الاقارب والشفقة على الورثة وان صلة القريب الاقرب والاحسان اليه افضل من الابعد "

اس حدیث پاک میں صلہ رحمی اور قریبی رشتہ داروں پر احسان کرنے اور ورثاء پر شفقت کرنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ اور اس بات پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔کہ قریبی رشتہ داروں پر صدقہ کر کے صلہ رحمی حاصل کرنا اوران پر احسان کرنا زیادہ بہتر ہے بنسبت دور والوں کے۔

☆ " واستدل به بعضهم على ترجيح الغنى على الفقير "

اسی سے بعض اہل علم نے یہ ثابت کیا ہے کہ اپنی قریبی رشتہ دار کو نفلی صدقہ دینا زیادہ بہتر ہے باوجود اس کے کہ وہ غنی ہو اور دوسرا شخص فقیر ہو۔

☆ " وفيه استحباب الانفاق فی وجوه الخير "

اور یہ بات ثابت ہوئی کہ بھلائی کے ہر قسم کے مواقع پر مال خرچ کرنا مستحب ہے۔

☆ " وفيه ان الاعمال بالنيات وانه انما يثاب على عمله بنية "

اور یہ ثابت ہوا کہ اعمال کا دارومدار نیات پر ہے، بے شک انسان کو اس کے عمل پر اس کی نیت کے مطابق ہی ثواب دیا جاتا ہے۔

☆ " وفيه ان الانفاق على العيال يثاب عليه اذا قصد به وجه الله تعالىٰ "

اور یہ ثابت ہوا کہ اہل وعیال پر مال خرچ کرنے پر بھی ثواب حاصل ہوا ہے۔ جب اس میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا لحاظ کیا جائے۔

☆ " وفيه المباح اذا قصد به وجه الله تعالىٰ يصير طاعة ويثاب عليه "

اور یہ واضح ہوا کہ مباح کے کام میں جب اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا لحاظ کیا جائے تو وہ طاعت

بن جاتا ہے اور اس پر ثواب دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اپنی زوجہ سے مہربانی اور تعلقات از دواجی دنیاوی خواہشات اور لذات کی وجہ سے ہوتا ہے، ان لذات کے پیش نظر ہی اس کے منہ میں لقمہ ڈالا جاتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے یہی کام کئے جائیں تو ان میں ثواب حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے زوجہ کے منہ میں ڈالے جانے والے لقمہ کو باعث اجر و ثواب قرار دیا ہے۔

☆ "ان الانسان اذا فعل شیاء اصله علی الاباحة ذالک کالاکل بنیة التقوی علی طاعة الله تعالی والنوم للاستراحة لیقوم ای بنیة العبادة نشیطا والاستمتاع بزوجة لیکف نفسه وبصره ونحوهما عن الحرام ولیقضی حقها ولیحصل ولد اصالحا"

(نووی شرح مسلم ج۲، ص ۴۷)

انسان جب کوئی ایسا کام کرے جو اصل میں تو مباح ہو لیکن جب وہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کو حاصل کرنے کے لئے کرے تو وہ مستحب ہو جائے گا۔ اس میں اسے ثواب حاصل ہوگا۔ جس طرح کھانا کھانا مباح ہے۔ لیکن جب اس لئے کھائے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی قوت حاصل ہو جائے تو یہی مستحب ہو جائے گا۔ "سونا" (آرام کرنا) مباح ہے لیکن اس لئے سونا کہ آرام حاصل ہو جائے تو پھر عبادت کرنے میں چستی حاصل ہو سستی باقی نہ رہے تو یہ سونا بھی مستحب ہوگا، اس پر ثواب حاصل ہوگا۔

زوجہ سے منافع حاصل کرنا مباح ہیں لیکن اس غرض سے منافع حاصل کرے کہ حرام کاموں سے بچ جاؤں اور زوجہ کے حقوق پورے کرلوں اور نیک اولاد حاصل ہو تو یہ منافع حاصل کرنے مستحب ہو جائیں گے اور ان پر ثواب مرتب ہوگا۔

نتیجہ واضح ہوا: علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ میت کے گھر والے یا ان کے رشتہ دار اگر اس غرض سے کھانا پکائیں کہ دور دراز سے آئے ہوئے رشتہ داروں اور پڑوسیوں یا اہل محلہ یا احباب کو کھلائیں گے تا کہ ہمارے تعلقات اور زیادہ بڑھیں صلہ رحمی حاصل ہو تو یقیناً یہ باعث ثواب ہے۔

تنبیہ: اہل میت کھانے کا اہتمام ایسا نہ کریں جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ خوشی کی محفل ہے۔ شرکاء بھی غمزدہ ہی نظر آئیں۔ مطلقاً ضیافت، اظہار خوشی یقیناً مکروہ ہے۔

"ویکرہ اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لا فی الشرور" (شامی ج ۱، ص ۶۶۴)

اسی لئے غم اور خوشی کے کھانوں میں فرق ہونا چاہئے، کسی قسم کی ایسی حرکات نہ پائی جائیں، جو خوشی پر دلالت کریں۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اگر خوشی کی طرح ہی کھانے کی محفل سجائی جائیں، شرکاء بھی ہنستے رہیں ان محافل سے غمی کا کوئی تصور نہ ہو تو پھر بھی "مکروہ" ہی ثابت ہوگا۔ "حرام" ثابت کرنے کے لئے صرف زبان سے کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ دلیل کی ضرورت ہے۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب:

"وفی البحر من صام او صلی او تصدق وجعل ثوابه لغیره من الاموات والاحیاء جاز ویصل ثوابها الیهم عند اهل السنة والجماعة کذا فی البدائع ثم قال وبهذا علم انه لا فرق بین ان یکون المجعول له میتا او حیا والظاهر انه لا فرق بین ان ینوی به عند الفعل للغیر او یفعله لنفسه ثم بعد ذالک یجعل ثوابه لغیره لاطلاق کلامهم"

(شامی ج ۱، ص ۶۶۶)

البحر الرائق میں ذکر کیا گیا ہے کہ کوئی شخص روزہ رکھ کر یا نماز ادا کر کے یا صدقہ کر کے ثواب دوسرے شخص کو پہنچائے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ یہ جائز ہے اور ان عبادات کا ثواب ان کو پہنچتا ہے۔ یہی اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے، البدائع میں بھی یہی ذکر ہے، اس کے بعد بدائع میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے معلوم ہو گیا کہ جس کو ثواب پہنچایا گیا، وہ زندہ ہو یا مردہ، اسی طرح عام ہے کہ یہ عبادات غیر کو ثواب پہنچانے کی غرض سے کرے اور ثواب پہنچائے، یا اپنے لئے اور پھر ثواب دوسرے کو پہنچائے کیونکہ اہل علم نے مطلقاً ثواب پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔

خیال رہے کہ نفلی نماز اور نفلی روزہ میں تو اتفاق ہے کہ ان کا ثواب غیر کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ لیکن فرضی نماز روزہ میں اختلاف ہے۔

اعتراض: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے!

﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى ﴾ اور یہ کہ آدمی نہیں پائے گا سوائے اپنی کوشش کے

اس آیت کریمہ سے تو پتہ چلا کہ انسان کو اپنے اعمال کا ہی فائدہ ہوگا، دوسرے کے اعمال کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اس اعتراض کے علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ جواب ذکر کیے ہیں۔

پہلا جواب: "انها منسوخة بقوله تعالیٰ والذين آمنوا واتبعتهم ذريتهم بايمان الحقنابهم ذريتهم...... الاية

" ادخل الابناء الجنة بصلاح الاباء "

یہ آیت کریمہ دوسری آیت کریمہ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ...... الآية ﴾ سے منسوخ ہے دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے، اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ہم نے ان کی اولاد ان سے ملا دی اور ان کے عمل میں انہیں کچھ کمی نہ دی سب آدمی اپنے کیے میں گرفتار ہیں

اس آیت کریمہ سے واضح ہوا کہ آباء کی نیکیوں کی وجہ سے ان کی اولاد کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا، جبکہ ان کے اپنے اعمال میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

دوسرا جواب: " انها خاصة بقوم ابراهيم وموسى عليهما الصلوة والسلام فاما هذه الامة فلها ما سعت وما سعى لها قاله عكرمة "

اس آیت کریمہ کا حکم قوم ابراہیم علیہ السلام اور قوم موسیٰ علیہ السلام سے خاص ہے کہ انہیں صرف اپنے ہی اعمال کا فائدہ ہوتا تھا، اس آیت سے پہلے قوم ابراہیم علیہ السلام اور قوم موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے، لیکن امت مصطفیٰ ﷺ کو اپنے اعمال کا بھی فائدہ ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ جو اپنی عبادات کا ثواب انہیں پہنچائیں اس کا فائدہ بھی انہیں حاصل ہوتا ہے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا اس آیت کریمہ کے متعلق یہی قول ہے۔

تیسرا جواب: " ان المراد بالانسان هنا الكافر فاما المؤمن ما سعى وسعى له قاله الربيع بن انس "

بے شک آیت کریمہ میں جو انسان کا ذکر ہے، اس سے مراد کافر ہے کہ کافر کو کسی دوسرے شخص کے عمل کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن مومن کو اپنے اعمال کا فائدہ بھی ہوگا، اور دوسروں کے اعمال کا بھی، جن کا ثواب اسے پہنچایا گیا ہو۔ اس آیت کریمہ کی وضاحت میں حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے۔

چوتھا جواب: " ليس للانسان الا ماسعى من طريق العدل فاما من باب الفضل فجائز ان يزيده الله ما شاء قاله الحسين بن فضل "

آیت کریمہ میں جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ انسان صرف وہی پائے گا جو اس نے خود کوشش کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نظام میں صرف عدل کی بات ہوتی تو یہ شخص کسی دوسرے کے عمل کا فائدہ حاصل نہ کرسکتا، لیکن نظام قدرت میں فضل کو بھی دخل عظیم ہے۔ اس لئے وہ اپنے فضل سے انسان کو اس کے اپنے اعمال کا فائدہ بھی دے گا۔ اور دوسروں سے پہنچائے گئے ثواب کا فائدہ بھی دے گا۔ وہ اپنے فضل سے جتنا چاہے انسان کے مراتب کو زیادہ کرے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں یہی قول حضرت حسین بن فضل رضی اللہ عنہ کا ہے۔

پانچواں جواب: " ان اللام في الانسان بمعنى علىٰ اى ليس على الانسان الا ما سعى "

(مرقاۃ ج۴، ص ۸۶)

للانسان میں لام بمعنی علی کے ہے، اب آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ انسان کو نقصان صرف اپنے برے اعمال کا ہوگا۔ کسی دوسرے کی بداعمالیوں کا اسے نقصان نہیں ہوگا۔

مسلمان ہمیشہ ایصال ثواب کرتے رہے

" وان المسلمين ما زالوا في كل مصر وعصر يجتمعون ويقرؤن لموتاهم من غير نكير فكان ذالك اجماعا " (مرقاۃ ج۴، ص ۸۲)

بے شک مسلمان ہر شہر میں اور ہر زمانہ میں ہمیشہ سے فوت شدہ آدمیوں کے لئے قرآن پاک

پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ اس پر اجماع امت ہے۔

" قال السیوطی واما القراءة علی القبر فجزم بمشروعیتها اصحابنا وغیرهم" (مرقاۃ ج۴، ص ۸۲)

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا قبر پر قرآن پاک پڑھنے کے جواز پر ہمارے اصحاب اور دوسرے حضرات نے یقین کیا ہے، یعنی اس کے جواز میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

" قال النووی فی شرح المهذب یستحب لزائر القبور ان یقرأ ما تیسر من القرآن ویدعو لهم عقبها نص علیه الشافعی واتفق علیه الاصحاب وزاد فی موضع آخر وان ختموا القرآن علی القبر کان افضل"

(مرقاۃ ج۴، ص ۸۲)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مہذب میں ذکر کیا ہے کہ قبروں کی زیارت کرنے والے کے لئے مستحب یہ ہے کہ جتنا ہو سکے قرآن پاک پڑھے، اور اس کے بعد قبرستان والوں کے لئے دعا کرے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر نص فرمائی ہے اس پر آپ کے اصحاب کا بھی اتفاق ہے۔

دوسرے مقام پر اور یہ زیادہ فرمایا کہ اگر قبر پر مکمل قرآن پاک پڑھ کر دعا کریں، تو اور زیادہ بہتر ہے

ایصالِ ثواب کا طریقہ: علامہ ابن عابدین شامی نقل فرماتے ہیں:

" وفی شرح اللباب ویقرأ من القرآن ما تیسر له من الفاتحة واول البقرة الی المفلحون وآیة الکرسی وآمن الرسول وسورة یسین وتبارک الملک وسورة التکاثر والاخلاص اثنی عشرمرة او احدی عشرة او سبعة او ثلاثا ثم یقول : " اللهم اوصل ثواب ما قرأناه الی فلان او الیهم " (شامی ج۱، ص۶۶۲)

شرح لباب میں ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن پاک جہاں سے آسان ہو پڑھے یعنی ہو سکے تو سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرۃ کی ابتداء سے "مفلحون" تک اور آیت الکرسی اور امن الرسول اور سورۃ تکاثر اور سورۃ اخلاص بارہ مرتبہ یا گیارہ مرتبہ یا سات مرتبہ یا تین مرتبہ پڑھے۔ پھر یہ کہے: اے اللہ جو میں نے پڑھا ہے اس کا ثواب فلاں شخص کو پہنچا۔

اگر زیادہ لوگوں کے لئے پڑھا ہو تو زیادہ کا ذکر کردے۔ اے اللہ فلاں، فلاں کو اس کا ثواب پہنچا

دعاء میں شامل سب کو مکمل ثواب پہنچے گا:

"فی زکوۃ التتارخانیۃ عن المحیط الافضل لمن یتصدق نفلا ان ینوی لجمیع المؤمنین والمؤمنات لانھا تصل الیھم ولا ینقص من اجرہ شیء" (شامی ج ۱، ص ۶۶۲)

بحر محیط کے حوالے سے تتارخانیہ کی کتاب الزکوۃ میں یہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے کہ جو شخص نفلی صدقہ کر رہا ہو، اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ تمام مومن مرد اور مومن عورتوں کی نیت کرے کیونکہ تمام کو ثواب پہنچے گا، اور اس کے اپنے اجر میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔

اس لئے ہر دعا میں تمام مومنین کا ذکر کیا جائے، یہ نہ خیال کیا جائے کہ شاید ثواب منقسم ہو جائے گا، ایسا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔

بہتر یہ ہے کہ دعا کرتے وقت پہلے نبی کریم ﷺ کے حضور ایصال ثواب کا نذرانہ عقیدت پیش کرے پھر تمام انبیاء کرام اور سلف صالحین کے حضور پیش کرے۔ ان بزرگ ہستیوں کے وسیلہ جلیلہ سے جس شخص کے لئے اہتمام کیا گیا ہے، اسے ثواب پہنچائے پھر تمام مومنین ومومنات کو ثواب پہنچائے۔

فائدہ: مذکورہ بحث سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ دعا سے پہلے مروج چھوٹا ختم شریف یعنی چہار قل، فاتحہ، سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات اور پھر کچھ اور آیات مبارکہ جو مختلف جگہ سے پڑھی جاتی ہیں یہ جائز ہے، البتہ، لازم نہیں کوئی اور سورتیں پڑھ لی جائیں، پھر بھی جائز ہے۔ قرآن پاک مکمل پڑھ لیا، ویسے ہی دعا کر لی پھر کوئی اور سورتیں یا آیات نہیں پڑھیں تو یہ بھی جائز ہے۔

حاجی صاحب کے فتویٰ سے بخوبی واضح ہو ہو جائے گا کہ سامنے کھانا رکھ کر اس پر کچھ مختصر سورتیں پڑھ کر دعا کرنا جائز ہے۔ قبولیت دعا اور حضور قلب کا ذریعہ ہے، البتہ اسے فرض اور واجب نہ سمجھے اور یہ بھی اعتقاد نہ رکھے کہ اس کے بغیر ثواب نہیں پہنچتا۔

میت کو ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ:

"عن سعد بن عبادۃ قال یا رسول اللہ ام سعد ماتت فای الصدقۃ افضل قال الماء"

حضرت سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یارسول اللہ سعد کی (یعنی میری) ماں فوت ہوگئی اس کے لئے کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: پانی۔ حضرت سعد نے کنواں کھدوایا (اور لوگوں کے لئے وقف کر دیا اور کہا یہ سعد کی ماں کے لئے ہے) یعنی اس کنویں کا نام ہی ایسا رکھا جس سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ ام سعد کے ایصال ثواب کے لئے ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی اور صحابی کے عمل کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میت کو ثواب نہیں پہنچتا تو یہ اس کی قسمت کی بات ہے، ہمیں کسی کی بدقسمتی پر ماتم کرنے کی ضرورت نہیں معاملہ اپنی اپنی قسمت کا ہے۔

پانی کو زیادہ باعث ثواب کہنے کی وجہ:

" الا فضلیة من الامور النسبیة و کان هناک افضل لشدة الحر و الحاجة وقلة الماء"
(مرقاۃ ج ۴ ص ۲۰۹)

کسی صدقہ کی افضلیت وقتی مناسبت سے تعلق رکھتی ہے۔ وہاں پانی کا صدقہ افضل تھا، کیوں کہ شدید گرمی پڑتی، پانی قلیل ہوتا تھا، لوگوں کو زیادہ اسی کی ضرورت تھی۔

اس سے پتہ چلا کہ اگر کہیں مسجد کی زیادہ ضرورت ہو تو مسجد بنوائی جائے، اگر کہیں دینی مدرسہ کی زیادہ ضرورت ہو تو دینی مدرسہ پر مال خرچ کیا جائے۔ اگر کہیں قبرستان کے لئے جگہ کی ضرورت زیادہ ہو تو قبرستان کے لئے جگہ لی جائے وغیرہ۔

میت کی جانب سے حج کرنا:

" حدثنی موسی بن سلمة الهذلی ان ابن عباس قال امرت امرأة سنان بن سلمة الجهنی ان یسال رسول الله ﷺ ان امها ماتت ولم تحج أفیجزی عن امها ان تحج عنها قال نعم ! لو کان علی امها دین فقضته عنها الم یکن یجزئی فتحج عن امها " (نسائی ج ۲، باب الحج عن المیت)

موسیٰ بن سلمہ ہذلی نے حدیث بیان کی کہ بیشک ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سنان بن سلمہ جہنی کی زوجہ نے حکم دیا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ سے پوچھ کر بتایا جائے، کہ میری ماں فوت ہوگئیں

انہوں نے حج نہیں کیا تھا۔ کیا میں ان کی طرف سے حج کر دوں تو ان کی طرف سے جائز ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا: کیا ایسا نہیں کہ اگر اس کی ماں پر فرض ہوتا تو وہ ادا کرتی (قرض ادا ہو جاتا) تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی ماں کی جانب سے حج کرے۔

"عن ابن عباس امرأة سالت النبی ﷺ عن ابیها مات ولم یحج قال حجی عن ابیک"
(نسائی جلد ۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک ایک عورت نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میرے باپ فوت ہو گئے ہیں اور وہ حج نہیں کر سکے۔ (تو اب میں کیا کروں) آپ نے فرمایا کہ تم اپنے باپ کی جانب سے حج کرلو۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ میت کو عبادات کا ثواب پہنچتا ہے، اگر ثواب نہ پہنچتا تو نبی کریم ﷺ یہ نہ فرماتے کہ تم اپنی ماں کی جانب سے، یا تم اپنے باپ کی جانب سے حج کرلو۔ میت کو عبادات کا فائدہ ہوتا ہے۔ اسی لئے آپ نے میت کی طرف سے حج کرنے کی اجازت فرمائی۔

ذکر و تسبیحات سے میت کو فائدہ پہنچانا:

"وعن ابن عباس قال مر رسول الله ﷺ بقبرین فقال انهما یعذبان و ما یعذبان فی کبیر اما احدهما . فکان لا یستبری من بوله ، واما الاخر فکان یمشی بالنمیمة ثم اخذ جریرة رطبة فشقها نصفین ثم غرز فی کل قبر واحدة فقالوا یا رسول الله ﷺ لم صنعت هذا ؟ فقال یخفف لعلهما عنهما"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے قریب سے گذرے تو آپ نے فرمایا کہ بیشک ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے، اور ان کو عذاب (بظاہر) کوئی بڑی چیز کی وجہ سے نہیں ہو رہا۔ ایک کو عذاب اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا، اور دوسرے کو عذاب اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ چغلخوری کرتا تھا۔ پھر آپ نے ایک سبز شاخ کو لیا اور اس کے دو ٹکڑے کئے۔ پھر ہر ایک قبر پر ایک ایک کو گاڑ دیا۔ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہیں ہوں گی۔ (انہیں فائدہ ہوگا) ان سے عذاب تخفیف

ہوگی۔ ''لعل'' کالفظ کوئی شک پر دلالت نہیں کر رہا بلکہ تعلیل کے لئے ہے۔یعنی جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہیں ہوں گی ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی۔تو اس سے تخفیف کی علت ثابت ہوگی۔

باعث تخفیف عذاب کیوں ہوں گی؟

" انه یسبح مادام رطبا فیحصل التخفیف ببرّکة التسبیح "

اس لئے کہ وہ جب تک سبز وتر رہیں گی۔اللہ تعالیٰ کی تسبیحات پڑھیں گی۔لہذا تسبیح کی برکت کی وجہ سے ان سے عذاب میں تخفیف ہوگی۔

" وعلی هذا فیطرد فی کل ما فیه رطوبة من الاشجار وغیرها
وکذلک فیما فیه برکة کالذکر وتلاوة القرآن "

اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ہروہ چیز جس میں رطوبت (تراوت) پائی جائے خواہ درخت ہوں یا اور کوئی چیز ہووہ باعث تخفیف عذاب ہے۔اسی طرح ہروہ چیز جس میں برکت پائی جاتی ہو جیسے ذکر اور تلاوت قرآن بطریق اولیٰ (یعنی سبز شاخوں سے بڑھ کر) فائدہ مند ہیں اور عذاب کی تخفیف کا سبب ہے۔ (از حاشیہ نسائی)

قبر پر پانی چھڑکنا رحمت الٰہی کا سبب ہے:

" وعن جابر قال رش قبر النبی ﷺ وکان الذی رش الماء علی قبره بلال بن رباح بقربة بدأ من قبل راسه حتی انتهی الی رجلیه " (رواه البیهقی فی دلائل النبوة مشکوة باب دفن المیت)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف پر چھڑکا گیا، بلال بن رباح نے مشکیزہ سے پانی چھڑکا، سر کی جانب سے شروع کیا گیا اور پاؤں کی انتہا تک چھڑکا گیا

" قال الطیبی لعل ذلک اشارة الی استنزال الرحمة الالٰهیة
والعواطف الربانیة کما ورد فی الدعاء اللهم اغسل خطایاه بالماء
والثلج والبرد وقالوا سقی الله ثراه وبرد مضجعه " (مرقاة ج ۴)

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پانی چھڑکنے میں اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ یہ رحمۃ الٰہیہ کے نزول کا سبب ہے۔اور رب تعالیٰ کی مہربانیوں کا ذریعہ ہے، جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ نے

دعاء میں فرمایا، اے اللہ اس کے گناہوں کو پانی اور برف اور اولوں (ژالہ باری) سے دھو دے۔ صحابہ کرام نے دعا میں ذکر کیا، اے اللہ ان کی قبر کو سیراب کر دے اور ان کے ٹھکانہ کو ٹھنڈا کر۔

نبی کریم ﷺ کا حضرت سعدؓ کی قبر پر تسبیحات و تکبیرات پڑھنا!

" وعن جابر قال خرجنا مع رسول الله ﷺ الى سعد بن معاذ حين توفى فلما صلى عليه ﷺ ووضع فى قبره وسوى عليه سبح رسول الله ﷺ فسبحنا طويلا ثم كبر فكبرنا . فقيل يا رسول الله ﷺ لم سبحت ثم كبرت ؟ قال لقد تضايق على هذا العبد الصالح قبرة حتى فرجه الله عنه "

(رواه احمد مشكوة باب اثبات عذاب القبر)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے جب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے ان پر نماز جنازہ پڑھی۔ اور ان کو قبر میں رکھا گیا، اور مٹی ڈال دی گئی، تو نبی کریم ﷺ تسبیحات پڑھیں۔ ہم نے طویل تسبیحات پڑھیں پھر حضور نے تکبیر پڑھی، ہم نے بھی تکبیر پڑھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا۔ کہ آپ نے تسبیح کیوں پڑھی؟ پھر تکبیر کیوں پڑھی؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اس نیک بندے پر قبر تنگ ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قبر کو کشادہ کر دیا۔

خیال رہے کہ قبر کی تنگی بکریوں یا اونٹوں کے پیشاب کے چھینٹوں سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

حضرت سعد بن معاذ جلیل القدر صحابی تھے۔ جن کا لقب نبی کریم ﷺ نے سید الانصار رکھا، انہوں نے مدینہ طیبہ میں عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ کی بیعت کے درمیانی عرصہ میں اسلام قبول کیا۔ ان کی وجہ سے بنو عبد الاشہل نے اسلام قبول کیا اور ان کے گھر کے تمام افراد نے اسلام قبول کر لیا، ان کی وفات پر خوشی سے عرش الٰہی جھوما۔ اور ستر ہزار فرشتے ان کے جنازہ میں شریک ہوئے۔

" وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ هذا الذى تحرك له العرش وفتحت له ابواب السماء وشهده سبعون الفامن الملائكة لقد ضم ضمه ثم فرج عنه "

(مشكوة)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ (سعد بن معاذ) وہ شخص

ہے جس کے لئے عرش الٰہی نے حرکت کی اور ان کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اور ان کے پاس (ان کی نماز جنازہ ادا کرنے کے لئے) ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے۔ تحقیق ان کی قبر تنگ ہوگئی تھی۔ پھر اسے کشادہ کرلیا گیا۔

" الذی تحرک له العرش ای ارتاح بصعوده واستبشر لکرامته علی ربه"
(مرقاۃ ج ا، ص ۲۱۱)

آپ کے لئے عرش الٰہی نے حرکت کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی روح کے چڑھنے کی وجہ سے خوش ہوا، راحت محسوس کی، آپ کی روح کو خوشبو سے مہکتا ہوا پایا۔ اور آپ کو جو رب کے ہاں عزت و تکریم حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے خوشی سے عرش جھوما۔

" وفتحت له ابواب السماء لإنزال الرحمة ونزول الملائكة اوتزيينا لقدومه وطلوع روحه لأن محل أرواح المؤمنين الجنة وهي فوق السماء السابعة عرضا للابواب بأن يدخل من أي باب شاء لعظم كما له كفتح ابواب الجنة الثمانية لبعض المؤمنين " (مرقاۃ ج ا، ص ۲۱۱)

آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے، تاکہ رحمت کا نزول ہو، اور فرشتے نازل ہوں، یا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی روح کے آنے کی وجہ سے آسمانوں کو مزین کرنے کے لئے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ اور وجہ یہ تھی کہ آپ کی روح کو جنت میں پہنچانے کے لئے دروازے کھول دیئے گئے تھے، کیونکہ جنت سات آسمانوں سے اوپر ہے اور جنت ہی مومنوں کی روحوں کے ٹھہرنے کا مقام ہے۔ اور وجہ یہ تھی کہ آپ کے عظیم کمال کی وجہ سے جنت کے تمام دروزے کھول دیئے گئے تھے، کہ آپ جس دروازے سے چاہیں داخل ہو جائیں، کیونکہ باکمال مومنوں کے لئے آٹھ جنتوں کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، کہ جس میں چاہیں داخل ہو جائیں۔

" وشهد سبعون الفا من الملائكة اى حضر جنازة تعظيما له "(مرقاۃ ج ا ص ۲۱۱)

آپ کے جنازہ میں آپ کی تعظیم کے لئے ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے۔

اے غافل انسان! کیا تو ایسے عظیم المرتبہ جلیل القدر صحابی سے بھی اپنے آپ کو بڑا سمجھ رہا ہے؟ اتنے عظیم مرتبہ والے صحابی پر قبر تنگ ہو سکتی ہے اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی تسبیحات و تکبیرات

سے قبر کشادہ ہوئی۔ تو تجھے کیا ہوا کہ اپنی قبر کو کشادہ کرنے کے ذرائع سے یعنی تلاوت قرآن پاک اور صدقہ وخیرات سے روک رہا ہے۔ کیا تو اپنی قبر کے تنگ ہونے پر ہی خوش ہے۔ اگر تجھے قبر کی تنگی پسند ہے تو ہمیں تیری قبر کے کشادہ کرنے کی کوئی فکر نہیں۔

میت کے لئے استغفار کا حکم:

"عن عثمان قال کان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن المیت وقف علیه فقال استغفروا لاخیکم ثم سلوا له بالتثبیت فانه الآن یسئل" (رواہ ابو داؤد، مشکوۃ اثبات القبر)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ میت کے دفن سے فراغت کے بعد اس پر ٹھہرے اور فرمایا اپنے بھائی کے لئے مغفرت طلب کرو! پھر اس کے لئے (کلمہ شہادت پر) ثابت رہنے کی دعا کرو، کیونکہ اب اس سے سوال کیا جائے گا۔

میت کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا: مسلم شریف جلد اول کتاب الجنائز میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کردہ ایک طویل حدیث میں یہ ذکر کیا گیا ہے۔

"...... حتی جاء البقیع فقام فاطال القیام ثم رفع یدیه ثلاث مرات ثم انحرف"

یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ بقیع (قبرستان کا نام) میں تشریف لائے، وہاں بہت دیر کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا کر تین مرتبہ دعا فرمائی پھر واپس ہو گئے۔

یہاں ہاتھ اٹھانے سے مراد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ہی مراد ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے آخر میں آ رہا ہے۔

"فقال ان ربک یأمرک ان تاتی اهل البقیع فتستغفر لهم"

جبرائیل نے کہا بیشک تمہارا رب تمہیں حکم دیتا ہے، تم بقیع میں دفن شدہ حضرات کے پاس آ کر ان کے لئے دعا مغفرت کرو۔

"مالک عن یحی بن سعید ان سعید بن المسیب کان یقول ان الرجل لیرفع بدعاء ولده من بعد وقال بیده نحو السماء فرفعهما"

(موطا امام مالک کتاب القرآن باب العمل فی الدعاء)

امام مالک یحی بن سعید سے روایت کرتے ہیں، بیشک سعید بن میسب کہتے ہیں کہ تحقیق پیچھے رہ

جانے والی اولاد کی دعا سے انسان کے مدارج بلند ہوتے ہیں، انہوں نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس حدیث کی شرح میں مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی تحریر فرماتے ہیں۔

"توضیح کلام الباجی ان قوله قال بیده (الخ) ویحتمل وجهین الاول ان یکون بیانا لقوله ید ویؤیده روایة بن عیسٰی بلفظ یرفعها ویدعو یعنی اذا رفع الولد یدیه نحو السماء للدعاء وصوره ابن المسیب بیدیه فیرفع لأجله درجات الولد"

شارح حدیث علامہ باجی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی وضاحت یہ ہے کہ حدیث شریف میں "بیدیه" سے لے کر آخر تک جو الفاظ مذکور ہیں۔ اس کا مقصد بیان کرنے میں دو احتمال ہیں۔ ایک احتمال یہ ہے کہ یہ "یدعوا" کا بیان ہوا، مطلب یہ ہوگا کہ اولاد ہاتھ اٹھا کر دعا کرے۔

اس معنی کی ابن عیسیٰ کی روایت تائید کرتی ہے، جس میں ذکر ہی "یرفعهماویدعوا" ہے جس کا معنی یہ ہے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا کرے۔ یعنی اولاد جب دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اپنے والدین کے لئے دعا کرے تو ان کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔

اسی صورت کو ابن مسیب نے اپنے ہاتھ اٹھا کر بتایا ہے، کہ اس طرح دعا کرے۔

خیال رہے کہ حدیث پاک میں اولاد کی قید اتفاقی ہے، کیونکہ تمام زندہ لوگوں کی دعا فوت شدہ لوگوں کے مدارج کی بلندی کا سبب ہے۔ اس حدیث کی شرح میں بیان کیا گیا ہے۔

"بدعاء ولده ای بسبب دعاء اولاده ومن تبعه من بعد ای بعد موته"

یعنی جس طرح اولاد کی دعا کی وجہ سے مدارج بلند ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کے پیچھے رہ جانے والوں میں سے کوئی بھی دعا کرے تو اس کے مدارج کی بلندی کا وہ دعا سبب ہوگی۔

ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے میں حکمت:

کچھ لوگ دعا کے تو قائل ہو جاتے ہیں مگر نا معلوم ہاتھ اٹھانے میں انہیں کیا قباحت محسوس ہوتی ہے؟ درج ذیل میں ہاتھ اٹھانے کی حکمت و برکت کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

"عن سلیمان قال قال رسول الله ﷺ ان ربکم حیی کریم یستحیي من عبده اذا رفع یدیه الیه ان یردهما صفرا" (رواہ الترمذی وابوداؤد والبیهقی مشکوۃ شریف کتاب الدعوات)

حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارا رب بڑے حیاء والا ہے۔ (جو اس کی شان کے لائق ہے) اپنے بندے سے حیاء فرماتا ہے کہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹائے۔

خیال رہے کہ یہاں حیاء کا حقیقی معنی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو انکے نفع والی چیزیں عطا فرمایا ہے اور ضرر والی ان سے دور رکھتا ہے۔

علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاۃ المفاتیح میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"حکمة الرفع الی السماء انها قبلة الدعاء ومهبط الرزق والوحی والرحمة والبركة"

ہاتھ اٹھانے میں یہ حکمت ہے کہ آسمان دعا کا قبلہ ہے جیسے نماز کا قبلہ کعبہ شریف ہے، نماز میں جب کعبہ شریف کی طرف انسان متوجہ ہوتا ہے تو دعا میں آسمانوں کی طرف ہاتھ پھیلا کر دعا کرے۔ آسمانوں سے ہی رزق، وحی رحمت اور برکت نازل ہوتی ہے۔

قرآن پاک پڑھ کر دعا کرنے میں عظیم برکت:

"وعن حمید الاعرج قال من قرء القرآن وختمه ثم دعا أمّن علیٰ دعانه اربعة آلاف ملك ثم لایزالون یدعون له ویستغفرون ویصلون علیه الی السماء او الی الصباح" (روح البیان پ۹ زیر آیة وهذا کتاب انزلنه مبارک)

حمید اعرج سے مروی ہے کہ جس نے قرآن پاک پڑھ کر ختم کیا، پھر دعا کی تو اس کی دعا پر چار ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں۔ پھر ہمیشہ اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں اور اس کے لئے مغفرت طلب کرتے رہتے ہیں اور صبح وشام تک اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں۔

سبحان اللہ! پڑھنے والے کو کتنا عظیم ثواب ملتا ہے اور اس کے لئے فرشتے دعا کرتے ہیں، جب وہ دعا کرتا ہے تو چار ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں۔ جب وہ میت کے لئے دعا کرے گا اور چار ہزار فرشتے آمین کہیں گے۔ تو میت کے کتنے مدارج بلند ہوں گے۔

قرآن پاک کے دَور کے وقت صدقہ کرنا:

"عن ابن عباس قال کان رسول الله ﷺ اجود الناس بالخیر وکان اجود ما

یکون فی شهر رمضان ان جبرئیل علیه السلام کان یلقاه فی کل سنة فی رمضان حتی ینسلخ فیعرض علیه رسول الله ﷺ القرآن فاذا لقیه جبرئیل کان اجود بالخیر من الریح المرسلة". (مسلم ج۲، باب جوده ﷺ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور رمضان شریف میں زیادہ سخاوت فرماتے تھے، بیشک جبرائیل علیہ السلام ہر سال رمضان میں آپ سے ملاقات کرتے تھے، یہ سلسلہ ملاقات رمضان کے ختم ہونے تک جاری رہتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جبرائیل علیہ السلام سے قرآن پاک کا دور کرتے تھے۔ جب آپ کی ملاقات جبریل سے ہوتی تو آپ تیز چلنے والی ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔

اس حدیث پاک کی تشریح میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

" وفی هذا الحدیث فوائد منها بیان عظم جوده ﷺ ومنها استحباب اکثار الجود فی رمضان ومنها زیادة الجود والخیر عند ملاقاة الصالحین وعقب فراقهم للتاثر بلقائهم ومنها استحباب مدارسة القرآن " (نووی شرح مسلم ج ۲، ص ۲۴۱)

اس حدیث پاک میں کئی فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔

(۱) نبی کریم ﷺ کی بہت زیادہ جود و سخاوت کا اس میں بیان ہے۔

(۲) رمضان شریف میں زیادہ سخاوت کرنا مستحب ہے۔

(۳) نیک لوگوں سے ملاقات کے وقت زیادہ سخاوت کرنا۔

(۴) نیک لوگوں کی جدائی کے وقت زیادہ سخاوت کرنا۔ کیونکہ ان کی ملاقات نے اس پر نیکیوں کے اثرات چھوڑے ہیں۔

(۵) قرآن پاک کو دور کرنا، یعنی ایک دوسرے کو سنانا مستحب ہے۔

اسی طرح چھٹا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ قرآن پاک پڑھنے پر صدقہ کرنا مستحب ہے۔

قرآن پاک پڑھ کر اجتماعی دعا کرنا:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ قرآن پاک کے ختم کے وقت اپنے گھر والے تمام حضرات کو جمع کرتے اور پھر سب مل کر دعا کرتے تھے۔ (نووی کتاب الاذکار باب تلاوت القرآن)

حکیم ابن عتبہ فرماتے ہیں کہ ایک مجمع کو مجاہدہ وعبدہ ابن ابی لبابہ نے بلایا اور فرمایا کہ ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ آج ہم قرآن پاک ختم کر رہے ہیں۔ چونکہ قرآن پاک ختم کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔

حضرت مجاہدہ سے صحیح روایت منقول ہے کہ بزرگان دین قرآن پاک کے ختم کے وقت لوگوں کو جمع کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اس وقت رحمت باری تعالیٰ کا نزول ہوتا ہے۔ (نووی کتاب الاذکار)

کھانا سامنے رکھ کر قرآنی آیات تلاوت کرنا:

عام طور پر مروج ہے کہ کھانا سامنے رکھ کر ''چھار قل'' یعنی سورۃ الکافرون، اخلاص، الفلق، الناس، فاتحہ، البقرۃ کی ابتدائی آیات پڑھ کر دعا کی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ یہ کھانا حرام ہوگیا ہے۔ سبحان اللہ کیسی جاہلانہ منطق ہے۔ قرآن پاک پڑھنے سے کھانا متبرک ہوتا ہے یا حرام؟

اللہ کا ذکر کرنے سے کھانا متبرک ہوتا ہے:

حضرت ابوطلحہ کے گھر تھوڑا سا طعام تھا۔ حضور ﷺ کے ساتھ ستر یا اسی صحابہ کرام آئے تو آپ نے فرمایا۔

" ھلمی یا ام سلیم ما عندک فاتت بذلک الخبیر فامر به رسول اللہ ﷺ ففت وصعرت ام سلیم عکة فادمته ثم قال رسول اللہ ﷺ فیه ما شاء اللہ " (مسلم، بخاری مشکوۃ المعجزات)

اے ام سلیم جو تمہارے پاس طعام ہے وہ لے آؤ انہوں نے روٹی پیش کی۔ آپ نے روٹی کے ٹکڑے کرنے کا حکم دیا، ام سلیم نے ایک برتن سے گھی نچوڑ کر روٹی پر لگایا۔ پھر اس پر نبی کریم ﷺ نے

کچھ پڑھا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت میں تھا۔ پھر دس دس آدمیوں کو بلاتے رہے جو سیر ہو کر چلے جاتے۔ وہ معمولی طعام آپکے پڑھنے کی برکت سے اسی آدمیوں نے سیر ہو کر کھا لیا۔ سبحان اللہ!

" ثم قال فیه رسول الله ﷺ ما شاء الله ان یقول "

اس کی تشریح علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

" فیه ای فی ذلک الخبز مع الادام او فیما ذکر من الخبز والادام "

اس میں پڑھا۔ سوال ہوتا ہے کہ مفرد کی ضمیر دو چیزوں کی طرف روٹی اور گھی کیطرف کیسے لوٹ رہی ہے۔ تو اسکی وجہ بیان کی یا یہ تاویل "فی ذلک الخبز مع الادام" اس روٹی میں بمع گھی کے پڑھا۔ یا تاویل یہ کریں "فیما ذکر" جس چیز کا پہلے ذکر آ چکا یعنی روٹی اور گھی میں پڑھا۔

"ماشاء الله ان یقول" اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہ پڑھا۔ " ای من الدعا أو الاسماء " یعنی دعا کی اور اسماالٰہیہ پڑھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں چند کھجوریں پیش کیں اور عرض کیا

" یا رسول الله ﷺ ادع الله فیهن البرکة فضمهن ثم دعا لی فیهم بالبرکة "

یا رسول اللہ ﷺ آپ ان میں اللہ تعالیٰ سے برکت کی دعا فرما دیں۔ آپ نے وہ ہاتھ میں لیں۔ پھر میرے لئے ان میں برکت کی دعا فرما دی۔ اور آپ نے فرمایا کہ یہ لے لو اور ان کو اپنے کسی توشہ دان میں ڈال لو۔ جب بھی تم کھجوریں لینا چاہو تو اس میں ہاتھ ڈال کر نکال لیا کرنا۔ لیکن ان کو نکال کر باہر نہیں پھینکنا۔

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں میں وہ کھجوریں ہمیشہ اپنی کمر پر باندھ کر رکھتا تھا، ان میں سے ایک وسق یعنی ساٹھ صاع (ایک صاع تقریباً چار کلو کے برابر ہوتا ہے) تو میں نے اللہ کی راہ میں دیں۔ ہم خود بھی کھاتے رہے اور دوسرے لوگوں کو بھی کھلاتے رہے۔ لیکن (افسوس) کہ وہ توشہ دان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن میری کمر سے ٹوٹ کر گر گیا۔ کھجوریں بکھر گئیں۔ (پھر وہ ختم ہو گئیں)۔

(باب المعجزات، مشکوۃ)

وہ کھجوریں جب حضرت ابو ہریرہ نے آپ کی خدمت میں پیش کی تھی ۔ان کی تعداد کل اکیس تھی نبی کریم علیہ السلام نے ہاتھ میں لے کر برکت کی دعا کی ۔وہ بابرکت ہوگئیں۔

غور کیجئے! کھانے کی چیز پر پڑھنے اور دعا کرنے سے وہ کھانا حرام کیسے ہو جاتا ہے ۔اہل علم کو تو اس کا پتہ نہیں ۔البتہ جہلاء اس کے حرام ہونے کی رٹ لگاتے رہیں، تو ہم ان کو ان کی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے معذور سمجھیں گے ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ۔کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کی تو میری والدہ ام سلیم نے کھجوروں، گھی اور کھوئے سے حلوہ تیار کیا، اسے ایک برتن میں ڈالا، پھر کہا اے انس یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤ، اور یہ عرض کرنا کہ یہ میری والدہ نے آپ کی طرف بھیجا ہے اور آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے ۔اور یہ کہہ رہی تھیں یا رسول اللہ آپ کے لئے ہماری طرف سے یہ تھوڑا سا ہدیہ ہے ۔

فرماتے ہیں: میں لے کر گیا، والدہ کا پیغام پہنچایا آپ نے فرمایا رکھ دو ۔پھر آپ نے فرمایا جاؤ فلاں کو میرے پاس بلاؤ اور فلاں کو اور فلاں کو جن شخصوں کے آپ نے نام ذکر فرمائے ۔(تین آدمیوں کے خصوصی نام ذکر فرمائے) پھر کہا جو بھی تمہیں ملے اسی کو میرے پاس آنے کی دعوت دے دو، میں نے ان آدمیوں کو دعوت دی جن کے آپ نے نام لئے تھے ۔واپس آیا تو آپ کا گھر آپ کے صحابہ سے بھرا ہوا تھا ۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تمہاری تعداد کتنی تھی ۔ آپ نے فرمایا کہ تین سو کے قریب تھی، حضرت انس کہتے ہیں ۔

" فرأيت النبى صلى الله عليه وسلم وضع يده على تلك الحسية وتكلم بما شاء الله"

میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ مبارک اسی حلوے پر رکھا ہوا ہے اور آپ نے اس پر پڑھا جو اللہ نے چاہا، پھر آپ نے دس دس آدمیوں کو بلایا اور وہ کھانا کھانے لگے ۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''اللہ کا نام لے کر کھاؤ اور ہر شخص اپنے سامنے سے کھائے !''

سب لوگ سیر ہو کر کھا کر چلے گئے ۔پھر اور دس کو بلایا ۔اسی طرح سب (یعنی تین سو کے قریب لوگوں) نے کھانا سیر ہو کر کھا لیا ۔اور مجھے آپ نے فرمایا اے انس اب اٹھالو ۔میں نے اٹھایا تو مجھے معلوم نہیں ہو

وہ کھجوریں جب حضرت ابو ہریرہ نے آپ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ان کی تعداد کل اکیس تھی نبی کریم ﷺ نے ہاتھ میں لے کر برکت کی دعا کی۔وہ بابرکت ہوگئیں۔

غور کیجئے! کھانے کی چیز پر پڑھنے اور دعا کرنے سے وہ کھانا حرام کیسے ہو جاتا ہے۔اہل علم کو تو اس کا پتہ نہیں۔البتہ جہلاء اس کے حرام ہونے کی رٹ لگاتے رہیں،تو ہم ان کو ان کی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے معذور سمجھیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کی تو میری والدہ ام سلیم نے کھجوروں، گھی اور کھوئے سے حلوہ تیار کیا، اسے ایک برتن میں ڈالا، پھر کہا اے انس یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے جاؤ، اور یہ عرض کرنا کہ یہ میری والدہ نے آپ کی طرف بھیجا ہے اور آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے۔اور یہ کہہ رہی تھیں یا رسول اللہ آپ کے لئے ہماری طرف سے یہ تھوڑا سا ہدیہ ہے۔

فرماتے ہیں: میں لے کر گیا، والدہ کا پیغام پہنچایا آپ نے فرمایا رکھ دو۔پھر آپ نے فرمایا جاؤ فلاں کو میرے پاس بلاؤ اور فلاں کو اور فلاں کو جن شخصوں کے آپ نے نام ذکر فرمائے۔(تین آدمیوں کے خصوصی نام ذکر فرمائے) پھر کہا جو بھی تمہیں ملے اسی کو میرے پاس آنے کی دعوت دے دو، میں نے ان آدمیوں کو دعوت دی جن کے آپ نے نام لئے تھے۔واپس آیا تو آپ کا گھر آپ کے صحابہ سے بھرا ہوا تھا۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تمہاری تعداد کتنی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ تین سو کے قریب تھی، حضرت انس کہتے ہیں۔

" فرأیت النبی ﷺ وضع یدہ علی تلک الحسیة وتکلم بما شاء اللہ"

میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک اسی حلوے پر رکھا ہوا ہے اور آپ نے اس پر پڑھا جو اللہ نے چاہا، پھر آپ نے دس دس آدمیوں کو بلایا اور وہ کھانا کھانے لگے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ کا نام لے کر کھاؤ اور ہر شخص اپنے سامنے سے کھائے!"

سب لوگ سیر ہو کر کھا کر چلے گئے۔پھر اور دس کو بلایا۔اسی طرح سب (یعنی تین سو کے قریب لوگوں) نے کھانا سیر ہو کر کھا لیا۔اور مجھے آپ نے فرمایا اے انس اب اٹھا لو۔میں نے اٹھایا تو مجھے معلوم نہیں ہو

رہاتھا، کہ جب کھانا رکھا تھا۔ اس وقت زیادہ تھا یا جب واپس اٹھایا؟ (مشکوۃ باب المعجزات)

یعنی آپ نے تعجب کیا کہ تین سولوگ کھانا کھا گئے لیکن کھانا پہلے سے زیادہ تھا۔ اس حدیث پاک سے بھی یہی واضح ہوا کہ کھانا سامنے رکھ کر نبی کریم ﷺ نے اللہ کا ذکر کیا اور دعا کی، اس میں برکت ہوئی۔

پتہ چلا کہ کھانا سامنے رکھ کر پڑھنا، ذکر کرنا، دعا کرنا باعث برکت ہے نہ کہ باعث حرمت۔

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ:

" طعامیکہ ثواب آن نیاز حضرت امامین نمایند بر آن قل وفاتحہ ودرود خواندن متبرک ثواب می شود وخوردن حضرت بیسار خوب است " (فتاوی عزیزیہ ص ۷۵)

وہ طعام جو حضرت امام حسن وامام حسین رضی اللہ عنہما کے ثواب کے لئے پکایا جائے اور اس پر قل (سورۃ الکافرون، فلق، الناس) پڑھنا باعث برکت ہے اور اس کا کھانا بہت ہی خوب ہے۔

" اگر مالیدہ وشیر برائے فاتحہ بزرگے بقصد ایصال ثواب بروح ایشان پختہ بخورانند جائز است مضائقہ نیست " (فتاوی عزیزیہ ص ۷۵)

کسی بزرگ کے فاتحہ کے لئے ان کے روحوں کو ثواب پہنچانے کے لئے دودھ اور مالیدہ پکایا جائے تو جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

حاجی امداد اللہؒ کا فتویٰ: حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (جو مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے مرشد ہیں) فرماتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ فاتحہ مروجہ کا: اس میں وہی گفتگو ہے جو "مسئلہ مولود" (محفل میلاد) میں مذکور ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ نفس ایصال ثواب ارواح اموات میں کسی کو کلام نہیں، اس میں بھی تخصیص وتعیین کو موقوف علیہ ثواب کا سمجھے (یعنی کھانا سامنے رکھنے سے ثواب ہوگا ورنہ نہیں ہوگا) یا واجب وفرض اعتقاد کرے تو ممنوع ہے۔ اور اگر یہ اعتقاد نہیں بلکہ کوئی مقصد باعث تقیید ہیئت کذائیہ (عام رواج کے مطابق اہتمام کرنا) ہے تو کچھ حرج نہیں۔ جیسا بمصلحت نماز میں سورہ اخلاص کو معین کرنے کو فقہاء

محققین نے جائز رکھا کہ سلف میں تو عادت تھی ۔ کہ مثلاً کھانا پکا کر مسکین کو کھلا دیا اور دل سے ایصال ثواب کی نیت کر لی۔ متاخرین میں کسی کو خیال ہوا کہ جیسے نماز میں نیت ہر چند دل سے کافی ہے۔ مگر موافقت قلب ولسان (دل اور زبان) کے لئے عوام کو زبان سے کہنا بھی مستحسن ہے ۔ اسی طرح اگر یہاں زبان سے کہہ لیا جائے ''یا اللہ اس کھانے کا ثواب فلاں شخص کو پہنچے'' تو بہتر ہے۔ پھر کسی کو خیال ہوا کہ اس کے لفظ کا مشار الیہ اگر روبرو موجود ہو تو زیادہ استحضارِ قلب (دل کا حاضر ہونا) ہو۔ کھانا روبرو لانے لگے۔ کسی کو یہ خیال ہوا کہ یہ ایک دعا ہے۔ اس کے ساتھ اگر کچھ کلام الٰہی بھی پڑھا جائے تو قبولیت دعا کی بھی امید ہے۔ اور اس کلام کا ثواب بھی پہنچ جائے گا۔ کہ

" جمع بین العباد میں ہے۔

ع ''چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار''

قرآن شریف کی بعض سورتیں بھی لفظوں میں مختصر اور ثواب میں بہت زیادہ ہیں پڑھی جانے لگیں۔ کسی نے خیال کیا، کھانا جو مسکین کو دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ پانی دینا بھی مستحسن ہے۔ پانی پلانا بڑا ثواب ہے اس نے پانی کو بھی کھانے کے ساتھ رکھ لیا پس یہ ہیئت کذائیہ حاصل ہوگئی۔

(یعنی ایک خاص طریقہ ختم اور دعا کا مروجہ ہو گیا۔ لیکن ہر کام میں ثواب ہے نہ کہ گناہ۔ بلکہ مستحب، کیونکہ حاجی صاحب جابجا لفظ مستحسن استعمال فرمارہے ہیں۔ جس کام کو علماء وصلحاء اچھا سمجھیں، وہ مستحب ہوتا ہے۔

تعیین تاریخ کے متعلق فرماتے ہیں:

''یہ بات تجربہ سے معلوم ہوتی ہے۔ کہ جو امر کسی خاص وقت میں معمول ہو اس وقت وہ یاد آجاتا ہے۔ اور ضرور ہو رہتا ہے، اور نہیں تو سالہا سال گزر جاتے ہیں۔ کبھی خیال بھی نہیں ہوتا اس قسم کی مصلحتیں ہر امر میں ہیں۔ (فیصلہ هفت مسئلہ ، کلیات امدادیہ صفحہ ۸۱)

حاجی صاحبؒ نے مسئلہ کا مکمل حل پیش کر دیا کہ معین تاریخ کو ایصال ثواب کا اہتمام کرنا، قرآن پاک پڑھ کر، سامنے کھانا اور پانی رکھ کر اور چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر دعا کرنا مستحب ہے۔ ہاں البتہ ان چیزوں کو فرض اور واجب نہ سمجھے، اور یہ بھی نہ سمجھے کہ اس صورت کے بغیر ثواب نہیں پہنچے گا۔ بفضلہ تعالیٰ

علمائے اہلسنت اور عوام اہل سنت کا یہی عقیدہ وطریقہ ہے۔

جمعرات کا ختم: اگرچہ ایصالِ ثواب کا کوئی دن مقرر نہیں، لیکن بعض دنوں کی بعض وجوہ سے افضلیت ثابت ہے اس لئے سلف صالحین نے ایصال ثواب کی محافل میں جن چیزوں کا لحاظ کیا ہے، وہ بلا دلیل نہیں بلکہ احادیث مبارکہ سے ہی وجوہ تلاش کی ہیں۔

" عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ یفتح ابواب الجنۃ یوم الاثنین و یوم الخمیس فیغفر لکل عبد لا یشرک باللہ شیئا الا رجل کانت بینہ وبین اخیہ شحناء وفیقال انظروا ھٰذین حتی یصطلحا "

(رواہ مسلم باب الحب فی اللہ ومن اللہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پیر کے دن اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانے والے ہر شخص کی بخشش کی جاتی ہے سوائے اس شخص کے جس کے درمیان اور اس کے (دوسرے مسلمان) بھائی کے درمیان عداوت پائی جاتی ہو، پس (اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو کہا جاتا ہے) ان کو مہلت دے دو یہاں تک کہ یہ صلح کرلیں۔

" وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ یعرض اعمال الناس فی کل جمعۃ مرتین یوم الاثنین ویوم الخمیس فیغفر لکل عبد مومن الا عبد بینہ وبین اخیہ شحناء فیقال اترکوا ھٰذین حتی یضیئا "

(رواہ مسلم ومشکوۃ باب الحب فی اللہ ومن اللہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں کے اعمال ہر ہفتہ میں دو دن پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر مومن بندے کے مغفرت کی جاتی ہے۔ سوائے اس کے ایک شخص اور اس کے دوسرے مومن بھائی کے درمیان عداوت پائی جاتی ہو، پس کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کو چھوڑ دو یہاں تک کہ یہ (عداوت سے) رجوع کرلیں۔

" قال القاضی قال الباجی معنی فتحھا کثرۃ الصفح والغفران ورفع المنازل واعطاء الثواب الجزیل قال القاضی ویحتمل ان یکون علی ظاھرہ وان فتح ابوابھا علامۃ لذلک " (نووی شرح مسلم ج ۲، ص ۳۲۵)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ باجی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا کہ جنت کے دروازوں کے کھلنے کا یہ مطلب ہے کہ ان دو دنوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کثیر معافی عطا کی جاتی ہے۔ اور کثیر بخشش کی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے مراتب بلند فرماتا ہے۔ اور کثیر ثواب عطا فرماتا ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ اس کو ظاہر پر رکھنا بھی درست ہے۔ کہ جنت کے دروازے فی الواقع کھول دیئے جاتے ہیں، البتہ ان کو کھولنے کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ کہ پتہ چل جائے کہ آج اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں ہے۔ اپنے بندوں کو عفو اور مغفرت کثیر طور پر عطا فرما رہا ہے۔ ان کے مراتب بلند کر رہا ہے۔ انہیں عظیم ثواب سے نواز رہا ہے۔

" وفی روایة الحکیم عن والد عبد العزیز ولفظه " تعرض الاعمال یوم الاثنین والخمیس علی الله تعالیٰ وتعرض علی الانبیاء وعلی الآباء والامهات یوم الجمعة فیفرحون بحسناتهم وتزداد وجوههم بیاضا واشراقا فاتقوا الله ولا توذوا موتاکم " (مرقاۃ ج ، ص ۲۶۵)

ایک روایت میں یہ ہے کہ بندوں کے اعمال پیر کے دن اور جمعرات کے دن اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کئے جاتے، اور انبیاء کرام اور لوگوں کے آباؤ وامہات، باپ، دادا، نانی، دادی وغیرہ اوپر تک آباؤ اجداد پر جمعہ کے دن پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ بزرگ ان کے اچھے اعمال سے خوش ہوتے ہیں ان کے چہرے خوشی کی وجہ سے زیادہ سفید اور روشن ہو جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور فوت شدہ اپنے آباؤ اجداد کو ایذاء نہ پہنچاؤ۔

ان احادیث سے واضح ہوا۔ کہ جمعرات کا دن اور پیر کا دن مبارک ہے، اس میں لوگوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرماتا ہے۔ اپنی رحمت کی وجہ سے جنت کے دروازے کھول دیتا ہے، اسی وجہ سے بزرگان دین نے جمعرات کو ایصال ثواب کا اہتمام کرنا خاص کیا ہے کہ قرآن پاک پڑھنے والوں کا عمل بھی مقام مقبولیت میں پہنچ جائے اور جس میت کیلئے دعا کی جارہی ہے۔ اس کے لئے دعا کی قبولیت کو بھی شرف حاصل ہو جائے۔

خاص کر کے جمعرات کو غروب آفتاب سے پہلے قرآن پاک پڑھنے کا اہتمام ہو اور غروب

آفتاب کے بعد دعا کی جائے تو جمعہ کی فضیلت بھی ساتھ ہی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح یہ دعا کا عمل انبیائے کرام کے حضور بھی پہنچے گا اور ان لوگوں کے آباؤ اجداد کے پاس بھی۔ اب لوگوں کی مرضی کی بات ہے کہ وہ دعائے مغفرت کا اہتمام کر کے اپنے آباؤ اجداد کو خوش کرنا چاہتے ہیں یا کہ ایصال ثواب کا کوئی فائدہ نہیں۔ کہہ کر انہیں مایوس کرنا چاہتے ہیں۔

" عن کعب ابن مالک ان النبی ﷺ خرج یوم الخمیس فی غزوۃ تبوک و کان تحب ان یخرج یوم الخمیس " (رواہ البخاری، مشکوۃ باب آداب السفر)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ بیشک نبی کریم ﷺ غزوہ تبوک میں جمعرات کے دن (گھر سے) نکلے، آپ جمعرات کو ہی نکلنا پسند فرماتے تھے۔

نبی کریم ﷺ غزوات وغیرہ کی لئے جمعرات کو جانا کیوں پسند فرماتے تھے۔

اس کی چند وجوہ ہیں۔

" احدھا انہ یوم مبارک یرفع فیہ اعمال العباد الی اللہ وقد کانت سفراتہ للہ وفی اللہ والی اللہ فاحب ان یرفع لہ فیہ عمل صالح " (مرقاۃ ج۷، ص ۳۲۶)

ایک وجہ یہ ہے کہ یہ برکت والا دن ہے، اس میں بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں، چونکہ نبی کریم ﷺ کے سفر بھی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی وجہ سے ہوتے تھے، اس لئے آپ پسند فرماتے تھے، کہ یہ میرا سفر جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہے، آج ہی اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو جائے

" عن عائشة قالت کان رسول اللہ ﷺ یصوم الاثنین والخمیس " (رواہ الترمذی والنسائی، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔

" وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ تعرض الاعمال یوم الاثنین والخمیس فاحب ان یعرض عمل وانا صائم " (رواہ الترمذی، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پیر اور جمعرات کو

(اللہ تعالیٰ کے حضور لوگوں کے) اعمال پیش ہوتے ہیں۔ پس میں پسند کرتا ہوں کہ میرے اعمال پیش
ہوں تو میں روزہ دار ہوں۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ جمعرات برکت والا دن ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس دن نیک اعمال کرنے کو پسند فرمایا ہے، اسلئے ایصال ثواب کی محافل اس دن قائم کرنا یقیناً فضیلت کا سبب ہیں

" عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ ﷺ ما من مسلم یموت یوم الجمعة
ولیلة الجمعة الا وقاہ اللہ فتنة القبر " (رواہ احمد والترمذی، مشکوٰۃ باب الجمعہ)

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان بھی جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات کو فوت ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور قبر کے فتنہ سے بچالیتا ہے۔ فتنہ قبر سے مراد عذاب قبر اور قبر میں ہونے والے سوالات ہیں۔ یعنی وہ قبر کے عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر عظیم فضل ہوتا ہے۔

" وھذا یدل علی ان شرف الزمان لہ تاثیر عظیم کما ان فضل المکان
لہ اثر جسیم " (مرقاۃ ج۳، ص ۲۴۲)

یہ حدیث پاک اس پر دلالت کر رہی ہے کہ زمانہ کی شرافت کی دعا کی قبولیت میں عظیم اثر حاصل ہے، جیسا کہ مکان کی فضیلت کو بہت زیادہ اثر حاصل ہے۔

تنبیہ:

" قال القرطبی ھذہ الاحادیث ای التی تدل علی نفی سوال القبر لاتعارض
احادیث السؤال السابقة ای لا تعارضھا بل تخصھا وتبین من لایسئل فی
قبرہ ولا یفتنہ فیہ ما یجری علیہ السؤال . (مرقاۃ ج۳، ص ۲۴۲)

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جو احادیث سوال قبر کی نفی پر دلالت کر رہی ہیں ان میں اور وہ احادیث جو پہلے مذکور ہو چکی ہیں۔ جن میں قبر کے سوال کا ذکر ہے ان میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ پہلی احادیث میں یہ ذکر ہے کہ قبر میں سوال ہوں گے۔ ان میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جمعہ کو فوت ہونے والے قبر کے سوال سے محفوظ ہوں گے اور اگر کسی سے سوال ہوا بھی تو وہ سختی اور عذاب سے محفوظ رہے گا۔

فائدہ: ابھی تک جن احادیث کو ذکر کیا ہے ان سے واضح ہوا، کہ جمعرات، جمعہ اور پیر کو دوسرے دنوں میں سے خصوصی فضیلت حاصل ہے، ان میں کئے ہوئے عمل کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے، اسی وجہ سے اہل علم بزرگان دین نے ان دنوں میں ایصال ثواب کی محافل کو منعقد کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

سوئم (تیجہ) تیسرے دن عام طور پر ایصال ثواب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جسے سوئم یا تیجہ یا قل کا ختم کہہ لیا جاتا ہے۔ قرآن پاک پڑھا جاتا ہے۔ کلمہ شریف، درود شریف اور سورۃ اخلاص پڑھے جاتے ہیں۔ یہ تمام امور مستحسن ہیں۔ ایصال ثواب کے طریقوں میں سے یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

مگر کچھ لوگ اپنی سرشت کے مطابق اسے بھی ناجائز کہتے ہیں۔ ان سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا اللہ کا کلام پڑھنا ناجائز ہے؟ کیا اللہ کا نام لینا منع ہے؟ کیا اللہ کے حبیب پر درود پاک پڑھنا حرام ہے؟ جب سب میں ثواب ہے کوئی چیز ناجائز نہیں تو ناجائز کہنا کہاں تک انصاف ہے۔ کیا ایسا کہنے والے عالم ہیں، یا جاہل۔ خدارا انصاف کیجئے! حق و باطل میں فرق کو سمجھیں۔

"التعزية لصاحب الميت حسن كذا فی الظهيرية"

مصیبت زدہ انسان کے پاس تعزیت کے لئے جانا مستحب ہے۔ خیال رہے کہ تعزیت کا معنی صبر دلانا ہے۔ پیٹنا نہیں، آج کل پیٹنے والے جلوسوں کا نام تعزیہ کے جلوس رکھ لیا گیا ہے، جنوں کا نام خرد اور خرد کا نام جنوں رکھ لیا۔ حقیقت میں صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کی سزا رب تعالیٰ نے یہ دے رکھی ہے کہ اپنے آپ کو پیٹتے رہو۔ احمق سزا کو ثواب سمجھ بیٹھے۔

"ووقتها من حين يموت الى ثلاثة ايام ويكره بعدها الا يكون المعزى او المعزى اليه غائبا فلا بأس بها وهي بعد الدفن اولى منها قبله وهذا اذا لم ير منهم جزع شديد فان رؤى ذلك قدمت التعزية"

تعزیت کا وقت وفات سے لے کر تین دنوں تک ہے، اس کے بعد مکروہ ہے، ہاں البتہ تعزیت کرنے والا یا جس کے پاس تعزیت کرنی ہے وہ موجود نہ ہو تو جب بھی ملاقات ہو تعزیت کر لی جائے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ دفن کے بعد تعزیت زیادہ بہتر ہے، ہاں اگر لوگ زیادہ جزع فزع کر رہے ہو، تو

دفن سے پہلے بھی تعزیت کی جاسکتی ہے۔

" ویستحب ان یعم بالتعزیة جمیع اقارب المیت الکبار والصغار والرجال والنساء الا ان یکون امرأة شابة فلا یعزیها الا محارمها "

مستحب یہ ہے کہ میت کے تمام اقارب کے پاس تعزیت کرے خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، مرد ہوں یا عورتیں البتہ جوان عورت کے پاس صرف اس کے محرم مرد ہی تعزیت کریں۔

" ویستحب ان یقال مصاحب التعزیة غفر اللہ تعالٰی لمیتک وتجاوز عنه وتغمده برحمة ورزقک الصبر علی مصیبة وآجرک علی موته "

جو شخص تعزیت کے لئے جائے اس کے لئے مستحب یہ ہے۔ کہ وہ یہ کہے! اللہ تمہارے میت کی مغفرت کرے اور اس کے گناہ معاف فرمائے اور اس کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے اور جو تمہیں مصیبت پہنچی ہے۔ اس پر تمہیں صبر عطا فرمائے، اور اس کی موت پر صبر کرنے کی وجہ سے تمہیں اجر عطا فرمائے۔

" ولا بأس لاهل المصیبة ان یجلسوا فی البیت او فی المسجد ثلاثة ایام والناس یأتونهم یعزیهم "

مصیبت زدہ لوگوں کے لئے کوئی حرج نہیں، کہ وہ گھر میں تین دنوں تک بیٹھیں یا مسجد میں بیٹھیں اور لوگ ان کے پاس آ کر تعزیت کریں۔

" واما لنوح العالی فلا یجوز والبکاء مع رقة القلب لا باس به "

بلند آواز سے رونا چلانا، واویلا کرنا جائز نہیں، البتہ رقت قلب (دل کی نرمی) کی وجہ سے آہستہ آواز میں رونا، آنسو بہانا جائز ہے۔

" واما تسوید الخدود والایدی وشق الجیوب وخدش الوجوه ونشر الشعور ونثر التراب علی الرؤس والضرب علی الفخذ والصدر وایقاد النار علی القبور فمن رسوم الجاهلیة "

رخساروں کو سیاہ کرنا، ہاتھوں کا سیاہ کرنا، گریبان پھاڑنا اور چہرہ نوچنا بال بکھیرنا۔ سر پر مٹی ڈالنا، رانا ور سینہ پر ہاتھ مارنا، قبروں پر آگ جلانا یہ سب جاہلانہ رسمیں ہیں۔ (از فتاوی عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۷)

خیال رہے کہ بعض دیہاتوں میں موذی جانور (بجو) کے قبر کو کھودنے کے خوف کی وجہ سے

قبروں پر دھواں دُکھایا (سلگایا) جاتا ہے، وہ بوجہ عذر کے ہے۔ وہ جائز ہے۔

"عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لیس منا من ضرب الخدود وشق الجیوب ودعا بدعوی الجاهلیة" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب البکاء علی المیت)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص ہم سے نہیں جس نے رخساروں پر مارا اور گریبان پھاڑا اور زمانہ جاہلیت کی طرح واویلا کیا۔

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہوا:

☆ تین دن تک میت والے مسجد میں یا گھر جمع ہوں۔ لوگ ان کے پاس تعزیت کیلئے جائیں، ان کے لئے صبر کی دعا کریں۔ اور میت کے لئے مغفرت کی دعا کریں۔ واویلا نہ کریں، زور زور سے نہ چلائیں، پیٹیں نہیں، ورنہ نبی کریم ﷺ کی امت اور آپ کے دین سے نکل جائیں گے۔

سلف صالحین، بزرگان دین، علماء دین متین نے جب یہ دیکھا کہ تعزیت کے لئے لوگ تیسرے دن کو تعزیت کا آخری دن سمجھ کر جمع ہوتے ہیں، لیکن وہ میت کے اقرباء کو تسلی دینے اور صبر کی تلقین کرنے کے بجائے خود بھی رونے چلانے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں، تو اس کی جگہ یہ بہتر ہے کہ لوگ قرآن پاک پڑھیں، اللہ کا ذکر کریں، کلمہ شریف پڑھیں؛ تا کہ پڑھنے والوں کو ثواب ہو اور میت کو بھی فائدہ ہو۔ لوگ رونے، پیٹنے سے بچ جائیں۔ لوگوں کی غیبت کرنے، جھوٹ بولنے سے بچ جائیں۔ لہٰذا "سوم" یعنی تیسرے دن نیک محافل کا انعقاد کیا گیا جو یقیناً باعث ثواب۔ باعث نزول رحمت اور سکون قلب کا ذریعہ ہے۔

فائدہ: اس بحث سے چہارم یعنی چوتھے دن کے ختم کا بھی پتہ چل گیا۔ کیونکہ میت والوں کے سوگ کے دن ختم ہو چکے ہوتے ہیں وہ قرآن خوانی کی محافل قائم کرتے ہیں، صدقہ وخیرات کرتے ہیں۔

کوئی مجھے سمجھائے تو سہی! کہ صدقہ وخیرات کرنا حرام ہے یا قرآن پاک پڑھنا حرام ہے کیا کلمہ شریف پڑھنا حرام ہے؟ یا اللہ کا نام لینا حرام ہے۔ کیا درود پاک پڑھنا حرام یا حضور ﷺ کی نعت خوانی حرام ہے ان کاموں سے جب کوئی "مکروہ تنزیہی" بھی نہیں۔ تو "حرام" کہنا کہاں درست ہو

گا۔ جب سب کام باعث ثواب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا سبب ہیں تو یقیناً جائز ہیں۔

شاہ ولی اللہ کا سوئم: "روز سوئم کثرت ہجوم آں قدر بود کہ بیروں از حساب است ہشتاد ویک کلام اللہ بہ شمار آمدہ و زیادہ ہم شدہ باشد و کلمہ را حصر نیست"

(ملفوظات شاہ عبدالعزیز ۸۰)

تیسرے دن لوگوں کا اتنا ہجوم تھا جو شمار سے باہر تھا اکاسی قرآن پاک ختم ہونے کا حساب لگایا گیا تھا ہوسکتا ہے اس سے بھی زیادہ پڑھے گئے ہوں۔ کلمہ شریف کا تو حساب ہی نہیں کہ کتنا پڑھا گیا تھا۔

چہلم (چالیسواں): اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: ﴿وَوَاعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً﴾ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا۔

موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دنوں کے بعد تورات عطا کی گئی۔ کہ آپ چالیس دن دنیا والوں سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہیں۔ تا کہ اس کے ذکر سے آپ کے قلب و روح کو ایک خاص قسم کی قوت حاصل ہو جائے جو اس عظیم بوجھ کو اٹھانے کے قابل ہو جائے۔

"ان للاربعین خصوصیة اختصاص الکلام للانبیاء کما ان لھا اختصاصا فی ظھور ینابیع الحکمة من قلوب الاولیاء کقولہ علیہ السلام من اخلص للہ اربعین صباحا ظھرت ینابیع الحکمة من قلبہ علی لسانہ"

(روح البیان)

بے شک چالیس کو ایک خصوصیت حاصل ہے، اسی وجہ سے انبیاء کرام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت کے اعلان کا حکم دیا جاتا رہا، ان سے رب تعالیٰ کا کلام بذریعہ وحی اسی عمر میں ہوا۔

پھر اولیائے عظام کا بھی یہی معمول ہے کہ وہ چلہ کشی کرتے ہیں۔ یعنی چالیس روز تک دنیا سے علیحدہ ہو کر فقط رب تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوتے ہیں تو ان کے دلوں پر حکمت کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جو شخص چالیس صبح خلوص سے اللہ تعالیٰ کی یاد کرتا ہے اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے نمودار ہو جاتے ہیں۔"

اس سے واضح ہوا کہ عام معمول کے مطابق میت کے لئے چالیس دن تک قرآن خوانی، درود پاک اور کلمہ شریف پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، پھر اجتماعی دعا ہوتی ہے۔ صدقہ وخیرات کیا جاتا ہے جو یقیناً دعا کی مقبولیت کا سبب بنتا ہے۔ پڑھنے والوں کے مدارج بھی بلند ہوتے ہیں اور میت کے اعمال میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کردہ ایک طویل حدیث میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ابتدائی طور پر خواب کی صورت میں وحی فرمائی جاتی، اس کے بعد یہ ذکر ہے۔

" ثم حبب الیہ الخلاء و کان یخلو بغار حرا فیتحنث فیه وهو التعبد اللیالی ذوات العدد " (مشکوۃ باب المبعث و بدء الوحی)

پھر جب آپ کو علیحدہ رہنا پسند ہوا، آپ غار حرا میں جا کر الگ تھلگ ہو کر کئی کئی راتیں عبادت کرتے۔

اس کے ماتحت علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"وهی شهر فی کل سنة و ذالک الشهر کان رمضان "

یعنی ہر سال میں ایک مہینہ رمضان کا آپ غار حرا میں علیحدہ ہو کر عبادت کرتے تھے۔

" اقول و یمکن ان تکون المدة اربعین قیاسا علی میقات موسیٰ علیه السلام "

علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ اپنا مختار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے چالیس دن علیحدہ ہو کر عبادت کی ہو۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن لوگوں سے علیحدہ ہو کر عبادت کی تھی تو آپ کو تورات عطا فرمائی گئی تھی۔

" ولما فیها من الخواص والاسرار التی تظهر آثارها وانوارها علی الصوفیة الابرار مع ما فیها من مطابقة الاربعینات فی الاطوار وقد قال ﷺ من اخلص للہ اربعین صباحا ظهرت ینابیع الحکمة من قلبه علی لسانه هذا "

" چالیس " میں جو خصوصیات اور اسرار پائے جاتے ہیں ان کے آثار اور انوار اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر یعنی صوفیائے کرام پر ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ بعض اوقات چلہ کاٹتے ہیں یعنی چالیس دن عام لوگوں سے دور رہ کر الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص چالیس صبح خلوص سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے نمودار ہو جاتے ہیں۔ (مرقاۃ ج ۷ ۱۰)

" ومن حفظ علی امتی اربعین حدیثا بعثه الله فقیها " (مرقاۃ ج ۷ ص ۱۹۳)

جو شخص میری امت پر چالیس حدیثیں یاد کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو فقیہ کے درجہ میں اٹھائے گا۔

اسی وجہ سے کئی بزرگ علمائے کرام نے چالیس چالیس حدیثوں پر مشتمل کتابیں تصنیف کی ہیں جن کے نام ہی اربعین رکھے گئے ہیں۔ جن میں اربعین نووی سب سے زیادہ مشہور ہے۔

" ان تعداد الاربعین تاثیرا بلیغا فی صرفها الی الطاعة او المعصیته "

(مرقاۃ ج ۷ ص ۱۹۳)

بے شک چالیس کو بہت زیادہ تاثیر حاصل ہے نیکیوں میں بھی اور گناہوں میں بھی۔

یعنی چالیس صبح خلوص سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے حکمت کے چشمے جاری ہوتے ہیں اور شراب پینے سے چالیس دنوں کی نمازیں اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے

" من شرب الخمر لم یقبل الله له صلوة اربعین صباحا"

جو شخص شراب پیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دنوں کی نمازیں قبول نہیں فرماتا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ چالیس دنوں کو خصوصی تاثیر حاصل ہے۔ لہٰذا چالیس دن میت کے ایصال ثوب کا اہتمام کرتے رہنا اور چالیسویں دن اجتماعی دعا کرنے میں خصوصی قبولیت کے واضح آثار نظر آتے ہیں۔

ایصال ثواب کی محافل میں نیک لوگوں کی شرکت:

عام طور پر سوئم اور چہلم کی ایصال ثواب کی محافل میں دینی مدارس کے طلباء و مشائخ کو بلایا جاتا ہے؛ کیونکہ نیک لوگوں کی شرکت سے دعا میں قبولیت ہوتی ہے۔ اور دینی مدارس کے طلباء صدقہ وخیرات کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی،

" واذا سمع صیاح الدیکة فلیسأل الله من فضله فانها رأت ملکا "

جب کوئی شخص مرغ کی آواز (آذان) سنے تو اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرے کیونکہ اس

نے فرشتہ کو دیکھا ہے۔

" قال القاضی عیاض سببہ رجاء تامین الملائکۃ علی الدعا واستغفارھم و شھادتھم بالتضرع والإقبال علی اللہ والإخلاص "

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مرغ کی اذان پر دعا کرنے کا حکم اس لئے فرمایا کہ وہ فرشتے کو دیکھ کر اذان کہتا ہے۔ تو جب اس کی آواز سن کر دعا کی جائے گی تو فرشتے اس دعا پر آمین کہیں گے اور دعا کرنے والوں کے لئے مغفرت طلب کریں گے اور ان کی عاجزی اور ان کے خلوص اور اللہ تعالیٰ کی طرف ان کے متوجہ ہونے کی گواہی دیں گے۔

" وفیہ استحباب الدعاء عند حضور الصالحین والتبرک بھم "

نیک لوگوں کی موجودگی میں دعا کرنا مستحب ہے اور نیک لوگوں کے آنے اور ان کے موجود ہونے سے برکت حاصل کرنا مستحب ہے۔

یعنی نیک لوگوں کی موجودگی کو غنیمت سمجھا جائے اور اپنی دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ سمجھا جائے

(مرقاۃ ج۸، ص ۲۳۳)

گزشتہ سے پیوستہ: علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں دو حوالے وہ ذکر فرمائے جو میرے رسالہ ایصال ثواب میں نہیں تھے خیال ہوا کہ ان کو بھی شامل کر لیا جائے تا کہ مزید فائدہ بھی ہو جائے اور حصول برکت بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

" ان سعد بن عبارۃ توفیت امہ وھو غائب عنھا فقال یارسول اللہ ﷺ ان امی توفیت وانا غائب عنھا اینفعھا شئی ان تصدقت بہ عنھا قال نعم قال فانی اشھدک ان حائطی المخراف صدقۃ علیھا "

(بخاری ج ۱ ص ۳۸۶، ۳۸۷)

" سعد بن عبارۃ رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ کی جب وفات ہوئی تو وہ اپنی والدہ کے پاس نہ تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی یارسول اللہ میری ماں وفات پا گئی اور میں اس کے پاس موجود نہ تھا کیا میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اسے وہ چیز نفع پہنچائے گی؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں حضرت سعد نے عرض کی تو یارسول اللہ میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا قطار در قطار لگایا ہوا باغ "مخراف" میری والدہ پر صدقہ ہے"

(التبیان مع البیان ص ۵۰ پارہ اول)

خیال رہے حضرت سعد کو کنواں کھودنے کا حکم دینا اور آپ کنواں کھدوانا وہ حدیث پہلے مذکور ہو چکی ہے اگرچہ علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے یہاں ذکر کی ان دونوں حدیثوں کا مجموعی مطلب یہ ہے کہ حضرت سعد نے اپنی والدہ کے لئے باغ صدقہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کے مزید ارشاد پر کنواں بھی کھدوایا جس کا نام ہی "هذه لام سعد" (یہ سعد کی ماں کے لئے ہے) رکھا۔

فائدہ: ایصال ثواب صدقات مالیہ کے ساتھ مختص نہیں بلکہ عبادات بدنیہ کا ثواب بھی دوسرے کو پہنچایا جاسکتا ہے ابراہیم بن صالح سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں میں نے اپنے باپ سے سنا۔ کہ ہم حج کرنے جارہے تھے ایک شخص (ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا تمہارے علاقے میں (بصرہ کے قریب ایک مشہور) شہر ابلہ ہے (جہاں نہر فرات کے کنارے مسجد عشار ہے)

"من يضمن لي منكم ان يصلي لي في مسجد العشار ركعتين او اربعا ويقول هذه لابي هريرة سمعت خليلي ابا القاسم ﷺ يقول ان الله عزوجل يبعث من مسجد العشار يوم القيامة شهداء لايقوم مع شهداء بدر غيرهم"
(ابو داود کتاب الملاحم ص ۵۹۲ مشکوۃ ص ۴۶۸)

تم میں سے کون میرے لئے ذمہ داری اٹھاتا ہے کہ وہ مسجد عشار میں میرے لئے دو یا چار رکعتیں نماز پڑھے اور کہے کہ یہ نماز ابو ہریرہ کے لئے ہے میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم (رسول اللہ) ﷺ سے سنا حضور فرماتے تھے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مسجد عشار سے (ایسے) شہداء کو اٹھائے گا کہ شہداء بدر کے ساتھ ان کے سوا کوئی کھڑا نہ ہو سکے گا۔

ملا علی قاری نے فرمایا یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ شہداء اس امت سے ہیں یا امم سابقہ سے مسجد عشار کے متعلق محدثین کا قول ہے کہ مسجد عشار ایک قدیم ترین مسجد ہے جہاں برکت حاصل کرنے کے لئے لوگ نمازیں پڑھتے ہیں حضرت ابو ہریرہ کی اس حدیث سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے اس حدیث سے عبادت بدنیہ کا ثواب دوسرے کو پہنچانے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ زندہ کے لئے بھی ایصال ثواب جائز ہے نیز اس سے یہ امر بھی ثابت ہوا کہ مسجد سے شہداء اور صالحین کا قرب اس میں نماز پڑھنے کی فضیلت کا سبب ہے۔

﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ کی تفسیر میں صاحب کتاب وجیز امام واحدی متوفی ۴۶۸ھ نے فرمایا

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ "اعطیناھم بما ینتفعون بہ ینفقون یخرجونہ فی طاعۃ اللہ"
(کتاب الوجیز ج اص۴) (ہم نے ان کو نفع کے لئے جو کچھ بھی دیا ہے وہ اس سے اللہ کی طاعت میں نکالتے ہیں) اس تفسیر کی روشنی میں آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ قرار پائے گا کہ پرہیزگار وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہر عطا اور اس کی ہر نعمت سے جس کا وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اسی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اپنی اولاد اور مال کو جہاد فی سبیل اللہ میں قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے وہ دل، کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں سے لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں وہ اپنے علم و عمل سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی کسی نعمت کو اس کی رضاء کے خلاف کام میں نہیں لاتے قیامت کے دن کی اس جواب طلبی سے وہ ڈرتے ہیں جس کا ذکر قرآن مجید میں وارد ہے ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ بیشک کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

نیز فرمایا ﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾ پھر قیامت کے دن اللہ کی نعمتوں کے متعلق تم سے ضرور پوچھا جائے گا۔

واضح ہوا کہ متقین ان تمام نعمتوں کو ضرورت کے وقت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے کار خیر میں ہی خرچ کرتے ہیں۔ (از التبیان مع البیان پارہ اول ص ۵۱ تا ۵۳)

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾

"اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا"

"اور (اے محبوب) جو آپ پر نازل کیا گیا اس پر وہ ایمان لاتے ہیں اور اس پر جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا"

متقین کی یہ چوتھی علامت بیان کی جارہی ہے کہ ان کا ایمان اس چیز پر بھی ہے جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا اور پانچویں صفت کہ ان کا ایمان اس پر بھی ہے جو پہلے انبیاء کرام پر نازل ہوا:

" قال ابن عباس ای یصدقون بما جئت بہ من اللہ وما جاء بہ من قبلک من المرسلین لا یفرقون بینھم ولا یجحدون ما جاء وھم بہ من ربھم"

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تصدیق
کرتے ہیں اس چیز کی جو (اے محبوب ﷺ) آپ نے لایا اور تصدیق کرتے ہیں
اس کی جو آپ سے پہلے رسولوں نے لایا وہ انبیاء کرام کے درمیان کوئی تفریق نہیں
کرتے اور جوانہوں نے اپنے رب کی طرف سے لایا ہے اس کا انکار نہیں کرتے''

وہ لوگ کون ہیں جن کا یہاں ذکر ہے؟ اس میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد تمام ایمان لانے والے خواہ وہ پہلے مشرک تھے یا کافر یا اہل کتاب یعنی مشرکین کفار اہل کتاب میں سے جو لوگ بھی پہلی تین صفات کے ساتھ یہ دو صفتیں بھی رکھتے ہیں کہ جو آپ نے لایا اور جو آپ سے پہلے انبیاء کرام نے لایا اس پر وہ ایمان رکھتے اور آنے والی صفت (کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں) بھی وہ رکھتے ہیں وہی متقین ہیں وہی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں سے مراد اہل کتاب ہیں جب کہ پہلے کفار اور مشرکین کا ذکر ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ کتاب ہدایت ہے ان لوگوں کے لئے جو کفار و مشرکین سے ایمان بالغیب لائے اور ہدایت ہے ان اہل کتاب کے لئے جو اس چیز پر بھی ایمان لائے جو آپ پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو پہلے انبیاء کرام پر نازل ہوئیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ پہلے موصوف عرب ہیں پھر دوسری مرتبہ اہل کتاب ہیں کیونکہ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں اہل کتاب سے ایمان لانے والوں کی شان بیان کی گئی ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ ﴾

بیشک اہل کتاب میں سے بعض وہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں اور اس چیز پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی اور اس پر جو ان کی طرف نازل کی گئی۔ اور ارشاد فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ وَاِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ﴾

وہ لوگ جن کو ہم نے آپ سے پہلے کتاب دی وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جب ان پر (قرآن کی آیات) تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں ہم نے اس پر ایمان لایا بیشک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے بیشک ہم تو پہلے ہی مانتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:" ثلاثة يؤتون اجرهم مرتين رجل من اهل الكتاب

آمن بنبیه و آمن بی و رجل مملوک ادی حق الله وحق موالیه او رجل ادب جاریته فاحسن تادیبها ثم اعتقها وتزوجها "

(رواه الشیخان عن ابی موسی الاشعری)

''تین شخص وہ ہیں جن کو دو مرتبہ اجر دیا جاتا ہے ایک وہ شخص جو اہل کتاب سے ہو اور وہ اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور پھر مجھ پر بھی ایمان لایا اور دوسرا شخص غلام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے مولی (مالکوں) کے حقوق بھی ادا کرے اور تیسرا شخص وہ ہے جو اپنی مملوکہ غلامہ کو اچھی طرح ادب سکھائے پھر اسے آزاد کردے اور پھر اس سے نکاح کرلے''

ظاہر یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کو عام رکھا جائے جیسا کہ حضرت مجاہد کا قول ہے کہ سورۃ بقرہ میں چار آیتیں مؤمنین کی صفات میں ہیں اور دو آیتیں کفار کی صفات بیان کر رہی ہیں اور تیرہ (۱۳) آیات میں منافقین کا ذکر ہے:

" فھذہ الآیات الا ربع عامة فی کل مؤمن اتصف بھا من عربی وعجمی و کتابی من انس وجنی "

نتیجہ واضح ہوا کہ یہ چار آیات عام ہیں ہر مومن ان کے ساتھ متصف ہے خواہ عربی ہو یا عجمی، خواہ انسان ہو یا جن۔ اس لئے کہ ان تمام صفات میں تلازم ہے کوئی ایک صفت دوسری کے بغیر نہیں پائی جاسکتی۔ ایسا ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص ایمان بالغیب تو رکھے لیکن اس کا ایمان اس پر نہ ہو جو نبی کریم ﷺ نے لایا اور اس پر ایمان نہ ہو جو پہلے رسولوں نے لایا۔

واضح ہوا کہ مومن متقی بننے کے لئے ہر شخص کو'' خواہ کفار سے ہو یا مشرکین سے یا اہل کتاب سے'' چھ صفات کے ساتھ متصف ہونا ضروری ہے۔ (ماخوذ از خلاصہ ابن کثیر للصابونی)

دینی مدارس کے طلباء کی دلچسپی کے لئے:

ابھی جو اقوال ذکر کیے ہیں ان کی اصل وجہ عربی گرائمر کی وجوہ ہیں جو کہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے تفصیلاً ذکر فرمائی ہیں۔ جن کا خلاصہ و تفسیر آسان لفظوں میں ذکر کر رہا ہوں۔ " وماانزل......الخ" کے عطف میں اختلاف بیان کا خلاصہ یہ ہے۔ معطوف یا معطوف علیہ کا مقابل اور مباین ہوگا یا نہیں مباین ہو تو پھر دو احتمال ہیں کہ عطف الذین یؤمنون پر ہو یا کہ المتقین پر ہو مباین نہ ہونے کی صورت میں

بھی دو ہی احتمال ہیں معطوف یا تو معطوف علیہ کے ساتھ متحد بالذات ہوگا یا کہ اس کا کچھ حصہ ہوگا۔

(۱) جب عطف ہو الـذیـن یـؤمـنـون بـالغیب پر اور معطوف اور معطوف علیہ میں مباینت ہو تو الـذیـن یـؤمنون بالغیب سے مراد وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے ایمان لایا کفر و شرک سے اور وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ ......الخ سے مراد ہوگا کہ وہ لوگ جو کفار و مشرکین تو نہیں تھے بلکہ اہل کتاب تھے اور ایک دین سے دوسرے دین کی طرف منتقل ہوئے۔

اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کتاب ہدایت ہے متقین کے لئے جو ایمان لائے ہیں کفر و شرک سے اور اسی طرح ہدایت ہے متقین سے ان لوگوں کے لئے جو کفار و مشرکین تو نہیں تھے لیکن وہ پہلے دین سے نبی کریم ﷺ کے دین کی طرف منتقل ہوئے۔

(۲) جب عطف ہو متقین پر معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت و مباینت ہو تو اب معنی یہ ہوگا کہ کتاب ہدایت ہے متقین کے لئے جو کفر و شرک سے ایمان لائے اور کتاب ہدایت ہے ان لوگوں کے لئے جو اہل کتاب سے آپ پر ایمان لائے۔

خیال رہے کہ پہلی صورت متقین کی دو قسمیں ہیں کفر و شرک سے ایمان لانے والے اور اہل کتاب سے ایمان لانے والے اور دوسری صورت میں ایمان لانے والوں کی دو قسمیں بنی ہیں کفر و شرک سے ایمان بالغیب لانے والے جو متقین ہیں۔ اور دوسرے جو اہل کتاب سے ایمان لانے والے ہیں لیکن یہ متقین کی قسم نہیں بنی۔

(۳) وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ کا عطف ہو الذین یؤمنون بالغیب پر اور معطوف اور معطوف علیہ متحد بالذات ہو اور اعتباری فرق ہو صرف صفات کے لحاظ سے۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ عطف ہو والذین یؤمنون بما انزل کا الذین یومنون بالغیب پر معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت بھی نہ ہو لیکن والذین یؤمنون بما انزل سے مراد تمام وہ لوگ نہ ہوں جو الـذیـن یـؤمـنـون بـالغیب میں داخل ہوں بلکہ ان میں سے بعض ہو اس صورت میں بھی مراد اہل کتاب ہی ہوں گے۔ (از بیضاوی شیخ زادہ حاشیۃ الشہاب)

ان تمام اقوال سے صحیح قول وہی ہے جو علامہ محمد علی صابونی رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ یہ عام ہے تمام کو شامل ہے "الانـزال نـقـل الشئی من الاعلی الی الاسفل" کسی چیز کو بلندی سے پستی کی

طرف منتقل کرنا انزال ہے عام طور پر تو کسی ذات کو منتقل کیا جاتا ہے لیکن ذوات میں معانی کا اعتبار بھی ہوتا ہے یہاں یہی وجہ مراد ہے۔

رسولوں پر کتب الاھیہ کو نازل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ جبرائیل اللہ تعالیٰ سے روحانی طور پر حاصل کر لیتے ہیں جو رسولوں تک پہنچا دیتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ لوح محفوظ پر رب تعالیٰ کی طرف سے خود ہی منتقل کر دیا جاتا ہے پھر وہاں سے جبرائیل یاد کر لیتا ہے اور رسولوں پر پیش کر دیتا ہے۔

قرآن وحدیث میں تلازم: ایسا ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میں قرآن کو مانتا ہوں لیکن حدیث کو نہیں مانتا۔ منکر حدیث دراصل منکر قرآن ہوتا ہے تفصیل مقدمہ میں دیکھیں یہاں رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ ﴾ یہ نہیں کہا **والذین یؤمنون بالقرآن**

مؤمن ہونے کے لئے صرف قرآن پاک پر ایمان لانا کافی نہیں ورنہ اللہ تعالیٰ یہی فرماتا کہ وہ لوگ جو قرآن پر ایمان لاتے ہیں لیکن رب تعالیٰ نے فرمایا ''وہ لوگ جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا یہ حکم عام ہے:

" والمراد بما انزل الیک القرآن باسرہ والشریعة عن آخرھا فان الانزل یعم الوحی الظاھر والخفی" (بیضاوی مع بین السطور) **بما انزل الیک** سے تمام قرآن پاک پر ایمان لانا مراد اور آپ کی شریعت پر ایمان لانا مراد ہے کیونکہ انزال (اتارنا) عام ہے جو ظاہر وحی کو بھی شامل ہے اور خفی وحی کو بھی شامل ہے۔

''ایمان می آرند بآنچه نازل کرده شده است بسوئے تو از وحی متلوکه عبارت از کتاب است ووحی غیر متلوکه عبارت است سنت از '' (عزیزی)

''**بما انزل الیک**'' سے مراد یہ ہے کہ وہ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو آپ پر نازل کی گئی خواہ وہ وحی متلو ہو یا وحی غیر متلو ہو۔

وحی متلو سے مراد قرآن پاک ہے اور غیر متلو سے مراد حدیث پاک یعنی قرآن اور حدیث دونوں پر ایمان لانے والے ہی مؤمن ہیں وہی متقی ہیں وہی ہدایت یافتہ ہیں کسی ایک کا بھی منکر مومن نہیں ہوسکتا متقی نہیں ہوسکتا ہدایت یافتہ نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ: نبی کریم ﷺ پر جو اتارا گیا اس پر ایمان لانا واجب ہے کیونکہ آخر میں بیان فرمایا:
"واولئک هم المفلحون" وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ جسے یہ ایمان حاصل نہیں ہو گا وہ فلاح بھی حاصل نہیں کر سکے گا جب یہ ثابت ہوا تو اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ پر جو اتارا گیا اس کا تفصیلی علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ جب تک علم ہی حاصل نہیں ہو گا تو اس پر عمل کیسے ممکن ہو گا۔ ہاں البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ شریعت (قرآن وحدیث) کا تفصیلی علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے (از کبیر) مقدار سفر یعنی ساڑھے بانوے کلومیٹر کے اندر اندر کوئی ایک شخص تفصیلی علم رکھنے والا ہو تو کوئی گنہگار نہیں ہو گا اگر کوئی بھی نہ ہوا تو سب گنہگار رہوں گے۔

وماانزل من قبلک: یعنی ونیز ایمان مے آرند بآنچہ نازل کرہ شدہ است پیش از تو بر انبیائے سابقین کہ عبارتست از کتبِ الاھیہ سابقہ مثل توراۃ وانجیل وزبور وصحف انبیائے پیشین وازسنن انبیائے سابقین ومواعظ وارشادات (عزیزی) یعنی نیز ایمان وہ لاتے ہیں اس پر جو آپ سے پہلے انبیاء کرام پر نازل کیا گیا یعنی پہلی آسمانی کتابیں تورات، انجیل، زبور اور صحیفوں پر وہ ایمان رکھتے ہیں اسی طرح پہلے انبیاء کرام کی سنتوں مواعظ اور ارشادات پر ایمان رکھتے ہیں یعنی یہاں بھی آسمانی کتابوں کے نام ذکر نہ کر کے واضح کر دیا کہ پہلے انبیاء کرام پر نازل کی گئی آسمانی کتابوں پر جس طرح ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح ان کے ارشادات پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

صحف کی تعداد: کل صحیفے ایک سو ہیں اور کتابیں چار ہیں صحیفوں کے مستقل نام نہیں اور کتابوں کے نام ہیں جو مشہور ہیں قرآن پاک جو ہمارے نبی کریم محمد مصطفےٰ ﷺ پر نازل ہوا۔ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر۔ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر۔ پچاس صحیفے حضرت شیث علیہ السلام پر۔ حضرت ادریس علیہ السلام پر تیس۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دس اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے نازل ہونے سے پہلے دس نازل ہوئے۔

اعتراض: پہلی کتابوں اور پہلے انبیاء کرام کے ارشادات پر ایمان لانا کیسے ممکن ہے جب کہ ان کے احکام اور ہماری شریعت کے احکام مختلف ہیں۔

جواب: ان پر اجمالی ایمان لانا ضروری ہے کہ جو پہلے انبیاء کرام پر رب تعالیٰ کی طرف سے

کتابیں صحیفے نازل ہوئے ہمارا ان پر ایمان ہے وہ حق تھے اور جو انبیاء کرام کے ارشادات تھے ان تمام پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ ہاں البتہ پہلے انبیاء کرام کے احکام اگر ہماری شریعت میں آ گئے تو ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہوگا اور عمل کرنا بھی ضروری لیکن یہ نہیں کہ ان پر اس لئے عمل ہوگا کہ وہ پہلی شریعتوں کے احکام ہیں بلکہ ان پر عمل اس لئے ضروری ہوگا کہ وہ ہماری شریعت کا حصہ بن چکے ہیں۔ (از قرطبی)

عقیدہ ختم نبوت کا ثبوت: جب مومن بننے کے لئے ضروری کہ وہ نبی کریم ﷺ پر جو نازل ہوا اس پر ایمان لائے اور آپ سے پہلے انبیاء کرام پر جو نازل ہوا اس پر ایمان لائے تو اسی سے واضح ہو گیا کہ حضور کے بعد کوئی اور نبی آ سکتا تو رب تعالیٰ ضرور حکم فرماتا کہ جو آپ کے بعد نبیوں پر نازل ہوگا اس پر بھی ایمان لائیں گے۔ جب ﴿وَمَا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِکَ﴾ نہیں کہا تو واضح ہو گیا کہ مومن وہی ہو سکتا ہے جو نبی کریم ﷺ کو آخری نبی مانے۔ ختم نبوت پر عقیدہ نہ رکھنے والا کبھی مومن نہیں ہو سکتا۔ ختم نبوت کی تفصیلی بحث کا تعلق تو ﴿وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ﴾ سے ہے صرف ایک حدیث یہاں نقل کی جا رہی ہے تا کہ مسئلہ کو سمجھنا آسان ہو جائے:

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ مثل ومثل الانبیاء کمثل قصر احسن بنیانه ترک منه موضع لبنة فطاف به النظار یتعجبون من حسن بنیانه الا موضع تلک اللبنة فکنت انا سددت موضع اللبنة ختم به البنیان وختم بی الرسل وفی روایة فانا اللبنة وانا خاتم النبیین"

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی محل بڑا حسین بنایا گیا ہو لیکن ایک اینٹ کی جگہ اس میں چھوڑ دی گئی دیکھنے والے اس میں گھوم پھر کر اسے دیکھیں تو اس کی حسین عمارت پر تعجب کریں لیکن ایک اینٹ کی جگہ (کو خالی چھوڑا ہوا انہیں پسند نہ آئے) تو میں نے اس اینٹ کی جگہ کو مکمل کر لیا مجھ سے ہی محل مکمل ہو گیا میں ہی رسولوں کا خاتم ہوں"

ایک روایت میں ہے کہ وہ اینٹ میں ہی ہوں خاتم النبیین میں ہی ہوں۔ حدیث کا مطلب واضح ہے کہ قصر نبوت میں ایک نبی کی جگہ خالی تھی جسے میں نے آ کر مکمل کر دیا اب کسی اور کے آنے کی کوئی گنجائش نہیں اس لئے خاتم المرسلین، خاتم النبیین میں ہی ہوں۔

﴿ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴾

(۱) ''اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں (۲) اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں''

متقین کی یہ چھٹی علامت ذکر کی جارہی ہے کہ وہ آخر پر کامل یقین رکھتے ہیں کامل یقین اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کا تفصیلی علم نہ ہو اور اس سے شک نہ اٹھ جائے۔ (عزیزی)

یعنی متقین کو قیامت کے احوال، حشر ونشر، جنت ودوزخ کا اتنا علم حاصل ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا اور ان کو اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔

آخِرَةِ: صفت ہے دار کی جس طرح آتا ہے ''الدار الآخرة'' پھر اسمیت اس پر غالب آگئی یعنی اب قیامت اور اس کے بعد کے احوال کا نام '' آخرة '' ہوگیا نام کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا سے بعد میں ہے یا ہم سے وہ دور ہے اور ہم اس سے دور ہیں دنیا کو دنیا کہنے کی وجہ یہ ہے وہ قریب ہے چونکہ دنیا دنو ماخوذ ہے جس کا معنی ہے قریب ہونا۔

يُوْقِنُوْنَ: ایقان سے لیا ہوا ہے جس کا اصل مادہ یقین ہے یقین کسے کہتے ہیں اس میں مختلف الفاظ مذکور ہیں لیکن آخر کار معنی دو ہی بنتے ہیں۔ بعض نے کہا یقین کا مطلب ہے کہ اسے وہم نہ ہو بعض نے کہا یقین علم کو کہا جاتا ہے جس سے شک کا زوال ہو۔ بعض نے کہا جو نظر واستدلال سے حاصل ہو وہ یقین ہے بعض نے کہا جو نقیض کا احتمال نہ رکھے وہ یقین ہے۔ بعض نے کہا یقین علم کی صفت ہے جو معرفت اور درایت سے اوپر ہے اسی لئے علم یقین کہا جاتا ہے معرفۃ یقین نہیں کہا جاتا لیکن یہ تمام معانی ان دو میں سمٹ کر آجاتے ہیں ایک معنی یہ ہے کہ اس میں شک نہ ہو خواہ وہ نظر سے حاصل ہو یا حس سے، یا عقل سے، یا خبر متواتر سے، یا دلیل سے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جو عقل پر غالب ہو اس میں شک یا مجاز کا کوئی احتمال نہ ہو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ پہلے شک ہو پھر زائل ہو جائے تو وہ یقین ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے علم کو یقین نہیں کہا جاتا اس لئے کہ وہ شک کے بعد بھی حاصل نہیں ہوا اور کسی دلیل سے بھی

حاصل نہیں ہوا۔ اسی طرح بدیہات پر بھی یقین نہیں بولا جاتا کیونکہ بدیہات استدلالی کی ضد ہیں ان میں بھی دلائل نہیں پائے جاتے۔ (از کبیر وروح المعانی)

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے آخرت پر یقین رکھنے والوں کی مدح کی اسی سے پتہ چل گیا کہ جن لوگوں کو آخرت پر یقین نہیں جس طرح مذاہب باطلہ رکھنے والے وہ کسی طرح بھی مدح کے مستحق نہیں ہو سکتے اسی طرح وہ لوگ بھی مدح کے مستحق نہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں لیکن حساب، سوال، مؤمنین کا جنت میں جانا، کافروں کا جہنم میں جانا اور جنت میں مختلف نعمتوں کا پایا جانا ان چیزوں پر ان کا یقین نہیں۔ اسی طرح یہود ونصاریٰ آخرت پر یقین رکھنے کے باوجود اپنی مرضی سے من گھڑت اقوال پیش کرتے ہیں ان کی اس حماقت کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْنَصَارٰى ﴾

"یعنی یہودی کہتے تھے جنت میں صرف یہود جائیں گے اور نصرانی کہتے تھے۔ جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے"

اسی طرح یہودیوں نے کہا ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ ہمیں آگ صرف چند دن ہی مس کرے گی یعنی چالیس دن جو ہمارے آباؤ اجداد نے بچھڑے کی پوجا کی تھی صرف اتنے دن ہمیں آگ کا عذاب ہوگا۔ یہ تمام مذاہب باطل ہیں ان کا آخرت پر یقین غیر معتبر ہے یہ نہ ہدایت پر ہیں اور نہ ہی ان کو فلاح حاصل ہوگی۔ (از کبیر)

اسی بحث سے ایک اور مسئلہ حل ہوگیا کہ "بالاخرۃ" اور "ھم" کو پہلے ذکر کیا گیا ہے جو حصر پر دلالت کر رہے ہیں کہ آخرت پر یقین صرف ایمان والوں کو ہی ہے کیونکہ دوسروں کا یقین معتبر ہی نہیں۔

لوگوں کی ناسمجھی پر تعجب: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"یاعجبا کل العجب من الشاک فی اللہ وھو یری خلقه وعجبا ممن یعرف النشاۃ الاولی ثم ینکر النشاۃ الآخرۃ وعجبا ممن ینکر البعث والنشور وھو فی کل یوم ولیلۃ یموت ویحی (یعنی النوم الیقظۃ)

وعجبا ممن یؤمن بالجنة ومافیها من النعیم ثم یسعی لدار الغرور وعجبا من المتکبر الفخور وهو یعلم ان اوله نطفة مذدة وآخره جیفة قذدة"

(کبیر)

''کتنا ہی تعجب ہے اس شخص پر جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو دیکھتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کے متعلق شک کرتا ہے (کہ کوئی اللہ ہے بھی یا نہیں) اور کتنا ہی تعجب ہے اس پر جو پہلی پیدائش کو جانتا ہے لیکن آخرت کے اٹھنے کا انکار کرتا ہے اور کتنا ہی تعجب ہے اس پر کہ جو حشر ونشر کا انکار کرتا ہے حالانکہ وہ ہر دن اور رات کو مرتا اور زندہ ہوتا ہے (یعنی سوتا اور جاگتا ہے) اور کتنا ہی تعجب ہے اس پر جو جنت اور جنت میں پائی جانے والی نعمتوں پر ایمان رکھتا ہے پھر وہ اس گھر کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتا ہے جس میں دھوکہ پایا جاتا ہے اور کتنا ہی تعجب ہے اس پر جو تکبر کرتا ہے اور فخر کرتا ہے جب کہ وہ جانتا بھی ہے کہ اس کا ابتدائی بیج نطفہ ہے اور آخر میں اس نے بدبودار مردار ہو جانا ہے''

﴿اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

(۱) ''وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے''

(۲) ''وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں''

پہلے متقین کی صفات بیان ہوئیں اور اس آیۃ میں ان کے انجام اور ان پر فیضان کو ذکر کیا کہ یہ وہ بلند مرتبہ کتاب ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں متقین کے لئے ہدایت ہے متقین کی یہ علامت ہیں کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی راہ میں خرچ کرتے اور جو نبی کریم ﷺ پر اتارا گیا اس پر وہ ایمان رکھتے ہیں اور آپ سے پہلے انبیاء کرام پر جو اتارا گیا اس پر وہ ایمان رکھتے ہیں اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔ اتنی صفات رکھنے والے متقین وہ خوش بخت لوگ ہیں کہ اپنے رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہدایت پر متمکن کر دیا جاتا ہے اور دین ودنیا اور آخرت میں ان کو کامیابی سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

ماقبل سے تعلق: (۱) جب یہ بیان کیا گیا کہ کتاب (قرآن پاک) ہدایت ہے متقین کے

لئے تو گویا کہ ضمناً سوال پایا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ کتاب متقین کے لئے ہدایت ہے؟ تو اس کا جواب الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ سے لے کر اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ تک دیا گیا کہ وہ یہ صفات رکھتے ہیں لہٰذا وہی اپنے رب تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

(۲) جب متقین کی صفات کا ذکر کر دیا گیا اور اس کے بعد ہدایت کا ذکر ہوا تو ضمناً سوال یہ ہوا کہ ان صفات سے متصف لوگ ہی کیوں ہدایت سے مختص ہیں؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ان کے غیر تو کفار اور فساق ہیں وہ تو رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوں گے ان کو ہدایت یا کامیابی حاصل ہونا ممکن ہی نہیں وہ تو اپنے آپ کو کامیابی کی راہ سے ہی دور کر چکے ہیں۔

(۳) ایمان والے متقین کی صفات اور ان کی کامیابی کو ذکر کر کے اشارۃً یہ بتا دیا کہ وہ اہل کتاب جو نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لائے وہ گمان کریں کہ ہم ہدایت پر ہیں اور ہم کامیاب ہوں گے تو ان کا یہ گمان باطل ہے کامیابی سے ہمکنار ہونے والے تو وہی ہوں گے جو نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت کے بعد ان مذکورہ چھ صفات سے متصف ہوں گے۔ (از کبیر)

اُولٰٓئِكَ: اشارہ متقین کی طرف ہے یہ قریب اور بعید مذکر اور مؤنث کے لئے مشترک ہے جب یہ لحاظ کیا جائے کہ متقین جو بہت عظیم صفات رکھنے والے ہیں وہ بڑی شان والے ہیں گویا کہ بلندی مرتبہ کی وجہ سے ان کو بعد مکانی (دوری) حاصل ہے تو بعید والا معنیٰ کیا جائے گا جیسا کہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے ''وہی لوگ'' اور جب یہ خیال کیا جائے متقین کا ذکر تو ابھی قریب ہی ہوا ہے تو معنیٰ قریب والا ہوگا جیسا کہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے کیا ہے ''یہی لوگ'' راقم نے اعلیٰ حضرت کی نقالی ہی کی ہے۔

خیال رہے کہ ''اولئک'' کا اشارہ غیر ذوی العقول کی طرف بھی ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنه مسؤلا'' (بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہونا ہے) یہاں اولئک کا اشارہ سمع، بصر، اور فواد کی طرف ہے جو غیر ذوی العقول ہیں۔ (از قرطبی)

عَلٰی: دینی مدارس کے طلباء کرام بخوبی واقف ہیں کہ ''علی، استعلا'' (بلندی کے معنیٰ) کے

لئے آتا ہے یہاں بلندی کا معنی کیسے؟ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "علی ھدی ، بیان لتمکنھم من الھدی واستقرارھم علیه حیث شبھت حالھم بحال من اعتلی الشئی ورکبه" "علی ھدی" میں لفظ "علی" سے یہ سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت پر متمکن کردے گا اوران کو ہدایت پر ثابت کردیا جائے گا یعنی ان کے حال کو اس شخص کو حال سے تشبیہ دی گئی جو کسی چیز کے اوپر ہو اور سوار ہو۔ یہی صورت پائی جاتی ہے۔ ان الفاظ میں "فلان علی الحق ، فلان علی الباطل" یعنی فلاں شخص اتنا حق پر قائم ہے کہ گویا کہ اسے حق پر تمکن حاصل ہوگیا اسی طرح فلاں شخص اتنا باطل راہ پر چل رہا ہے کہ گویا کہ باطل پر سوار ہے۔ ایسے ہی عام طور پر کہا جاتا ہے " فلان جعل الغوایة مرکبا" فلاں نے گمراہی کو سواری بنالیا اسی طرح یوں کہا جاتا ہے " فلان امتطی الجھل" فلان نے جہالت کو سواری بنالیا۔ جو شخص کسی سواری پر سوار ہوا سے یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ جب تک چاہے سوار رہے وہ بغیر ضرورت کے سواری سے نہیں اترتا اسی طرح جس شخص نے دلائل سے اپنے لئے سیدھی راہ کو حاصل کرلیا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اس پر قائم رہے اور اپنا محاسبہ کرتا رہے تاکہ اس سے ہٹ نہ جائے۔ گویا کہ لفظ "علی" سے ہی یہ سمجھ آ گیا کہ وہ اللہ کے فضل وکرم سے ہمیشہ ہدایت پر قائم رہے گا۔ (از کبیر)

ھدی کو نکرہ ذکر کرنے کی وجہ:

نکرہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ اس کا ابہام اس چیز پر دلالت کرے کہ اس کی حقیقت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ ہی اس کا کوئی اندازہ کرسکتا ہے مطلب یہ ہے کہ متقین حضرات کو رب تعالیٰ کی طرف سے اتنی عظیم ہدایت حاصل ہوتی ہے جس کی حقیقت کو انسان نہیں سمجھ سکتا اس کی عظمت، اس کثرت بے انتہاء رب کی مہربانیوں کا انسان اندازہ نہیں کرسکتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے " لو ابصرت فل انا ابصرت رجلا" اگر تو فلاں کو دیکھے تو اسے تو مرد پائے۔ اس مثال میں نکرہ (رجلا) ذکر کیا اشارہ اس طرف کیا کہ اگر تو فلاں شخص کو صحیح نظر و بصیرت سے دیکھتا تو جوانمردی، بہادری مروت واحسان اس میں بہت ہی کامل درجہ کا پاتا۔

فائدہ: عون ابن عبداللہ نے فرمایا:" الھدی من اللہ کثیر ولا یبصر الابصیر ولا یعمل

به الایسیر الاتری ان نجوم السماء یبصر ها البصراء ولا یهتدی به الا العلماء"
اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کے بہت راستے دکھائے جاتے ہیں لیکن ان کو صرف بصیرت والے حضرات ہی دیکھتے ہیں اوران پرعمل کرنے والے بہت تھوڑے ہی ہوتے ہیں کیا تم دیکھتے نہیں کہ بیشک آسمان کے ستاروں کوسب نظر والے دیکھتے تو ہیں لیکن ان سے ہدایت صرف علماء ہی حاصل کرتے ہیں۔
(از کبیر)

مِنْ رَّبِّهِمْ: ان کے رب کی طرف سے ان کو ہدایت حاصل ہوتی ہے یہ کہہ کر بیان یہ فرمایا کہ اگرچہ بظاہر اسباب اور وسائل صوریہ (صورت رکھنے والے واسطے) پائے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں رب تعالیٰ کی مہربانی سے ہی ہدایت حاصل ہوتی ہے "انہ ھو الموفق لھم والمفیض علیھم من بحار لطفہ و کرمہ" اس لئے کہ ان کو توفیق دینے والا وہی ہے اور اپنے لطف وکرم کے سمندروں سے ان پر فیضان کرنے والا وہی ہے۔

" ان الوسائط قد ترتفع من البین فیبتلج صبح العیان لذی عینین " بیشک واسطے اور اسباب کبھی درمیان سے اٹھ بھی جاتے ہیں لیکن رب تعالیٰ کی مہربانیوں کی وجہ سے عطاء کو صبح کی طرح ظاہر، روشن، چمکتا دمکتا ہوا آنکھیں رکھنے والا انسان دیکھ لیتا ہے۔

آنکھ والا تیری عطاء کا تماشہ دیکھے ، دیدۂ کور کو کیا نظر آئے کیا دیکھے؟
(روح المعانی)

" مِنْ رَّبِّهِمْ " سے قدریہ فرقہ کا رد بھی ہوگیا کیونکہ وہ انسان کو ہی ایمان اور ہدایت کا خالق مانتے ہیں اگر مذہب صحیح ہوتا تو "من انفسھم" کہا جاتا "من ربھم" نہ کہا جاتا کیونکہ ان کے مذہب کے مطابق اسی وقت صحیح مطلب ہوسکتا ہے جب یہ کہا جائے کہ وہ ہدایت پر ہیں اپنے نفسوں کی طرف سے ہی (از قرطبی) سبحان اللہ رب تعالیٰ کا کلام کیسا ہی ذیشان ہے ایک ایک لفظ موجزن دریا کی حیثیت رکھتا ہے جس میں در یکتا پنہاں ہیں۔

یہاں ہدایت سے مراد کیا: "علی ھدی ای علی نور وبیان وبصیرۃ من اللہ تعالیٰ" وہ ہدایت پر ہوں گے اپنے رب کی طرف سے یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور، بیان اور بصیرت حاصل ہوگی "وقال ابن عباس علی ھدی من ربھم ای علی نور من ربھم واستقامۃ علی

ماجاء هم به " حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کو ان کے رب تعالیٰ کی طرف سے نور حاصل ہوگا اور جو ان کو دین شریعت ، ایمان ، اقامت صلوۃ ، رب کی راہ میں خرچ کرنا قرآن وحدیث پر ایمان پہلی کتب الاھیہ اور ارشادات انبیاء پر ایمان اور آخرت پر یقین حاصل ہوئے ہیں ۔ ان پر اللہ تعالیٰ ان کو استقامت نصیب فرماتا ہے یہی استقامت ان کے لئے رب تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہے۔

(صابونی)

وہ رب تعالیٰ جس نے تمام مخلوق کی تربیت کی وہ اپنی رحمت کاملہ سے ایمان کی دولت عطا کر کے اور قرآن میں جتنے بھی ہدایت کے طریقے ذکر ہیں ان پر چلا کر متقین کو عظیم ہدایت سے نوازتا ہے

(از تیسیر الرحمن)

اللہ تعالیٰ متقین کو ''رشاد'' (درست راہ پر چلنا) اور نور اور استقامت عطا فرماتا ہے۔

(خازن جواهر طنطاوی)

" علی هدی من ربهم ، اما الیه و اما الی داره ، دار السلامة ، والفضل والثواب واللطف "

رب تعالیٰ ان کو اپنی طرف ہدایت دیتا ہے یعنی ان کو اپنا قرب عطا فرماتا ہے اور اپنے دار یعنی دارالسلامۃ کی طرف ہدایت دیتا ہے کہ ان کو جنت کے اعلیٰ مقام کا مستحق ٹھہراتا ہے ان پر فضل فرماتا ہے ان کو ثواب عطا کرتا ہے ان پر مہربانی فرماتا ہے۔

(ابن عربی)

مفلحون کے معانی: فلح کا معنی، پھاڑنا، توڑنا جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

" ان الحدید بالحدید یفلح " لوہا لوہے سے کاٹا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے فلاحۃ الارض زمین کو ہل چلا کر پھاڑنا اسی وجہ سے "اکار" کو فلاح کہتے ہیں یعنی ہل چلانے والے کو اکار کہتے ہیں اور فلاح بھی اسی طرح جس شخص کا نیچے والا ہونٹ پھٹا ہوا ہو اسے "افلح" کہا جاتا ہے مفلح کو مفلح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مشکلات کو کاٹ کر مطلوب تک پہنچتا ہے۔ کبھی اس کا معنی ہوتا ہے'' کامیاب ہونا'' جیسا کہ کہا جاتا ہے استفلحی بامرک خاوند اپنی زوجہ کو کہتا ہے تو اپنے امر میں کامیاب ہوگئی کبھی اس کا معنی ہوتا باقی رہنا جیسا کہ کہا گیا ہے "افلح بما شئت فقد یدرک بالضعف وقد یخدع الاریب" تو باقی رہ جس طرح تو چاہے (خواہ عقل مندی سے یا حماقت سے) کبھی رزق دیا جاتا ہے احمق کو اور کبھی عاقل کو محروم کر دیا جاتا ہے۔

(از قرطبی)

یہاں مفلحون کا کون سا معنی ہے؟

"واولئک ھم المفلحون ، ای الفائزون بالجنة والباقون فیھا" وہ لوگ جنت کے حصول سے کامیاب ہونے والے ہیں اوراس میں ان کو باقی رہنا ہے۔ابن ابی اسحاق نے کہا "المفلحون ھم الذین ادرکوا ما طلبوا ونجوا من شرما منه ھربوا" مفلحون ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو مطلوب کو حاصل کرلیں اورجس شر سے وہ بھاگنا چاہیں اس سے نجات حاصل کرلیں۔

"فلاح" کا ایک معنی حدیث شریف میں "سحری کا کھانا" بھی آیا ہوا ہے چونکہ سحری کا کھانا اس لئے کھایا جاتا ہے کہ انسان اپنے روزہ کو آسانی سے باقی رکھ سکے اس معنی کے لحاظ پر بھی "مفلحون" سے مراد جنت کی نعمتوں میں باقی رہنے والے لوگ ہیں۔ (از قرطبی)

"کامیاب ہونا" ایسا معنی ہے جو سب کو شامل ہے تمام معانی اس میں آجاتے ہیں وہ آگ سے نجات حاصل کرکے کامیاب ہیں وہ جنت کو پاکر کامیاب ہیں وہ عزت حاصل کرکے کامیاب ہیں وہ سعادت حاصل کرکے کامیاب ہیں وہ مطلوب کو حاصل کرکے کامیاب وہ شر سے بچ کر کامیاب ہیں (از خازن)

اسی وجہ سے تبصیر الرحمٰن میں یہ معنی بیان کیا گیا ہے "واولئک ھم المفلحون بالھدایات کلھا" وہ ہر قسم کی ہدایت کو حاصل کرکے کامیاب ہیں۔اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوگیا کہ کفار کو کوئی ہدایت حاصل نہیں کیونکہ قرآن پاک سے کفر کرنا مستلزم ہے کہ وہ ہدایت کے ساتھ بھی کفر کرنے والے ہیں لہٰذا وہ گمراہ ہیں ہدایت پر نہیں۔ (تبصیر الرحمن)

لفظ فلاح میں عظمت:

"لیس فی کلام العرب کلہ اجمع من لفظة الفلاح لخیری الدنیا والآخرة کما قالہ ائمة اللغة" (تاج العروس)

ائمہ لغت نے یہ واضح کیا ہے کہ کلام عرب میں لفظ فلاح سے بڑھ کر کوئی اور ایسا لفظ نہیں جو دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کا جامع ہو یعنی اس میں ہر قسم کی نعمتوں کا ذکر آجاتا ہے۔

فائدہ: سورۃ بقرہ کی ابتداء سے یہاں تک آیات کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بیشک میں نے تمہاری طرف رسول بھیجا جسے حکمت عطا کی گئی وہ فصیح اللسان ہیں ان کو فصاحت

اسی کتاب حکیم کے ذریعے عطا کی گئی قرآن کی فصاحت کو ان آیات اور اس کے نتائج میں دیکھو قرآن پاک کے دلائل اور ان کی عمدگی ان آیات میں نظر آئے گی ان آیات اور ان سے حاصل ہونے والے شرعی احکامات کی طرف تو توجہ کر وان آیات سے بڑھ کر اور تمہیں کون سا کلام بلیغ نظر آئے گا یہ قرآن پاک مرکب تو ان حروف تہجی سے ہی ہے جن سے اور کتب بھی تصنیف کی گئی ہیں لیکن اس کا مقابلہ کرنے سے ساری دنیا کے سارے انسان فصحاء و بلغاء عاجز آ گئے۔

اس کتاب میں متقین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان کے مطابق اپنے آپ کو بنالو اسی میں کامیابی ہے اسی میں نجات ہے۔ متقین کی تین قسم کی صفات کو بیان کیا گیا ہے ایک قسم میں متقین کے "علم وحکمت کو بیان کیا گیا ہے ان دونوں کا ذکر ایمان بالغیب میں ہے متقین کی دوسری صفت تسخیر بدن بالعبادۃ (یعنی عبادت کے ذریعے اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے تابع بنانا) جو نماز سے حاصل ہوتی ہے اور تیسری صفت جو رب تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے رب کی راہ میں خرچ کرنے سے حاصل ہوتی ہے پھر ان کی بزرگی کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا کہ ان کا ایمان اپنے دین پر بھی ہے اور پہلے دینوں پر بھی اور آخرت پر بھی ان کا یقین ہے۔ اس پر ان کی کامیابی کا ذکر فرمایا گویا کہ ان کے ماضی، حال، استقبال کا ذکر فرما کر یہ سمجھا دیا گیا کہ اے انسان تو اگر کامیابی چاہتا ہے تو اپنے ماضی، حال، استقبال کی طرف نظر رکھ۔ ماضی کی غلطیوں سے تائب ہو جا حال کو درست رکھ پھر تیرا مستقبل روشن ہوگا سبحان اللہ قرآن پاک تیری فصاحت وبلاغت پر قربان، تیری عظمت کو سمجھنے والے علماء کو سلام۔ (ماخوذ از جواھر طنطاوی)

گزشتہ سے پیوستہ: واولـــئک دوبارہ ذکر کر کے یہ مسئلہ بتایا کہ متقین جو صفات مذکورہ سے متصف ہوں گے وہ ان دو انعاموں سے بھی متصف ہیں یعنی وہ صفات خود ہی تقاضا کریں گی کہ انکو دونوں انعام حاصل ہوں اگر اسم اشارہ میں تکرار نہ ہوتا تو یہ وہم بھی ہوسکتا تھا کہ شائد صفات صرف ایک ہی انعام کا تقاضا کرتی ہوں اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں انعاموں میں سے ہر ایک متقین کو دوسروں سے ممتاز کرنے کیلئے کافی ہے۔ کیونکہ ان کے غیر لوگوں کو نہ ہدایت حاصل ہے اور نہ ہی فلاح واؤ عاطفہ کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر ایک جملہ کا مفہوم مختلف ہے جیسا کہ پہلے ہدایت اور فلاح کی بحث میں دونوں کے مطالب تفصیلی طور پر بیان کئے جا چکے ہیں ان پر نظر کرنے سے فرق خود بخود واضح ہو جائے گا۔

"ھم" ضمیر درمیان میں ذکر کی گئی ہے کہ یہاں حصر ہے جس کا مطلب ہے کہ صرف وہی لوگ کامیاب ہیں جو متقی ہیں ان کے غیروں کو کوئی فلاح حاصل نہیں۔ (از بیضاوی)

عربی کا شاندار ضابطہ:

ہر وہ کلمہ جس کا فاء کلمہ فاء ہی ہو اور عین کلمہ لام ہو اس میں پھاڑنے، فرق کرنے کا معنی ضرور پایا جائے گا۔ جیسا کہ فلج، پھٹنا، فلح، کاٹنا، فلذ، کاٹنا، فلی، بالوں کو ادھر ادھر کرنا کھجلانے کیلئے یا جوئیں نکالنے کے لئے فلف، پھٹنا۔ (از بیضاوی)

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴾

"بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں"

"بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے"

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں، خالص اولیاء کا ذکر کیا ان کی صفات کا ذکر کیا ان پر مرتب ہونے والے نتائج یعنی ان کو عطاء ہونے والے انعامات کا ذکر کیا۔ اب اس آیۃ میں اور اس کے بعد آنے والی آیۃ میں سرکش، نافرمان کھلے کافروں کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ ان کو ہدایت نفع نہیں دیتی ان کو آیات سے کوئی فائدہ نہیں ان کو ڈرانے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ ایمان نہیں لائیں گے کافروں سے مراد کون سے کافر ہیں؟ یا تو "الذین" (موصول) عہد پر دلالت کر رہا ہے اس سے مراد خاص معین کافر ہیں ابولہب، ابوجہل، ولید بن مغیرہ یہود کے پادری۔ اور یا "الذین" موصول جنس پر دلالت کر رہا ہے یعنی مراد تو جنس کفار ہیں لیکن وہ جو کفر پر قائم رہنے کا مصمم ارادہ کئے ہوئے ہیں کفر پر جمے ہوئے

ہیں ہر ایک ایک کافر مراد نہیں کہ کوئی کافر بھی ایمان نہیں لائے گا اس لئے کہ ہزاروں کافر مسلمان ہوئے رب تعالیٰ کا کلام سچا ہے صرف اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی)

علامہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کے اس بیان کے بعد اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ پر نظر کریں کہ ایک ہی لفظ سے دریا کو کوزے میں کیسا بند کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں ''بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے'' یہ نہیں ترجمہ کیا ''بیشک وہ جو کافر ہیں'' یعنی ایک لفظ ''قسمت'' ذکر کر کے علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی ساری بحث کو اس میں سمیٹ دیا کہ ایمان جو نہیں لائیں گے اور جن کو نبی کریم ﷺ کا ڈرانا نفع نہیں دے یہ وہی کافر ہوں گے جن کی قسمت میں کفر پر ہی مرنا ہوگا سارے کافر اس سے مراد نہیں۔

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

''سواء'' پر رفع میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ یہ ''ان'' کی خبر ہے اور ﴿وَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ مقام رفع میں ہے کیونکہ وہ فاعل ہے بتاویل مصدر سواء کا اور سواء بمعنی استواء ہے اور استواء بمعنی ''مستو'' کے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے ﴿اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ بتاویل مصدر اسم ہے اور مبتدا سواء خبر مقدم ہے۔ پورا جملہ خبر ہے ''ان'' کی اب معنی یہ ہوگا ''سواء علیهم انذارک وعدمه'' (آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا ان پر برابر ہے) دوسری ترکیب زیادہ بہتر ہے کیونکہ سواء اسم ہے اس کو فعل کا قائم مقام ماننا خلاف اصل ہے۔

(از کبیر)

سواء مرفوع ہے بوجہ مبتداء ہونے کے اور ''وانذرتهم ام لم تنذرهم'' خبر ہے اور مکمل جملہ خبر ہے ''ان'' کی۔

(قرطبی)

لیکن خیال رہے کہ علامہ قرطبی کی ترکیب بغیر تاویل کے درست نہیں کیونکہ ''سواء'' نکرہ ہے اور نکرہ بغیر تخصیص کے مبتداء نہیں بن سکتا اس لئے تاویل کر کے کوئی تخصیص ثابت کرنی پڑے گی جو خلاف ظاہر ہے۔

کفر کا لغوی معنی: لغت میں کفر کا معنی ڈھانپنا ستر اسی معنی میں شاعر نے اس مصرع میں استعمال کیا ہے ''فی لیلة کفر النجوم غمامها'' رات میں ستاروں کو رات کے بادل نے ڈھانپ دیا۔

کفر بمعنی رات اصل معنی چھپانا ہی ہے اسی مناسبت سے رات پر بولا گیا ہے جیسا کہ ثعلبہ بن صعیرہ مازنی نے کہا "فتذکرا ثقلا رثیدا بعد ما ، القت ذکاء یمینھا فی کافر " ان دونوں نے شترمرغ طے بطے (تہ بتہ) رکھے ہوئے انڈوں کا ذکر کیا اسکے بعد جب کہ سورج نے چھپنا شروع کیا۔

" ذکاء بضم الذال والمد اسم الشمس الثقل بالتحریک ھنا بیض النعام المصون الرشید المنضد القت یمینھا فی کافر بدأت فی المغیب...... لسان العرب"

دریا اور بڑی نہر کو بھی کافر کہہ لیا جاتا ہے کہ ان زیادہ گہرے پانی کی وجہ سطح زمین چھپی ہوئی ہوتی ہے زمین میں کھیتی باڑی کرنے والے کسان (زراع) کو بھی کافر کہا جاتا ہے کہ وہ دانے کو چھپا دیتا ہے اسی معنی میں قرآن پاک میں بھی استعمال ہے "کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ " اس بارش کی طرح جس کے اگائے ہوئے سبزہ نے کسانوں کو تعجب میں ڈالا جس خاکستر پر ہوا مٹی ڈال دے اسے بھی مکفور کہا جاتا ہے جو شخص لوگوں سے علیحدہ ہو کر دور چلا جائے کہ وہاں سے کسی کا گزر نہ ہو کوئی اسے ملنے نہ آئے اسے "الکافر من الارض "(دور زمین میں چھپ جانے والا) کہا جاتا ہے بستیوں کو بھی "الکفور "کہا جاتا ہے۔

کفر کا اصطلاحی معنی: کفر ایمان کی ضد ہے وہی یہاں مراد ہے جب واضح ہو چکا ہے کہ ایمان تصدیق کو کہا جاتا ہے تو سمجھ آ گیا کہ کفر انکار کو کہا جائے گا خواہ انکار ظاہری ہو یا باطنی یعنی تصدیق کا نہ پایا جانا کفر ہے خیال رہے کبھی نعمت واحسان کے انکار یعنی ناشکری کو بھی کفر کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿لَئِنْ شَکَرْ تُمْ لَاَزِیْدَ نَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَ ابِیْ لَشَدِیْدٌ﴾ اگر تم نے شکر کیا تو میں تمہیں اور دوں گا اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب سخت ہے۔ حدیث کسوف میں رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے متعلق ارشاد فرمایا:

"ورأیت النار فلم ار منظرا کالیوم قط افظع ورآیت اکثر اھلھا النساء قیل بم یارسول اللہ ؟ قال بکفرھن قیل ایکفرن باللہ ؟ قال یکفرن العشیر ویکفرن الاحسان لواحسنت الی احداھن الدھر کلہ ثم رات منک شیا قالت ما رأیت منک خیرا قط ، اخرجہ البخاری وغیرہ"

اور میں نے آگ کو دیکھا آج جیسا کوئی پریشان کن گھبرا دینے والا منظر نہیں دیکھا میں

نے آگ والوں میں عورتوں کو زیادہ تعداد میں دیکھا پوچھا گیا اس کی وجہ کیا ہے یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا بوجہ ان کے کفر کے آپ سے پوچھا گیا کیا وہ اللہ تعالیٰ سے کفر کرتی ہیں؟ آپ نے فرمایا (یہ کفر بمعنی ناشکری ہے) وہ اپنے خاوند کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان کو بھلا دیتی ہیں (ناشکری کرتی ہیں) اگر تم ان میں سے کسی ایک پر سارا زمانہ احسان کرتے رہو پھر وہ تم سے ذرا بھر کوئی چیز دیکھ لے (یعنی معمولی فرق آ جائے) تو کہے گی میں نے تو تم سے کوئی اچھائی دیکھی ہی نہیں۔

انذار کا معنی: لغت میں انذار کا معنی " **الانذار اعلام مع تخویف** " خوف دلاتے ہوئے کسی کو تعلیم دینا بتانا " **فکل منذر معلم ولیس کل معلم منذر** " ہر منذر معلم ضرور ہوگا لیکن ہر معلم کا منذر ہونا ضروری نہیں۔ یعنی انذار صرف ڈرانا نہیں بلکہ کسی کو تعلیم دیتے ہوئے تبلیغ کرتے ہوئے ڈرانا مراد ہے (از خازن) اسی سے یہ واضح ہوگیا کہ ظالمانہ انداز کی دھمکیاں دینے والے مخوف تو ہوسکتے ہیں لیکن نذیر نہیں ہوسکتے حقیقی طور پر تو انبیاء کرام کی صفت ہے نذیر ہونا لیکن مجازی طور پر انبیاء کرام کے وارث ہونے کے لحاظ پر علماء کرام بھی نذیر ہیں کہ وہ بھی تبلیغ احکام میں رب تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کرتے ہیں لیکن خیال رہے دونوں پہلو مدنظر رہیں۔ صرف عذاب کا ذکر کرنا رحمت کا نہ ذکر نا اور صرف رحمت کا ذکر نا عذاب کا ذکر نہ کرنا انبیاء کرام کی سنت کے خلاف ہے انبیاء کرام بشیر بھی ہیں اور نذیر بھی۔ البتہ یہاں معنی یہ مراد ہے " **الانذار التخویف من عقاب اللہ بالزجر عن المعاصی** " (مدارک) آپ ان کو گناہوں (کفر) سے روکتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان پر کوئی اثر نہیں۔

" **لایؤمنون ای لا یصدقون یعنی انهم ینکرون انکار شئی مما علم بالضروۃ کونه من دین محمد علیه السلام** " (از خازن وتبصیر الرحمن)

وہ ایمان نہیں لائیں گے یعنی وہ تصدیق نہیں کریں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے دین سے بدیہی طور پر سمجھ آنے والے احکام کا انکار کریں گے۔

آیۃ کریمہ کا شان نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حریص تھے کہ تمام لوگ ایمان لے آئیں اور ہدایت پر آپ کی تابعداری کریں تو آپ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جن کی قسمت میں

ہمیشہ کیلئے کفر پر ہی رہنا ہے ان کو آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے (یہاں سے ہی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے پھر تاکید کے طور پر لایؤ منون ذکر کیا کہ) وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (از صابونی)

اعتراض: کفر کی جب یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم علیہ السلام کی شریعت کے بدیہی احکام کی تصدیق کرنا تو کفار کے شعار پر عمل کرنے والے کو کیسے کافر کہا جاتا ہے حالانکہ اسے تصدیق حاصل ہوتی ہے کہا جاتا ہے مثلاً کافروں کی خصوصی شعار والی لمبی ٹوپی پہننا اور جنجو باندھنا کفر ہے تصدیق کے ہوتے ہوئے ان کو کفر کہنا کیسے صحیح ہے۔

جواب: کفار کے شعار کو علامتِ کفر کہا جاتا ہے عین کفر نہیں صرف یہ ہے کہ شریعت مصطفوی کی تصدیق کرنے والا کافروں کے شعار پر عمل کرنے کی جرات نہیں کرسکتا اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ کافر نظر آئے گا بظاہر یہی سمجھ آئے گا کہ یہ کافر ہے کیونکہ اس نے کافروں کی خصوصی علامات کو اپنایا ہوا ہے۔
(از بیضاوی وشیخ زادہ)

اعتراض: جب ازلی کفار کو ڈرانے کا کوئی فائدہ نہیں تو نبی کریم علیہ السلام کو تبلیغ احکام کا حکم کیوں دیا گیا یا اس خبر کے بعد آپ کا تبلیغ کو جاری رکھنے کا کیا مقصد ہے۔

جواب: اس کے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ کافروں کے منہ بند کرنے مقصود تھے کہ وہ قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکیں "لو لا ارسلت الینا رسولا فنتبع آیاتک ونکون من المؤمنین" (اے اللہ) تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہیں بھیجے کہ ہم تیری آیات کی تابعداری کرتے اور ہم مومن ہو جاتے۔ اور ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کی مہربانی کا اظہار بھی ہو جائے اس لئے کہ رب تعالیٰ نے اپنی مہربانی کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر کیا ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے بیشک رسول نہ بھیج دیں۔ رسولوں کو تبلیغ جاری رکھنے کے حکم کا یہی فائدہ ہے کہ ان کو عذاب دینا بلاوجہ نہیں بلکہ رب تعالیٰ نے رسول بھیج دیئے انہوں نے تبلیغ کر دی پھر نہ ایمان لانے والوں کی حجت بازی ختم ہوگئی اب وہ عذاب کے مستحق ہو گئے تو عذاب ان کو دے دیا گیا۔

اسی فائدہ کو رب تعالیٰ نے یوں ذکر فرمایا:

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾

تاکہ رسولوں کے (آنے اور تبلیغ کرنے) کے بعد لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

یعنی یہ نہ کہہ سکیں کہ ﴿ اِنَّا کُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ ﴾ ہم تو اس سے غافل تھے ہمیں کسی نے بتایا ہوتا تو ہم ایمان لاتے دوسرا فائدہ یہ ہے "ھی حیازتہ علیہ السلام فضل الا بلاغ " کہ نبی کریم ﷺ تبلیغ دین کا ثواب حاصل کرلیں:

" فان الا بلاغ والدعوة الى الحق والى طريق مستقيم اعظم الطاعات التى ينال المرء بها من ربه اعظم المثوبات "

بیشک تبلیغ، حق کی دعوت، سیدھی راہ کی طرف ہدایت تمام طاعات سے عظیم طاعت ہے انسان کو اس عمل پر اپنے رب تعالیٰ کی طرف سے عظیم ثواب عطا کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک کے انداز بیان کو تو دیکھئے ذرا غور کریں سمجھنے کی کوشش کریں یہ عقدہ خود ہی حل ہو جائے گا یہ نکتہ سمجھ آجائے گا "ولذلک سوا علیھم ولم یقل سواء علیک " رب تعالیٰ نے یہ فرمایا ان پر آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے یہ نہیں فرمایا کہ ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا آپ پر برابر ہے۔

مطلب واضح ہے کہ ازلی کفار کو تو آپ کے ڈرانے کا یقیناً کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن آپکو عظیم ثواب حاصل ہوگا آپکے مدارج میں بلندی ہوگی۔ ایک اور آیۃ کو سمجھنے سے یہ مسئلہ اور نکھر کر واضح ہو جائے گا رب تعالیٰ نے بت پرستوں کو ارشاد فرمایا ﴿سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ﴾ تم پر برابر ہے کہ تم ان (بتوں) کو بلاؤ یا خاموش رہو اس آیۃ میں بتوں کے پکارنے والوں کو کہا کہ تمہیں کوئی فائدہ نہیں بلاؤ یا نہ بلاؤ تمہارے لئے نقصان ہی نقصان ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

اعتراض : جب رب تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ ازلی کافر ایمان نہیں لائیں گے تو ان کے ایمان نہ لانے پر ان کو عذاب کیوں دیا جائے گا۔

خیال رہے کہ یہی اعتراض آج کل کے لوگ جو دین کے باغی ہیں وہ بھی کر رہے ہیں کہ جب رب تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ہم نے گناہ کرنا ہی کرنا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے ہم تو مجبور ہیں۔

جواب : اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وشعور دیا اور اس کے اعضاء صحیح وسلامت بنائے پھر بندے کو مختار بنایا جب بندہ اپنے اختیار سے ہر کام کرتا ہے تو اسی پر سزا اور جزا خیر کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم نے ان کو مجبور نہیں کیا وہ ایمان لائیں یا کفر کریں نیکی کریں یا گناہ کریں ہر فعل ان کا ان کے اختیار سے ہوتا ہے اس

کی ایک مثال پر ذرا توجہ کریں کہ ایک استاد نے اپنے شاگردوں کو کہا کل جو سبق یاد کر کے نہیں لائے گا اسے سزا ملے گی استاذ کو اپنے شاگردوں کے متعلق کافی حد تک علم اور تجربہ ہوتا ہے اسی علم اور تجربہ کے پیش نظر استاد نے کسی دوست کا بتا دیا کہ فلاں فلاں لڑکے یاد تو کر سکتے ہیں لیکن بے پرواہ ہیں مار کھا لیتے ہیں لیکن سبق یاد نہیں کرتے اس لئے کل انہوں نے مار کھانی ہے۔اب اس کے بعد ہوا ایسے ہی جیسے استاذ نے بتایا تھا لیکن استاذ نے ان کو سبق یاد نہ کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا استاذ کی خبر نے ان کے اختیارات اور صلاحیت کو نہیں چھین لیا تھا۔اسی طرح رب تعالیٰ کا علم ماضی، حال، مستقبل کا ایک جیسا ہے رب تعالیٰ نے اپنے علم سے اگر چہ بتا دیا ہے کہ فلاں فلاں نے کافر ہونا ہے یا فاسق و گنہگار اور ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کو یہ عذاب دیا جاتا ہے لیکن ان کو صلاحیت دی اختیار دیا صحیح وسلامت اعضاء دیئے انہوں نے عذاب میں مبتلا ہونا ہے تو اپنی بے پرواہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے علم نے انہیں کفر وفسق پر مجبور نہیں کیا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جواب:

ایک شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی محفل میں کھڑے ہو کر کہا اے ابو عبد الرحمٰن قوم زنا بھی کرتی ہے چوری بھی کرتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں اور کہتے یہ ہیں " **كان ذلك في علم الله فلم نجد منه بدا** " کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہی تھا ہم اس سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ غصہ میں آ گئے اور فرمایا:" **سبحان الله العظيم قد كان في علم الله تعالىٰ انهم يفعلون ذلك فلم يحملهم علمه على فعلهم** "

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور عظیم ہے اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ تھا کہ یہ ایسا کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم نے ان کو ان افعال پر مجبور تو نہیں کیا۔یعنی اللہ تعالیٰ کا علم اور کسی چیز کی خبر دینا اور ارادہ کرنا کہ یہ کام پایا جائے گا یا نہیں پایا جائے گا اس سے کسی انسان کی قدرت اور اس کے اختیار کو ضائع نہیں کیا جاتا کہ اس کے اختیار کو باطل کر کے اور اسے مجبور کر کے وہ کام کرایا جائے یا وہ کام جو کرنے تھے ان کو مجبور کر کے نہ کرنے دیئے جائیں۔

شاندار علمی ضابطہ:

" ان الاخبار عن الشئی حکم علیه بمضمون الخبر والحکم تابع لارادة الحاکم ایاه وارادته تابعة لعلمه وعلمه تابع للمعلوم والمعلوم هو ذلک الفعل الصادر عن فاعله باختیاره ففعله او ترکه باختیاره اصل وجمیع ذلک تابع له والتابع لایوجب المتبوعٔ ایجابا یؤدی الی القسر والالجاء بل التابع علی حسب وقوع المتبوع "

کسی چیز کی خبر دینے پر مضمون خبر کا حکم ثابت ہوتا ہے حکم حاکم کے ارادہ کے تابع ہے اور حاکم کا ارادہ اس کے علم کے تابع ہے اور علم معلوم کے تابع ہے معلوم وہ فعل ہے جو فاعل کے اختیار سے صادر ہوتا ہے اس فعل کے کرنے اور نہ کرنے میں حاکم کو کامل اختیار حاصل ہے یہ سب چیزیں تابع ہیں تابع متبوع پر کسی کام کو واجب نہیں کرسکتا کہ اسے مجبور کردے بلکہ تابع تو متبوع سے کام کے واقع ہونے کے مطابق ہی تابع ہے (یہاں حاکم سے مراد حکم دینے والا)۔

آیئے ذرا اس ضابطہ کو آسان لفظوں میں سمجھئے وزیر اعظم کہیں جانا چاہے اس کا پروگرام طے ہو جائے کہ فلاں دن اس نے جانا ہے اور فلاں دن اس نے واپس آنا ہے اس کے خادموں اور چمچوں سے کسی نے اس کے پروگرام کی خبر دے دی اس کی خبر سے وزیر اعظم کے پروگرام کا تو پتہ چل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ حکم دراصل وزیر اعظم کا اپنا ہے۔ اس نے یہ حکم اپنے ارادہ سے دیا ہے اور اس کا یہ ارادہ اسکے اپنے علم کے مطابق ہے کہ مجھے فلاں وقت جانا چاہیے اور فلاں وقت آنا چاہیے اس کا علم اسی کام کے مطابق ہے جو اس کے پروگرام کے مطابق ہے۔ لیکن خدارا انصاف کیجئے کیا اس خادم کے خبر دینے سے حاکم مجبور ہوا یا اس کا سارا پروگرام اپنے ارادہ سے ہے یقینی بات ہے کہ خبر دینے والے علم رکھنے والے نے وزیر اعظم کو مجبور نہیں کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے علم اور خبر دینے سے کوئی مجبور نہیں ہوتا ہر شخص کام اپنی مرضی اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

خواص وعوام مسئلہ تقدیر میں نہ الجھیں:

" والقدر سر من اسرار الله تعالیٰ لم یطلع علیه ملکا مقربا ولا نبیا

مرسلا ولا یجوز الخوض والبحث عنه بطریق العقل"

مسئلہ تقدیر اللہ تعالیٰ کے رازوں میں ایک راز ہے اس کی تفصیل اور اس کی حقیقت سے کسی مقرب فرشتے اور کسی نبی مرسل کو مطلع نہیں کیا گیا لہذا اس مسئلہ میں عقل کے ذریعے غور وخوض اور بحث کسی طرح بھی جائز نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا:

ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ آپ مجھے تقدیر کے متعلق بتائیں آپ نے فرمایا "طریق مظلم لا تسلکه" تاریک راستہ ہے اس پر نہ چلو۔ اس شخص نے پھر وہی سوال لوٹایا آپ نے فرمایا "بحر عمیق لا قلجه" گہرا سمندر ہے۔ اس شخص نے پھر وہی سوال کیا آپ نے فرمایا "سر اللہ قد خفی علیک فلا تفتشه" یہ اللہ تعالیٰ کا راز ہے جو تم پر مخفی ہے اس کی تفتیش نہ کرو۔

تقدیر پر ایمان ضروری ہے:

" الایمان بالقدر فرض لازم وهو ان یعتقد ان الله تعالیٰ خالق اعمال العباد خیرها وشرها وکتبها فی اللوح المحفوظ قبل ان خلقهم والکل بقضائه وقدره وارادته ومشیئته غیر انه یرضی الایمان والطاعة ووعد علیهما الثواب ولا یرضی الکفر والمعصیة واوعد علیهما العقاب "

" قدر پر ایمان لانا فرض لازم ہے اور وہ یہ کہ عقیدہ رکھے کہ بیشک اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام اعمال کا خالق ہے خواہ خیر ہوں یا شر اور ان کو لوح محفوظ میں لکھ دیا مخلوق کی پیدائش سے پہلے سب اللہ تعالیٰ کی قضاء قدر ارادہ اور مشیت میں ہیں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ ایمان اور طاعت کو پسند فرماتا ہے اور ان پر اس نے ثواب مقرر فرمایا ہے اور وہ کفر ومعصیت پر راضی نہیں اور ان پر عذاب کی وعید فرمائی ہے"

(از مرقاة ج ا ص ۱)

﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴾

۱) ''اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کردی اور ان کی آنکھوں پر گھٹاٹوپ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب''

۲) ''اللہ نے مہر لگادی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے''

ختم کا معنی: ختم اور کتم تقریباً ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں اگرچہ ان میں ترادف نہیں اس لئے کہ ختم کا مطلب ہے کسی چیز پر مہر لگا دینا بند کر دینا جس طرح خط وغیرہ پر مہر لگا کر بند کر دیا جائے یا دروازہ پر مہر لگا کر بند کر دیا جائے (سیل کر دیا جائے) چونکہ اس میں بھی معنی چھپانے والا آجاتا ہے لہذا کتم کو اس کے قریب سمجھ لیا گیا اس لئے کہ کتم کا معنی مطلقاً چھپانا ہے اس میں مہر لگانے والا معنی مراد لینا ضروری نہیں۔

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

کفار کے دلوں کے رب تعالیٰ نے دس وصف بیان فرمائے:

(۱) انکار: ﴿ قُلُوْبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ ان کے دل منکر ہیں اور وہ مغرور ہیں

(۲) حمیة: ﴿ اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ ﴾ جب کہ کافروں نے اپنی دلوں میں آڑ رکھی ہے۔

(۳) انصراف: ﴿ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴾ پھر وہ پھر گئے اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا بیشک وہ قوم سمجھنے والی نہیں۔

(۴) قساوة: ﴿ فَوَیْلٌ لِّلْقَاسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ تو خرابی ہے ان کی جن کے دل یاد خدا کی طرف سے سخت ہوگئے۔

(۵) **موت :** ﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ ﴾ اور کیا وہ کہ مردہ تھا تو ہم نے اسے زندہ کیا۔

(۶) **رین :** ﴿ كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ کوئی نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے ان کی کمائیوں نے۔

(۷) **مرض :** ﴿ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ ان کے دلوں میں مرض ہے۔

(۸) **ضیق :** ﴿ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّضِلَّه، يَجْعَلْ صَدْرَه، ضَيِّقًا حَرَجًا ﴾ اور جسے گمراہ کرنا چاہے اس کا سینہ تنگ خوب رکا ہوا کر دیتا ہے۔

(۹) **طبع :** ﴿ فَطَبَعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴾ ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی تو وہ سمجھتے نہیں۔

(۱۰) **ختم :** ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ﴾ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی۔

ختم کی دو قسمیں: ختم کبھی تو محسوس ہوتی ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خط پر مہر لگانا یا دروازہ پر مہر لگانا اور کبھی ختم کا اطلاق غیر محسوس درجہ کا ہوتا ہے جیسا کہ دلوں یا کانوں پر مہر لگانا کیونکہ یہاں ظاہری طور پر مہر لگانا مراد نہیں بلکہ دل میں حق بات کا نہ آنا حق خطابات کو نہ سمجھنا اور اللہ تعالیٰ کی آیات میں تفکر نہ کرنا مراد ہے۔ اسی طرح کانوں پر مہر لگانے کا یہ مطلب ہے کہ حق بات کو ان کے کان سن کر قبول نہیں کرتے گویا کہ نہ سننے کے مترادف ہے۔

فائدہ: قلوب کو پہلے ذکر کر کے اشارہ کر دیا گیا کہ قلب تمام اعضاء سے اشرف ہے اس لئے کہ قلب (دل) ہی مقام فکر ہے بلکہ اس کو قلب کہنے کی وجہ ہی یہ ہے کہ ایک چیز کو سوچ کر ادھر پھر گیا اور دوسری چیز کو سوچ کر ادھر پھر گیا۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مثل القلب مثل ريشة تقلبها الرياح بفلاة" دل کی مثال ایک پر کی طرح ہے جسے ہوائیں جنگل میں الٹ پلٹ کرتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ دعاء فرمایا کرتے "اللهم يا مثبت القلوب ثبت قلوبنا على طاعتك" اے اللہ دلوں کو ثابت رکھنے والے اپنی طاعت پر ہمارے دلوں کو ثابت رکھ۔

" فاذا کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقولہ مع عظیم قدرہ وجلال منصبہ فنحن اولی بذلک اقتداء بہ "

نبی کریم ﷺ عظیم قدر و منزلت رکھنے والے اعلیٰ منصب کے مالک جب یہ دعا کرتے تھے تو ہم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ہم بھی یہ دعا کریں کیونکہ نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں ہی کمال ہے۔

سمع و بصر میں افضل کون؟ بعض حضرات نے بیان فرمایا کہ یہاں آیۃ کریمہ میں سمع کا ذکر پہلے ہے اور بصر کا بعد میں اس لئے سمع افضل ہے بصر سے۔ اس کی وجہ بھی واضح طور پر سمجھ آتی ہے کہ چھ جہتوں (دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے) سے آنے والی آواز کو سنا جا سکتا ہے لیکن دیکھنے کا تعلق صرف سامنے سے ہے۔ اور وجہ یہ بھی ہے کہ اندھیرے میں انسان سن سکتا ہے لیکن دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن اکثر متکلمین حضرات نے بصر کو سمع پر افضل کہا ہے کیونکہ سمع کا تعلق صرف کلام اور آواز سے ہے اور بصر سے جسموں رنگوں اور شکلوں کا ادراک ہوتا ہے۔

راقم کے نزدیک آسان صورت یہ ہے کہ بعض لحاظ سے سمع افضل ہے اور بعض لحاظ سے بصر افضل ہے۔ بہر حال اس قسم کی بحثوں سے قرآن پاک کی عظمت ہی سمجھ میں آتی ہے کہ ایک ایک لفظ میں اہل علم نے کیا خوب تفکر کیا ہے۔ (از قرطبی)

غشاوۃ کا معنیٰ: غشاوۃ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو ڈھانپ دے مراد اس سے پردہ ہے۔

عربی کا شاندار ضابطہ: جب فعالۃ (فا کے نیچے کسرہ زیر) کا وزن ہو تو اس میں معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز کسی پر مشتمل ہے جیسا کہ غشاوۃ، آنکھ پر مشتمل ہونے والا پردہ، عصابۃ، لپیٹنے والی پٹی جو کسی عضو پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور عمامہ، پگڑی جو سر پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب فعالہ (فا پر ضمہ پیش) کا وزن ہو تو اس میں معنی یہ ہوگا کہ کسی چیز کسی سے گرنا جیسا کہ مشاطہ، کنگھی کرتے ہوئے گرنے والے بالوں کو کہا جاتا ہے برایہ لکڑی تراشتے ہوئے گرنے والا بورا اور قلم تراشتے ہوئے گرنے والے چھلکے۔ (شیخ زادہ)

دینی مدارس کے طلباء کے لئے: سمع کو واحد ذکر کیا گیا اور ابصار کو جمع اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ سمع مصدر ہے اور مصدر تثنیہ جمع نہیں ہوتا۔ اگرچہ بظاہر بصر بھی مصدر نظر آتا ہے اسے بھی جمع

نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس پر اسمیت غالب آ گئی وہ آنکھ کا نام بن جانے کی وجہ سے جمع ذکر کیا گیا ہے ۔سمع اور قلب چونکہ جمیع جوانب سے ادراک کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے ان کے لئے ختم (مہر) کا ذکر کیا جو جمیع جوانب کو بند کر دیتی ہے لیکن بصر کا تعلق سامنے سے ہے اس لئے اس کے لئے پردہ کا ذکر کیا جو سامنے سے بند کر دیتا ہے۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ دل اور کان پر پردہ ان کے ادراک یعنی دل کو سمجھنے اور کان کو سننے سے بند نہیں کر سکتا اس لئے ان کے مناسب مہر ہی ہے اور آنکھ کو پردہ دیکھنے سے روک دیتا ہے اس لئے بصر کے لئے غشاوۃ کا ذکر ہی مناسب ہے (از حاشیہ جلالین) یہ تو انسانی علم اور ادراک کی باتیں ہیں ورنہ رب تعالیٰ کے کلام میں کلام ہی کیا جس لفظ کو رب تعالیٰ نے جہاں ذکر کیا ہے وہ اس کا محل ہے دوسرا لفظ وہاں استعمال ہی کیسے ہو؟

اعتراض: جب رب تعالیٰ نے ہی انسانوں کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ کر دیا تو انسانوں کا ایمان نہ لانا نیکیاں نہ کرنا ضروری ہو گیا اس لئے اس میں انسان کا تو کوئی قصور نہیں پھر عذاب دینے کا کیا مقصد ہے۔

جواب: انسان خود اپنے اختیارات کو غلط استعمال کر کے ایمان سے دور رہ کر گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو مہر اور پردے اور عذاب کا مستحق بنالیتا ہے رب تعالیٰ کی طرف نسبت اس وجہ سے کی گئی ہے کہ وہ تمام چیزوں کا خالق یعنی ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائے جانے اور آنکھوں پر پردہ چھا جانے کی وجہ اصل میں ان کا کسب ہے البتہ ہر چیز کا خالق چونکہ رب تعالیٰ ہے لہذا بحیثیت خلق کے رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہیں ۔آیئے اس پر احادیث مبارکہ کو دیکھیں:

"قال رسول اللہ ﷺ ان الرجل لیصدق فتنکت فی قلبہ نکتۃ بیضاء وان الرجل لیکذب الکذبۃ فیسود قلبہ"

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک ایک شخص سچ بولتا ہے تو اس کے دل میں ایک سفید نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اور بیشک انسان جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے۔''

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث نقل کی ہے:

" ان الرجل لیصیب الذنب فیسود قلبه فان هو تاب صقل قلبه قال هو الرین الذی ذکره الله فی القرآن فی قوله ﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾"

"بیشک انسان جب گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے اگر وہ توبہ کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے وہ سیاہ نکتہ دراصل زنگ ہے جسے رین کہا جاتا ہے قرآن میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے دل اپنے کسب کی وجہ سے زنگ آلود ہیں"

(از قرطبی)

" قَالَ قَتَادَةَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ اِذَا اَطَاعُوْهُ فَخَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ هُدًى وَّلَا يَسْمَعُوْنَ وَلَا يَفْقَهُوْنَ وَلَا يَعْقِلُوْنَ "

اس آیۃ کی تفسیر میں حضرت قتادہ نے بیان کیا کہ جب ان (کفار) پر شیطان غالب آجاتا ہے وہ اس کی اطاعت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دیتا ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ کر دیتا ہے تو وہ ہدایت کی راہ کو دیکھ نہیں سکتے اور حق بات سن نہیں سکتے اور حق بات کو سمجھنے اور عقل رکھنے کی ان میں صلاحیت نہیں رہتی۔ اس قول سے بھی واضح ہوا کہ شیطان کے جال میں پھنس کر وہ اپنے آپ کو اس قابل کر لیتے ہیں کہ انکے دیکھنے، سننے، سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

ابن جریج نے کہا کہ مجاہد نے بیان کیا ہے کہ وہ لوگ جب کفر کرتے ہیں اور گناہ کرتے ہیں تو وہ گناہ انکے دلوں پر چھا جاتے ہیں گناہوں کا دلوں پر چھا جانا اور ان میں سمجھنے کی صلاحیت کا ختم ہو جانا ہی طبع اور ختم ہے۔ عبداللہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ انہوں نے مجاہد کو کہتے سنا ران (زنگ) آسان ہے "طبع" سے اور "طبع" آسان ہے قفل (تالے) سے یہی کیفیت وہ ہے جسے ختم کہا گیا ہے۔

مجاہد نے اپنے ہاتھ سے اس طرح سمجھایا کہ پہلے چھوٹی انگلی بند کی پھر دوسری پھر تیسری پھر چوتھی پھر پانچویں کہ اسی طرح ایک گناہ دل پر چھا جاتا ہے پھر دوسرا تیسرا وغیرہ یہاں تک کہ وہ دل بالکل بند ہو جاتا ہے سمجھنے کی طاقت اس میں ختم ہو جاتی ہے۔

(از ابن کثیر)

ابھی تک جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی بہت زیادہ واضح طور پر

دلالت کر رہا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ ﴾ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے مہر لگا دی ہے۔

"وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ": ان کے لئے بڑا عذاب ہے یعنی کافروں کو رب تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا عذاب دیا جائے گا "عذاب" کا لغوی معنی ہے روکنا کہا جاتا ہے "اعذبه عن كذا" اسے اس طرح کے کاموں سے روکو "غدوبة الماء" میٹھے پانی کو "عذوب" کہا جاتا ہے کیونکہ اسے بھی پینے کے لئے برتنوں میں روک کر رکھا جاتا ہے یا یہ کہ وہ پیاس کو روکتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی اسی معنی پر دلالت کر رہا ہے "اعذبوا نساء كم عن الخروج" اپنی عورتوں کو باہر نکلنے سے روکو اس طرح کہا جاتا ہے "لا لجمنك لجا ما معذبا" میں تمہیں روکنے والا لگام ڈالوں گا۔ اصطلاح میں عذاب کا معنی ہے "ما يولم الانسان" جو انسان کو درد پہنچائے جیسا کہ کوڑے سے مارنا آگ سے جلانا اور لوہے سے کاٹنا۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے حد کو بھی عذاب کہا ہے کیونکہ اس میں بھی انسان کو درد پہنچانا اور گناہوں سے روکنا مقصود ہوتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "ويشهد عذابهما طائفة من المؤمنين" ان دونوں (زانی مرد اور عورت) کے عذاب کے وقت مومنوں کا ایک گروہ حاضر رہے۔ یہاں حد کو عذاب کہا گیا ہے یعنی جب ان پر حد جاری ہو دوسرے مومن لوگ حاضر رہیں تا کہ عبرت پکڑیں۔ (از قرطبی)

"عظیم" حقیر کی ضد ہے اور کبیر، صغیر کی ضد ہے جس طرح حقیر، صغیر سے کم کو کہا جاتا ہے اسی طرح عظیم کبیر سے فوق (اوپر) چیز کو کہا جاتا ہے۔ یعنی کافروں کو اتنا بڑا عذاب ہوگا جس کی حقیقت کو کوئی نہیں پا سکتا اگر چہ عظیم کا لفظ بھی عظمت پر دلالت کر رہا تھا لیکن اس پر تنوین بھی تعظیم کے لئے ہے لہٰذا معنی ہوگا بہت بڑا عذاب ان کو ہوگا۔

خیال رہے کہ "غشاوة" پر تنوین بھی تعظیم کی ہے کہ ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ہوگا جس کی حقیقت کو رب تعالیٰ ہی جانتا ہے انسان اس کی حقیقت کو جاننے سے قاصر ہے۔ یہاں علامہ بیضاوی اور علامہ رازی رحمہما اللہ نے دقیق اور طویل بحثیں کی ہیں اگر چہ ان کا ذکر کرنا بیضاوی پڑھنے والے طلباء کے لئے مفید بھی تھا لیکن ان سے صرف نظر کر رہا ہوں تا کہ بہت طوالت بھی نہ ہو۔

قلب کے متعلق شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قلب لغت میں وہ گوشت صنوبری (الٹالٹکا ہو) ہے جو سینہ کے بائیں جانب ہے روح حیوانی اسی گوشت میں پیدا ہوتی ہے اور وہی روح حیوان کے لئے حس وحرکت کا منشا ہے اہل شرح کی اصطلاح قلب لطیفہ انسانی کو کہا جاتا ہے اسی سے انسان کو انسانیت حاصل ہے اور وہی اوامر ونواہی کو تسلیم کرنے کا سبب ہے قرآن پاک میں اسی معنی کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان کیا گیا ﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ ﴾ بیشک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جس کا دل ہے یعنی جسے سمجھنے کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے کبھی قلب بمعنی نفس بھی آتا ہے اور کبھی قلب بمعنی روح بھی آتا ہے۔

(از عزیزی)

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴾

(۱) ''اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں''

(۲) ''اور بعض لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر حالانکہ وہ ایمان والے نہیں''

پہلے مؤمنین کا ذکر کیا ان کی صفات کا ذکر کیا اور ان کا ہدایت پر ہونا اور ان کے کامیاب ہونے کا تذکرہ کیا پھر کھلے کفار کا ذکر کیا جو ظاہراً اور باطناً کافر تھے ان کا ذکر صرف دو آیتوں میں کر دیا اس لئے کے جس کے متعلق ظاہری طور پر معلوم ہو کہ یہ دشمن ہے اس سے انسان بچ کر رہتا ہے اور یہاں سے منافقین کا ذکر شروع ہو رہا ہے ان کا تیرہ آیات میں ذکر کیا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو مومنین کے سامنے مومن ہونا ظاہر کرتے تھے حالانکہ وہ مومن تو نہیں تھے بلکہ کافر تھے ان سے مؤمنین کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑا اس لئے کہ صحابہ کرام ان کو اپنا سمجھ کر ہر قسم کی بات کر لیتے تھے وہ کافروں کو بتا دیتے تھے رب تعالیٰ نے بھی اسی وجہ سے ان کے کردار کو کھول کر بیان کیا اور ان کی مذمت کی اور سب سے زیادہ سخت عذاب بھی منافقوں کو ہی ہونا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ بے شک منافقین آگ کے سب سے نیچے درجے میں ہوں گے۔

شانِ نزول: جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے اس وقت وہاں انصار کے قبیلے اوس اور خزرج تھے زمانہ جاہلیت میں یہ لوگ مشرکین عرب کی طرح بت پرست تھے اور مدینہ طیبہ میں اہل کتاب سے یہود بھی تھے یہ اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ہی قائم تھے ان کے تین قبیلے تھے ایک بنوقینقاع جوخزرج کے حلیف تھے دوسرا قبیلہ بنونضیر، تیسرا قبیلہ بنوقریظہ یہ دونوں اوس کے حلیف تھے۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں آئے تو اوس اور خزرج قبیلے کے زیادہ لوگ اسلام لے آئے یہی انصار کہلائے۔ یہود میں سے بہت کم تعداد میں لوگ اسلام لائے ان میں سے اسلام لانے والے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے کچھ ساتھی تھے۔ ابھی تک کوئی منافق نہیں تھا کیونکہ ابھی مسلمانوں کو زیادہ دبدبہ حاصل نہیں تھا نبی کریم ﷺ نے بھی یہود اور مدینہ طیبہ کے اطراف میں رہنے والے لوگوں سے زیادہ طور پر پہلوتہی ہی کی۔ جب بدر کا واقعہ درپیش آیا تو دین اسلام کا غلبہ ہوا اور خصوصی اعزاز حاصل ہوا مسلمانوں کا رعب قبائل کے دلوں پر چھا گیا اور مسلمانوں کو خاص طور پر دبدبہ حاصل ہو گیا بدر کے واقعہ کے بعد منافقت کا دور شروع ہوتا ہے اس کا پس منظر یہ تھا۔

عبداللہ ابن ابی ابن سلول خزرج قبیلہ سے تھا، جو مدینہ طیبہ میں سردار تھا۔ اوس اور خزرج اختلاف رکھنے کے باوجود، دونوں قبیلے ہی اسے اپنا سردار مانتے تھے، انہوں نے اسے مستقل طور پر اپنا بادشاہ بنانے اور اس کی تاج پوشی کی تیاری کر لی تھی۔

جب ان کو نبی کریم ﷺ کی نبوت کی خبر ملی، کچھ لوگ ہجرت سے پہلے ہی عقبہ اولی اور ثانیہ پر ایمان لا چکے تھے، اور آپ کی ہجرت کے بعد تو دونوں قبائل سے کثیر تعداد میں لوگ ایمان لائے۔

عبداللہ بن ابی کی بادشاہت کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا، اس کا اسے رنج تھا، ادھر بدر کا واقعہ درپیش آ گیا، مسلمانوں کی شوکت و دبدبہ کو دیکھ کر، عبداللہ ابن ابی اور اسی کے قبیلہ کے چند لوگ، اور یہود میں سے کچھ، اور اطراف مدینہ سے کچھ لوگوں نے منافقت کی راہ اختیار کر لی، کہ بظاہر مسلمان بن کر مسلمانوں کے ساتھی بن کر ان کو نقصان پہنچاؤ۔

ان لوگوں کی چالبازیوں کو بیان کرنے کے لئے یہ آیۃ کریمہ اور اس کے بعد والی نازل ہوئیں۔

خیال رہے مہاجرین میں سے کوئی بھی منافق نہیں تھا، اس لئے کہ انہوں نے اپنا وطن، گھر، اہل وعیال اور اقرباء کی صرف ایمان اور محبت رسول اللہ ﷺ کے لئے چھوڑا تھا، وہ خالص مومنین

تھے۔ان میں نفاق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(از ابن کثیر)

منافقت کو سمجھنے کے لئے تحقیقی بحث: دل کے احوال چار ہیں:

(۱) دلیل سے جو حاصل ہوا اعتقاد بھی اس کے مطابق ہوا سے علم کہا جاتا ہے۔

(۲) اعتقاد اس کے مطابق ہو جو دلیل سے تو نہیں حاصل لیکن مجتہد سے حاصل ہو یہ ہے اعتقاد مقلد۔

(۳) اعتقاد واقعہ کے مطابق نہ ہو یہ ہے جہل۔ (۴) دل ان تمام سے خالی ہو۔

پھر زبان کے احوال تین ہیں۔ (۱) اقرار۔ (۲) انکار۔ (۳) سکوت۔

یہ تمام بارہ قسمیں بن گئیں کیونکہ جب عرفان قلبی حاصل ہو یعنی دلیل سے حاصل ہوا اور اعتقاد اس کے مطابق ہو تو اس کے ساتھ یا اقرار ہوگا یا انکار، یا سکوت۔

(۱) عرفان قلبی کے ساتھ جب اقرار پایا جائے تو یہ اقرار اگر اختیاری ہو تو وہ شخص سچا مومن ہوگا اس میں سب کا اتفاق ہے اور اگر اقرار اضطراری ہو کہ خوف نہ ہوا تو اقرار کرلیں گے ورنہ انکار کرلیں گے یہ ہے منافقت اسلئے کہ وہ دل سے حقانیت کو پہچانتا بھی ہے لیکن پھر تکذیب بھی کرتا ہے۔

(۲) عرفان قلبی کے ساتھ انکار ہو لیکن وہ انکار اضطراری ہو تو وہ شخص مومن ہوگا کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ﴾ یعنی جس سے جبراً کفریہ کلمہ کہلایا گیا اور دل اسکا ایمان پر مطمئن ہو تو وہ کفر اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب عظیم سے مستثنیٰ ہے۔اگر انکار اختیاری ہوا تو وہ پکا کافر ہے کیونکہ اختیاری طور پر ایمان سے انکار میں سوائے کفر کے اور کوئی صورت نہیں۔

(۳) عرفان قلبی ہو اور سکوت ہو یعنی نہ اقرار ہو اور نہ انکار پھر اگر یہ سکوت اضطراری ہے کہ اسے اقرار کرنے میں خوف ہے اس کا خیال ہے کہ جبھی خوف زائل ہوگا میں اقرار کرلوں گا یہ مؤمن ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک شخص نے دلیل سے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اور دل سے تسلیم کرلیا لیکن زبان سے اقرار کی مہلت ہی نہ ملی وفات طاری ہوگئی تو وہ مومن ہے۔اگر یہ سکوت اختیاری ہے تو یہ محل بحث ہے لیکن زیادہ بہتر قول امام غزالی رحمہ اللہ کا ہے کہ وہ مومن ہے اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "یخرج من النار من کان فی قلبه مثقال ذرة من الایمان" جس آدمی کے دل میں ایک ذرہ بھر بھی

ایمان ہوا اللہ تعالیٰ اسے آگ سے نکال دے گا۔ اس شخص کا دل بھی نور ایمان سے بھرا ہوا ہے کیسے آگ سے نہیں نکلے گا۔

(۴) اعتقاد تقلیدی ہو اور اس کے ساتھ انکار ہو لیکن وہ انکار اختیاری ہو تو وہ شخص کافر ہے یعنی اس کا کفر یقینی ہے۔ اگر وہ انکار اضطراری ہو یعنی اسے اقرار میں خوف ہو تو اس شخص کو بھی مومن سمجھا جائے گا کیونکہ اس کے دل میں ایمان ہے۔

(۵) اعتقاد تقلیدی اور اسکے ساتھ اقرار ہو اور اقرار اختیاری ہو تو یہ مسئلہ اہل علم میں متنازع ہے تاہم صحیح یہ ہے کہ وہ مؤمن تو ہو گا لیکن اپنا اعتقاد بھی ضروری ہے فقط تقلید نہ ہو کیونکہ تقلید فروعی مسائل میں ہے اعتقادیات میں نہیں اگر اقرار اضطراری ہو تو یہ منافقت ہوگی۔

(۶) اعتقاد تقلیدی ہو اور سکوت اختیاری ہو اور ساتھ ساتھ اپنا اعتقاد بھی مل گیا تو وہ شخص مؤمن ہے جیسا کہ علامہ غزالی رحمہ اللہ کا قول پہلے بیان ہوا ہے اور اگر سکوت اضطراری ہوا تو وہ بھی مومن ہے کیونکہ اضطراری حالت ویسے ہی عذر ہے

(۷) انکار قلبی ہو اس کے ساتھ اقرار ہو زبان سے خواہ وہ اقرار اختیاری ہو یا اضطراری ہو یہ منافقت ہی ہے۔

(۸) انکار قلبی کے ساتھ زبانی انکار بھی پایا جائے تو وہ ہر حال میں کافر ہی ہے انکار کی کوئی صورت بھی ہو۔

(۹) انکار قلبی کے ساتھ سکوت پایا جائے وہ کافر ہے منافق نہیں کیونکہ منافق وہ ہوتا ہے جو اظہار بھی کرتا ہے۔

(۱۰) تمام اعتقادات سے اس کا دل خالی ہے زبان سے وہ ایمان کا اقرار کرتا ہو تو اسے کافر نہیں کہا جائے گا کیونکہ ایک تو اس کے ظاہر حال کا اعتبار ہوگا اور دوسرا ہو سکتا ہے وہ غور و فکر کر رہا ہو۔

(۱۱) قلب خالی ہو انکار ہو تو اس پر حکم کفر ثابت ہوگا کیونکہ ظاہراً اس کا انکار پایا گیا ہے۔

(۱۲) قلب خالی ہو اور سکوت ہو تو اس کو بھی کافر ہی سمجھا جائے گا جب تک قلب میں اعتقاد نہیں آتا تو حقیقی ایمان نہیں اور جب تک زبان سے اقرار نہیں تو ظاہری ایمان نہیں۔ (از...)

منافقت کی تین قسمیں:

(۱) خالص منافقت، یعنی منافقت میں اعلی اور اکمل ہونا کہ ایمان کو ظاہر کرے اور باطن میں صاف منکر ہو یعنی دل میں کفر ہو اور زبان پر ایمان ہو اس آیۃ کریمہ میں اسی منافقت کا ذکر ہے۔

(۲) ظاہر اور باطن میں متذبذب اور متردد ہو یعنی نہ ایمان پر یقین ہو اور نہ ہی کفر پر اعتبار ہو اسی حالت کو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿ مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ط ﴾ وہ اس کے درمیان متذبذب ہیں نہ ادھر کے ہیں نہ ادھر کے۔

(۳) اگر چہ وہ دل میں تصدیق تو رکھتے ہیں لیکن کثیر گناہوں اور دنیا کی بہت زیادہ محبت اور بے ایمان لوگوں کے برے اخلاق کے پائے جانے کی وجہ سے ان کا ایمان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

ایمان کا اصل مقصد یہ ہے کہ مؤمنین کو بلند ہمت حاصل ہو دنیا سے محبت کم ہو لذات نفسانیہ کو چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے اس کا ہر کام ہو قیامت کی فکر کرے اور ایسے عمل کرے کہ قیامت کے دن اسے بلند مرتبہ حاصل ہو جائے۔ لیکن جب کوئی شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دے آخرت کے عذاب کی اسے کوئی فکر نہ ہو دنیا کی تکالیف سے ہی بچنے کی کوشش میں رہے خواہ ان کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کرنے پڑیں ایسے لوگ کوتاہ ہمت ہوتے ہیں۔ اگر چہ یہ لوگ ہوتے تو مومن ہیں لیکن ان میں علامات منافقت پائی جاتی ہیں۔

(از عزیزی)

علاماتِ نفاق حدیث مبارکہ سے:

"عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ اربع من كن فيه كان منافقا خالصا ومن كانت فيه خلة كانت فيه خلة من نفاق حتى يدعها اذا حدث كذب واذا عاهد غدر واذا وعد اخلف واذا خاصم فجر"

"حضرت عبد اللہ بن عمرو کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص میں چار چیزیں پائی گئیں اسے منافقوں سے بہت زیادہ مشابہت حاصل ہوگی اور جس میں ان چار خصلتوں سے ایک خصلت بھی پائی گئی وہ منافقت کی خصلت ہوگی یہاں تک کہ ان کو چھوڑ دے (وہ چار یہ ہیں) جب بات کرے جھوٹ بولے جب معاہدہ کرے تو دھوکہ کرے اور جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب جھگڑا کرے تو گالی

نکالے'' (مسلم ج ۱ ص ۷۶ کتاب الایمان باب خصال المنافق)

وضاحت حدیث:

''وقد اجمع العلماء علی من کان مصدقا بقلبه ولسانه وفعل هذه الخصال لایحکم علیه بکفر ولایکون هو منافق یخلد فی النار''

''علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جس شخص کے دل میں تصدیق پائے جائے زبان سے بھی اقرار پایا جائے اور اس میں یہ چار کی چار عادات پائی جائیں وہ کافر نہیں اسے منافق نہیں کہا جاتا کہ وہ آگ میں ہمیشہ رہے''

پھر نبی کریم ﷺ کے ارشاد ''اربع من کن فیه کان منافقا خالصا'' کا کیا مطلب ہے حالانکہ اس کا ظاہری معنی تو یہی ہے کہ جس میں یہ چار خصلتیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے ''معناه شدید الشبه بالمنافقین بسبب هذه الخصال'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جس میں یہ چار خصلتیں پائی جائیں اسے منافقوں سے بہت زیادہ مشابہت حاصل ہوتی ہے (راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے)۔

بعض علماء نے ایک اور شاندار جواب بھی دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کی یہ بات ہے کیونکہ اس وقت یہ چار خصلتیں صرف منافقوں میں پائی جاتی تھیں مومنوں میں چار کا اجتماع کبھی نہیں ہوا البتہ بعد میں مسلمانوں میں بھی چار جمع ہونی شروع ہوگئیں اس لئے بعد والے مسلمانوں کے لحاظ پر وہی جواب ہوگا جو پہلے بیان کیا ہے ''اذا عاهد غدر'' معاہدہ عام ہے امانت رکھنا بھی معاہدہ میں آتا ہے جنگ کے معاہدہ میں دھوکہ کرنا بھی اسی ضمن میں آتا ہے ''اذا خاصم فجر'' فجور کا اصلی معنی میانہ روی سے پھر جانا یہاں مراد حق سے پھر جانا باطل اور جھوٹ کہنا تقریباً مراد یہ ہے کہ جب جھگڑا کرے تو بیہودہ لغو کلام کرے گالی گلوچ سے کام لے۔ (از نووی)

آیۂ کریمہ میں دو باطل فرقوں کا واضح رد:

جو شخص اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانے یعنی دل سے تصدیق نہ کرے اور اقرار کرے وہ مومن نہیں ہوسکتا اس پر ﴿وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ﴾ کی واضح دلالت پائی گئی ہے۔ اس سے کرامیہ فرقہ کا رد ہو گیا کیونکہ وہ اس قسم کے لوگوں کو مومن مانتے ہیں جو قرآن پاک کے سراسر مخالف ہے۔ ایک اور باطل فرقہ کا نظریہ یہ

ہے کہ ہر مکلف اللہ تعالیٰ کو پہچاننے والا ہوتا ہے۔اس لئے کہ انہوں نے جب اقرار کیا ہے تو ضروری ہے کہ ان کا اقرار ایمان ہو یہ نظریہ بھی باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب فرمایا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔تو یہ واضح ہے کہ انہوں نے اقرار تو کیا ہے لیکن پھر رب تعالیٰ نے فرمایا ''وہ مومن نہیں'' اس سے واضح ہو گیا کہ یہ کہنا باطل ہے کہ ہر مکلف اور اقرار کرنے والا ضرور مومن ہوتا ہے۔

منافق میں قباحتیں ہیں جو کافروں میں نہیں:

(۱) منافق دھوکہ بازی کا ارادہ رکھتا ہے لیکن کافر میں دھوکہ بازی نہیں۔

(۲) کافر میں مردوں والی عادت ہوتی ہے کہ وہ کھلی دشمنی کرتا ہے اور منافق میں خنثی والی عادات ہوتی ہیں کہ وہ اوپر سے اور ہوتا ہے اور اندر سے اور۔

(۳) کافر کو جھوٹ بولنے سے شرم آتی ہے وہ جھوٹ نہیں بولتا بلکہ سچی بات کرتا ہے منافق کو جھوٹ بولنے سے شرم نہیں آتی بلکہ وہ جھوٹ بولنے کو پسند کرتا ہے۔

(۴) منافق کافر بھی ہوتا ہے اور مسلمانوں سے استھزاء (مزاح کرنا) بھی کرتا ہے لیکن خالص کافر دشمنی تو مسلمانوں سے کرتا ہے لیکن استھزاء جیسا بیہودہ فعل نہیں کرتا اسی وجہ سے منافق کی سزا بھی رب تعالیٰ نے سخت مقرر کی ہے اور فرمایا ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ بیشک منافقین آگ کے سب سے نیچے درجہ میں ہوں گے۔

(۵) کافروں کا ذکر صرف دو آیتوں میں کیا گیا لیکن منافقین کا ذکر تیرہ آیات میں کیا گیا واضح ہوا کہ وہ زیادہ مذمت کے قابل تھے کیونکہ ان کے جرائم زیادہ تھے۔ (از کبیر)

ایمان میں صرف دو چیزوں کا ذکر کیوں؟

صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور آخرت پر ایمان لانے کا ذکر کیا ہے کہ مقصود اعظم ایمان میں یہی چیزیں ہیں کیونکہ ایمان کی ابتداء اور انتہاء کا جب ذکر کر دیا گیا تو دوسری چیزیں خود بخود اس میں آ گئی ہیں ضمناً ایک اور بات یہ سمجھ آ گئی کہ جب یہ منافقین اپنے آپ کو مومن اور سچا سمجھتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر بھی ان کو جھوٹا کہا ہے کہ وہ منافق ہیں تو یقیناً وہ لوگ جو اپنے آپ کو جھوٹا سمجھ کر

مسلمانوں سے استہزاء کریں گے اور منافقت سے کام لیں گے وہ ان سے بھی برے ہوں گے۔ (از بیضاوی)

نکتہ : انہوں نے کہا " آمنا " عقل کا تقاضا یہ تھا کہ کہا جاتا " وما آمنوا " (انہوں نے ایمان نہیں لایا) تا کہ دونوں جملوں میں ماضی کا ذکر ہوتا لیکن یہ کہا گیا ہے کہ ﴿ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ کیونکہ اس میں ان کا دعوی کامل طور پر رد کر دیا گیا ہے کہ وہ مومنوں کی گنتی سے ہی باہر ہیں صرف ماضی میں ان کے ایمان کی نفی میں اتنا مبالغہ نہیں جتنا "وما هم بمؤمنين "میں ہے۔ (از بیضاوی)

لفظی بحث: "من " تبعیضیہ ہے جس کا معنی "بعض" یا "کچھ"

الناس: (۱) یا مشتق ہے " ناس ،ینوس " سے جس کا معنی ہے حرکت کرنا اسی معنی میں حدیث ام زرع استعمال ہے "اناس من حلي اذني (اذ ناى "زیور سے میرے کانوں نے حرکت کی۔ اس معنی کے لحاظ پر انسان کو انسان کہنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ حرکت کرتا ہے۔

(۲) بعض نے کہا یہ مشتق ہے " نسی " سے ناس اصل میں " نسی " ہے پھر اس میں قلب یا " نيس " ہو گیا یا متحرک ماقبل فتحہ الف سے بدل دیا گیا "ناس" ہو گیا پھر الف لام اس پر داخل کیا تو " الناس " ہو گیا قال ابن عباس "نسی آدم عهد الله فسمی انسان " حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے اس لئے آپ کا نام انسان ہو گیا نبی کریم ﷺ نے فرمایا "نسی آدم فنسیت ذریته " آدم علیہ السلام بھولے اسی وجہ سے ان کی اولاد بھی بھولتی ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰی آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ ﴾ تحقیق ہم نے آدم علیہ السلام سے وعدہ لیا اس سے پہلے تو وہ بھول گئے۔ کسی شاعر نے کہا "سمیت انسان لانک ناسی " تیرا نام انسان رکھا گیا کیونکہ تو بھولنے والا ہے۔ ابو الفتح نے کہا:

نسیت عهدک و النسیان مغتفر — فاغفر فاول ناس اول الناس

میں تمہارا وعدہ بھول گیا بھول معاف کر دی جاتی ہے — معاف کر دو سب سے پہلے انسان ہی سب سے پہلے بھولے

یا اکثر الناس احسانا الی الناس — واکثر الناس افضالا علی الناس

سب لوگوں سے زیادہ لوگوں پر احسان کرنے والے — اکثر لوگوں کی مہربانیاں بھولنے والوں پر ہوتی ہیں

(۳) بعض نے کہا انسان کو انسان اس لئے کہا جاتا ہے کہ " لانسه بحوا " حضرت آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے حضرت حوا سے انس پکڑا۔ بعض نے کہا " لانسه بربه " اپنے رب تعالیٰ

سے محبت کرنے کی وجہ سے انسان کو انسان کہا گیا ہے۔ کسی شاعر نے کہا:

و ما سمي الانسان الا لانسه ولا القلب الا انه يتقلب

انسان کو اسی لئے انسان کہا گیا ہے کہ یہ محبت کرتا ہے اور قلب کو صرف اس لئے قلب کہا گیا ہے کہ یہ منقلب (پلٹتا) رہتا ہے

اس معنی کے لحاظ پر ہمزہ اصل ہوگا جب الف لام داخل ہوگا تو ہمزہ کو حذف کر دیا جائے گا ہمزہ اور الف لام دونوں کا اجتماع جائز نہیں یعنی "الا نــاس" نہیں کہا جائے گا۔ البتہ قلیل طور پر آ جاتا ہے جیسا کہ اس مصرع میں ہے:

"انا المنايا يطلعن على الاناس الآمنينا"۔

(۴) انسان کو انسان اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ظاہر ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ﴾ (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے) طور کی جانب آگ کو دیکھا یہ وجہ ایسی ہی ہے۔ جیسا کہ "جن" کو اسی لئے "جن" کہا جاتا ہے کہ وہ آنکھوں سے چھپا ہوتا ہے۔

(از قرطبی، کبیر، بیضاوی)

حقیقی منافقت اب نہیں:

"عن حذيفة قال انما النفاق كان على عهد رسول الله ﷺ فاما اليوم فانما هو الكفر او الايمان" رواه البخاری، مشکوۃ باب الکبائر وعلامات النفاق)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ منافقت نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھی اب یا کفر ہے یا ایمان اس منافقت سے مراد حقیقی منافقت ہے علامات نفاق اب بھی پائی جاتی ہیں جیسا کہ پہلے حدیث پاک سے واضح کیا جا چکا ہے:

" ان المصالح كانت مقتصرة على ذلك الزمان اما اليوم فلم تبق تلك المصالح فنحن ان علمنا انه كافر سرا قتلناه حتى يؤمن " (لمعات)

اس لئے کہ منافق جس مصلحت اور غرض کی وجہ سے منافقت کرتے تھے وہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے ساتھ ہی خاص تھی اب وہ مصلحت موجود نہیں اگر ہمیں معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص باطنی طور پر کافر ہے تو ہم اس چھپے ہوئے کافر سے لڑائی کریں گے یا وہ ایمان لے آئے نہیں تو ہم اسے قتل کر دیں گے۔ واضح ہوا کہ اب حقیقی منافقت نہیں۔

﴿ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ﴾

فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو، اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر وہ اپنی جانوں کو اور انہیں شعور نہیں۔

دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو، اور وہ دھوکہ نہیں دے رہے سوائے اپنی جانوں کے، اور انہیں محسوس نہیں ہو رہا۔

منافقین ظاہر طور پر ایمان والوں کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کرتے تھے اور اندرونی طور پر کافر تھے، وہ اپنی اس چالبازی سے یہ سمجھتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ، فریب دے رہے، اسے ہماری اس حرکت کا پتہ ہی نہیں، اسی طرح وہ اپنے گمان میں یہ خیال کر رہے تھے کہ ہماری چالبازیوں سے مومنین بے خبر ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ اپنے لئے سخت سے سخت عذاب کا سامان پیدا کر رہے تھے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ دھوکہ نہیں دے رہے تھے سوائے اپنی جانوں کے، یعنی ان کے دھوکہ کا کسی کو کوئی نقصان نہیں تھا، نقصان تو وہ اپنا ہی کر رہے تھے۔ وہ اپنے خیال میں بڑے سمجھ دار بن رہے تھے، لیکن درحقیقت بے سمجھ تھے۔

یُخَادِعُوْنَ ، الخ : خدع بری چیز ہے، اسلئے ضروری تھا کہ منافقین کی اس حرکت کو ذکر کر کے بے نقاب کیا جائے تا کہ دوسرے ایسا نہ کریں، اور ان کو معلوم ہو جائے کہ خدع کیا ہے۔

''خدع'' کا اصلی معنی ہے مخفی رکھنا، اسی لئے خزانہ کو ''مخدع'' (مخفی رکھنے کی جگہ) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح گردن میں دو مخفی رگوں کو ''اخدعان'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے۔ ''خدع الضب'' جب کہ گوہ اپنے بل میں چھپ جائے، کبھی کبھی باہر نکلے، اسی طرح وہ راستہ جو مقصد کے خلاف ہو جسے عقلمند شخص بھی نہ سمجھ سکے، اسے طریق خادع، یا، طریق خیدع کہا جاتا ہے

اصطلاح میں ''خدع'' یہ ہے کہ ظاہر وہ چیز کرنا جس میں سلامتی ہو، اور وہی درست راہ ہو، لیکن

در پردہ غیر کو نقصان پہنچانے کی راہ کو اختیار کیا جائے، ظاہر طور پر اپنا بن کر در پردہ دشمنی کی جائے۔

یہ حقیقی منافقت تو نہیں، البتہ منافقوں کی مشابہت ہے، اس لئے کہ حقیقی منافقت میں ظاہر طور پر ایمان اور در پردہ کفر کا پایا جانا ضروری ہے۔ یعنی صرف ظاہری دوستی، باطنی دشمنی حقیقی منافقت نہیں۔

ایسے ہی ریاء کاری کے طور پر اچھے اعمال کرنا بھی علامت نفاق ہے، اگرچہ حقیقی منافقت کہنا ممکن نہیں۔

منافقت غیر حقیقی کیلئے ضابطہ:

جیسا کہ واضح ہو چکا ہے کہ منافقت حقیقی کی تو صرف ایک ہی صورت ہے، لیکن منافقت غیر حقیقی یعنی انداز منافقانہ کی کئی صورتیں ہیں۔ اس لئے اس کے لئے یہ ضابطہ یاد کر لیا جائے تو خود بخود انسان سمجھ لے گا کہ یہ منافقت ہے۔

وہ ضابطہ یہ ہے۔ ہر وہ چیز جو دین کے مخالف ہو، اسے چھپا کر رکھنا، اور اس کے مخالف چیز کو ظاہر کرنا نفاق ہے۔

اللہ تعالیٰ دین کی استقامت کو پسند کرتا ہے۔ اس میں استقامت نہ ہو تو نفاق ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ عبادت میں خلوص کو پسند کرتا ہے۔ خلوص نہ ہو تو منافقت ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ چاہتا ہے دھوکہ نہ دیا جائے، لہٰذا کسی کو دھوکہ دینا منافقت ہے۔

اسی لئے وہ حدیث مدلس کہلاتی ہے۔ جس کا راوی یہ ظاہر کرے کہ یہ حدیث اس نے فلاں سے سنی ہے۔ حالانکہ اس سے سنی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر ظاہر طور پر کہہ دے میں فلاں کا نام تو لے رہا ہوں، لیکن میں نے اس سے یہ حدیث سنی نہیں، یہ تدلیس نہیں، البتہ اعلانیہ کذب ہے۔

اعتراض: ''یخادعون'' باب مفاعلہ سے ہے جو جانبین سے فعل کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کا ظاہری طور پر تو یہ معنی ہے۔ کہ وہ اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اور اللہ ان کو دھوکہ دیتا ہے۔

یہ دونوں معنی مراد لینے درست نہیں، وہ رب تعالیٰ کو دھوکہ دے نہیں سکتے، اور اللہ تعالیٰ کی شان

کے لائق نہیں کہ وہ دھوکہ دے۔ رب تعالیٰ کو دھوکہ کیوں نہیں دیا جا سکتا؟ اس لئے کہ " انه تعالیٰ یعلم الضمائر والسرائر " بیشک اللہ تعالیٰ چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے دل کے رازوں پر مطلع ہے اسے دھوکہ کیسے دیا جائے اس لئے کہ "خادع " (دھوکہ دینے والا) تو وہ ہوتا ہے جو ظاہر اور کرے اور باطن میں اور رکھے وہ کون سی چیز ہے جسے رب تعالیٰ سے چھپایا جا سکتا ہے:

" فاذا كان الله تعالى لا يخفي عليه البواطن لم يصح ان يخادع "

''جب اللہ تعالیٰ پر باطن کو مخفی نہیں تو اسے دھوکہ بھی نہیں دیا جا سکتا''

دوسری وجہ یہ تھی کہ منافقوں کا یہ عقیدہ ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رسول بھیجا ہے ان کا یہ عقیدہ ہوتا تو وہ دھوکہ دیتے اس لئے " فلم يكن قصدهم في نفاقهم مخادعة الله تعالى'' ان کا منافقت کرنے میں اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا کسی طرح بھی مقصود نہیں ہو سکتا۔ "خدع " کا استعمال یہاں کس طرح درست ہے؟ جب کہ دونوں جانب سے "خدع " درست نہیں۔

جواب: " لا يمكن اجراء هذا اللفظ على ظاهره بل لا بدمن التاويل " اس لفظ کو ظاہر پر رکھنا تو ممکن نہیں اسلئے ضروری ہے کہ اس کی تاویل کی جائے یعنی جب حقیقی معنی کے لحاظ یہ لفظ استعمال نہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی مجازی معنی ضروری طور پر لیا جائے گا اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) " صورة حالهم مع الله حيث يظهرون الايمان وهم كافرون صورة من يخادع" وہ چونکہ ایمان کو ظاہر کر رہے تھے حالانکہ واقع میں کافر تھے وہ اپنے خیال میں اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے رہے تھے کیونکہ ان کا طریقہ دھوکہ دینے والوں کا تھا۔ یعنی اسی چیز کو آپ اس طرح بیان کر دیں جس طرح یہ عبارت کبیر کی واضح کر رہی ہے کہ ان کا ''خدع'' رب تعالیٰ سے حقیقی طور پر نہیں تھا بلکہ ان کا طریقہ "خادعین " (دھوکہ دینے والوں) کا تھا ''خدع'' کی صورت کو ''خدع'' کہہ دیا یا یوں بیان کیا جائے جیسا کہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان کیا "یخادعونه عند انفسهم وعلى ظنهم " وہ اپنی طرف سے اور اپنے خیال کی مطابق اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔

(۲) ''انه تعالىٰ ذكر نفسه وارادبه رسوله على عادته في تفخيم وتعظيم شانه " بیشک اللہ تعالیٰ نے ذکر اپنا فرمایا ہے لیکن مراد اس سے رسول ﷺ لئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ

(جو اس کی شان کے لائق ہے) یہ ہے کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی طرف منسوب ہونے والی چیزوں کو اپنی طرف کرتا ہے تاکہ نبی کریم ﷺ کی شان کی بلندی اور عظمت واضح ہو جائے جیسا کہ فرمایا ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ﴾ بیشک وہ لوگ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں یعنی منافقوں کا اپنے خیال میں رسول اللہ ﷺ کو دھوکہ دینے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمادیا تاکہ آپ کی عظمت واضح ہو جائے۔ (از کبیر)

میری برادری کے لوگ اپنے ہی مفتی محمد شفیع دیوبندی صاحب کی اسی بحث میں اس عبارت کو ضرور پڑھیں۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے رسول یا ولی کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کے حکم میں ہے دوسری طرف آنحضرت ﷺ کی رفعتِ شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ آپ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسا اللہ جل شانہ کی شان میں گستاخی جرم ہے۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۱۲۹)

اعتراض کی دوسری شق کا جواب:

جو یہ کہا گیا ہے کہ مخادعۃ جانبین سے ہوتی ہے تو معنی یہ کیسے صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان سے دھوکہ کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہی نہیں کہ وہ دھوکہ کرے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ باب مفاعلہ میں کبھی جانبین کا معنی نہیں پایا جاتا جیسا کوئی حاکم کہے "عاقبت اللص" میں نے چور کو سزا دی اس میں صرف اتنا ہی معنی ہے یہ معنی درست نہیں کہ "چور نے مجھے بھی سزا دی"۔ دوسرا جواب یہ ہے "صورة صنيع الله معهم حيث امر باجراء احكام المسلمين عليهم وهم عنده فى عداد الكفرة" منافقین اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافروں میں شمار تھے لیکن کچھ دیر کے لئے ان پر مسلمانوں والے احکام جاری کرنے کا حکم دیا گیا اس ظاہری صورت کو مجازی طور پر مخادعت سے تعبیر کر دیا گیا۔ پہلا جواب ہی زیادہ قوی ہے کیونکہ اس کی ابوحیوۃ کی قراءت تائید کر رہی ہے کیونکہ اس قراءت میں "یخدعون" باب فتح سے ہے مفاعلہ سے نہیں۔ (از کبیر)

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ :

''وہ دھوکہ کسی ایک کو بھی نہیں دے رہے سوائے اپنی جانوں کے''

" فانہ لا یخفی علی اللہ خافیۃ وھو یطلع نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم والمؤمنین فھم غروا انفسھم "

ان کا دھوکہ رب تعالیٰ کو دینا ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کو بھی وہ دھوکہ نہیں دے سکتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بذریعہ وحی مطلع فرما دیا۔ اس لئے وہ دھوکہ درحقیقت اپنے آپ کو دے رہے تھے وہ بظاہر طور پر مطمئن تھے کہ ہمیں عذاب نہیں ہوگا حالانکہ وہ عذاب الیم کے مستحق ہیں۔ اسی طرح جب ایک ایک منافق کا نام لے کر ان کو مسجد سے نکال دیا گیا رسوائی ان کو حاصل ہوئی تو ان کے دھوکہ دینے کا وبال جب ان کو ہی حاصل ہوا تو انہوں نے دھوکہ اپنے آپ کو ہی دیا۔ (از مظہری)

تنبیہ : اگرچہ بعض ایمان والوں کو دھوکہ دینا تو ممکن تھا لیکن تمام ایمان والوں کو دھوکہ دینا ممکن نہیں تھا بعض کو دھوکہ بھی ایک وقت کے لئے ممکن تھا۔

اسی طرح یہ بھی خیال رہے کہ ایمان والے کسی کو دھوکہ نہیں دیتے ان کی شان کے لائق ہی نہیں کہ وہ دھوکہ بازی کریں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ کے متعلق فرمایا " کان اعقل من ان یخدع وافضل من ان یخدع " اگر "یخدع" کو مجہول پڑھا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ آپ عقل مند تھے آپ افضل تھے آپ کو دھوکہ دیا جانا ممکن نہیں تھا اگر معروف پڑھا جائے تو پھر معنی یہ ہوگا کہ آپ عقل مند اور افضل تھے کسی کو دھوکہ دینا آپ کی شان کے لائق نہیں تھا نبی کریم ﷺ نے فرمایا " المؤمن غر کریم " مؤمن امتیازی شان رکھنے والا کریم ہے اس سے بھی واضح ہوا کہ مؤمن کسی سے دھوکہ نہیں کرتا اس لئے کہ " ان الا نخداع یدل علی البلہ " بیشک دھوکہ دینا بے وقوفی ہے مؤمن عقل مند ہے بے وقوف نہیں۔ (از روح المعانی)

وَمَا يَشْعُرُوْنَ : ''ان کو شعور ہی نہیں''

" انھم یخدعونھا او ان اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون او اطلاع اللہ تعالیٰ نبیہ ﷺ علی خداعھم وکذبھم "

ان کو یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ ہم کسی اور کو دھوکہ نہیں دے رہے بلکہ اپنی ہی جانوں کو دھوکہ

دے رہے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر ظاہر اور باطن کو جانتا ہے اور اپنے نبی کریم ﷺ کو بھی ہمارے دھوکہ اور کذب بیانی سے مطلع کر رہا ہے۔ (از روح المعانی)

" ان وبال ذلک الخداع راجع الیھم لان اللہ تعالیٰ یطلع علی نبیہ ﷺ علی نفاقھم فیفتضحون فی الدنیا ویستوجبون العقاب فی العقبی " (خازن)

" ان کے دھوکہ کا وبال ان کی طرف ہی لوٹ رہا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کو ان کے نفاق سے مطلع فرمارہا تھا وہ دنیا میں بھی رسوا ہو رہے تھے اور آخرت میں بھی عذاب کے مستحق ہوں گے "

نکتہ : وما یشعرون اگرچہ مطلقاً لا یعقلون (وہ سمجھ نہیں رکھتے) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہتا ہے لیکن حقیقی معنی شعور کا حواس سے محسوس کرنا اور جو چیز محسوس ہو وہ بدیہی کے درجہ میں ہوتی ہے " ومن لایشعر بالبدیھی المحسوس مرتبتہ ادنی مرتبۃ من البھائم " اس سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ منافقین کا مرتبہ چوپاؤں سے بھی کم ہے کہ انہیں محسوس بدیہی کا بھی شعور نہیں اور شعور کی نفی سے علم کی نفی بھی ہو جاتی ہے اس لئے " وما یشعرون " میں بنسبت " وما یعلمون " کے زیادہ مبالغہ ہے۔ (از بیضاوی و خفاجی)

تنبیہ : ابھی تک جو بحث کی اس سے یہ واضح ہوا کہ منافقین اپنے خیال اور گمان کے مطابق اللہ تعالیٰ اور ایمان والوں کو دھوکہ دینا چاہتے تھے یا نبی کریم ﷺ اور ایمان والوں کو دھوکہ دینا چاہتے تھے حقیقت میں وہ کسی ایک کو بھی دھوکہ نہیں دے سکتے تھے یہ بات سمجھنے کے بعد تراجم کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ بہت عظیم ہے۔

يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا :

" چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں " (اشرف علی صاحب)

" فریب دیتے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو کہ ایمان لائے " (شاہ رفیع الدین صاحب)

" دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے " (شاہ عبدالقادر صاحب)

" وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں " (مودودی صاحب)

" فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو " (مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

﴿ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ﴾

☆ ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بدلہ ان کے جھوٹ کا

☆ ان کے دلوں میں فساد ہے تو اللہ نے ان کے فساد کو بڑھا دیا اور ان کے لئے درد ناک عذاب ہے بوجہ ان کے جھوٹ کے

مرض کی دو قسمیں: مرض حقیقی اور مرض مجازی۔

مرض حقیقی: یہ ہے کہ وہ بدن کو عارض ہو خاص اعتدال سے نکال دے اور افعال میں خلل پیدا کرے

مرض مجازی: یہ ہے کہ اعراض نفسانیہ کے کمال میں خلل پیدا کرے جیسے جہالت، بدعقیدگی، حسد، کینہ وغیرہ یعنی ہر قسم کی بری صفات جو گناہوں کا سبب بنیں۔

مرض حقیقی اور مجازی میں مشابہت:

مرض حقیقی کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ مرض بدن کو اعتدال سے نکال دے جو اس کے لائق ہے اور افعال میں خلل پیدا کرے یعنی ہر عضو جو اپنی درست حالت میں کام کرتا ہے اس میں خلل آ جائے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ مرض سے حیات جسمانیہ میں ہلاکت آ جائے یعنی انسان پر مرض سے موت طاری ہو جائے اسی طرح مرض مجازی کی بھی دو ہی قسمیں ہیں ایک یہ کہ مرض انسان کو فضائل دینیہ کے حاصل کرنے کے کمال سے مانع ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طاعت اور دین کے ہر پسندیدہ راستہ سے دور کرنے کا ذریعہ بنے اور خلل پیدا کرے اور دوسری قسم یہ ہے کہ وہ مرض

مجازی انسان کی ابدی زندگی سے موت کی طرف لے جائے یعنی کفر تک پہنچا دے جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ﴾ زندہ اور مردہ برابر نہیں یعنی مومن اور کافر برابر نہیں اس آیت میں زندہ سے مراد مومن اور مردہ سے مراد کافر ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

منافقین کی مرض میں اقوال:

منافقین کے دلوں میں مرض کو ذکر فرمایا اس مرض سے مراد کیا ہے؟ اس میں کئی اقوال ہیں "مرض ای شک ونفاق" مرض سے مراد شک اور نفاق ہے شک کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں میں متردد ہونا جیسا کہ حدیث پاک میں ان کے تردد کو ذکر کیا گیا:

"عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ مثل المنافق کالشاة العائرة بین الغنمین تعیر الی هذه مرة والی هذه مرة" (رواه مسلم، مشکوة باب الکبائر النفاق)

"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی مثال ایسے ہے جیسے بکری نر کی تلاش میں دو بکریوں کے درمیان متردد ہو کبھی اس کی طرف جائے اور کبھی اس کی طرف"

متردد کو مریض اس لئے کہا گیا ہے کہ مریض موت وحیات میں متردد ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مرض ضد ہے صحت کی۔ اسی طرح فساد کو بھی صحت کے مقابل استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا ان کے دلوں میں مرض کہہ کر یہ ثابت کیا کہ ان کو صحت حاصل نہیں بلکہ ان کو فساد حاصل ہے۔ یعنی ہر قسم کے فساد کو مرض سے تعبیر کر دیا جاتا ہے اور جب مرض کا معنی نفاق لیا جائے تو اس کا بھی یہی مطلب ہوگا کہ ان کے دلوں میں فساد ہے۔ (از مدارک للنسفی) مرض کو بعض حضرات نے انکار کے معنی میں لیا اور بعض نے تکذیب کے معنی میں لیا اور بعض نے رجس (ناپاکی) کے معنی میں لیا۔ (از قرطبی)

بعض حضرات نے مرض کو ریاء (دکھلاوا) کے معنی میں لیا ہے بعض نے کہا مرض سے مراد دین میں مرض کا لاحق ہونا بعض نے کہا مرض کا معنی شر ہے بعض نے کہا مرض کا معنی ضلالت ہے۔ (از ابن کثیر)

تمام اقوال کا مطلب ایک:

"والمرض عبارة مستعارة للفساد الذی فی عقائدهم" (قرطبی) مرض کا مجازی

معنی مراد ہے یعنی ان کے عقائد میں پایا جانے والا فساد ان کے دلوں میں مرض سے تعبیر کر دیا گیا وہ فساد نفاق کی وجہ سے تھا وہ فساد شک کی وجہ سے تھا۔ وہ فساد انکار کی وجہ سے تھا وہ فساد تکذیب کی وجہ سے تھا وہ فساد ریاء کاری کی وجہ سے تھا وہ فساد دین میں خرابیوں کی وجہ سے تھا وہ فساد ان کے شرکی وجہ سے تھا وہ فساد ان کی ضلالت (گمراہی) کی وجہ سے تھا۔ یعنی تمام معنی اس معنی میں موجود ہیں کہ ان کے دلوں میں فساد تھا ان کا عقیدہ ظاہر کے خلاف تھا۔

جب واضح ہو گیا کہ مرض سے مراد عام ہے خواہ وہ بیماری کی وجہ سے صحت سے نکال دے یا نفاق کی وجہ سے صحت سے نکال دے یا امر دینیہ میں تقصیر (کوتاہی) کی وجہ سے حد اعتدال سے نکال دے

اعتراض: قرآن کے متعلق تو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ﴾ یہ لوگوں کیلئے شفا ہے جب منافق قرآن پاک بھی پڑھتے تھے تو ان کے دلوں کو شفاء کیوں نہ حاصل ہوئی۔

جواب: " لانهم لما ابغضوه لم يستعملوا النظر فيه "اس لئے کہ انہوں نے جب قرآن پاک سے بغض رکھا تو اس میں نظر کو استعمال ہی نہیں کیا کہ قرآن پاک ان کو سمجھ آتا یعنی بغض، حسد، عناد نے ان کو سوچنے، سمجھنے کی طاقت سے دور کر دیا تھا لہذا واضح ہوا کہ قرآن پاک میں شفا تو ہے لیکن اس سے شفا حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح کوئی دوا کسی مرض کے لئے مفید ہو تو دوا کو استعمال کرنا اور پرہیز کرنا اس سے نفع حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ (از تبصیر الرحمن)

وجہ مرض کیا تھی؟ منافقین کے دلوں میں مرض کی وجہ یہ تھی:

" ان المنافقين مرضت قلوبهم لما راؤا ثبات امر النبی ﷺ واستعلاء شانه يوما فيوما وذلک کان يؤثر فی زوال رياستهم "

بیشک منافقین کے دلوں میں مرض اس لئے آ گئی تھی کہ جب انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کا معاملہ روز بروز پختہ ہی ہو رہا ہے آپ کی شان تو دن بدن بڑھ رہی ہے اب ہمیں تو سرداری کے ملنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تو انکے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی ہر طرح کی چالبازیوں اور فساد سے وہ فتنے برپا کرنے لگے یعنی صرف ریاست کے زوال کی وجہ سے حسد تھا۔ اسی پر ایک روایت بھی شاہد ہے:

" روى انه عليه السلام مر بعبد الله بن ابى بن سلول على حمار فقال

له نح حمارک یامحمد فقد آذنتی ریحه فقال له بعض الانصار اعذره یارسول الله فقد کنا عزمنا علی ان نتوجه الریاسة قبل ان تقدم علینا "
روایت بیان کی گئی کہ بیشک نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ عبداللہ بن ابی بن سلول کے قریب سے اپنے گدھے پر سوار ہوکر گزرے تو اس نے کہا اے محمد اپنے گدھے کو یہاں سے ہٹالو اس کی بو نے مجھے تکلیف پہنچادی بعض انصار نے کہا یارسول اللہ اسے معذور سمجھیں (یہ غم میں مبتلا ہے) کیونکہ آپ کے تشریف لانے سے پہلے ہم نے اسے اپنا سردار بنانے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا

یعنی آپ کے آنے سے اس کی سرداری کا زوال ہوگیا تو یہ بیچارہ اس کے غم میں حسد کی آگ میں جل رہا ہے۔ لیکن خیال رہے کہ یہ مشورہ بعض حلیم حضرات کا تھا لیکن بعض جوشیلے صحابہ کرام نے اسے کہا خبردار منہ کو بند رکھو نبی کریم ﷺ کے گدھے کے پیشاب کی بو کستوری کی خوشبو سے اچھی ہے۔ اس طرح دونوں طرف سے تکرار پر لڑائی ہوگئی چھتر اور لاٹھیاں چل گئیں نبی کریم ﷺ نے اپنے اخلاق کریمانہ سے بچ بچاؤ کرادیا مکمل تفصیل مسلم شریف میں دیکھی جائے۔

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا: "انکی مرض کو اللہ تعالیٰ نے اور زیادہ کردیا" اس کا مطلب بھی یہی ہے۔

" زادهم الله غما علی غمهم بما یزید فی اعلاء امر النبی ﷺ وتعظیم شانه "
کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غموں پر غم پہنچادیئے کیونکہ ان کے غمناک ہونے کی وجہ نبی کریم ﷺ کی شان کی رفعت تھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی رفعت کو روز بروز بڑھانے اور آپ کی تعظیم شان میں زیادتی فرمانے سے ان کے غم میں زیادتی ہونے لگی یہی وجہ تھی ان کی مرض کی زیادتی کی۔ (از کبیر)

ذرا غور کریں تو آج بھی عبداللہ بن ابی کی ذریت معنوی میں کوئی کمی نظر نہیں آئے گی نبی کریم ﷺ کی شان سے لوگ جل اٹھتے ہیں کہیں یارسول اللہ کہنے سے درد لاحق ہوتا کہیں آپ کو شفیع کہنے سے پریشان رب تعالیٰ جب مصطفےٰ کریم کی شان کو زیادہ فرمانے کا وعدہ ﴿ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ﴾ سے کرچکا ہے تو کسی کے جلنے سے کیا ہوگا

مٹ گئے مٹ جائیں گے سب اعداء تیرے
نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

نکتہ: فی قلوبھم مرض کہا ہے یہ نہیں کہا " قلوبهم مرضی " (ان کے دل مریض ہیں)

جملہ ظرفیہ ذکر کر کے اشارہ کیا کہ ان کی مرض عارضی تھی دل اس کی جائے قرار تھا البتہ وہ دل میں راسخ ہوگئی تھی کیونکہ اس کے اسباب یعنی حسد، کینہ، کھوٹ کو وہ دل سے نہیں نکال رہے تھے۔ اسی جملہ سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ازلی کافروں کی طرح نہیں تھے کہ جن کے متعلق فرمایا " لا یؤمنون" وہ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ یہ اسباب کو زائل کر دیں تو مخلص ایمان والے ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کئی منافقین نے نفاق کو چھوڑ دیا تھا اور مخلصین ہو گئے۔ (از ابن عربی)

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

"الیم" فعیل کے وزن پر ہے یہ کبھی فاعل کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی مفعول کے معنی میں زیادہ مفسرین نے اسے مفعول کے معنی میں لیا ہے درد پہنچایا ہوا لیکن یہ صفت عذاب کی نہیں بلکہ اس شخص کی ہے جسے عذاب دیا جانا ہے عذاب کی صفت یہاں کیسے ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مبالغہ ثابت کرنے کے لئے عذاب کے شدید دردناک ہونے کو بیان کرنے کے لئے الیم کو مفعول کے معنی میں لیتے ہوئے عذاب کی صفت بنا دیا گیا ہے " وجه المبالغة افادة ان الالم بلغ الغاية حتى سرى من المعذب الى العذاب المتعلق له " مبالغہ کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس شخص کو عذاب اتنا شدید درد پہنچائے گا کہ وہ درد خود اس عذاب میں بھی پہنچ جائے گا۔ تاہم فاعل کے معنی میں بھی استعمال ہے خطیب میں یہی ذکر کیا گیا "ويجوز كسر لام مولم كسميع بمعنى مسمع " یعنی الیم بمعنی مولم ہے جس طرح مفسرین نے مولم کے لام پر فتحہ (زبر) پڑھ کے مفعول کا معنی لیا ہے اسی طرح مولم کے لام کے نیچے کسرہ (زیر) پڑھ کر فاعل کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے اس وقت " الیم " کا لفظ صفت "عذاب" کی ہوگا یعنی لفظی اور معنوی دونوں صورتوں میں اب معنی ہوگا ان کو عذاب ہوگا جو درد پہنچانے والا ہوگا پہلی صورت میں معنی ہوگا ان کو عذاب ہوگا جس سے وہ درد پہنچائے جائیں گے۔

بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ:

باء میں دو احتمال ہیں کہ یہ مقابلہ کے لئے ہے یا سبب کیلئے ہے ان دونوں کو قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے یوں بیان فرمایا" والمعنى بسبب كذبهم او ببدله جزاء لهم " یعنی یا معنی یہ کیا جائے کہ

ان کو دردناک عذاب ہوگا بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے اور یا یہ معنی کیا جائے کہ ان کو دردناک ہوگا ان کے جھوٹ کے بدلے (از بیضاوی) " مـــا " مصدریہ ہے اس طرح معنی مختصر ہو سکتا ہے ان کو دردناک عذاب ہوگا بوجہ جھوٹ کے۔

یَکْذِبُوْنَ: میں دو قراءتیں ہیں ثلاثی مجرد باب ضرب سے معنی ہوگا جھوٹ بولنا یعنی انہوں نے جو یہ کہا تھا ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ﴿ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر﴾ یہ ان کا کہنا جھوٹ تھا۔ دوسری قراءت میں ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل سے ہے اس کے لحاظ پر معنی یہ ہے کہ ان کو دردناک عذاب ہوگا بوجہ تکذیب کے (از مظہری) تاہم ان کے دونوں حال تھے جھوٹے بھی تھے اور نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک کی تکذیب بھی کرتے تھے یہی قرآن پاک کی عظمت ہے کہ ایک ہی لفظ سے کئی مسائل بیان کر دیئے جاتے ہیں۔

اعتراض: " کـــانوا " سے زمانہ ماضی سمجھ آ رہا ہے اور یکذبون سے زمانہ حال یا استقبال سمجھ آ رہا ہے ایک ہی جگہ ان کو کیسے جمع کیا گیا۔

جواب: کان جمیع زمانوں کے استمرار پر دلالت کرتا ہے اور مضارع استمرار تجدد پر دلالت کرتا ہے اور "ما" کا مصدریہ ہونا بھی بیان کر دیا گیا ہے اب واضح ہے کہ ان کے جھوٹ کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے خواہ وہ ماضی میں ہو یا مستقبل میں ہو۔ (از روح المعانی)

منافقین عذاب کے مستحق تھے:

" بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ " سے یہ واضح کر دیا کہ منافقین کو دردناک عذاب بلاوجہ نہیں ہوگا بلکہ جھوٹ بول کر انہوں نے اپنے آپ کو دردناک عذاب کا مستحق بنا لیا تھا۔ خاص کر جب وہ جھوٹ اس ذات کے سامنے بول رہے جو سید الانبیاء اور سید الکائنات ہیں تو یقیناً وہ شدید دردناک عذاب کے مستحق ہو گئے اور نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنے کی وجہ سے بھی وہ اس کے حقدار تھے کہ ان کو دردناک عذاب ہی دیا جائے۔

کذب کی مذمت احادیث مبارکہ سے:

" عن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ ان الصدق یهدی الی البر وان

البر یھدی الی الجنة وان الرجل لیصدق حتی یکتب عند اللہ صدیقا وان الکذب یھدی الی الفجور وان الفجور یھدی الی النار وان الرجل لیکذب حتی یکتب عند اللہ کذابا " (مسلم ج ۲ ص ۳۳۳)

" حضرت عبداللہ (ابن مسعود) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک صدق نیکی کی راہنمائی کرتا ہے اور بیشک نیکی جنت کی ہدایت دیتی ہے اور بیشک ایک شخص سچ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے صدیق لکھ دیا جاتا ہے اور بیشک کذب گناہوں کی راہنمائی کرتا ہے اور گناہ آگ (جہنم) میں پہنچانے کا ذریعہ ہیں اور بیشک انسان جھوٹ بولتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے کذاب لکھ دیا جاتا ہے"

" البر جامع للخیر کلہ " ہر قسم کی بھلائی جس میں جمع ہو اس نیکی کا نام "بر" ہے مطلب واضح ہے کہ سچ سے نیک اعمال حاصل ہوتے ہیں اور نیک اعمال سے جنت حاصل ہوتی ہے سچا انسان اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوتا ہے یہاں تک کہ اسے مقام صدیقیت حاصل ہو جاتا ہے "الفجور ھو المیل عن الاستقامة وقیل الانبعاث فی المعاصی " درست راہ سے ہٹ جانے کا نام فجور ہے اسی طرح گناہوں پر ابھارنے والے اسباب کو بھی فجور کہتے ہیں۔

جھوٹا شخص کتنا بدبخت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کے جھوٹ کے چرچے ہوتے ہیں اور اسے رب تعالیٰ کے ہاں کذاب کا لقب دے دیا جاتا ہے:

" وفی روایة علیکم بالصدق فان الصدق یھدی الی البر وایاکم والکذب "

"ایک روایت میں ہے کہ تم پر صدق لازم ہے بیشک سچ نیکیوں کی راہنمائی کرتا ہے اور تم جھوٹ سے بچ کر رہو"

" وفی روایة یستحری الصدق ویستحری الکذب " یعنی جو شخص سچ میں کوشش کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے اور جو شخص کذب میں کوشش کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔

ان روایات سے واضح ہوا کہ سچ میں انسان کوشش کرے سچ بولنا ہی اس کا مقصود ہو اور وہی معتبر ہو اور کذب سے بچنا ضروری ہے اور کذب سے بچنے میں تساہل (سستی) کرنا بھی برا ہے اس لئے کہ

اس سستی کی وجہ سے انسان کثیر جھوٹ بولنے کا عادی بن جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے اور کذاب کا لقب اسے مل جاتا ہے۔ یہاں صدیق اور کذاب میں لکھنے کا کیا مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو اس کا شقی ہونا یا سعید ہونا پہلے سے ہی لکھا ہوتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یہ صفت ملأ اعلیٰ میں مشہور ہو جاتی ہے۔ سچے شخص کا سچ اور جھوٹے شخص کا جھوٹ آسمانوں میں مشہور ہو جاتا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ " **یلقی ذلک فی قلوب الناس والسنتھم کمایوضع له القبول والبغضاء** " کہ سچ کو جس طرح مقام قبولیت حاصل ہوتا ہے اسی طرح سچے انسان کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے اور لوگوں کی زبانوں پر اس کا چرچا ہوتا ہے یعنی سچے انسان کا لوگ ذکر خیر کرتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں اور جھوٹ سے جس طرح نفرت اور ناپسندیدگی رب تعالیٰ کو اور فرشتوں کو ہوتی ہے اسی طرح لوگوں کے دلوں میں بھی اسے ڈال دیا جاتا ہے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں اور جب بھی کہیں اس کا ذکر کرتے ہیں تو جھوٹا کہہ کر ہی یاد کرتے ہیں۔ (از نووی)

☆ " **وقال ابو امامة قال رسول الله ﷺ ان الکذب باب من ابواب النفاق** "

(احیاء العلوم ج ۳ ص ۸۲)

ابوامامہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک جھوٹ منافقت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جیسا کہ پہلے ایک حدیث کو بیان کیا جا چکا ہے کہ جھوٹ منافقت کی علامت ہے اور جھوٹ کی عادت (العیاذ باللہ) حقیقی منافقت کی طرف پہنچانے کا ذریعہ بھی ہے۔ اس لئے کہ جن کافروں نے جھوٹ کو برا سمجھا اور جھوٹ بولنا اپنے لئے عار سمجھا وہ کھلے کافر ہے لیکن جن کافروں نے جھوٹ کی کوئی پرواہ نہیں کی وہ ہی منافق ہوئے۔

☆ " **وقال علیه السلام الکذب ینقص الرزق** " (احیاء العلوم ج ۳ ص ۸۲)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جھوٹ رزق کو کم کرتا ہے۔ یعنی جھوٹ کی وجہ سے خیر و برکت میں کمی آجاتی ہے رب تعالیٰ کی ناراضگی ہوتی ہے جس کی وجہ سے مخلوق بھی اس پر اعتبار نہیں کرتی اس کے لین دین کا تعلق لوگ ختم کر لیتے ہیں اس طرح اسے خسارہ ہوتا ہے اور رزق بھی یقیناً کم ہوگا۔

☆ " **وقال رسول الله ﷺ ان التنجارھم الفجار فقیل یارسول الله الیس قد احل الله البیع قال نعم ولکنھم یحلفون فیاثمون ویحدثون فیکذبون** " (احیاء العلوم ج ۳ ص ۸۲)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تاجر فاجر (گنہگار) ہیں عرض کیا گیا یا رسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ نے

خرید وفروخت کوحلال نہیں کیا؟ آپ نے فرمایاہاں (حلال تو کیا ہے) لیکن (میری مراد) وہ ہیں جو قسمیں اٹھاتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں بات کرتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں یعنی جھوٹی قسمیں اٹھا اٹھا کر اپنے مال کی تعریف کرنا وغیرہ تاجروں کو گنہگار کرتا ہے ہاں البتہ سچے تاجروں کی رسول اللہ ﷺ نے تعریف بھی فرمائی ابوسعید کی روایت میں ہے:

"قال رسول اللہ ﷺ التجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقیین والشهداء"

(رواه الترمذی الدارمی والدار قطنی ورواه ابن ماجه عن ابن عمر مشکوة باب المساهلة فی المعاجلة)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سچے امین تاجر انبیاء کرام ،صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوں گے یعنی جو تاجر اپنی تجارت میں سچ بولتے ہیں امانت دار ہوتے ہیں قیامت کے دن ان کو انبیاء کرام اور صدیقین اور شہداء کا قرب حاصل ہوگا۔

تین جھوٹوں کا علیحدہ حکم: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"لیس الکذب الذی یصلح بین الناس ویقول خیرا وینمی خیرا قال ابن شهاب ولم اسمع یرخص فی شئی مما یقول الناس کذب الا فی ثلاث الحرب والاصلاح بین الناس وحدیث الرجل امراته وحدیث المراة زوجها" (مسلم شریف ج ۲ باب تحریم الکذب ص ۳۲۳)

"وہ شخص کذاب نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور بہتر بات کرے اور بہتری کی طرف نسبت کرے ابن شہاب نے بیان کیا کہ میں نے سوائے تین چیزوں کے کہ لوگ ان کو کذب کہتے ہیں رخصت نہیں سنی ایک جنگ میں دوسرا لوگوں کے درمیان صلح کرانا اور تیسرا خاوند زوجہ سے کوئی بات کرے یا زوجہ خاوند سے"

"قال القاضی لاخلاف فی جواز الکذب فی هذه الصور" قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ ان تین مقامات میں جھوٹ بولنا جائز ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔لیکن اس میں اختلاف ہے کہ وہ جھوٹ کس طرح جائز ہے بعض حضرات نےکہا مطلقاً جائز ہے لیکن بعض حضرات نے کہا

"لایجوز الکذب فی شی اصلا قالوا وماجاء من الاباحة فی هذا المراد به التوریة واستعمال المعاریض لاصریح الکذب"

جھوٹ کسی چیز میں بالکل جائز نہیں جو مباح ہے وہ توریہ اور تعریض کے طور پر کلام کرنا مراد ہے صریح جھوٹ مراد نہیں۔

توریہ اور تعریض یہ ہے کہ اس انداز پر کلام کی جائے کہ سننے والا اور معنی سمجھے اور بولنے والا اور معنی مراد لے یہ حقیقت میں جھوٹ نہیں ہوتا البتہ سننے والا ہو سکتا ہے جھوٹ سمجھے۔ جیسا کہ اپنی زوجہ کو کہے میں تم پر احسان کر دوں گا اچھے کپڑے پہناؤں گا نیت کرے کہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ نے طاقت دی تو ایسے کروں گا۔ اسی طرح دو آدمیوں کے درمیان مخالفت ہو تو ایک شخص ان کے درمیان صلح کرانا چاہتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ وہ تو تمہارے حق میں بڑے اچھے الفاظ بول رہا تھا تمہیں کسی نے غلط خبر دی اسی طرح دوسرے کو کہے، مراد یہ ہو کہ تمہاری لڑائی سے پہلے تم دونوں ایک دوسرے کو اچھے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ اسی طرح جنگ کے دوران دشمن سے کہے "مات امامکم الاعظم "تمہارا بڑا بادشاہ مرگیا۔ مراد اس سے یہ لے کہ تمہارا پہلے بڑا بادشاہ مرگیا تھا مقصد اس میں یہ ہوتا ہے کہ ان کے حوصلے پست ہو جائیں۔ اسی طرح یہ کہے "غدا یاتینا المدد" ہمارے پاس مدد آرہی ہے اس کی مراد یہ ہو کہ ہمارے پاس کھانا آرہا ہے دشمن یہ سمجھے کہ ان کے پاس فوج کی امداد آرہی ہے یہ توریہ یا تعریض کہلاتا ہے یہ جائز ہے لیکن کھلا اور واضح جھوٹ جائز نہیں۔

(از نووی)

اسی توریہ کی ایک اور مشہور و معروف مثال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کلام ہے ہجرت کی رات آپ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے کسی شخص نے آپ کو پہچانا اور حضور کو نہ پہچانا اس نے پوچھا کہ اے ابوبکر تمہارے ساتھ کون ہے؟ اب آپ نے خیال کیا کہ اگر یہ بتاتا ہوں کہ میرے ساتھ نبی کریم ﷺ ہیں تو یہ لوگ آپ کو تکلیف پہنچائیں گے کیونکہ وہ دشمن تو صرف آپ کے ہیں ہمارے تو نہیں اور اگر یہ بتاتا ہوں کہ میرے ساتھ کوئی اور شخص ہے تو جھوٹ ہوگا آپ نے اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کیا خوب جواب دیا کہ میرے ساتھ "ہادی" ہے۔ سننے والے نے سمجھا کہ آپ کہیں سفر پر جا رہے ہیں راستہ نہیں دیکھا ہوا تو اپنے ساتھ کوئی راہنما لیا ہے لیکن آپ کا مقصد تھا میرے ساتھ وہ ذات گرامی ہے جو میرے راہنما ہیں دنیاوی امور میں بھی اور دینی امور میں بھی جواب سچا تھا سننے والا نہ سمجھے تو اس کا اپنا قصور ہے۔

بغیر ضرورت کے تعریض بھی جائز نہیں:

" قال عمر رضی اللہ عنہ اما فی المعاریض مایکفی الرجل عن الکذب وروی ذلک عن ابن عباس وغیرہ وانما ارادوا بذلک اذا اضطر

الانسان الی الکذب فاما اذالم تکن حاجة وضرورة فلا یجوز التعریض ولا التصریح جمیعا ولکن التعریض اهون "(احیاء العلوم ج ۳ ص ۸۴)

" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تعریض کا مطلب یہ ہے کہ انسان جھوٹ سے بچ جائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا کہ تعریض کا یہ مطلب ہے کہ انسان جھوٹ اور گناہ سے بچ جائے لیکن یہ ضرورت کے وقت تعریض بھی جائز ہے بغیر ضرورت کہ نہ تو صریح طور پر جھوٹ جائز ہے اور نہ ہی تعریض کے طور پر البتہ تعریض بغیر ضرورت کے کھلے جھوٹ سے ذرا کم درجہ جرم ہے"

نبی کریم ﷺ کا منافقین کو قتل نہ کرانے میں حکمت:

جب یہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے منافقین کے متعلق مطلع فرما دیا تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے منافقین کو قتل کیوں نہیں کرایا اس لئے کہ کافر تو واجب القتل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ ظاہر طور پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ نماز نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں ادا کرتے تھے تمام کام مسلمانوں والے کرتے تھے اور تمام مسلمانوں کو ان کی منافقت کا پتہ نہیں تھا اگر آپ ان کو قتل کرادیتے تو نئے مسلمان ہونے والے ان کی منافقت کو نہ جاننے والے یہ کہتے کہ یہ کیسے نبی ہیں جو اپنے ہی مسلمانوں کو قتل کرا رہے ہیں تو ان کے دلوں میں اسلام کی الفت ڈالنے اور اسلام پر قائم رہنے کی مصلحت کے پیش نظر آپ نے منافقوں کو قتل کرانے کا حکم نہیں دیا۔ اسی مقصد کو نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا:

" معاذ الله ان یتحدث الناس انی اقتل اصحابی "

" اللہ کی پناہ اس سے کہ لوگ یہ باتیں کریں کہ میں اپنے دوستوں کو قتل کرادیتا ہوں"

" وقد کان یعطی للمؤلفة قلوبهم مع علمه بسوء اعتقادهم تالفا "

" یہی وجہ تھی کہ کئی مؤلفۃ قلوب کو بداعتقاد ہونے کے باوجود آپ عطیات سے نوازتے تا کہ ان کے دلوں میں اسلام کی محبت راسخ ہوجائے" ہاں یہ بھی خیال رہے کہ یہ اس وقت تک کی بات ہے جب تک مسلمانوں کو شوکت و دبدبہ حاصل نہیں ہوا جب اسلام کو مسلمانوں کی کثرت سے قوت حاصل ہوئی مسلمانوں کو دبدبہ حاصل ہوگیا تو منافقین کو بے نقاب کردیا گیا جس کا ذکر چوتھے پارہ میں اس آیۃ میں کردیا گیا

"ماکان اللہ لیذر المؤمنین علی ما انتم علیہ حتی یمیز الخبیث من الطیب"

" قال الشافعی واصحابہ وانما منع رسول اللہ ﷺ من قتل المنافقین ماکانوا یظھرونہ من الاسلام مع العلم بنافقھم لان مایظھرونہ یجب ماقبلہ"

''امام شافعی اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کو منافقوں کے نفاق کا علم تھا لیکن ان کو قتل اس لئے نہیں کرایا کہ وہ اس چیز (یعنی اسلام) کو ظاہر کر رہے تھے جو پہلے کی تمام برائیوں کو مٹا دیتی ہے''

اس طرح لوگوں کے دلوں سے اعتبار اٹھ جانے کا خطرہ تھا کہ ادھر آپ فرماتے ہیں اسلام کفر اور تمام برائیوں کو ختم کر دیتا ہے اسلام لانے کے بعد پہلے گناہوں کی باز پرس نہیں اور ادھر آپ مسلمانوں کو قتل کرا رہے ہیں۔

مسئلہ: طبری نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ظاہری احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے کسی کے باطنی امور پر اپنی مخلوق کو ذاتی علم نہیں دیا گیا ہاں خود اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو مطلع فرما دیا تو یہ اس کی عطا سے علم حاصل ہوا تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ظاہری احکام پر ہی عمل کریں اگر کوئی کہتا ہے مسلمان ہوں تو اسے مسلمان سمجھ کر اس سے مسلمانوں والا سلوک کیا جائے اس کی موت پر نماز جنازہ پڑھی جائے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے اس کے اندرونی حالات کیا ہیں ان کو رب تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔ (از قرطبی)

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴾

☆ اور جو ان سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں۔

☆ اور جب ان سے کہا جاتا زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہی ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ: "اذا" ظرف ہے زمانہ استقبال کیلئے استعمال ہوتا ہے شرط والا معنی زیادہ طور پر

پایا جاتا ہے یقینی امور پر استعمال ہوتا ہے یا جن کا وقوع راجح ہو ان پر استعمال ہوتا ہے۔ (ابوسعود)

"قیل" اصل میں "قول" ہے ماضی مجہول ہے اسکا فاعل "اللہ تعالیٰ" ہے یا "رسول اللہ ﷺ" ہیں یا "مومنین" ہیں یہ مختلف قول ہیں۔ تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ سب ہی احتمال درست ہیں مومن بھی ان کو کہتے تھے فساد نہ پھیلاؤ رسول اللہ ﷺ بھی ان کو یہی فرماتے کہ فساد نہ پھیلاؤ اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو یہی فرمایا۔ (از کبیر)

لَا تُفْسِدُوْا: فساد سے لیا ہوا "الفساد خروج الشئی عن الاعتدال والصلاح ضده" اور فساد کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کا اعتدال سے نکل جانا اور اسکی ضد کو صلاح کہا جاتا ہے یعنی کسی چیز کا اعتدال میں رہنا "صلاح" ہے "وكلهما يعمان كل ضار ونافع" پھران دونوں لفظوں کا استعمال عام ہوگیا ہے یعنی ہر نقصان دہ چیز کو "فساد" کہہ دیا جاتا ہے اور ہر نفع مند چیز کو صلاح کہا جاتا ہے۔ (از بیضاوی)

اِنَّمَا: حصر کے لئے آتا ہے یعنی یہ "ما،الا" کے معنی کو متضمن ہوتا ہے اس کا معنی کیا جاتا ہے سوائے اس کے کہ نہیں۔ (از بیضاوی)

منافقوں کا فساد: رب تعالیٰ کے کلام میں کیسی جامعیت ہے کیسا فصیح کلام ہے کہ ایک لفظ کتنے معانی کو شامل ہے صرف ایک لفظ ذکر کر کے کتنے معانی اس سے مراد لئے ہیں تفصیل ملاحظہ ہو:

(ا) "لا تفسدوا فی الارض من افراطكم فی الشهوية والغضبية وتفريطكم فی الحكمية بترك الانقياد للشرائع التی بها انتظام امرا لدارين وتحقق الانسانية" (تبصیر الرحمن)

زمین میں افراط وتفریط سے فساد نہ پھیلاؤ جانوروں کی طرح خواہشات نفسانیہ میں مبتلا ہونا اور درندوں کی طرح قوۃ غضبیہ میں مبتلا ہونا افراط ہے اور یہ ذریعہ فساد ہے تم انسان ہو کر حیوانوں اور درندوں کی طرح اپنے آپ کو کیوں بنا رہے ہو۔

حکمت والے کاموں میں کوتاہی کرنا تفریط ہے یہ بھی ذریعہ فساد ہے وہ حکمت والے کام کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ شرعی احکام یعنی اوامر ونواہی کی پابندی کی جائے جن پر دینا اور آخرت کے نظام کی دارومدار ہے اور ان پر چلنا ہی انسان کو انسانیت کا سبق دیتا ہے ان میں کوتاہی کرنا ان کو چھوڑنا تفریط ہے

گویا ان کو کہا گیا ہے کہ تفریط کے ذریعے فساد نہ پھیلاؤ۔

(۲) "لا تفسدوا فی الارض بمخادعة المؤمنین" مسلمانوں کو دھوکہ دے کر زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ چونکہ منافقین مسلمانوں کے خلاف کفار کی امداد کرتے تھے اور مسلمانوں کے راز ان پر افشاء (ظاہر) کرتے تھے جن کی وجہ سے لڑائیاں اور فتنے برپا ہوتے ان کی ان حرکات اور فتنوں، لڑائیوں کی وجہ سے لوگ، جانور، کھیتیاں سب ہی متاثر ہوتے تو ان کو کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر فساد نہ پھیلاؤ۔ اس لئے کہ تمہارے اس عمل سے لوگ مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں جانور قتل ہوتے ہیں یا کھیتیوں کے برباد ہونے کی وجہ سے انسان اور جانور بھوک میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کو کھانے کی اشیاء میسر نہیں ہوتیں۔

(از بیضاوی)

(۳) "لا تفسدوا فی الارض بمدارة الکافرین" کافروں سے محبت کر کے زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ چونکہ منافقین کفار سے محبت کرتے تھے ان کی طرف ہی ان کا میلان تھا ان کے ساتھ ہی میل جول رکھتے قلبی طور پر یہ لوگ کفر کی طرف ہی مائل تھے اگرچہ بظاہر مسلمان تھے یہ خیال کرتے تھے کہ ہم اس طرح رسول اللہ ﷺ اور انصار کو نقصان پہنچا سکیں گے ان کے اس طریقہ سے کافروں کو جرات ملتی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے عداوت کو ظاہر کرتے لڑائیاں قائم کرتے اپنے خیال میں نبی کریم ﷺ پر غلبہ حاصل کرنے کی طمع میں ہوتے۔ گویا کہ کفار سے منافقین کی محبت فساد عظیم تھا اس سے ان کو منع کیا گیا کہ کفار سے محبت کر کے فساد نہ پھیلاؤ۔ (از کبیر) رب تعالیٰ نے بیان فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴾

"اور کافر آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا"

یعنی مسلمانو! اگر تم نے آپس میں ایک دوسرے کی امداد نہ کی تو کافر سب ایک ہو کر تمہیں نقصان دینے کی کوشش کریں گے جو بہت بڑا فساد ہوگا جب کہ کفار سے محبت فساد ہے تو یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے مومنوں کو کافروں سے محبت کرنے سے منع کیا اور ارشاد فرمایا:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴾

"اے ایمان والو کافروں کو دوست نہ بناؤ مسلمانوں کے سوا کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے

اوپر کے لئے صریح حجت کر لو یعنی کافروں سے محبت کر کے اپنے آپ کے لئے منافقت پر واضح دلیل نہ بنالو'' (از ابن کثیر وخزائن العرفان)

(۴) ''لا تفسدوا فی الارض بکتمان الکفر'' اپنے کفر کو چھپا کر زمین میں فساد نہ پھیلاؤ کیونکہ وہ چھپ چھپ کر نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرتے اسلام کا انکار کرتے اور لوگوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف شبہات ڈالتے لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کے لئے ہی تو وہ نام کے مسلمان بنے بیٹھے تھے لیکن درپردہ اسلام کے خلاف کام کر کے فساد پھیلا رہے تھے رب تعالیٰ نے ان کو اس حرکت سے منع کیا۔ (از کبیر) آج بھی منافقین کی علامات رکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں لیکن انشاءاللہ وہ اپنے مکر میں کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''الاسلام یعلو ولا یعلی'' اسلام بلند ہے پست نہیں یعنی اسلام کے خلاف یہودیت ونصرانیت کی پرچار کرنے والے کبھی اسلام پر غلبہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔

(۵) ''ان المراد بالفساد فی الارض اظہار معصیة الله تعالیٰ'' فساد سے اللہ تعالیٰ کی معصیت کرنا یعنی منافقین کو کہا گیا ہے کہ تم گناہوں کے مرتکب ہو کر زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ اس لئے کہ شرعی احکام پر عمل کرنے سے ہر شخص درست راہ پر چلتا ہے کسی پر کوئی ظلم نہیں کرتا ناحق خون نہیں بہایا جاتا فتنے نمودار نہیں ہوتے تو اس طرح زمین میں بہتری ہوتی ہے اس کے رہنے والے بہتر راہ پر چل رہے ہوتے ہیں ''لان اصلاح الارض والسماء بالطاعة'' اس لئے کہ زمین اور آسمان کی اصلاح رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طاعت سے حاصل ہوتی ہے:

'' فان الاخلال بالشرائع والاعراض عنها ممایوجب الهرج والمرج ویخل بنظام العالم ''

''لیکن شریعت کے احکام پر عمل نہ کرنا ان میں خلل پیدا کرنا اور ان سے اعراض کرنا نظام عالم میں خلل پیدا کرتا ہے اور اس سے قتل وغارت فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے'' (از کبیر، ابن کثیر، بیضاوی)

''هرج ومرج'' کا معنیٰ ''قتل وغارت، فتنہ وفساد ہے'' جیسا کہ علامات قیامت کا ذکر جس حدیث پاک میں ہے اس میں ذکر ہے ''ویکثر الهرج وهو القتل'' قیامت سے پہلے کثیر ہرج پایا جائے گا راوی نے خود ''هرج'' کا معنیٰ بیان کر دیا کہ اس سے مراد ''قتل'' ہے۔

گناہوں کی وجہ سے نظامِ عالم کی بربادی:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ ﴾

تو کیا تمہارے یہ لچھن نظر آتے ہیں کہ اگر تمہیں حکومت ملے تو زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رشتے کاٹ دو یعنی رشوتیں لو، ظلم کرو، آپس میں لڑو، ایک دوسرے کو قتل کرو'' (خزائن العرفان)

اس آیۃ کریمہ سے واضح ہوا کہ معاصی فتنہ وفساد کا سبب ہیں ان سے رشتوں کے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں نظام عالم برباد ہو کر رہ جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾

''ظاہر ہوئی خرابی خشکی اور تری میں ان برائیوں کی وجہ سے جو لوگوں نے کیں تا کہ ان کو بعض کرتوتوں کا مزہ چکھائے کہیں وہ باز آئیں''

لوگوں کے شرک اور گناہوں کی وجہ سے خشکی اور تری طوفان آتے ہیں زمین میں فصل نہیں اگتے دریاؤں کا پانی نمکین ہو جاتا ہے چشموں کا پانی خشک ہو جاتا ہے ہر قسم کا فساد برپا ہو جاتا ہے۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيْرًا ﴾

''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں اس کے خوشحالوں پر احکام بھیجتے ہیں پھر وہ اس میں فسق کرتے ہیں تو اس پر بات پوری ہو جاتی ہے تو ہم اسے تباہ کر کے برباد کر دیتے ہیں''

مطلب آیۃ کریمہ کا واضح ہے کہ امیر لوگ، خوشحال جب اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے شہروں اور ملکوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ: ''تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہی ہیں''

یعنی جب ان کو کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں ہم

تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں وہ اپنے فساد کو اپنے باطل گمان کے مطابق اصلاح سمجھتے ہیں وہ کافروں کی معاونت کرنے کے باوجود اور مسلمانوں کے راز افشا کرنے کے باوجود کہتے یہ ہیں کہ ہم مومنوں اور کافروں کے درمیان صلح کرانے والے ہیں۔ (از قرطبی)

انہوں نے فساد کو اصلاح سے اس لئے تعبیر کیا تھا کہ ان کے دلوں میں مرض تھی یوں سمجھیں جس طرح مریض کسی چیز کے ذائقہ کو الٹا سمجھ لیتا ہے اسی طرح وہ دل کے مریض ہونے کی وجہ سے فساد کو اصلاح کرر ہے تھے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ﴾ تو کیا وہ جسکی نگاہ میں اسکا برا کام آراستہ کیا گیا کہ اس نے اسے بھلا سمجھا (ہدایت والے کی طرح ہو جائے گا؟) "انما" سے انہوں نے اپنے دعوی کو بڑا زور دے کر صحیح کرنے کی کوشش کی کہ سوائے اصلاح کے ہمارا تو اور کوئی مقصد ہی نہیں۔

﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾

"سنتا ہے وہی فسادی ہیں مگر انہیں شعور نہیں"

"خبردار بیشک وہی فساد پھیلانے والے ہیں لیکن ان کو شعور نہیں"

منافقین نے جب اپنے آپ کو اصلاح کرنے والا بیان کرنے پر زور دیا تاکید سے بیان کیا تو رب تعالیٰ نے بھی ان کے دعوی کو بہت ہی تاکید سے رد کیا پہلے فرمایا "الا" اس میں بھی تاکید کا معنی پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے حرف نفی پر داخل ہے جس طرح "اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ" کیا اس پر قادر نہیں؟ یعنی یقیناً وہ قادر ہے اسی طرح "الا" کا معنی بھی اصل میں یہ ہے کیا نہیں اور مراد یہ ہے کہ ہاں یقیناً ہے۔ پھر "الا" کو تنبیہ کے لئے استعمال کرتے ہیں معنی کر لیا جاتا ہے "خبردار" اس میں اصل مراد یہ ہوتی ہے "خبردار غور سے سنو" اسی لئے اعلی حضرت نے ترجمہ کیا ہے "سنتا ہے" "الا" یا کوئی بھی حرف نفی ہو جس پر ہمزہ استفہام داخل ہو اس کے بعد آنے

والا جملہ یا تو قسم سے شروع ہوتا ہے یا اس میں قسم کی طرح پختگی پائی جاتی ہے۔

اسی وجہ سے جملہ کو "ان " سے شروع کیا گیا جو تحقیق کا معنی دیتا ہے اس کا ترجمہ ہی ''تحقیق'' یا ''بیشک'' ہوتا ہے پھر خبر کو معرفہ ذکر کر کے مبتدا (یعنی اسم ان) اور خبر کے درمیان "ھم "ضمیر فصل ذکر کے اور تاکید پیدا کر دی یعنی جب منافقین نے کہا ہم تو اصلاح کے بغیر کچھ کرتے ہی نہیں ہمارا مقصد تو صرف اصلاح ہی اصلاح ہے۔ تو رب تعالیٰ نے بھی ان کا روان کے کلام سے بھی زیادہ پختہ کیا اور گویا کہ یوں فرمایا خبردار غور سے سنو تحقیق اس میں کوئی شک نہیں وہی فساد پھیلانے والے ہیں۔ یعنی ان کا کوئی کام فساد کے بغیر ہے ہی نہیں ان کا اپنے آپ کو مصلح کہنا ایسا ہی ہے جیسا وہ اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں حالانکہ حقیقت میں نہ ہی وہ مومن ہیں اور نہ ہی وہ مصلح ہیں۔

وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ : ''لیکن ان کو شعور ہی نہیں''

یہاں شعور کی نفی کر کے یہ بتایا کہ وہ امور محسوسہ میں فساد پھیلاتے ہیں لیکن انکی حس ہی نہیں کہ انہیں پتہ چل سکے کہ ہم تو فساد پھیلا رہے ہیں (ابو سعود) ان کے شعور کی نفی کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ:

" انهم لم يصلوا الى رتبة البهائم فان البهائم تمتنع من المضار فلا تقربها لشعورها بخلاف هؤلاء "

(صاوی)

بیشک وہ چوپاؤں کے مرتبہ کو بھی نہیں پہنچے ہوئے کیونکہ چوپائے نقصان دہ چیز سے رک جاتے ہیں اس کے قریب نہیں جاتے کیونکہ ان کو شعور ہوتا ہے بخلاف منافقین کے کہ ان کو شعور ہی نہیں وہ نقصان دہ چیز کو نفع مند سمجھتے ہیں۔

خیال رہے کہ ہمارے معاشرہ میں کسی کو بے وقوف کہنا ہو تو اسے گدھا کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں شرم وحیا نہیں یا اسے اونٹ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ پیشاب اپنی ٹانگوں پر ہی کرتا رہتا ہے۔ لیکن منافقین یا ان کی علامات رکھنے والے ان کے ہمنوا لوگوں کو گدھا یا اونٹ کہنا بھی غلط ہوگا کیونکہ وہ تو جانوروں سے بھی گئے گزرے ہوئے ہیں جب ان میں حیوانیت ہی نہیں تو انسانیت کیا ہوگی۔

مطلب واضح ہوگیا: یعنی جب منافقین کو مومنوں نے اور رسول اللہ ﷺ نے اور اللہ تعالیٰ

نے فرمایا اے منافقو! کافروں سے محبت کر کے کافروں سے میل جول رکھ کر گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنی خواہشات کے مطابق افراط وتفریط کر کے اوپر سے اور اندر سے اور بن کر لوگوں کے دلوں میں اشتباہ پیدا کر کے فساد نہ پھیلاؤ تو انہوں نے کہا ہمارے یہ طریقے صرف مومنین اور کفار یا مؤمنین اور اہل کتاب کے درمیان صلح کرانے کے لئے ہیں صلح کرانے کے بغیر ہمارا کوئی مقصد ہی نہیں۔ رب تعالیٰ نے ان کا رد اس انداز پر فرمایا کہ وہ تو حواس ہی نہیں رکھتے چوپاؤں سے بھی گئے گزرے ہوئے ان کو نفع نقصان کے درمیان فرق کرنے کا شعور ہی نہیں وہ فساد کو اصلاح سمجھ رہے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ ہی فساد پھیلانے والے ان کا فساد ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

فائدہ: " وما روی عن سلمان ان اهل هذه الآية لم يأتوا بعد فلعله اراد به ان اهله ليس الذين كانوا فقط بل وسيكون من بعد حاله حالهم " (بیضاوی)

" حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے جو روایت آتی ہے کہ اس آیۃ کے اہل ابھی نہیں آئے اس سے مراد یہ ہے کہ اس آیت کے اہل صرف یہی لوگ نہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے ہیں بلکہ ابھی جو نہیں آئے بلکہ بعد میں آئے ہیں وہ بھی ان کی طرح ہی ہوں گے"

یعنی اگرچہ خالص منافقین تو صرف نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ہی ہوتے ہیں لیکن ان کی طرح کام کرنے والے ہر زمانہ میں آتے رہیں گے جو فساد کو اصلاح کہیں گے لیکن وہ چوپاؤں سے بھی زیادہ گئے گزرے ہوں گے۔ قارئین کرام حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی روایت کو دیکھ کر خود ہی انصاف کریں کیا ہمارے زمانہ میں ہمارے ملک میں وہ لوگ نہیں جو یہود، نصاریٰ اور ہنود کے ایجنٹ ہیں؟ یقیناً ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں اوپر سے مسلمان ہیں لیکن وہ کام غیر مسلموں کا کرتے ہیں ملک کو اسلام کو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی وقت ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ان کی معاونت کافروں سے ہوتی ہے مسلمانوں کے راز ان پر افشاء کرتے ہیں کیا ہمارے ملک میں ایسے لوگ نہیں جو کافروں سے محبت رکھتے ہوں ان کے دین کو پسند کرتے ہوں ان کے اطوار (طور طریقہ) کے دلدادہ ہوں؟ یقیناً ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ کیا ہمارے ملک میں ایسے لوگ نہیں جو بظاہر مسلمان بن کر اسلام کے احکام پر

اعتراض کرتے ہوں انگریز کے قوانین پر چلتے ہوں حاکم کے اشاروں پر ان کے فیصلے ہوتے ہوں؟ یقیناً ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ کیا ہر طرح کی برائیوں کے مرتکب لوگ کچھ کم ہیں جن کی برائیوں کی وجہ سے ملک کا نظام تباہ و برباد ہو رہا ہے؟ یقیناً ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ منافقین کی طرف پر کام کرنے والے ہمارے ملک میں کثیر تعداد میں ہیں جو فساد پھیلانے کو اصلاح کہتے ہیں۔

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴾

''اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں سنتا ہے وہی احمق ہیں مگر نہیں جانتے''

''جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لائے ہیں اور لوگ تو وہ کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں ایسا جیسا کہ بے وقوفوں نے ایمان لایا ہے خبردار بیشک وہی بے وقوف ہیں لیکن وہ جانتے نہیں''

یعنی منافقین کو جب یہ کہا جاتا کہ تم بھی ایسا ایمان لاؤ جیسا کہ دوسرے مومن لوگوں نے ایمان لایا کہ وہ مخلص ایمان والے ہیں تو ان کی طرف سے جواب ہوتا کہ وہ تو صرف ایک طرف کے ہو کر بے وقوف ہیں رب تعالیٰ نے ان کا رد بڑی تاکید سے فرمایا خبردار غور سے سنو اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بے وقوف صرف وہی لوگ ہیں۔ " الناس " پہ الف لام جب جنسی ہو تو معنی ہوگا:

" الكاملون في الانسانية العاملون بقضية العقل "

''وہ لوگ جو انسانیت میں کامل ہیں اور عقل کے تقاضا کے مطابق کام کرتے ہیں''

انسان کامل اس وقت ہوتا ہے جب رذیل کاموں کو چھوڑ دے اور اچھے کام کرے اس لئے پہلے حکم دیا گیا ﴿لا تفسدوا﴾ فساد نہ پھیلاؤ یعنی ہر قسم کے گھٹیا کام جو فساد کا ذریعہ ہیں ان کو چھوڑ دو پھر

حکم دیا " آمنو " ایمان لاؤ یعنی اچھے کام کر کے اور برے چھوڑ کر اپنے آپ کو کامل انسان بنالو الف لام جنسی اگر چہ مطلقاً جنس اور ذات کے لئے بھی بولا جاتا ہے لیکن کبھی معانی مخصوصہ اور مقصودہ پر بھی بولا جاتا ہے اسی وجہ سے غیر سے نفی بھی ہوتی ہے اب معنی یہ ہوگا کہ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ ان لوگوں نے ایمان لایا جو کامل انسان ہیں یعنی انسان کہلانے کے وہی حقدار ہیں ان کے بغیر دوسرے انسان کہلانے کے حقدار ہی نہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں صرف صحابہ کرام جنہوں نے نبی کریم ﷺ پر خلوص سے ایمان لایا وہی انسانیت کے درجہ میں تھے آپ پر ایمان نہ لانے والے انسانیت سے ہی دور تھے۔

☆ " النـــاس " پر الف لام اگر عہد خارجی ہو تو خاص معین لوگ مراد ہوں گے یعنی نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھ صحابہ کرام اب معنی یہ ہوگا کہ جب ان کو کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جیسا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور رسولوں اور قیامت اور جنت اور دوزخ پر ایمان لایا یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ " (اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو) کو کامل طور پر تسلیم کیا اور اسے بجالایا۔

☆ " النـــاس " پر الف لام عہد خارجی ہی مان کر اس سے مراد حضرت عبداللہ ابن سلام اور ان کے دوسرے ساتھی ایمان لانے والے ہوں گے اب مطلب یہ ہوگا کہ جب ان کو کہا جاتا ہے تم ایمان لاؤ جیسا کہ تمہارے ساتھی یعنی اہل کتاب میں سے ہی حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ایمان لائے۔

(از بیضاوی، شیخ زادہ، ابن کثیر)

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ :

"وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائیں ایسا جیسا کہ ایمان لایا بے وقوف لوگوں نے"

یعنی جو لوگ انسانیت میں کامل تھے انسان کہلانے کے حقدار ہی صرف وہ تھے ان کو منافقوں نے بے وقوف کہا اس کی دو وجہ تھیں ایک یہ کہ وہ بہت زیادہ جاہل تھے ان کا کفر واضح تھا ان کی نظر سوچ میں خلل تھا ان کے اعتقادات باطل تھے انہوں نے یہ سمجھا حق پر صرف ہم ہی ہیں اس کے سوا سب کچھ باطل ہے جو ہمارے نظریات کے خلاف ہوگا وہ سفیہ (بے وقوف) ہوگا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ غنی

تھے مال ودولت کے مالک تھے اور صحابہ کرام میں سے اکثر غریب لوگ تھے کئی آزاد کردہ غلام تھے وہ ان کو (معاذ اللہ) حقیر سمجھ کر بے وقوف کہا کرتے تھے (از بیضاوی وشیخ زادہ) " السفاھة ای خفة العقل وقیل من تعمد الکذب " سفاہت کا معنی عقل کی کمی بعض نے کہا جان بوجھ کر جھوٹ بولنا بھی سفاہت ہے۔

اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ : ''خبردار بیشک وہی بے وقوف ہیں''

اللہ تعالیٰ نے بہت تاکید سے ان کا رد کیا اور کہا کہ بے وقوف تو وہ خود ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کے معجزات کو دیکھ کر ان کا ایمان نہ لانا پھر اہل کتاب سے منافقین کا تورات کو پڑھنا نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو جاننے کے باوجود ایمان نہ لانا نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کرنا صرف اس وجہ سے تھا کہ ان کی عقلیں ان کو چھوڑ چکی تھیں " فما اصبرھم علی النار " اس سے بڑھ کر ان کی بے وقوفی کیا ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو آگ کا مستحق بنا رہے تھے۔

وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ :

" یعنی ومن تمام جھلھم انھم لا یعلمون بحالھم فی الضلالة والجھل وذلک اردی لھم وابلغ فی العمی والبعد عن الھدی "

''لیکن وہ جانتے نہیں'' یعنی وہ اتنا زیادہ جاہل ہیں ان کو کامل طور پر جہالت حاصل ہے کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم گمراہ ہیں اور جاہل ہیں یہ ان کا گھٹیا حال ہے یہ ان کے اندھا ہونے میں کامل درجہ کا حال ہے یہ ان کے ہدایت سے دور ہونے کے وجہ سے۔ یعنی قانون یہ ہے کہ جو جاہل ہو اور اپنے آپ کو عالم سمجھے اپنی جہالت کا علم نہ رکھے اس حال کا نام ''جہل مرکب'' ہے تو منافقین میں سے ہر شخص جاہل مرکب تھا۔ علامہ محقق جلال الدین دوانی رحمہ اللہ نے اخلاق جلالی میں جاہل کی تعریف ان الفاظ سے کی ''ہر کس کہ داند نہ داند'' جو شخص اپنے نہ جاننے کو جانے وہ تو جاہل ہے لیکن ''ہر کس کو نہ داند نہ داند'' ہر وہ شخص جو اپنے نہ جاننے کو نہ جانے وہ جاہل مرکب ہے۔ ایسے شخص کا کوئی علاج نہیں اس کو سمجھانا ممکن نہیں وہ ضال اور مضل تو ہو سکتا ہے لیکن اس کو ہادی ماننا حماقت ہے۔

تنبیہ : اس سے واضح ہوا کہ صحابہ کرام اور نبی کریم ﷺ کے گستاخ منافقین تھے جنہوں

نے ان پاک ہستیوں کو بے وقوف کہا تھا جو کامل انسان تھے بالکل اس وقت صرف وہی انسانیت کے درجہ کو حاصل کرنے والے تھے ان لوگوں نے خود تو صبر سے کام لیا جاہل، منافق، بے وقوف لوگوں کو کوئی جواب نہ دیا لیکن رب تعالیٰ نے ان کی طرف سے جواب دیا گویا یوں کہا خبردار غور سے سنو بغیر کسی شک اور تردد کے اس بات پر یقین کرلو کہ بے وقوف تو وہ خود ہیں لیکن اپنی جہالت اپنی حماقت اپنی گمراہی اپنے اندھا پن اپنے ہدایت سے دور ہونے کو بھی نہیں جانتے۔

خدارا انصاف کیجئے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت امیر معاویہ، حضرت عائشہ صدیقہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا گستاخ کیا جاہل مرکب نہیں کیا بے وقوف نہیں جو گمراہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو عالم سمجھے بیٹھا ہے کیا شور وغل کرنے کا نام علم ہے کیا جھوٹا شخص عالم ہوسکتا ہے کیا علامات منافقین رکھنے والا عالم ہوسکا ہے کیا دوسرے لوگوں کو گمراہ کرنے والا انسانیت کا درجہ حاصل کرسکتا ہے؟ نہیں نہیں یقیناً نہیں بلکہ وہ انسانیت سے دور ہے ایسے شخص کو مذمت سے بھی تشبیہ نہ دی جائے بلکہ گدھا اس سے اچھا ہے ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ضمن میں آتا ہے۔ ﴿اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ﴾ وہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ اسی طرح گستاخ انبیاء کرام گستاخ اہل بیت اطہار گستاخ اولیاء کرام شخص بھی وہی درجہ رکھتا ہے جو صحابہ کرام کے گستاخ کا حال ہے خدارا اپنی عاقبت کو برباد نہ کرو صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کے محب بن جاؤ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کے محب بن جاؤ اسی میں دین ودنیا میں کامیابی ہے۔

علماء کرام متوجہ ہوں: جب منافقوں کو صحابہ کرام نے نصیحت کے طور پر کہا کہ تم لوگ راہ راست سے دور ہوکر غلط کاموں کا ارتکاب کرکے فساد پھیلا رہے ہو ایسا نہ کرو بلکہ اچھے کام کرو ظاہر وباطن میں مومن بنو کامل ایمان والے تب ہی ہوگے جب تم اچھے کام کروں گے "**فکان من جوابھم ان سفھوھم لتمادی جھلھم**" وہ لوگ اپنی کامل جہالت کی وجہ سے مخلص ایمان والے لوگوں کو یعنی صحابہ کرام کو بے وقوف کہنے لگے "**وفیہ تسلیۃ للعالم مما یلقی من الجملۃ**" اس میں علماء کے لئے تسلی ہے کہ اگر تمہیں جاہلوں کی طرف سے اس قسم کے الفاظ سننا پڑیں تمہیں لوگ بے وقوف کہیں تمہیں لوگ جاہل کہیں تو یہ خیال کرنا کہ تم صحابہ کرام سے تو بڑے نہیں ہو جب ان کو بے وقوف کہہ دیا

گیا تھا تمہیں جاہل بے وقوف کہنا کون سا عجیب کام ہے (از مدارک) ہاں اتنا سمجھ لینا کہ تمہیں بے وقوف کہنے والے درحقیقت خود ہی بے وقوف ہیں۔ ہیں تو احمق، ہیں تو سفیہ، ہیں تو جاہل مرکب لیکن اپنے آپ کو پڑھا لکھا سمجھتے ہیں کہ ہم تو ڈاکٹر ہیں۔ ہاں ہاں رئیس المنافقین عبد اللہ ابن ابی بھی اسلام کے خلاف ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری رکھتا تھا علماء کرام کبھی اس کی طرف بھی آپ نے توجہ کی کہ انبیاء کرام کو تو ''مجنون'' پاگل تک کہہ لیا گیا تھا کیا تمہیں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یاد نہیں ''العلماء ورثۃ الانبیاء'' علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ جب تم انبیاء کرام کے وارث ہو تو تمہیں انبیاء کرام کی طرح جہلا کا سامنا بھی کرنا پڑے گا ان کے بیہودہ الفاظ بھی سننے پڑیں گے صرف اسی پر اکتفا نہیں ہوگا بلکہ تمہیں گھسیٹا بھی جائے گا تم پر پتھر بھی برسائے جائیں گے۔ تمہیں انبیاء کرام کی طرح صبر کرنا ہوگا رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے بیان کو جاری رکھنا پڑے گا۔

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴾

''اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں''

''اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب لوٹتے ہیں اپنے شیطانوں کی طرف تو کہتے ہیں بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان سے ٹھٹھہ ہی کرتے ہیں''

شانِ نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیۂ کریمہ عبد اللہ ابن ابی منافق اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ یہ ایک مرتبہ گھروں سے نکلے ان کا سامنا صحابہ کرام میں سے کچھ افراد سے ہوگیا عبد اللہ ابن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''دیکھو میں ان لوگوں کو کیسے بے وقوف بناتا ہوں'' یہ کہا اور اس نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑا اور کہنے لگا مرحبا۔

صدیق بنو تیم کے سردار شیخ الاسلام غار میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنے والے اپنی جان اور اپنا مال رسول اللہ ﷺ پر قربان کرنے والے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑ کر کہنے لگا مرحبا اے بنو عدی بن کعب کے سردار فاروق اللہ کے دین میں قوی، بہادر اور اپنے مال اور اپنی جان کو رسول اللہ ﷺ پر قربان کرنے والے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑ کر کہنے لگا، مرحبا اے رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹے اور آپ کے داماد اور رسول اللہ ﷺ کے ماسوا بنو ہاشم کے سردار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے کہا " اتق الله یاعبد الله و لا تفافق " اے عبداللہ، اللہ سے ڈر اور منافقت نہ کر اس لئے کہ منافقین اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سے شر (زیادہ برے اور شریر) ہیں یہ کہنے لگا اے ابوالحسن (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کنیت) رک جائیں یعنی ہمیں منافق نہ کہیں میں منافقت سے یہ نہیں کہہ رہا بلکہ اللہ کی قسم ہمارا ایمان تمہارے ایمان جیسا ہے ہماری تصدیق تمہاری تصدیق جیسی ہے پھر یہ لوگ صحابہ کرام سے علیحدہ ہو گئے یہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا دیکھا ہے تم نے میں نے ان سے کیا کہا یعنی ان کو کیسے بے وقوف بنایا ان سب نے اس کی تعریف کی تم نے بہت کمال کیا ہے (خازن) لیکن تعجب ہے ان کی بے وقوفی پر کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ان کو واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ تم منافق ہو تم اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے بدترین ہو تو پھر اس کا یہ کہنا کیسے کہ دیکھا تم نے میں نے کیا کیا اور ان لوگوں کا اس کی تعریف کرنا اور یہ کہنا کہ تم نے تو کمال ہی کر دی یہ سب ان کی بے وقوفی کی علامت تھی۔

" لَقُوْا ": اصل میں میں " لقیوا " ہے بعض قراءتوں میں " لا قوا " ہے معنی اس کا ملاقات کرنا اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں " آمنا " ہم ایمان لائے اس سے مراد ان کا صرف زبان سے ایمان لانا مراد نہیں بلکہ دل سے خلوص کے ساتھ ایمان لانا مراد ہے کیونکہ ان کا زبانی ایمان تو مؤمنین کو پہلے ہی معلوم تھا یہ بتانے کی انہیں ضرورت نہیں تھی اسی طرح کافروں سے جب وہ ملتے تو ان کے ساتھ ہونے کا ذکر کرنے سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ دل سے کافر ہیں صرف ظاہری طور پر ایمان والوں سے ملتے جلتے ہیں جب ایمان والوں سے ملتے تھے تو یقیناً اس کی ضد ہی انہوں نے بیان کرنی تھی اب اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ہم دل سے ایمان لائے ہیں ہم ایمان لانے میں مخلص ہیں۔ (از کبیر)

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ : " واذا خلوا الی رجعوا " (خازن) ایک معنی یہ ہے کہ جب وہ اپنے شیطانوں کیطرف لوٹتے ہیں دوسرا معنی ہے "مزاح اڑانا" جیسا کہ کہا جاتا ہے "خلوت بہ" میں نے اس سے مزاح اڑایا اب معنی یہ ہوگا کہ جب وہ اپنے شیطانوں کے پاس مسلمانوں کا مزاح اڑاتے ہیں تیسرا معنی صاحب کشاف نے کہا کہ کہا جاتا " خلوت بفلان " یا کہا جاتا ہے "خلوت الی فلان " اسکا معنی ہوتا ہے " انفردت معه " میں اس سے اکیلے میں ملا۔ (کبیر)

لیکن بعض حضرات نے کہا کہ یہ معنی لینے کے لئے " الی " کو باء کے معنی میں لینا پڑے گا جو ضعیف ہے (قرطبی) اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر چہ "علیحدگی میں ملنا" معنی لینا اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب باء ذکر ہولیکن " الی " کو "باء " کے معنی میں لے کر مبالغہ ثابت کیا گیا کہ وہ اپنے شیطانوں کے بہت ہی قریب ہوجاتے ہیں ایک قول یہ ہے کہ عبارت میں حذف پایا گیا ہے اصل عبارت اس طرح" واذا خلوا من المؤمنین الی شیاطینهم " اور جب وہ مومنوں سے لوٹ کر شیطانوں کی طرف جاتے ہیں۔

شیطانوں سے مراد کون لوگ ہیں؟

یا تو اس سے مراد کھلے کافر ہیں اور یا اس سے مراد منافقین کے سردار ہیں ان کو شیطان کہنے کی وجہ یہ ہے "شیطاطینهم الذین ماثلوا الشیاطین فی تمردهم " کہ وہ شیاطین کی طرح سرکش تھے اب مطلب یہ ہوگا کہ جب یہ اپنے شیطانوں سے علیحدگی میں ملتے ہیں یعنی منافقین جب کفار سے ملتے ہیں یا چھوٹے منافقین اپنے بڑے سرداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یعنی ہم تمہارے معاون ہیں ہم تمہارے دوست ہیں ہم تمہارے دین کے موافق ہیں ہماری تمام ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ (از کبیر ، مدارک)

علمی نکتہ : مسلمانوں سے مل کر کہتے ہیں " آمنا " یہ جملہ فعلیہ ہے جو تجدد پر دلالت کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر چہ پہلے مؤمن نہیں تھے لیکن اب خالص مومن ہیں اور کافروں سے جب علیحدگی میں ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں " انا معکم " یہ جملہ اسمیہ ہے جو دوام واستمرار پر دلالت کرتا

ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پہلے بھی تمہارے ساتھ تھے اب بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ (مدارک)

اِنَّـمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُ وْنَ : مومنوں کے ساتھ مزاح اڑانے کے بغیر ہمارا کوئی کام ہی نہیں "انـما" سے حصر کا فائدہ سمجھ میں آرہا ہے۔ یعنی ہم محمد ﷺ اوران کے ساتھیوں کے سامنے اسلام ظاہر کر کے ان کے شر سے بچ جاتے ہیں (معاذ اللہ) اوران کے رازوں پر مطلع ہوجاتے ہیں ان سے مال غنیمت اور صدقات حاصل کر لیتے ہیں۔ (خازن)

" الاستهزاء السخرية والاستخفاف" استھزاء کا معنی ہے مزاح اڑانا کسی کو گھٹیا سمجھنا

تنبیہ : کئی لفظ عربی میں استعمال ہوتے ہیں اور عربی میں بھی، لیکن ہو زبان کا استعمال اپنے اپنے انداز پر ہے:

" المزاح بضم ميم ويكسر ثم المزاح انبساط مع الغير من غير ايذاء فان بلغ الا يذاء يكون سخرية " (مرقاۃ باب المزاح)

مزاح کی میم پر ضمہ (پیش) ہے یا کسرہ (زیر) ہے جب کوئی شخص دوسرے سے خوش طبعی کی کوئی بات کرے اسے گھٹیا نہ سمجھے ایذا (تکلیف) نہ پہنچائے اس میں کسی کی ذلت نہ ہو تو عربی میں اسے مزاح کہتے ہیں اور اگر کسی کو ایذا پہنچائی جائے تو اسے " سخرية " کہا جاتا ہے لیکن اردو میں مزاح میم کے فتحہ (زبر) سے استعمال ہے پھر جب کہا مزاح کرنا یہ عام ہے اچھے مزاح کو بھی کہا جاتا ہے اور برے کو بھی لیکن جب کہا جائے مزاح اڑانا تو یہ صرف گھٹیا پر بولا جاتا ہے استھزاء اور سخریہ تقریباً ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ خوش طبعی کے طور پر مزاح جائز ہے کسی کو ذلیل کرنے کے لئے مزاح یعنی استہزاء اور سخریہ (ٹھٹھہ کرنا) ناجائز ہے۔

☆☆☆

بُرا مزاح گناہ ہے

نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' لا تمار اخاك ولا تمازحه '' اپنے بھائی کو حقیر نہ سمجھو جھگڑا نہ کرو اور مزاح نہ کرو 'لا تمار ، مماراۃ سے لیا ہوا جس کا مطلب ہے کسی کے کلام میں طعن پیش کرنا، کسی کے کلام میں خلل اور غلطیاں نکالنا اور اپنی برتری ظاہر کرنا اس میں اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو تکلیف پہنچانا لازم آتا ہے اور ایسا شخص زیادہ طور پر جھوٹ بولتا ہے۔ دوسرے سے جھگڑا کرتا ہے جس سے منع کیا گیا۔

مزاح کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ ہے کہ مزاح سے کسی کو ایذاء پہنچائی جائے اسے سخریۃ کہتے ہیں یہ ہر صورت میں ناجائز ہے۔

دوسری قسم مزاح کی یہ ہے کہ اس میں خوش طبعی پائی جائے کسی کو ایذاء نہ پہنچائی جائے۔ اس میں بھی زیادتی اور ہمیشگی منع ہے۔ کیونکہ کثرت مزاح سے کثیر ہنسی حاصل ہوگی اور کثیر ہنسنے سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے، دل کی سختی گویا کہ دل مردہ ہونے کے مترادف ہے، دل کے مردہ ہونے سے انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر اور دینی معاملات میں تفکر سے دور ہو جاتا ہے۔

زیادہ مزاح کرنے سے انسان بعض اوقات تو دوسروں کو تکلیف دینے کا سبب بنتا ہے اور انسانوں کے درمیان کھوٹ، کینہ کا سبب بنتا ہے اس طرح زیادہ مزاح کرنے والے کا رعب و وقار ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں'' من كثر ضحكه قل هيبته '' جو شخص زیادہ ہنسے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے۔

'' من كثر كلامه كثر سقطه ومن كثر سقطه قل حياء ه ومن قل حياء ه قل ورعه ومن قل ورعه مات قلبه ''

جو شخص مزاحیہ کلام زیادہ کرنے کا عادی ہو جائے وہ زیادہ گھٹیا ہو جاتا ہے، جو شخص زیادہ گھٹیا ہو جائے اس کی حیاء میں کمی آ جاتی ہے، اور جس شخص کی حیاء میں کمی آ جائے اس کی نیکی اور تقویٰ میں کمی آ جاتی ہے، اور جس شخص کی نیکی اور تقویٰ میں کمی آ جائے، اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔

حضرت وہیب بن ورد نے ایک قوم کو عید الفطر کے دن ہنستے ہوئے دیکھا تو آپ نے فرمایا اگران لوگوں کو اپنی مغفرت کا یقین ہو چکا ہے تو انہیں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے والے لوگ اس طرح نہیں ہنستے اور اگران لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ ہماری مغفرت نہیں ہوئی تو انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا چاہئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والے لوگ بھی اس طرح نہیں ہنستے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ مزاح کو مزاح کیوں کہتے ہیں؟ احباب نے جواب دیا ہم نہیں جانتے آپ نے فرمایا" لانّہ ازاح صاحبی عن الحق "آپ نے فرمایا کہ اسے مزاح اس لئے کہتے ہیں کہ یہ مزاح کرنے والے کو حق سے دور کر دیتا ہے۔ یعنی مزاح کا لفظ ازاحۃ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ہٹانا، دور کرنا۔

مزاح کی جگہ دینی محافل قائم کرے!

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا کہ مزاح کی محافل قائم کرنے سے اجتناب کرو، اس سے دلوں میں کھوٹ، کینہ، کدورت پیدا ہوتی ہے جو انسان کو برائیوں کے ارتکاب کی طرف پہنچاتا ہے تم ذکر قرآن کی محافل قائم کیا کرو یعنی ایسی محفلیں قائم کرو جن میں قرآن و احادیث بیان کی جائیں اگر تمہیں اس قسم کی محفلیں قائم کرنے میں مشکل درپیش آئے تو نیک لوگوں کی نیک باتیں ہی بیان کر لیا کرو۔

کسی کی مصیبت پر ہنسنا ناجائز ہے:

ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اپنے اونٹ پر سوار ہیں آپ کا اونٹ جوان، پھرتیلا، سرکش ہے، وہ جب نبی کریم ﷺ کے قریب آکر سلام کہتے ہوئے کوئی بات پوچھنا چاہتے ہیں تو ان کا اونٹ منہ زور ہو کر انہیں دور لے جاتا ہے۔ صحابہ کرام اس منظر کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ یہ معاملہ کئی مرتبہ درپیش آیا۔ آخر کار اونٹ نے انہیں گرا دیا وہ شہید ہو گئے، صحابہ کرام نے عرض کیا۔

"یارسول اللہ ان الاعرابی قد صرعہ قلوصہ وقد ھلک فقال نعم وافواھکم ملانی من دمہ"

یارسول اللہ اعرابی کو اونٹ نے گرا دیا ہے وہ شہید ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں لیکن

تمہارے منہ اس کے خون سے بھرے ہوئے ہیں۔ مقصد یہی تھا کہ ان کا اونٹ سرکش تھا جوان کے قابو میں نہیں تھا۔ وہ بے بس تھے۔ اونٹ کو قریب لانا چاہتے تھے وہ انہیں دور لے جاتا، تم ان کی بے بسی پر ہنس رہے تھے ان کا اس بے بسی کی حالت پر فوت ہونا اور تمہارا اس حالت پر ہنسنا گویا ان کے خون سے اپنے موٹھوں کو بھرنا تھا۔

اچھا مزاح سنت و مستحب ہے:

جب مزاح میں صرف خوش طبعی مقصود ہو، مزاح میں کثرت نہ ہو، ہمیشہ مزاح کرنے کی عادت نہ بنالی جائے، مزاح میں جھوٹ نہ ہو بلکہ حق بات ہو، مقصد مخاطب کو خوش کرنا ہو تو یہ جائز و مستحب ہے۔ ایسا مزاح انسان کے حسن اخلاق کو ظاہر کرتا ہے، ہنس مکھ چہرا سے کلام کرنا ہی اخلاق کریمانہ ہیں، کشادہ روئی جنت والوں کی علامت ہے اور مرجھایا ہوا چہرا، ماتھے پر بل، اکڑ کر رہنا جہنمیوں کی علامت ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ!

" انک تداعبنا قال انی لا اقول الاحقا "

بے شک آپ ہمارے ساتھ مزاح فرمالیتے ہیں آپ نے فرمایا کہ ہاں میں سوائے حق کے کچھ نہیں کہتا۔

صحابہ کرام کا تعجب کرنا اس وجہ سے تھا کہ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ اپنے بھائیوں سے مزاح نہ کرو اسی وجہ سے از روئے تعجب صحابہ کرام نے آپ کے مزاح کی وجہ پوچھی کہ آپ ہمارے ساتھ مزاح فرمالیتے ہیں اس میں حکمت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں سوائے حق کے کچھ نہیں کہتا۔ میرے کلام میں عدل و انصاف اور حق و صداقت ہوتی ہے تم میں سے ہر آدمی اس طرح کی بات کرنے پر قادر نہیں اس وجہ سے تمہیں منع کیا ہے اگر تم بھی مزاح کا یہی حق ادا کرسکو تو تمہارے لئے بھی جائز ہے۔

نبی کریم ﷺ کے مزاح کی درخشاں مثالیں

(۱) "وعن انس ان رجلا من اهل البادية كان اسمه زاهر بن حرام و كان يهدى للنبى ﷺ من البادية فيجهزه رسول الله ﷺ اذا اراد ان يخرج فقال النبى ﷺ ان زاهرا باديتنا ونحن حاضروه و كان النبى ﷺ يحبه وكان دميما فاتى النبى ﷺ يوما وهو يبيع متاعه فاحتضنه من خلفه وهو لايبصره فقال ارسلنى من هذا ؟ فالتفت فعرف النبى ﷺ فجعل

لایألو ما الزق ظهره بصدر النبی ﷺ حین عرفه وجعل النبی ﷺ یقول من یشتری العبد فقال یارسول الله اذا و الله تجدنی کاسدا فقال النبی ﷺ لکن عند الله لست بکاسد "

دیہات میں رہنے والے ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس دیہاتی تحفے پیش کرتے، جب وہ واپس جانے کا ارادہ فرماتے تو آپ ان کے لئے اسباب مہیا فرماتے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ زاہر ہمارا جنگل ہے ہم اس کے شہر ہیں۔ نبی کریم ﷺ اس شخص سے محبت کرتے تھے اگرچہ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھے ایک دن نبی کریم ﷺ تشریف لائے وہ اپنا سامان فروخت کر رہے تھے، آپ نے آ کر ان کو پیچھے سے اپنے بازوؤں میں لے لیا، انہیں نظر نہیں آ رہا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ یہ کون ہے مجھے چھوڑ دے، پھر انہوں نے پہچان لیا کہ نبی کریم ﷺ ہیں پہچاننے پر اپنے پیٹھ کو نبی کریم ﷺ کے سینہ مبارک سے ملنے لگے، نبی کریم ﷺ فرمانے لگے یہ غلام کون خریدے گا، انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، آپ اسے کھوٹا پائیں گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو کھوٹا نہیں۔

وضاحت حدیث: یہ صحابی زاھر ابن حرام حجازی تھے باہر جنگل، دیہاتی، صحرائی تحفے پھل، نباتات خوشبوئیں اور دوائیں وغیرہ بطور ھدیہ لاتے اور نبی کریم ﷺ انہیں مدینہ طیبہ سے واپسی پر ان کی واپسی کے اسباب مہیا فرماتے اور دیہاتوں میں جن شہری چیزوں کی ضرورت واقع ہوسکتی وہ عطا فرماتے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا " ان زاھرا بادیتنا ونحن حاضروہ " جس کا مطلب ہے کہ بے شک زاہر ہمارا ہے جو صحرا میں رہتا ہے، کہ ہم اس سے صحرائی تحفے وصول کر کے فائدہ حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ یہ معنی لینا بھی زیادہ قریب ہے کہ زاہر ہمارے صحراء میں رہتا ہے۔ لیکن پہلا معنی مراد لینے میں زیادہ حلاوت (مٹھاس) ہے۔ اور فرمایا کہ ہم اس کے ہیں، جو شہر میں رہتے ہیں یعنی وہ ہمارے شہری تحفوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے اس طرز عمل سے اور آپ کے اقوال سے یہ واضح ہے کہ ایک دوسرے کو ھدیہ، تحفہ، دینا محبت کے بڑھنے کی علامت ہے۔ صرف ھدیہ وصول کرنے کی طرف ہی نظر نہ رکھے بلکہ ھدیہ دینے والے کو ھدیہ اور محبت وشفقت سے نوازے، یہ ہی نہ کہتا رہا کہ میں تمہارے پاس آؤں تو کیا دوگے ار جب تم میرے پاس آؤ تو کیا لاؤ گے۔

حدیث شریف میں جو لفظ ''دمیما'' استعمال ہوا ہے اس کا معنی '' قبیح المنظر کریه الصورة '' یعنی بدصورت ہے۔ نبی کریم ﷺ ان سے بہت ہی زیادہ محبت فرماتے تھے اگرچہ وہ بدصورت تھے لیکن ان سے محبت کی وجہ ان کا حسن سیرت تھا۔ ہر انسان کسی کو محبوب بنانے، شادی کرنے میں یہی نقطہ مدنظر رکھے کہ خوبصورت بدکردار کے بجائے، بدصورت لیکن دیندار کو پسند کرے۔ اسی میں دین و دنیا کی کامیابی ہے۔

ایک دن حضرت زاہر بازار میں یا کہیں کھلی فضاء میں اپنا سامان فروخت کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے ''فاحتضنه'' ان کو بغل کے نیچے پہلوؤں میں لیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھ مبارک ان کی بغل کے نیچے سے گذار کر ان کو پیچھے کی جانب سے گلے لگایا، ان کی آنکھوں پر بھی ہاتھ رکھے کہ وہ دیکھ نہیں سکتے تھے، یا آپ ﷺ کے پکڑنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ پیچھے نہیں دیکھ سکتے تھے اور کہہ رہے کہ یہ کون ہے مجھے چھوڑ دے۔ جب حضرت زاہر نے آنکھ کے ایک کنارے سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ تو میرے حبیب پاک علیه التحیة والثناء ہیں تو پہچاننے پر اپنی پیٹھ کو آپ کے سینہ سے ملنے لگے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ حضور میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''من یشتری العبد''؟ یہ غلام کون خریدے گا؟

یہی بات سمجھنے کی ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں جو مزاح کرتا ہوں وہ حق ہوتا ہے تو آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب کیا ہو سکتا ہے کہ آپ نے آزاد شخص کو غلام کہا اور غلام بیچا نہیں جا سکتا تو آپ نے کیسے فرمایا اسے کون خریدے گا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے مزاح میں ظاہری مطلب اور ہوتا تھا لیکن درحقیقت اور مطلب مراد ہوتا تھا جو حق ہوتا تھا، یہاں بھی آپ نے لفظ عبد استعمال فرمایا اس کا ظاہری معنی غلام ہے لیکن اس سے آپ کی مراد عبداللہ (اللہ کا بندہ) ہے اس طرح یشتری لفظ اشتراء سے لیا ہوا ہے جس کا ظاہری معنی خریدنا لیکن یہ لفظ کبھی ''مقابلة الشئی بالشئی'' (ایک چیز کے مقابل دوسری کا ہونا) کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کا معنی ''تبدیل کرنا'' ہوتا ہے اب پورے کلام کا معنی اس طرح ہوگا اس اللہ کے بندے کو میری محبت کے مقابل (اکرام و تعظیم) کون عطا کرے گا۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ اس اللہ کے بندے جیسا میرے پاس کون لائے گا کوئی ایسا محبوب اور بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا تیسرا معنی یہ ہوگا۔ اس اللہ کے بندے کو کون لے گا کوئی ہے جو اس سے ایسی ہی محبت کرے جیسے میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ حضرت زاہر نے نبی کریم ﷺ کے ظاہر الفاظ کو دیکھتے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اس غلام کو کھوٹا سکہ پائیں گے، یہ تو سستا بکے گا۔ اسے کون خریدے گا۔ اس بدصورت کو کون پسند کرے گا۔

قربان جاؤں! میرے پیارے مصطفیٰ علیہ التحیة والثناء نے کیا خوبصورت جواب دیا! آپ فرماتے ہیں ''لکن عند اللہ لست بکاسد '' لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم تو کھوٹے نہیں۔ یعنی جب تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتے ہو تو وہ شخص کیسے کھوٹا سکہ، بے قدر و منزلت ہوسکتا ہے جو محبّ اللہ اور محبّ رسول اللہ ﷺ ہو بلکہ اس سے بڑھ کر محبوب رسول اللہ ﷺ بھی ہو۔

اصل محبت محبانِ مصطفیٰ ﷺ سے محبت ہے:

پیر طریقت راہبر شریعت ترجمان مسلک اہل سنت حضرت علامہ سید تراب الحق شاہ صاحب مدظلہ العالی سے صرف تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک یادگار ملاقات دوران حج مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ لیکن آپ سے اور آپ کے حلقہ ارادت کے دو ہیرے ﴿قادری برادارن﴾ یعنی حافظ قاری محمد آصف قادری صاحب اور حافظ قاری محمد عارف قادری صاحب مدظلہما العالی سے بہت ہی محبت صرف اسی واسطہ سے ہے کہ یہ سینے محبت مصطفیٰ ﷺ کے انوار سے منور ہیں۔

لپٹا جو دامن مصطفیٰ سے وہ یگانہ ہو گیا ☆ جس کے حضور ہو گئے اس کا زمانہ ہو گیا

جو محبت مصطفیٰ ﷺ سے دور ہیں ان بے نُور روحوں سے ہم بھی دور ہیں، ان سے کبھی محبت نہیں ہو سکتی

جو تجھ سے یار پھرتے ہیں ☆ یونہی دربدر خوار پھرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے مزاح کی ایک اور مثال:

(۲) حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ ایک بڑھیا حبیب پاک علیہ التحیة والثناء کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ میرے لئے دعا فرمائیں کہ میں جنت میں داخل ہو جاؤں آپ نے فرمایا اے ام فلاں ''ان الجنة لاتدخلها عجوز '' بے شک جنت میں بوڑھی عورتیں

داخل نہیں ہوں گی، راوی کہتے ہیں وہ روتے ہوئے واپس ہو رہی تھیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اسے خبر دے دو کہ جنت میں بوڑھی عورتیں اس حال میں نہیں جائیں گی کہ وہ اس وقت بھی بوڑھی ہوں گی بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْشَأْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴾

ہم نے پیدا کیا ان کی بیویوں کو حیرت انگیز طریقہ سے۔ پس ہم نے بنا دیا انہیں کنواریاں۔

یہاں اہل جنت کی نیک بیویوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے، یعنی جب وہ جنت میں داخل ہوں گی تو ان کی خلقت بالکل بدلی ہوئی ہوگی، اگرچہ دنیا میں وہ خوش شکل نہ تھیں مرتے وقت وہ بالکل بوڑھی ہو گئیں تھیں، لیکن جب جنت میں داخل ہوں گی تو بھرپور جوانی ہوگی، مجسم حسن و رعنائی ہوں گی، اور کنواری بنا کر انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔

حدیث شریف میں اس آیت کی یہی تفسیر مذکور ہے، حضرت ام سلمہؓ کے عرض کرنے پر حضور نے فرمایا

"یا ام سلمة هن اللواتي قبضن في الدنيا عجائز شمطا عمشا رمصا جعلهن الله بعد الكبر اترا با علي ميلاد واحد في الاستواء"

اے ام سلمہ ان سے وہی بیویاں ہیں اگرچہ وفات کے وقت وہ بالکل بوڑھی تھیں ان کے بال سفید تھے، ان کی بینائی کمزور تھی، آنکھیں میلی کچیلی رہتی تھیں لیکن جب وہ جنت میں داخل ہوں گی تو ساری ہم عمر ہوں گی۔ (احیاء العلوم ج ۳، مرقاۃ، مشکوٰۃ باب المزاج، شمائل ترمذی، ضیاء القرآن)

نبی کریم ﷺ کے مزاح کی صرف دو مثالیں پیش کیں ہیں۔ مقصد صرف یہ سمجھانا ہے کہ مزاح خوش طبعی کے طور پر جب کہ اس میں صداقت ہو کذب بیانی نہ ہو۔ متکبرانہ انداز نہ ہو، اپنی برتری اور کسی کی حقارت بیان کرنا مقصود نہ ہو، تو جائز ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے مزاح فرمایا۔ لیکن بات حق اور سچ ہوتی صرف سننے والا ابتدائی طور پر دوسرا معنیٰ سمجھ کر بعض اوقات غلطی میں واقع ہو جاتا ہے، اس طرح کے نبی کریم کے کئی اور مزاح بھی احیاء العلوم اور کتب احادیث میں ملتے ہیں، سب کی نوعیت ایک ہی ہے۔ کسی کو حقیر و ذلیل کرنے کی غرض سے مزاح ہو یا کسی قسم کا کوئی بھی کلام ہونا جائز ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو عاجز، دوسروں سے کمتر سمجھنا اور دوسروں کو فوقیت دینا اور انہیں اپنے آپ سے برتر سمجھنا ہی "کمال" ہے۔

﴿ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾

☆ اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا اس کی شان کے لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

☆ اللہ ان کو ٹھٹھہ کا بدلہ دے گا اور انکو مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں رہیں۔

جب منافقین نے کہا ہم مسلمانوں سے استھزاء (ٹھٹھہ) کرتے ہیں تو رب تعالیٰ نے ان کے جواب میں کہا اللہ تعالیٰ ان سے استہزاء کرتا ہے (جو اس کی شان کے لائق ہے) اور ان کو مہلت دے رکھی ہے دنیا میں ان کو عذاب نہیں دیتا تاکہ وہ اور زیادہ سرکشی کرتے رہیں اسی طرح بھٹکتے رہیں تاکہ اور ہی زیادہ عذاب کے مستحق ہوسکیں۔

اعتراض: استہزاء میں تو مکاری پائی جاتی ہے کیونکہ بظاہر شان بیان کی جاتی ہے لیکن حقیقت میں ذلت بیان کی جاتی ہے جیسا کہ نالائق طالب علم کا کسی کو تعارف کراتے ہوئے کہا جائے کہ یہ ہمارے مدرسہ کا بڑا لائق طالب علم ہے یہ تو ابھی سے ہی بہت بڑا عالم فاضل ہے یہ بظاہر تعریف ہے لیکن حقیقت میں اس کی تذلیل ہے۔ اسی طرح استھزاء جاہلوں کا کام ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک مقتول کو زندہ کرنے کے لئے گائے کو ذبح کرنے (اور اس کا گوشت اس کے جسم سے لگانے) کا حکم دیا تو ان لوگوں نے کہا " اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا " کیا تم ہمارے ساتھ مزاح اڑا رہے ہو؟ تو آپ نے ان کو جواب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ ﴾ ''اللہ کی پناہ کے میں جاہلوں سے ہو جاؤں''

مکاری اور جہالت دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں تو اللہ تعالیٰ کا استہزاء کرنا کیسا درست ہے؟

جواب اول: " ان ما يفعله الله بهم جزاء على استهزائهم سماه بالاستهزاء " اللہ تعالیٰ نے ان کو استہزاء پر جو سزا دینی ہے اسے استھزاء کہہ دیا گیا ہے کیونکہ ایک چیز کی جزا کو اسی والا نام دے دیا جاتا ہے اسے علم بدیع میں " مشاكلة " کہا گیا جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "جزاء سيئة سيئة "

برائی کی جزاء بری ہے۔ حالانکہ برائی کی جزاء تو حکمت کے مطابق ہوتی ہے بری نہیں لیکن مشاکلۃ کے طور پر اسے "سیئہ" کہہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾

"جو شخص تم پر تجاوز (زیادتی) کرے تم اس پر تجاوز کرو ایسا ہی جیسا اس نے تم پر تجاوز کیا"

یہاں زیادتی کے بدلہ کو زیادتی کہا گیا ہے حالانکہ زیادتی کا بدلہ حق ہے لیکن یہاں بھی مشاکلۃ والا قانون جاری ہے خیال رہے راقم کا ترجمہ اسی جواب کے مطابق ہے۔

جواب دوم: منافقین جو مومنین سے استہزا کرتے ہیں اس کا وبال اور ضرر ان کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہے مومنوں کو اس کا نقصان ہونا نہیں چونکہ ہر عمل ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے رب تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب فرمایا اب ترجمہ یہ ہوگا ان کے استہزاء کو اللہ تعالیٰ ان پر ہی لوٹا دے گا کیونکہ نقصان ان کا ہی ہونا ہے۔

جواب سوم: استہزاء سبب ہے اور اس پر مرتب ہونے والے مسببات ذلت، حقارت، رسوائی ہیں یہاں مجاز مرسل کا ضابطہ استعمال ہے کہ ذکر سبب کا ہے اور مراد اس سے مسبب ہے اب معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ ان کو ہی ذلیل، حقیر، رسوا کرے گا۔

جواب چہارم: کچھ دیر کے لئے منافقین سے مومنوں والا سلوک کیا گیا ان کے مال اور ان کی جانیں محفوظ رہیں اور مال غنیمت وغیرہ ان کو ملتا رہا لیکن پھر ان کو اعلانیہ طور پر علیحدہ کر دیا گیا ان کو رسوا کر دیا گیا اسے استہزاء سے تعبیر کر دیا گیا اس معنی کے لحاظ سے "ویمدھم" اس کی تفسیر ہوگا اب معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ کچھ دیر کے لئے مہلت دے کر ختم کر دے گا۔

جواب پنجم: مطلب یہ ہوگا کہ "اللہ تعالیٰ ان سے دنیا اور آخرت میں استہزاء والا معاملہ کرے گا" اس ترجمہ کے مطابق دنیا میں استہزا کا معاملہ تو یہی ہے کہ ان کے راز نبی کریم ﷺ پر کھول دیئے گئے حالانکہ وہ اپنے شیطانوں سے چھپ چھپا کر باتیں کرتے تھے اور آخرت میں ان سے استہزاء والا معاملہ یہ ہوگا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب جنت والوں کو جنت میں داخل

کر دیا جائے گا اور جہنم والوں کو جہنم میں تو منافقین کے جہنم والے مقام کے سامنے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ یہ جنت کے دروازہ کو کھلا دیکھ کر اس کی طرف آئیں گے قریب پہنچنے پر دروازہ بند کر دیا جائے گا جنت والے یہ منظر دیکھ کر ہنسیں گے اسی کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ﴿ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴾ آج کے دن ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے۔ (از کبیر)

ان پانچ جوابات کو دیکھ کر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو پھر سے دیکھیں تو عجیب سے عجیب خوب سے خوب تر، کامل ترین ترجمہ نظر آئے گا جس میں یہ پانچ جواب سمٹ کر آ گئے۔

نکتہ: منافقین کے قول ﴿ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ کے جواب میں "یستھزی" کہا ہے مستھزی نہیں کہا حالانکہ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ جواب بھی ان کے قول کے مطابق ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "یستھزی" مضارع ہے جو وقتاً فوقتاً کام کے جاری رہنے پر دلالت کرتا ہے اس سے رب تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہو رہا ہے:

﴿ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ﴾ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بیشک انہیں فتنہ میں مبتلا کیا جاتا سال میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ۔

يَمُدُّهُمْ: حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود اور کچھ دوسرے حضرات نے اس کا معنی کیا ہے "ویملی لھم" ان کو دیر تک فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔ مجاہد نے اس کا معنی کیا ہے "ویزیدھم" ان کو زیادہ دیتا ہے یعنی جتنے ان کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اتنا ہی ان کو مال و دولت وغیرہ زیادہ دیا جاتا ہے وہ اسے نعمت سمجھتے ہیں حالانکہ واقع میں وہی ان کے لئے عذاب ہوتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ☆ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

"پھر جب انہوں نے بھلا دیا جو نصیحتیں ان کو کی گئی تھیں ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب خوش ہوئے اس پر جو انہیں ملا تو ہم نے اچانک انہیں پکڑ لیا اب وہ آس ٹوٹے رہ گئے تو جڑ کاٹ دی گئی ظالموں کی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا مالک ہے"

تقریباً مطلب دونوں معنی کا ایک ہی ہے کیونکہ اصل مقصد بیان ہی یہ ہے جو ابن جریر نے بیان کیا ہے کہ مطلب اس کا یہ ہے " نزیدهم علی وجه الاملاء و الترک لهم فی عتوهم وتمردهم " گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کو زیادہ نعمتیں دیتے ہیں تا کہ وہ ان سے زیادہ دیر نفع حاصل کرلیں ہم ان کو اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں یعنی جلدی سے ان کو عذاب نہیں دیتے کہ وہ حدود سے تجاوز کرتے رہیں سرکشی کرتے رہیں " الطغیان هو المجاوزة فی الشئی " کسی چیز میں جب تجاوز پایا جائے یعنی حد سے بڑھ جائے تو اسے طغیان کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ حَمَلْنٰکُمْ فِی الْجَارِیَةِ ﴾

بیشک ہم نے پانی کو جب حد سے بڑھا دیا تو تمہیں کشتی پر سوار کر دیا چونکہ کفر بھی حد سے بڑھ جانے کا نام ہے اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی کیا ہے " فی طغیانهم یعمهون ای فی کفرهم یترددون " وہ اپنے کفر میں سرگرداں ہوتے ہیں مجاہد اور کچھ دوسرے حضرات نے معنی کیا ہے " فی کفرهم وضلالتهم " وہ اپنے کفر اور گمراہی میں متردد رہتے ہیں مقصد یہاں بھی ایک ہی ہے کہ کفر ہے ہی ضلالت اس لئے گویا کہ ضلالت کفر کی ہی تفسیر ہے۔

یَعْمَهُوْنَ: عمه سے لیا ہوا ہے اس کے مختلف معانی مراد لئے گئے ہیں تاہم مقصد ان سب کا بھی ایک ہی ہے " العمه الضلال " عمه کا معنی بھٹک جانا " العمی فی العین و العمه فی القلب " آنکھ کے اندھے کو اعمی کہتے ہیں اور دل کے اندھے کو اعمه کہا جاتا ہے تاہم بھی عمی کا اطلاق دل کے اندھے پر بھی ہوتا ہے " ذهبت ابله العمهاء اذا لم یدر این ذهبت به " اندھا پن بے وقوف کو کہیں لے جائے اسے معلوم نہ ہو کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے کہ وہ بھٹکتے رہیں متردد رہیں سرگرداں رہیں۔

(از ابن کثیر)

فائدہ: ابھی جن دو آیتوں کی وضاحت بیان کی گئی ان سے یہ واضح ہوا کہ انسانوں میں بھی کئی شیاطین ہیں کیونکہ کفار اور منافقین کے سرداروں کو شیطان کہا گیا اس لئے کہ وہ سرکش اور حد سے تجاوز کرنے والے تھے اس لئے مسلمانوں میں بھی اگر ایسے لوگ ہوں جو سرکش، ظالم، حد سے تجاوز کرنے

والے، غاصب، لیٹرے، جھوٹے فراڈی ہوں تو وہ کافر یا منافق اگرچہ نہیں کافروں یا منافقوں کی طرح شیطان اگرچہ نہیں لیکن منافقوں اور شیطانوں والی صفات ان میں ضرور موجود ہوتی ہیں۔ انسانوں اور جنوں سے شیاطین کا واضح ذکر قرآن پاک کی اس آیۃ کریمہ میں پایا گیا ہے۔

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ﴾

''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن کیے ہیں آدمیوں اور جنوں میں سے شیطان کہ ان میں ایک دوسرے پر خفیہ ڈالتا ہے بناوٹ کی بات دھوکہ کے لئے''

مسند امام احمد میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' نعوذ باللہ من شیاطین الانس والجن '' ''اللہ کی پناہ انسانوں اور جنوں کے شیطانوں سے''

'' فقلت یا رسول اللہ اوللانس شیاطین قال نعم'' میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں (ہوتے ہیں) (از ابن کثیر) دلیل اس پر قرآن پاک سے بیان کی جا چکی ہے ہمارے زمانہ میں '' نعوذ باللہ من شیاطین الانس والجن'' کی کثرت کی جائے۔

فائدہ: زیادہ مال و دولت، زیادہ اولاد، باغات، مکانات وغیرہ کو نعمت ہی نہ سمجھا جائے بلکہ اصل نعمت یہ ہے کہ خوف خدا حاصل ہو محبت مصطفیٰ کریم ﷺ حاصل ہوتا کہ وہ دین پر قائم رہے رب سے دوری، تکبر، سرکشی انسان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے جب تباہی کا وقت آتا ہے تو مال و دولت، اولاد، محافظین، چمچے، کڑچھے کوئی بھی کام نہیں آتے۔ خدا سے ڈریں تباہی سے پہلے انسان بن جائیں تباہ ہونے والے ظالم بادشاہوں کے انجام سے سبق سیکھیں۔

تنبیہ: تفسیر کبیر سے جو وضاحت کی گئی اس سے واضح ہو چکا ہے کہ استہزا کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف بغیر تاویل کے درست نہیں اس لئے اعلیٰ حضرت نے بریکٹ میں یہ الفاظ بڑھائے ہیں اللہ ان سے استھزاء کرتا ہے (جیسا اس کی شان کے لائق ہے) اب تراجم کو دیکھ کر خود فیصلہ کیجئے کون سا ترجمہ رب تعالیٰ کی شان کی لائق ہے:

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ :

اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور ترقی دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں۔	(محمود الحسن صاحب)
اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور بڑھاتا ہے ان کو ان کی شرارت میں بہکے ہوئے۔	(شاہ عبد القادر صاحب)
ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے۔	(فتح محمد صاحب)
اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور ان کی رسی دراز کیے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے جاتے ہیں۔	(مودودی صاحب)
اللہ ٹھٹھا کرتا ہے ان سے اور کھینچتا ہے ان کو بیچ سرکشی ان کے بہکتے ہیں۔	(شاہ رفیع الدین صاحب)
انہیں اللہ بنا رہا ہے۔	(عبد الماجد دریا آبادی صاحب)

اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا اس کی شان کی لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں (اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ) نیز یہ بھی خیال رہے کہ عبد الماجد صاحب نے "یستھزی" کا ترجمہ کیا ہے بنا رہا ہے یہ معنی لغوی بھی نہیں اور مرادی بھی نہیں

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴾

☆ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔

☆ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خریدا گمراہی کو ہدایت کے بدلے ان کو تجارت میں کچھ نفع نہ ہوا اور وہ (تجارت کا طریقہ) جانتے ہی نہ تھے۔

"اُولٰٓئِكَ" کا اشارہ ان منافقین کی طرف ہے جن کے پہلے دو وصف بیان کئے جا چکے ہیں

ایک تو ان کا فسادی ہونا اگر چہ وہ اپنے آپ کو مصلح سمجھتے تھے دوسرا ان کا وصف یہ تھا کہ وہ بے وقوف تھے لیکن اپنے آپ کو عقل مند سمجھتے تھے اب ان کی بے وقوفی کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ انہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو خریدا کتنے وہ بے وقوف تھے کہ ایسی تجارت کر رہے تھے کہ ان کا اصل سرمایہ بھی تباہ ہو رہا تھا۔

اعتراض: اشتراء کا معنی خریدنا ہوتا ہے بیع کا معنی بیچنا یہ ان کا زیادہ استعمال ہے اگر چہ بیع کا معنی بیچنا اور خریدنا دونوں ہی آتے ہیں اور شراء کے بھی دونوں معنی آتے ہیں۔ اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ بیع کی تعریف فقہاء کرام یہ کرتے ہیں " البیع ھو مبادلة المال بالمال بالتراضی بالایجاب والقبول او بالتعاطی " بیع کا مطلب یہ ہے کہ مال کو مال سے تبدیل کیا جائے فریقین کی رضامندی پائی جائے ایجاب وقبول پایا جائے یا بغیر کلام کے ثمن دے کر مبیع لے لیا جائے۔ یہاں تو ہدایت یا ضلالۃ دونوں میں سے کوئی ایک بھی مال نہیں تو " اشتروا " کا مطلب کیا ہوگا۔

جواب: یہاں اشتراء کا حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد لیا گیا ہے یعنی گمراہی (ضلالت) کو بیع سے تشبیہ دی گئی اور " ھدی " کو ثمن سے۔

اعتراض: منافقین کے پاس تو ہدایت تھی ہی نہیں وہ تو کافر تھے انہوں نے کس طرح ہدایت کے بدلے ضلالت کو حاصل کیا؟

جواب: بعض حضرات کا یہاں قول یہ ہے کہ ان کے پاس ہدایت تھی اور بعض کا قول یہ ہے کہ ان کے پاس ہدایت نہیں تھی جن حضرات کا قول یہ ہے کہ ان کے پاس ہدایت نہیں تھی ان کے قول کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا ہے کہ اس مقام میں شراء کا معنی ایک چیز دے کر دوسری اس کے بدلہ میں لینا مراد نہیں:

" لان المنافقین لم یکونوا مؤمنین فیبیعون ایمانھم " اس لئے کہ منافقین تو مؤمن تھے ہی نہیں کہ وہ اپنے ایمان کو بیچتے۔

اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا:

" اخذوا الضلالة وترکو الھدی "

انہوں نے گمراہی کو حاصل کیا اور ہدایت کو چھوڑا۔ اسی قول کے مطابق " اشتروا " کا ایک معنی یہ ہے " استحبوا " ضلالت سے مراد کفر اور ہدایت سے مراد ایمان ہے اب معنی یہ ہوگا "استحبوا الکفر علی الایمان " انہوں نے کفر کو ایمان پر پسند کیا یعنی انہوں نے کفر سے محبت کی اسے حاصل کیا اور ایمان کو پسند نہیں کیا اس لئے اسے چھوڑ دیا۔

(از قرطبی)

اور جن حضرات نے کہا کہ ان کے پاس ہدایت تھی انہوں نے بھی شراء کا معنی تو مجازی ہی لیا ہے حقیقی معنی نہیں لیا اس قول کے مطابق معنی یہ ہوگا " استبدلوا الضلالۃ بالھدی " انہوں نے ہدایت دے کر اس کے بدلے میں گمراہی کو حاصل کر لیا ان کے پاس ہدایت کیا تھی اس میں پھر دو قول ہیں ایک یہ:

" ولا مریۃ فی ان ذلک کان حاصلا لاولئک المنافقین بما شاھدوہ من الآیات الباھرۃ والمعجزات القاھرۃ والارشاد العظیم والنصح والتعلیم لکنھم نبذوا ذلک فوقعوا فی مھاوی المھالک "

" اس میں کوئی شک نہیں کہ منافقین کو کچھ ظاہری طور پر ہدایت حاصل تھی کیونکہ وہ روشن آیات، قاہر معجزات، بہت بڑی راہنمائی یعنی رشد وہدایت، نصیحت، تعلیم کا مشاہدہ کر رہے تھے نبی کریم ﷺ سے براہ راست ان چیزوں کو حاصل کر رہے تھے یہ ظاہری طور پر ان کو ہدایت حاصل تھی لیکن وہ اسے چھوڑ کر پس پشت ڈال کر ہلاکت کے ہاویہ میں گر گئے"

لیکن اس قول کے مطابق ہدایت کا مجازی معنی مراد ہے حقیقی نہیں "اویقال المراد بالھدی الھدی الجبلی وقد کان حاصلا لھم حقیقۃ فان کل مولود یولد علی الفطرۃ " یا یہ کہا جائے کہ ان کو حقیقی طور پر ہدایت حاصل تھی اس ہدایت سے مراد فطرتی، جبلی، پیدائشی ہدایت ہے کیونکہ ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس میں اسلام قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے اسے ضائع کر کے گمراہی کو حاصل کر لیا اب بھی اشتروا کا معنی تبدیل کرنا ہی ہوگا۔ (از روح المعانی) راقم کے نزدیک یہی قول معتبر ہے جیسا کہ ﴿ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴾ کی وضاحت سے مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ: اللہ تعالیٰ نے نفع کو تجارت کی طرف منسوب کیا کیونکہ عربی

حضرات کا محاورہ یہ تھا کہ وہ اس طرح کہتے تھے " ربح بیعک " تیری بیع نے نفع دیا۔ حالانکہ اصل میں اس طرح ہونا چاہیے " ربحت فی بیعک " تجھے اپنی بیع میں نفع ہوا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "خسرت صفقتک " تیرے سودے نے نقصان پہنچایا حالانکہ اصل میں یوں ہونا چاہیے "خسرت فی صفقتک " تونے اپنے سودے میں نقصان اٹھایا (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ظاہر محاورہ کے مطابق ہے)

" فما ربحت تجارتھم ای ما ربحوا فیھا اشار بذلک ان اسناد الربح للتجارۃ مجاز عقلی وحقہ ان یسند للتجر " (جلالین، صاوی)

جلالین میں ﴿ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ ﴾ کا معنیٰ کیا گیا ہے ان کو تجارت میں کچھ نفع نہ ہوا اس پر صاوی نے ذکر کیا کہ یہاں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آیۃ کریمہ میں مجاز عقلی پایا گیا ہے کیونکہ ربح کی نسبت تجارت کی طرف مجاز عقلی ہے حق یہ تھا کہ تاجروں کی طرف نسبت کی جاتی جلالین کے " ما ربحوا فیھا " کے الفاظ کو دیکھ کر شائد راقم کا ترجمہ بھی منصفین کو درست نظر آئے:

" الربح الفضل علی راس المال ولذلک سمی شفا بکسر الشین الفضل " (بیضاوی، شیخ زادہ)

اصل سرمایہ سے جو زیادہ مال حاصل ہو اس نفع کو " ربح " کہا جاتا ہے اسی کو شفا بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ : وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے یعنی تجارت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ نفع حاصل ہو جائے لیکن ایسا تاجر جو اپنا اصل سرمایہ ہی برباد کردے وہ تجارت کے طریقہ سے بے خبر ہوتا ہے ایسے ہی منافقین بھی تھے:

" وھم ضیعوا راس المال وھی الفطرۃ وما حصلوا الفضل با دراک الحق ونیل الکمال " (مظھری)

کیونکہ انہوں نے اپنا اصلی سرمایہ ہی ضائع کر دیا تھا وہ حق کو پالینے اور کمال کو حاصل کر لینے کا نفع کیا حاصل کرتے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے اسی آیۃ کی تفسیر میں کہا ہے:

" قد واللہ رائیتموھم خرجوا من الھدی الی الضلالۃ ومن الجماعۃ الی الفرقۃ ومن الامن الی الخوف ومن السنۃ الی البدعۃ " (ابن کثیر)

''قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ تم ان کو دیکھتے ہو وہ ہدایت سے گمراہی کی طرف چلے گئے جماعت (یعنی مومنوں کی جماعت) کو چھوڑ کر انہوں نے تفرقہ کی راہ کو اختیار کیا، ایمان اور اسلام کی جو امن کی راہ ہے اسے چھوڑ کر انہوں نے کفر کی راہ کو اختیار کیا جو خوف کی راہ ہے، سنت کو چھوڑ کر بدعت کو انہوں نے حاصل کر لیا''

فائدہ: یہ خیال رہے کہ ہر بدعت کو ضلالت اور گمراہی سے تعبیر کرنا جہالت ہے بلکہ بدعت کی پانچ قسمیں ہیں۔

﴿اقسام بدعات﴾

نمبر ۱ **واجب:** جس طرح قرآن پاک اور حدیث پاک کو سمجھنے کے لئے علم نحو کا پڑھنا۔

نمبر ۲ **حرام:** اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرح جسم ثابت کرنا بندے کو پتھر کی طرح غیر مختار سمجھنا وغیرہ۔

نمبر ۳ **مستحب:** دینی مدارس قائم کرنا سرائے بنانا اور ہر بہتر کام جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں نہیں تھا۔

نمبر ۴ **مکروہ:** ہر ایسا کام جس کے کرنے سے سنت کی ترک لازم آئے تو اگر سنت غیر مؤکدہ کی ترک لازم آئے تو مکروہ تنزیہی اور اگر سنت مؤکدہ کی ترک لازم آئے تو مکروہ تحریمی۔ بعض کے نزدیک جس سے واجب کی ترک لازم آئے وہ مکروہ تحریمی ہے

نمبر ۵ **مباح:** جیسے صبح یا عصر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا لیکن بغیر سلام کے مصافحہ کرنے کا یہ حکم ہے اور اگر مصافحہ کے ساتھ سلام بھی ہو تو مستحب ہوگا۔ بیہقی نے مناقب امام شافعی رحمہ اللہ میں ان کا ہی قول نقل کیا:

" المحدثات من الامور ضربان احدهما ما احدث مما يخالف كتابا او سنة او اثرا او اجماعا فهذه البدعة الضلالة والثانی ما احدث من الخير لا خلاف فيه لواحد من هذا هذه محدثة غير مذمومة"

(الحاوی للفتاوی ج ۱ ص ۱۹۲)

''نئے امور یعنی بدعات کی دو قسمیں ہیں ایک ان میں سے یہ ہے کہ ایسا نیا کام جو

قرآن یا حدیث یا آثار صحابہ یا اجماع امت کے مخالف ہو یہ بدعت گمراہی ہے یعنی نا جائز ہے اس سے اجتناب ضروری ہے دوسری قسم ان میں سے یہ ہے کہ کوئی نیا کام ہو لیکن نیکی کا کام ہو اس کے جائز ہونے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں بلکہ بالاتفاق جائز ہے اور مستحسن ہے اس پر عمل کرنا باعث ثواب ہے اور یہ بدعت کسی طرح بھی بری نہیں"

نئے کاموں کے ایجاد کے لئے نبی کریم ﷺ نے ضابطہ بیان فرمایا:

" قال رسول الله ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شئی ومن سن فی الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شئی "
(مشکوۃ کتاب العلم)

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کرتا ہے اسے اس کا ثواب ملے گا اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی اس کو ثواب ملے گا اور ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ رائج کرتا ہے اس کو برے طریقہ کے رواج دینے کا گناہ ہوگا اور جتنے آدمی اس پر عمل کریں گے ان کے عمل کے مطابق بھی اسے گناہ ہوگا اور ان عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی"

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ اسلام میں اچھا طریقہ رائج کرنا منع نہیں بلکہ نیکیوں کا سبب ہے اور برا طریقہ رائج کرنا گناہوں کا سبب ہے اس سے بچنا ضروری ہے۔ معلوم نہیں کہ لوگ کتنی ہی بدعات کے مرتکب ہونے کے باوجود جو بات پسند نہ آئے جس میں نبی کریم ﷺ کی شان پائی جائے اسے بدعت کہہ کر اور ضلالت کہہ کر کیوں گمراہ ہو رہے ہیں۔

ذرا انصاف تو کریں کبھی طالبان کے حق میں جلوس، کبھی واجپائی کے آنے کے خلاف جلوس، کبھی کارگل سے فوجیں ہٹانے کے خلاف جلوس، کبھی امریکہ کے خلاف جلوس، کبھی امام کعبہ کے استقبال کے لئے جلوس، کبھی مریدکے میں جلوس، کبھی لاہور میں جلوس، کبھی مظفر آباد میں جلوس، کبھی دھرنے مارنے کے لئے جلوس جائز ہوں۔

لیکن میلاد النبی ﷺ کا جلوس ناجائز ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے وجہ صرف ایک نظر آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شان پسند نہیں شانِ مصطفےٰ کریم ﷺ کی رفعت دیکھ کر یہ لوگ جل جاتے ہیں ورنہ سب جلوسوں میں لوگوں کا اجتماع، بینر، جھنڈے، ڈنڈے، گاڑیاں، لاؤڈ سپیکر، تقریریں مشترک ہیں ہاں فرق یہ ہے کہ میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں نعت خوانی ہوتی ہے نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان کئے جاتے ہیں کسی کے خلاف تقریر نہیں ہوتی پولیس پر پتھراؤ نہیں ہوتا کسی کی غیبت نہیں ہوتی کسی کی برائی بیان نہیں ہوتی۔ لیکن باقی جلوسوں میں یہ سارے کام ہوتے ہیں۔ اب آپ سے صرف یہ سوال کرنا ہے کہ انصاف سے بتائیں کہ میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں کون سی چیز ان لوگوں کو ناجائز نظر آتی ہے مجھے تو صرف یہی سمجھ آیا کہ نبی کریم ﷺ کی شان کا بیان کرنا ان کو پسند نہیں۔ ورنہ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ پاک جلوس ناجائز ہو ناپاک جلوس جائز ہو جائیں۔

ہدایت کے بدلے گمراہی حاصل کرنے کا ایک واقعہ:

ملک غسان کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ جبلہ ابن ایہم تھا جو کہ نصرانی تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اسلام قبول کر لیا مکہ مکرمہ میں گیا دوران طواف اس کی چادر پر بنی فزارہ کے ایک شخص کا پاؤں آ گیا جبلہ نے اسے تھپڑ مار دیا جس کی وجہ سے اس کے ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور دانت بھی ٹوٹ گیا۔ وہ بنی فزارہ کا مظلوم شخص اپنی فریاد لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا شکایت کی آپ نے فیصلہ فرمایا کہ جبلہ کو یا معاف کرانا پڑے گا یا قصاص دینا پڑے گا اس نے بڑے تعجب سے یہ سوال کیا " اتقتص منی وانا ملک وهو سوقة " کیا مجھ سے قصاص لیا جائے گا جب کہ میں بادشاہ ہوں وہ ایک عام دہقانی شخص ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا خوب جواب دیا " شملک واياه الاسلام فلا تفاضل بينكما الا فی العاقبة " اب وہ اور تم دونوں مسلمان ہو تمہیں ایک دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہاں جس کا انجام اچھا ہوا وہ افضل ہوگا جبلہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک دن کی مہلت طلب کی رات کو بھاگ کر ملک شام چلا گیا اور العیاذ باللہ مرتد ہو گیا اگرچہ ایمان تو اسے نصیب نہ ہو سکا تاہم وہ نادم ضرور ہوا اس نے اپنی ندامت کو یوں ذکر کیا:

تنصرت بعد الحق عارا للطمة
وما كان فيها لو صبرت لها ضرر

میں حق کے بعد ایک تھپڑ کی عار سے نصرانی ہو گیا۔ اگر میں صبر سے تھپڑ کھا لیتا تو اس میں کیا نقصان تھا

و ادرکنی فیها لجاج حمیة   فبعت لها العین الصحیحة بالعور

مجھے حمیت کی گہرائی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا، میں نے صحیح آنکھ کو بیچ کر ضائع آنکھ کو حاصل کر لیا

فیا لیت امی لم تلدنی ولیتنی   صبرت علی القول الذی قاله عمر

کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا کاش   میں اس بات پر صبر کر لیتا جو عمر نے کہی

(شیخ زادہ علی البیضاوی)

اس واقعہ سے اسلام کا نظام انصاف سمجھ آیا کہ مجرم کو کلیسا میں تو پناہ مل سکتی ہے لیکن اسلام میں حاکم کسی مجرم کو پناہ دے یہ ممکن نہیں اور مساوات محمدی کی ایک جھلک نظر آئی کہ اسلام میں بادشاہ اور غریب کا کوئی فرق نہیں انصاف میں سب برابر ہیں۔

تراجم کا تقابلی جائزہ: میں نے کئی سال پہلے تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کیا اس اپنی کاوش کا نام تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان رکھا۔ ذرا ایک نظر اس پر:

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ :

ترجمہ	مترجم
☆ اور نہ ہوئے وہ راہ پانے والے۔	(محمود الحسن صاحب)
☆ اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے۔	(اشرف علی صاحب)
☆ اور یہ ہرگز صحیح راستہ پر نہیں۔	(مودودی صاحب)
☆ اور نہ وہ ہدایت یاب ہی ہوئے۔	(فتح محمد صاحب)
☆ اور نہ راہ پائے۔	(شاہ عبد القادر صاحب)
☆ اور نہ ہوئے راہ پانے والے۔	(شاہ رفیع الدین صاحب)
☆ اور نہ وہ راہ یاب ہوئے۔	(عبد الماجد صاحب)
☆ اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔	(اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کے آئینہ میں دیکھیں بفضلہ تعالیٰ صاف وشفاف نظر آئے گا۔

مدارک میں ہے:

﴿ وما كانوا مهتدين لطريق التجارة ﴾ ''وہ طریقہ تجارت کی راہ نہیں جانتے تھے''

جلالین میں ہے '' وما كانوا مهتدين فيما فعلوا '' اس پر حاشیہ میں ہے '' فيما فعلو اى الى طرق التجارة ''، مقصد اس کا بھی یہی کہ وہ طریقہ تجارت کو نہیں جانتے تھے۔ بیضاوی شریف میں ہے:

'' وما كانوا مهتدين لطرق التجارة فان المقصود عنها سلامة رأس المال والربح وهؤلاء قد اضاعوا الطلبتين لان راس ما لهم كان الفطرة السليمة والعقل الصرف فلما اعتقدوا هذه الضلالات بطل استعدادهم واختل عقلهم ولم يبق لهم راس مال يتوسلون به الى درك الحق ونيل الكمال فبقوا خاسرين آيسين من الربح فاقدين للاصل ''

''یعنی وہ تجارت (سودے) کی راہ نہیں جانتے تھے کیونکہ تجارت میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصلی سرمایہ محفوظ رہے اور نفع بھی حاصل ہو اور ان لوگوں نے دونوں کو ضائع کر دیا کیونکہ اصل ان کا سرمایہ فطرت سلیمہ اور عقل خالص تھا لیکن اعتقاد باطلہ کی وجہ سے ان کی استعداد باطل ہوگئی عقلوں میں فتور آ گیا اور ان کا اصل سرمایہ جو حق کو پانے اور حصول کی کمالات کا ذریعہ تھا وہ ضائع ہوگیا پس اس طرح وہ اصل مال کے ضائع کرنے کی وجہ سے خسارے میں ہوئے اور نفع سے محروم رہے''

تفسیر بیضاوی کی وضاحت سے بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید حاصل ہوئی۔ اسی طرح بیضاوی پر شیخ زادہ میں یہ ہے '' فظهر ان من اشترى الضلالة بالهدى كما يلزمه ان يكون خاسرا فى التجارة '' یعنی جو شخص ہدایت کے بدلے گمراہی کو حاصل کرتا ہے وہ اپنی تجارت میں خسارے میں رہتا ہے۔ ﴿ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴾ پر شیخ زادہ نے یہ تحریر کیا ہے '' ان المرام بعدم الاعتداء عدم اهتدائهم لطريق التجارة '' ان کے ہدایت نہ پانے سے یہ مراد ہے کہ وہ سودے کی راہ نہیں جانتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی واضح ہوگئی جو کہ معتبر تفاسیر کی بحثوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

(تسكين الجنان ص ۳۱، ۳۲)

﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِی ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴾

"ان کی کہاوت اس کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی تو جب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سوجھتا"

"ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی جب اس کے اردگرد کو آگ نے بہت روشن کر دیا اللہ انکے نور کو لے گیا اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ دیکھ نہیں سکتے"

فائدہ: ایمان کو نور سے اور کفر کو ظلمت سے تشبیہ قرآن پاک میں کئی مقامات پر دی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نور (روشنی) حیرانگی کو زائل کرتا ہے اور کامل طور پر راستہ کی ہدایت اس میں پائی جاتی ہے اسی طرح ایمان سے تحیر زائل ہوتا ہے اور دین میں کامل منفعت پائی جاتی ہے۔ کفر کو ظلمت سے تشبیہ دی گئی ہے اس لئے کہ تاریکی میں انسان راستہ سے بھٹک جاتا ہے اور متحیر ہوتا ہے ایسے ہی کفر کی وجہ سے صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے اور تحیر میں مبتلا ہوتا ہے۔ (از کبیر)

منافقین کو آگ جلانے والے سے تشبیہ کیوں دی؟

منافقوں کے حال کو تاریکی میں آگ سے روشنی حاصل کرنے والے سے تشبیہ اس لئے دی کی اس میں غرابت پائی گئی ہے " کانه قیل قصتهم العجیبة کقصة الذی استو قد نارا " گویا کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان منافقوں کا قصہ بھی عجیب ہے جیسا کہ تاریکی میں آگ جلانے اور روشنی کے ختم ہونے پر متحیر ہونے والوں کا قصہ عجیب ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: جماعت کو واحد سے کیسے تشبیہ دی گئی مثلهم، بنورهم، ترکهم میں ضمائر جمع کی ہیں اسی طرح لا یبصرون جمع ہے اور "الذی استو قد" واحد ہے۔

جواب: الذی لغت میں جمع کی جگہ عام طور پر واقع ہوتا رہتا ہے جیسا کہ " وخضتم

کالذی خاضوا " میں "الذی "مقام جمع میں واقع ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ " الذی "جنس کے لئے استعمال ہو جنس میں کثرت کے پائے جانے کا بھی احتمال ہوسکتا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ "الذی " واحد ہی ہے الذین کی جگہ تو استعمال نہیں البتہ مجازی طور پر اس کا معنی جمع والا سے لیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ " الذی استو قد " سے مراد فوج ہو کہ منافقوں کی مثال اس فوج کی طرح ہے جس نے آگ جلائی اس صورت میں جمع کو جمع سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ منافقین کی ذاتوں کو آگ جلانے والوں کی ذاتوں سے تشبیہ نہ دی گئی ہو بلکہ ایک قصہ کو قصہ سے تشبیہ دی گئی ہو اس صورت میں جماعت کو واحد سے تشبیہ دینے کی کوئی صورت نہیں۔ (از کبیر)

" استوقد ای اوقد " یہاں سین اور تا طلب کے لئے نہیں یعنی معنی آگ کا بھڑکانا اس میں طلب والا معنی نہیں (جلالین، صاوی) " وقود النار هو سطوعها وارتفاع لهبها " وقود النار کا مطلب آگ کو روشن کرنا اس کے شعلوں کو بلند کرنا " نــار "ایک جوہر لطیف ہے جس میں روشنی، حرارت اور جلانے کی تاثیر پائی جاتی ہے اصل میں یہ لفظ لیا ہوا ہے نــار ، ینور سے جب کہ کوئی بھاگ جائے نار میں بھی حرکت اور اضطراب پایا جاتا ہے اس لئے اسے " نار " کہا جاتا ہے نور بھی اسی سے مشتق ہے نار کی ضوء (روشنی) کو ہی نور بھی کہا جاتا ہے " ظــلــمة " کا معنی ہے نور کا نہ پایا جانا البتہ اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اس میں نور کے پائے جانے کی وجہ سے ظلمت ختم ہو جائے یعنی نور اور ظلمۃ میں نسبت عدم وملکہ کی ہے۔

اَضَــآءَ تْ: اضاءۃ اور اظلام یہ دونوں لفظ لازم بھی استعمال ہوتے ہیں اور متعدی بھی یعنی ان کا معنی روشن ہونا اور تاریک ہو جانا بھی ہے اور روشن کرنا اور تاریک کرنا بھی ہے جیسا قرینہ ہوگا ویسا ہی معنی ہوگا اس مقام میں متعدی ہے یعنی جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا اگرچہ متعدی والا معنی زیادہ مناسب ہے تاہم لازم والا معنی لینے کا احتمال بھی ہے کہ اضاءت میں ضمیر ماحولہ کی طرف لوٹے اس کے اردگرد مکانات اور اشیاء روشن ہوگئیں۔ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ لازم والا کیا ہے راقم نے علامہ رازی رحمہ اللہ کے ان الفاظ " وهنــا الاقــرب انها متعدية " کو دیکھ کر متعدی والا ترجمہ کر دیا تاکہ قارئین کو اس کی دونوں حالتوں کا پتہ چل جائے۔ حضور پرنور سید یوم النشور علیہ السلام کے زمانہ میں منافق دو

قسم کے تھے ایک تو اسلام کے سخت دشمن مگر بظاہر ہمدرد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے ان کو ﴿اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾ سے بیان کیا۔ دوسرے جو طبیعت کے کمزور تھے نہ حامی تھے نہ مخالف جدھر فائدہ نظر آتا ادھر ہو جاتے اس آیت میں اسی قسم کو بیان کیا گیا ہے۔ (از الحسنات)

اس مثال سے منافقوں کے حال کو بیان کیا گیا کہ جسطرح کوئی شخص اندھیری رات میں روشنی حاصل کرنے کیلئے آگ جلائے اور جب اس کا اردگرد روشن ہو جائے تو وہ آگ کی روشنی جاتی رہی اب وہ آگ جلانے سے پہلے کی حالت سے بھی زیادہ تاریکی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت منافقوں کی تھی کہ وہ کفر کی تاریکی میں مبتلا تھے لیکن مومنوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے اسلام سے بظاہر روشنی بھی حاصل کر لیتے تھے لیکن انکے مکروفریب کی وجہ سے وہ ظاہری روشنی بھی رب تعالیٰ نے ضائع کر دی تو وہ تاریکیوں میں ڈوب گئے کہ انہیں کچھ بھی نہ دکھائی دیا۔ مَثَل (میم اور ثاء پر فتحہ) اور مِثل (میم کے نیچے کسرہ) اور مثیل، شبہ، شبہ اور شبیہ کی طرح ہیں انکا معنی ہوتا ہے کسی کا ہم مثل ہونا مشابہ ہونا یعنی نظیر اور مثیل اور شبیہ تقریباً ایک معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ پھر ''مثل'' کا لفظ عجیب وغریب ضرب المثل پر بولا جاتا ہے پھر مجازی طور پر حالت، صفت اور قصہ کو ''مثل'' کہہ لیتے ہیں۔

مثال سے سمجھانے کا فائدہ: مثال سے کسی مسئلہ کو سمجھانا دلوں میں زیادہ تاثیر پیدا کرتا ہے کیونکہ اس چیز کے اوصاف کو بیان کرنا اتنا زیادہ مؤثر نہیں ہوتا۔ مثال سے بیان کرنے میں غرض یہ ہوتی ہے کہ جلی کے ذریعے خفی کو واضح کیا جائے اور شاہد کے ذریعے غائب کی وضاحت کی جائے اس طرح ماہیت پر زیادہ واقفی حاصل ہو جاتی ہے عقل میں آنے والی چیز محسوس کے درجہ میں آ جاتی ہے۔ صرف ایمان کا ذکر اتنا مؤثر نہیں جتنا اس کو نور سے تشبیہ دے کر سمجھانے سے اثر حاصل ہوتا ہے اسی طرح صرف کفر کے ذکر کرنے سے کفر کا قبیح (برا ہونا) ہونا اتنا سمجھ میں نہیں آ سکتا جتنا کہ کفر کو تاریکی سے تشبیہ دینے سے اس کا قبیح ہونا واضح ہوگا۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے اس کے فائدہ کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾

''اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں وہ سمجھیں''

(ماخوذ از کبیر)

اعتراض: جس شخص کو نور دے کر سلب کر لیا جائے اس سے منافقوں کو تشبیہ کیسے دی گئی جب کہ ان کو نور حاصل ہی نہیں اور اس لحاظ پر بھی تشبیہ کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آگ جلانے والا روشنی سے نفع کچھ دیر کے لئے تو حاصل کر لیتا ہے پھر محروم ہوتا ہے لیکن منافقوں کو تو نفع حاصل ہی نہیں ہوتا۔ پھر اس لحاظ پر تشبیہ درست نظر نہیں آتی کہ آگ جلا کر روشنی حاصل کرنے والا اس روشنی سے نفع حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کی روشنی کو ضائع کر دیتا ہے لیکن منافق تو بھلائی کو حاصل ہی نہیں کرنا چاہتے۔

جواب: جن حضرات کے نزدیک منافقوں کو ہدایت حاصل تھی ان کی طرف سے تو جواب یہ ہوگا کہ انہوں نے جب اسلام کو ظاہر کیا تو وہ اپنے آپ کو قتل سے بچانے اور اپنے مالوں کی سلامتی اور مال غنیمت کے حصول اور اپنی اولاد کو قید سے بچانے میں کامیاب ہو گئے یہ گویا کہ انہیں نور حاصل ہوا لیکن مسلمانوں سے استہزاء اور دھوکہ بازی سے ان کا نور جاتا رہا۔ لیکن وہ لوگ جن کے نزدیک منافقوں کو ہدایت حاصل ہی نہیں تھی ان کی طرف سے جواب یہ ہے کہ یہاں تشبیہ جمیع وجوہ میں نہیں بلکہ صرف ایک وجہ میں ہے وہ یہ کہ جس طرح آگ جلانے والا روشنی کے ضائع ہونے میں متحیر (حیران) ہوتا ہے اسی طرح منافقین بھی متحیر تھے یعنی وجہ شبہ صرف ان کی حیرانگی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

ظلمات کو جمع لانے کی وجہ: ظلمات کو جمع اس لئے لایا گیا کہ منافقوں کو موت کے بعد کئی تاریکیاں ان کا احاطہ کریں گی:

اول: ظلمت کفر۔

دوم: ظلمت مکر و فریب، جو انہوں نے مومنوں سے مکر و فریب کیا تھا۔

سوم: ظلمت دروغ و افتراء جو انہوں نے اپنے آپ کو جھوٹ کے طور پر مومن کہا تھا حالانکہ وہ مومن نہیں تھے۔

چہارم: ظلمت طعن و تشنیع، یعنی انہوں نے خالص مومنوں کو جو بے وقوف کہا اسکی تاریکی بھی ان پر چھائے ہوگی۔

پنجم: ظلمت جہل مرکب، یعنی جو انہوں نے فسادی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اصلاح کرنے والا کہا گویا کہ وہ اپنے حال کو جاننے سے بھی بے خبر رہے۔

ششم: ظلمات معاصی وشہوات، یعنی ان کے وہ گناہ اور نافرمانیاں جن میں وہ منافقت سے پہلے ہی مبتلا تھے لیکن منافقت سے انہوں نے ان معاصی اور شہوات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی

ہفتم: ظلمت قبر، قبر میں ان کو شدید ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑے گا قبر کے مختلف عذابوں میں مبتلا ہوں گے اور قبر کی شدید تاریکی ان کو حاصل ہوگی۔ (از عزیزی)

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ ظلمات کو جمع لانے کی وجہ بیان کرتے ہیں ان کو ظلمت کفر حاصل ہے کیونکہ کفر ہے ہی ظلمت کے مشابہ اسی طرح ان کو ظلمت نفاق حاصل ہے کیونکہ منافقت میں بھی باطنی طور پر کفر ہی ہے جو ظلمت ہے اور قیامت کے دن ان کو ظلمت حاصل ہوگی ﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ جس دن تم ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو دیکھو گے انکا نور ان کے آگے اور ان کے دہنے دوڑتا ہوگا یعنی جب مومنوں کو قیامت کے دن نور حاصل ہوگا منافقوں کو ظلمت حاصل ہوگی اور انکو ظلمت ضلال حاصل ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی ظلمت حاصل ہوگی اور ان کو نہ ختم ہونے والے عذاب کی ظلمت حاصل ہوگی۔ اور انکو شدید ظلمت حاصل ہوگی ان تمام ظلمات کو ذکر کرنے کے بعد ذکر کیا" كانها ظلمات متراكمة " گویا کہ انکو کثیر ظلمتیں حاصل ہوں گی جو ایک دوسرے کے اوپر نیچے تہ بتہ حاصل ہوں گی۔

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

تقریباً واضح یہ ہوا کہ عزیزی اور بیضاوی میں ذکر کی گئی تمام ہی ظلمتیں ان کو حاصل ہوں گی بلکہ ان سے بھی زائدہ ہوں گی اسی وجہ سے ظلمات کو جمع ذکر کیا گیا۔

خیال رہے راقم نے جو " فلما اضاءت " کے ترجمہ میں ''بہت روشن'' کے الفاظ ذکر کیے ہیں وہ تفسیر ابی السعود سے لئے ہیں " الاضاءة فرط الانارة " اضاءۃ کا معنی ہے ''بہت زیادہ روشن کرنا''۔

(ابو السعود)

﴿ صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴾

''بہرے گونگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں''

''یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں تو وہ نہیں پھریں گے''

صم: حق بات کو سننے سے وہ بہرے ہیں اس لئے کہ وہ حق بات کو قبول نہیں کرتے جو حق بات کو قبول نہ کرے وہ ایسے ہی جیسا کہ اس نے سنا ہی نہیں۔

بکم: حق بات چونکہ وہ کہتے ہی نہیں تھے جب وہ حق کلام نہیں کرتے تھے تو گویا کہ وہ گونگے تھے ان میں بولنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔

عمی: ان کو بصیرت حاصل نہیں تھی کہ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کرسکیں جس کو بصیرت حاصل نہ ہو اسے بصارت بھی حاصل نہیں ہوتی یعنی جس شخص میں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ پائی جائے گویا کہ اسے دیکھنے کی صلاحیت بھی حاصل نہیں خیال رہے کہ ان کے حواس درست تھے سنتے تھے، دیکھتے تھے، بولتے تھے لیکن جب حق کو سننے سے ان کے کان بند تھے تو وہ اس لحاظ پر بہرے تھے اور جب حق بات ان کی زبان پر نہیں آتی تھی تو گویا کہ وہ گونگے تھے۔

ما حولہ: ایک چیز کے ارد گرد آس پاس جو چیزیں متصل (قریب) ہوں ان کو ماحول کہا جاتا ہے حال یحول کا لغوی معنی پھرنا متغیر ہونا ہے سال کو حول کہتے ہیں اس لئے کہ وہ بھی پھرتا رہتا ہے جب کسی کے قرض وغیرہ کو اس سے ہٹا کر کوئی شخص اپنے ذمہ لگالے تو اسے حوالہ کہا جاتا ہے اس میں بھی بدلنا پایا گیا جب کسی فعل کا کوئی طالب نہ ہو اس کے بعد فعل کی طلب کرنا محاولہ کہلاتا ہے آنکھ کے بدلنے کو حول کہتے ہیں اسی وجہ سے بھینگے کو احول کہا جاتا ہے

ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ: بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جب ﴿ فَلَمَّا اَضَآءَتْ ﴾ ذکر کیا گیا ہے تو اس کے جواب میں '' ذھب اللہ بضوئھم'' ہونا چاہئے تھا بنورھم کیوں کہا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کامل تاریکی کا ذکر کرنا مقصود تھا وہ بنورھم سے ہی حاصل ہوسکتا تھا بضوئھم سے حاصل

نہیں ہوسکتا تھا۔اگر " ذهب الله بضوئهم " کہا جاتا تو اس میں وہم ہوسکتا تھا کہ شائد بہت زیادہ روشنی کو ماند کر کے تھوڑی روشنی رہنے دی گئی ہو کیونکہ " ضوء " زیادہ روشنی کو کہا جاتا ہے اور " نور " اصل روشنی کو کہا جاتا ہے جب کہا " ذهب الله بنورهم " تو اس سے واضح کر دیا کہ اللہ ان کی روشنی کو مکمل طور پر لے جائے " والغرض ازالة النور بالكلية " مقصد بیان ان کے نور کو کلی طور پر زائل کرنا ہے اسی وجہ سے اس کے بعد اس کمال زوال پر دلالت کرنے کے لئے ﴿ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴾ ذکر فرمایا کیونکہ " ظلمة " کا معنی ہے "عدم النور " نور کا نہ پایا جانا پھر اسے جمع اور نکرہ ذکر کر کے کامل تاریکی کا ذکر فرمادیا۔ (از کبیر)

اس کے بعد "لا يبصرون " مزید اس پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ " ومفعول لا يبصرون من قبيل المطروح المتروك ، لا يبصرون " کا مفعول مقدر نہیں بلکہ اسے گویا کہ ذکر ہی نہیں کیا گیا تا کہ اس میں عموم پیدا ہو جائے جیسا کہ " والله يدعو الى دار السلام " اور اللہ ہر ایک کو دار اسلام کی طرف بلاتا ہے یہاں مفعول کو مکمل طور پر چھوڑنے سے عموم سمجھ آیا کہ یہاں مفعول " كل احد " ہے۔اسی طرح یہاں معنی یہ ہے " لا يبصرون شيئا "وہ کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے (از بیضاوی) اسی مبالغہ والے معنی کو اعلیٰ حضرت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے "میں کچھ نہیں سوجھتا" اور راقم نے یوں بیان کیا" وہ دیکھ نہیں سکتے" گویا کہ سخت تاریکی کی وجہ سے ان کے دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔

ایک عجیب علمی نکتہ: " ذهب " لازم ہے اس کا معنی ہے "وہ گیا" جب اس کے بعد "با" آجائے تو یہ متعدی ہو جاتا ہے۔اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے "لے جانا" جیسا کہ یہاں استعمال ہوا ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ اللہ ان کے نور کو لے گیا اسی طرح باب افعال پر آ کر بھی متعدی ہوتا ہے اگر اس طرح ہوتا " اذهب الله نورهم " تو پھر بھی معنی یہی ہوتا اللہ ان کے نور کو لے گیا۔تو کیا وجہ ہے کہ ﴿ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ﴾ کہا ہے " اذهب الله نورهم " ذکر نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ "اذهب" اور "ذهب به " میں فرق یہ ہے کہ اذھب کا معنی ہے ایک جگہ سے ہٹانا اور اس کو جانے والا بنانا۔لیکن جب یہ کہا جائے "ذهب به " تو اس کا معنی ہوتا ہے وہ ساتھ لے گیا یعنی بہ اس مقام

میں معہ کے معنی میں ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ " جب یوسف کے بھائی اس کو اپنے ساتھ لے گئے یہاں گویا کہ معنی یہ ہے " اخذ الله نورهم وامسكه "ان کے نور کو اللہ نے لے لیا ہے اور اپنے پاس روک لیا ہے لیکن یہ معنیٰ " اذهب '' میں نہیں سمجھ آ سکتا۔ (از کبیر)

قربان جاؤں قرآن تیری عظمت پہ تیرے ایک ایک لفظ میں کتنے موجزن سمندر موجود ہیں۔

اور جب حق و باطل کے درمیان ان میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں تھی بلکہ اپنے عیوب کو بھی وہ سمجھنے سے قاصر تھے اس لحاظ پر وہ اندھے تھے یعنی تھے تو وہ دل کے اندھے لیکن ایسے ہی تھے جیسے کہ آنکھوں کے اندھے ہوتے ہیں۔

فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ: وہ اپنی گمراہی اور منافقت سے پھر کر حق کی طرف آنے والے نہیں تھے بلکہ وہ اپنی منافقت کو ہی اپنا کمال سمجھ رہے تھے وہ اپنے فساد کو اصلاح کہہ رہے تھے وہ اپنی بے وقوفی کو عقل مندی سمجھ رہے تھے تو اس حال سے پھرنا ان سے کیسے ہو سکتا تھا (از خازن) ان دونوں آیتوں کے متعلق صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ ان کی مثال ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کچھ ہدایت دی یا اس پر قدرت بخشی پھر انہوں نے اس کو ضائع کر دیا اور ابدی دولت کو حاصل نہ کیا ان کا مال حسرت و افسوس اور حیرت و خوف ہے اس میں وہ منافق بھی داخل ہیں جنہوں نے اظہار ایمان کیا اور دل میں کفر رکھ کر اقرار کی روشنی کو ضائع کر دیا اور وہ بھی جو مومن ہونے کے مرتد ہو گئے اور وہ بھی جنہیں فطرت سلیمہ عطا ہوئی اور دلائل کی روشنی نے حق کو واضح کیا۔ مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور گمراہی اختیار کی اور جب حق سننے ماننے کہنے راہ حق دیکھنے سے محروم ہوئے تو کان زبان آنکھ سب بے کار ہیں۔

(خزائن العرفان)

☆☆☆

﴿ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾

☆ ''یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے''

☆ ''یا پھر جیسے زور کی بارش برس رہی ہو بادل سے جس میں تاریکیاں ہوں اور گرج اور چمک ہو وہ اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس رہے ہوں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ نے کافروں کا احاطہ کیا ہوا ہے''

منافقوں کی حالت کو ایک دوسری مثال سے بیان کیا جا رہا ہے یا تو اس مثال سے منافقوں کی دوسری قسم کے لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جیسا کہ پہلے تفسیر الحسنات کے حوالہ سے ذکر کیا۔ یا یہ ہے کہ منافقوں کے حال کو دو مثالوں سے بیان کیا گیا ہے۔ تمام منافقوں کو ان دو مثالوں سے بیان کیا جا رہا ہے۔ یہی قول زیادہ مفسرین نے پسند کیا ہے۔ غزالی دوراں حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کے مطابق تفسیر فرمائی ہے۔ یعنی جس طرح کثیر بارش ہو رہی ہو اور اس میں رات کی تاریکی بھی ہو بارش کی کثرت کی وجہ سے تاریکی بھی ہو اور بادلوں کے سایہ کی وجہ سے تاریکی بھی ہو اور اس میں کڑک بھی ہو اور بجلی کی چمک بھی ہو کڑک کی وجہ سے ایسے حال میں مبتلا ہونے والوں کو موت کا خطرہ لاحق ہو جائے وہ اپنے آپ کو اس ڈر سے بچانے کے لئے اپنی انگلیوں کو کانوں میں ٹھونس دیں۔

تنبیہ: اس آیۃ کریمہ میں جو مثال بیان کی گئی ہے اس کی وضاحت انشاءاللہ اس آیۃ اور آنے والی آیۃ کی لفظی بحث مکمل کرنے کے بعد کی جائے گی اس پر ''مقصد بیان'' کا عنوان قائم کر دیا جائیگا۔

دینی مدارس کے طلباء کے فائدہ کے لئے:

"او" "یاتو" "وائو" کے معنی میں ہے جیسا کہ اس شعر میں اسی معنی میں استعمال ہے " قال الخلافة او کانت له قدرا ، کما اتی ربه موسی علی قدر " اور بعض حضرات نے کہا" او للتخییر ای مثلوهم بهذا او بهذا " ، "او "تخییر کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ منافقوں کی یہ مثال دیں یا پہلی مثال دیں۔

(از قرطبی)

خیال رہے کہ تفسیر الحسنات سے منافقوں کی دو قسمیں اور ہر قسم کے مطابق ایک مثال کا جو ذکر پہلے کیا ہے اس کے مطابق "او" تنویع کے لئے ہے۔

کَصَیِّبٍ: کاف کا معنی ہے مثل، صیب اصل میں صیوب ہے صوب سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے اترنا اوپر سے نیچے پلٹنا پھر یہ بادل اور بارش پر بولا جاتا ہے آیۃ کریمہ میں جو لفظ " صیب " استعمال ہے اس میں دونوں احتمال پائے جاسکتے ہیں کہ بارش مراد ہو یا بادل لیکن بعد میں " من السماء " کے ذکر سے یہی معنی لینا زیادہ مناسب ہے " ارید به نوع من المطر شدید " کہ اس سے مراد شدید بارش ہے۔

(از بیضاوی)

مِنَ السَّمَآءِ: " السماء " مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کی جمع اسمیة (بروزن اعونة) اور سماوات اور سمی (بروزن مفعول) لیکن اب تعلیل کے بعد سین پر ضمہ اور میم کے نیچے کسرہ ہے " السماء کل ما علاک فاظلک " ہر وہ چیز جو تم سے بلند ہو اور تمہیں سایہ کرے اسے " سماء " کہہ لیا جاتا ہے۔ " السماء " کے آسمان، کمرے کا چھت، بارش مشہور معانی ہیں اسی طرح " سماء " کا معنی بادل بھی عام طور پر استعمال ہوتا رہتا ہے۔ کیچڑ اور گھاس کو بھی " سماء " کہا جاتا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے " ما زلنا نطأ السماء حتی اتیناکم " ہم کیچڑ اور گھاس کو روندتے ہوئے تمہارے پاس آ گئے گھوڑے کی پیٹھ کو بھی سماء کہہ لیا جاتا ہے کہ اس میں بھی بلندی پائی گئی ہے۔ ہر بلند چیز کو سماء کہا جاتا ہے اور ہر پست چیز کو ارض کہہ لیا جاتا ہے۔

(از قرطبی)

فِیْهِ ظُلُمٰتٌ: بارش میں تاریکیاں ہوں یعنی رات کی بھی تاریکی ہو بارش کی کثرت کی وجہ سے بھی تاریکی ہو اور بادلوں کے سائے کی بھی تاریکی ہو۔

(از بیضاوی)

وَرَعْدٌ: رعد کیا ہے اس پر ترمذی کی ایک حدیث کی طرف توجہ کریں:

"عن ابن عباس قال سألت اليهود النبی عن الرعد ما هو؟ قال ملک من الملائکة معه مخاريق من نار يسوق بها السحاب حيث شاء الله فقالوا فما هذا الصوت الذی نسمع ؟ قال زجره بالسحاب اذا زجره حتی ينتهی الی حيث امر الله قالوا صدقت"

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہود نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا رعد کیا ہے" آپ نے فرمایا وہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ (جو بادلوں پر مقرر کیا ہوا ہے) اس کے پاس آگ کی گرزیں ہوتی ہیں وہ ان سے بادلوں کو چلاتا ہے۔ انہوں نے کہا پھر یہ آواز کیا ہے جو ہم سنتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ فرشتے کی گرجدار آواز ہے جب وہ بادلوں کو زجر کرتے ہوئے آواز نکالتا ہے اور بادلوں کو وہاں تک پہنچا دیتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہوتا ہے"

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ بارش میں کڑک فرشتہ کی گرجدار آواز ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کسی کی گرجدار آواز کو لغت عرب میں " **رعد اور صواعق** " کا استعمال معلوم (یقینی واضح) ہے جیسا کہ لبید نے زمانہ جاہلیت میں اپنے اس شعر میں دونوں لفظوں کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے:

فجعنی الرعد والصواعق بال　　فارس يوم الكريهة النجد

"مجھے نجد کی شدید لڑائی کے دن سواروں کی گرجدار کڑکتی ہوئی آواز نے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا"

" وروی عن ابن عباس انه قال الرعد ريح تختفق بين السحاب فتصوت ذلک الصوت "

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بادل کے درمیان پھنس جانے والی ہوا جب باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے اس آواز کو رعد (کڑک) کہا جاتا ہے"

وَّبَرْقٌ: (چمک) اس پر حضرت علی ابن مسعود ابن عباس رضی اللہ عنہم کی روایت مشاہدہ ہو کہ برق کیا ہے " **البرق مخراق حديد بيد الملک يسوق به السحاب** "فرشتے کے ہاتھ میں لوہے کی گرز ہوتی ہے جس سے وہ بادلوں کو چلاتا ہے اسے (اس کی چمک کو) برق کہا جاتا ہے۔" **وعن ابن**

عباس ایضا، هو سوط من نور بید الملک یزجر به السحاب " حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ فرشتے کے ہاتھ میں ایک روشن کوڑا ہوتا ہے جس سے وہ بادلوں کو چلاتا ہے اسے برق کہا جاتا ہے " وعنه ایضا، البرق ملک یتراء ی " حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ فرشتے کی چمک کو برق کہا جاتا ہے۔ (از قرطبی)

تمام روایات میں تطبیق: جتنی روایات بیان کی گئی ہیں سب کا مطلب ایک ہے ذرا اسکو یوں بیان کر کے دیکھیں ایک نورانی فرشتہ بادلوں پر مقرر ہوتا ہے جو ان کو رب تعالیٰ کے حکم سے چلاتا جہاں رب تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے وہاں پہنچا دیتا ہے اس کے ہاتھ میں لوہے کی گرز (کوڑا) آگ میں گرم کیا ہوا چمکدار ہوتا ہے وہ جب بادلوں کو چلاتا ہے تو اس سے پہلے بادلوں میں ہوا رکی ہوئی ہوتی ہے جیسا کہ کسی کا گلا گھونٹا ہوا ہو۔ وہ نورانی فرشتہ اپنی زوردار آواز سے اپنے کوڑے کو حرکت دیتا ہے بادل پھٹ جاتے ہیں۔ جب بادل پھٹتے ہیں تو ان سے بھی ایک زوردار آواز سے اپنے کوڑے کو حرکت دیتا ہے اس طرح فرشتے کی گرجدار آواز اور بادلوں کے پھٹنے اور ہوا کے نکلنے سے زوردار آواز مجتمع ہو کر کڑک پیدا کرتی ہیں۔ اور نورانی فرشتہ کی نورانیت اور اس کے ہاتھ میں لوہے کا آگ میں گرم کیا ہوا چمکدار کوڑا جو روشنی پیدا کرتے ہیں۔ اسی فرشتے کی نورانیت اور کوڑے کی چمک کو مجتمع ہونے سے اس چمک میں شدت آ جاتی ہے اسی کو برق کہا جاتا ہے۔ (راقم)

رعد کا لغوی معنی: رعد کا معنی حرکت، اضطراب ہے بزدلی کی وجہ سے کانپنے والے ہاتھ کو رعد کہا جاتا ہے۔ ارتعد کا معنی ہے وہ مضطرب ہوا کندھوں کے کانپنے کے لئے حدیث شریف میں " ترعد فرائصهما " استعمال ہوا ہے کڑک میں بھی اضطراب ہوتا ہے اس لئے اسے رعد کہا گیا ہے۔

برق کا لغوی معنی: اصل اس کا بریق ہے جس کا معنی چمکنا روشن ہونا۔ نبی کریم علیہ السلام جس سواری پر معراج کی رات سوار ہوئے اسے براق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ نورانی اور برق رفتار تھا۔ آسمانی بجلی اور اس کی چمک کو برق کہا جاتا ہے۔ (از قرطبی)

فلاسفہ کا مذہب: فلاسفہ کہتے ہیں کہ گرمی سے پانی بخار بن جاتا ہے اور زمین کے اجزاء سے دھواں

جیسے لکڑی سے دھواں بنتا ہے اور دیگچی وغیرہ سے گرم پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے اسے بخار کہا جاتا ہے اور یہ زمین کا دھواں جب ہوا کی حرکت سے بڑھ کر کرۂ آگ تک پہنچتا ہے اور وہاں جا کر روشن ہو جاتا ہے تو کبھی تو چند روز تک روشن رہتا ہے تو مدار ستارے اور نیزے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی روشن ہو کر جلد بجھ جاتا ہے جس کو شہاب کہتے ہیں (ستارہ ٹوٹا) اور کبھی روشن نہیں ہوتا بلکہ جل جاتا ہے اور آسمان کی سرخی اور سیاہی بن کر نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح بخار زمین سے اٹھ کر چند صورتیں اختیار کر لیتا ہے ایک یہ کہ زیادہ اونچا ہو کر جم جاتا ہے اور قطرہ قطرہ ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے اس جمے ہوئے بخار کو بادل اور قطروں کو بارش کہتے ہیں۔ اور کبھی یہ بخار زیادہ اونچا نہیں جاتا بلکہ زمین کے قریب ہی سردی سے جم کر گر جاتا ہے اس کو شبنم یا اوس کہتے ہیں اور کبھی سخت سردی کی وجہ سے یہ بخار راستہ ہی سے جم کر زمین پر گر پڑتا ہے اس کو اولہ (ژالہ) کہتے ہیں یہ جو ابھی تک بیان کیا ہے اس میں بخار اور دھوئیں کے علیحدہ علیحدہ حالات بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آفتاب کی گرمی پا کر بخار دھواں اور غبار مخلوط ہو کر زمین سے اوپر اٹھتے ہیں اور وہاں پہنچ کر علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ غبار الٹا واپس آتا ہے اسی کا نام آندھی ہے اور بخار اور دھواں ٹھنڈک کی حد کو پہنچتے ہیں جہاں بخار ٹھنڈا ہو کر بادل بن جاتا ہے اور دھواں اس کو چیر کر اوپر جانا چاہتا ہے کہ جس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی آواز کا نام اردو میں گرج اور عربی رعد ہے اور کبھی یہ دھواں۔ تیز حرکت کی وجہ سے بھڑک کر روشن ہو جاتا ہے اسی کو اردو میں بجلی اور عربی میں برق کہتے ہیں۔ اور کبھی سخت سردی کی وجہ سے یہ دھواں بھی جم کر زمین کی طرف لوٹتا ہے یہ جما ہوا دھواں جب بادل کو چیرتا ہے تو اس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے اور زمین پر گر کر بہت سی چیزوں کو فنا کر دیتا ہے اسی کو عربی میں صاعقہ اور اردو میں بجلی گرنا کہتے ہیں۔ اس کی قوت اس قدر ہے کہ دریا میں گر کر مچھلیوں کو بھی جلا ڈالتا ہے بعض جگہ یہ بجھی ہوئی بجلی لوہے کی شکل میں ملی ہے یہ وہی پکا ہوا اور جما ہوا دھواں ہے۔

(از نعیمی)

میرے خیال میں مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے یہ بحث ھدیہ سعیدیہ سے لی ہے چونکہ علامہ خیر آبادی رحمہ اللہ کی طرز پر ہی حضرت مفتی صاحب نے بعد میں یہ تحریر فرمایا ہے مگر دل کے بہلانے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے: یہ سب عقلی ڈھکوسلے ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ تمام قدرت کے کرشمے ہیں۔

راقم کا خیال: راقم کے نزدیک صورت یہ ہے کہ فلاسفہ نے جن چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ اسباب ہیں اور کسی سبب کا مؤثر ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ سبب مؤثر ہو اور چاہے تو مؤثر نہ ہو حقیقت یہی ہے کہ یہ سب قدرت کے کرشمے ہیں لیکن ان کے اسباب بھی ہیں۔ خاص کر کے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں رعد کی جو تعریف بیان ہوئی کہ بادلوں میں ہوا محبوس ہو جاتی ہے اور بادل پھٹتے ہیں تو ہواز وردار آواز سے باہر آتی ہے تو ایک کڑک پیدا ہوتی ہے۔ اس روایت میں اور فلاسفہ کے قول میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض فلاسفہ اپنی بدبختی کی وجہ سے مومن نہ بن سکے کیونکہ انہوں نے بہت سے باطل نظریات کو اپنے عقائد میں شامل کر لیا۔

اسباب کا مؤثر ہونا قدرت کے تابع ہے:

جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے کہ رب تعالیٰ چاہے تو کسی سبب کو موثر بنا دے اور چاہے تو سبب ہو لیکن مؤثر نہ بنائے۔ اس پر ایک شعر ہی پیش کرنا کافی ہے جو مستانہ گجراتی مرحوم اپنی نعت سے پہلے پڑھا کرتے تھے:

دو موتوں سے بوت بنایا نام رکھایا پوت   کرم کرے تے بھلا بھلا نہیں تے موت دا موت

یعنی دو نطفوں کو ملا کر جسم بنایا جس کا نام بیٹا رکھا۔ مہربانی فرمادے تو اس کی طرف سے بھلائی نہ مہربانی فرمائے تو نطفہ ہی رہے گا۔ واضح ہوا کہ نطفہ اولاد کا سبب تو ہے لیکن اس کا مؤثر ہونا رب تعالیٰ کی مہربانی سے ہے رب کی مہربانی نہ ہو تو وہ نطفہ غیر موثر ہو جاتا ہے۔

فائدہ جلیلہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ اور شام کے درمیان ہم سفر میں تھے شدید آندھی چلنے لگی اور سخت بارش ہونے لگی جس میں کڑک بھی تھی اور بجلی کی چمک بھی۔ لوگ مختلف جگہ میں پناہ لینے کے لئے متفرق ہو گئے۔ مجھے کعب نے کہا جس آدمی نے کڑک کو سن کر یہ پڑھا " سبحان اللہ من یسبح الرعد بحمدہ و الملائکۃ من خیفتہ " وہ کڑک اور ژالہ باری سے محفوظ رہے گا میں نے اور کعب نے یہ الفاظ پڑھ لئے (تو ہم کڑک اور ژالہ باری سے بفضلہ تعالیٰ محفوظ رہے) جب صبح ہوئی لوگ جمع ہوئے تو میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا اے امیر المؤمنین لوگ جس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہم تو اس سے محفوظ رہے۔ آپ

نے فرمایا'' وہ کیسے؟ تو میں نے ان کو بتایا جو عمل حضرت کعب نے بتایا تھا آپ نے کہا ''سبحان اللہ افلا قلتم لنا فنقول کما قلتم'' سبحان اللہ تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا ہم بھی پڑھ لیتے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اسی موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ناک ژالہ لگنے سے متاثر ہوا۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ جب کڑک اور گرج سنتے تو یہ پڑھتے:

'' اللهم لا تقتلنا بغضبک ولا تهلکنا بعذابک وعافنا قبل ذلک '' (قرطبی)

يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ :

وہ اپنی انگلیوں کو اپنے کانوں میں ٹھونستے ہیں اس لئے کہ قرآن پاک کو نہ سن سکیں ایسا نہ ہو کہ قرآن سن کر قرآن پر اور اللہ تعالیٰ پر اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئیں۔'' وذلک عندهم کفر والکفر موت '' کیونکہ ایمان لانے کو وہ کفر سمجھتے تھے اور کفر کو موت سمجھتے۔ (از قرطبی)

خیال رہے کہ وہ انگلیوں کے پورے کانوں میں داخل کرتے تھے پوری انگلیوں کو کانوں میں داخل کرنا ممکن ہی نہیں لیکن اس سے مبالغہ ثابت کیا گیا کہ وہ انگلیاں داخل کرنے میں گویا کہ اتنی کوشش کرتے کہ پوری انگلیاں کانوں میں گھس آئیں تا کہ وہ ذرا بھی قرآن نہ سن سکیں۔ (از بیضاوی)

مِنَ الصَّوَاعِقِ: من اجل الصواعق، کڑک کی وجہ سے۔ صواعق جمع ہے صاعقہ کی۔ حضرت ابن عباس، مجاہد وغیرہ نے بیان فرمایا ہے کہ بادلوں پر مقرر فرشتہ جب شدید غصہ سے منہ سے بات نکالتا ہے تو وہ آگ کے شعلہ کی حیثیت رکھتا ہے اسی کو صواعق کہا جاتا ہے۔ خلیل نے کہا ''رعد کی آواز سے شدت پیدا ہوتی ہے اس میں بعض اوقات جلا دینے والی آگ بھی ہوتی ہے وہی صاعقہ ہے ابوزید نے کہا سخت کڑک میں آسمانوں سے گرنے والی آگ صاعقہ ہے۔ گرجدار آواز جو عذاب بن کر آئے اسے بھی صاعقہ کہا جاتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ ﴾ ان کو رسوا کن عذاب کی کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ کبھی ''صعق'' کا معنی بے ہوش ہونا آتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ﴾ ''موسیٰ بے ہوش کر گر پڑے'' کبھی ''صعق'' کا معنی ''موت'' آتا ہے جیسا کہ ﴿ فَصَعِقَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ ﴾ صور پھونکنے پر آسمانوں اور زمین والی تمام مخلوق مرجائے گی۔ (از قرطبی)

راقم کی وضاحت: فلاسفہ کے نزدیک صاعقہ کا جو معنی بیان کیا گیا ہے یا دوسرے اقوال جو بیان کئے گئے ہیں ان تمام کو جمع کر کے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ بادلوں پر مقرر فرشتہ کی منہ سے شدت غضب کے وقت نکلنے والی آگ کی طرح بات اور زمین سے اٹھنے والے دھوئیں کا بادلوں کو چیرتے وقت آگ کا آسمانوں سے گر کر چیزوں کو فنا کر دینے کا نام صاعقہ ہے اس طرح یہاں واقع ہونے والے صواعق میں کوئی اختلاف نہ رہا بلکہ مطلب ایک ہوگا البتہ دوسرے مقامات پر صاعقہ اور معانی میں بھی استعمال ہے جیسا کہ قرآنی آیات سے واضح کر دیا گیا۔

حَذَرَ الْمَوْتِ: موت کے ڈر کی وجہ سے " والموت ضد الحیاۃ " حیات کی ضد کو موت کہا جاتا ہے وہ زمین جس کا انسانوں میں سے کوئی مالک نہ ہو اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھاتا ہو اسے موات کہا جاتا ہے " والموتان (بالتحریک) خلاف الحیوان "حیوان کے خلاف موتان (میم اور واؤ پر فتحہ) کا استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے " اشتر الموتان ولا تشتر الحیوان " زمین اور مکان خرید، غلام اور چوپائے نہ خرید و اس مثال میں " موتان " سے مراد زمین اور مکان ہے "مؤتہ" اس زمین کا نام ہے جس میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ (از قرطبی)

وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ: اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کا احاطہ کیا ہوا ہے " ای لا یفوتونہ " کوئی کافر بھی رب تعالیٰ سے بھاگ کر نہیں جاسکے گا جیسا کہ کہا جاتا ہے " احاط السلطان بفلان " بادشاہ نے فلاں کا ہر طرف سے احاطہ کیا ہوا ہے یعنی اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اسی طرح کہا جاتا ہے " فاللہ سبحانہ محیط بجمیع المخلوقات " یعنی تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور اس کے قہر کے نیچے ہے جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ تمام زمین قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہوگی۔ احاطہ کا معنی علم بھی ہے اس معنی کے لحاظ پر ﴿ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾ کا مطلب ہوگا اللہ تعالیٰ کافروں کو جاننے والا ہے یہ معنی رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے ثابت ہے۔ ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو علم کے ذریعے احاطہ کرنے والا ہے اور ایک معنی ہلاک کرنا جمع کرنا بھی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِلَّا اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ﴾ مگر یہ کہ تم تمام کو ہلاک کر دیا جائے۔ (قرطبی)

راقم کے نزدیک سب معانی جمع ہیں:

﴿ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰافِرِيْنَ ﴾ اللہ تعالیٰ تمام کافروں کو جانتا ہے کوئی اس سے بھاگ کر کہیں جانہیں سکے گا وہ سب کو جمع کر کے عذاب میں مبتلا کر کے ہلاک کردے گا۔

اعتراض: ذکر منافقوں کا ہو رہا ہے ان کو ہی مثالوں سے بیان کیا جارہا ہے تو کافروں کا ذکر کیسے آ گیا۔

جواب: قرآن پاک کی یہی عظمت ہے کہ ایک لفظ سے کئی معانی سمجھا دیئے جاتے ہیں یعنی پہلے ان کافروں کا ذکر کیا جو بد بخت ہمیشہ کے لئے کفر پر رہ کر مرنے والے ہیں پھر منافقوں کا ذکر کیا باطنی طور پر وہ بھی کافر ہیں جن کے کفر کو ﴿ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ سے ثابت کردیا گیا کہ وہ ایمان والے نہیں ﴿ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾ سے حکم عمومی ثابت کردیا کہ ظاہری کافر، باطنی کافر یعنی کفر پر مرنے والے سارے ہی اس میں داخل ہیں۔

﴿ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَا اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾

۱ ''بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا بیشک اللہ سب کچھ کرسکتا ہے''

۲ ''قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی اچک لے جب بھی ان کے لئے روشنی ہوئی وہ اس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اگر اللہ چاہتا تو ان کی بینائی اور شنوائی لے جاتا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

یَكَادُ الْبَرْقُ: کاد افعال مقاربہ ہے اس لئے واضح کیا گیا ہے کہ اس سے یہ ثابت ہو کہ خبر کا پایا جانا قریب ہے لیکن پائی نہیں گئی یا کسی مانع کے عارض ہونے کی وجہ سے نہیں پائی گئی یا شرط ہی نہیں پائی گئی (بیضاوی) ہاں البتہ قرآن پاک کے بغیر عربی شعراء نے اس کی خبر کو وجود میں بھی استعمال کیا ہے جیسا کہ روبہ نے کہا " قد کاد من طول البلی ان یمصحا " زیادہ دیر گزر جانے کی وجہ سے نشانات تقریباً مٹ چکے ہیں۔ اس مصرع میں " کاد " کے بعد اس کی خبر کا تقریباً وقوع ثابت کیا گیا ہے (از قرطبی) اور یہ بھی خیال رہے کہ " عسی " کی خبر کے پائے جانے کی امید پائی جاتی ہے یعنی اس کا پایا جانا قریب ہوتا ہے۔

(بیضاوی)

یَخْطَفُ: " الخطف الاخذ بسرعة " جلدی سے کسی چیز کو لے لینا اسے عربی میں خطف کہا جاتا ہے اور اردو میں '' اچک لینا '' ایک پرندہ جو بہت تیزی سے اڑتا ہے اسے خطاف (خاء پر پیش) کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک نے خوف دلانے کے لئے اسے مثال کے طور پر پیش کیا ہے اب معنی یہ ہوگا " ان خوفهم مما ينزل بهم يكاد يذهب ابصارهم " بیشک ان کو خوف ہوتا ہے کہ ان پر بجلی گر کر ان کی بینائی کو ہی زائل نہ کر دے۔ خطف باب سمع پر بھی آتا ہے اور ضرب پر بھی اسی مقام میں ایک قراءت میں "يتخطف" بھی آیا ہوا ہے۔

اَبْصَارَهُمْ: ابصار جمع ہے بصر کی " وهی حاسة الردية " یہ دیکھنے والی قوت کو کہا جاتا ہے جسے ہم اپنی زبان میں نظر، نگاہ، بینائی کہہ لیتے ہیں۔

(قرطبی)

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ کی بحث بعد میں آئے گی ابھی دونوں آیتوں سے حاصل ہونے والے مقصد کو بیان کیا جاتا ہے۔

مقصد بیان: جس کہاوت اور ضرب المثل سے منافقوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ کہاوت یہ ہے جب بادل ہو اس میں کڑک اور چمک ہو بادل کی تاریکی کے ساتھ رات کی تاریکی اور بارش کی کثرت کی تاریکی بھی جمع ہو جائیں اس میں بجلی بھی گر رہی ہو۔ ایسی حالت میں پھنس جانے والے لوگ موت سے ڈر کر اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس رہے ہوں انہیں یہ بھی خطرہ ہو کہ کہیں بجلی ہماری

نظروں کو ہی ضائع نہ کر دے۔ لیکن جب بجلی چمکتی ہے تو وہ اس روشنی میں کچھ چل بھی لیتے ہیں اور جب بجلی کی چمک ختم ہو جاتی ہے تو بہت زیادہ تاریکی چھا جاتی ہے وہ متحیر (بہت حیران) ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ تین تاریکیوں کے بعد اچانک روشنی ہو کر پھر جب ختم ہو جاتی ہے تو حیرت بڑھ جاتی ہے بلکہ وہ اندھیرا آنکھوں میں پہلے سے بھی بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔

منافقین کو اس کہاوت سے مشابہت کیسے؟

اس میں مشابہت کی چند وجوہ پائی گئی ہیں سب کو دیکھ کر سمجھنا کوئی مشکل نہیں:

(۱) منافقوں کی حیرت اور دین میں جہالت کو ان لوگوں سے مشابہت دی گئی کہ جس طرح بادل میں پھنس جانے والے تاریکیوں کی وجہ سے راہ نہیں دیکھ سکتے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے اسی طرح منافقین بھی اپنے تحیر اور دین میں جاہل ہونے کی وجہ سے سیدھی راہ نہیں چل رہے اور نہ ہی کامیابی کو حاصل کرنے کی راہ انہوں نے اختیار کی۔

(۲) بارش اگرچہ نفع مند ہے لیکن جب اس میں کڑک ہو، چمک ہو اور بجلی کے گرنے کا خطرہ ہو بلکہ بجلی گر رہی ہو تو ایسی صورت میں بارش نقصان دہ ہوتی ہے نفع مند نہیں ہوتی۔ ایمان کو ظاہر کرنا بھی نفع مند ہوتا ہے لیکن جب کہ اسکے ساتھ باطنی ایمان بھی پایا جائے خلوص اعتقاد ہو دل میں بھی ایمان ہو اور زبان پر بھی ایمان ہو لیکن جب خلوص نہ ہو منافقت پائی جائے اب ایمان کا ظاہر کرنا نقصان دہ، نفع مند نہیں یعنی منافقت انسان کو جہنم کا ایندھن بنا دیتی ہے۔

(۳) جو لوگ خالص مومن ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں انہیں معلوم ہوتا ہے کڑک، گرج وغیرہ سے انگلیوں کو کانوں میں ٹھونسنا نفع نہیں دے سکتا جو بھی ہونا ہے وہی ہونا ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کم ہوتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا ان کے لئے نفع مند ہے حالانکہ ان کی یہ سوچ غلط ہے۔ ان لوگوں سے ہی منافقوں کی اس حالت کو تشبیہ دی گئی کہ منافق لوگ مومنوں کے سامنے ایمان کا اظہار کرتے اور کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں وہ یہ سمجھتے کہ ہمارے لئے ایسا کرنا نفع مند ہے حالانکہ یہ ان کی سوچ غلط تھی کیونکہ رب تعالیٰ نے ان کی چالبازوں کو بے نقاب کر کے ذلیل کر دیا۔

(۴) جس طرح بجلی کی کڑک سے موت کے ڈر کی وجہ سے وہ انگلیاں کانوں میں ٹھونستے تھے اسی

طرح منافقین جہاد میں شریک ہونے سے گھبراتے تھے اور اگر جاتے تو وہاں سے بھاگ آتے مختلف حیلے، بہانے بنا کر واپس لوٹ آتے کیونکہ یہ بھی ڈرتے تھے کہ مر جائیں گے اور قتل ہو جائیں گی۔

(۵) جس طرح کڑک، گرج میں مبتلا ہونے والے موت سے ڈر کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر یہ سمجھتے کہ ہم موت سے بچ جائیں گے ان کو یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا " **فان الموت والهلاک من ورائهم لا مخلص لهم** " کہ موت اور ہلاکت کو ان کا پیچھا کر رہی ہے اس سے ان کو چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے بھی یہی مضمون سمجھ میں آ رہا ہے " **قل ان الموت الذی تفرون منه فانه ملا قیکم** " اے محبوب آپ فرما دیں بیشک وہ موت جس سے تم بھاگ رہے ہو بیشک وہ تمہیں ملنے والی ہے۔ یہی حال تھا منافقین کا وہ یہ سمجھتے تھے کہ شائد مومنوں کے سامنے ایمان کا اظہار کر کے وہ رب تعالیٰ کے عذاب سے بچ جائیں گے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا:

" **ان الذی یخوضون فیه لا مخلص من عذاب النار** "

''کہ وہ جو کوشش کر رہے ہیں یہ ان کو جہنم کے عذاب سے چھٹکارا نہیں دلا سکے گی''

(۶) جس طرح بادل کی وجہ سے کڑک اور بجلی کی چمک میں مبتلا ہونے والا شخص بہت زیادہ حیران و پریشان ہوتا ہے کیونکہ ہر طرف سے مختلف اندھیروں کا اسے سامنا کرنا پڑ رہا ہے بجلی گرنے کا اسے خوف ہے۔ ایسے ہی منافقین دین میں بہت زیادہ حیران تھے کسی راہ کو متعین کرنا ان سے نہیں ہو رہا تھا اور ہر وقت ان کو یہ خوف دامن گیر رہتا کہ اگر ہمارے باطنی کفر کا مومنوں کو پتہ چل گیا تو یہ ہمیں قتل کر دیں گے:

" **فلا یکاد الوجل والخوف یزول عن قلبه مع النفاق** "

''منافق جب تک منافق ہے اس کے دل سے ڈر اور خوف نہیں نکل سکتا''

(۷) ایمان اور قرآن پاک کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے اور تاریکیوں اور کڑک اور چمک سے منافقوں کو مشکل میں ڈالنے والی چیزوں کو تشبیہ دی گئی ہے۔ منافقوں کو مشکل چیزیں جو نظر آتی تھیں وہ یہ تھیں نماز ادا کرنا، روزہ رکھنا اپنی ریاست و سرداری کو چھوڑنا اور جہاد کرنا خصوصاً اپنے

ہی رشتہ داروں سے جہاد کرنا ان کے لئے اور ہی مشکل کا سبب تھا اور اپنے پرانے دین کو چھوڑنا اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت کرنا یہ تمام چیزیں وہ اپنے لئے بہت شاق سمجھتے تھے۔ان تمام چیزوں سے بچنے کے لئے وہ ایمان اور قرآن سے بھی بچتے تھے جیسا کہ اندھیرے، کڑک اور چمک سے بچنے کے لئے انسان بارش کو بھی ناپسند کرے۔

(۸) جس طرح اندھیرے میں اچانک بجلی کی چمک ہونے پر بادل میں گھرے ہوئے چلنا شروع کرلیں اسی طرح منافقین کے مال جب محفوظ رہتے اور ان کی جانیں محفوظ رہتیں اور مالِ غنیمت حاصل ہوتا تو دین کو پسند کرتے۔

(۹) جس طرح بجلی کی چمک کے ختم ہونے پر اندھیرا چھا جانے پر وہ کھڑے ہو جاتے اسی طرح منافقین کو بھی اگر مالِ غنیمت حاصل نہ ہوتا اور کسی قسم کا دنیاوی نفع نہ حاصل ہوتا تو وہ دین کو ناپسند کرنا شروع کر دیتے۔ (از کبیر)

(۱۰) جب بھی ان کے احوال بہتر ہوتے کھیتی باڑی، مال مویشی میں ترقی ہوتی اور ان کو نعمتیں زیادہ حاصل ہوتیں تو کہتے:

" دین محمد دین مبارک " ، ''محمد کا دین مبارک دین ہے''

گویا کہ وہ جب روشنی ہوتی تو چلتے اور جب ان پر کوئی مصیبت آتی اور قحط سالی میں مبتلا ہوتے " ثبتوا فی نفاقھم "اپنی منافقت میں قائم رہتے یعنی اندھیرا چھا جانے پر چلنے سے رک جاتے۔(از قرطبی)

فائدہ: صوفیاء کرام نے بیان فرمایا کہ اسی مثال سے ایک اور مطلب بھی سمجھ میں آ گیا کہ اگر کسی شخص کے ابتدائی طور پر ہی احوال ارادہ صحیح نہ ہوں وہ اپنے باطل گمان اور جھوٹے دعوی سے اکابر کے درجہ میں ہونا ظاہر کرے تو گویا کہ اس نے اپنے آپ کو شیخ ظاہر کر کے بارش کو ظاہر کیا جھوٹے دعووں سے اپنے آپ کو بجلی اور کڑک کا مستحق ٹھہرایا۔ (از قرطبی)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ :

" لو " حرف تمنی ہے شرط کے معنی میں استعمال ہے اس کی جزاء " لذھب " ہے یعنی اگر اللہ تعالٰی چاہتا تو مومنوں کو ان پر ابتدائی طور پر ہی مطلع کر دیتا کہ وہ ان کو قتل کر دیتے اور اپنے آپ سے

ان کو دور کر دیتے۔ سمع اور بصر کا ذکر اس لئے کیا کہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یا اس لئے کہ انسان کے یہ اشرف اعضاء ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: " الشئی یختص بالموجود " موجود کے ساتھ شے خاص ہے اصل میں یہ مصدر ہے " شاء " کا جس کا معنی ہے اس نے موجود کیا معتزلہ نے " شئی " کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا " الشئی ما یصح ان یوجد وھو یعم الواجب والممکن " شئی اسے کہا جاتا ہے جس کا پایا جانا صحیح ہو اس معنی کے لحاظ سے واجب اور ممکن کو بھی " شئی " کہہ لیا جائے گا " او ما یصح ان یعلم ویخبر عنه فیعم الممتنع ایضا " شئی کا معتزلہ بعض اوقات معنی بیان کرتے ہیں کہ شئی اسے کہا جاتا ہے کہ جس کا علم حاصل کرنا اور اس کی خبر دینا ممکن ہو اس لحاظ پر شئی عام ہے جو واجب ممکن اور ممتنع تمام کو ہی شامل ہے۔

قَدِیْرٌ: قدرۃ سے لیا ہوا ہے " القدرۃ ھو التمکن من ایجاد الشئی " کسی چیز کو موجود کر سکنا قدرۃ کہلاتا ہے۔

قادر اور قدیر میں فرق: اگرچہ دونوں لفظ ہی قدرۃ سے لئے ہوئے ہیں بظاہر دونوں کا معنی ایک ہے لیکن ان کا استعمال کے لحاظ پر فرق بھی ہے " القادر ھو الذی ان شاء فعل وان لم یشا لم یفعل " قادر وہ ہے کہ اگر کام کرنا چاہے تو کرے اور اگر نہ کرنا چاہے تو نہ کرے " القدیر الفعال لما یشا علی ما یشا " قدیر وہ ہے کہ جو چاہے وہ کرے اس طرح جس طرح چاہے۔ غیر اللہ پر اس کا استعمال بہت ہی کم ہوا۔

(از بیضاوی)

اعتراض: اہل سنت و جماعت کے نزدیک جب شئی کا معنی موجود ہے اور موجود تو رب تعالیٰ کی ذات اور صفات بھی ہیں اور رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھی شئی کا اطلاق ہے۔

" قل ای شئیٍ اکبر شهادة من الله ، قل الله شهید "

اس آیۃ کریمہ میں پہلے سوال ہے کہ " اے محبوب آپ فرما دو کون سی چیز بڑی ہے از روئے اللہ تعالیٰ کی شہادت کے " پھر اس کا جواب ہے فرما دو اللہ گواہ ہے یعنی سب چیزوں سے اللہ بڑا

گواہ ہے۔اس میں رب تعالیٰ پرشئی بولا گیا اب خرابی یہ لازم آئے گی کہ آیۃ کریمہ سے یہ سمجھ آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات پر بھی قادر ہے حالانکہ واجبات قدرۃ میں داخل نہیں۔اسی طرح معتزلہ پر اعتراض میں اور زیادتی ہوگی کہ ان کی نزدیک شئی کا جو معنی ہے اس معنی کے لحاظ سے، واجبات اور ممتنعات تمام ہی قدرۃ میں داخل ہوں گے حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں۔اور برے افعال رب تعالیٰ کی قدرت میں کیسے داخل ہوں گے حالانکہ بظاہر یہ معلوم ہورہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے تو ہر چیز میں جھوٹ، چوری وغیرہ تمام ہی برے اعمال داخل ہوگئے کس طرح کہنا صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ، چوری وغیرہ جیسے برے اعمال پر بھی قادر ہے "معاذ اللہ"

جواب: پہلے آسان لفظوں میں علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کی تفسیر کو دیکھیں جواب خود سمجھ آجائے گا اس کے بعد انشاء اللہ تفصیلی جواب نقل کروں گا۔"ہم کتاب وسنت کے دلائل قطعیہ کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی سبوحیت وقدوسیت پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ہم مومن نہیں ہوسکتے۔قاضی بیضاوی نے فرمایا لفظ "قدیر" قدرت سے مشتق ہے اس کا استعمال مبالغہ کے معنی میں ہوا یہی وجہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے اس کا استعمال بہت ہی کم ہوا ہے۔ قدرت کے معنی ہیں " التمکن من ایجاد الشئی " کسی شئی کے ایجاد پر قابو اور قوت رکھنا" بندے کی قدرت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کسی فعل کی قوت رکھتا ہو قادر اور قدیر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ جو کام کرسکتا ہو اسے ضرور کرے بلکہ اس کا کرنا نہ کرنا اس کے ارادے پر موقوف ہے چاہے کرے چاہے نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا نہ کرنا مشیت کے علاوہ حکمت سے بھی متعلق ہوتا ہے کیونکہ وہ قدیر ہی نہیں بلکہ حکیم بھی ہے لہٰذا اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ (التبیان مع البیان ص ۷۰)

علامہ کاظمی رحمہ اللہ کی اس تفسیر کے بعد عوام کے لئے تو کچھ بیان کرنا ضروری نہیں کیونکہ ان کے لئے تو اتنا بیان ہی کافی ہے اور علماء کرام کے لئے اس لئے ضروری نہیں کہ تفاسیر کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت وہ راقم سے زیادہ رکھتے ہیں۔دینی مدارس کے آخری کلاسوں کے طلباء کرام بھی یقیناً بہت بڑی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں وہ بھی اردو تفسیر کے محتاج کم ہی ہوتے ہیں تاہم چھوٹی کلاسوں کے طلباء کے فائدہ کے لئے کچھ مزید بحث پیش خدمت ہے۔

قاضی بیضاوی نے فرمایا: شی کا معنی " مشئی وجوده "جس کے وجود کو رب تعالیٰ چاہے۔ اور اس کا ارادہ کرے اس کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ زادہ نے بیان کیا کہ واجبات یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کا وجود اور اس کی صفات قدرت سے باہر ہیں " لانه لا يصدق عليه مفهوم مشئی وجوده " اس وجہ سے کہ شئی کا معنی جو قاضی بیضاوی نے " مشئی وجوده " کیا ہے اس کا مفہوم واجب تعالیٰ اور اس کی صفات پر ثابت ہی نہیں۔ اس طرح معتزلہ کا مسلک بیان کرنے کے بعد فرمایا " لزمهم التخصيص بالممكن في الموضعين " ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس آیۃ میں شئی کا معنی کرتے ہوئے "ممکن" کی قید لگائیں تا کہ واجب اور ممتنع اس سے خارج ہو جائے کیونکہ ہر ذی عقل کی عقل کا یہی تقاضا ہے کہ ممتنعات اور واجبات قدرت سے باہر ہیں۔ قدرت کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کریں تو اس کا معنی ہوتا ہے " نفي العجز " وہ عاجز نہیں اور قدرت کی نسبت جب بندے کی طرف کریں تو پھر اس کا معنی ہوتا ہے " يتمكن بها من الفعل " کہ اسے یہ طاقت وقدرت حاصل ہے کہ وہ یہ کام کر سکتا ہے اسی طرح قدرۃ کا معنی جب قدر سے لیا جائے تو معنی یہ ہوگا " القادر يوقع الفعل على مقدار قوته " قادر وہ ہے جو اپنی قدرت کی مقدار کے مطابق کام کو واقع کرے "او على مقدار ما تقتضيه المشية " رب تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے جب وہ چیز اس کی مشیت میں بھی ہو۔

بیضاوی کا خلاصہ یہ ہے کہ بندہ جس چیز پر عمل کے لحاظ پر قادر ہے رب تعالیٰ اس پر خلق کے لحاظ پر قادر ہے اور وہ رب تعالیٰ کی تقدیر میں ہے اور رب تعالیٰ جس چیز کو چاہے اور اس کی شان کے لائق ہو وہ اس کی قدرت میں داخل ہے برے اعمال خود ہی اس قابل نہیں کہ رب تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہونا ان کا ممکن ہو اور نہ ہی رب ان کو چاہتا ہے اور نہ ہی ان کا ارادہ کرتا ہے اس بحث سے برائیوں کا رب کی قدرت میں ممکن ہونے کا بیہودہ قول رد ہو جائے گا۔ اور علامہ بیضاوی کی اس عبارت میں مشکل میں کوئی نہیں پھنسے گا " ان مقدور العبد مقدور الله " مطلب اس کا یہی ہے کہ بندہ جس پر عمل کرنے پر قادر ہے وہ چیز رب کی قدرت تخلیق و ایجاد میں داخل ہے۔

جلالین میں ذکر کیا گیا:

﴿ ان اللہ علی کل شاء ہ﴾ (قدیر) ، ''بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز جسے چاہے اس پر قادر ہے''

اس پر صاوی میں بیان کیا گیا کہ مفسر نے ''شاء ہ'' سے ''شئی'' کی تفسیر اس لئے کی ہے کہ وہ اعتراض مندفع ہو جائے کہ کہا جاتا ہے شی تو موجود کو کہتے ہیں تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات بھی موجود ہیں لفظ '' کل '' استغراق کے لئے جس کا مطلب ہوگا ہر موجود پر اللہ تعالیٰ قادر ہے قدرت کا تعلق واجبات سے صحیح نہیں۔ کیونکہ موجود کو پھر موجود کرنے کی قدرت سے ایک حاصل چیز کو حاصل کرنا لازم آئے گا اور یا حقائق کا بدلنا لازم آئے گا۔ جب شیٔ کی تفسیر شاءہ سے کی تو اس سے یہ واضح کر دیا:

" ان اللہ علی کل شی ای ارادہ والآرادۃ لا تتعلق الا بالممکنات "

''بیشک اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ کرے اس پر قادر ہے ارادہ کا تعلق صرف ممکنات سے ہے واجبات اور ممتنعات سے نہیں'' (از صاوی)

" والمتحیلات فلا تتعلق القدرۃ والارادہ بشی من ذلک "

''محال چیزوں سے قدرت اور ارادہ کا کوئی تعلق نہیں'' (صاوی حاشیہ جلالین ص ۹۷)

یقینی بات ہے کہ تمام برائیاں رب تعالیٰ کے حق میں محال کے درجہ میں ہی ہیں ان کا پایا جانا ممکن بھی نہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا خوب بحث کی:

" والشئی لغۃ ما یصح ان یعلم ویخبر عنہ کما نص علیہ سیبویہ " شیٔ لغت میں اسے کہتے ہیں جس کا علم حاصل ہو سکے اور اس سے خبر دی جا سکے سیبویہ نے یہی بیان کیا ہے۔ علامہ آلوسی کے اس بیان سے پتہ چلا کہ یہ معنی صرف معتزلہ کے نزدیک نہیں ہے بلکہ نحو کے امام کے نزدیک لغوی معنی یہی ہے اس معنی کے لحاظ سے معدوم موجود واجب اور ممکن سب کو شیٔ کہا جاتا ہے لیکن اطلاق کے لحاظ پر مختلف ہیں قرائن سے پتہ چلے گا کہ یہاں کون کون سے افراد پائے گئے ہیں:

☆ کبھی جمیع افراد مراد ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴾ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا علم واجب، ممکن معدوم، ممکن موجود محال سب کو محیط ہے۔

☆ اور کبھی شئی کا اطلاق صرف ممکن پر ہوگا واجب اور ممتنع پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا جیسا کہ اسی آیۃ میں اس پر قرینہ قدرت ہے کیونکہ قدرت کا تعلق صرف ممکنات سے ہے لہٰذا واضح ہوا کہ ﴿اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ممکنات پر قدرت رکھتا ہے

☆ اور کبھی شئی کا اطلاق ممکن خارجی پر ہوتا ہے لیکن ابھی تک وہ صرف ذہن میں موجود ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ﴾ تم ہرگز کسی شے کی متعلق یہ نہ کہو کہ میں کل کروں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے یعنی جو کام ہوسکنا ممکن ہے اور ابھی تک تمہارے ذہن میں موجود ہے کہ کل کرنا ہے تو اس کے لئے " ان شاء اللہ " کا لفظ ذکر کر کے کہو کہ "کل میں کروں گا"۔

☆ اور کبھی شئی کا اطلاق ہوتا ہے ممکن معدوم پر جو نفس الامر میں ثابت ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ﴾

بیشک ہمارا قول کسی چیز کے بارے میں جب ہم اس کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں ہو جا وہ ہو جاتی ہے۔ اس میں تکوین قرینہ ہے کیونکہ کسی چیز کی تکوین (معرض وجود میں لانا) کا تعلق ہی معدوم سے ہوتا ہے اگر پہلے سے ہی موجود ہو تو اسے پھر موجود کرنے کا کیا مطلب ہوگا۔

☆ اور کبھی شی کا اطلاق موجود خارجی پر ہوتا ہے یعنی جو چیز خارج میں موجود ہوتی ہے اسے شی کہا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد گرامی ہے :

﴿وَقَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا﴾

(اے زکریا) میں نے اس سے پہلے تمہیں پیدا کیا تو تم کچھ نہیں تھے یعنی تم خارج میں واقع میں موجود نہیں تھے جب میں نے تمہیں پیدا کیا۔

(از روح المعانی)

خیال رہے کہ علامہ آلوسی نے قاضی بیضاوی کے اس قول پر کہ شی موجود کو کہتے ہیں اور اس آیۃ میں " مشئی وجودہ " کے معنی میں ہے " فیہ ما فیہ " سے اعتراض کیا ہے۔ تاہم راقم کے نزدیک آسان بات یہ ہے کہ شئی کا معنی موجود کرنا بھی اہل علم کا قول ہے جب وہ قول لیا جائے تو اس وقت آیۃ کریمہ میں "شئی موجودہ" معنی ہوگا۔ اور جب یہ معنی مراد ہو جو سیبویہ نے کیا ہے اور علامہ آلوسی نے بیان کیا ہے پھر یہ بحث بھی خوب ہے جو علامہ آلوسی نے بیان کی ہے۔

﴿ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

☆ اے لوگو اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیز گاری ملے۔

☆ اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے (لوگوں) کو پیدا کیا تا کہ تم پرہیز گار ہو جاؤ۔

جب اللہ تعالیٰ نے مکلفین کے تین فرقوں کا ذکر کیا مومنین، کفار اور منافقین جو کہ مذبذبین تھے۔ مومنین کا ذکر ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ﴾ سے کیا کامل مومنین متقین کی صفات کو ذکر کیا پھر ان پر مرتب ہونے والے انعامات کا ذکر ﴿اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ سے کیا، دوسرا فرقہ کفار کا ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ﴾ سے ان کا ذکر کیا پھر ان کی سزا کا ذکر کیا کہ ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اس کے بعد ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴾ سے ان کے لئے بڑے عذاب کا ذکر کیا، تیسرے فرقہ منافقین کا ذکر ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ ﴾ سے کیا پھر ان کی سزا کا ذکر ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ سے کیا اس کے بعد تینوں فرقوں کو حرف نداء سے اپنی طرف متوجہ کیا کیونکہ عبادت میں تکلیف اور مشقت پائی جاتی ہے جب کسی کو خطاب کیا جائے تو وہ لذت محسوس کرتا ہے۔ (از روح المعانی)

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

یا: صاحب کشاف نے کہا ''یا'' حرف نداء اس کی وضع بعید کے لئے ہے لیکن مجازی طور پر قریب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے نداء بعید کو یہاں کیوں استعمال کیا گیا اصل وجہ یہ ہے کہ قریب کے مقام پر بعید کو استعمال اس لئے کیا جاتا ہے کہ یا نداء دینے والے کا مرتبہ بلند ہوتا یا منادی کا درجہ بلند ہوتا ہے۔ اس مقام پر منادی (اسم فاعل) کا مرتبہ بلند ہے کیونکہ وہ رب تعالیٰ ہے اور کبھی اس لئے بھی قریب کے مقام پر بعید کو لایا جاتا ہے کہ سامع کی غفلت کو دور کرنا بھی مقصود ہوتا ہے وہ صورت بھی یہاں موجود ہے کہ خطاب

کا مطلب ہو کہ اے لوگو غفلت کو دور کرتے ہوئے رب تعالیٰ کے ارشاد کو غور سے سنو پھر اس پر عمل کرو۔

(از روح المعانی)

تنبیہ: قاضی بیضاوی نے بھی صاحب کشاف کے قول کو پسند کیا کہ ''یا'' کی وضع نداء بعید کے لئے ہے قریب کے لئے مجازی طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن شیخ زادہ نے اسے رد کرتے ہوئے کہا:

'' قال ابن الحاجب فی الکافیة یا اعم حروف النداء ای ینادی بھا القریب والبعید علی السواء ودعوی المجاز فی احدھما خلاف اصل ''

''علامہ ابن حاجب نے کافیہ میں ذکر کیا ہے کہ یا حرف ندا قریب اور بعید کے لئے برابر ہے اس لئے قریب کے لئے مجاز کا قول کرنا خلاف اصل ہے''

راقم کا بھی خیال یہی ہے جو شیخ زادہ نے کہا ہے کہ قریب اور بعید کے لئے بطور مشترک ایک جیسا استعمال ہے اگر بعید کو قریب کے لئے استعمال ہونا تسلیم کیا جائے تو وہی صورت ہوگی جو بیان ہو چکی ہے۔اور اگر قریب ہو اور استعمال بھی قریب کے لئے ہو تو پھر واضح ہے کہ مخلوق رب سے دور نہیں اس لئے کہ رب تعالیٰ خود قریب ہے البتہ یہ خیال رہے کہ یہ قرب وبعد مکان کے لحاظ سے نہیں رب تعالیٰ مکان سے پاک ہے اس قرب وبعد سے مراد رب تعالیٰ کی رحمت کا قریب ہونا مومنوں کے لئے اور رب تعالیٰ کے عذاب کا کفار ومنافقین کے قریب ہونا مراد ہے۔اسی طرح تمام مخلوق کا اسے علم ہے اور تمام پر اس کی مہربانیاں ہیں اس لحاظ پر وہ سب کے قریب ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

اَیُّھَا: قانون یہ ہے کہ معرف باللام (جس کلمہ پر الف لام ہو) پر جب حرف نداء آئے تو سوائے لفظ ''اللّٰہ'' کے باقی تمام کلمات پر حرف نداء اور معرف باللام کے درمیان ایھا اور ای ھذا وغیرہ کا فاصلہ لاتے ہیں۔

النَّاسُ: یہ خطاب کن لوگوں کو ہے؟ اس سے مراد مومنین ہیں یا کفار ہیں یا سب ہی مراد ہیں؟ بعض حضرات نے کہا کہ یہ خطاب کفار کو ہے کیونکہ اس آیۃ کی ابتدا ﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ﴾ سے ہے جو آیتیں ﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ﴾ سے شروع ہوتی ہیں وہ مکی ہوتی ہیں ان میں خطاب مشرکین مکہ کو ہوتا ہے اور جو آیتیں ﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے شروع ہوتی ہیں وہ مدنی ہوتی ہیں۔

لیکن خیال رہے یہ دونوں قاعدے کلیہ نہیں بلکہ اکثریہ ہیں کیونکہ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا

اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ﴾ آیۃ کی ابتداء ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے ہے لیکن آیۃ مکی ہے اور یہ آیۃ ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا ﴾ بالاتفاق مدنی ہے (از عزیزی) اس لئے زیادہ بہتر یہی ہے کہ یہاں یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ خطاب عام ہے مومنین کفار اور منافقین کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

"انه عام في جميع الناس فيكون خطابه للمؤمنين باستدامة العبادة وللكافرين بابتدائها وهذا حسن"

یہ حکم عام ہے مومنوں کو بھی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مومنو اگرچہ تم پہلے ہی عبادت کر رہے ہو۔ لیکن اپنی عبادت پر قائم ودائم رہو۔ یعنی ہمیشہ کے لئے اپنی عبادت کو جاری رکھو۔ کفار کو بھی خطاب ہے کہ اے کافرو تم بھی رب تعالیٰ کی عبادت کو جاری کرلو، اور یہ خطاب منافقین کو بھی اسی طرح ہی ہوگا، کیونکہ وہ بھی کفار ہی ہیں، یہی قول زیادہ بہتر ہے۔ (از قرطبی)

البتہ یہ خیال رہے کہ کفار کا کافرہ کر تو عبادت کرنا یعنی نماز ادا کرنا روزہ رکھنا وغیرہ کوئی مفید نہیں ان کو حکم دینے کا کیا مطلب؟ اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ دنیا کے لحاظ سے حکم کا مطلب یہ ہے کہ اے کافرو پہلے ایمان لے آؤ پھر عبادت کرو۔

اے منافقو! جس طرح تم ظاہری طور پر ایمان کا اقرار کرتے ہو اسی طرح باطنی طور پر بھی ایمان لے آؤ پھر عبادت کرو لیکن کافر اگر حالت کفر میں ہی مر گئے ایمان نہ لائے تو قیامت میں ان کو ایمان نہ لانے کا اور عبادات پر اعتقاد نہ رکھنے کا عذاب ہوگا۔ یہی مطلب ان آیات کا ﴿ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ﴾ عذاب ہوگا مشرکین کو جو زکوۃ ادا کرنے کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے ﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ☆ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ☆ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴾ (جب کافروں سے پوچھا جائے گا) تمہیں جہنم میں کس چیز نے داخل کیا ہے تو وہ کہیں گے ہم نماز کی فرضیت کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور مسکینوں کو طعام کھلانے (یعنی زکواۃ دینے) کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔

یہی قول معتبر ہے جو بیان کر دیا گیا ہے کہ آخرت میں ان کو عذاب ایمان نہ لانے اور عبادات پر

عقیدہ نہ رکھنے کی وجہ سے ہوگا تاہم بعض حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ بات صرف عقیدہ نہ رکھنے کی نہیں بلکہ کفار کو عذاب ایمان نہ لانے کی وجہ سے جس طرح ہوگا اسی طرح عبادات کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے بھی ہوگا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

خیال رہے کہ عبادت کی بحث تفصیلی طور پر ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ﴾ کی وضاحت بیان کرتے ہوئے ذکر ہو چکی ہے۔

رَبَّکُمْ: اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی یہاں سے یہ واضح کیا گیا کہ اگر عبادات میں تمہیں مشکل درپیش آئے تو اس کے قریبی اور واضح سبب کو سامنے رکھنا کہ اس ذات کی تم عبادت کر رہے ہو جو تمہارا رب ہے مالک ہے ہر طرح کی تمہاری تربیت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے لیکن یہ حکم عوام کے لئے ہے خواص تو بغیر واسطہ کے ہی عبادت کرتے ہیں وہ تو صرف اس کی ذات کبریائی کو دیکھتے ہیں۔

(از روح المعانی)

اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ: خلق کا لغوی معنی ہے "صحیح مستقیم" خلق کا استعمال ان معانی میں ہے عدم سے وجود میں لانا اور بغیر نمونہ کے کسی چیز کو ایجاد کرنا۔

تنبیہ: کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے کسی انسان کو اس معنی کے لحاظ سے خلق حاصل نہیں البتہ مخلوق کے لئے جھوٹ بہتان گھڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "وتخلقون افکا"

(از مفردات راغب)

وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ: اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، صنعت کا ذکر فرمایا کہ تمہیں یہ معلوم ہے کہ خالق تو صرف میں ہی ہوں تو تمہیں چاہئے کہ تم اس ذات کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا یعنی تم کچھ نہ تھے تمہیں معرض وجود میں لایا اور تمہارے آباء و اجداد کو بھی اسی ذات نے پیدا کیا۔

خیال رہے کہ کفار بھی رب تعالیٰ کے خالق ہونے کو مانتے تھے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾

اگر آپ ان سے سوال کریں زمین و آسمان کا خالق کون ہے تو ضرور بر ضرور کہیں گے "اللہ"

انفسکم واھلیکم نارا ﴾ آیۃ کی ابتداء ﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے ہے لیکن آیۃ مکی ہے اور یہ آیۃ ﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا ﴾ بالاتفاق مدنی ہے (ازعزیزی) اس لئے زیادہ بہتر یہی ہے کہ یہاں یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ خطاب عام ہے مومنین کفار اور منافقین کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

"انہ عام فی جمیع الناس فیکون خطابہ للمؤمنین باستدامۃ العبادۃ وللکافرین بابتدائھا وھذا حسن"

یہ حکم عام ہے مومنوں کو بھی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مومنو اگر چہ تم پہلے ہی عبادت کر رہے ہو۔ لیکن اپنی عبادت پر قائم ودائم رہو۔ یعنی ہمیشہ کے لئے اپنی عبادت کو جاری رکھو۔ کفار کو بھی خطاب ہے کہ اے کافرو تم بھی رب تعالیٰ کی عبادت کو جاری کرلو، اور یہ خطاب منافقین کو بھی اسی طرح ہی ہوگا، کیونکہ وہ بھی کفار ہی ہیں، یہی قول زیادہ بہتر ہے۔ (از قرطبی)

البتہ یہ خیال رہے کہ کفار کا کافر رہ کر تو عبادت کرنا یعنی نماز ادا کرنا روزہ رکھنا وغیرہ کوئی مفید نہیں ان کو حکم دینے کا کیا مطلب؟ اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ دنیا کے لحاظ سے حکم کا مطلب یہ ہے کہ اے کافرو پہلے ایمان لے آؤ پھر عبادت کرو۔

اے منافقو! جس طرح تم ظاہری طور پر ایمان کا اقرار کرتے ہو اسی طرح باطنی طور پر بھی ایمان لے آؤ پھر عبادت کرو لیکن کافر اگر حالت کفر میں ہی مر گئے ایمان نہ لائے تو قیامت میں ان کو ایمان نہ لانے کا اور عبادات پر اعتقاد نہ رکھنے کا عذاب ہوگا۔ یہی مطلب ان آیات کا ﴿ وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ ﴾ عذاب ہوگا مشرکین کو جو زکوۃ ادا کرنے کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے ﴿ مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ ☆ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ☆ وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ ﴾ (جب کافروں سے پوچھا جائے گا) تمہیں جہنم میں کس چیز نے داخل کیا ہے تو وہ کہیں گے ہم نماز کی فرضیت کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور مسکینوں کو طعام کھلانے (یعنی زکواۃ دینے) کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔

یہی قول معتبر ہے جو بیان کر دیا گیا ہے کہ آخرت میں ان کو عذاب ایمان نہ لانے اور عبادات پر

عقیدہ نہ رکھنے کی وجہ سے ہوگا تاہم بعض حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ بات صرف عقیدہ نہ رکھنے کی نہیں بلکہ کفار کو عذاب ایمان نہ لانے کی وجہ سے جس طرح ہوگا اسی طرح عبادات کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے بھی ہوگا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

خیال رہے کہ عبادت کی بحث تفصیلی طور پر ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ کی وضاحت بیان کرتے ہوئے ذکر ہوچکی ہے۔

رَبَّكُمْ: اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی یہاں سے یہ واضح کیا گیا کہ اگر عبادات میں تمہیں مشکل درپیش آئے تو اس کے قریبی اور واضح سبب کو سامنے رکھنا کہ اس ذات کی تم عبادت کر رہے ہو جو تمہارا رب ہے مالک ہے ہر طرح کی تمہاری تربیت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے لیکن یہ حکم عوام کے لئے ہے خواص تو بغیر واسطہ کے ہی عبادت کرتے ہیں وہ تو صرف اس کی ذات کبریائی کو دیکھتے ہیں۔ (از روح المعانی)

الَّذِیْ خَلَقَكُمْ: خلق کا لغوی معنی ہے "صحیح مستیقم" خلق کا استعمال ان معانی میں ہے عدم سے وجود میں لانا اور بغیر نمونہ کے کسی چیز کو ایجاد کرنا۔

تنبیہ: کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے کسی انسان کو اس معنی کے لحاظ سے خلق حاصل نہیں البتہ مخلوق کے لئے جھوٹ بہتان گھڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "وتخلقون افکا" ۔ (از مفردات راغب)

وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ: اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، صنعت کا ذکر فرمایا کہ تمہیں یہ معلوم ہے کہ خالق تو صرف میں ہی ہوں تو تمہیں چاہئے کہ تم اس ذات کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا یعنی تم کچھ نہ تھے تمہیں معرض وجود میں لایا اور تمہارے آباء واجداد کو بھی اسی ذات نے پیدا کیا۔

خیال رہے کہ کفار بھی رب تعالیٰ کے خالق ہونے کو مانتے تھے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾

اگر آپ ان سے سوال کریں زمین وآسمان کا خالق کون ہے تو ضرور بر ضرور کہیں گے "اللہ"

مقصد واضح ہوا کہ جب تم رب تعالیٰ کو خالق بھی مانتے ہو یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ تمہارے آباء واجداد کا خالق بھی وہی ہے گویا کہ تم اس کے احسان کو بھی مانتے ہو اس کی قدرت کو بھی مانتے ہو تو تمہیں خود ہی سمجھ آنا چاہئے کہ اس کا کوئی شریک نہیں اس کے بغیر کوئی عبادت کے لائق نہیں اس لئے اسی ذات کی عبادت کرو۔ پھر یہ بھی خیال کرو کہ تم اگر رب تعالیٰ کی عبادت کرو گے تو اس میں رب تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس میں بھی تمہارا ہی فائدہ ہے کیونکہ تمہیں ہی پرہیزگاری حاصل ہونی ہے۔ (از کبیر)

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: بظاہر اس میں وہم یہ ہوتا ہے کہ "لعل" ترجی کے لئے آتا ہے یعنی اس میں طمع اور امید کیسے؟ جب کہ یہ رب تعالیٰ کا کلام ہے اس کا ظاہری طور پر معنی یہ سمجھ میں آتا ہے "شائد کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ" اس میں تو رب تعالیٰ کی طرف شک کی نسبت کیسے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "لعل" کا استعمال تین طرح ہے:

(۱) "لعل" ترجی اور توقع کے معنی میں ہی استعمال ہے لیکن اس توقع کی نسبت بندوں کی طرف ہے رب تعالیٰ کی طرف نہیں گویا کہ یوں کہا گیا ہے "**افعلوا ذلک علی الرجاء منکم**" تم عبادت کرو اس میں امید یہ رکھو کہ تمہیں پرہیزگاری حاصل ہو جائے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے "یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے"

(۲) "**ان العرب استعملت لعل مجردة من الشک بمعنی لام کی**" بیشک عربی حضرات "لعل" کو شک کے معنی کے بغیر "لام" کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں جس کا معنی ہوتا ہے "تاکہ" راقم کا ترجمہ اور کئی مترجمین کے تراجم اسی جواب کے مطابق ہیں "تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ" "**وھذا القول عن قرطب والطبری**" "لعل" کو "لام کی" کے معنی میں لینا قطرب اور طبری کا قول ہے (قطرب بضم القاف)

(۳) "**ان تکون ، لعل بمعنی التعرض للشی**" "لعل کبھی کسی چیز کے درپے ہونے کے معنی میں آتا ہے یعنی یہ کام کرو فلاں چیز کے درپے ہونے کے لئے اس توجیہ کے لحاظ پر معنی یہ ہوگا۔

"**لعلکم ان تجعلوا بقبول ما امرکم اللہ بہ وقایة بینکم وبین النار**"

''اللہ تعالیٰ کا حکم مانتے ہوئے اس کی عبادت کرو اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے کہ وہ تمہیں آگ سے بچالے''

(از قرطبی)

تنبیہ: '' لعل وعسی حرفا ترج وھما ای کل منھما من اللہ واجب '' (خازن)

لعل اور عسی دونوں ہی امید کے معنی میں آتے ہیں لیکن ان میں سے ہرایک جب رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو وجوب یعنی یقین کے لئے آئے گا وہاں شک یا صرف طمع کی بات نہیں ہوگی۔

فائدہ جلیلہ:

'' ومعلوم ان الزیادۃ علی العبادۃ عبادۃ فصح تفسیرۃ قولہ اعبدوا بالزیادۃ فی العبادۃ ''

(از کبیر)

''جب ایمان والے عبادت گزار حضرات کو حکم ہوگا کہ عبادت کرو تو اس کی تفسیر اس طرح بھی درست ہے کہ کہا جائے تم اور زیادہ عبادت کرو کیونکہ عبادت پر زیادتی بھی عبادت ہے''

اس سے بہت سے لغویات کا حل مل گیا کہ یہاں نوافل درست نہیں یہاں دعا درست نہیں یہ ثابت نہیں وہ ثابت نہیں یہ سب لغو باتیں ہیں عبادت عبادت ہی ہے عبادت سے روکنا منافقوں کا کام ہے

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

اللہ تعالیٰ نے جب اپنی ربوبیت اور خالقیت کا ذکر کیا تو اس سے چند فوائد حاصل ہوئے:

پہلا فائدہ: اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم اور اس میں نظر واستدلال تمام علوم سے اشرف ہے اس کی فضیلت پر بہت واضح اور روشن دلائل موجود ہیں:

(۱) علم کی شرافت معلوم کی شرافت کے مطابق ہوتی ہے جب اشرف المعلومات اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات ہیں تو یقیناً ان سے متعلق علم بھی اشرف العلوم ہوگا۔

(۲) علم یا دینی ہوگا یا غیر دینی یقینی بات ہے کہ علم دینی افضل ہے غیر دینی سے پھر علم دینی کی دو قسمیں ہیں یا وہ علم اصول کا ہوگا یا اصول کے ماسوا کا علم ہوگا لیکن ان دونوں سے افضل اصول کا علم ہے کیونکہ اصول کے ماسوا کی صحت اصول پر ہی موقوف ہے۔ اس لئے کہ مفسر اللہ تعالیٰ کے

کلام کے معانی کی بحث کرتا ہے اللہ کا کلام متفرع ہے اس کے متکلم ہونے پر اور اس کے صانع ہونے پر اور اس کے مختار ہونے پر۔

محدث بحث کرتا ہے رسول اللہ ﷺ کے کلام کی یہ فرع ہے آپ کی نبوت کے ثبوت کی اس طرح حدیث کی بحث فرع ہوئی رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی بحث اصل ہوئی۔ فقیہ بحث کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی یہ بحث فرع ہے توحید و نبوت کی۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ فروع سے متعلق تمام علوم موقوف ہیں اصول کے علوم پر لیکن اصول کے علوم فروع کے علوم پر موقوف نہیں۔ اور نہ ہی ان کے محتاج ہیں "فوجب ان یکون علم الاصول اشرف العلوم" تو ثابت ہوا کہ علم اصول اشرف العلوم ہے۔

(۳) کسی چیز کا کمال اور اس کا اشرف ہونا اس کی ضد کی خساست (گھٹیا پن) سے سمجھ آتا ہے ایک چیز جتنی زیادہ گھٹیا ہو گی اس کی ضد اتنی ہی زیادہ اشرف ہو گی۔ جب اصول یعنی توحید باری تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرنے کی ضد کفر ہے اسی طرح اصول کی ضد بدعات سیئہ ہیں اور وہ بہت زیادہ خسیس ہیں تو علم اصول اتنا ہی زیادہ اشرف ہے۔

(۴) کسی علم کے اشرف ہونے کی دارومدار تین چیزوں پر ہے ایک یہ کہ اس کا موضوع افضل ہو۔ دوسرا یہ کی اس کی حاجت بہت زیادہ ہو تیسرا یہ کہ اس کے دلائل قوی ہوں۔ علم اصول ان تینوں چیزوں پر مشتمل ہے موضوع اس کا اعلیٰ ضرورت اس کی زیادہ دلائل اس کے قوی۔

موضوع افضل کیسے؟ اسلئے کہ علم اصول سے اللہ تعالیٰ کی ذات صفات اور افعال کی معرفت مطلوب ہے اور اسی طرح معلومات خواہ موجود ہوں یا معدوم ان کی معرفت بھی علم اصول سے ہی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام چیزیں افضل ہیں ان تمام کا علم بھی افضل ہے ان کے علم کا نام ہی علم اصول ہے۔

علم اصول کی ضرورت بہت زیادہ کیوں؟ اسلئے کہ ضرورت کا تعلق دین سے ہو گا اور یا دنیا سے دین میں علم اصول کی شدید ضرورت اس لئے ہے کہ جس شخص نے ان اشیاء کا علم حاصل کر لیا وہ ثواب عظیم کا مستحق ہو گا اور ملائکہ سے اسے قرب حاصل ہو گا اور جو شخص ان سے جاہل رہا وہ عذاب عظیم کا مستحق ہو گا اور شیطانوں سے ملے گا۔ اور دنیا کے لحاظ سے بھی علم اصول کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔

اس لئے کہ جہان میں بہتر کاموں کے منظم ہونے کی دارومدار ایمان پر ہے جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان حاصل ہوگا حشر ونشر پر ایمان حاصل ہوگا اس کے کام صحیح ہوں گے غلط راہ پر چلنے سے وہ اجتناب کرے گا اس لئے کہ اسے رب تعالیٰ کے عذاب اور جہنم کا خوف ہوگا جب ایمان ہی نہیں ہوگا تو قتل وغارت کا ہی ہر طرف بازار گرم ہوگا عبادت گاہوں میں بھی قتل کرنے سے ان کو حیا نہیں آئے گی۔ خیال رہے قتل کرانے والے بھی وہی ہیں جو حفاظت کا ڈھونگ رچانے والے ہیں جب ملک کے محافظ غاصب اور لیٹرے بن جائیں منصفین انصاف کا دامن چھوڑ دیں ایمان نام کی کوئی شے نہ رہے تو یہی حال ہوتا ہے جو ہماری آنکھوں دیکھا حال ہے۔

علم اصول کے دلائل قوی کیسے؟ اس علم کے دلائل قوی ہیں کیونکہ وہ مقدمات یقینیہ سے مرکب ہیں علم کی تمام قسموں سے اعلیٰ علم یقین ہی ہے تو پتہ چل گیا کہ علم اصول کے دلائل قوی ہیں۔ جب علم اصول کے موضوع کی افضلیت اور علم اصول کی شدید ضرورت اور علم اصول کے دلائل کا قوی اور قطعی ہونا دلائل سے ثابت ہوگیا تو ان دلائل سے ہی علم اصول کا اشرف العلوم ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

(۵) اصول کسی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئے کسی شریعت میں بھی ان میں تبدیلی نہیں آئی تو ان سے متعلق علم بھی نہ کبھی منسوخ ہوا اور نہ ہی تبدیل ہوا امتیں بدلتی رہیں زمانے بدلتے رہے زمین کے مختلف حصوں میں مختلف قومیں آباد رہیں لیکن علم اصول نہ بدلا نہ بدلنے والا اشرف ہی ہوا کرتا ہے۔

(۶) قرآن پاک کی جن آیات میں علم اصول پایا گیا ہے وہ درجہ کے لحاظ پر اشرف ہیں ان آیات سے جن میں فقہی احکام پائے گئے ہیں تو اس سے بھی واضح ہوا کہ یہ علم دوسرے علم سے اشرف ہے مثال کے طور پر دیکھیں ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر ہے ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ ﴾ میں رسول اللہ ﷺ کے ایمان کا ذکر ہے اور آیۃ الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود نہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کی صفات عظیمہ کا ذکر ہے یہ تمام آیات زیادہ درجہ رکھتی ہیں بنسبت ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ﴾ کے جس میں عورتوں کے حیض کا احکام کا ذکر ہے اسی طرح بنسبت ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ ﴾ کے کہ اس میں قرض کے لین دین پر لکھنے کا ذکر ہے۔

(۷) جن آیات میں احکام شرعیہ ذکر ہیں وہ چھ سو سے کم ہیں اور باقی تمام آیات اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کر رہی ہیں کیونکہ بعض آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا صراحتہً ذکر ہے بعض میں نبوت کا ذکر ہے نبوت خود بھی اصول میں داخل ہے اور نبوت کے علم سے بھی علم توحید حاصل ہوتا ہے اور بعض آیات میں کفار اور بت پرستوں کا رد ہے اس سے بھی توحید کا علم حاصل ہوتا ہے اور بعض آیات میں قصص کا ذکر ہے لیکن ان سے بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کا ہی پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ﴿ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ ﴾ تحقیق قصص میں عقل والوں کے لئے عبرت ہے اس سے بھی واضح ہو گیا کہ علم اصول تمام علوم سے اشرف ہے۔

دوسرا فائدہ: آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے فوائد سے اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جب رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا تو اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔

وجود باری تعالیٰ پر دلائل:

" اما الذی یدل علی وجود الصانع فالقرآن مملوء منه "

جن دلائل سے صانع کا موجود ہونا سمجھ آتا ہے قرآن پاک ان سے بھرا ہوا کسی آیۃ کو بھی دیکھیں وجود باری تعالیٰ کا پتہ چلے گا تاہم چند دلائل صرف سمجھانے کی حد تک ذکر کئے جا رہے ہیں کسی کو سمجھ آئے تو یہ بھی اس پر رب تعالیٰ کا ہی فیضان ہے۔

(۱) سب سے پہلے تو اس زیر بحث آیۃ کریمہ اور بعد میں آنے والی آیۃ کریمہ کو دیکھیں ان میں ہی کئی دلائل آپ کو مل جائیں گے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ربوبیت کو " ربکم " سے ذکر کیا ہے مربی اور مالک وہی ہو سکتا ہے جو موجود ہو پھر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اَلَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ جس ذات نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو۔ ان الفاظ مبارکہ میں رب تعالیٰ نے مکلفین کو بتایا کہ تمہارا خالق بھی میں ہوں اور تم سے پہلے لوگوں کا خالق بھی میں ہی ہوں خالق وہی ہو سکتا ہے جو موجود ہو۔ آنے والی آیۃ سے سمجھ آ رہا ہے کہ زمین و آسمان کا خالق بھی رب تعالیٰ ہے اس کی صفت خالقیت کا تقاضا ہے کہ وہ موجود ہو پھر آسمان سے پانی کو نازل کرنا اور زمین میں اگانے کی تاثیر پیدا کرنا پھر زمین سے پھلوں کو پیدا کرنا یہ تمام چیزیں رب تعالیٰ کے خالق ہونے اور موجود ہونے

پر دلالت کر رہی ہیں:

" وکل ماور د فی القرآن من عجائب السموات والارض فالمقصود منه ذلک "

قرآن پاک میں جتنے بھی زمین و آسمان کے عجائب کا ذکر ہے سب کے بیان سے مقصد وجود باری تعالیٰ کو ہی ثابت کرنا اور اسی کو وحدہ لاشریک لہ ماننا اور اس کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرنا ہے اور صرف اسی کی عبادت کرنا مقصد بیان ہے۔

وجود صفات باری تعالیٰ پر دلائل:

اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں کیا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَىْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں زمین میں اور نہ ہی آسمانوں میں۔ اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿ هُوَ الَّذِىْ يُصَوِّرُكُمْ فِى الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ﴾ وہ ذات جو تمہیں صورتیں عطا فرماتا ہے بچہ دانیوں میں جس طرح چاہتا ہے۔

یہ متکلمین کی دلیل ہے کہ افعال کے احکام اور ان پر یقین ہونے کے لئے صانع کا علم ضروری ہے اس لئے کہ خود رب تعالیٰ نے بچہ دانیوں میں صورتیں عطا کرنے سے پہلے اپنے علم کا ذکر فرمایا۔ اسی سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اور اسکی صفات کا علم پہلے ہے اور اس کے احکام پر عمل بعد میں ہوگا۔

صفت قدرت: اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تفصیلی ذکر ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ کی بحث میں ہو چکا ہے لیکن پھر بھی انسان جب یہ خیال کرے کہ رب تعالیٰ نے مختلف قسم کے پھل پیدا کئے اور مختلف قسم کے حیوانات پیدا کئے سب میں چار طبائع موجود ہیں حرارت (گرمی) برودت (ٹھنڈک) رطوبت (تری) یبوست (خشکی) لیکن تمام کا مختلف ہونا رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلیل ہے۔

صفت تنزیہ: رب تعالیٰ جسم سے پاک ہے مکان سے پاک ہے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ فرما دیجئے وہ اللہ ایک ہے اس کا "احد" ہونا ہی دلالت کر رہا ہے کہ وہ مرکب نہیں کیونکہ مرکب محتاج ہوتا ہے اور محتاج حادث ہوتا ہے یعنی اس کی ابتداء بھی ہوتی ہے اور انتہاء بھی " احد " سے ہی یہ سمجھ میں آیا کہ وہ جسم نہیں جب جسم نہیں تو مکان سے بھی پاک ہے۔

صفت توحید: اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامیہ سے یہ ارشاد اس پر بہت واضح دلیل ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾

اگر زمین وآسمان میں متعدد الہ ہوتے تو یہ دونوں برباد ہو کر رہ جاتے۔

صفت نبوت: اصول میں سے ہی نبوت ہے نبوت کا علم بھی علم اصول میں ہی داخل ہے نبوت کے دلائل میں سے ایک آیہ کریمہ کا ملاحظہ کریں ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ اور اگر تم شک میں ہو اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تو تم اس کی ایک چھوٹی سے سورت جیسی لے آؤ۔

اس آیہ کریمہ سے واضح ہوا کہ اللہ کا کلام جس بندہ پر نازل ہوتا ہے وہ نبی ہی ہوتا ہے اور اسی سے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے کیونکہ تمام فصحاء و بلغاء کو چیلنج کیا گیا جب اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے تو اسی سے مصطفیٰ کریم ﷺ کا نبی ہونا اور قرآن پاک معجزہ ہونا واضح ہو گیا۔

صالحین کے وجود باری تعالیٰ پر عجیب استدلات:

ایک زندیق (بے دین) نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے پاس رب تعالیٰ کا انکار کیا کہ کوئی بھی اس جہان کو معرض وجود میں لانے والا نہیں یہ خود ہی نظام چل رہا ہے اس کا کوئی صانع نہیں۔ حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے پوچھا کیا تم دریا کو عبور کرنے کے لئے کشتی پر بھی کبھی سوار ہوئے؟ اس نے کہاں ہاں سوار ہوا ہوں پھر آپ نے پوچھا کیا اس کے ہولناک مناظر کو بھی کبھی دیکھا ہے؟ اس نے کہا ہاں دیکھا ہے۔ ایک دفعہ دریا کے سفر کے دوران شدید آندھی چلی کشتیاں ٹوٹ گئیں ملاح غرق ہو گئے میں کشتی کے ایک پھٹے سے چمٹ گیا کچھ دیر کے بعد مجھ سے وہ پھٹا بھی چھوٹ گیا مجھے دریا کی موجیں کنارے کی طرف دھکیل رہی تھیں یہاں تک کہ میں کنارے پر پہنچ گیا۔ حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ نے اسے کہا پہلے تمہارا اعتماد کشتی اور ملاح پر تھا پھر پھٹے پر اعتماد ہوا کہ یہ تمہیں نجات دیں گے لیکن جب تمام سہارے ختم ہو گئے کیا تم نے اپنے آپ کو ہلاکت کے سپرد کر دیا تھا؟ یا اس کے بعد بھی تمہیں امید تھی کہ میں بچ سکتا ہوں اور سلامت رہ سکتا ہوں۔ اس شخص نے کہا مجھے اس وقت بھی سلامتی

کی امید تھی۔ حضرت امام نے کہا اس وقت تمہیں امید کون دلا رہا تھا؟ وہ خاموش رہا کوئی جواب نہ دے سکا آپ نے فرمایا اس وقت تمہیں امید دلانے والا اللہ تعالیٰ ہی تھا جو صانع ہے اور اسی نے تمہیں غرق ہونے سے بچایا ہے۔ یہ سن کر اس شخص نے حضرت امام کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔

" سبحان اللہ ما اعظم شانہ " .

☆ کتاب دیانات العرب میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عمران ابن حصین کو کہا:

" کم لک من الہ ؟ قال عشرۃ قال فمن لغمک و کربک و دفع الامر العظیم اذا نزل بک من جملتھم ؟ قال اللہ قال علیہ السلام مالک من الہ الا اللہ "

" تمہارے کتنے خدا ہیں؟ اس نے کہا دس آپ نے فرمایا جب **تمہیں تمام کی طرف** سے غم، مصیبت اور عظیم مصائب ہی حاصل ہوں تو اس وقت تمہارا خدا کون ہوتا ہے اس نے کہا "اللہ" آپ نے فرمایا تمہارا اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں "

☆ " کان ابو حنیفۃ سیفا علی الدھریۃ " امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ دہریوں کے لئے تلوار تھے وہ آپ کو شہید کرنے کے لئے موقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ ایک دن آپ مسجد میں بیٹھے تھے کہ دہریوں کی ایک جماعت تلواریں سونت کر آپ کو قتل کرنے کی غرض سے اچانک آ گئے۔ آپ نے ان کو کہا مجھے ایک سوال کا جواب دو پھر جو چاہے کرنا انہوں نے کہا وہ کیا؟ آپ نے فرمایا تم مجھے یہ بتاؤ کہ ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے ایک کشتی کو دیکھا جو بھری ہوئی تھی اس پر بہت بڑا بوجھ تھا دریا کہ موجیں طغیانی میں تھیں مختلف سمتوں سے تیز ہوائیں چل رہی تھیں کشتی بالکل سیدھی سمت پر چل رہی تھی لیکن اسے چلانے والا کوئی ملاح نہیں تھا۔ کیا اسے عقل تسلیم کرتی ہے؟ وہ کہنے لگے ایسا نہیں ہو سکتا اسے تو عقل نہیں مانتی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا یا سبحان اللہ جب ایک کشتی کا بغیر ملاح کا چلنا عقل تسلیم نہیں کرتی تو یہ دنیا کا اتنا بڑا نظام جس میں حالات مختلف ہوتے رہتے ہیں اعمال بدلتے رہتے ہیں ہر طرف وسیع زمین اور دور دور تک مکانات پھیلے ہوئے ہیں یہ بغیر صانع کے بغیر حفاظت کرنے والے کے پایا جائے۔ وہ لوگ یہ سن کر رونے لگ گئے انہوں نے کہا آپ نے سچ فرمایا ہے انہوں نے اپنی تلواریں نیام میں کر لیں اور توبہ کر لی۔

☆ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے پاس سترہ شخص آئے جو دہریے تھے یعنی اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے یا اسی کے قبضہ قدرت میں تمام نظام کے ہونے کے وہ قائل نہیں تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ رب تعالیٰ کی ذات کے صانع ہونے اور اس کے موجود ہونے پر تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ آپ نے فرمایا تم مجھے یہ بتاؤ کہ توت درخت کے تمام پتے کیا ایک ہی ذائقہ نہیں رکھتے کیا ان کا رنگ ایک ہی نہیں کیا ان کی بو ایک جیسی نہیں کیا ان کی طبیعت ایک جیسی نہیں؟ ان تمام نے اسے تسلیم کیا کہ ہاں توت کے تمام پتوں کے یہ سارے اوصاف تو واقعی ایک جیسے ہیں۔ ان سے یہ اقرار کرانے کے بعد آپ نے ان کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہا کہ اب ذرا غور کرو۔ آپ نے فرمایا توت کے تمام پتوں کے تم نے تمام اوصاف ایک جیسے تسلیم کر لئے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہی پتے ریشم کا کیڑا کھائے تو اس سے ریشم پیدا ہوا اور ان پتوں سے ہی شہد کی مکھی رس حاصل کرے تو شہد بن جائے اور وہی پتے بکری کھائے تو مینگنیاں بن جائیں اور وہی پتے ہرن کھائے تو اس کی ناف میں کستوری بن جائے۔ وہ کون ہے جو ایک ہی طبیعت کے پتوں سے مختلف چیزوں کو معرض وجود میں لا رہا ہے؟ ان لوگوں نے آپ کے اس جواب کو اچھا سمجھا کہ واقعی جواب با کمال ہے تو ان تمام نے اسلام قبول کر لیا۔

☆ حضرت امام احمد حنبل رحمہ اللہ نے وجود باری تعالیٰ پر یوں دلیل پیش کی ایک مضبوط قلعہ ہو جو باہر سے صاف، شفاف ہو اس میں کوئی سوراخ نظر نہ آتا ہو اس کے اندر چاندی ہو اور پھر اس کے اندر خالص سونا ہو پھر دیواریں پھٹیں تو اس قلعہ کے اندر سے ایک حیوان نکلے جس کو سماعت بھی حاصل ہو اور بصر بھی۔ کیا یہ حیوان خود بخود اس قلعہ سے نکل آیا کیا اس سونے اور چاندی سے روح والا جانور خود بن گیا یا کسی نے بنایا؟ آپ کی اس دلیل کا بھی کوئی جواب نہ دے سکا بلکہ لوگ سمجھ ہی نہ پائے۔ آپ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا مضبوط صاف شفاف قلعہ جس کی دیواروں میں کوئی سوراخ نظر نہ آتا ہو اس سے میری مراد انڈہ ہے سفید چاندی سے مراد انڈے کے اندر سفیدی ہے اور پھر اس کے اندر خالص سونے سے مراد انڈے کی زردی ہے۔ اس قلعہ میں پہلے چاندی اور سونے کے بغیر اور کوئی ذی روح چیز نہیں تھی۔ اسی سونے اور چاندی یعنی اسی زردی اور سفیدی سے انڈے میں بچہ پیدا کر دیا۔ بغیر کسی قادر، فاعل مختار اور صانع کے ایسا کرنا ممکن نہیں آپ کی اس دلیل کو بھی مستحسن سمجھا گیا۔

☆ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے اور اس کے صانع پر اس طرح سمجھایا کہ بعض اوقات باپ چاہتا ہے مجھے بیٹا حاصل ہو لیکن اس کی بیٹی پیدا ہو جاتی ہے یہ تو بتاؤ وہ کون سی قوت ہے جس نے باپ کی مرضی کے بغیر بیٹی کو معرضِ وجود میں لایا؟ وہ ذات جس نے یہ کیا یقیناً وہی اللہ ہے ہارون الرشید نے ایک مرتبہ امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے اور وہی تمام نظام کو چلانے والا ہے، سارا جہان اسی کے قبضہ قدرت میں ہے؟ آپ نے فرمایا کیا ہر انسان نہیں چاہتا کہ میری آواز خوبصورت ہو کیا ہر انسان نہیں چاہتا کہ مجھے الفاظ کا ادا کرنا اچھی طرح آ جائے میری طرز خوبصورت ہو میرا اندازِ بیان اچھا ہو؟ ہارون الرشید نے کہا ہاں یہ تو ہر شخص کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ میری آواز خوبصورت ہو میری طرز حسین ہو۔ آپ نے فرمایا کہ جب ہر شخص کی تمنا یہ ہے لیکن تمام کی یہ تمنا نہیں پوری ہوتی تو اس کی وجہ کیا ہے؟ یقیناً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ نظام کسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

☆ ابونواس نے رب قدوس کی قدرت اور اس کی صنعت پر کیا خوبصورت اشعار سے دلیل قائم کی:

تامل فی نبات الارض وانظر   الی آثار ماصنع الملیک
عیون من لجین شاخصات   وازهار کما الذهب الیک
علی قضب الزبرجد شاهدات   بان الله لیس له شریک

زمین کے پودوں میں غور کرو اور دیکھو
کہ مالک الملک کی صنعت کے کیا کیا آثار پائے گئے ہیں
سفید شفاف چاندی کی طرح چشموں کا ٹھہرا ہوا پانی
اور شگوفے کلیاں جیسا کہ سونا پگھلایا ہوا ہے
زمرد کی ٹہنیوں پر یہ تمام چیزیں شاہد ہیں
کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں

☆ ایک اعرابی سے پوچھا گیا کہ تمہیں کیا معلوم ہے کہ اس نظام کائنات کو کوئی چلانے والا ہے یہ نظام خود بخود کیوں نہیں چل رہا تو اس نے کیا خوبصورت جواب دیا:

"البعرة تدل علی البعیر والروث علی الحمیر وآثار الاقدام علی المسیر فسماء ذات ابراج، وارض ذات فجاج وبحار ذات امواج

اما تدل علی الصانع الحلیم العلیم القدیر "

"اونٹ کی مینگنیاں اونٹ پر دلالت کرتی ہیں لید گدھے پر دلالت کرتی ہے قدموں کے نشان چلنے والے پر دلالت کرتے ہیں برجوں والا آسمان، وسیع راستوں والی زمین کیوں نہ دلالت کریں اس ذات پر جو صانع ہے، حلیم ہے، علیم ہے اور قدیر ہے"

کسی طبیب سے پوچھا گیا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ کوئی رب تعالیٰ بھی ہے جو مؤثر حقیقی قادر مختار ہے اس نے کہا "باھلیج مجفف اطلق ولعاب ملین امسک" مجھے خشک ہریڑ سے پتہ چلا کیونکہ اس میں دو مختلف تاثیریں پائی جاتی ہیں قبض کشا ہے لیکن نرم لعاب کو روکتی ہے۔ اس کو مختلف قسم کی تاثیریں عطا کرنے والا یقیناً کوئی صانع موجود ہے ایک چیز کو کھولے بھی اور روکے بھی خود بخود تو اس میں یہ کوئی طاقت نہیں۔

☆ ایک اور شخص سے پوچھا گیا تمہیں کیسے پتہ چلا کہ کوئی رب تعالیٰ ہے اور تمام جہان کا نظام اسی کے قبضہ قدرت میں ہے؟ تو اس نے کہا " عرفته بنحلة باحد طرفیها تعسل والآخر تلسع " میں نے رب تعالیٰ کو شہد کی مکھی سے پہچانا اس لئے کہ وہ ایک طرف سے شہد بناتی ہے اور دوسری طرف سے ڈستی ہے اس کی ایک طرف میں شہد کو رکھنا دوسری طرف ڈنگ مارنے کی تاثیر کا رکھنا کسی قادر کا ہی کام ہے۔

عربی زبان کی چاشنی: " عسل " کا معنی ہے شہد اور اس لفظ کو الٹا کریں یعنی پہلے لام پھر سین اور پھر عین رکھیں تو "لسع " ہو جائے گا جس کا معنی ہے ڈنگ مارنا ذرا توجہ فرمائیں کہ شہد کی مکھی ایک طرف سے " عسل " (شہد) بناتی ہے اور دوسری طرف یعنی الٹ جانب عسل کا الٹ " لسع " ڈسنا پایا جاتا ہے (ماخوذ از کبیر) سبحان اللہ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام کی زبان کو کیا خوب بنایا کیا ہی اس میں ذوق پایا گیا ہے۔

تنبیہ: عبادت کی مکمل بحث ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ﴾ کی بحث میں اور "الناس "کی بحث " ومن الناس من یقول " کی بحث میں اور تقوی (تتقون) کی بحث ﴿ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴾ کی بحث میں دیکھیں۔ خیال رہے علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس آیۃ کریمہ کی بہت تفصیل سے تفسیر کی ہے لیکن بہت زیادہ طوالت سے بچتے ہوئے بحث کو کچھ مختصر کر دیا ہے۔

﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ج فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

''اور جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کیلئے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ''

''وہ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت اور نازل کیا بلندی سے پانی تو نکالے اسکے ذریعے پھل جو تمہارے لئے رزق ہیں تو اللہ کے شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو''

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ساتھ اپنے احسان کا بھی ذکر کیا کہ رب تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو بھی پیدا کیا جن میں تمہارے آباء واجداد بھی تھے اور عبادت کرنے کا فائدہ بھی لوگوں کو ہی ہے اس کا ذکر کیا ﴿ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ کہ تقویٰ تمہیں ہی حاصل ہونا ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں مزید احسانات کا ذکر کیا کہ رب تعالیٰ نے تمہارے قرار کے لئے زمین کو بنایا اور آسمان کو تمہارے لئے چھت بنایا پھر بارشیں برسا کر زمین کو رب تعالیٰ ہی اس قابل بناتا ہے کہ زمین میں اگانے کی تاثیر پیدا ہوتی ہے اور تمہارے لئے پھلوں کو پیدا کیا۔ ان نعمتوں کے ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ رب تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہراؤ جب تمہیں معلوم بھی ہے کہ خالق صرف وہی ذات ہے ہر قسم کی نعمتیں اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں کسی ایک صفت میں بھی کوئی اس کا مثل نہیں ہوسکتا تو پھر اس ذات کے تم کیوں شریک ٹھہراتے ہو۔

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

اَلَّذِیْ جَعَلَ: (وہ جس نے بنایا) ''جعل'' کبھی بمعنی ''صیر'' کے آتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے بنانا ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھیرنا اس وقت اس کے دو مفعول ہوتے ہیں جس طرح اس

آیۃ کریمہ میں استعمال ہوا ہے ﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا ﴾ یہاں "ارض" اور "فراشا" دومفعول ہیں۔

☆ اور "جعل" کبھی بمعنی "خلق" کے ہوتا ہے اس وقت اس کا ایک مفعول ہوتا ہے اس وقت معنی ہوتا ہے "پیدا کرنا" جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ اس نے تاریکیاں اور نور پیدا کئے۔

☆ اور جعل کبھی بمعنی "اخذ" کے ہوتا ہے اس وقت لازم ہوتا ہے اس وقت معنی اس کا شروع کرنا ہوتا ہے لیکن یہ خیال رہے کہ اس صورت میں یہ ایک اور فعل پر داخل ہوتا ہے جیسا کہ مفلس ابن لقیط اسدی نے دو آدمیوں کے ستانے پر کہا:

وقد جعلت نفسی تطیب لضغمه ۔۔۔ لضغمهما ها یقرع العظم نابها

میں اپنے نفس کو تسلی دینی شروع کی کہ میں بھی ان کو ایسا ہی ستاؤں گا جیسا انہوں نے مجھے ستایا ہڈیاں باری باری پر کھٹکتی ہیں۔

☆ اور کبھی "جعل" نام رکھنے کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "انا جعلنا قرآنا عربیا" بیشک ہم نے اس (کتاب) کا نام قرآن عربی رکھا۔

خیال رہے اکثر مفسرین نے اس آیۃ میں "جعل" کا معنی بنایا کیا ہے اس لحاظ پر "جعل" بمعنی "صیر" ہے۔

☆ اور کبھی "جعل" زائد ہوتا ہے جس کا معنی نہیں ہوتا جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

وقد جعلت اری الاثنین اربعة ۔۔۔ والواحد اثنین لما هدنی الکبیر

"مجھے دو چار نظر آتے ہیں اور ایک دو دکھائی دیتے ہیں جب سے میں بوڑھا ہو گیا"

(از قرطبی)

لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا: یہاں "لکم" میں لام انتفاع کا ہے معنی یہ ہوا تمہارے نفع کے لئے زمین کو فراش بنایا "الارض" جس طرح "السماء" کا معنی آسمان بھی ہے اور بلند چیز بھی اسی طرح "الارض" کا معنی زمین بھی ہے اور پستی بھی "فراشا" بچھونا۔ ایک اور مقام پر ارشاد گرامی ہے

﴿الَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا﴾ کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا "مھادا " کا معنی بچھونا بھی ہے اور ہموار ہونا بھی ہے۔ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا ﴿جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا﴾ زمین کو قرار بنایا یعنی ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔ تقریباً تینوں آیات کا مطلب یہی ہے کہ زمین کو تمہارے نفع کے لئے یعنی تمہارے ٹھہرنے کے لئے جائے قرار بنایا جیسا کہ بچھونا سونے اور آرام کرنے کے لئے ہوتا ہے ایسا ہی زمین کو بچھونے کی حیثیت دی۔

(از کبیر وقرطبی)

زمین کے بچھونا ہونے کی شرائط:

(۱) بچھونا بننے کی ایک شرط یہ ہے وہ زیادہ سخت بھی نہ ہو اور بہت زیادہ نرم بھی نہ ہو، یہی اوصاف زمین میں بھی موجود ہیں۔اگر زمین بہت زیادہ سخت ہوتی تو اس پر سونا اور چلنا دشوار ہوتا اور اس سے تمام بدن کو درد ہوتا۔اور یہ بھی خیال رہے کہ اگر زمین سونے چاندی کی بنائی جاتی تو اس پر کھیتی باڑی ممکن نہ ہوتی اس پر مکان بنانے مشکل ہوتے اور اسے کھودنا اس میں کنویں بنانے ممکن نہ ہوتے اور زمین پانی کی طرح بہت زیادہ نرم نہیں اگر ایسے ہوتی تو لوگ اس میں غوطے کھاتے رہے اور زمین کے اندر ہی دھنستے چلے جاتے۔زمین کے بہت زیادہ سخت اور نرم ہونے کی صورت میں زمین سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ ہوتا کیونکہ جب اس پر ٹھہرنا ہی ممکن نہ ہوتا تو اس سے نفع کیا ہوتا۔

(۲) بچھونا وہ چیز بن سکتی ہے جو بہت زیادہ لطیف اور شفاف نہ ہو کیونکہ شفاف چیز پر نور قرار نہیں پکڑ سکتا جو چیز اس طرح ہو وہ ہمیشہ ٹھنڈی ہی رہتی ہے اس میں ستاروں اور سورج کی حرارت (گرمی) نہیں پائی جاسکتی۔رب تعالیٰ نے زمین کو مٹی والا اسی لئے بنایا کہ اس میں نور قرار پکڑ سکے اور ستاروں کی حرارت اس میں اثر انداز ہو سکے تاکہ انسان اور دوسرے حیوان اس پر رہ سکیں اور نفع حاصل کر سکیں۔

(۳) زمین کے فراش بننے کے لئے ضروری ہوا کہ زمین کو پانی سے باہر نکالا جائے زمین کی اپنی طبیعت یہ تھی کہ وہ پانی میں مستغرق رہے لیکن اگر ایسا ہوتا تو اس پر انسان سکونت اختیار نہ کر سکتے۔تو اللہ تعالیٰ نے زمین کی طبیعت کو بدل دیا تھا جس طرح سمندر میں بعض جزیرے ظاہر ہو جاتے ہیں اسی طرح زمین کو پانی سے باہر نکال کر رہنے کے قابل بنا دیا۔

(۴) علامہ رازی رحمہ اللہ نے زمین کے فراش ہونے کے لئے زمین کا ساکن ہونا بھی شرط قرار دیا۔

اور اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے بھی زمین کے ساکن ہونے پر ایک رسالہ تحریر فرمایا علامہ رازی نے تفسیر کبیر میں زمین کے ساکن ہونے پر بہت دلائل قائم کیے ہیں آج کل کے سائنسدان زمین کے متحرک ہونے کے قائل ہیں۔ لیکن راقم کے خیال میں سائنسدانوں کا اختلاف قرآن پاک کی عظمت کو ہی ثابت کر رہا ہے کہ فلاسفہ کے قانون بدلتے رہتے ہیں لیکن قرآن پاک کے قوانین کبھی نہیں بدلے اور کبھی نہیں بدلیں گے۔ راقم ان فلاسفہ کے نظریات سے اتفاق رکھتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ زمین بھی ساکن ہے اور آسمان بھی ساکن ہے سیارے ہی چلتے ہیں۔ قرآن پاک کی یہ آیۃ کریمہ بھی بظاہر اسی کی تائید کرتی ہے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلاَ ﴾ تاہم یہ ایسا مسئلہ نہیں کہ ایک دوسرے کے خلاف لکھا جائے، قران پاک میں صراحۃً کسی ایک نظریہ کی بھی ترجمانی نہیں ملتی ہر طرف سے دلائل ملتے ہیں اور آیات مبارکہ کی تاویلات پائی جاتی ہیں۔

وَالسَّمَآءَ بِنَآءً: علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

" والبناء مصدر سمی به المبنی بیتا او کان قبة او خباء " "بناء" مصدر ہے معنی اس کا مفعول والا ہے گھر یا قبہ یا خیمہ کو کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے اور آسمان کو عمارت بنایا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" والسماء بناء " السماء للارض کالسقف للبیت ولهذا قال وقوله الحق " وجعلنا السماء سقفا محفوظا "

آسمان زمین کے لئے ایسے ہے جیسے مکان کا چھت اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے لیکن اگر یوں کہہ دیا جائے کہ آسمان کو چھت کی طرح عمارت بنایا تو اس میں دونوں معنی شامل ہو جائیں گے۔

زمین میں رب تعالیٰ کی صنعت کے عجائب:

(۱) قانون یہ ہے کہ ہر چیز جو وزنی ہوتی ہے وہ نیچے کی طرف آنے کا میلان رکھتی ہے جس چیز

میں وزن (بھار) نہیں ہوتا بلکہ ہلکی ہوتی ہے وہ اوپر جانے کی کوشش کرتی ہے۔ پانی کے نیچے زمین کا نہ جانا جب کہ تمام زمین کے نیچے پانی ہے اور زمین بھاری بھی ہے یقیناً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ رب تعالیٰ کی قدرت کے بغیر ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔

(۲) زمین میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیاں بطور ودیعت رکھی ہیں جن کا ذکر خود مالک الملک نے اس آیۃ کریمہ میں کیا ہے

﴿ وَفِي الْاَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴾ اور زمین میں یقین رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں

(۳) ایک ہی زمین میں کچھ حصے نرم اور کچھ سخت اور کچھ خوبصورت اور کچھ خوبصورتی میں کم بنانا بھی صرف رب تعالیٰ کی قدرت سے ہی ہوسکتا ہے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے ﴿ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ ﴾ اور زمین کے مختلف قطعے ہیں اور ہیں آس پاس۔ خزائن العرفان میں اس کی تفسیر ان الفاظ سے کی گئی ایک دوسرے سے ملے ہوئے ان میں کوئی قابل زراعت ہے کوئی ناقابل زراعت کوئی پتھریلا کوئی ریتلا۔

(۴) زمین میں مختلف رنگ رکھے گئے ہیں جن کا تذکرہ رب قدوس نے بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴾

''اور پہاڑوں میں راستے ہیں سفید اور سرخ رنگ رنگ کے اور کچھ بہت کالے''

(۵) زمین میں اگانے کی تاثیر رکھی گئی رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴾ اور زمین کی (قسم) جو اس سے کھلتی ہے یعنی زمین بارش سے اس قابل ہوتی ہے کہ وہ کھل جاتی ہے اور بیج سے پودے اگتے ہیں۔

(۶) زمین میں اسکی طبع میں خشکی کی وجہ سے بارش کے پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھی گئی۔ اس کا ذکر رب تعالیٰ نے اس آیۃ میں کیا ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ﴾ اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا ایک اندازہ پر پھر اسے زمین میں ٹھہرایا۔

(۷) اللہ تعالیٰ نے زمین میں چشمے اور نہریں جاری فرمائیں۔

(۸) مختلف قسم کے گھاس اور نباتات پودجات، درخت زمین میں ہی اگائے گئے۔

خیال رہے کہ نباتات کا زمین میں پیدا ہونا بظاہر ایک نشانی نظر آتی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس ایک نشانی میں کئی قدرت کی نشانیاں موجود ہیں۔ اس لئے کہ علیحدہ علیحدہ رنگ پائے جانے بہت بڑی نشانی ہے اور مختلف قسم کا ذائقہ ان میں پایا جانا اور علیحدہ نشانی ہے، پھر مختلف قسم کی بوئیں پائی جانی اور علیحدہ قسم کی نشانی ہے۔ پھر ان میں کوئی انسانوں کی خوراک بنتے ہیں، کوئی حیوانوں کی حیوانوں میں سے چرندوں کی علیحدہ خوراک، پرندوں کی علیحدہ یہ ایک اور عظیم نشانی ہے پھر ان میں سے بعض کو اسی طرح کھایا جاتا ہے بعض کو آگ پر پکا کر یہ ایک اور نشانی ہے پھر بعض کا بطور دوا استعمال کیا جانا اور بعض کا بطور تلذذ جس طرح پھل ہو گئے یہ اور علیحدہ نشانی ہے۔

پھر ذرا غور کریں تو لباس بھی نباتات سے ہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ سوت کپاس سے حاصل ہوتا جو زمین کی پیداوار ہے اور جانوروں کے بالوں اور پشم اور جانوروں کے چمڑے سے بننے والا لباس بھی زمین کے نباتات سے ہی حاصل ہوا کیونکہ جانوروں کی خوراک نباتات سے ہی حاصل ہوتی ہے اور ریشم سے بننے والا لباس بظاہر کیڑے سے حاصل ہوا لیکن کیڑے کو خوراک درخت کے پتوں سے ملتی ہے تو یہ بھی زمین کی پیداوار ہی ہو گیا۔

راقم نے جن کو سات نمبر اور آٹھ نمبر میں شمار کیا ان دونوں رب تعالیٰ کی قدرت کی عجیب نشانیوں کو رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں دیکھیں ﴿ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ﴾ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں لنگر ڈالے اور اس میں ہر بارونق جوڑا اگایا۔

(۹) زمین میں رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ تاثیر رکھی ہے کہ ایک دانہ اس میں کاشت کیا جائے تو وہ اس سے سات سو دانے اگاتی ہے اسی کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ﴿ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ﴾ جیسا کہ ایک دانہ ہو (اس سے زمین) سات بالیاں (خوشے، سٹے) اگائے اور ہر بالی میں سو دانہ ہو۔

(۱۰) زمین کو حشر و نشر کا نمونہ بنایا گیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا ﴾ اور ان کے لئے نشانی ہے کہ مردہ زمین کو ہم نے زندہ کیا۔ یعنی جس طرح بارش نہ

ہوتو زمین میں اگانے کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے وہ مردہ حیثیت رکھتی ہے اور جب بارش ہوتی ہے تو اس میں اگانے کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے وہ زندہ ہونے کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہی صورت چونکہ انسان کی موت وحیات، حشرونشر میں بھی ہوتی ہے تو گویا کہ زمین حشرونشر کی یاددلاتی ہے۔

(۱۱) اسی زمین میں ہی اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے جانور پیدا فرمائے جن کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں فرمایا ﴿ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ﴾ اور اس (زمین) میں (اللہ) نے ہر قسم کے جانوروں کو پھیلایا۔

(۱۲) اسی زمین میں اللہ تعالیٰ نے مختلف پتھر پیدا فرمائے بعض پتھر وہ ہیں جو صرف زینت کا کام دیتے ہیں جیسا کہ یاقوت، الماس، عقیق اور فیروزہ اور بعض پتھر وہ ہیں جو صرف تعمیر کے لئے کام آتے ہیں جس طرح عام سخت پتھر جو ہم عام دیکھتے ہیں لیکن تعمیر کے کام آنے والے پتھر بھی مختلف قسم کے ہیں کوئی بہت سخت نیلگوں کوئی ریتلے کوئی سچے ہیں۔ اور بعض پتھر وہ ہیں جو تعمیر اور زینت دونوں کا بیک وقت فائدہ دیتے ہیں جیسا کہ سنگ مرمر اور سرخ رنگ کا پتھر پھر ذرا اور غور کریں تو عجیب بات یہ نظر آئے گی کہ بعض پتھر وہ ہیں جن کی قیمت تھوڑی اور فائدہ زیادہ جیسا کہ تعمیر کے کام آنے والے اور چقماق جس سے آگ نکلتی ہے۔ اور بعض پتھر وہ ہیں جنکی قیمت زیادہ لیکن ان میں فائدہ تھوڑا ہے جیسا کہ یاقوت، عقیق وغیرہ۔ زمین میں پتھروں کا پایا جانا اور پھر مختلف قسم کا ہونا یہ رب تعالیٰ کی عظیم قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں

(۱۳) معدنیات بھی زمین میں ہی پائی جاتی ہیں جن میں سونا اور چاندی کی کان زیادہ قیمت رکھتی ہے یہ بھی رب تعالیٰ کی قدرت کی ہی عجیب نشانیاں ہیں۔

(۱۴) زمین میں بسنے والے انسان کو رب تعالیٰ نے مختلف کسب، مختلف صنعتوں اور مختلف عادات کا مالک بنادیا یہی زمین میں رہنے والا انسان کبھی دریا کی گہرائی سے مچھلیاں پکڑتا ہے اور کبھی فضاء سے پرندے پکڑتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ منافع جو انسان کو حاصل ہوتے ہیں وہ بہت ہی عظیم ہیں اس لئے کہ خوراک میں حیات ہے جو بعض اوقات جنگل اور سفر میں یہ چیزیں وہ فائدہ دیتی ہیں جو سونا اور چاندی فائدہ نہیں پہنچاسکتے۔

(۱۵) زمین میں بڑے بڑے درخت لگائے گئے جنکے حسین مناظر کو دیکھ کر انسان بے ساختہ کہتا ہے ''سبحان اللہ کیا ہی رب کی قدرت ہے'' پھران درختوں کی لکڑی سے انسان اپنے مکانات کے چھت، دروازے وغیرہ بناتے ہیں۔ غرضیکہ زمین میں رب تعالیٰ کی قدرت کی بہت ہی زیادہ نشانیاں پائی گئی ہیں۔

مقام توجہ: اے انسان ذرا تو سوچ توجہ کر اپنے حال کو سمجھنے کی کوشش کر تو تجھے یقینی طور پر یہ سمجھ آئے گی کہ جہان ایک گھر کی مثال ہے گھر میں جن چیزوں کی ضرورت انسان کو ہوتی ہے وہ سب مہیا کر دی گئی ہیں۔ آسمان کو چھت بنایا، زمین کو فرش اور اس گھر میں ستاروں کے چراغ چاند، سورج کی قندیلیں اور زمین کے نباتات سے غذا، دوا، لباس، سواری، زیور عطا کئے گئے۔ حیوانات، معدنیات اسے عطا کئے گئے اسے گھر کا مالک بنایا گیا طرح طرح کے انعام اس پر کئے گئے اور رب تعالیٰ نے ان گنت احسانات اس پر فرمائے اب انسان کے لئے ضروری کہ وہ شکر گزار بندہ بنے اور رب تعالیٰ کی عبادت کرے اور اسی کی طاعت کرے اگر انسان رب تعالیٰ کا شکر گزار ہوا تو ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ کے وعدہ کے مطابق اور ہی رب تعالیٰ سے انعام حاصل کرے گا اور اگر ناشکری کی تو ﴿وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِيْدٌ﴾ کی وعید کے مطابق وہ شخص رب قدوس کے انعام واکرام سے محروم ہو جائے گا۔ (ماخوذ از عزیزی)

قارئین کرام کیا آپ اپنے ملک میں اور گرد نواح میں آئے دن مشاہدہ نہیں کر رہے کہ رب تعالیٰ کی ناشکری کرنے والے بڑے بڑے عظیم بڑے بڑے جابر، بادشاہ، حکمران ذلیل نہیں ہو رہے خدرا یہودیوں، عیسائیوں، ہندوؤں کا آلہ کار بن کر کام کرنا چھوڑ دو یہ مسلمان کا شیوہ نہیں رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

زمین کی فضلیت: اللہ تعالیٰ نے زمین کے مختلف حصوں کو برکت والا کہا ہے مکہ شریف کی زمین کو برکت والا اس آیۃ میں ذکر کیا گیا ہے ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا﴾ موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کرنے اور سب سے پہلے رب تعالیٰ کے کلام کرنے والے مقام کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان کیا گیا '' فی البقعة المباركة من الشجرة '' مسجد اقصیٰ کے ارد گرد زمین کی برکت کا

ذکراس آیۃ میں کیا ﴿ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ ﴾ ملک شام کی زمین کا برکت والی ہوناذکر کرتے ہوئے فرمایا ﴿ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَھَا الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا ﴾ تمام زمین میں رب تعالیٰ نے برکت رکھی اس کا ذکر یوں کیا گیا ﴿ وَجَعَلَ فِیْھَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِھَا وَبٰرَکَ فِیْھَا ﴾ اگر کوئی یہ کہے کہ خالی جنگل ہولناک جنگل میں کون سی برکت ہے؟ تو اس کا جواب دیا جائے گا کہ جنگل میں جانور پائے جاتے ہیں جن سے انسان فائدہ حاصل کرتا ہے پھر بعض اوقات انسان اپنی ضرورت کے مطابق جنگل میں بسیرا اختیار کر لیتا ہے۔ زمین میں ان برکتوں کے پائے جانے کی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ﴾ (یقین رکھنے والوں) کا ذکر کیا ہے جیسا کہ قرآن پاک اگر چہ تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے لیکن اس ہدایت سے نفع صرف متقین حضرات ہی حاصل کرتے ہیں اس لئے فرمایا ﴿ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴾

زمین کی فضلیت پر واضح دلیل یہ بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام جو مقرب اور بلند درجات کے مالک ہیں وہ زمین میں ہی پیدا ہوئے اور زمین ہی ان کا اصل ہے یہ مسئلہ اس آیۃ کریمہ کو دیکھنے سے سمجھ آ جائے گا ﴿ مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ ﴾ اسی (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے۔ یہ خطاب تمام انسانوں کو ہے جس میں انبیاء کرام بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خاص انعام سے مکرم فرمایا جو پہلے کسی نبی کو وہ انعام نہیں دیا گیا ﴿ جعل الارض کلھا مسجدا لہ وجعل ترابھا طھورا ﴾ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے تمام زمین کو مسجد بنایا اور زمین کی مٹی کو پاک کرنے والا بنایا یعنی اس سے تیمم کیا جاتا ہے جس سے انسان کو طہارت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے بھی زمین کی فضلیت سمجھ میں آئی واضح ہوا کہ زمین کو مختلف وجوہ سے کمال اور فضلیت حاصل ہے۔ (از کبیر)

آسمان کی فضلیت: آسمان ملائکہ کی عبادت گاہ ہے اس میں کوئی جگہ ایسی نہیں جسمیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ آدم علیہ السلام جب جنت میں تھے بھول کر خطا کے واقع ہونے پر بھی آپ کو جنت سے نکل جانے کا حکم دیا۔ آسمان کو مضبوط چھت بنایا جس کا ذکر رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے کیا ﴿ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ﴾ اور آسمان میں برج بنائے مالک الملک نے ارشاد فرمایا

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجاً﴾

زمین وآسمان کی فضیلت کا ذکر:

" انه تعالیٰ ذکر امر السموات والارض فی کتابه فی مواضع "

" بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کے متعلق اپنی کتاب میں کئی جگہ ذکر کیا"

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین وآسمان کا بہت زیادہ ذکر کیا " فھو یدل علی عظم شانھما " تو وہ ان کی عظمت شان پر دلالت کرتا ہے " وعلی ان له سبحانه و تعالیٰ فیھما اسرارا عظیمة " بیشک اللہ تعالیٰ کے زمین وآسمان میں عظیم راز پائے جاتے ہیں اس سے بھی ان دنوں کی شان میں عظمت واضح طور پر سمجھ آ رہی ہے:

" وحکما بالغة لا یصل الیھا افھام الخلق ولا عقولھم "

" اور زمین وآسمان میں اللہ تعالیٰ کی کامل حکمتیں اتنی پائی جاتی ہیں جن تک مخلوق کی سمجھ اور عقل نہیں پہنچ سکتی"

اس بھی پتہ چلا کہ زمین وآسمان کو رب تعالیٰ نے بہت زیادہ عظمت عطا فرمائی ہے۔

آسمانوں کو زمین پر فضیلت کے قائلین کے دلائل:

اول: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو سات چیزوں سے مزین فرمایا ہے:

(۱) مصابیح (چراغوں) سے ﴿وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ﴾

(۲) چاند سے جس کا ذکر یوں فرمایا ﴿وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا﴾

(۳) سورج سے، جس کا ذکر فرمایا ﴿وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجاً﴾

(۴) عرش سے، اسے یوں بیان کیا ﴿رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ﴾

(۵) کرسی سے، اس کا ذکر اس طرح کیا ﴿وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾

(۶) لوح سے، جسے ذکر کیا ﴿فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾

(۷) قلم سے جس کا ذکر فرمایا ﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾.

دوم: سماء کا معنیٰ ہی بلندی ہے جس کا نام عظمت پر دلالت کر رہا ہے کہ آسمانوں کو رفعت شان حاصل ہے

سوم: " انه تعالیٰ جعل السماء قبلة الدعاء فالایدی ترفع الیها و الوجوه تتوجه نحوها "
بیشک اللہ تعالیٰ نے آسمان کو دعاء کا قبلہ بنایا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھتے ہیں انسان آسمان کی طرف ہی دعا میں متوجہ ہوتا ہے آسمان ہی انوار کی منزل ہے اور صفاء اور روشنی اور طہارت اور خلل وفساد سے پاک ہونے کا محل ہے۔

چہارم: آسمان مؤثر ہیں کہ بارش سورج کی شعاعیں زمین میں اثر انداز ہیں لیکن آسمان اثر قبول کرنے والے نہیں زمین اثر کو قبول کرتی ہے مؤثر نہیں " والمؤثر اشرف من القابل " مؤثر قبول کرنے والے سے اشرف ہوتا ہے۔

پنجم: آسمانوں کو سورج اور چاند سے جو زینت حاصل ہے اس سے بھی آسمانوں کو فضلیت حاصل ہے یہ دلائل دینے والے حضرات آسمانوں کو زمین پر افضل مانتے ہیں کہ زمین کو یہ کمالات حاصل نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کا موقف: استاذی المکرم حضرت علامہ مفتی محمد حسین نعیمی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ نبی کریم ﷺ ہیرے کی مثال ہیں ہیرا اگر رومال میں لپیٹ دیں تو رومال کی قیمت بڑھ گئی ہیرے کو ٹوپی میں رکھیں تو ٹوپی کی قیمت بڑھ گئی اور اگر ہیرے کو کسی برتن میں رکھیں تو وہ برتن قیمتی ہو جائے گا۔

بس یہی سمجھیں کہ جب نبی کریم ﷺ غار حرا میں ہوتے تو غار حرا کا مقام بلند ہوتا اور جب مکہ مکرمہ میں ہوتے تو مکہ مکرمہ کا مقام بلند ہوتا اور جب آپ غار ثور میں تشریف لائے تو غار ثور کا مقام بلند ہو گیا اور جب آپ آسمانوں پر تشریف لے گئے تو آسمانوں کا مقام بلند ہو گیا اور جب آپ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو مدینہ طیبہ کا مقام بلند ہو گیا اور جب آپ مزار انور میں تشریف لے گئے تو آپ کے مزار انور کا مقام بلند ہو گیا۔

راقم کو یہی بات پسند آئی دل میں یوں راسخ ہو گئی کہ زمین کی افضلیت پر دلائل اور آسمان کی افضلیت پر دلائل کی قوی ہونے یا ضعیف ہونے سے قطع نظر دل یہ کہتا ہے میرا ایمان یہی ہے میرا دین یہی ہے میری محبت یہی ہے کہ رب تعالیٰ تو مکان سے پاک ہے رب تعالیٰ کے بعد اگر کوئی ذات سب کائنات سے بلند ہے تو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ ہیں وہ چونکہ زمین میں ہیں لہٰذا زمین ہی افضل ہے کوئی

شخص دلائل کی قوت وضعف سے مجھ پر اعتراض نہ کرے میرا سرمایہ صرف محبت رسول اللہ ﷺ ہی ہے۔

مسئلہ : اگر چہ زمین کو فراش کہا گیا ہے اور سورج کو سراج کہا گیا ہے لیکن قسم کا تعلق عرف سے ہے اس لئے اگر کسی نے قسم اٹھائی کہ میں فراش پر نہیں سوؤں گا اگر وہ زمین پر سو گیا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹی کیونکہ عرف عام میں زمین کو فراش نہیں کہتے بلکہ بستر کو فراش کہتے ہیں۔اسی طرح اگر قسم اٹھائی کہ میں سراج (چراغ) کی روشنی میں نہیں پڑھوں گا تو اس نے سورج کی روشنی میں پڑھ لیا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹی کیونکہ عرف میں سورج کو چراغ نہیں کہا گیا۔ (از احکام القرآن للجصاص)

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً:

(اور آسمان سے پانی نازل کیا) بظاہر اس پر وہم یہ پایا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی بادل سے نازل ہوتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ذکر ہے:

﴿ اَفَرَءَیْتُمُ الْمَاءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ☆ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴾

"تو بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو پیتے ہو کیا تم نے اسے بادل سے اتارا یا ہم ہیں اتارنے والے"

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نرم نرم چلاتا ہے بادل کو پھر انہیں آپس میں ملاتا ہے پھر انہیں تہہ بتہہ کر دیتا ہے تو تو دیکھے کہ اس میں سے بارش نکلتی ہے۔

جب ثابت ہوا کہ پانی بادل سے نازل ہوتا ہے تو یہاں آسمانوں سے پانی کے نازل ہونے کا کیا مطلب ہے؟

☆ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں یا تو مراد ہے " انزل من جهتها " آسمان کی جانب سے پانی نازل کرتا ہے۔

☆ اور یا اس کا مقصد یہ ہے " منها الى السحاب و من السحاب الى الارض " کہ رب تعالیٰ آسمان سے پانی بادل میں نازل کرتا ہے اور بادل سے زمین کی طرف نازل کرتا ہے

اس پر حدیث پاک شاہد ہے:

" عن ابن عباس رضى الله عنهما انه قال تحت العرش بحر ينزل منه

ارزاق الحیوانات یوحی الله تعالیٰ الیه فیمطر ماشاء من سماء الی سماء حتی ینتهی الی السماء الدنیا ویوحی الی الریح فتحمله فتلقیه فی السحاب والسحاب بمنزلة الغربال ویوحی الی السحاب ان یغربله فیغربله فلیس من قطرة الا ومعها ملیک یضعها موضعها ولا ینزل من السماء قطرة الا بکیل معلوم ووزن معلوم الا ما کان فی یوم الطوفان فانه کان منهمرا قد نزل بغیر کیل ولا وزن"

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عرش کے نیچے دریا ہے جس سے حیوانوں کا رزق نازل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف وحی کرتا ہے تو وہ بارش برساتا ہے جتنی رب چاہتا ہے وہ بارش ایک آسمان سے نیچے والے آسمان تک اس طرح یہ سلسلہ چلتے ہوئے آسمان دنیا تک پہنچ جاتا ہے پھر ہوا کی طرف وحی کی جاتی ہے جو اس بارش کو اٹھا کر بادلوں تک پہنچا دیتی ہے اور بادل چھلنی کی طرح ہوتے ہیں پھر بادلوں کی طرف وحی کی جاتی ہے تو ان سے چھلنی کی طرح بارش برسنی شروع ہو جاتی ہے ہر قطرہ کے ساتھ ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اسے اپنی جگہ رکھ کر چلا جاتا ہے ہر قطرہ کی مقدار معلوم ہوتی ہے ہاں طوفان کے دن وہ بے تحاشا پانی ہوتا ہے جس کی مقدار معلوم نہیں ہوتی''

خیال رہے کہ علامہ طنطاوی نے ''السماء'' کا معنی ہی یہاں ''السحاب'' (بادل) کیا ہے۔

☆ اور یا اس کا جواب یہ ہے " او المراد بالسماء جهة العلو کما ینبئی عنه الاظهار فی موضع الاضمار" اور یا " السماء " سے مراد ''بلندی کی جانب'' ہے کیونکہ پہلے "والسماء بناء " میں " السماء " سے مراد آسمان ہے اگر یہاں بھی مراد آسمان ہوتا تو یوں کہہ دیا جاتا " وانزل منه ماء " جب ضمیر نہیں ذکر کی بلکہ اسم ظاہر لایا گیا تو اس سے بھی اشارہ مل رہا ہے کہ پہلے معنی سے مختلف معنی لینا زیادہ مناسب ہے۔ (از تفسیر ابی السعود ، شیخ زادہ)

☆ " او من اسباب سماویة تثیر الاجزاء الرطبة من اعماق الارض الی جوا لهواء فتنعقد سحابا ما طرا " یا اس آیۃ میں یہاں " السماء " سے مراد "اسباب سماویہ" ہو جائیں یعنی زمین کی گہرائی سے تر اجزاء فضاء کی طرف اٹھتے ہیں اور بادل بن کر برستے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسباب سماویہ سے پانی نازل کیا خیال رہے کہ تر اجزاء سے مراد بخارات ہیں جو پانی اور ہوا سے ملے جلے ہوتے ہیں یعنی پانی سے بخارات اٹھ کر ہوا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر وہ

کرہ ہوائیہ جسے زمہریریہ کہا جاتا ہے اس میں پہنچ جاتے ہیں اور پانی کی شکل اختیار کر کے زمین پر آجاتے ہیں۔ (از بیضاوی، شیخ زادہ)

راقم کا موقف: راقم نے اس تمام بحث کے بعد یہ مناسب سمجھا کہ "السماء" کا معنی بلندی کر لیا جائے اور اس طرح بیان کیا جائے کہ تمام اقوال اس میں سمٹ کر آجائیں کسی کا اختلاف نظر نہ آئے وہ یوں سمجھ آتا ہے کہ زمین کے پانی سے اٹھنے والے بخارات فقط سبب ہیں بارش کا برسنا رب تعالیٰ کی قدرت سے ہے وہ چاہے تو کسی سبب کو مؤثر بنائے اور چاہے تو مؤثر نہ بنائے۔ بخارات سے بننے والے بادلوں کو عرش کے نیچے سے آنے والا پانی بھی فراہم ہوتا ہے وہ پانی چونکہ آسمانوں کی جانب سے ہی آتا ہے پھر برستا اس وقت ہی ہے جب رب تعالیٰ حکم دیتا ہے چونکہ "السماء" کا لغوی معنی بلندی بھی ہے اس لئے راقم نے "بلندی" معنی کر کے اپنے زعم ناقص کے مطابق تمام اقوال کو جمع کر لیا ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ:

جب ﴿ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾ میں لفظ "ماء" کی تنوین کو تبعیض کے لئے بنایا جائے اور "من الثمرات" میں "من" کو بھی تبعیض کے لئے بنایا جائے تو معنی یوں ہوگا۔ "اور اللہ نے بلندی سے کچھ پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے تمہارے رزق کے لئے بعض پھل نکالے"۔ اس سے اس طرف اشارہ حاصل ہوگیا کہ جب بارش برستی ہے تو زمین میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے ہر قسم کے نباتات پیدا ہوتے ہیں جن میں سے بعض انسانوں کے کھانے کے لئے ہوتے ہیں اور بعض جانوروں کے کھانے کے لئے ہوتے ہیں جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴾

"بیشک ہم نے اچھی طرح پانی ڈالا پھر زمین کو خوب چیرا تو اس میں اگایا، اناج اور انگور اور چارہ اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغیچے اور میوے اور نباتات تمہارے اور تمہارے چوپاؤں کے نفع کے لئے"

☆ اور اگر ﴿ مِنَ الثَّمَرٰتِ ﴾ میں ''من'' کو بیانیہ بنایا جائے تو معنی ہوگا۔ ''تو نکالے اس کے ذریعے پھل''۔ اب مقصد یہ ہوگا کہ تمام پھل ہی انسان کے نفع کے لئے ہیں کیونکہ جن نباتات کو حیوانوں نے کھانا ہے اور حیوانوں سے نفع انسان نے حاصل کرنا ہے وہ نباتات بھی درحقیقت انسان کے نفع کے لئے ہی ہیں۔

(ماخوذ از بیضاوی وقرطبی)

قرآن پاک کی یہ عظمت ہے کہ ایک ایک لفظ سے کتنے مطالب حاصل ہوتے ہیں بیان کرنے والے پھر بھی اپنے عجز کا ہی اعتراف کرتے ہیں کہ ہم قرآن پاک کو کما حقہ بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

شاندار علمی نکتہ: " الثمرات " جمع مؤنث سالم ہے جب اس پر الف لام نہ ہوتو یہ جمع قلت ہے اور جب اس پر الف لام ہو تو جمع کثرت ہے اس لفظ کو ذکر کرنے اور الثمر یا الثمار نہ ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے " تنبیھا علی قلة ثمار الدنیا واشعار بتعظیم امر الآخرة " کہ اس سے متنبہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ دنیا میں بظاہر پھل کثیر پائے جاتے ہیں لیکن وہ امر آخرت کی عظمت اور ان پھلوں کے مقابل قلیل ہی ہیں۔

(از کبیر)

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا: (تو اللہ کے شریک نہ ٹھہراؤ) " انداد " جمع ہے " ند " کی جس کا معنی ہے مثل، نظیر، کفو جس طرح کسی شاعر نے کہا:

نحمد الله ولا ندله ، عنده الخیر وما شاء فعل

ہم اللہ کی حمد کرتے ہیں اور اس کی کوئی مثل نہیں اسی کے پاس سب بھلائیاں جو چاہے وہ کرتا ہے

(از قرطبی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی لغوی معنی کے مطابق ہے لیکن مرادی معنی یوں بیان کیا گیا ہے

" فلا تجعلوا لله اندادا ، شرکاء فی العبادة "

اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک نہ ٹھہراؤ (جلالین) راقم کا ترجمہ جلالین کے مطابق ہے یہاں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیا گیا ہے ماقبل کے ساتھ اس کے تعلق میں تین احتمال ہیں۔

(۱) اس کا تعلق " اعبدوا " سے ہو اب مطلب یہ ہوگا کہ اے لوگو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ" فان اصل العبادة واساسها التوحید " بیشک عبادت کی اصل اور بنیاد توحید ہے۔

(۲) اس کا تعلق " لعل " سے ہو اب مطلب یہ ہوگا "اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا تاکہ تم ڈرو اور اس کے عذاب کا خوف رکھو" فلا تثبتوا له ندا فانه من اعظم موجبات العقاب " اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ کیونکہ اسکے ساتھ شریک ٹھہرانا بہت بڑے عذاب کا سبب ہے

(۳) اس کا تعلق ﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا......الخ ﴾ سے ہو اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ ذات جس نے تمہیں اتنی عظیم نعمتوں سے نوازا اور اپنے خالق ہونے پر اتنے روشن دلائل قائم کیے ہیں اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔ (از کبیر)

اندادا جمع لانے میں عجیب حکمت:

" وفی الاتیان بالجمع تشنیع علیهم حیث جعلوا ......انداد لمن یستحیل له ان یکون له ند واحد " " اندادا " جمع ذکر کر کے ان لوگوں کی حماقت کو واضح کیا گیا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئی شریک ٹھہراتے تھے کہ یہ لوگ کیسے ہی احمق ہیں کہ اس ذات کے ساتھ کئی شریک ٹھہرا رہے ہیں جس کا کوئی ایک شریک ٹھہرانا بھی محال ہے۔

کیا خوب کہا زید بن عمر بن نفیل رضی اللہ عنہ نے جو نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے زمانہ فترۃ میں بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے تھے:

اربا واحدا ام الف رب ، ادین اذا تقسمت الامور
ترکت اللات والعزی جمیعا ، کذلک یفعل الرجل البصیر

کیا ایک رب ہے یا ہزار رب ہیں کیا دین کے امور (کئی خداؤں میں) تقسیم ہو سکتے ہیں
میں نے لات اور عزیٰ سب کو چھوڑ دیا عقل آدمی ایسا ہی کرتا ہے

(از روح المعانی)

اعتراض: پہلے تمہید کو دیکھا جائے پھر اعتراض کو سمجھنا آسان ہوگا "ند" ایک چیز کی مثل کو

کہا جاتا ہے جو اس کے امور میں مخالف ہو منافر ہو اس سے بعید ہو "الند المشارک فی الجوھریۃ فقط" ایک چیز جو دوسری چیز کے ساتھ جوہر ہونے میں مشترک ہو اسے "ند" کہا جاتا ہے "الشکل المشارک فی القدر والمساحۃ" ایک چیز جب دوسری سے قدر او رتہ (ناپ، اندازہ) میں مشترک وہ "شکل" ہے "الشبۃ المشارک فی الکیفیۃ فقط" ایک چیز دوسری کے ساتھ صرف کیفیت میں شریک ہو تو اسے "شبہ" کہتے ہیں "والمساوی فی الکمیۃ فقط" جب ایک چیز دوسری کے ساتھ مقدار (لمبائی وغیرہ) میں مشترک ہو تو اسے "مساوی" کہا جاتا ہے "والمثل عام فی جمیع ذالک" ایک چیز دوسری کے ساتھ کسی طرح بھی مشترک ہو تو اسے "مثل" کہا جاتا ہے۔

اب اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین میں سے کوئی بھی اپنے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں صفات میں مماثل نہیں مانتے تھے اور نہ ہی وہ اپنے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے افعال کے مخالف کام کرنے والا مانتے تھے:

"وانما عبدوھا لتقربھم الیہ سبحانہ زلفی"

"وہ تو بتوں کی عبادت صرف اس لئے کرتے تھے کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کرتے ہیں"

یہاں کیسے کہا گیا کہ "رب تعالیٰ کے "ند" نہ بناؤ وہ تو رب تعالیٰ کا کوئی "ند" (جوہر ہونے میں اس کا مماثل) مانتے ہی نہیں تھے۔

پہلا جواب: یہاں استعارہ تھکمیہ پایا گیا ہے جس طرح کہ کفار کو عذاب کی خبر ان الفاظ سے دی گئی ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ اے محبوب آپ ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ حالانکہ عذاب کی خبر تو پریشان کن ہوتی ہے لیکن اس کو بشارت سے تعبیر کر دیا گیا کیونکہ اس میں تہکم پایا گیا ہے "تھکم" کا معنیٰ تو مزاح اڑانا ہے لیکن یہاں مفہوم یہ ہے کہ ان سے اس انداز پر کلام کریں کہ تمہارے کلام سے ان کے بے وقوفی واضح ہو جائے۔ اس آیۃ میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غیر کی عبادت صرف اس غرض سے کرنا کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کریں گے یہ حماقت ہے یہ تو ایسے ہی ہے جیسا کہ اس کا کوئی مماثل سمجھ لیا جائے۔

دوسرا جواب: ہو سکتا ہے کہ آیۃ مبارکہ میں "ند" کا معنیٰ مثل اور نظر لے لیا گیا ہو کہ غیر اللہ کی

عبادت کرنا اس کو معبود سمجھنے میں مثل ہی سمجھنا ہے۔ (از روح المعانی)

تیسرا جواب: علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے آسان لفظوں میں یوں جواب ذکر فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ کسی ایک صفت میں غیر اللہ کو اسکے برابر مان لینا گویا اس کی ذات اور تمام صفات میں برابر ماننا ہے۔ (تبیان البیان)

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: حال من ضمیر "لا تجعلوا" والمفعول مطروح " یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے یعنی معنی یہ ہے کہ تمہارا حال یہ ہے کہ بیشک تم علم، معرفت، نظر و فکر اور درست رائے رکھتے ہو جب تم معمولی بھی غور و فکر کرو تو تمہیں سمجھ آ جائے کہ صانع (خالق) موجود ہے وہ ذات وصفات میں واحد ہے اس کے بغیر کوئی معبود نہیں راقم کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے" حالانکہ تم جانتے ہو" "اومقدر حسبما یقتضیه المقام ویسد مسد مفعولی العلم" یا مناسب الفاظ مقدر نکالے جائیں جو "علم" کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہوں۔ یعنی اب معنی اس طرح ہوگا " وانتم تعلمون انه سبحانه لا یماثله شئی" اللہ تعالیٰ کے برابر نہ ٹھہراؤ تم جانتے بھی ہو کہ اس پاک ذات کا کوئی مثل نہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے تو اللہ کیلئے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ۔

اعتراض: اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تو محاورہ کے خلاف ہے اس لئے کہ ہم جب کسی کو یہ کہیں کہ یہ کام جان بوجھ کر نہ کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ارادۃً قصداً یہ کام نہ کرو یہاں یہ مراد ہی نہیں۔

جواب: زبان کا تعلق علاقہ اور زمانہ سے ہوتا ہے بعض علاقوں میں اور محاورہ ہوتا ہے اور بعض میں اور اسی طرح بعض زمانوں میں اور محاورات ہوتے ہیں بعض میں اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو یوں پڑھ کر دیکھیں تو اللہ کے لئے جانتے ہوئے (کہ اس کا کوئی مثل نہیں) برابر والے نہ ٹھہراؤ۔ انشاء اللہ آپ کا ذہن اسے ضرور قبول کرے گا کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کا یہی مطلب ہے جو راقم نے آپ کے ترجمہ کی توجیہ بیان کی۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک ٹھہرانے والوں کے عقائد:

ایک فرقہ جس کو ثنو یہ کہا جاتا ہے وہ دو خدا مانتے ہیں ایک حلیم جو بہتر کام کرتا ہے اور ایک سفیہ جو برے کام کرتا ہے اسی فرقہ کے قریب مجوس ہیں وہ بھی دو خالق مانتے ہیں ایک نیکیوں کو پیدا کرنے والا جس کا نام ان کے نزدیک یزادان ہے اور دوسرا برائیوں کو پیدا کرنے والا جسے وہ اھرمن کہتے ہیں۔

اسی طرح ایک فرقہ جن کو صابئین کہا جاتا ہے یہ ستاروں کو معبود مانتے ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ستاروں کو پیدا کیا ہے اور ان ستاروں کو تمام جہان کا مدبر بنایا ہے اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کی عبادت کریں اور ستارے اللہ کی عبادت کریں۔ ایک اور فرقہ جسے نصاریٰ کہا جاتا ہے "الذین یعبدون المسیح علیہ السلام" یہ وہ لوگ ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں ایک اور فرقہ ہے جو بت پرست ہیں تمام فرقوں سے پہلا فرقہ بت پرستوں کا ہی ہے کیونکہ یہ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بھی پائے گئے ہیں جن کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَاتَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا﴾ وہ کہنے لگے اپنے معبدوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور (اپنے بتوں) ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا۔

بت پرست بتوں کی عبادت کیوں کرتے تھے؟

ابو معشر جعفر ابن محمد منجم بلخی نے ذکر کیا ہے کہ بہت سے چین اور ہند کے لوگ کہتے تھے "بـاللہ وملائکۃ" اللہ کی قسم اور اس کے فرشتوں کی قسم۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے اور اس کی صورت ہے وہ سب صورتوں سے اچھی صورت رکھتا ہے اور اسی طرح فرشتے بھی جسم ہیں اور بہت خوبصورت ہیں۔ لیکن وہ تمام آسمانوں میں ہیں ان کی صورتیں ہم سے محجوب ہیں یعنی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں اس لئے انہوں نے اپنے عقیدہ کے مطابق ضروری سمجھا کہ ان کی اچھی اچھی صورتیں بنا لیں لہٰذا انہوں نے خوبصورت خوبصورت مورتیاں بنالیں ان بتوں کی عبادت کرنی شروع کر دی کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں۔

ستارہ پرستوں کے نظریات:

جب لوگوں نے دیکھا کہ نظام عالم میں تغیر ستاروں کے احوال کے تغیر کے ساتھ منسلک ہے کہ سورج کا سر کی جانب سے قرب اور دوری سے مختلف حالات ہوتے ہیں اسی طرح باقی سیاروں کا بھی یہی حال ہے تو ان لوگوں نے یہ عقیدہ رکھ لیا کہ دنیا میں نحوست یا سعادت کی دارومدار ستاروں پر ہی ہے تو انہوں نے ان کی تعظیم میں حد درجہ سے تجاوز کیا۔

اب ان میں سے بعض نے یہ عقیدہ رکھا کہ یہ تمام ستارے واجب الوجود (خود قائم ہیں کسی نے

ان کو موجود نہیں کیا) ہیں اور یہی اس جہان کی تمام مخلوق کے خالق ہیں۔
اور بعض ان میں سے اللہ تعالیٰ کو بھی مانتے تھے اسے " اللہ اکبر " کہتے تھے ان کا عقیدہ ستاروں کے متعلق یہ تھا کہ یہ اللہ اکبر کی مخلوق ہیں لیکن اس جہان کے یہ خالق ہیں۔
ان دونوں فرقوں میں یہ فرق تھا کہ پہلے فرقہ والے لوگ ستاروں کو مستقل خدا مانتے تھے ان کو ہی خالق مانتے تھے اور یہ کہتے کہ یہ جب خود خالق ہیں تو مخلوق نہیں۔ دوسرے فرقہ والے ان کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق مانتے تھے اور دوسری مخلوق کا خالق مانتے تھے اس طرح ان کے نزدیک ستارے اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان واسطہ تھے " فلا جرم اشتغلوا بعبادتها والخضوع لها " یقیناً دونوں فرقے ہی ان کی عبادت میں مشغول ہو گئے اور ان کے سامنے انہوں نے عجز کا اظہار شروع کر دیا۔ پھر ان لوگوں نے بھی جب دیکھا کہ ہمارے معبود تو کبھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو انہوں نے بھی ان کی مورتیاں بنالیں اور ان بتوں کی عبادت شروع کر دی ان کی غرض یہ تھی کہ یہ بت ہمیں ہمارے معبودوں (ستاروں) کے قریب کرتے ہیں پھر ان میں کئی لوگوں نے زیادہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان بتوں کو ہی مستقل معبود سمجھ لیا ستاروں کو معبودیت سے معزول کر دیا۔

طلسم پرست: جادوگری کی لکیریں کھینچنے کو خوشحالی کے آنے اور مصائب کے مندفع کرنے کا مستقل ذریعہ سمجھ لیا اسی کی تعظیم شروع کر دی آہستہ آہستہ رب تعالیٰ کے مقابل مستقل کارساز ان کو ہی سمجھ لیا: " ولما طاقت المدة ذلک الفعل نسوا مبدا الامر واشتغلوا بعبادتها علی الجهالة باصل الامر " جب وقت زیادہ گزر گیا تو یہ لوگ بھی اپنے ابتدائی عقیدہ سے اور تجاوز کر گئے انہوں نے بھی "طلسم پرستی" شروع کر دی۔

بت پرستی کی ایک اور وجہ: جب ان میں سے کوئی بڑا شخص فوت ہو جاتا تھا جسے وہ سمجھتے تھے کہ اس کی دعا قبول ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی شفاعت قبول ہوتی ہے " اتخذوا صنما علی صورته یعبدونه " اس کی شکل کا وہ بت بنا لیتے تھے اور اس کی وہ عبادت کرتے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ انسان جن کی مورتیوں کی ہم عبادت کر رہے وہ قیامت کے دن ہمارے شفیع ہوں گے اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کو یوں بیان فرمایا ﴿يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ وہ کہتے یہ اللہ کے ہاں

ہمارے شفاعت کریں گے۔

بت پرستی کا ایک اور انداز: ابتدائی طور پر وہ بزرگوں کے بت بنا کر مسجد کے محراب میں رکھ لیتے تھے وہ اپنے خیال میں عبادت تو رب تعالیٰ کی ہی کرتے تھے لیکن بتوں کو اپنی توجہ کا مرکز سمجھتے تھے "**ولما استمرت هذه الحالة ظن الجهال من القوم انه يجب عبادتها**" جب وہ اسی حال میں رہے زیادہ وقت گزرنے پر ان کے جاہلوں نے محراب میں رکھے ہوئے بتوں کی عبادت کو واجب سمجھ لیا اور ان کو حقیقی معبود سمجھ لیا۔

بت پرستوں کا ایک اور عقیدہ:

"**لعلهم كانوا من المجسمة فاعتقدوا جواز حلول الرب فيها فعبدوها على هذا التاويل**" وہ جن بزرگوں کا مجسمہ بناتے تھے اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ رب تعالیٰ اس مجسمہ میں اتر آیا ہے لہذا یہ مجسمہ رب تعالیٰ کا قالب ہے ہم تو رب کی عبادت کر رہے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: باطل فرقوں کی جتنی قسمیں بیان کی ہیں ان تمام کا عقیدہ یہ تھا کہ غیر اللہ معبود ہیں ان کے وہ مجسمے بنا کر ان کی عبادت کرتے تھے۔

مقام افسوس! کہ جہلاء مسلمانوں کو مشرک کہہ کر اپنے آپ کا جہنم کا ایندھن بناتے رہتے ہیں وہ کہتے یہی ہیں کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کا مقرب ماننے والے ان کو شفیع ماننے والے بت پرستوں کی طرح ہی ہیں۔ خدارا انصاف کیجئے کیا کوئی مسلمان کسی نبی کسی ولی کو معبود سمجھتا ہے کیا کوئی مسلمان ان کا مجسمہ بنا کر ان کو پوجتا ہے؟ جب ایسا نہیں تو مسلمانوں کو مشرک کہنے والے یقیناً انسانیت سے دور ہیں۔

فائدہ جلیلہ:

"**وكان قصي جد رسول الله ﷺ ينهاهم عن عبادتهم ويدعوهم الى عبادة الله تعالىٰ**" (کبیر)

"رسول اللہ ﷺ کے جدامجد حضرت قصی لوگوں کو بتوں کی عبادت سے منع کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت تھے"

نبی کریم ﷺ کے والدین کو کافر کہنے والے اپنی عاقبت کو برباد کر رہے ہیں ان شاء اللہ مستقل بحث مناسب مقام پر ذکر کی جائے گی۔

توحیدِ باری تعالیٰ: مسند احمد میں حارث اشعری سے روایت ذکر کی گئی بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا تحقیق اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو پانچ کلمات (پانچ چیزوں) کا حکم دیا کہ خود بھی ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی حکم دو وہ بھی ان پر عمل کریں بنی اسرائیل کو کہنے میں آپ سے کچھ دیر ہوگئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا رب تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے پانچ چیزوں کا کہ تم خود بھی ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دو۔ بنی اسرائیل کو یہ حکم تم پہنچاؤ گے یا میں پہنچاؤں آپ نے کہا اے میرے بھائی (دینی بھائی) مجھے ڈر لگتا ہے کہ اگر تم نے مجھ سے پہلے بنی اسرائیل کو حکم پہنچا دیا:

"ان اعذب او یخسف بی" تو مجھے کہیں عذاب نہ دے دیا جائے یا میری صورت کو کہیں تبدیل نہ کر دیا جائے۔

حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام نے بیت المقدس میں بنی اسرائیل کو جمع کیا یہاں تک کہ مسجد بھر گئی آپ بلند جگہ پر بیٹھے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اور اسکی ثناء بیان کی پھر کہا بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ چیزوں کا حکم دیا ہے کہ میں ان پر خود بھی عمل کروں اور تمہیں بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دوں۔

اَوْلٰهُنَّ اَنْ تَعْبُدُوْا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْاً:

ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ بیشک اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے خالص مال یعنی سونے یا چاندی سے غلام خریدے پھر اسے کسی کام پر مقرر کرے (یعنی اس سے مزدوری کرائے) اور وہ اپنی آمدنی اپنے مالک کے غیر کو دے دے تم میں سے کون سا شخص ہے جو اپنے غلام کی اس طرح کی حرکت کو پسند کرے گا؟

"وان اللہ خلقکم ورزقکم فاعبدوہ ولا تشرکوا بہ شیا"

"بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں رزق عطا فرمایا تو اسی کی تم عبادت کرو اور اس کے

ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ"

وَاَمَرَکُمْ بِالصَّلوٰةِ: اور (دوسری چیز یہ ہے) اللہ تعالیٰ نے تمہیں نماز کا حکم دیا ہے بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی طرف (اپنی رحمت کی) توجہ فرماتا ہے جب تک بندہ ادھر ادھر منہ نہ پھیرے نماز میں بندہ چونکہ ادھر ادھر منہ نہیں پھیرتا (لہذا وہ رب تعالیٰ کی رحمت کی توجہ کا مستحق رہتا ہے)

وامرکم بالصیام: "اور تمہیں رب تعالیٰ روزں کا حکم دیتا ہے" اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ ایک جماعت میں کسی کے پاس کستوری کی تھیلی ہو سب لوگ اس سے خوشبو حاصل کریں کیونکہ روزہ دار کی منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری کی بو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔

و امرکم بالصدقة: اور (چوتھی چیز) تمہیں صدقہ کرنے کا حکم دیا بیشک اسکی مثال ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی شخص کو اس کا دشمن قید کرلے اس کے ہاتھ گردن سے باندھ لے اور اس کے گردن اڑانے کے لئے اسے میدان میں کھڑا کر دیا جائے وہ کہے تم مجھ سے فدیہ لے کر مجھے چھوڑ دو (چونکہ صدقہ بھی جہنم سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " ان الصدقة تطفی النار " بیشک صدقہ آگ کو بجھا دیتا ہے۔

وامرکم بذکر اللہ کثیرا: اور (پانچویں چیز) اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم اللہ کا ذکر بہت کرو اس کی مثال ایسے ہے جیسا کہ ایک شخص کے پیچھے دشمن جلدی جلدی سے آرہا ہو یہ بھاگ کر ایک قلعہ میں داخل ہو کر قلعہ بند ہو جائے بیشک انسان جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہ شیطان سے قلعہ بند ہو کر محفوظ ہو جاتا ہے:

" قال قال رسول الله ﷺ وانا آمركم بخمس الله امرنى بهن الجماعة والسمع والطاعة والهجرة والجهاد فى سبيل الله فانه من خرج من الجماعة قيد شبر فقد قلع ربقة الاسلام من عنقه الا ان يراجع ومن دعا بدعوى جاهلية فهو من جثى جهنم قالوا يا رسول الله وان صام وصلى فقال وان صلى وصام وزعم انه مسلم فادعوا المسلمين باسمائهم على ما سماهم الله عزوجل المسلمين المؤمنين عباد الله ، هذا حديث حسن "

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا جماعت کو لازم پکڑو (رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو) دل کے کانوں سے سنو اور (اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی) طاعت کرو اور ہجرت اور جہاد اللہ تعالیٰ کی راہ میں۔

(جماعت کی ساتھ رہنے کا حکم کیوں دیا) بیشک وہ شخص جماعت سے ایک بالشت کی مقدار بھی ہٹ گیا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا ڈورا نکال دیا ہاں مگر یہ کہ وہ (پھر جماعت کی طرف) لوٹ آئے اور جس نے زمانہ جاہلیت کے طور طریقے اختیار کئے وہ جہنم میں اوندھا ہو کر گرے گا صحابہ کرام نے کہا یا رسول اللہ اگر چہ اس نے نمازیں ادا کیں اور روزے رکھے آپ نے فرمایا ہاں اگر چہ وہ نمازیں بھی ادا کرر ہا ہو روزے بھی رکھتا رہا ہو۔ اور اس نے اپنے آپ کو مسلمان بھی سمجھا ہو مسلمانوں کو ان کے ان ناموں سے ہی بلاؤ جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے نام مسلمان اور مومن رکھے ہیں'' (صابونی)

حدیث شریف سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو جوامع الکلم کا خصوصی اعجاز رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوا تھا صرف ایک لفظ سے عظیم سے عظیم مسائل بیان کر دیئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا '' الجماعة '' جماعت کو لازم پکڑو کیونکہ مسلمانوں کی جماعت کے عقیدہ سے نکل جانے والا زمانہ جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنے والا جہنمی ہو گا اس سے شرک کی نفی ہوگئی عبادت کرنے کا حکم پایا گیا چوری، ڈاکہ، غصب، بدکاری، سودخوری، شراب نوشی غرضیکہ ہر برائی سے اس ایک لفظ سے روک دیا گیا کیونکہ یہ تمام طریقے زمانہ جاہلیت کے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت کر دیا کہ زمانہ جاہلیت کی طرح لوگوں کو برے القاب نہ دینا برے الفاظ سے نہ پکارنا اگر کوئی بظاہر مسلمان ہو تو اسے مسلمان ہی سمجھنا اس کے باطن کو رب تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

سبحان اللہ میرے پیارے مصطفےٰ کریم ﷺ نے کتنا شاندار عقیدہ توحید بیان فرما دیا کہ صرف زبان سے اپنے آپ کو توحیدی کہنے سے توحید نہیں ملتی توحیدی بنتا ہے تو زمانہ جاہلیت کی تمام برائیوں کو یکسر ختم کرنا ہو گا لوگوں کے مال پر ناجائز قبضہ بھی اور نام کا توحیدی بھی ہوا ایسا توحیدی انشاء اللہ قیامت کے دن صاحب حق سے اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکے گا۔

☆ اسی آیۃ کریمہ کے مطابق ہی دوسری آیۃ میں بھی رب تعالیٰ نے اپنے انعامات واحسانات

کا ذکر فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

''اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو قرار بنایا اور آسمان کو چھت اور تمہیں صورتیں عطا کیں تو تمہاری صورتوں کو حسین بنایا اور تمہیں حلال چیزوں سے رزق عطا فرمایا یہ اللہ تمہارا رب ہے اللہ برکت والا ہے وہ ہی سب جہانوں کا رب ہے''

ان دونوں آیتوں سے مضمون یہ ثابت کیا گیا ہے:

" انه الخالق الرازق مالک الدار وساكنيها ورازقهم فبهذا يستحق ان يعبد وحده ولا يشرک به غيره ولهذا قال فلا تجعلوا لله اندادا وانتم تعلمون "

''بیشک وہی خالق وہی رازق وہی سب جہانون کا مالک وہی جہان میں رہنے والوں کا مالک وہی ان کو رزق دینے والا ہے اسی وجہ سے وہی مستحق ہے کہ عبادت صرف اس ایک ذات کی کی جائے اس کے ساتھ کوئی اور شریک نہ ٹھہرایا جائے''

اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے خود فرمایا:

﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ تو اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو

☆ بخاری و مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں میں نے کہا " يا رسول الله اى الذنب اعظم عند الله قال ان تجعل لله ندا وهو خلقک " یارسول اللہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کون سا بہت بڑا گناہ ہے آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کے شریک ٹھہراؤ وہ ذات جس نے تمہیں پیدا کیا (یعنی خالق کے ساتھ شریک ٹھہرانا بہت بڑا گناہ ہے)۔

☆ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے " اتدری ما حق الله علی عباده ان يعبدوه ولا يشركوا به شيا " کیا تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے؟ (اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر یہ حق ہے) کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

☆ ایک اور حدیث میں ہے " لا يقولن احدكم ماشاء الله وشاء فلان ولكن ليقل

ماشاء الله ثم شاء فلان " تم میں سے کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے "جو اللہ نے چاہا اور فلاں شخص نے چاہا ہاں البتہ یہ کہہ سکتے ہو جو اللہ نے چاہا پھر فلاں نے چاہا۔

یعنی پہلی صورت میں شرک کا شبہ پڑتا ہے لیکن دوسری صورت میں " ثم " ذکر ہے جو تراخی پر دلالت کرتا ہے اس میں شرک کا شبہ لللہ ﷺ نے فرمایا " فلا تقولوا ما شاء الله وشاء محمد ولكن قولوا ما شاء الله وحده " تم یہ نہ کہو جو اللہ نے چاہا اور محمد ﷺ نے چاہا لکن تم صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کہ نہیں پڑتا۔

☆ ایک اور حدیث میں ہے رسول اجو اللہ نے چاہا۔ (از ابن ...)

نام نہاد توحیدی توجہ فرمائیں:

ابھی ساتھ ہی متصل جس حدیث کو پیش کیا ہے اسے توحید کے علمبردار بہت پیش کرتے ہیں ہمیں تو بفضلہ تعالیٰ کوئی اعتراض ہی نہیں ہم نے کبھی " العیاذ باللہ " نبی کریم ﷺ کو معبود نہیں سمجھا کبھی رب تعالیٰ کا شریک نہیں سمجھا البتہ یہ ضرور سمجھا جائے کہ اس حدیث میں عین شرک کا ذکر نہیں بلکہ صرف شرک کی مشابہت اور شرک کے وہم سے بچنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے ذکر فرمایا کہ رب تعالیٰ کی مشیت سے ملا کر میری مشیت کو نہ ذکر کیا جائے۔

شرک کی مشابہت اور تقویٰ:

" وعن ابن عباس رضی الله عنهما لا تقولوا لو لا فلان لا صابنی کذا ولولا کلبنا یصیح علی الباب لسرق متاعنا وعن النبی ﷺ انه قال ایاکم ولو فانه من کلام المنافقین قالوا لو کانو عندنا لما ماتوا وما قتلوا "

" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ نہ کہو اگر فلاں نہ ہوتا تو مجھے اسی طرح تکلیف پہنچتی اگر ہمارے دروازے پر ہمارا کتا نہ بھونکتا تو چور ہمارا سارا سامان لے جاتے اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کلمہ " لو " کہنے سے اپنے آپ کو بچا کر رکھو کیونکہ یہ منافقوں نے کہا " لو کانوا عندنا لما ماتوا وماقتلوا " اگر وہ (صحابہ کرام) ہمارے پاس ہوتے (جہاد میں نہ شریک ہوتے) تو نہ فوت ہوتے اور نہ ہی قتل کئے جاتے (یعنی شہید نہ ہوتے)" (روح البیان وحاشیہ جلالین)

یہ دراصل تقوی کی باتیں ہیں تقویٰ کا اعلیٰ معیار ان میں پایا گیا ہے ورنہ کون سا توحیدی نہیں کہتا کہ مجھے یہاں آنے میں دیر ہوگئی ایک مہمان آ گیا تھا اگر مہمان نہ آتا تو میں وقت پر پہنچ جاتا۔کون سا توحیدی یہ نہیں کہتا دوران سفر ٹھنڈی ہوا لگی تو نزلہ، بخار ہوگیا اگر ٹھنڈی ہوا نہ لگتی تو نزلہ، بخار بھی نہ ہوتا وہ کون سا توحیدی ہے جو یہ نہیں کہتا کہ چلنے میں کچھ دیر ہوگئی گاڑی نکل گئی اگر تھوڑا پہلے چلتا تو گاڑی کو پکڑسکتا تھا، خدارا! انصاف کیجئے جب ہر مسلمان دن میں بیسیوں مرتبہ اگر ہوتا اگر یہ نہ ہوتا کی رٹ لگاتا رہتا ہے اسی کوئی مشرک نہیں کہتا توحیدی یہی الفاظ سینکڑوں مرتبہ بولنے پر اپنے آپ کو مشرک نہیں کہتا تو اس کی وجہ کیا ہے؟ ہاں ہاں یقیناً یہ الفاظ بولنے والا مشرک تو نہیں البتہ تقوی کا اسے اعلیٰ معیار حاصل نہ ہوا ہاں اگر کوئی خوش بخت بڑی احتیاط سے کام لیتا ہوا اس قسم کے الفاظ نہ ذکر کرے تو وہ تقوی کے بلند مقام پر فائز ہے۔

بس یہی مطلب ہے " **فلا تقولوا ما شاء الله شاء محمد** " کا اگر چہ ان الفاظ سے عین شرک حاصل نہیں ہوگا البتہ تقوی کا بلند مقام اسی وقت حاصل ہوگا جب فقط رب تعالیٰ کی مشیت کا ذکر کرتے ہوئے کہے گا " **ماشاء الله** "۔

ذرا اور توجہ فرمائیں: علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ آیۃ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوق سے مستغنی (بے پرواہ) بنایا۔اسی وجہ سے نبی کریم علیہ السلام نے اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

" والله لان یاخذ احدکم حبله فیحتطب علی ظهره خیر له من ان یسال احدا عطاه او منعه " (اخرجه مسلم)

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تم میں سے کوئی شخص رسی لے لے اور اپنی پیٹھ پر لکڑیاں (ایندھن) لائے (اور بیچ دے) تو اس کے لئے بہتر ہے بنسبت اس کے کہ کسی سے سوال کرے وہ دے یا نہ دے۔

" ویدخل فی معنی الاحتطاب جمیع الاشغال من الصنائع وغیرها فمن احوج نفسه الی بشر مثله بسبب الحرص والامل والرغبة فی زخرف الدنیا فقد اخذ بطرف من جعل الله ندا "

"نبی کریم علیہ السلام نے جو یہ فرمایا کہ لکڑیاں جنگل سے لاکر بیچنا کسی سے مانگنے سے بہتر ہے آپ کے اسی ارشاد گرامی میں یہ تمام چیزیں داخل ہیں کہ کسی کارخانہ میں کام کرنا،

دوکان کرنا، کسی قسم کی تجارت کرنا، کسی قسم کی محنت ومزدوری کرنا اپنا کوئی بھی کام کرنا
کسی سے مانگنے سے بہتر ہے"

جو شخص حرص، امید اور دنیا کی زیب وزینت میں رغبت کی وجہ سے اپنے آپ کو کسی انسان کا محتاج بنالیتا ہے تو اس نے بھی شرک کا کچھ نہ کچھ کنارہ حاصل کر ہی لیا (قرطبی)

ہاں ذرا غور کیا آپ نے کہ کوئی ایسا شخص بھی ڈھونڈنے سے ملے گا جس نے کسی دوسرے انسان سے لالچ نہ رکھی ہو۔

فائدہ جلیلہ: صوفیاء کرام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں انسان کو فقر کی راہ بتائی ہے وہ یہ ہے کہ اے انسان تو زمین کو اپنا بچھونا بنا اور آسمان کو اوڑھنی بنا پانی کو ذریعہ لذت بنا اور گھاس پتے اپنا طعام بنا اور دنیا کی طلب کی وجہ سے مخلوق میں سے کسی ایک کی بھی عبادت نہ کر:

"فان اللہ عزوجل قد اتاح لک مالا بدلک من غیر منة فیه لاحد علیک"

"بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہاری ضرورت کی ہر چیز تمہیں مہیا فرمائی ہے اور اس نے تم میں سے کسی شخص پر اپنا احسان نہیں جتلایا"

نوف بکالی کہتے ہیں ایک مرتبہ رات کو حضرت علی رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے آپ نے ستاروں کی طرف نگاہ کی تو آپ نے فرمایا اے نوف "ارا قد انت ام رامق" کیا تم سوئے ہوئے یا کچھ جاگ رہے ہو میں نے کہا "بل رامق یا امیر المؤمنین" اے امیر المؤمنین میں جاگ رہا ہوں آپ نے فرمایا:

"طوبی للزاھدین فی الدنیا والراغبین فی الآخرة اولئک قوم اتخذوا الارض بساطا وترابها فراشا وماء ھا طیبا والقرآن والدعاء دثارا وشعارا فرفضوا الدنیا علی منهاج المسیح علیه السلام"

"کتنے اچھے وہ لوگ ہیں جو دنیا سے دور ہوتے ہیں اور آخرت کی طرف رغبت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زمین کو بچھونا بنایا اور اس کی مٹی کو اس کے اوپر فرش بنایا اور اسکے پانی کو باعث لذت سمجھا اور قرآن پاک اور دعاء کو اوڑھنا بنایا اور دنیا کو اس طرح چھوڑ دیا جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام دنیا سے دور رہے"۔

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴾

''اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (ان خاص) بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو''

''اور اگر تمہیں کچھ شک ہے اس میں جو ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل کیا تو اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو اگر تم سچے ہو''

ماقبل سے تعلق:

" لما تقرر اثبات الربوبیة للہ سبحانہ وتعالیٰ وانه الواحد الخالق وانه لا ضد له ولا ند اتبعه باقامة الحجة علی اثبات نبوة محمد ﷺ وما يدحض الشبهة فی کون القرآن معجزة وانه من عند اللہ تعالیٰ لامن عند نفسه کما تدعون فيه"
(خازن)

''پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کا ذکر کیا کہ وہی رب ہے وہی خالق ہے وہی رازق ہے وہی بارش نازل کرنے والا ہے وہی زمین سے پھل نکالنے والا ہے زمین کو جائے قرار بنانے والا وہی ہے اور آسمان کو چھت بنانے والا وہی ہے لہٰذا اس ایک ذات کی ہی عبادت کرو وہی " وحدہ لاشریک له " (ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں)''

اس کے بعد واضح طور پر ﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا ﴾ کا ارشاد فرمایا کہ تم اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ یہ تمام ذکر توحید باری تعالیٰ کا تھا۔ اب یہاں سے نبوت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ قرآن ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل کیا ہے اور قرآن نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے آپ نے خود قرآن نہیں پیش کیا۔ علامہ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ولما اثبت التوحید استدل علی اثبات النبوة لیصح بهما الاسلام

فانہ لا یصح الابشہادتین"

رب تعالیٰ نے جب اپنی توحید کا ذکر فرمادیا تو ساتھ نبوت کے ثبوت پر دلائل ذکر فرمادیئے تاکہ ان دونوں پر ایمان لاکر لوگ مسلمان بن سکیں کیونکہ رب تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوسکتا۔ توحید بغیر رسالت کے انسان کو زندیق بنادیتی ہے اور رسالت بغیر توحید کے انسان کو مجوسی اور قدری بنادیتی ہے واضح ہوا کہ توحید اور رسالت دونوں میں میں تلازم ہے ایک دوسری سے جدا نہیں ہوسکتیں۔ (ابن عربی)

شانِ نزول: کافروں نے کہا آپ جو کلام پیش کررہے ہیں ہمیں تو اس میں شک ہے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کلام تم خود پیش کررہے ہو ان کے یہ کہنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی)۔ اہل کتاب نے قرآن پاک کے وحی باری تعالیٰ ہونے پر شک کیا۔ تو یہ آیۃ نازل ہوئی (کبیر) دونوں قول ایک ہی مطلب رکھتے ہیں، کہ کفار اور اہل کتاب کے اعتراض اور شک وتردد کرنے پر ان کے رد میں یہ آیۃ نازل ہوئی۔ تو نہ فوت ہوئے اور نہ ہی قتل کیے جاتے (یعنی شہید نہ ہوئے)۔ (روح البیان و حاشیہ جلالین)

مختصر مطلب: جب کفار اور اہل کتاب نے قرآن پاک پر شک کیا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو کہا کہ اگر تمہیں اس چیز میں شک ہے جو ہم نے اپنے خاص بندے محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمائی تو تم بھی اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت لے آؤ۔ رب تعالیٰ کے بغیر جتنے بھی تم نے معبود بنا رکھے ہیں یا جن کو بھی تم رب تعالیٰ کے بغیر اس کے مدمقابل اپنا مددگار سمجھتے ہو۔ ان تمام کو بلالو سب مل کر ایک چھوٹی سی سورت بنالو اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو۔

خیال رہے کہ ابتداء میں ﴿ لَا رَیْبَ فِیْهِ ﴾ کی بحث میں ریب اور شک میں فرق بیان کردیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کردیا گیا ہے کہ قرآن پاک اگرچہ شک سے پاک ہے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں البتہ جن لوگوں نے اس کے کلام الٰہی ہونے میں شک کیا ہے وہ یا تو حاسد تھے اور یا سمجھنے کی اہلیت سے قاصر تھے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ: لفظ "ان" ذکر کیا ہے جس کا معنیٰ "اگر" ہوتا ہے یہ مقام شک میں استعمال ہوتا ہے "اگر تم نے سبق یاد نہ کیا تو تمہیں سزا دی جائے گی" یہ کلام استاذ اسی وقت کرتا ہے جب

اسے یقین نہیں ہوتا کہ یہ لڑکا سبق یاد کرے گا یا نہیں کرے گا۔ یہاں رب تعالیٰ کے ارشاد میں "ان" کا استعمال کیسے ہے؟ تو اس کا مطلب یہ ہے "لـلتوبیخ علی الارتیاب" کہ ان لوگوں کو شک کرنے پر ڈانٹنا مقصود تھا کہ قرآن پاک میں تو شک کی گنجائش نہیں البتہ اے حسد کرنے والو سوچنے، سمجھنے کہ اہلیت نہ رکھنے والو اگر بالفرض تمہیں کوئی شک ہو تو قرآن پاک کی ایک چھوٹی سی سورت جیسی سورت بنا کر تو دکھا دو جب تم اپنے تمام مددگار بلانے کے باوجود بھی ایسا نہیں کر سکو گے تو سمجھ لینا کہ کلام الٰہی میں شک کرنا ہماری اپنی ہی غلطی ہے۔ اور مطلب یہ بھی ہے کہ کفار اور اہل کتاب میں سے قرآن پاک میں شک کرنے والے تو کچھ لوگ تھے تمام نہیں تھے لیکن ایمان نہ لانے کی وجہ سے سب ایک جیسے ہی تھے اس لئے شک نہ کرنے والوں کو بھی شک کرنے والوں کے ساتھ ملا کر ارشاد فرمایا کہ اگر تمہیں بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح کبھی شک ہو جائے تو تم بھی یہی کوشش کر کے دیکھ لینا تمہیں سمجھ آ جائے گا کہ ہاں واقعی یہ اللہ کا کلام ہے ماننا تو اسی وقت ہوتا ہے جب قسمت ساتھ دے۔

رَیْبٍ: لفظ "ریب" کو نکرہ ذکر کر کے بھی یہ ارشاد فرمایا کہ اگر تم نے شک کیا بھی تو وہ کوئی حیثیت نہیں رکھے گا۔ کیونکہ قرآن پاک کی حقانیت پر بہت قوی اور روشن دلائل پائے گئے ہیں ان دلائل کے ہوتے ہوئے تمہارے شک کا کیا مقام رہ جائے گا (از روح المعانی)۔ بلکہ تمہارے نہ ماننے کے باوجود تمہارے اپنے دل اس پر گواہی دیں گے کہ قرآن پاک حق ہے اللہ کا کلام ہے اور تمہارے ساتھ بھی تمہیں یہی کہیں گے کہ اس کتاب جیسی اور کوئی کتاب نہیں۔

مِمَّانَزَّلْنَا: اصل میں "من مانزلنا" ہے لفظ "من" ابتدائیہ ہے اور بعض حضرات نے تبعیضیہ بھی بنایا ہے بعض نے "تبعیضیہ" ہونے پر کلام بھی فرمایا ہے "ما" موصولہ ہے اس سے مراد "کتاب" ہے مطلب یہ ہوگا کہ جو کتاب ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل فرمائی ہے اگر تمہیں اس کتاب پر شک ہو بلکہ اس کتاب کی کسی ایک سورت پر بھی شک ہو تو تم بھی اس جیسی کوئی سورت لے آؤ۔

خیال رہے کہ تنزیل کا معنی ہے آہستہ آہستہ اتارنا اور انزال کا معنی ہے ایک ہی بار اتارنا لیکن یہ کبھی ایک دوسرے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ یہاں آہستہ آہستہ اتارنے کا مفہوم مراد تو نہیں تاہم کفار کے اس قول کا بھی ضمنی طور پر رد ہو گیا "لولا نزل علیه القرآن جملة واحدة" یہ قرآن اس پر ایک بار ہی سارا کیوں نہیں نازل ہوا۔ ضمنی طور پر رد واضح ہے اگر تمہیں قرآن

پاک کے آہستہ آہستہ نازل ہونے پر کوئی شک ہوتو ہمارا یہ چیلنج بھی قبول کرلو کہ تم قرآن پاک کی سورت جیسی سورت آہستہ آہستہ تمام مل کر ہی لے آؤ۔

عَلٰی عَبْدِنَا: " وقوله علی عبدنا ، اضافة تشریف لمحمد ﷺ وان القرآن منزل علیه من عند اللہ تعالٰی " (خازن)

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ عَلٰی عَبْدِنَا ﴾ میں اضافت تشریفی ہے جو مضاف کی عظمت وشرافت کو واضح کر رہی ہے کہ وہ ہمارا بندہ ہے اس لئے کہ قرآن اس ذات پر ہم نے ہی نازل کیا ہے سبحان اللہ جسے رب تعالیٰ نے خود اپنا بندہ کہا وہ رب تعالیٰ کا خاص ہی بندہ ہے وہ صرف " عبد " نہیں بلکہ رب تعالیٰ نے " عبدنا " کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ میں بریکٹ میں لفظ '' خاص '' بڑھایا ہے راقم نے بھی اگرچہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی ہی نقل کی ہے لیکن اضافت تشریفی علم معانی کا ضابطہ اہل علم سے مخفی نہیں اس لئے راقم نے بغیر بریکٹ کے بندہ خاص معنی کر دیا ہے جس پر تفسیر خازن کی تائید پیش کر دی ہے۔

فَاْتُوْا: فا علیحدہ ہے ائتوا علیحدہ امر کا صیغہ ہے "تو لے آؤ" اگرچہ وہ لا تو نہیں سکتے تھے لیکن ان کو یہ حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ وہ لا سکیں گے اور ان سے مطالبہ کیا گیا ہو کہ یہ کام تمہارے ذمہ ہے تم کر سکتے ہو لہٰذا ضرور کرنا بلکہ یہ امر "تعجیز" کیلئے ہے ان کو عاجز کرنا اور تمام کائنات پر ان کے عجز کو ظاہر کرنا مقصود تھا کہ تم یہ کام کبھی نہیں کر سکو گے جیسا کہ بعد والی آیت میں واضح ہو جائے گا۔

بِسُوْرَةٍ: "بـا" تعدیت کی ہے اسی وجہ سے " ائتـوا " کا معنی "لاؤ" کیا ہے ورنہ بغیر "بـا" کے اس کا معنی ہوتا ہے "آؤ، دو" "سورة" کا ایک معنی ہے قطعہ (ٹکڑا) چونکہ سورت بھی قرآن پاک کا ایک حصہ ہوتا ہے اس لئے اسے سورت کہا جاتا ہے۔

خیال رہے کہ سورت میں کم از کم تین آیتوں کا ہونا ضروری ہے اور ایک آیۃ میں کم از کم چھ حرفوں کا ہونا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ شامی نے ثم نظر، ثم عبس، ثم بسر" چھ چھ حرفوں پر مشتمل آیات کو چھوٹی آیات کہا ہے اور اس کے مجموعہ یعنی اٹھارہ حرفوں پر مشتمل مقدار کی آیات کو بڑی آیات کہا ہے۔ "سورة" کا ایک اور معنی "بلند مرتبہ" اسی معنی کے لحاظ پر شہر کے اردگرد دیوار کو "سور البلد" کہا جاتا ہے

کہ وہ دیوار بھی بلند ہوتی اس معنی کے لحاظ سے قرآن پاک کی ''سورۃ'' کو ''سورۃ'' کہنے کی یہ وجہ ہے:

'' سمیت سورۃ لان القاری ینال بھا منزلۃ رفیعۃ حتی یستکمل المنازل باستکمال سور القرآن ''

سورۃ کا نام سورۃ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اسے پڑھنے والا شخص بلند مرتبہ حاصل کر لیتا ہے یہاں تک جب قرآن پاک تمام سورتوں کی قراءت مکمل کر لیتا ہے تو مرتبہ کی بلندی میں کمال حاصل کر لیتا ہے۔ (از خازن)

مِنْ مِّثْلِهٖ: اگر ضمیر '' مثلہ '' کی قرآن پاک کی طرف لوٹے جو ''مما نزلنا'' سے بیان کیا گیا ہے تو اب معنی یہ ہوگا کہ اگر تمہیں شک ہے اس پر جو ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل کیا ہے تو تم ایک چھوٹی سے سورت لے آؤ جو اس قرآن کی سورۃ جیسی فصاحت و بلاغت رکھتی ہو:

'' ولو کان الضمیر مردودا الی محمد ﷺ (ای الی عبدنا) تعال وان ارتبتم فی ان محمدا منزل علیہ فھاتوا قرآنا مثل محمد ﷺ '' (خازن)

اور اگر ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹے (یعنی عبد کی طرف لوٹے) تو معنی یہ ہوگا کہ اگر تمہیں شک ہے اس میں جو محمد ﷺ پر ہم نے نازل کیا تو تم ایک چھوٹی سی سورۃ لے آؤ جو محمد ﷺ کی مثل ہو مفہوم یہاں بھی یہ ہوگا کہ جو محمد ﷺ پر نازل ہونے والے قرآن کی مثل ہو علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں ذکر کیا کہ ایسا شخص ہو جو نبی کریم ﷺ کی طرح امی ہوتا ہم ضمیر کو قرآن کی طرف لوٹانا ہی بہتر ہے تا کہ دوسری آیات کے مطابق ہو جائے خصوصاً سورہ یونس میں ''عبد'' کا ذکر ہی نہیں صرف سورۃ کا ذکر ہے ﴿ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ﴾۔

خیال رہے کہ مثل سے مراد یہ نہیں کہ عربی عبارت اتنی مقدار میں بناؤ جتنی مقدار ایک چھوٹی سی سورۃ ہے کیونکہ جو لوگ ایک ''طرح مصرع'' پر قصیدے لکھتے تھے ان کے سامنے سورۃ کوثر کی مقدار عربی زبان میں عبارت پیش کرنا کیا مشکل تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن پاک کی طرح فصیح و بلیغ ایک چھوٹی سی سورۃ لے آؤ۔

تنبیہ: راقم نے جو ترجمہ میں ''چھوٹی سی سورت'' تحریر کی ہے یہ مدارک سے ترجمہ لیا ہے کیونکہ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس کے ترجمہ میں یہ تحریر فرمایا ہے ''سورۃ من اصغر السور '' ایک

ایسی سورۃ لاؤ جو تمام سورتوں سے چھوٹی ہو کچھ مزید ذکر انشاء اللہ تفصیلی ذکر میں آجائے گا ابھی تک تو اختصار سے کام لیا جا رہا ہے۔

وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: "الدعاء النداء والاستعانة" دعاء کا معنی بلانا اور امداد طلب کرنا البتہ پہلا معنی حقیقی ہے اور دوسرا مجازی اور یہ بھی ممکن ہے کہ استعانت کنایہ کے طور پر نداء پر مبنی ہے اس لئے کہ جب کوئی شخص کسی کو بلاتا ہے تو اس سے امداد طلب کرتا ہے۔ "شهداء" شہید یا شاہد کی جمع ہے اور شہید جس طرح علامہ راغب اصفہانی نے بیان کیا اسے کہا جاتا ہے "كل من يعتد بحضوره ممن له الحل والعقدة ولذا سموا غيره مخلفا" ہر وہ شخص جس کی موجودگی کو معتبر سمجھا جائے یعنی جو شخص صاحب علم ہو اور ہر قسم کے علمی پیچ وخم کو جانتا ہو اس کا موجود ہونا اصل سمجھا جائے اس کے موجود ہوتے ہوئے جیسے دوسرے حاضر ہوں تو ان کو اس کا خلیفہ ہی سمجھا جائے اور دوسرے اس کے ہوتے ہوئے موجود نہ ہوں تو پھر بھی ان کو خلیفہ ہی سمجھا جائے۔ اور شہید کے اور معانی حاضر ہونا، گواہی دینا، امداد کرنا اور امام ہونا۔

"دون" کے معانی: قریب ہونا، اس کا استعمال "مـــن" سے زیادہ ہوتا ہے جیسے یہاں استعمال ہے "مـــن دون الله" اور کبھی باء سے بھی استعمال ہوتا ہے پھر مجازی طور پر "دون" کا استعمال تفاوت کیلئے بھی آتا ہے زیادہ طور پر حسی تفاوت کیلئے استعمال ہوتا ہے لیکن معنوی تفاوت کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جسطرح کہا جائے "دون زيد فى القامة" فلاں شخص کا قد زید کے قد سے چھوٹا ہے یہ حسی تفاوت کی مثال ہے اور یہ کہا جائے "دون زيد شرفا" فلاں شخص زید سے شرافت کے لحاظ پر کم ہے تو تفاوت معنوی ہوگا پھر مجازی معنی میں اور زیادہ عموم پایا جاتا ہے یعنی ایک حد سے دوسری حد کی طرف تجاوز کرنے کیلئے بھی "دون" کا استعمال ہوتا ہے اگرچہ اس میں تفاوت اور پستی نہ بھی پائی جائے اسی معنی کے لحاظ پر "دون" "غیر" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو کلمہ استثناء کہلاتا ہے اس صورت میں اس کا معنی ہوتا ہے سوا۔ اور "دون" کا معنی "گھٹیا" اکثر طور پر آتا ہے۔ (از روح المعانی)

اب معنی کی طرف توجہ کریں:

"وادعوا شهداء كم من دون الله اى استعينوا بآلهتكم التى تعبدونها من دون الله"

یعنی اللہ تعالیٰ کے بغیر جن کی تم عبادت کرتے ہو اور ان کو اپنا معبود سمجھتے ہو ان کو اپنی امداد کے لئے بلالو کہ آؤ ہماری امداد کرو کہ ہم قرآن کی سورت جیسی کوئی سورت بنالیں۔ یعنی جب تمہارا دعوی یہ ہے کہ ہم جن کی عبادت کر رہے ہیں یہ عبادت کے مستحق ہیں تو ان کو اپنی امداد کے لئے بلالو اور قرآن کی سورت جیسی سورت بنا کر نبی کریم ﷺ سے مقابلہ کرلو اگر تم ایسا نہیں کر سکتے وہ تمہارے معبود تمہاری امداد نہیں کر سکتے تو تم سمجھ لو کہ تم باطل راہ پر ہو۔

(از خازن)

خیال رہے کہ یہ جو معنی بیان کیا ہے اس میں " شھید " بمعنی ناصر لیا ہے کہ تم اپنے معبودوں کو اپنی مدد کے لئے بلالو کہ وہ تمہاری امداد کریں اور ''شہید'' بمعنی گواہ لے کر ایک معنی یہ ہوگا " **واستعینوا بآلھتکم التی تعبدونھا وتزعمون انھا تشھدلکم یوم القیامۃ** '' اور تم اپنے معبودوں کو اپنی امداد کے لئے بلالو جن کی تم عبادت کرتے ہو اور گمان یہ کرتے ہو کہ وہ قیامت کے دن تمہاری شہادت دیں گے۔ یعنی جن کو تم اپنے لئے قیامت کے دن کا گواہ سمجھ کر ان کی عبادت کرتے ہو ان اپنے قیامت کے گواہ معبودوں کو بلالو سب مل کر قرآن کی سورت جیسی سورت لے آؤ۔ (از مظہری) اور ''شہید'' بمعنی گواہ کے ہی لے کر ایک اور معنی یہ ہے:

''**وادعوا ان اتیتم بشئی وزعمتم انہ من مثلہ شھداء کم ای من یشھد لکم فالعاقل لا یرضی لنفسہ ان یشھد بما یظہر اختلالہ** ''

اگر تم اپنے باطل خیال کے مطابق کوئی کلام پیش کر کے اسے قرآن پاک جیسا سمجھ بیٹھو تو اس اپنے کلام کے قرآن کی مثل ہونے پر کوئی گواہ لے آؤ جو یہ گواہی دے کہ ہاں یہ قرآن کی مثل ہے لیکن تم سے یہ بھی نہیں ہو سکے گا کیونکہ کوئی عقل مند شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ جس میں خلل ظاہر ہو اس کی گواہی دے دے یعنی تمہارے اپنے ساتھی بھی کیوں نہ ہوں اگر ان میں معمولی بھی عقل ہوئی بالکل ہی پاگل نہ ہوئے تو وہ بھی آنکھیں بند کر کے یہ گواہی نہیں دے سکیں گے کہ تمہارا ناقص کلام قرآن پاک کی مثل ہوسکتا ہے۔

(از تبصیر الرحمن)

''شہید'' بمعنی حاضر لے کر یہ معنی ہوگا'' **ادعوا اناسا یحضرونکم** '' تم لوگوں کو بلالو جو تمہارے پاس حاضر ہو جائیں یعنی حاضر ہو کر تمہاری امداد کریں کہ تم سب

مل کر کوئی سورت قرآن پاک کی چھوٹی سی سورت جیسی لے آؤ۔ یا پہلے والا معنی ہی مراد ہو جائے کہ تم لوگوں کو بلا لو یعنی بڑے بڑے فصحاء کو بلا لو وہ گواہی دیں کہ تمہارا کلام رب کے کلام کے مثل ہو سکتا ہے۔

اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ: اگر تم سچے ہو کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کا اپنا کلام ہے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کر لو اور اپنے مددگار بھی بلا لو اور قرآن پاک کی چھوٹی سی سورت جیسی لے آؤ۔ اب اس وضاحت کے بعد امید ہے کہ قارئین کرام کو اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بخوبی سمجھ آ جائے گا کہ اپنے حمایتی بلا لو وہ تمہاری سورت بنانے میں حمایت کریں یا تمہارے کلام کو رب کے کلام جیسا اپنی گواہی سے ثابت کر کے حمایت کریں راقم کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی نقل ہی ہے صرف الفاظ کا فرق ہے۔

کچھ مزید وضاحت: اللہ تعالیٰ نے جب اپنی خالقیت اور اپنے معبود ہونے پر بہت پختہ دلائل قائم فرما دیئے اور اس کے بعد یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس آیۃ میں نبوت پر دلائل قائم فرمائے ہیں اور ساتھ باطل فرقوں کا رد بھی فرمایا ہے اس لئے کہ رب تعالیٰ نے جب اپنی توحید کو پہلے ذکر کیا تو تعلیمیہ فرقہ کا رد ہو گیا۔

وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رسول کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کو پہلے ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ عقل والے ہر چیز سے میری الوہیت اور میری وحدانیت کو سمجھ سکتے ہیں اسی انداز بیان سے حشویہ فرقہ کا بھی رد ہو گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت قرآن اور حدیث کے بغیر نہیں۔ نتیجہ واضح ہوا کہ پہلے توحید پھر رسالت۔

"ولما کانت نبوة محمد ﷺ مبینة علی کون القرآن معجزا اقام الدلالة علی کونه معجزا"

جب نبی کریم ﷺ کی نبوت کی بناء قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر تھی تو اس آیۃ مبارکہ میں رب تعالیٰ نے قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر دلائل قائم فرمائے ہیں۔

قرآن پاک معجزہ ہے: قرآن پاک معجزہ ہے اس لئے کہ کتنا ہی زمانہ گزر جائے قرآن کریم

تبدیل وتحریف سے محفوظ رہے گا رب تعالیٰ اس کا خود محافظ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾

''بے شک قرآن ہم نے اتارا ہے اور بیشک ہم خود اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''

قرآن پاک ہر شے کا جامع ہے اس سے بھی قرآن پاک کا معجزہ ہونا واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ اور ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا جس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔ قرآن اپنے غیر سے بے نیاز ہے جس سے قرآن کا معجزہ ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ﴾ اور بے شک وہ عزت والی کتاب ہے باطل کو اس کی طرف راہ نہیں نہ اس کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ اور قرآن پاک حفظ کرنے والوں کے لئے آسان کر دیا گیا جس سے قرآن پاک کا معجزہ ہونا ثابت ہے کہ پہلی آسمانوں کتب کو یہ مقام حاصل نہیں تھا ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾

''اور تحقیق ہم نے قرآن یاد کرنے کے لئے آسان فرما دیا ہے تو ہے کوئی یاد کرنے والا''

قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر نبی کریم ﷺ کا فرمان ذیشان:

بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی نبی ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ اس نبی کو اس کی مانند معجزہ دیا گیا جس پر بشر ایمان لائے بلاشبہ جو چیز مجھے عطا فرمائی گئی ہے وہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف فرمائی اور میں امید رکھتا ہوں کہ میں تبعین کے اعتبار سے تمام نبیوں سے ممتاز ہوں گا یعنی میری امت سب سے زیادہ ہوگی۔

ایک شخص کا ایمان لانا کہ قرآن معجزہ ہے:

بیہقی نے یحیٰ بن اکثم سے روایت کی انہوں نے کہا کہ خلیفہ مامون کے پاس ایک یہودی آیا اور اس یہودی نے بہت اچھی گفتگو کی پھر مامون نے اس یہودی کو اسلام کی دعوت دی مگر اس نے انکار کیا جب ایک سال گزر گیا تو وہ یہودی ہمارے پاس مسلمان ہو کر آیا اور اس نے فقہ پر بہت اچھی گفتگو کی مامون نے اس سے پوچھا تیرے اسلام لانے کا واقعہ کیا ہے؟ اس یہودی نے کہا جب میں آپ کے

پاس سے گیا تو میں نے چاہا کہ میں تمام دینوں کا امتحان لوں چنانچہ میں نے پہلے تورات کو شروع کیا اور اس کے نسخے لکھے اور میں نے اس میں کمی زیادتی کی۔ پھر میں ان نسخوں کو لے کر کنیسہ میں گیا تو انہوں نے وہ نسخے مجھ سے خرید لئے۔ اس کے بعد میں نے انجیل کی طرف توجہ دی اسکے تین نسخے لکھے جس میں ، میں نے کمی زیادتی کی اور ان کو گرجا میں لے گیا تو انہوں نے وہ نسخے مجھ سے خرید لئے۔ پھر میں نے قرآن کی طرف قصد کیا اور میں نے اسکے تین نسخے لکھے اور میں نے اس میں بھی کمی، زیادتی کی اور ان اوراق کو لے کر مسلمانوں کے پاس گیا تو مسلمانوں نے ان کو بغور پڑھا جب انہوں نے ان میں کمی وزیادتی پائی تو انہوں نے ان ورقوں کو میرے منہ پر مار دیا اور نہیں خریدا۔ اس وقت میں نے جان لیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے تو یہ واقعہ میرے اسلام لانے کا ہے۔

یحییٰ بن اکثم نے بیان کیا میں اسی سال حج کو گیا تو میں حضرت سفیان بن عیینہ کو ملا اور ان سے یہ واقعہ بیان کیا اس پر انہوں نے مجھ سے فرمایا اس واقعہ کی صداقت اللہ تعالیٰ کی کتاب میں موجود ہے میں نے پوچھا وہ کس جگہ ہے؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتَابِ اللّٰهِ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے تورات وانجیل کی حفاظت ان امتوں کے ذمہ رکھی مگر انہوں نے اسے ضائع کر دیا۔ لیکن قرآن کریم کے بارے میں فرمایا ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت ہمارے ذمہ نہیں کی بلکہ اپنے ذمہ رکھی اس لئے وہ ضائع نہیں ہوا۔

قرآن پاک شیطان سے محفوظ:

بیہقی نے حسن سے آیۂ کریمہ ﴿ لَا یَأْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ ﴾ کی تفسیر میں روایت کی انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو شیطان کے دخل سے محفوظ رکھا ہے لہٰذا نہ کوئی اس میں باطل کا اضافہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی اس میں سے حق کو نکال سکتا ہے۔ خیال رہے قرآن پاک میں کوئی اضافہ بھی کیا جائے وہ باطل ہی ہے اور قرآن پاک سے کچھ بھی نکالنے کی ناپاک جسارت کی جائے تو وہ حق کا ہی نکالنا ہی گا۔ واضح ہوا کہ قرآن پاک کمی اور زیادتی سے شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ ہے۔

قرآن پاک تمام آسمانی کتب کے مضامین کو حاوی ہے:

بیہقی نے شعب الایمان میں حسن بصری سے روایت کی انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں

نازل فرمائیں اوران کتابوں کے علوم چار کتابوں میں جمع فرمائے وہ چار کتابیں تورات، انجیل، زبور اور فرقان حمید ہے۔اس کے بعد تورات، انجیل اورزبور کے علوم کوقرآن مجید فرقان حمید میں جمع فرمادیا۔

قرآن پاک قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ ہے:

آپ کا وہ معجزہ جو قیامت تک باقی و مستمر رہے گا وہ قرآن کریم ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات اپنے وقت کے ساتھ تھے۔ یہ خصوصیت شیخ عزالدین ابن عبدالسلام نے خصائص میں شمار کی ہے اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات تمام انبیاء کے معجزات سے زیادہ ہیں۔ چنانچہ ایک قول کے بموجب ایک ہزار معجزات اور ایک قول کے بموجب تین ہزار معجزات تک ان کی گنتی پہنچتی ہے اسے بیہقی نے ذکر کیا ہے۔تمام نبی جوجدا جدا معجزات رکھتے تھے وہ سب کے سب حضور ﷺ کو عطا ہوئے کسی اور نبی کو وہ تمام معجزات عطا نہیں ہوئے۔

(ماخوذ از خصائص کبری اردو حصہ دوم از ص ۳۹۱ تا ص ۴۰۳ مترجم مولنا معین الدین نعیمی رحمہ اللہ)

قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر دلائل:

قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر دلائل دوطریقوں سے بیان کئے جاسکتے ہیں پہلا طریقہ ان میں سے یہ ہے کہ قرآن پاک کے معجزہ ہونے میں عقلی احتمال تین ہیں۔ایک یہ کہ قرآن پاک تمام فصحاء کے کلام کے برابر ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ قرآن پاک دوسرے فصحاء کے کلام سے زیادہ مرتبہ رکھتا ہو فصاحت میں لیکن اتنا ہی زائد ہو جتنا کہ عام فصحاء اپنے اپنے کلاموں میں ایک دوسرے پر برتری رکھتے ہیں یعنی یہ زیادتی عام عادت کے مطابق ہو۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ قرآن پاک میں فصاحت عام فصحاء کے کلاموں پر اتنی زیادہ ہو کہ کوئی انسان سرتوڑ کوشش کرے کہ میں بھی ایسا کلام پیش کرسکوں لیکن وہ عاجز آجائے یعنی قرآن پاک کی فصاحت عام انسانوں کی طاقت سے بلند و بالا ہو۔عقلی احتمال تو یہ تین ہیں لیکن پہلے دونوں احتمال باطل ہیں اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو لوگ انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر قرآن پاک کا مقابلہ کر سکتے لیکن جب تمام انسان مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے تو قرآن کا معجزہ ہونا بھی واضح ہوگیا۔اس لئے کہ قانون یہ ہے کہ جب کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس میں فیصلہ حکام اور گواہ کرتے ہیں تا کہ یہ اختلاف ختم

ہو سکے۔ وہ لوگ اس قسم کے تھے کہ خاندانی رقابت، نسلی برتری کو قائم رکھنے کے لئے کسی کی حق بات کو بھی ماننے کے لئے تیار نہ تھے باطل کو ماننا جو ان کی مرضی کے خلاف ہو یہ تو ان کے تصور میں بھی نہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنی خاندانی حمیت کے پیش نظر نبی کریم ﷺ سے مقابلہ کرنے کی سر توڑ کوشش کی اپنے مال اور جانوں کو مقابلہ میں لگاتے رہے پوری کوشش کے باوجود وہ قرآن پاک جیسا کلام پیش کرنے سے جب عاجز آ گئے تو قرآن پاک کا معجزہ ہونا بھی واضح ہو گیا۔ اور خصوصاً جب ان کو یہ بھی کہہ دیا گیا کہ تم اپنے تمام معبودوں اور لوگوں میں سے اپنے فصحاء کو بھی مددگار بنا لو۔ پھر قرآن پاک کی چھوٹی سی سورت جیسی سورت بنا کر پیش کرو۔ پھر اس کی فصاحت اور قرآن پاک کی فصاحت کے ایک جیسا ہونے پر اللہ کو گواہ نہ بناؤ مسلمانوں کو گواہ نہ بناؤ بلکہ اپنے ہمنوا ساتھیوں کو گواہ بنا لو، ان سے فیصلہ کرا لو، کہ کیا تمہارا کلام قرآن پاک جیسا ہو سکتا ہے؟ جب وہ لوگ ایسا نہ کر سکے تو پتہ چلا کہ قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت انسانی کلام کی فصاحت و بلاغت کی حدوں سے بہت ہی بلند و بالا ہے۔ انسان کی سمجھ سے ہی بالاتر ہے کہ وہ اس سے کیسے مقابلہ کرے اس سے مسئلہ بہت ہی واضح ہو گیا کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے معجزہ سے مقابلہ انسان کے لئے ممکن ہی نہیں:

"فظهر انه سبحانه كما لم يكتف فى معرفة التوحيد و التقليد فكذا فى معرفة النبوة لم يكتف بالتقليد"

''واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی معرفت میں بھی تقلید نہیں اسی طرح نبوت کی معرفت میں بھی تقلید کافی نہیں''

اسی سے احناف کا مسلک بھی نکھر کر سامنے آ گیا کہ تقلید فروع میں ہے اصول میں نہیں کیونکہ اعتقادیات میں تقلید کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی ائمہ اربعہ یا علماء ربانیین نے یہ کہا ہے۔

قرآن پاک اور فصحاء کا کلام:

''قرآن پاک کے معجزہ ہونے کو دوسرے طریقہ سے بیان کرنا'' اگر عام فصحاء کے کلام کو دیکھا جائے اور ان کے کلاموں میں وجوہ فصاحت کو دیکھا جائے اور ادھر قرآن پاک کو دیکھا جائے تو انسانی عقل تو یہ کہتی ہے کہ قرآن پاک میں فصاحت کم ہونی چاہئے کہ وہ وجوہ فصاحت اس میں نہیں جو عام فصحاء کے کلاموں میں ہیں۔ لیکن پھر بھی قرآن پاک میں بہت زیادہ فصاحت کا پایا جانا اور تمام

انسانوں کا اس سے مقابلہ کرنے سے عاجز ہونا قرآن پاک کے معجزہ ہونے کو واضح کر رہا ہے:

(۱) عرب کی فصاحت اکثر طور پر مشاہدات کی تعریفوں میں ہے کبھی انہوں نے اونٹ کی تعریف کی اور کبھی گھوڑے کی اور کبھی لونڈیوں کی تعریف کی اور کبھی بادشاہوں کی۔ اور کبھی تلوار کی ضرب کی تعریف کی اور کبھی نیزہ بازی کی، اور کبھی لڑائیوں کی تعریف کی اور کبھی لوٹ مار کی۔

قرآن پاک میں اس قسم کی تعریفات میں سے کوئی بھی نہیں پائی گئی فصحاء کے کلام میں فصیح الفاظ ان چیزوں میں ہی پائے گئے ہیں عقل کا تقاضا یہ تھا کہ جب اور قسم کے مضامین کے لئے کوئی فصیح الفاظ ہی نہیں ملیں گے تو فصاحت کیسے ہوگی۔ لیکن قرآن پاک جب انسانوں کا کلام ہی نہیں تو یہ اپنا مقام فصاحت قائم رکھنے کے لئے انسانوں کے الفاظ کا محتاج ہی کیسے ہوتا؟ یہی وجہ ہے کہ تمام انسان اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے۔

(۲) قرآن پاک رب تعالیٰ کا کلام ہے اس میں سچ کا ہی ذکر ہے جھوٹ کا وہم وگمان اس میں نہیں پایا جا سکتا لیکن عرب کے بڑے بڑے فصحاء شعراء کا کلام جھوٹ پر مبنی ہے جتنا زیادہ جھوٹ کو وہ اپنے کلام میں شامل کرتے تھے اتنا ہی زیادہ ان کا کلام حسین نظر آتا۔ اسی وجہ سے عارف گنجوی نے اپنے بیٹے کو شعر بنانے کا طریقہ سکھاتے ہوئے یہ نصیحت کی:

ہر گز مپیچ در فن او ، چوں اکذب است احسن است

شعر میں اس کے فن کی باریکیوں کو نہ دیکھیں بلکہ جتنا زیادہ جھوٹ اس میں ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ حسین ہوگا۔ **وکل شاعر ترک الکذب والتزم الصدق نزل شعرہ ولم یکن جیدا** " ہر شاعر جس نے جھوٹ کو چھوڑا اور سچائی کو لازم کیا اس کے شعر، شعراء کی نظر میں کم درجہ ہوئے انہوں نے ان اشعار کو عمدہ نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت لبید بن ربیعہ اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما نے اسلام لانے کے بعد جو شعر کہے ہیں ان اشعار کو شعراء نے اتنا عمدہ اور حسین نہیں سمجھا جیسا کہ ان دونوں حضرات کے زمانہ جاہلیت کے اشعار کو حسین سمجھا وجہ اس کی یہی تھی کہ اسلام میں جھوٹ گناہ کبیرہ ہے:

" **وان اللہ تعالیٰ مع ماتنزہ عن الکذب والمجازفۃ جاء بالقرآن فصیحا کما تری** "

" بیشک اللہ تعالیٰ کا کلام قرآن پاک جھوٹ اور اٹکل، اٹے سٹے سے پاک ہے لیکن فصاحت کا وہ معیار اس میں پایا گیا ہے کہ تمام بنی نوع انسان اس کے مقابلہ سے عاجز آ گئے"

قرآن پاک معجزہ ہے اس کو سمجھنا کوئی مشکل نہ رہا۔

(۳) فصحاء کے قصائد اور اشعار میں یقیناً کچھ ایسے شعر بھی ہوتے ہیں جن سے مقابلہ کرنا دوسرے شعراء کے لئے آسان ہوتا ہے بلکہ معمولی تغیر وتبدل سے ایک شاعر دوسرے شاعر کے شعروں کو اپنے قصیدہ میں داخل کر لیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کلام میں ایک چھوٹی سورت سے بھی مقابلہ کرنے کی تمام مخلوق میں کسی کو بھی طاقت نہ مل سکی اس سے بڑھ کر قرآن پاک کے معجزہ ہونے پر کس دلیل کی طلب ہوگی۔

(۴) جب بھی کسی فصیح شاعر نے اپنے کلام میں کسی چیز کے وصف کو دوبارہ ذکر کیا تو اس میں پہلے کی طرح فصاحت نہیں پائی گئی پہلے کی طرح ذوق اور چاشنی اس میں نہیں پائی گئی:

" وفی القرآن التکرار الکثیر ومع ذلک کل واحد منها فی نهایة الفصاحة ولم یظهر التفاوت اصلا"

لیکن قرآن پاک میں کثیر تکرار پایا گیا ہے باوجود کثیر تکرار اس میں بہت ہی زیادہ فصاحت پائی گئی ہے اس میں ذرا بھر بھی فرق نہیں پایا گیا۔

(۵) قرآن پاک میں جن چیزوں کا ذکر ہے ان کو اپنے کلام میں کوئی شاعر بھی لا کر فصاحت نہیں لا سکتا۔ قرآن پاک میں "عبادات کے وجوب، برائیوں سے اجتناب، اچھے اخلاق پر برانگیختہ کرنا، دنیا کو چھوڑنا، اور آخرت کو اختیار کرنا، اس قسم کی چیزوں کا ذکر ہے۔ جن کے ذکر سے کلام کو فصیح نہیں بنایا جا سکتا لیکن ان ہی چیزوں کو ذکر سے قرآن پاک میں فصاحت کا وہ بلند مقام قائم کیا گیا ہے کہ تمام مخلوق کو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کہہ دیا لیکن کسی کو جرات نہ ہو سکی اس سے قرآن پاک کا عظیم معجزہ ہونا ثابت ہو گیا۔

(۶) امراء القیس کے اشعار کو دیکھیں تو ان میں عورتوں کا ذکر، گھوڑوں کا ذکر، عورتوں وغیرہ کے ساتھ محافل قائم کرنے کا ذکر نظر آئے گا یعنی اس کے اشعار کا حسن ان چیزوں میں بند ہے۔ نابغہ کے اشعار خوف کے وقت کہے گئے ان میں حسن کی دارومدار صرف خوف کے ذکر پر بند ہے۔ اعشیٰ کے اشعار میں حسن اور فصاحت کو طلب اور شراب کی تعریف میں بند کر دیا گیا ہے۔ زہیر کے اشعار میں حسن کی دارومدار رغبت اور امید کے تذکرہ پر اس کے بغیر اس میں اور کسی چیز کا ذکر نہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہر شعر میں فصاحت اور حسن کا تعلق معین اشیاء کے ذکر سے ہے ان سے ہٹ کر اگر اسی شاعر نے کوئی شعر کہا تو وہ غیر معیاری ٹھہرا۔ "اما القرآن فانه جاء فصیحافی کل فنون علی غایة الفصاحة" لیکن قرآن پاک میں (اس قسم کے مضامین نہیں) حقائق ہیں سچائی ہے بے شمار مضامین ہیں لیکن فصاحت کا بلند سے بلند مقام اس میں پایا گیا ہے جس کے مقابلہ سے ساری مخلوق عاجز آ گئی۔

قرآن پاک کے مضامین اور فصاحت:

(۱) قرآن پاک میں ترغیب (رغبت دلانا) کو ذکر کیا گیا جب کہ فصیح شعراء ترغیب کو اپنے شعروں میں ذکر کر کے فصیح نہ بنا سکے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴾

"تو کسی نفس کو معلوم نہیں جو آنکھ کی ٹھنڈک ان کے لئے چھپا رکھی ہے جزاء ہے اس کی جو وہ عمل کرتے رہے"

(۲) قرآن پاک میں ترھیب (ڈرانا) کو ذکر کر کے فصاحت کا بے مثال انداز قائم کیا جبکہ فصیح شعراء سے یہ کام نہ ہوسکا یعنی سادہ مضامین اور فصاحت کا بلند معیار صرف قرآن پاک میں ہی ملے گا۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا ﴾

"کیا تم اس سے نڈر ہو گئے کہ وہ خشکی ہی کا کوئی کنارہ تمہارے ساتھ دھنسا دے یا تم پر پتھراؤ (کا عذاب) بھیجے پھر تم اپنا کوئی حمایتی نہ پاؤ"

ترھیب کو ہی ذکر کرتے ہوئے اور ارشاد فرمایا:

﴿ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ☆ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ ﴾

"کیا تم اس سے نڈر ہو گئے ہو جس کی سلطنت آسمان میں ہے کہ تمہیں زمین میں دھنسا دے جبھی وہ کانپتی رہے یا تم نڈر ہو گئے ہو اس سے جس کی سلطنت آسمان میں ہے کہ تم پر پتھراؤ (کا عذاب) بھیجے تو اس وقت تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کیسا تھا میرا ڈرانا"

ترھیب میں ہی اور ارشاد باری تعالیٰ دیکھئے:

" وخاب کل جبار عنید ، من ورائه جهنم ویسقی من ماء صدید یتجرعه ولا یکاد یسیغه ویاتیه الموت من کل مکان وما هو بمیت ومن ورائه عذاب غلیظ "

''اور رسوا ہوا ہر سرکش اور ہٹ دھرم جہنم اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا بمشکل اس کا تھوڑا تھوڑا گھونٹ لے گا اور گلے سے نیچے اتارنے کی امید نہ ہوگی اور اسے ہر طرف سے موت آئے گی اور مرے گا نہیں اور اس کے پیچھے اسے سخت عذاب ہوگا''

(۳) اللہ تعالیٰ نے زجر کا ذکر جس انداز سے کیا کسی انسان کی طاقت میں ہی نہیں کہ وہ اسے بیان کر سکے یعنی قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ کو دیکھ کر بھی انسان اس قسم کا کلام پیش کرنے سے عاجز ہے رب تعالیٰ کا فصیح کلام دیکھئے:

﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾

''تو ان میں سے ہر ایک کو ہم نے اس کے کنارہ سے پکڑا تم ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ (کا عذاب) بھیجا اور ان میں سے کسی کو چنگھاڑ (زوردار آواز) نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور ان میں سے کسی کو زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کسی کو ڈبو دیا اور اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا ہاں وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے''

(۴) الھیات کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالُ ﴾

''اللہ جانتا ہے جو کچھ کسی مادہ کے پیٹ میں ہے اور پیٹ جو کچھ گھٹتے اور بڑھتے ہیں اور ہر چیز اسکے پاس ایک اندازے سے ہے وہی ہر چھپے اور ظاہر کا جاننے والا ہے سب بڑی بلندی والا ہے''

تمام علوم قرآن پاک میں ہیں: قرآن پاک تمام علوم کا منبع اور اصل ہے علم کلام کو دیکھیں تو قرآن پاک میں نظر آئے گا۔ علم فقہ قرآن پاک سے ماخوذ ہے۔ اصول فقہ کو قرآن پاک سے حاصل کیا گیا ہے علم صرف، علم نحو، علم لغت تمام کا اصل قرآن پاک ہی ہے دنیا میں علم زہد اور آخرت کی خبریں

قرآن پاک سے ہی ملیں گی اور اچھے اخلاق کو حاصل کرنے کا سبق قرآن پاک سے ہی ملتا ہے

غرضیکہ کہ قرآن پاک میں ہر قسم کے مضامین، تمام علوم، سچی باتیں، حقائق ذکر ہیں لیکن فصاحت و بلاغت اس مقام تک پہنچی ہوئی ہیں کہ انسان بلکہ تمام مخلوق اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ جبکہ انسانوں میں سے لوگ ان کو فصحاء سمجھتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ جھوٹ اپنے کلام میں لائیں اور عورتوں کے حسن و جمال کے تذکرے کریں کہیں اپنی بہادری کے گن گائیں، کہیں اپنے گھوڑے کی تعریف کریں اور کہیں اونٹ کی، کہیں شراب کی تعریف اور کہیں ثقافت کے نام پر بے حیائی کے پروگرام کی محافل کا تذکرہ سبحان اللہ قرآن تیری عظمت پر قربان تو رب تعالیٰ کا ذیشان فرمان تیرا مقابلہ کیا کرے گا ملک و جن و انسان۔

قرآن پاک نے کئی مرتبہ مقابلہ کے لئے بلایا:

رب تعالیٰ اپنے محبوب کی زبان مبارک سے اعلان ان الفاظ مبارکہ سے کرایا ﴿ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَا ﴾ تم فرماؤ تو اللہ کے پاس سے کوئی کتاب لے آؤ جوان دونوں کتابوں (قرآن پاک اور تورات) سے زیادہ ہدایت کی ہو۔

مقابلہ کے لئے لوگوں کو بلایا بھی لیکن ساتھ ہی واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ تمام جن اور انسان مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا "

"تم فرماؤ اگر آدمی اور جن سب اس پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند لے آئیں تو اس کا مثل نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں"

پھر ان کو قرآن پاک کی دس سورتوں جیسی سورتیں لانے کے لئے کہا اور ارشاد فرمایا:

﴿ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴾

"کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں (نبی کریم) نے یہ خود ہی بنا لیا ہے ان کو کہو اس جیسی دس سورتیں بنا لاؤ اور اللہ کے بغیر جن کو تم بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو"

اس کا جواب بھی رب تعالیٰ نے خود ہی ارشاد فرما دیا کہ ان کو اس کا جواب دینے کی کوئی طاقت ہی حاصل نہیں:

﴿ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾

''اگر وہ تمہیں (اے مسلمانو) اس بات کا جواب نہ دے سکیں تو سمجھ لو وہ اللہ کے علم سے ہی اترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں''

پھر ان کو قرآن پاک کی سورتوں میں سے کوئی ایک سورت جیسی سورت بنا کر لانے کے لئے کہا۔

اور ارشاد فرمایا:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾

''کیا یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اسے بنا لیا ہے تم فرماؤ تو اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کو چھوڑ کر جو مل سکیں سب کو بلا لاؤ اگر تم سچے ہو''

اس کے بعد بھی رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ وہ جاہل ہیں، جھوٹے ہیں، رب تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہوں گے:

﴿ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴾

''بلکہ انہوں نے قرآن کو سمجھنے کے بغیر ہی جھٹلایا اور ابھی انہوں نے اس کا انجام نہیں دیکھا ایسے ہی ان سے پہلے لوگوں نے (انبیاء اور اللہ کی کتب کو) جھٹلایا تھا تو دیکھو ظالموں کا کیسا انجام ہوا''

آخری چیلنج یہی ہے جس آیۃ کی تفسیر جاری ہے کہ ﴿ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ﴾ اس میں ''بسورۃ'' پر تنوین صغر پر دلالت کر رہی ہے جس کا معنی ہے قرآن پاک کی چھوٹی سے سورت (یعنی کوثر اور العصر) جیسی سورت لے آؤ۔ اس میں بھی ان کو کھلی اجازت دی کے اپنے تمام مددگار'' خواہ وہ تمہارے معبودان باطلہ ہوں، یا انسانوں سے بڑے بڑے فصحا ہوں بلا لو اگر تم اپنے اس گمان میں سچے ہو کہ یہ قرآن نبی کریم ﷺ نے خود پیش کیا ہے تو تم بھی بنا کر دکھاؤ۔

اسکے بعد بھی رب تعالیٰ نے ان کو واضح طور پر فرما دیا ہے کہ تم سے یہ کام کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ابھی وہ ارشاد دیکھئے جسکی وضاحت کرنی بھی مقصود ہے اور زیر بحث آیت کے بعد آ رہی ہے وہ یہ ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوْا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ ﴾

☆ ''پھر اگر نہ لاسکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار رکھی ہے کافروں کے لئے''

☆ ''پھر اگر تم نہ کرسکے اور ہرگز تم نہیں کرسکو گے تو بچ جاؤ اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔ وہ کافروں کے لئے تیار کر رکھی ہے''

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا: یہ پہلی آیۃ پر مرتب ہے اور اسی کا گویا کہ نتیجہ ہے اسی وجہ سے اسے ''فاء'' سے شروع کیا گیا ہے گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ جب تم اپنی پوری کوشش صرف کرلو فصاحت کے شاہسواروں اور اپنے معبودان باطلہ کے دامن کا بھی سہارا لے لو اور خود بھی بڑے مضبوط اور تیز چلنے والے گھوڑوں پر سوار ہو کر میدان فصاحت میں گھوڑے دوڑا چکو جب عاجز آجاؤ قرآن پاک کا مقابلہ نہ کرسکو تو تصدیق لازم ہے ایمان لے آؤ۔ اور اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچالو وہ آگ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ (از روح المعانی)

علمی نکات: بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ یقین کے مقام پر '' اذا '' استعمال ہوتا ہے اور شک کے مقام پر '' ان '' کا استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو لطیف وخبیر ہے اور علیم مافی الصدور (دلوں کی بھید جاننے والا) ہے۔ تو '' ان '' کا استعمال کس طرح درست ہوگا۔ یہ تو مقام یقین ہے اس مقام پر ''اذا'' آنا چاہئے تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں '' ان '' مخاطبین کے حال کے مطابق ہے کہ اگر تمہیں کوئی شک ہو کہ ہم کوشش کریں تو کامیاب ہوجائیں تو کوشش کرکے دیکھ لو اگر ایسا نہ کرسکو تو آگ سے بچ جاؤ۔ یا اس میں تحکم پایا گیا ہے کہ تم قرآن پاک کی ایک چھوٹی سورت جیسی بھی بنا تو نہیں سکتے۔ لیکن ذرا کوشش کرکے تو دیکھ لو اپنی فصاحت پر ناز کرنے والو تمہیں اپنے عجز کا پتہ چل جائے گا۔ ایک اور وہم یہ ہے کہ '' ان ''استقبال کے لئے آتا ہے اور '' لم '' جب مضارع پر داخل ہو تو اسے ماضی منفی بنا دیتا ہے۔ یہاں ایک ہی جگہ پر استقبال اور ماضی کا اجتماع کیسے درست ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

''ان '' جب ماضی پر داخل ہوتو اسے مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے لہذا اب ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا ﴾ کا معنی یہی ہوگا اگر تم نہ لاسکو اگر تم نہ کرسکو۔ دوسرا جواب یہ ہے:

''فان ''ھنا داخلة علی المجموع عاملة فی محله کانه قال فان ترکتم الفعل فیفید الکلام استمرار عدم الاتیان المحقق فی الماضی''

اس مقام میں '' ان '' مجموعہ (یعنی لم اور تفعلوا) پر داخل ہے صرف ''لم'' پر داخل نہیں کہ ایک اور وہم پڑے کہ حرف کا حرف پر عمل نہیں ہوتا تو یہاں کس طرح '' ان '' کا '' لـــم '' پر داخل ہونا صحیح ہے۔ اس کا بھی ساتھ ہی جواب آ گیا کہ پورے ﴿ لَمْ تَفْعَلُوْا ﴾ کے مجموع پر '' ان '' داخل ہے اور اس کے محل پر عمل کر رہا ہے۔ اب معنی یہ ہوگا کہ ''اگر تم نے فعل ترک کر دیا''۔

اس سے واضح ہوا کہ ان کا نہ لاسکنا زمانہ ماضی میں بھی جاری رہا اب ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا ﴾ کا معنی یہ ہوگا۔ کہ اگر تم آج تک کر نہیں سکے اور ہرگز کر بھی نہیں سکو گے۔

خیال رہے کہ پہلے معنی سے ﴿ وَلَنْ تَفْعَلُوْا ﴾ جملہ معترضہ ہوگا۔ لیکن اب جو معنی کیا ہے اس کے لحاظ سے معطوفہ بنانا درست ہے معترضہ بنانے کی ضرورت نہیں۔

وَلَنْ تَفْعَلُوْا: اگر چہ ''لا ''بھی نفی کرتا ہے لیکن '' لا ''کی نفی مطلق ہوتی ہے اور اس میں تاکید بھی نہیں ہوتی اور '' لـــن ''مستقبل کی نفی کرتا ہے اور نفی میں تاکید ہوتی ہے (از روح المعانی) اس کا معنی یہ ہے ''اور ہرگز تم نہیں کرسکو گے'' البتہ مرادی معنی یہ ہے ''اور ہرگز تم نہیں لاسکو گے''

آیۃ کریمہ میں چار معجزے:

(۱) بڑی متواتر خبروں سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ کفار نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت کے بعد آپ کے شدید دشمن بن گئے بہت بڑی مخالفت کرنے لگ گئے اور ہر وقت یہی چاہتے تھے کہ آپ کے لائے ہوئے دین اسلام کو مٹا کر رہیں۔ نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو ہر طرح کی تکالیف پہنچانے، اور ان کی ایذاء رسانیوں اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت کرنے سے واضح ہے کہ انہوں نے عداوت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

ان حالات میں جب قرآن نے یہ پیش کیا ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا ﴾ (پھر اگر تم نہ

کر سکے اور ہرگز نہیں کر سکو گے) اس کے بعد " فلو کان فی وسعهم وامکانهم الاتیان بمثل القرآن او بمثل سورة منه لاتوا به فحیث ماأتوا به ظهر المعجز " اگر ان کی وسعت میں ہوتا اور ان کے لئے ممکن ہوتا تو قرآن پاک جیسی کتاب بنا لیتے یا کم از کم کوئی سورت ضرور بنا لیتے۔ لیکن وہ شدید مخالفت کے باوجود کثیر کوشش کے بعد قرآن پاک جیسا کلام پیش کرنے کی شدید حرص اور تمنا رکھنے کے باوجود جب عاجز آ گئے کہ ایک چھوٹی سورت بھی نہ بنا سکے تو معجزہ ہونا ثابت ہو گیا

(۲) اگرچہ کفار نبی کریم ﷺ کی نبوت کے معاملہ میں شک کرتے تھے لیکن وہ بھی نبی کریم ﷺ کے کامل عاقل ہونے اور فضیلت رکھنے اور کسی کام کے انجام کو اچھی طرح جاننے میں کوئی شک نہیں کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کو اپنی نبوت میں بھی یقین کامل تھا ذرا بھر بھی شک نہیں تھا۔ ورنہ اتنا بڑا چیلنج کرنے میں آپ خوف کرتے لیکن آپ نے بلا خوف جب ساری مخلوق کو قرآن پاک کے ساتھ مقابلہ کرنے کی دعوت دے دی اور رب تعالیٰ کا پیغام ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ (تم ہرگز نہیں کر سکو گے) سنا دیا اور وہ تمام لوگ عاجز آ گئے تو اس سے بھی معجزہ ہونا واضح ہو گیا۔

(۳) نبی کریم ﷺ کو اگر اپنی نبوت میں یقین نہ ہوتا تو آپ یہ قطعی خبر " لایاتون بمثله " (تمام جن اور انسان مل کر بھی قرآن جیسا نہیں لا سکیں گے) نہ دیتے۔ اس لئے کہ اگر آپ کی نبوت قطعی طور پر صحیح نہیں ہوتی تو آپ کی خبر کے خلاف وہ لوگ قرآن پاک جیسا کلام پیش کر لیتے اگر ایسا کر لیتے تو (معاذ اللہ) نبی کریم ﷺ کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جاتا۔ باطل راہ پر چلنے والا جھوٹا شخص اپنا کلام یقینی طور پر پیش کرنے پر قادر نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اپنے آپ پر یقین کر سکتا ہے:

" فلما جزم دل انه علیه الصلوة والسلام کان قاطعا فی امره "

"جب آپ نے اپنا کلام یقینی طور پر پیش فرما دیا تو اسی سے واضح ہو گیا کہ آپ کو اپنی نبوت میں بھی یقین محکم حاصل تھا"

(۴) قرآن پاک نے جو خبر دی ہے نبی کریم ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک اس کی صداقت جگمگا رہی ہے۔ اور انشاء اللہ قیامت تک کوئی اس سے مقابلہ کرنے کی جرات نہیں کر سکے گا۔ ان چار وجہ سے واضح ہو گیا کہ اس آیۃ کے چند الفاظ مبارکہ سے ثابت ہو گیا کہ قرآن پاک عظیم کتاب ہے

مختصر الفاظ سے عظیم مطالب اور کئی کئی معجزات بیان کر دیئے گئے ہیں:

" وذلک یدل علی فساد الجهال الذین یقولون ان کتاب الله لا یشتمل علی الحجة والاستدال "

اسی سے جاہلوں کا وہ قول بھی مردود ہو گیا کہ قرآن پاک میں حجت اور دلائل مذکور نہیں ہاں اپنی جہالت کی وجہ سے کوئی قرآن پاک کو نہ سمجھ سکے تو وہ اپنی جہالت پر افسوس سے کف دست ملے۔ قرآن پاک کے تو ایک ایک لفظ سے کئی کئی مسائل کے دلائل حاصل ہو رہے ہیں بات صرف ایمان، ایقان، عرفان حاصل ہونے کی ہے۔

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ: اس (آگ) کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں "**وقود**" میں اگر واؤ پر فتحہ (زبر) ہو تو وہ اسم ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے "ماتوقد به النار" جس چیز کے ذریعے آگ جلائی جائے یعنی ایندھن اور اگر واؤ پر ضمہ (پیش) ہو تو وہ مصدر ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے جلانا۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ واؤ پر فتحہ کی صورت میں بھی مصدر آ تا رہتا ہے اگر آیۂ کریمہ میں مصدری معنی لیا جائے تو مبالغہ ہو گا یا مضاف حذف ہو گا۔ تقدیر عبارت کی ہو گی "ذووقودها" اس آگ کو جلانے والے۔

حِجَارَةُ: حجر بفتحتین (حا اور جیم پر زبر) کی جمع کثرت ہے۔ اور اس کی جمع قلت "احجار" ہے۔

حجارۃ سے مراد کون سے پتھر ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عام پتھر ہیں کیونکہ پتھروں سے بھڑکائی ہوئی آگ بہت زیادہ گرم ہوتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد گندھک ہے۔ کیونکہ اس میں حرارت بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس سے اٹھنے والے شعلے آسمانوں سے باتیں کرتے ہیں اور وہ بہت جلدی بھڑک پڑتی ہے اور وہ بدن سے چمٹ جاتی ہے " واعداد اهل النار ان یکونوا حطامع نتن ریح وکثرة دخان وقود کثافة " جب وہ آگ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے تو اس کا ایندھن بھی ایسا بنایا کہ اس میں بدبو پائی جاتی ہے اور بہت زیادہ دھواں اس میں پایا جاتا ہے اور بہت زیادہ سیاہی اس میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ لطیف نظر نہیں آتی بلکہ وہ آگ بہت زیادہ کثیف ہوتی ہے۔ آگ کا ایندھن پتھر کہہ کر گویا کہ آگ کی شدید ہولناکیاں ذکر فرما دیں تاکہ لوگ اس سے نفرت کریں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ پتھروں سے مراد ان کے تراشے ہوئے بت ہیں۔ جن کو وہ پتھروں سے بناتے تھے یعنی کفار کے ساتھ ان کے بتوں کو بھی جلایا جائے گا تا کہ ان کی حسرت وندامت کو اور زیادہ کیا جا سکے کہ ہم تو امید کرتے تھے کہ یہ ہمیں رب تعالیٰ کے عذاب اور اس کی ناراضگی سے بچالیں گے لیکن افسوس کہ ہمارے معبود بھی ہمارے ساتھ ہی جل رہے ہیں:

"وهناک يتم لهم نوعان من العذاب روحاني وجسماني"

''وہاں انہیں مکمل عذاب حاصل ہوگا جسمانی بھی اور روحانی بھی''

کیونکہ جب وہ خود آگ میں جل رہے ہوں گے تو یہ ان کا جسمانی عذاب ہوگا۔ اور جب ان کے معبودان باطلہ بھی ان کے ساتھ ہی جل رہے ہوں گے تو ان کی ناامیدی بڑھ جائے گی۔ شدید حسرت حاصل ہوگی اور شدید ندامت ہوگی تو یہ ان کا روحانی عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس کی تائید کررہا ہے۔ ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ بیشک تم اور جن کو تم اللہ سے سوا پوجتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہو۔

چوتھا قول یہ ہے کہ حجارۃ سے مراد سونا اور چاندی ہے " لانهما يسميان حجرا " کیونکہ ان کو بھی وہ پتھر ہی کہتے تھے اور دنیا میں ان کی حفاظت کرتے تھے اور دنیا میں سمجھتے تھے کہ سونا اور چاندی فدیہ دے کر انسان اپنے آپ کو بچا سکتا ہے لیکن جب ان کے ساتھ سونا اور چاندی بھی جل رہے ہوں گے تو ان کی ناامیدی بڑھ جائے گی اور کہیں گے ہائے افسوس آج تو بچنے کا کوئی ذریعہ بھی نظر نہیں آرہا۔

سب اقوال کا مطلب ایک: جہنم کی آگ کا ایندھن لوگ بھی ہوں گے اور پتھر بھی اور گندھک بھی اور ان کے بت بھی اور سونا چاندی بھی۔ یعنی پتھروں سے بھڑکائی ہوئی شدید گرم آگ میں گندھک بھی ہوگی جس کی بدبو اور دھواں اور سیاہ تاریکی سے اور ہی زیادہ عذاب ہوگا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ ان کے معبودان باطلہ کو جلا کر ان کی اس امید کو ختم کردیا جائے گا کہ ہمارے یہ معبود ہمیں چھڑا لیں گے۔ اور ان کے ساتھ سونا اور چاندی بھی آگ میں جھونک دیا جائے گا تا کہ فدیہ دے کر اپنے آپ کو چھڑانے کا تصور بھی ان کے ذہنوں سے جاتا رہے۔

سبحان اللہ قرآن پاک کے ایک لفظ سے کتنے عظیم مطالب حاصل ہوگئے اگر یوں کہہ دیا جائے تو

شائد بے جانہیں ہوگا کہ " الحجارة " میں جو اجمال تھا اس کی تفسیر ﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ (کسی نفس سے کوئی بدلہ (فدیہ) قبول نہیں کیا جائے گا اور کافروں کو کسی کی شفاعت سے کوئی نفع نہیں ہوگا اور ان کی امداد نہیں کی جائے گی) میں آ گئی۔

تنبیہ: جہنم میں جن اور شیاطین بھی ہوں گے، جن کا ذکر دوسرے مقامات پر موجود ہے۔ یہاں انسانوں اور پتھروں کا ذکر کر کے جہنم کے آگ کی شدت کا ذکر کیا جارہا ہے، تا کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف پیدا ہو۔

" نعم قال سیدی الشیخ الاکبر قدس سره انهم لهبها اولئک جمرها "

" ہاں البتہ شیخ اکبر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جن اور شیاطین آگ کے شعلے ہوں گے اور انسان اور پتھر چنگاریاں ہوں گے"

انسانوں کا ذکر پہلے کیوں؟ جہنم کے ایندھن ہونے میں لوگوں کا ذکر بھی کیا اور پتھروں کا بھی، لیکن لوگوں کا ذکر پہلے اس لئے کیا کہ ان کو درد ہوگا، شدید تکلیف ان کو ہی ہوگی۔ اور یہ بھی وجہ ہے کہ پتھروں کی بنسبت انسان جلدی جلیں گے، کیونکہ ان میں گوشت اور چربی پائی جاتی ہے۔ اور یہ چیزیں آگ کو جلدی قبول کرتی ہیں اور آگ کا بھی ان پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔

سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جہنم کی آگ کا خوف تو صرف انسانوں کو دلانا مقصود ہے۔ پتھروں کو جلانے کی وجہ پتھروں کو عذاب دینا مقصود نہیں ہوگا، بلکہ وہ بھی انسانوں کو عذاب ہوگا۔ کیونکہ یا تو پتھروں کی آگ کی شدت کی وجہ سے انسانوں کو شدید عذاب ہوگا۔ اور یا اپنے معبودانِ باطلہ کو جلتے دیکھ کر حسرت وندامت کا ان کو روحانی عذاب ہوگا یہی وجہ ہے کہ انسانوں کا ذکر پتھروں سے پہلے کیا گیا۔

تنبیہ: " النار " کو معرفہ ذکر کیا گیا معرفہ وہ ہوتا ہے جو معین ہو جس کے متعلق پہلے علم ہو۔ معرفہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ سورۃ تحریم میں "نار" کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے۔ جو نزول کے لحاظ پر پہلے ہے وہاں ذکر ہوا ﴿ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچالو، جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔ لہذا جب ایک مرتبہ نکرہ ذکر ہو چکا تھا تو علم حاصل ہو گیا اب معرفہ ذکر کرنا درست ہو گیا۔

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ: کافروں کے لئے تیار کی گئی یعنی آگ کو اصل میں تو کافروں کے لئے تیار کیا گیا ہے کیونکہ کفار کی آگ میں تذلیل بھی ہوگی لیکن اگر مومنین گنہگار جہنم میں ڈالے گئے تو ان کو آگ میں ڈالنے کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ یہ گناہوں کی آلودگی سے پاک ہو جائیں، جیسا کہ سونے کو آگ کی بھٹی میں ڈالنے کا مقصد سونے کی بے قدری نہیں۔ بلکہ سونے کے کھوٹ سے پاک کرنا مقصد ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی خیال رہے کہ آگ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ تو پہلے کافروں کو ہی آگ میں ڈالا جائے۔ مومن گنہگار تو بعد میں کچھ دیر کے لئے آگ میں ڈالے جائیں گے (اللھم انا نعوذ بک من النار) اور آگ جب کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے تو وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ نہ اخروی زندگی نے ختم ہونا ہے اور نہ ہی ان کا عذاب ختم ہونا ہے کہ وہ آگ سے نکال دیئے جائیں۔ لیکن مومن گنہگار تو صرف کچھ دیر کے لئے آگ میں ڈالے جائیں گے۔ گناہوں کا عذاب ختم ہوتے ہی وہ جنت میں آ جائیں گے۔

فائدہ: اسی بحث سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا:

" کون الاعداد للکفرین لاینا فی دخول غیرھم فیھا علی جھة التطفل
فلا حاجة الی القول بان نار العصاة غیر نار الکفار "

آگ کا کافروں کیلئے تیار کیا جانا اسکے منافی نہیں کہ دوسرے نافرمان لوگوں کو انکے پیچھے داخل کیا جائے گا۔ لہٰذا بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ کافروں کی آگ اور ہوگی۔ اور گنہگاروں کی آگ اور ہوگی یہ قول درست نہیں۔ اور نہ ہی اسکی کوئی ضرورت ہے کہ دو قسم کی آگ ثابت کی جائے۔

" اعدت" ماضی کا صیغہ ہے، جس کا معنی تیار کر دی گئی۔ اسی سے معتزلہ کا بھی رد ہو گیا۔ کہ وہ جنت اور دوزخ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ابھی پیدا نہیں ہوئیں، البتہ قیامت کے بعد پیدا ہوں گی۔ ان کا یہ قول قرآن پاک اس آیت اور کئی دوسری آیات کے سراسر مخالف ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

جہنم کی آگ کا ہولناک منظر: بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" نارکم جزء من سبعین جزء من نار جھنم "

"تمہاری آگ (یعنی دنیا کی آگ) جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک ہے"

بخاری و مسلم کی ہی ایک اور روایت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" انه اهون اهل النار عذابا من له نعلان وشراكان من نار يغلي منهما دماغه كما يغلي المرجل مايرى ان احدا اشد منه عذابا وانه لاهونهم عذابا "

'' بیشک آگ والے لوگوں کا سب سے آسان عذاب یہ ہوگا کہ اسے دو جوتے پہنائے جائیں گے جو آگ کے ہوں گے۔ اور ان کے تسمے بھی آگ کے ہوں گے، جن سے اس کا دماغ اس طرح کھولتا ہوگا، جس طرح آگ پر دیگ کھولتی ہے۔ وہ شخص سمجھے گا کہ سب سے زیادہ عذاب مجھے ہی دیا جارہا ہے۔ حالانکہ اس کا یہ عذاب جہنم والے تمام لوگوں سے کم ہوگا''

جب سب سے کم عذاب اتنا شدید ہولناک ہوگا، تو زیادہ عذاب کتنا ہولناک ہوگا؟ اے اللہ مومنین کو تو اس عذاب سے اپنی رحمت سے بچا۔ ہمارے عملوں کو نہ دیکھ، اپنے فضل کو دیکھ۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" او قد على النار الف سنة حتى احمرت ثم اوقد عليها الف سنة حتى ابيضت ثم اوقد عليها الف سنة حتى اسودت فهي سوداء مظلمة "

'' جہنم کی آگ کو ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا یہاں تک کہ وہ سرخ ہوگئی۔ پھر ایک ہزار سال بھڑکایا گیا یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئی پھر ایک ہزار سال بھڑکایا گیا یہاں تک کہ سیاہ ہوگئی۔ اب وہ بہت ہی سیاہ تاریک آگ ہے''

دارمی نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کو ذکر کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

" انذرتكم النار ، انذرتكم النار فما زال يقولها حتى لو كان في مقامي هذا سمعه اهل السوق وحتى سقطت خميصة كانت عليه عند رجليه "

'' میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں، میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں۔ آپ یہ فرماتے رہے، یہاں تک اگر میرے اس مقام میں بازار والوں سے کوئی شخص سنتا تو اپنا جبہ اتار دیتا جو اس کے پاؤں تک ہوتا ہے''

یعنی آپ نے آگ کا اتنا ہولناک منظر بار بار یہ کہہ کر کہ ''میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں'' پیش کیا کہ اگر پاؤں تک جبے پہنے لوگ اسے سنتے تو وہ خوف کے مارے اپنے جبے بے ساختہ اس طرح اتار دیتے کہ گویا ان کے جبے خود ہی گر رہے ہیں۔ (مظہری)

﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

☆ اور خوشخبری دے انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ ان کیلئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں جب انہیں ان باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا (صورت دیکھ کر) کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور وہ (صورت میں) ملتا جلتا انہیں دیا گیا، اور ان کیلئے ان باغوں میں ستھریاں بیبیاں ہیں، اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔

☆ اور خوشخبری دو ان لوگوں کو جنہوں نے ایمان لایا اور اچھے عمل کیے۔ بیشک ان کیلئے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور ان کو جب بھی ان جنتوں سے پھلوں کا رزق دیا جائے گا، وہ کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا۔ اور اسی کے مشابہ ان کو دیا گیا۔ اور ان کیلئے ان جنتوں میں پاکیزہ زوجہ ہوں گی۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اشقیاء (بد بخت) کفار کا ذکر کیا اور ان کے عذاب کا ذکر کیا، تو اس کے بعد مومنین نیک بخت لوگوں کا ذکر فرمایا، جو اپنے ایمان میں مخلص اور نیک عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک اسماء گرامیہ میں ایک اسم گرامی ''مثانی'' بھی ہے۔ جس کا ایک معنی یہ ہے کہ قرآن پاک میں جب ایک چیز کا ذکر ہوتا ہے، تو ساتھ ہی اس کے مقابل دوسری چیز کا ذکر بھی ہوتا ہے، اس لئے کہ قانون یہی ہے:

'' انما الاشياء تعرف باضدادها '' ''کہ بیشک چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں''

یہ وجہ ہے کہ پہلے کفار کا ذکر تو بعد میں ایمان والوں کا ذکر ہوگا۔ اور اگر پہلے ایمان والوں کا ذکر ہو تو بعد میں کفار کا ذکر ہوگا۔ اسی طرح پہلے نیک لوگوں کا ذکر ہو تو بعد میں گنہگاروں کا ذکر ہوتا ہے۔ اور پہلے گنہگاروں کا ذکر ہو تو بعد میں نیک لوگوں کا ذکر ہوتا ہے۔ (از ابن کثیر)

وَبَشِّرِ : اور بشارت دو۔ یہ حکم نبی کریم ﷺ کو ہے کہ آپ بشارت دو، یا یہ حکم عام انسانوں کو ہے " وھذا حسن " عام لوگوں کو حکم دینا اچھا ہے کہ اس بشارت میں عظمت اور شان کی بلندی پائی گئی ہے۔ کہ اے انسانو! جو بھی بشارت دینے کی طاقت رکھتے ہو ایمان والوں اور اچھے عمل والوں کو جنت کی بشارت دے دو " والبشارۃ الاخبار بما یظھر سرور المخبر بہ " بشارت اس خبر کو کہتے ہیں جسے سن کر وہ شخص ہو جائے، جسے خبر دی گئی ہو۔ یعنی اس کے چہرے کے بشرہ (چمڑے) پر مسرت کے آثار ظاہر ہوں۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ جس میرے غلام نے مجھے فلاں شخص کے آنے کی بشارت دی وہ آزاد ہے۔ اس کے اس قول کے بعد ایک غلام آیا اس نے بتایا کہ فلاں آ گیا۔ پھر دوسرے نے، پھر تیسرے نے بتایا۔ تو صرف پہلا غلام آزاد ہوگا، کیونکہ بشارت اسی کی خبر کو کہا جائے گا، بعد والوں کی خبریں فقط خبریں ہی ہیں، کیونکہ مسرت صرف پہلی خبر سے حاصل ہوتی ہے۔

لیکن اگر کسی شخص نے کہا میرے جس غلام نے فلاں شخص کے آنے کی خبر دی وہ آزاد ہے۔ اس طرح کئی غلاموں نے خبر دی، پہلے ایک، پھر دوسرے، پھر تیسرے نے تو تمام غلام آزاد ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ جتنے بھی بتائیں گے، ان تمام کے بتانے کو خبر کہا جائے گا۔ (از احکام القرآن للجصاص ومدارک)

فائدہ: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" بشر المشائین الی المسجد فی ظلم اللیالی بالنور التام یوم القیامۃ "

''اندھیری راتوں میں مسجد کی طرف جانے والوں کو قیامت کے دن کامل نور حاصل ہونے کی بشارت دو'' (ابو السعود)

آپ کے اس ارشاد گرامی سے ایک تو یہ فائدہ حاصل ہوا کہ بشارت کا حکم یہاں عام ہے، کہ جس سے بھی بشارت ممکن ہو وہ ہی ایمان والوں اور نیک اعمال والوں کو بشارت دیں۔

اور دوسرا فائدہ حاصل ہوا کہ جماعت سے نماز ادا کرنے والے، مسجد میں جانے والے کتنے خوش قسمت ہیں کہ ان کا ذکر مصطفےٰ کریم علیہ ﷺ کی زبان ذیشان پر ہے۔ صرف ذکر ہی نہیں بلکہ بشارت دینے کا حکم دیا جارہا ہے۔

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: وہ لوگ جنہوں نے ایمان لایا۔ یعنی بشارت دو ایمان والوں کو " الذین امنوا ، صدقوا باللہ " مراد اس سے یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی تصدیق کی وہی ایمان والے ہیں۔ ایمان والوں کی تفسیر صرف اس سے کر دینا کافی ہے " لانہ یلزم من التصدیق باللہ التصدیق بما اخبر بہ علی لسان رسلہ " کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تصدیق اس کو ہی حاصل ہوگی جسے ان تمام خبروں کی تصدیق حاصل ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی زبان مبارک سے بیان فرمائیں

(از جلالین وصاوی)

مقصد واضح ہے کہ ایمان وہی معتبر ہے کہ ان تمام چیزوں پر ایمان ہو جن کا ایمان میں اعتبار کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر، تمام انبیاء کرام، ملائکہ، قیامت کے دن، تقدیر پر ایمان ہو۔ تاہم خیال رہے کہ تفسیر عزیزی اور تبصیر الرحمٰن " الذین امنوا " کی تفسیر میں کتاب یعنی قرآن پاک پر ایمان کا ذکر ہے۔ لیکن قرآن پاک پر بھی ایمان اسی وقت مکمل ہوگا جب کہ تمام ایمانیات کی تصدیق حاصل ہوگی۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور اچھے عمل کیے، یعنی ایمان والوں اور اچھے عمل کرنے والوں کو بشارت دو۔

اچھے عمل کون سے ہیں؟

" وعملوا الصالحات من الفرائض والنوافل " ''اچھے عمل یہ ہیں فرائض ادا ہوں اور نوافل بھی''

فرائض سے مراد جیسا کہ پانچ وقت نماز ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، عمر میں ایک مرتبہ طاقت حاصل ہونے پر حج کرنا۔ اپنے مال کی زکوۃ ادا کرنا اور جب دشمن اچانک حملہ کر دے تو جہاد کرنا۔ نوافل سے مراد نفلی نماز ادا کرنا۔ نفلی روزے رکھنا" ومواساۃ الفقراء وغیر ذلک من انواع البر " اور فقراء کی امداد کرنا اور ہر قسم کے نیکی کے کام کرنا اسی میں شامل ہے:

"والمراد عملوا الصالحات علی حسب الطاقة قال تعالیٰ فاتقوا اللہ ما استعطتم"
"نیک عمل کرنے سے مراد "طاقت کے مطابق عمل کرنا" ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی کا بھی یہی مطلب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تمہیں طاقت ہو" (جلالین صاوی)

نیک عمل کی پہچان:

"العمل الصالح ما کان فیہ اربعة اشیاء العلم والنیة والصبر والاخلاص"
"نیک عمل وہ ہوگا جس میں چار چیزیں پائی جائیں گی، علم، نیت، صبر اور اخلاص" (خازن)
"وقال عثمان بن عفان وعملوا الصالحات ای اخلصوا الاعمال یعنی عن الریاء"
"حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نیک عمل وہ معتبر ہوں گے جو ریاء کاری (دکھلاوے) سے پاک ہوں گے"

علمی نکتہ: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے بعد واو عاطفہ کو ذکر کیا پھر ﴿عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کو معطوف بنایا۔ چونکہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت ہوتی ہے۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں۔ البتہ مؤمن کی پہچان اعمال صالحہ سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر اعمال کو ایمان میں داخل مانا جائے "لزم التکرار وھو خلاف الاصل" تکرار لازم آئے گا وہ خلاف اصل ہے۔ (از کبیر)

تنبیہ: ایمان اور اعمال صالحہ پر ہی موت آئے اس کے ذمہ کوئی حقوق العباد اور حقوق نہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق اپنے فضل سے جنت عطا فرمائے گا اگرچہ اس پر کوئی چیز لازم نہیں۔ اور بندہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہے۔

اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ: بیشک ان کے لئے جنتیں ہوں گی۔ یعنی بشارت دو ان لوگوں کو جنہوں نے ایمان لایا اور اچھے عمل کیے کہ بیشک ان کو جنات حاصل ہوں گی۔ جنت کا معنی باغ ہے۔ یعنی ان کو باغات حاصل ہوں گے۔ جنت کا کچھ مختصر ذکر احادیث مبارکہ سے انشاء اللہ بعنوان "جنت کا منظر" سے آیہ کریمہ کی لفظی بحث کے بعد آئے گا۔

جنتوں کی تعداد: رب تعالیٰ نے "جنات" جمع ذکر کیا ہے۔ اس سے اتنا تو واضح ہے کہ

جنتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ البتہ ان کی تعداد کتنی ہے۔ اس میں تین قول مشہور ہیں:

ایک قول یہ ہے جنتیں کل چار ہیں۔ کیونکہ سورۃ الرحمٰن میں چار جنتوں کا ذکر ہے ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ ﴾ میں دو جنتوں کا ذکر ہے پھر ﴿ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتَانِ ﴾ میں دو اور کا ذکر ہے

دوسرا قول یہ ہے کہ جنتوں کی کل تعداد سات ہے، اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد مبارک شاہد ہے:

"وجمعها و تنكيرها لان الجنان على ماذكره ابن عباس سبع جنة الفردوس وجنة عدن وجنة النعيم ودار الخلد وجنة الماوى ودار السلام وعليون"

''جنات'' کو جمع اور نکرہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر فرمایا کہ جنتیں سات ہیں:

(۱) جنت الفردوس (۲) جنت عدن (۳) جنت نعیم (۴) دار الخلد

(۵) جنت ماوی (۶) دار السلام (۷) علیون۔

تیسرا قول یہ ہے جنتیں کل آٹھ ہیں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے سات نام یہی ذکر فرمائے جو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں ذکر کئے ہیں اور آٹھواں نام آپ نے "دار المقامة" ذکر فرمایا ہے۔ (از بیضاوی و عزیزی)

راقم کا موقف اس پر یہ ہے کہ جب مشہور ضابطہ یہ ہے کہ ''ذکر قلیل کثیر سے مانع نہیں'' تو اس ضابطہ کے مطابق جنتوں کی تعداد آٹھ ذکر کرنی ہی صحیح ہے۔ کیونکہ جہاں چار کا ذکر ہے وہاں بھی آٹھ کی نفی نہیں۔ اور جہاں سات کا ذکر ہے وہاں بھی آٹھ کی نفی نہیں۔

زیادہ تعداد میں جنتوں کی حکمت:

"وفي كل واحدة منها مراتب ودرجات متفاوتة على حسب تفاوت الاعمال والعمال"

''ہر ایک جنت میں مختلف مراتب اور مختلف درجات ہیں کیونکہ عمل کرنے والے بھی مختلف درجات رکھتے ہیں اور ان کے اعمال بھی مختلف درجات کے ہوتے ہیں'' (بیضاوی)

یعنی جب انسان عمل کے لحاظ پر مختلف درجات رکھتے ہیں اور رب تعالیٰ کی طرف سے بھی

انبیاء کرام کو تمام مخلوق سے زیادہ مرتبہ حاصل ہے۔ اور تمام انبیاء کرام سے افضل ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ تو یہ بالکل عقل کا تقاضا ہے کہ جنت کے بھی اسی طرح مدارج ہوں۔ تاکہ زیادہ مرتبہ والے حضرات کا جنت میں بھی مقام عظیم المرتبۃ ہو۔ اور جس جس طرح اعمال میں فرق ہوگا۔ اسی طرح ان لوگوں کے جنت میں مقامات میں بھی فرق ہوگا۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ : ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یعنی ایمان والوں اور اچھے عمل کرنے والوں کو جنتوں کی بشارت دو جن میں نہریں جاری ہوں گی۔

﴿مِنْ تَحْتِهَا﴾ سے مراد "من تحت اشجارها" ہے یعنی جنتوں (باغات) کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

جنت کی نہریں دنیا کی نہروں سے مختلف ہوں گی:

"عن مسروق النار الجنة تجری فی غیر اخدود"

"حضرت مسروق رضی اللہ عنہ سے مروی کی جنت کی نہریں کے لئے کھائیاں نہیں ہوں گی"

یعنی دنیا میں نہر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے اردگرد بند باندھا جائے۔ اور درمیان میں پانی والی جگہ بنسبت طرفوں کے گہری ہو۔ لیکن جنت کی نہریں ہموار زمین میں خود بخود قدرت باری تعالیٰ سے صحیح سمت میں چلتی ہوں گی دائیں بائیں پانی وغیرہ کا نکلنا ممکن ہی نہیں ہوگا۔ (از بیضاوی)

خیال رہے کہ نہر سے مراد دریا ہیں کیونکہ نیل اور فرات کو نہر کہا گیا ہے جو دریا ہیں۔

جنت کی نہریں: رب تعالیٰ نے خود ہی واضح طور پر جنت کی نہروں کا ذکر فرمادیا ہے۔ جن کو یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۞ فِیْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۵ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی﴾

"احوال اس جنت کا جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے ہے، اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو کبھی خراب نہ ہوں، اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہ بدلے اور ایسے

شراب کی نہریں ہیں جس کے پینے میں لذت ہے، اور ایسے شہد کی نہریں ہیں جو صاف کیا گیا ہے"

یعنی جنت میں پانی کی نہریں بھی ایسے ہوں گی کہ وہ پانی کبھی بدبودار نہیں ہوگا، سڑے گا نہیں۔ اس پانی کے ٹھہرنے کی وجہ سے اس میں کسی قسم کے کوئی اثرات نہیں ہوں گے۔

دودھ کی نہریں بھی دنیا کے دودھ سے مختلف ہوں گی۔ دنیا میں دودھ کا مزہ بدل جاتا ہے، ترش ہوجاتا ہے، بدبودار ہوجاتا ہے۔ لیکن جنت میں دودھ کی نہروں پر اس قسم کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

جنت کی شراب پاکیزہ ہوگی، اس میں نشہ نہیں ہوگا، پینے میں لذت حاصل ہوگی، جنت کے شراب میں دنیا کے شراب کے عیوب اور خرابیاں نہیں پائی جائیں گی۔

جنت میں خالص، صاف، شفاف شہد کی نہریں ہوں گی۔ اگرچہ دنیا میں بھی شہد میں شفاء ہے لیکن جنت کا شہد اور ہی عظیم ہوگا۔

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا:

"جب انہیں جنتوں سے کوئی پھل رزق کے طور پر دیا جائے گا تو وہ یہ کہیں گی کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا اور اس کے مشابہ دیا گیا"

﴿ الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ اس میں ایک قول یہ ہے کہ ان کو جنت میں جو پھل دیا جائے گا وہ دنیا والے پھلوں کی طرح ہی ہوگا شکل کے لحاظ پر سیب، انار، انگور، انجیر وغیرہ ہی ہوں گے لیکن ان کا ذائقہ مختلف ہوگا۔ یعنی جنت والے پھلوں کا نام اور شکل تو دنیا والے پھلوں کی طرح ہوں گے، لیکن ان کی شان بہت بلند ہوگی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان کو جنت میں ایک مرتبہ جو پھل دیئے جائیں گے وہ دوبارہ جب دیئے جائیں گے تو نام اور شکل تو پہلے پھلوں والی ہوگی لیکن ذائقہ ہر مرتبہ مختلف ہوگا۔ (از بیضاوی)

دونوں قولوں کا مجموعہ ہی مقصد ہے:

یعنی جنت والے حضرات کو جنت میں جو پھل دیئے جائیں گے وہ دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہوں

گے تاکہ وہ مانوس پھلوں کو دیکھ کر ان سے نفع حاصل کر سکیں۔ لیکن وہ ذائقہ کے لحاظ پر مختلف ہوں گی اور ان میں عظمت پائی جائے گی جو دنیا کے پھلوں میں نہیں۔

پھر جنت میں جتنی مرتبہ بھی پھل ان کو دیئے جائیں گے وہ پہلے سے ذائقہ میں مختلف ہوں گے اگرچہ رنگ اور شکل میں پہلے کی طرح ہوں گے۔

جنت کے پھلوں کے متعلق ارشاد مصطفویٰ:

" روی انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام قال والذی نفس محمد بیدہ ان الرجل من اہل الجنۃ یتناول الثمرۃ لیاکلھا فما ھی واصلۃ الی فیہ حتی یبدل اللہ مکانھا مثلھا "

" نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بیشک جنتی لوگ کھانے کے لئے جو پھل بھی حاصل کریں گے وہ ان کے منہ تک نہیں پہنچے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پھل کی مثل اور اسی درخت سے قائم فرما دے گا"

یعنی وہاں پھلوں کے لئے پھول لگنا، پھر آہستہ آہستہ ان کا پھل بننا پھر پکنا اس پر زمانہ گزرنا نہیں پایا جائے گا بلکہ ادھر پھل توڑا ادھر اسی کی مثل دوسرا تیار ہو گیا۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا: (ان کو اسی کے مشابہ دیا گیا) یہ جملہ معترضہ ہے اور ماقبل کلام کی تقریر (پختگی، تاکید) کے لئے لایا گیا ہے۔ کیونکہ " الذی رزقنا من قبل " سے سمجھ آ چکا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ رزق تو وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا۔ اسی سے پتہ تو چل گیا تھا کہ ان کے کہنے کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ پھل دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہیں یا ان کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ پھل تو جنت میں حاصل ہونے والے پھلوں کے مشابہ ہیں۔ لیکن پہلے ضمناً یہ مقصد حاصل ہوا تھا اب صراحتاً اسے بیان کیا جا رہا ہے۔

" بہ " میں ضمیر لوٹ رہی ہے " رزق " کی طرف جو " رزقنا " سے حاصل ہوا یعنی " مارزقوا فی الدارین " یہ اسی کے مشابہ دیا گیا جو ان کو دنیا اور جنت میں پہلے دیا گیا۔ اور یا ضمیر لوٹ رہی ہے " رزق " کی طرف جو " رزقنا " سے حاصل ہوا۔ کہ ان کو اسی رزق کے مشابہ دیا گیا جو پہلے دیا گیا۔

تنبیہ: یہ مشابہت صرف رنگ اور شکل میں ہوگی ورنہ جنتی پھل اتنے اعلیٰ ہوں گی کہ انکے ساتھ مماثلت اور مشابہت تامہ دنیا کے پھلوں کو حاصل نہیں ہوسکے گی۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشادگرامی ہے " لیس فی الجنة من اطعمة الدنیا الا الاسماء " جنت میں کوئی طعام بھی دنیا کے طعاموں سے نہیں ہوگا۔صرف ان طعاموں کے نام دنیا کے طعاموں والے نام ہوں گے

علمی نکتہ: ابھی ذکرکیا ہے کہ ﴿ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ﴾ جملہ معترضہ ہے۔لیکن اس کے متعلق طلباء کرام اس بات کو نہ بھولیں۔حواشی سعدیہ میں یہ ذکرکیا گیا ہے:

" جعله اعتراضا مبنی علی رائی من یجوز الاعتراض فی آخر الکلام ومن لا یجوزه فیه یجعله تذییلا وھو ان یعقب الکلام بما یشتمل علی معناه توکیدا "

''جملہ معترضہ ان حضرات کے مذہب کے مطابق بنانا صحیح ہے جوکلام کے آخر میں بھی جملہ معترضہ کولانے کے قائل ہیں۔لیکن جوکلام کے آخر میں جملہ معترضہ کوتسلیم نہیں کرتے ان کے نزدیک یہ جملہ " تذییل " ہے۔ " تذییل " کا معنی ہوتا ہے دامن میں لانا یعنی ایک جملہ کے بعد دوسرا اسی کے معنی کی وضاحت اور تاکید کے لئے لایا جائے''

(از بیضاوی وشیخ زاده)

وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ :''اوران جنتیوں کے لئے جنتوں میں پاکیزہ زوجہ ہوں گی''

اَزْوَاجٌ: جمع ہے زوج کی، زوج مذکراورمؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے۔اس مقام پر مرادمؤنث ہے۔

لَهُمْ: میں ضمیر ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے۔یعنی ایمان والے اور نیک عمل کرنے والے جن کے لئے بشارت دینے کا حکم دیا گیا ہے وہ جنتی لوگ مراد ہیں۔

فِيْهَا: میں ضمیر جنات کی طرف لوٹ رہی ہے۔کہ ان کو جنتوں میں پاکیزہ زوجہ حاصل ہوں گی۔

مُطَهَّرَةٌ: پاکیزہ ہوں گی۔یعنی " مطهرة مما یستقذر من النساء ویذم من احوالهن " ان کو ہراس گندگی سے پاکیزگی حاصل ہوگی جو دنیا کی عورتوں میں پائی جاتی ہے۔اوران تمام حالات سے پاکیزہ ہوں گی جو دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ان کی مذمت کا سبب ہیں۔

طبعی قذر (گندگی) سے پاک ہوں گی:

" مطھرات الاجسام مما یستکرہ طبعا کالدن والبزاق والمخاط " ان کے جسم ہر اس چیز سے پاک ہوں گے جو طبعی طور پر ناپسند ہوں۔ یعنی میل کچیل سے وہ پاک ہوں گی۔ بار بار تھوکنا جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں اس سے وہ پاک ہوں گی۔ اور ناک ان کا نہیں بہہ رہا ہوگا جسے دیکھ کر لوگ پسند نہ کریں بلکہ ایسی صاف ستھری ہوں گی کہ ان کے خاوندان کی طرف بہت زیادہ میلان کریں گے:

" ومما یستکرہ شرعا کالحیض والنفاس والبول والغائط والمذی "

'' ان کے جسم ان چیزوں سے بھی پاک ہوں گے جو شرعاً ناپاک سمجھی گئی ہیں جیسے حیض، نفاس، پیشاب، پاخانہ اور مذی منی وغیرہ''

" ومطھرات الاخلاق لیس فیھن شئی من الاخلاق الذمیمة کالحسد والبخل والکبر والعجب ونحوھا "

''اور وہ پاکیزہ اخلاق والی ہوں گی ان کے اخلاق میں کسی قسم کی برائی نہیں ہوگی۔ جیسے حسد، بخل، تکبر اور اپنے آپ پر اترانا۔ یہ تمام برے اخلاق ہیں ان سے وہ پاک ہوں گی''

" ومطھرات الافعال لا یصدر عنھن فعل تسبیح " (بیضاوی وشیخ زادہ)

''اور ان کے افعال پاکیزہ ہوں گی ان سے کسی قسم کا کوئی برا فعل سرزد نہیں ہوگا''

فائدہ: جو عورت جس مسلمان کے نکاح میں مرے گی وہ جنت میں اسی کے ساتھ رہے گی۔ یعنی عورت اپنے آخری مسلمان خاوند کے ساتھ جنت میں رہے گی۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد بھی آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام تھا تاکہ وہ آپ کے ساتھ ہی جنت میں رہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ نبی کریم ﷺ کو شہداء سے بھی اعلیٰ حیات حاصل ہے۔ زندہ کی زوجہ بیوہ نہیں ہوتی کہ وہ کسی اور کے ساتھ نکاح کرے۔

خیال رہے کہ شہداء کو قبر میں زندگی حاصل ہے لیکن دنیاوی طور پر ان پر احکام فوت شدہ والے جاری ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی بیوہ نکاح کر سکتی ہے شہید کی زندگی پر بحث انشاء اللہ مناسب مقام پر آئے گی۔

جس مسلمان عورت کا خاوند (العیاذ باللہ) کافر ہو کر مر گیا۔ یا وہ عورت جو کنواری ہی فوت ہو گئی

ان کا نکاح جنتیوں میں سے کسی شخص سے کر دیا جائے گا جو جنت کو بھرنے کے لئے اس وقت پیدا کئے جائیں گے۔ جس شخص کی بیوی (العیاذ باللہ) کافر ہو کر مرگئی یا وہ شخص کنوارا ہی فوت ہو گیا تو اس کو صرف جنت کی حوریں حاصل ہوں گی دنیاوی کوئی عورت اس کے نکاح میں نہیں ہو گی۔ جس شخص کی بیوی مسلمان ہونے کی حالت میں ہی فوت ہوئی اسے وہ اپنی بیوی بھی حاصل ہو گی اور جنتی حوریں بھی لیکن دنیاوی عورت جنتی حوروں سے حسن و جمال میں کسی طرح بھی کم نہیں ہوں گی۔

فائدہ جلیلہ: روایات میں آیا ہے کہ حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ، اور حضرت آسیہ فرعون کی بیوی جنت میں نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں گی۔ (از نعیمی)

جنت میں ایک عورت کو کئی خاوند حاصل نہیں ہو گے:

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں جنت میں ایک مرد کو کئی عورتیں دی جائیں گی، لیکن ایک عورت کو کئی مرد نہیں دیئے جائیں گے کیونکہ یہ بے حیائی ہے۔ ایک مخدوم کے چند خادم ٹھیک ہیں مگر ایک خادم کے چند مخدوم ٹھیک نہیں ہاتھ میں انگوٹھا جو نہر ہے ایک ہے انگلیاں جو مادہ ہیں وہ کئی ہیں۔ (نعیمی)

اسی مسئلہ کو غزالی دوران حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے بڑے خوبصورت انداز میں یوں بیان فرمایا:

اگر کہا جائے کہ ﴿ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ ﴾ میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں کیونکہ ہر ایک دوسرے کا زوج یعنی جوڑا ہے۔ جس طرح ایک مرد کو جنت میں بہت سی عورتیں ملیں گی اسی طرح ایک عورت کو بھی وہاں بہت سے مرد ملنے چاہئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جنت میں جسے جو کچھ ملے گا وہ اس کی خواہش کے مطابق ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ ﴾ (حم سجدہ آیۃ نمبر ۳۱)

''یعنی جنت میں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہو گا جس کی تم خواہش کرو گے''

لیکن مخفی نہ رہے کہ جنت میں کسی اہل جنت کے دل میں کوئی ایسی خواہش پیدا نہ ہو گی جو اصل فطرت کے خلاف ہو کیونکہ وہ عیب ہے جس سے جنتی پاک ہوں گے۔ دنیا میں کوئی غیر فطری خواہش

لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن جنت میں کسی اہل جنت کے دل میں خلاف فطرت خواہش کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں۔

مرد کی اصلِ فطرت ایک سے زیادہ عورتوں کی متقاضی (تقاضا کرنے والی) ہو سکتی ہے یہ تقاضا اس کے حق میں عیب نہیں۔ لیکن عورت کی اصلِ فطرت بیک وقت ایک سے زیادہ مردوں کی متقاضی نہیں ہو سکتی۔ اگر دنیا میں کوئی عورت اس قسم کی غیر فطری خواہش اپنے دل میں رکھتی ہے تو وہ یقیناً عیب ہے۔ جنت میں اس عیب کا تصور کسی بھی جنتی عورت کے حق میں نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا وہاں کوئی عورت ایک سے زائد کسی مرد کی خواہش مند نہ ہوگی۔ ایسی صورت میں کسی جنتی عورت کو بہت سے مرد ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح عورتیں مردوں کے لئے نعمت ہیں اسی طرح مرد بھی عورتوں کے لئے یقیناً نعمت ہیں اور زیادتی نعمت کا تقاضا فطری خواہش ہے۔ اس لئے اگر عورتوں کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو تو خلاف فطرت نہ ہوگی۔ میں عرض کروں گا کہ اگر یہی سوال کسی سلیمۃ الفطرت حیادار عفت مآب عورت کے سامنے رکھا جائے تو وہ شرم وحیا سے پسینہ پسینہ ہو جائے گی۔ اور اسی کی زبان حال جواب دے گی کہ سائل اپنے والد کو اپنے حق میں نعمت سمجھتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں سمجھتا تو ناخلف ہے اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ میرا والد میرے حق میں اللہ کی نعمت ہے تو کیا وہ اس نعمت کی زیادتی کا طلب گار ہوگا اور اس کی فطرت ایک سے زیادہ والد کی خواہش مند ہوگی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو وہ سمجھ لے کہ ایک حیادار عورت ایک سے زیادہ خاوند کی خواہش مند نہیں ہو سکی۔ (التبیان مع البیان)

وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ: اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی جنت والے حضرات جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کو جنتوں سے نکالا نہیں جائے گا، کیونکہ اخروی زندگی کا انقطاع نہیں ہونا۔ اور نہ ہی کسی کو انعام عطا کرنے کے بعد انعام کو چھینا جانا ہے۔

خیال رہے کہ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ لفظی بحث یہاں کی گئی ہے کہ صرف لفظ "خالدون" سے ہی یہ معنی حاصل ہو جاتا ہے یا کہ اس کے ساتھ "ابدا" لفظ بڑھائیں تو یہ معنی حاصل ہوتا ہے۔ اور صرف "خالدون" آئے تو اس کا معنی زیداہ دیر ٹھہرنا ہوتا ہے۔ تاہم اس بحث کو غیر ضروری سمجھ کر ترک کیا جا رہا ہے۔ مسئلہ وہی ہے جو ابتدائی سطروں میں تحریر کر دیا ہے۔

جنت کا منظر: اجمال کے بعد کچھ تفصیلی طور پر جنت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ تا کہ قرآن پاک کی مختلف آیات مبارکہ اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں جنت کا منظر سامنے آ سکے۔ اور بد مذہب لوگوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ بھی ہو سکے کہ جنت ایسی نہیں ہوگی، جیسے مولوی بیان کرتے ہیں، یہ انکی بیہودگی علماء کو نقصان تو نہیں پہنچا سکتی البتہ انہیں دین کا باغی بنا سکتی ہے۔ ہاں یہ کام صرف یہود ونصاری اور ہنود کے ایجنٹ ہی کر سکتے ہیں۔ کوئی مسلمان قرآن وحدیث کی مخالفت کی جرات نہیں کر سکتا۔

جنت کی عظمت

اللہ کے انعام کی عظمت انسانوں کی سمجھ سے بالاتر ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی (حدیث قدسی) ہے:

" اعددت لعبادی الصالحین مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر ، واقرؤا ان شئتم ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا اُخْفِیَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾ "

(بخاری ، مسلم ، مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ واهلها)

میں نے اپنے بندوں کے لئے ایسا مقام تیار کر رکھا ہے جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور کسی کان نے سنا نہیں اور کسی دل پر کھٹکا نہیں، اگر تم چاہتے ہو تو (قرآن پاک کی یہ آیت) پڑھ لو۔ (جس کا مطلب ہے) کوئی نفس نہیں جانتا، جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے مخفی کر کے رکھی ہوئی ہے۔

اس سے مراد خصوصی ثواب اور انعام واکرام ہے:

" ای نوع عظیم من الثواب ادخر اللہ لاولئک واخفاه من جمیع خلائقه لایعلمه الا هو مما تقربه عیونهم "

یعنی ثواب کی عظیم قسم جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کے لئے تیار کر رکھی ہے اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مخلوق میں سے کوئی ایک بھی نہیں جانتا، یہ وہ عظیم ثواب اور مرتبہ ہوگا جس سے نیک لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔

" بلغک اللہ امنیتک حتی ترضی به نفسک وتقر عینک ولاتستشرف الی غیره "

یعنی اے نیک انسان اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری تمام خواہشوں پر کامیاب کر دے گا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے گا، اور تیری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی تجھے غیر کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی

جنت کا کم از کم مقام دنیا کی تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"موضع سوط فی الجنة خیر من الدنیا ومافیها"

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفة واھلھا)

جنت میں کوڑا (چابک، چھڑی) رکھنے کا مقام دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔ چونکہ جنت کی نعمتیں باقی رہنے والی ہیں اور اس کی نعمتیں فنا ہونے والی ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ باقی رہنے والی چیز فنا ہونے والی سے بہتر ہے۔

"قال ابن الملک سوی کلام اللہ وصفاته و جمیع انبیائه"

ابن الملکؒ نے کہا ہے کہ اگرچہ دنیا میں اللہ کے کلام کا نزول بھی ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ صفات کا ظہور بھی ہوا ہے اور انبیاء کرام بھی تشریف لائے لیکن یہ حکم ان کو شامل نہیں، ان کے سواء باقی دنیا کی تمام نعمتوں یعنی مال و دولت، عالیشان محلوں سے جنت کا ادنیٰ درجہ بھی اعلیٰ ہوگا۔

کوڑے یعنی چابک یا چھڑی کو ذکر کرنے میں خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے حقیر سمجھا جاتا ہے جب کوئی سوار اترنا چاہتا ہے تو وہ پہلے اپنی چھڑی زمین پر پھینکتا ہے پھر خود اترتا ہے۔ پہلے اس کے چھڑی پھینکنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسرے ساتھیوں کو معلوم ہو جائے کہ یہاں ہی اترنا ہے وہ آگے نہ چلے جائیں، لیکن چھڑی کو زمین پر پھینکنے سے اس کی اور اس کے رکھنے کی جگہ کی حقارت بھی معلوم ہوگئی اس لئے واضح فرمایا کہ جنت ایسا مقام بھی دنیا کی عظیم الشان نعمتوں سے ارفع و اعلیٰ ہوگا۔

جنت کے درخت کی عظمت:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ان فی الجنة شجرة یسیر الراکب فی ظلها مائة عام لا یقطعها"

بیشک جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں چلنے والا سوار اس کو ایک سو سال میں بھی قطع نہیں کر سکے گا اور جنت میں تمہارے ایک کمان کی مقدار کا مقام بھی سورج کے مقام طلوع اور غروب سے بہتر ہے۔

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفة الجنة واھلها)

جنت کے درخت کا نام "طوبی" ہے جس طرح ابن جوزی نے فرمایا "یقال انها طوبی" کہا جاتا ہے بیشک وہ طوبی ہے۔ خیال رہے درخت کے سائے میں چلنے سے مراد اس کے نیچے کنارے پر چلنا ہے کیونکہ دنیا میں سایہ کا اعتبار سورج سے ہے، خصوصا درخت کے سایہ میں اس وقت انسان چلتا ہے جب دھوپ اور سورج کی تمازت (گرمی) سے بچنا چاہتا ہو، لیکن جنت کی تعریف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے" لا یرون فیها شمسا ولا زمهریرا "جنتی لوگ جنت میں نہ دھوپ دیکھیں گے اور نہ سردی۔ اور ممکن ہے کہ درخت کے اوپر اور پر نورانیت کا ظہور ہو اور اس کے نیچے حجاب ہو جو سایہ نظر آرہا ہو جس طرح ہمارے محاورہ میں رات کو چراغ، بجلی کے قمقموں کی روشنی میں نظر آنے والے عکس کو بھی سایہ کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح صبح صادق سے لیکر طلوع شمس تک سورج کی شعاعوں کے مقابل اس وقت کو بھی ظل (سایہ) کہا گیا ہے، رب تعالیٰ نے فرمایا" وظل ممدود" پھیلایا ہوا ظل (سایہ) اس سے مراد یہی وقت ہے۔

جس طرح انسان شکار کرنے کے لئے جائیں تو وہ درخت کے سایہ میں یا اور کسی جگہ آرام کرنے کے لئے اپنا کمان رکھ کر اپنی اپنی جگہ مختص کرتے ہیں اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں اتنی جگہ جتنی جگہ تم کمان رکھتے ہو وہ طلوع شمس (سورج) اور غروب شمس کے درمیان مقام سے اعلیٰ ہے۔ یعنی تمام دنیا سے اعلیٰ ہے" وفی الجامع ان فی الجنة لشجرة یسیر الراکب الجواد المضمر السریع "یعنی بخاری میں مزید وضاحت موجود ہے کہ جنت میں درخت کے نیچے چلنے والے سوار سے مراد وہ سوار ہے جو ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کے جسم کو بہت پختہ کیا گیا ہو اور وہ بہت تیز چلتا ہو، عمدہ قسم کا گھوڑا ہو۔

☆☆☆

جنت کیسی ہے؟

جنت میں شیشے کے خیمے:

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان للمؤمن فی الجنة لخیمة من لؤلؤ واحدة مجوفة "

جس کا طول وعرض ساٹھ ذراع (نوے فٹ) ہوگا، (ایک روایت طول ساٹھ ذراع کا ذکر ہے اور دوسری راویت میں عرض ساٹھ ذراع کا ذکر ہے) اور ہر کونے میں اسکی اھل ہوں گی کوئی بعض دوسرے بعض کونہیں دیکھ سکے گا، مومنین ان کے پاس جائیں گے دو جنتیں چاندی کی ہوں گی اور انکے برتن اور ہر چیز چاندی کی ہوگی، اور دو جنتیں سونے کی ہوں گی ان کے برتن اور انکی تمام اشیاء سونے کی ہوں گی، جنت عدن میں مومن قوم اور رب کو دیکھنے میں صرف رداء (چادر) کبریائی حائل ہوگی۔

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفة الجنة واھلھا)

" وقد یکون لارباب الکمال جنتان من ذھب وجنتان من فضة "(مرقاۃ المفاتیح)

ارباب کمال کو دو جنتیں چاندی کی اور دو سونے کی حاصل ہوں گی۔

اس طرح چار جنتیں ہوں گی لیکن ان کے طبقات آٹھ ہیں جیسے شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ انسان جب جنت میں ہوگا اسکی جسمانی کدورت اٹھالی جائے گا۔ حسی موانع ختم ہوجائیں گے لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے جلال کا اتنا رعب ہوگا اور اسکی نورانیت کا اتنا غلبہ ہوگا کہ سوائے اسکی رحمت او مہربانی کے انسان رب تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکے گا، یہی رداء کبریائی ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جنت الفردوس سب سے اعلیٰ جنت ہے:

حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جنت میں ایک سو درجہ ہے اور ہر درجہ میں اتنی وسعت ہے جس طرح زمین وآسمان کے درمیان وسعت ہے۔

" والفردوس اعلاھا درجة منھا تفجر انھار الجنة الاربعة ومن فوقھا یکون العرش فاذا سألتم اللہ فاسئلوا الفردوس "

(ترمذی، مشکوۃ باب صفة الجنة واھلھا)

فردوس تمام سے اعلیٰ درجہ والی ہے، اس میں جنت کی چار نہریں جاری ہیں۔ ان تمام (جنتوں کے) اوپر عرش ہے۔ جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کرو تو "فردوس" کا سوال کیا کرو۔

وضاحت حدیث: حدیث شریف میں" مائة درجة "ایک سو درجہ کا ذکر ہے لیکن بیہقی میں حضرت عائشہؓ سے مرفوع حدیث مروی ہے:

" عدد درج الجنة عدد آی القرآن فمن دخل الجنة من اهل القرآن فليس فوقه درجة "

جنت میں قرآن پاک کی آیتوں کے مطابق درجات ہیں، قرآن پاک پڑھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے جس درجہ میں داخل ہوں گے اس کے اوپر کوئی درجہ نہیں۔

ان حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ جنت میں بہت سے مدارج ہوں گے۔ سو کا ذکر کثرت کے لئے ہے۔ تعداد کے لئے نہیں۔ اہل عرب ستر، سو وغیرہ الفاظ سے عام طور پر کثرت والا معنی لیتے تھے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کثیر تعداد میں سے، سو درجے ایک ایک شخص کو حاصل ہوں۔

فردوس کا لغوی معنی ایسا باغ جس میں ہر قسم کے درخت اور انگور کی بیلیں ہوں۔ لیکن جنت کے طبقات میں فردوس کو وہ خصوصیت اور امتیاز حاصل ہوگا جو دوسرے کسی طبقہ کو حاصل نہیں ہوگا اسی وجہ سے امت سے مصطفیٰ ﷺ کو اس کی طلب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی امت تمام امتوں سے اعلیٰ تو اس کو تمام جنتوں سے اعلیٰ جنت طلب کرنی چاہئے۔

نبی کریم ﷺ کی امت کی برتری کا تذکرہ رب تعالیٰ نے اس طرح فرمایا:

○ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ○

(پ ۲ / ۱)

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے کیا سب امتوں سے افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

جب پہلی امتیں تبلیغ انبیاء کا انکار کر دیں گی تو رب تعالیٰ باوجود علم کے منکرین پر حجت قائم کرنے

کیلئے تبلیغ پر انبیائے کرام سے گواہ طلب کرے گا۔ انبیائے کرام امت محمد ﷺ کو گواہ پیش کریں گے۔ پہلی امتیں کہیں گی۔ تم ہمیں کیسے پہچانتے ہو؟ تو یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے سچے نبی نے اللہ کا کلام اس کی کتاب کے ذریعے پہنچایا جس سے ہمیں علم حاصل ہوا۔ پھر ان پر نبی کریم ﷺ کو گواہی دینے کیلئے لایا جائے گا، آپ اپنی امت کے حق میں نگہبان کی حیثیت میں شہادت دیں گے

خیال رہے کہ ''نگہبان'' کا لفظ صرف اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کے ترجمہ میں ہے باقی کسی ترجمے میں نہیں، یہ لفظ آپ نے کیوں زیادہ فرمایا؟ اور باقی مترجمین کس طرح علمی نقطہ سے غافل رہے؟ یہ وضاحت میں نے اپنی کتاب تسکین الجنان میں کی ہے وہاں دیکھیں۔

چار نہریں:

﴿ فِيهَا اَنْهَارٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهَارٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى'' (پ۲۶/۶)

ان (جنتوں) میں ایسی پانی کی نہریں ہیں جو کبھی خراب نہ ہوں اور ایسی دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہ بدلے اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جس کے پینے میں لذت ہے۔ اور ایسی شہد کی نہریں ہیں جو صاف کیا گیا ہے۔

ایک نہر پانی کی ہے اور وہ پانی دنیا کے پانیوں سے مختلف ہے کیونکہ زیادہ دیر ٹھہرنے کی وجہ سے اس کا ذائقہ اور بو نہیں بدلیں گے حالانکہ دنیا کے پانیوں میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے گل سڑ جاتا ہے سب سے پہلے پانی کا اس لئے ذکر کیا کہ انسان دنیا میں بغیر پانی کے زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہی در پیش آتی ہے۔

دوسری نہر دودھ کی ہوگی وہ دودھ بھی دنیا کے دودھ سے مختلف ہوگا، نہ کھٹا ہوگا اور نہ ہی اس میں بدبو پیدا ہوگی بلکہ وہ صرف قدرت سے ہی دودھ معرض وجود میں آئے گا، کیونکہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ دودھ کی نہر جانوروں سے دوہا ہوا دودھ نہیں ہوگا، اسی طرح حضرت سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ جنت کا دودھ گوبر اور خون کے درمیان نالی سے پیدا ہونے والا نہیں ہوگا۔

دودھ کا ذکر دوسرے مرتبہ پر کیا کیونکہ دودھ کو کثیر اہل عرب طعام کی جگہ بھی استعمال کرتے تھے اس لئے پینے کے بعد گویا کہ کھانے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

تیسری نہر شرابا طہورا کی ہوگی دنیا کے شراب نشہ والے ہوتے ہیں ان میں بدبو ہوتی ہے بنانے والے کی میل کچیل کی آمیزش کا بھی قوی گمان ہوتا ہے لیکن جنتی شراب ان تمام چیزوں سے پاک ہوگا۔

تیسرے مرتبہ پر اس کا ذکر بھی اس لئے کیا گیا ہے کہ عام طور پر کھانے کے بعد تلذذ والی چیز کا استعمال ہوتا ہے اس لئے جنت میں بھی دودھ کی غذاییت کے بعد شراب سے لذت دی جائے گی لیکن وہ شراب پاکیزہ ہوگا، صاف ستھرا مشروب ہوگا، نشہ سے پاک ہوگا۔

چوتھی نہر شہد کی ہوگی لیکن وہ شہد خالص صاف شفاف ہوگا، دنیا کے شہد میں بعض اوقات لوگ شمع کی یا چینی کی آمیزش کر کے شہد کو خراب کر دیتے ہیں جو خالص نہیں رہتا، اسی طرح دنیا کے شہد میں شہد کی مکھیوں کے فضلات کی آمیزش بھی ہو جاتی ہے لیکن جنتی شہد ان تمام چیزوں سے پاک ہوگا کیونکہ وہ فقط قدرت سے معرض وجود میں آیا ہوا ہوگا، ظاہری اسباب کو اس میں دخل نہیں ہوگا۔

شہد کا ذکر چوتھے مرتبہ پر کیا کیونکہ اس میں شفاء ہے۔ مرض میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر کھانے پینے کی بے احتیاطی پر مرض لاحق ہوتی ہے اور دواء کی ضرورت در پیش آتی ہے، اس لئے اس کا ذکر سب کے بعد عام عادت کے مطابق ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

ایک حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے جنت کی چار نہروں کے نام دنیا کی نہروں کے مطابق بیان فرمائے ہیں کہ جنت میں ایک نہر کا نام نیل ہے دوسری کا دجلہ، تیسری کا فرات اور چوتھی کا سیحان بعض جگہ سیحون آیا ہوا ہے۔ یہ صرف ناموں کی مطابقت ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ دنیا کے دریا شائد جنت کے ہی ہیں۔

بیہقی میں حضرت کعب سے مروی ہے:

"نهر النيل نهر العسل و نهر دجلة نهر اللبن و نهر الفرات نهر الخمر و نهر سيحان نهر الماء في الجنة" (تفسير روح المعانی)

جنت میں نہر نیل شہد کی نہر ہے۔ نہر دجلہ دودھ کی نہر ہے، نہر فرات شراب کی نہر ہے اور نہر سیحان / سیحون پانی کی نہر ہے۔

جنت کا بازار: حضرت انسؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

" ان فی الجنة لسوقا یأتونها کل جمعة "

بیشک جنت میں ایک بازار ہے جس میں جنتی لوگ ہر جمعہ کو آئیں گے ان پر شمالی جانب سے ہوا چلے گی ان کے چہروں اور کپڑوں پر (کستوری اور ہر قسم کی خوشبوئیں) پھیلا دے گی۔ ''فیرجعون الی اهلهم وقد ازدادوا حسنا وجمالا '' اپنے اھل کی طرف جب یہ لوٹ کر آئیں گے تو وہ کہیں گے '' والله لقد ازددتم بعدنا حسنا وجمالا '' قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تمہارا حسن و جمال ہمارے بعد زیادہ ہوگیا ہے اور یہ انہیں کہیں گے۔

" وانتم والله تعالی زدتم بعدنا حسنا وجمالا . (مسلم، مشکوۃ باب صفة الجنة واهلها)

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تمہارا بھی حسن و جمال ہمارے بعد زیادہ ہوگیا ہے۔

وضاحتِ حدیث: قیامت میں بھی لوگ علماء کے محتاج ہوں گے، اگرچہ قیامت میں سورج اور رات، دن کا وجود نہیں ہوگا لیکن جمعہ اور عیدین کا اعتبار کرنا یا مبارک دنوں میں زیارت کرنا وغیرہ ان تمام چیزوں کی دارومدار اس پر ہوگی'' وانما یعرف وقت اللیل والنهار بارخاء استار الانوار ورفعها '' جنت میں رات اور دن کی پہچان نور سے ہوگی، جب نور پر پردے لٹکا دئے جائیں گے تو رات ہوگی اور جب پردے ہٹا دئے جائیں گے تو دن ہوگا۔

بیشک اہل جنت میں محتاج ہوں گے، اس وجہ سے کہ وہ ہر جمعہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کریں گے فیقول لهم تمنوا علی ماشئتم، رب تعالیٰ انہیں کہے گا جو بھی چاہتے ہو اسی چیز کی تمنا کرو یعنی مجھ سے طلب کرو، اب جنت والوں کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کسی چیز کی طلب کریں'' فیلتفتون الی العلماء فیقولون ماذا نتمنی فیقولون تمنوا علیه کذا و کذا '' وہ علماء کی طرف توجہ کریں گے، ان سے پوچھیں گے کہ ہم رب تعالیٰ سے کیا مانگیں؟ علماء انہیں بتائیں گے کہ تم فلاں فلاں چیزوں کی طلب کرو'' فهم یحتاجون الیهم فی الجنة کما یحتاجون الیهم فی الدنیا '' وہ

جنتی لوگ جنت میں علماء کے اسی طرح محتاج ہوں گے جیسے وہ دنیا میں ان کے محتاج تھے۔

جنت میں جمعہ کا نام یوم المزید (زیادہ نعمتوں کے حاصل ہونے کا دن) بھی ہوگا، اس سے واضح ہوا کہ جمعہ کے دن کو دنیا کی طرح جنت میں بھی باقی دنوں پر سرداری حاصل ہوگی۔

اہل عرب شمالی جانب سے چلنے والی ہوا کو برکت والی اور بارش والی ہوا قرار دیتے ہیں اس لئے ذکر فرمایا کہ ان کے چہروں اور کپڑوں کی شمالی جانب سے چلنے والی ہوا کستوری اور طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر کردے گی جس سے ان کی شکل وصورت اور زیب وزینت میں حسن و جمال زیادہ ہو جائے گا، چونکہ تمام اہل جنت جمعہ کے دن بازار میں جائیں گے اس لئے جب لوٹیں گے تو قبیلہ کا سربراہ اپنی جنتی ازواج سے کلام کرے گا وہ اس سے کلام کریں گی کہ ان کا حسن و جمال زیادہ ہو چکا ہے، اپنے حسن و جمال کی زیادتی کا علم تو ہو نہیں سکے گا، دوسرے کو دیکھ کر کہیں گے تمہارا حسن و جمال زیادہ ہو گیا ہے حالانکہ ہر ایک کا حسن و جمال زیادہ ہوگا۔

﴿اہل جنت کے فضائل﴾

جنت میں اعمال کے مطابق نورانیت کا حصول ہوگا:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں سب سے پہلے داخل ہونے والی جماعت کے لوگ چودھویں کے چاند کی طرح ہوں گے۔ پھر ان کے بعد بہت زیادہ چمکتے ہوئے ستارے کی طرح ہوں گے ''قلوبهم على قلب رجل واحد لا اختلاف بينهم ولا تباغض'' ان کے دل ایک آدمی کے دل ہوں گے، ان میں کوئی اختلاف اور بغض نہیں ہوگا۔

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب صفة الجنة)

سب سے پہلی جماعت انبیاء کرام کی ہوگی جن کے چاند کی طرح چمکتے چہرے ہوں گے لیکن سب سے زیادہ نورانیت مصطفےٰ ﷺ کو حاصل ہوگی ''ولعل دخولها على صورة الشمس مختص بنبينا ﷺ'' باقی انبیائے کرام چاند کی طرح ہوں گے لیکن سورج کی طرح آب وتاب سے جگمگاتے چہرے سے دخول ہمارے نبی کریم ﷺ سے ہی خاص ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جب مشہور بات یہ ہے کہ "نور القمر مستفاد من نور الشمس" چاند کی نورانیت سورج کی نورانیت سے حاصل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب چاند اور سورج کے درمیان زمین حائل ہو جائے تو چاند کو گرہن لگ جاتا ہے یعنی وہ بے نور ہو جاتا ہے۔اس ضابطہ کو سمجھنے کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء کرام کو چاند کی صورت عطا کر کے اور نبی کریم ﷺ کو سورج کی صورت عطا کر کے یہ ظاہر کیا جائے گا کہ تمام انبیاء کرام کو نورانیت مصطفیٰ کریم ﷺ کے واسطہ سے حاصل ہو رہی ہے۔

اس جماعت کے بعد آنے والے "یقربون تلک الزمرة فی قرب المرتبة من الاولیاء والعلماء والشهداء والصلحاء" (مرقاة المفاتیح)

وہ لوگ ہوں گے جو انبیائے کرام کے مرتبہ کے لحاظ پر قریب ہوں گے وہ اولیائے کرام اور علمائے عظام، شہدائے کرام اور نیک متقی پرہیزگار لوگ ہوں گے۔

جنتی لوگوں میں اتفاق و اتحاد ہوگا، ایک دوسرے سے محبت ہوگی، تمام لوگوں کے دل ایک آدمی کے دل کی طرح ہوں گے یعنی جس طرح کسی آدمی کو اپنے آپ سے اختلاف نہیں ہوتا اس طرح وہاں ایک دوسرے سے کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔اور نہ ہی دلوں میں کوئی کھوٹ، کینہ ہوگا یہی وجہ ہوگی کہ کوئی ایک دوسرے سے بغض و عناد نہیں رکھے گا۔

جنت کا حسن و جمال: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مخلوق کو کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "من الماء" پانی سے۔ہم نے پوچھا جنت کو کس چیز سے تخلیق کیا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

"لبنة من ذهب ولبنة من فضة وملاطها المسک الاذفر وحصباؤها اللؤلؤ والیاقوت وتربتها الزعفران" (مسند احمد، ترمذی، دارمی، مشکوٰۃ باب صفۃ الجنۃ واھلھا)

سونے اور چاندی کی اینٹوں سے اور اینٹوں میں چونہ، سیمنٹ کی جگہ بہت زیادہ خوشبودار کستوری کو استعمال کیا گیا ہے اور جنت کی نہروں میں موتیوں اور یاقوت کی طرح سنگریزے ہوں گے اور اس کی مٹی کی جگہ زعفران ہوگا، یعنی نرم، زرد اور خوشبودار مٹی ہوگی، سفید، زرد اور سرخ رنگ سے مزین کیا گیا ہے۔اور سبز درختوں سے اس کے حسن و جمال کو اور زیادہ دوبالا کیا گیا ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جنتی لوگوں کی عمریں اور خوبصورتی:

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" اهل الجنة جرد مر د کحلٰی لایفنی شبابهم و لا یبلی ثیابهم . " (مشکوۃ باب صفة الجنة)

جنت والے لوگ " جُـرد مُرد" ہوں گے سرمہ لگا ہوگا، ان کی جوانی ختم نہیں ہوگی اور انکے کپڑے پرانے نہیں ہوں گے (دوسری روایت میں ہے) انکی عمریں تیں، تینتیس سال ہوں گی۔

جُرد: کا معنی جس کے جسم پر بال نہ ہوں اور "مُرد" کا معنی جس کی داڑھی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خوبصورت اور نرم و نازک ہوں گے، اور قدرتی طور پر ان کی آنکھوں کی پلکوں میں سیاہی اس طرح رکھ دی جائے گی جیسے یہ معلوم ہوگا کہ سرمہ لگایا ہوا ہے۔

جوانی ختم نہیں ہوگی، اس کی تفصیل دوسری حدیث میں ہے "یعطی قوة مائة" ایک آدمی کو سو آدمی کے برابر طاقت دی جائے گی، دنیا میں ایک سو آدمی جنتی طاقت رکھتے ہیں، جنت میں اتنی طاقت ایک آدمی کو حاصل ہوگی یعنی اس طرح ازواج سے مجامعت کی قدرت ہوگی۔ جنتی ہمیشہ زندہ رہیں گے مریں گے نہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من یدخلها ینعم و لایبأس ویخلد و لا یموت " (مشکوۃ باب صفة الجنة)

جو شخص جنت میں داخل ہوگا اس کو نعمتیں حاصل ہوں گی وہ کبھی فقیر محتاج نہیں ہوگا، وہ ہمیشہ باقی رہے گا اس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔

جنت کی نہر کوثر: حضرت انسؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ کوثر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

" ذاک نهر اعطانیه الله یعنی فی الجنة اشد بیاضا من اللبن و احلی من العسل "

یہ وہ نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں عطا کی ہے جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ (مشکوۃ باب صفة الجنة)

اس میں یہ اشارہ پایا گیا ہے کہ جنت میں نہر کوثر کے پانی میں دودھ کی طرح غذائیت اور شہد کی

طرح حلاوت (مٹھاس) پائی گئی ہے۔ اگر چہ اس میں شہد کی طرح شفاء بھی ہوگی لیکن وہاں مرض نہیں لاحق ہوگی اس لئے بطور دواء استعمال کی ضرورت بھی درپیش نہیں آ ئے گی۔

اسی طرح اس پانی میں آنکھوں کی ٹھنڈک اور خواہش کی طلب پائی جاتی ہے یہی نہر کوثر محشر کے حوض کوثر کا منبع بھی ہے۔ جس طرح پہلے تفصیل بیان کی جاچکی ہے۔

اس نہر پر ایسے پرندے ہوں گے جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں کی طرح ہوں گی۔

نبی کریم ﷺ کی امت سب سے زیادہ جنت میں ہوگی:

حضرت بریدہؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" اهل الجنة عشرون ومائة صف ثمانون منها من هذه الامة واربعون من سائر الامم " (ترمذی ۔مشکوۃ باب صفة الجنة)

جنت والے لوگوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی، ان میں اَسی (۸۰) اس امت کی ہوں گی اور باقی تمام امتوں کی چالیس صفیں ہوگی۔

اولیائے عظام کے منازلِ رفیعہ:

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تحقیق اہل جنت اپنے اوپر بالا خانہ پر رہنے والوں کو ایسے دیکھیں گے جس طرح تم مشرق یا مغرب میں افق پر باقی رہنے والے بہت زیادہ چمکدار ستارے کو دیکھتے ہو، کیونکہ جنت والے لوگوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہوگی ۔صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ یہ منازل تو صرف انبیائے کرام کو ہی حاصل ہوں گے، دوسرا تو کوئی وہاں نہیں پہنچ سکے گا، آپ نے فرمایا:

" بلى والذى نفسى بيده رجال امنوا بالله وصدقوا المرسلين "
(بخاری ، مسلم مشکوۃ باب صفة الجنة)

کیوں نہیں؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ یہ مرتبہ تو ان مردوں کو بھی حاصل ہوگا جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور رسولوں کی تصدیق کی۔

جنت والے لوگ ایک دوسرے کو دیکھیں گے، اعمال کے مطابق انکے مراتب و مدارج ہوں

کے اولیائے عظام کو عالیشان، بلند محلات حاصل ہوں گے، ظاہری طور پر بھی ان کو بلند مقام حاصل ہوگا جسطرح شان کے لحاظ سے انہیں بلند مقام حاصل ہوگا۔ روشن ستارے کیطرح بلندی اور نورانیت حاصل ہوگی، جنت میں کچھ لوگ پست مقام میں ہوں گے، کچھ درمیانی مقام میں کچھ بلندی پر۔

حدیث میں لفظ رجال استعمال ہوا ہے جس کا مطلب کامل فی الرجولیة یعنی جو بہت کامل لوگ ہوں گے ذکر اگرچہ رجال کا ہے لیکن نساء (عورتوں) کو بھی شامل ہے۔ کامل لوگ کون ہیں۔ رب تعالیٰ نے بیان فرمایا" رجال لاتلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ " کامل لوگ وہ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض نہ کرائے، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ انہیں کامل ایمان، پختہ یقین، اور عبادت میں کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کا مقام حاصل رہے۔

رسولوں کی تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے لائے ہوئے تمام اوامر اور نواہی (جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے یا ان سے روکا گیا ہے) کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ صابرین شاکرین کی صف میں قائم ہیں اور مقام رضاء کے درجہ پر فائز ہیں، جب انسان ان بلند منازل کو طے کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کو انعامات سے نواز دیتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اولئک یجزون الغرفة بما صبروا" ان لوگوں کو صبر کی وجہ سے بطور جزاء بالاخانے عطا کئے جائیں گے۔

جنتی لوگوں کو نیند نہیں آئے گی:

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا:

" اینام اھل الجنة قال النوم اخو الموت ولا یموت اھل الجنة"

(بیھقی، مشکوٰۃ باب صفة الجنة)

کیا جنت والوں کو بھی نیند آئے گی؟ آپ نے فرمایا نیند موت کی مثل ہے، جنت والوں کو موت نہیں آئے گی۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے مدلل جواب ارشاد فرمایا کہ جس طرح انسان موت کے ہوتا ہے

نیند میں بھی اسکی ایسی حالت ہی ہوتی ہے۔ جب موت نہیں آنی تو یقیناً نیند بھی نہیں آئے گی

دنیا میں نیند کی ضرورت انسان کو اس لئے ہوتی ہے کہ وہ تھکان محسوس کرتا ہے اسے راحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ نیند سے پوری کرتا ہے۔لیکن جنت میں ہر طرح کا آرام ہی آرام ہونا ہے کسی قسم کی تھکاوٹ ہونی ہی نہیں تو اس وجہ سے نیند کی ضرورت بھی درپیش نہیں آئے گی۔

جنت میں انسان کو اولاد کی خواہش نہیں ہوگی:

"اذا اشتھی المؤمن فی الجنة الولد کان فی ساعة ولکن لایشتھی"

(مشکوۃ باب صفة الجنة)

مومن کو جنت میں اگر اولاد کی طلب ہو تو اسی وقت اس کو عطا کر دی جائے لیکن مومن کو جنت میں اولاد کی خواہش ہی نہیں ہوگی۔

جنتیوں کے خدام اور ان کی بیویاں:

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت والے لوگوں کو کم از کم اسی ہزار خادم اور بہتر بیویاں حاصل ہوں گی۔

جنتی بیویوں کی شان: حدیث شریف میں ہے:

"یریٰ فخ سوقھن من وراء العظم واللحم من الحسن" (مشکوۃ باب صفة الجنة)

ان کے حسن و جمال کی وجہ سے ان کی پنڈلیوں (کی ہڈی) کا مغز ہڈی اور گوشت کے پیچھے نمایاں نظر آئے گا۔یعنی جنتی حوروں کو اس طرح لطافت اور حسن و جمال کامل طور پر حاصل ہوگا کہ ان سے انسان کے نفرت کرنے کا تصور بھی نہیں پایا جائے گا۔حسن میں صفائی، چمڑا نرم و نازک، تمام اعضاء میں لطافت اس طرح ہوگی کہ انسان دنیا میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پنڈلیوں کی ہڈی کے مغز کے سامنے ہڈی اور گوشت حجاب نہیں بن سکیں گے؛ کیونکہ ہڈی اور گوشت کو شیشے کی طرح صفائی اور چمک دمک حاصل ہوگی۔

جنتی حور کبھی ناراض نہیں ہوگی: حضرت علیؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک جنت

خوبصورت آنکھوں والی سفید رنگ والی بیویوں سے جمع ہونے کا مقام ہے۔

" یقلن نحن الخالدات فلا نبید ونحن الناعمات فلا نبأس ونحن الراضیات فلانسخط طوبیٰ لمن کان لنا وکنا له " (ترمذی ، مشکوٰۃ باب صفۃ الجنۃ)

وہ اپنے نغموں کی آواز بلند کریں گی وہ ایسی آواز ہوگی کسی نے اس سے پہلے ایسی آواز نہیں سنی ہوگی۔ وہ کہیں گی ہم ہمیشہ (زندہ) رہنے والی ہیں ہم کبھی ہلاک نہیں ہوں گی، ہمیں نعمتوں سے نوازا گیا ہے ہم کبھی محتاج نہیں ہوں گی۔ ہم راضی رہنے والی ہیں کبھی ناراض نہیں ہوں گی، کتنی خوش بختی کا مقام ہے اس شخص کے لئے جو ہمارا اور جس کی ہم ہیں۔

جنتی بیویاں پاکیزہ ہوں گی:

﴿ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾ (پ ۱/ ۳)

ان کے لئے ان باغوں میں صاف ستھری بیویاں ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یعنی وہ عورتیں خواہ حوریں ہوں یا دنیا کی عورتیں ہوں وہ تمام ہی ہر قسم کے ظاہری اور باطنی عیبوں اور گندگیوں سے بالکل پاک ہوں گی۔ یعنی حیض، نفاس، پیشاب، پاخانہ، منی، تھوک، میل اور ہر قسم کی بیماری وغیرہ سے بھی پاک ہوں گی اور بد خلقی، سخت زبانی، نافرمانی وغیرہ سے بھی ایک دم دور ہوں گی۔ ان کے چہرے کا نور آفتاب کی روشنی کو شرما دے گا۔

اللہ تعالیٰ نے بیویوں کا نعمتوں میں ذکر کیا کیونکہ انسان اپنی زوجہ کا مالک ہوتا ہے اس لئے زوجہ بھی عظیم نعمت ہے خیال رہے کہ جو عورت جس مسلمان کے نکاح میں مرے گی وہ جنت میں اسی کے ساتھ رہے گی اس لئے نبی کریم ﷺ کی بیویوں سے نکاح کرنا حرام تھا کیونکہ وہ جنت میں حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہیں۔

اور جس عورت کا شوہر کافر ہو کر مرا، یا جو کہ کنواری ہی مر گئی ان کا نکاح ان جنتیوں میں سے کسی سے کر دیا جائے گا، جو لوگ جنت کے بھرنے کے لئے اس وقت پیدا کئے جائیں گے۔ اور جس کی بیوی کافر ہو کر مری یا کنوارا ہی مر گیا اس کے نکاح میں صرف حوریں ہوگی۔

اور جس کی بیوی بھی مسلمان مرے وہ جنت میں اپنی اس بیوی کو بھی پائے گا اور حوروں کو بھی لیکن وہاں یہ دنیاوی بیویاں حسن و جمال میں حوروں سے کسی طرح کم نہیں ہوں گی۔

روایات میں آیا ہے کہ حضرت مریم (عیسیٰ کی والدہ) اور حضرت آسیہ (فرعون کی زوجہ) جنت میں نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں گی۔ (از تفسیر نعیمی)

جنتی بیویاں نگاہیں نیچے رکھیں گی:

﴿ فِيهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ☆ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ☆ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ☆ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ (پ ۲۷ الرحمن)

ان (جنتیوں) میں نیچی نگاہوں والی ہوں گی، جن کو نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ یہ تو گویا یاقوت اور مرجان ہیں۔ پس اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ان باغات میں جو محلات اور مکانات ان جنتیوں کے لئے بنائے گئے ان میں ایسی عورتیں ہوں گی جو شرم و حیا کا پیکر ہوں گی۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی۔ وہ اپنے شوہروں کے بغیر کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گی باشرم و باحیا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اتنی پاکدامن اور عفت مآب ہوں گی کہ آج تک انہیں کسی جن وانس نے چھوا تک نہ ہوگا۔

ان کے چہرے یاقوت کی طرح سرخ اور ان کے بدن مرجان کی طرح سفید اور شفاف ہوں گے۔ آپ ذرا غور فرمائیں ان کے ظاہری حسن و جمال اور اس کی سچی دلربائی اس کی پاک دامنی اور اس کی آنکھوں کا شرمیلا پن ہے۔

ع گھر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ نہ ہو تو وہ حضرۃ الدمن ہے۔ یعنی کوڑے کے ڈھیر پر اُگا ہوا سبزہ۔ اس کی طرف گدھے تو لپک کر جا سکتے ہیں اور اس کو اپنا تر نوالہ بنا کر زور سے ہینگ سکتے ہیں۔ لیکن ایک شریف النفس اور باذوق آدمی کو تو اس سے بدبو آئے گی، اس کی سڑاند سے اس کا دماغ پھٹنے لگے گا۔

دنیا میں بھی امت مصطفویہ کی بہو بیٹیوں کو عفت وحیا کے زیور سے آراستہ ہونا چاہیے۔(یہی ان کا حسن وجمال ہے) یہ قاصرات الطرف کون ہوں گی؟ وہ نیک بیویاں جو دنیا میں اللہ کے نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، وہی جنت میں ان کے محلات کی زینت بنیں گی۔ان کے علاوہ انہیں حوریں بھی دی جائیں گے۔ نیز وہ مسلمان عورتیں جو کسی کے نکاح میں نہ تھیں یا جن کے خاوند جہنم رسید کردیئے گئے ان کو بھی جنتی مردوں...... جو مخلوق اس وقت تخلیق ہوگی...... کے ساتھ بیاہ دیا جائے گا۔ یہی حال مومن جنوں اور باایمان جنیوں کے ساتھ ہوگا۔

علامہ قرطبیؒ مختلف اقوال لکھنے کے بعد فرماتے ہیں۔

" والذی یغلب علی الظن ان الانسی یعطی من الانسیات والحور والجنی یعطی من الجنیات والحور "

(تفسیر روح المعانی)

(غالب گمان یہی ہے کہ انسانوں کو انسان عورتیں اور حوریں دی جائیں گی اور جنوں کو جن عورتیں اور حوریں عطا ہوں گی)

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ دنیا کی بیویاں افضل ہوں گی یا جنت کی حوریں؟ حضور نے فرمایا''نساء دنیا افضل من الحور العین کفضل الظہارۃ علی البطانۃ ''یعنی دنیا کی عورتیں جنتی حوروں سے افضل ہونگی جس طرح ابری استر سے۔میں نے عرض کیا یارسول اللہ یہ کیسے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:''بصلواتھن و صیامھن و عبادتہن ''اپنی نمازوں، اپنے روزوں اور اپنی عبادات کے باعث وہ افضل ہوں گی۔ پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ ان کے چہروں کو نورانی بنادے گا۔ان کے جسم ریشم سے نرم۔ان کے چہرے سفید۔ان کے لباس سبز اور ان کے زیورات سونے کی طرح زرد۔ان کی انگوٹھیاں موتیوں کی اور ان کنگنیاں سونے کی ہوں گی۔

(تفسیر ضیاء القرآن)

جنتی بیویاں پردہ دار ہوں گی:

○ فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ☆ فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ☆ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ ☆ فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ○

(پ ۲۷، الرحمن)

ان (جنتیوں) میں اچھی سیرت والیاں، اچھی صورت والیاں ہوں گی۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ یہ حوریں پردہ دار خیموں میں ہوں گی۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

﴿ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ☆ فَبِاَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾

ان کو اب تک نہ کسی انسان نے چھوا ہو اور نہ کسی جن نے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

یعنی ان سرسبز و شاداب باغوں میں ایسی عورتیں ہوں گی جو اخلاق کے اعتبار سے بھی بے مثال اور حسن و جمال میں بھی بے نظیر "خیرات الاخلاق حسان الوجوه" یعنی جن کے اخلاق بہترین اور چہرے خوبصورت ہوں گے۔

حور جمع ہے اسکا واحد حوراء ہے "هی الشدیدة بیاض العین والشدیدة سوادها" یعنی جس کی آنکھ کا سیاہ حصہ بہت زیادہ سیاہ ہو اور سفید حصہ بہت ہی زیادہ سفید ہو۔ مقصورات فی الخیام فرما کر ان کے باحیاء اور باشرم ہونے کا ذکر فرمادیا کہ وہ آوارہ پھرنے والیاں نہیں بلکہ اپنے اپنے خیموں میں جلوہ افروز رہتی ہیں ان کے ظاہری اور باطنی حسن و جمال سے ان کے خیموں کا گوشہ گوشہ معطر اور منور ہے۔ ان کے گھر کی فضا خوشی اور مسرت سے معمور رہتی ہے۔

جنتی بیویاں موٹی آنکھوں والی ہوں گی:

﴿وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴾ (پ ۲۷ الطور) انہیں بیاہ دیا بڑی آنکھوں والی حوروں سے

خیال رہے کہ یہ دنیا کے نکاح کی طرح نکاح نہیں ہوگا۔ کیونکہ دار تکلیف دنیا ہی ہے۔

"بل بمعنی تصییر هم زوجین ای صیرناهم کذالک بسبب حوز عین" (روح المعانی)

بلکہ ان کو زوجہ عطا کردی جائیں گی۔ ان کو جب عطا ہوں گی تو وہ جنتی بیویوں والے ہوجائیں گے۔ ان کو ازواج کا عطا کرنا گویا کہ ان کے ساتھ بیاہ ہوگا۔

ایمان والی اولاد کو جنت میں ماں باپ سے ملا دیا جائے گا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ (پ ۲۷ / الطور)

اور جولوگ ایمان لائے اور ان کی پیروی کی ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ہم ملا دیں گے ان کے ساتھ ان کی اولاد کو۔

ایک مزید انعام کا ذکر ہو رہا ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کو سرفراز فرمائے گا۔ اگر ان کی اولاد باایمان اس دنیا سے رخصت ہوئی ہے تو جنت میں وہ اپنے والدین کے ساتھ ملا دیا جائے گی اگرچہ ان کے اعمال زیادہ اچھے نہ ہوں۔

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ الرعد آیت نمبر۲۳ اور سورۃ نمبر۸ میں بھی گذر چکا ہے کہ مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کے والدین، ان کی بیویاں اور ان کی اولاد کو ان کے طفیل مقامات رفیعہ پر فائز کر دیا جائے گا لیکن وہاں ماں۔ باپ کے نیک اور صالح ہونے کی قید ہے اور یہاں صرف ایمان کی شرط ذکر کی گئی ہے نیز پہلی دو آیتوں میں جنت عدن میں داخل ہونے کا ذکر تھا، یہاں فرمایا کہ ہم ان کو ان کے متقی والدین کے ساتھ ملا دیں گے۔ وہ انہیں کے پاس ان کے مقامات رفیعہ میں ہمارے لطف واحسان سے محفوظ ہوتے رہیں گے۔ اپنے بچوں کو اپنے پاس یوں خوش وخرم دیکھ کر ہمارے پیارے بندوں کی آنکھیں ٹھنڈی اور دل مسرور ہوں گے۔

عن ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ عزوجل لیرفع ذریۃ المؤمن معہ فی درجۃ فی الجنۃ وان کان لم یبلغھا لتقربھم عینہ ثم قرء ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ الآیۃ ﴾ (تفسیر قرطبی)

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل مومن کی اولاد کو بھی جنت میں اس کا درجہ عطا فرمائے گا۔ اگرچہ وہ اپنے عمل کے ذریعہ وہاں رہنے کا مستحق نہ ہو۔ یہ اس لئے تاکہ انہیں اس مقام پر فائز دیکھ کر اس نیک بندے کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ پھر حضور نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

" فیجمع اللہ بھم انواع السرور بسعادتھم فی انفسھم و بمزاوجۃ الحور العین وبموانسۃ الاخوان المؤمنین وباجتماع اولادھم وسلھم بھم" (تفسیر کشاف)

والدین کے مرتبہ کو کم کر کے اولاد کے ساتھ نہیں ملا دیا جائے گا اگرچہ اولاد کا مرتبہ کم ہی کیوں نہ

بلکہ اولاد کو والدین کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ کیونکہ عمل کم کرنا ظلم کے مترادف ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں۔ لیکن کسی کے عملوں کی کمی کے باوجود اسے بلند عطا کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوگا وہ اپنے فضل سے جسے چاہئے نواز دے یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔ لیکن تمام لوگوں کو ان کے اعمال کے بغیر کسی کمی کے پوری پوری جزاء عطا فرمائے گا۔

جنتی بیویاں شتر مرغ کے انڈے کی طرح ہوں گی:

﴿ وَعِندَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ☆ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ (پ۲۳/ ۲)

اور ان کے پاس ہیں جو شوہروں کے سوا دوسری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گی۔ بڑی آنکھوں والی گویا وہ انڈے ہیں پوشیدہ رکھے ہوئے۔

قصرات الطرف ،جھکی ہوئی نگاہوں والیاں جو اپنے شوہروں کے بغیر کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہی نہیں باشرم و باحیاء۔ عین جمع عیناء کی۔ موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں والیاں۔ جن کی آنکھوں کا سیاہ حصہ بہت سیاہ اور سفید حصہ نہایت سفید۔ بیض ،انڈا خصوصاً شتر مرغ کا انڈا اس میں سفید اور زرد رنگ کی آمیزش بڑی لطیف ہوتی ہے۔ عربی لوگ عورتوں کے اس رنگ کو بہت پسند کرتے تھے۔ (از ضیاء القرآن)

معلوم ہوا کہ جنت میں پردہ ہوگا۔ کوئی عورت اجنبی مرد کو نہیں دیکھے گی۔ متقی پرہیز گار سے بھی پردہ ہے کہ جنت میں سارے متقی ہوں گے۔ مگر جنتی عورتیں حوریں ان سے بھی پردہ کریں گی، جن گھروں میں آج پردہ ہے وہ جنتی گھر ہیں اور جہاں بے پردگی، بے حیائی ہے وہ دوزخی گھر ہیں۔
(تفسیر نور العرفان)

جنتی بیویاں موتیوں کی طرح ہوں گی:

﴿ وَحُوْرٌ عِيْنٌ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴾ (پ۲۷/ ۱۴)

اور حوریں خوبصورت آنکھوں والیاں (سچے) موتیوں کی مانند جو چھپا رکھے ہوں۔

حوروں کو موتیوں سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی وہ موتی جو سیپ میں ہو یا ڈبیہ میں بند کر کے رکھا ہوا ہو

وہ ہاتھوں سے محفوظ رہتا ہے اور تغیر و تبدل سے بچا رہتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

" صفاؤ ھن کصفاء الدر الذی لاتمسه الایدی " (تفسیر روح المعانی)

ان (جنتی حوروں کے رنگ اور جسم) کی صفائی ایسے ہوگی جیسے اس موتی کی صفائی ہوتی ہے جس کو ہاتھوں نے نہ چھوا ہو۔ اہل عرب اکثر طور پر حسین چیز کو موتیوں سے تشبیہ دیتے ہیں

جنتی عورتیں جوان ہوں گی:

﴿ اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰاهُنَّ اَبْكَارًا ☆ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴾ (پ۲۷ / ۱۴)

ہم نے پیدا کیا ان کی بیویوں کو حیرت انگیز طریقہ سے، پس ہم نے بنا دیا انہیں کنواریاں (دل و جان سے) پیار کرنے والیاں ہم عمر۔

اہل جنت کی نیک بیویاں جب جنت میں داخل ہوں گی تو ان کی خلقت بالکل بدلی ہوئی ہوگی اگر چہ دنیا میں وہ خوش شکل نہ تھیں، مرتے وقت وہ بالکل بوڑھی تھیں، لیکن جنت میں داخل ہوں گی تو بھر پور جوانی ہوگی۔ مجسم حسن و رعنائی ہوں گی اور کنواری بنا کر انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا حدیث شریف میں اس آیت کی یہی تفسیر مذکور ہے۔

حضرت ام سلمہؓ کے عرض کرنے پر حضور ﷺ نے فرمایا:

" یا ام سلمة ھن اللواتی قبضن فی الدنیا عجائز شمطا عمشا رمصا جعلھن اللہ بعد الکبر اترابا علی میلاد واحد فی الاستواء "

اے ام سلمہ ان سے مراد وہی بیویاں ہیں۔ اگر چہ وفات کے وقت بالکل بوڑھی تھیں، ان کے بال سفید تھے۔ ان کی بینائی کمزور تھی، آنکھیں میلی کچیلی رہتی تھیں لیکن جب وہ جنت میں داخل ہوں گی۔ تو ساری ہم عمر ہوں گی۔

عُرُب اس کا واحد عروب ہے، علامہ قرطبی کہتے ہیں "فالعروب تبین محبتھا لزوجھا بشکل و عنج و حسن کلام " یعنی وہ عورت جو ناز و ادا اور خوش گفتاری سے اپنی محبت کا اظہار اپنے خاوند سے کرے۔

یہ عورت کی ایسی صفت ہے جس میں اس کو نسوانیت کی ساری خوبیاں سمٹ آتی ہیں، حسین وجمیل بھی ہو، ناز وادا والی بھی ہو، خوش گفتاری بھی ہو، ہنس مکھ بھی اور اپنے خاوند کو دل سے چاہنے والی بھی ہو اور اپنے چاہت کو چھپانے والی نہ ہو بلکہ اس کا اظہار کرنے والی ہو۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اتــرابــا: ہم عمر ہوں گی یعنی تمام کی عمریں ایک جیسی تیس اور تینتیس سال کے درمیان ہوں گی کامل جوانی ہوگی۔ اپنے شوہروں سے کامل محبت کرنے والی ہوں گی۔

خدام اور چھلکتے جام:

﴿ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ ......تا ...... اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا﴾ (پ۲۹ / ۱۹)

اور گردش میں ہوں گے ان کے سامنے چاندی کے ظروف اور شیشہ کے چمکدار گلاس اور شیشے بھی وہ چاندی کی قسم سے ہوں گے۔ ساقیوں (پلانے والے) نے انہیں پورے اندازہ سے بھرا ہوگا۔ اور انہیں پلائے جائیں گے۔ وہاں (ایسی شراب کے) جام جس میں زنجبیل (سونٹھ) کی آمیزش ہوگی۔

...... یہ زنجبیل جنت میں ایک چشمہ ہے جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے ......اور چکر لگاتے رہیں گے ان کی خدمت میں ایسے بچے جو ایک ہی حالت پر رہیں گے۔ جب تو انہیں دیکھے تو یوں سمجھے گویا یہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں۔

آنیة : جمع ہے انساء کی ظرف، برتن۔ اکواب، کوب کی جمع ہے وہ پیالہ یا پیالی جس کے ساتھ کنڈا نہ ہو۔

کانت قواریرا ، قواریرا من فضة :

حضرت ابن عباسؓ نے اس کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

" آنية من فضة صفاء ها كصفاء القوارير ."

یعنی یہ سارے برتن چاندی کے بنے ہوں گے لیکن ان میں چمک اتنی زیادہ ہوگی کہ خیال گزرے گا کہ شیشہ اور بلور ڈھال کر انہیں بنایا گیا ہے۔

ساقی گری کی خدمت پر جو خدام مقرر ہوں گے وہ بھی بڑے سلیقہ شعار اور ادا شناس ہوں گے۔

صراحی سے جام میں اتنی مقدار میں شراب انڈیلیں گے جتنی پینے والا چاہے گا، جتنی اس کی خواہش ہوگی اناڑی نہ ہوں گے۔ جس کو چند گھونٹ کی خواہش ہو اسے چھلکتا گلاس دے دیں اور جو زیادہ پینا چاہتا ہو اسے چند قطروں پر ٹرخادیں۔ جن کی دلداری اور عزت افزائی مقصود ہے وہ ان کی خواہش کا پورا پورا احترام کریں گے۔

انہیں ایسی شراب دی جائے گی جس میں زنجبیل (سونٹھ) کی ملاوٹ ہوگی۔ ساتھ ہی بتادیا کہ یہ بھی جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے اور اسی کو سلسبیل بھی کہا جاتا ہے۔ اہل عرب شراب میں سونٹھ ملا کر پیتے تھے۔ انہی کا پسند خاطر نام ذکر فرمادیا اور بتادیا کہ جنت میں ایک چشمہ اسی نام کا جاری ہے جس میں سونٹھ کی بُو تو ہوگی لیکن اس کے ذائقہ کی تلخی نہ ہوگی۔

خدام لڑکے ہر وقت ان کی خدمت بجالانے کے لئے اور ان کے احکام کی تعمیل کے لئے ان کے آگے پیچھے پھرتی سے دوڑ رہے ہوں گے۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شکل وصورت اور ان کے رنگ روپ میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور جب وہ جنت کے مرغزاروں اہل جنت کی خدمت کیلئے ادھر ادھر بھاگے پھر رہے ہوں گے تو یوں معلوم ہوگا کہ کوئی موتیوں کی لڑی ٹوٹ گئی ہے اور اس کے تابندہ اور رنگ رنگیلے موتی ادھر اُدھر لڑھکتے چلے جارہے ہیں۔ (از ضیاء القرآن)

جنتی شراب پاکیزہ، نشہ سے پاک:

﴿يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ☆ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ☆ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ﴾ (پ ۲۳/ ۶)

ان پر (پاکیزہ شراب) کے چھلکتے جام کو پھرایا جائے گا۔ سفید رنگ، پینے والوں کو لذت حاصل ہوگی۔ نہ اس میں نشہ ہوگا اور نہ ہی سر کو چکر آئیں گے۔

کأس اس پیالہ کو کہتے ہیں جس میں شراب موجود ہو۔ خواہ دنیا کی شراب یا جنت کی۔ خالی پیالہ کو قدح کہتے ہیں۔ معین کا معنی ہے جاری ہونا جس طرح جاری پانی کو عان الماء کہہ لیا جاتا ہے۔ یعنی پیالے بھرے ہوں گے، چھلک رہے ہوں گے۔

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں'' ان خمرا لجنة اشد بیاضامن اللبن '' بیشک جنت کا شراب دودھ سے بھی زیادہ سفید ہوگا ''لا تغول عقولھم من السکر '' جنتی شراب میں نشہ نہیں ہوگا کہ اس سے عقل زائل ہو جائے ''لیس فیھا نتن ولا کراھیة کخمر الدنیا '' دنیا کے شراب کی طرح نشہ اس میں بدبو اور کراہیت نہیں پائی جائے گی۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں'' فی الخمر اربع خصال السکر والصداع والقیء و البول فنزه اللّٰہ تعالیٰ خمرالجنة عنھا '' دنیا کے شراب میں چار صفات ہیں۔ نشہ، سر کا چکرانا، قے آنا اور اس سے پیشاب آنا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جنت کے شراب کو ان تمام سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

یادرہے جنت میں پیشاب نہیں آئے گا۔ (تفصیل ان شاءاللہ عنقریب ذکر ہوگی)

جنتی شراب کافور کی طرح ہوگا:

﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُھَا کَافُوْرًا ☆ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِھَا عِبَادُ اللّٰہِ یُفَجِّرُوْنَھَا تَفْجِیْرًا ﴾ (پ۲۹/ ۱۹)

بے شک نیک لوگ پئیں گے (شراب کے) ایسے جام جن میں آبِ کافور کی آمیزش ہوگی۔ (کافور) ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے (وہ) خاص بندے پئیں اور جہاں چاہیں گے اسے بہا کر لے جائیں گے۔

یعنی جب اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جنت میں اپنے اپنے مقامات پر تشریف فرما ہوں گے تو ان کو پاکیزہ شراب کے پیالے بھر بھر کر پیش کیے جائیں گے جن میں چشمہ کافور کا پانی جب ٹھنڈک اور رنگ میں کافور کی طرح ہوگا۔ اسی طرح وہ شراب بھی کافور کی طرح سفید اور چمکدار اور نہایت لذیذ اور ٹھنڈی ہوگی۔

جنت والوں کو جب پانی کی ضرورت ہوگی تو ان کی خواہش کے مطابق پانی خود بخود ادھر بہنا شروع ہو جائے گا۔ جدھر وہ اشارہ کریں گے۔ یعنی انہیں پانی حاصل کرنے میں کوئی مشقت نہیں اٹھانی

پڑے گی۔

تنبیہ: سابقین اور مقربین کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے نیچے سے شراب طہور کے بھرے ہوئے پیالے بلا واسطہ پلائے گا۔ درمیانی درجے والوں کو فرشتے پلائیں گے۔ اور عام لوگوں کے ساقی غلمان ہوں گے۔ جب وہ بہشت کے شراب کو پئیں گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں مست ہو جائیں گے۔ پردوں کو الٹ دیں گے۔ بے چون و چگوں و بے جہت حق تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ الٰہی! ہمیں بھی یہ نعمتیں عطا فرما اور اپنے کرم سے مقربین میں داخل فرما۔ آمین (تفسیر جرخی، ضیاء القرآن سورہ الدھر)

جنتی حضرات پاکیزہ خوش طبعی کریں گے

﴿ يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ☆ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ﴾ (پ ۲۷ / ۳)

وہ چھینا جھپٹی کریں گے وہاں جام شراب پر (لیکن) اس میں نہ کوئی لغویت ہوگی اور نہ گناہ اور (خدمت بجالانے کے لئے) چکر لگاتے ہوں گے ان کے گرد۔ ان کے غلام (اپنے حسن کے باعث) یوں معلوم ہوں گے گویا وہ چھپے موتی ہیں۔

جنت میں منعقد ہونے والی مجلس نشاط و سرور کی کتنی عمدہ تصویر کشی کی گئی۔ اہل جنت جب اپنی مجلس نشاط سجائیں گے۔ مہوش ساقی بلوریں جاموں (چاند کی صورت والے پلانے والے شیشے کی طرح چمکتے ہوئے پیالوں) میں شراب طہور (پاکیزہ) ڈال کر پیش کریں گے اور چھلکتے ہوئے جام کب گردش میں آئیں گے تو انس و محبت اور بے تکلفی کے عالم میں وہ ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کریں گے۔ یہ اس کے ہاتھوں سے جام چھینے گا اور وہ اس سے اچکنے کی کوشش کرے گا یہ سب کچھ ازراہِ ملاعبت و ملاطفت ہوگا۔ لیکن کیف و سرور کے اس عالم میں بھی وہ بے ہودہ گوئی اور ہرزہ سرائی کے قریب تک نہیں جائیں گے۔ کوئی ناشائستہ حرکت اور گناہ اس وقت بھی ان سے صادر نہیں ہوگا۔

علامہ آلوسی نے بڑے پیارے انداز سے یتنازعون کی تفسیر لکھی ہے:

"ای یتجاذبونها فی الجنة هم و جلساء هم تجاذب ملاعبة کما یفعل ذالک الندامی بینهم فی الدنیا بشدة سرورهم" (تفسیر روح المعانی)

یعنی وہ لوگ اپنے ندیموں (ہمنشینوں) سے از راہ ملاعبت وملاطفت پیالے چھینیں گے۔ جس طرح اس دنیا میں مے خواری کے وقت مے خوار کرتے ہیں۔

دیگر آسائشوں کے علاوہ اہل جنت کو خدمت گار بھی مہیا کیے جائیں گے جو ہر وقت ان کے اردگرد گھومتے رہیں گے تاکہ ان کے ہر اشارہ ابرو کی فوراً تعمیل کر سکیں۔ وہ خدمت گزار دنیا کے خدام کی طرح بد وضع، غلیظ اور اکھڑ مزاج نہیں ہوں گے۔ بلکہ بہت خوبصورت اور صاف ستھرے ہوں گے۔ یوں محسوس ہوگا کہ وہ آبدار موتی ہیں جو اب تک آغوش صدف میں مستور ہے اور ابھی ابھی باہر نکلے ہیں۔

(از تفسیر ضیاء القرآن)

جنتی لوگوں کو پھل عطا کیے جانا:

﴿ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ﴾

(پ ۱/ ۳)

جب انہیں ان باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا (صورت دیکھ کر) کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا۔ یعنی جنت میں جب لوگوں کو پھل دیئے جائیں گے تو وہ شکل میں اور نام میں دنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے تو جنتی لوگ بہت تعجب سے یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم قدرت ہے کہ اس نے ہمیں یہاں بھی دنیا کے پھلوں کی طرح پھل عطا کر دیئے۔ لیکن جنتی لوگوں کے گمان میں یہ ہوگا کہ شائد ذائقہ اور لذت میں بھی ان پھلوں کی طرح ہی ہوں گے لیکن حقیقت میں وہ ان سے بہت ہی زیادہ لذیذ اور مزہ دار ہوں گے جس کی کیفیت کو بیان کرنا ممکن نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "**ليس في الجنة من اطعمة الدنيا الا الاسماء**"

(بیہقی، روح المعانی)

جنت میں دنیا کے کھانوں کا صرف نام ہی ہوگا۔ یعنی صرف شکل اور نام میں مشابہت ہوگی ورنہ وہ بہت ہی عمدہ ہوں گے۔ اسی طرح جب جنت میں دوبارہ ان کو پہلے کھائے ہوئے پھل کی خواہش ہوگی تو دوبارہ جب وہ حاصل کریں گے تو کہیں گے یہ وہ ہی پھل ہے جو ہم نے ابھی پہلے کھایا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جتنی مرتبہ ان کو ایک ہی پھل ملے گا اتنی مرتبہ ہی اس کا ذائقہ پہلے سے مختلف ہوگا

اس طرح ان کے تعجب میں اور اضافہ ہوگا کہ ہم تو سمجھ رہے تھے یہ وہی پھل ہے لیکن اس کا ذائقہ تو اور ہی نرالا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی:

والذی نفس محمد بیدہ ان الرجل من اھل الجنۃ یتناول الثمرۃ لیأ کلھا فما ھی واصلۃ الیٰ فیہ حتی یبدل اللہ تعالیٰ مکانھا مثلھا'' (تفسیر روح المعانی)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے بیشک جنتی آدمی جب ایک مرتبہ کھانے کے لئے پھل حاصل کرے گا تو جب ایک مرتبہ وہ پھل اس کے منہ میں پہنچیں گے تو اللہ تعالیٰ (ان درختوں کے ساتھ ہی) ان کی جگہ اور پھل لگا دے گا۔ یعنی اگرچہ شکل تو پہلے والوں کی ہوگی لیکن ذائقہ اور ہی عجیب ہوگا۔

خیال رہے کہ دو قول بنانے کے بجائے یہ تفسیر زیادہ مناسب ہے کہ پہلی مرتبہ پھل دیکھ کر سمجھیں گے یہ دنیا کے پھلوں کی طرح ہیں اور پھر سمجھیں گے کہ یہ تو ابھی جنت میں پہلے حاصل ہو چکے ہیں۔

(تفسیر روح المعانی)

﴿ھذا الذی رزقنا من قبل﴾ کی تفسیر میں ایک جگہ تحریر ہے''وھو المرزوق فی الدارین'' یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں دنیا اور جنت میں دیا جا چکا ہے۔ دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔''ان المراد من المرزوق فی الدنیا والآخرۃ'' بیشک ان کا یہ کہنا کہ یہ تو ہمیں پہلے بھی دیا گیا۔ اس سے مراد جو رزق دنیا میں اور پھر آخرت (جنت) میں ہمیں دیا گیا۔

پھل بہت ہوں گے ان میں کوئی کمی نہیں ہوگی:

﴿ یُطَافُ عَلَیۡهِمۡ بِصِحَافٍ ...... تا ...... مِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ﴾ (پ ۲۵ / ۱۳)

ان پر سونے کے پیالے اور جام پھرائے جائیں گے۔ اور اس میں جو جی چاہئے اور جس سے آنکھ کو لذت پہنچے اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے اور یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث کئے گئے (مالک بنائے گئے ہو) اپنے اعمال سے تمہارے لئے اس میں بہت میوے ہیں کہ ان میں سے کھاؤ۔

یعنی درخت ثمردار (پھل دار) سدا بہار ہیں ان کی زیب وزینت میں فرق نہیں آتا۔ حدیث

شریف میں ہے کہ اگر کوئی ان سے ایک پھل لے گا تو درخت میں اس کی جگہ دو پھل نمودار ہو جائیں گے

خالص لذیذ خواہش کے مطابق پھل دیئے جائیں گے:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّعُیُوْنٍ ☆ وَفَوَاكِهَ مِمَّا یَشْتَهُوْنَ ☆ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (پ۲۹ / ۲۲)

بیشک متقی لوگ سایوں اور چشموں میں ہیں۔ اور میووں میں جو ان کا جی چاہے۔ (حکم ہوگا) کھاؤ اور پیو دل بھاتا۔

هنیئا : لذیذ خالص جس میں ذرا بھی نقص کا شائبہ نہ ہو جو دل میں رچے دل کو بھائے۔

اہل جنت ہر قسم کی آسائش اور ناز نعمت میں آرام کریں گے۔ ان کو ان کی مرضی، خواہش کے مطابق نعمتیں عطا کی جائیں گی۔ دنیا کی طرح نہیں کہ کبھی کوئی نعمت حاصل ہونے کی تمنا ہو تو وہ میسر نہ ہو

خیال رہے کہ یہاں متقین سے مراد مومن لوگ ہیں۔ ان المتقین من الکفر والتکذیب لوقوعه فی مقابلة المکذبین بیوم الدین فیشمل عصاة المؤمنین . (روح المعانی)

یہ نعمتیں ان لوگوں کو حاصل ہوں گی جو کفر اور قیامت کو جھٹلانے سے ڈرتے رہے کیونکہ اس مقام پر قیامت کے جھٹلانے والوں کے عذاب کے مدمقابل ذکر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ نعمتیں ان گناہگار مومنوں کو بھی حاصل رہیں گی جن کو پہلے ہی اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یا انبیاء کرام کی شفاعت سے جنت میں داخل فرما دے گا اسی طرح صلحاء شہداء کی شفاعت سے کسی کو جنت میں داخل کر دیا جائے۔ وہ گناہگار جو جہنم میں اپنے گناہوں کی سزا کاٹ کر جنت میں داخل ہوں گے ان کو بھی جنت میں تمام نعمتیں حاصل ہوں گی۔

جنتی لوگوں کے قریب پھل خود ہی آئیں گے

﴿ وَدَانِیَةً عَلَیْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِیْلًا ﴾ (پ۲۹ / ۱۹)

اور اس (بہشتی درختوں) کے سائے ان پر جھکے ہوں گے اور اس کے گچھے جھکا کر نیچے کر دیئے ہوں گے۔ یعنی جنتی لوگ جب بھی کسی پھل کی خواہش کریں گے تو ان کو وہی پھل جس کی انہوں

نے خواہش کی ہوگی درخت خود ان کے قریب ہو کر ان کو عطا کرے گا۔ اگرچہ تمام پھل ہر وقت قریب ہوں گے۔ کسی کی طلب کے لئے ادھر ادھر بھاگ دوڑ، تلاش کرنے کی ضرورت نہیں آئے گی۔ کہ درختوں پر چڑھ کر ان کے پھل کو توڑا جائے۔

" ای سخرت ثمارها لمتنا ولها ان کان الانسان قائما تناول الثمر دون کلفة وان کان قاعدا او مضطجعا ولا یرد الید عنها بعد ولا شوک " (المختصر من روح المعانی)

یعنی ان کے پھلوں کو حاصل کرنے والوں کے تابع کر دیا جائے گا۔ کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں یا لیٹے ہوں ہر حال میں بغیر کسی مشقت کے پھل حاصل کر لیں گے۔ ان کے ہاتھ پھلوں سے دور نہیں رہیں گے۔ اور درختوں میں کسی قسم کے کانٹے نہیں ہوں گے جو توڑنے والوں کے لئے رکاوٹ کا سبب بنیں۔

پھل اور پرندوں کا گوشت:

﴿ وَفَاكِهَةٍ مِمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ☆ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴾ (پ ۲۷ / ۱۴)

اور میوے جو پسند کریں۔ اور پرندوں کا گوشت جو چاہیں۔

یعنی ہر قسم کا پھل وہاں میسر ہوگا۔ انسان جو چاہے گا وہی اعلیٰ اور افضل حالت میں ان کو حاصل ہو جائے گا۔ اور پرندوں کا گوشت بھی حاصل ہو جائے گا۔

" ان الرجل من اهل الجنة یشتهی الطیر من طیور الجنة فیقع فی یده مقلیا نضجا " (روح المعانی)

بے شک جنتی انسان جب پرندوں کے گوشت کی خواہش کرے گا تو جنتی پرندے اس کے ہاتھ میں خود بخود بھونے ہوئے آجائیں گے۔ لیکن خیال رہے جنت کا تمام نظام دنیا کے نظام سے علیحدہ اور عجیب تر ہے۔ پرندوں کا بھونا ہوا دنیا کے پرندوں کے بھونے کی طرح نہیں ہوگا اور وہ کھائے جانے سے ختم نہیں ہوں گے۔

حضرت میمونہؓ سے مروی ہے:

" ان الرجل یشتهی الطیر فی الجنة فیجیء مثل البختی حتی یقع علی خوانه لم یصبه دخان ولم تمسه نار فیاکل منه حتی یشبع ثم یطیر الی غیر ذالک " (تفسیر روح المعانی)

انسان جنت میں جب پرندوں کے گوشت کی خواہش کرے گا تو وہ خود بخود سفید بُختی اونٹوں

کی طرح اس کے دستر خوان پر آ جائیں گے۔(اگر چہ بھونے ہوئے ہوں گے)لیکن ان کو دھوئیں اور آگ نے چھوا تک نہیں ہوگا۔ یہ اس سے سیر ہو کر کھالیں گے پھر وہ اڑ کر دوسرے آدمی کی طرف چلے جائیں جو ان کی خواہش رکھتا ہوگا۔

نیک لوگ باغات میں اور عذاب سے محفوظ:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِیْمٍ ☆ فٰكِهِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ﴾ (پ۲۷/۳)

بے شک پرہیز گار باغوں اور چین میں ہیں اور اپنے رب کی عطاء پر خوش ہوں گے۔اور انہیں ان کے رب نے آگ کے عذاب سے بچالیا۔

یعنی نیک لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے عذاب سے نجات عطا فرمائے گا کیونکہ انسان کے اعمال میں اتنے عیوب اور کوتاہیاں پائی جاتی ہیں کہ(اگر عدل کی بات ہو تو کئی طریقے سے نیک لوگوں کا گرفت میں آنا بھی ہوسکتا ہے۔لیکن صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے عذاب سے محفوظ ہوں گے اور باغوں کی سیر کر کے اور نعمتوں کے حصول سے خوش ہوں گے۔

نیک لوگ باغات اور نہروں میں:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ☆ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴾ (پ۲۷/۱۰)

بے شک پرہیز گار باغوں اور نہر میں۔ سچ کی مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے حضور۔یعنی اللہ کے مقبول بندے جنتوں میں ابدی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے میٹھے پانی،شراب طہور، صاف مصفی شہد اور تازہ دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوں گی۔اواخر آیات کی رعایت کرتے ہوئے لفظ واحد ذکر کیا گیا۔(نہر)لیکن مراد انہار ہی ہے۔(اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں نہر ذکر کیا ہے لیکن اس سے مراد بھی ہر نہر ہی ہے مقصد آپ کا بھی نہریں ہی ہے)

حضرت امام جعفر صادقؓ فرماتے ہیں:

"مدح المکان بالصدق فلا یقعد فیه الا اهل الصدق"

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو صفت صدق سے موصوف فرمایا ہے اس لئے کہ وہاں اہل صدق کو ہی

بیٹھنے کی جگہ ملے گی۔

بانه یبیح عزوجل لهم النظر الی وجهه الکریم۔ (روح المعانی)

یہ وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کے ساتھ جو وعدے فرمائے ہیں وہ پورے فرمائے گا۔ اس وقت ان عاشقان دلفگار کو اذن عام ہوگا کہ اے آتش عشق میں جلنے والو، اے شوق دیدار میں ماہی بے آب کی طرح عمر بھر تڑپنے والو، محبوب ازل اپنے رخ زیبا سے پردہ اٹھارہا ہے، آنکھیں اٹھاؤ اور سیر ہوکر شاہد رعنا کا دیدار کرلو۔ (از ضیاء القرآن)

جنتی لوگ بول و براز وغیرہ سے محفوظ:

حضرت جابرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اہل جنت اس میں (جنت میں) کھائیں گے، پئیں گے'' ولایتفلون، ولایبولون، ولا یتغوطون ولا یمتخطون ''انہیں تھوک نہیں آئے گی، پیشاب نہیں آئے گا، پاخانہ نہیں آئے گا۔ ناک نہیں بہے گا، کھنکھار وغیرہ نہیں آئے گا، صحابہ کرام نے عرض کیا اس کے کھانے کا کیا حال ہوگا؟

آپ نے فرمایا:

'' جشاء ورشح کرشح المسک یلهون التسبیح اولتحمید کما تلهون النفس ''

(مسلم، مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ)

وہ ڈکار سے ہضم ہوگا اور پسینہ سے وہ پسینہ کستوری کی طرح خوشبودار ہوگا۔ تسبیح وتحمید ان کو ایسے الہام کی جائے گی جس طرح سانس الہام کیا جاتا ہے۔

یعنی جنت میں انسان ہر اس چیز سے محفوظ رہے گا جو دنیا میں ناپسندیدہ ہے۔ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا انسان جنت میں بول و براز وغیرہ سے بچا ہوگا تو صحابہ کرام نے از روئے تعجب عرض کیا کہ وہ کھانا، پینا کہاں جائے گا۔ آپ نے فرمایا ڈکار اور پسینہ سے ختم ہو جائے گا۔ لیکن وہ ڈکار اور پسینہ دنیا سے مختلف ہوگا۔ ''فجشاء الجنة لا یکون مکروها بخلاف جشاء الدنیا'' دنیا کا ڈکار ناپسندیدہ ہے لیکن جنتی ڈکار میں بھی خوشبو اور حسن ہوگا۔ اور دنیا کا پسینہ بدبودار ہوتا ہے لیکن جنت کا پسینہ کستوری سے بھی زیادہ خوشبودار ہوگا۔'' والاظهر ان الاکل یتقلب جشاء والشرب یعود رشحا'' ظاہر یہی ہے کہ کھانے کی اشیاء ڈکار سے ہضم ہو جائیں گے اور پینے کی پسینہ کی شکل میں

مترشح ہوکر۔

الہام: القاء الشیء فی الروع ۔انسان کے نفس میں کسی چیز کا القاء کرنا۔یعنی مطلب یہ ہے کہ انسان کو جس طرح سانس لینے میں تھکاوٹ اور دشواری نہیں ہوتی اسی طرح تسبیح وتحمید بھی بغیر تھکاوٹ اور دشواری کے اسے حاصل رہیں گے بلکہ جس طرح سانس انسان سے کسی وقت مکمل رابطہ توڑتا نہیں اسی طرح جنت میں انسان سے تسبیح وتحمید کا ذکر کبھی ختم نہیں ہوگا۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جنتی لوگوں کا لباس اور سونے کے کنگن

﴿ جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا یُحَلَّوۡنَ ...... تا ...... وَلَا یَمَسُّنَا فِیۡهَا لُغُوۡبٌ ﴾ (پ۲۲/۱۶)

جنات عدن (بسنے کے باغوں) میں داخل ہوں گے ان میں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہے۔اور کہیں گے سب خوبیاں اللہ کو جس نے ہمارا غم دور کیا، بیشک ہمارا رب بخشنے والا اقدر فرمانے والا ہے۔وہ جس نے ہمیں آرام کی جگہ اتارا اپنے فضل سے، ہمیں اس میں نہ کوئی تکلیف پہنچے نہ ہمیں اس میں کوئی تھکان لاحق ہو۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کریم کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا:

"ان علیھم الیتجان انی ادنی لؤلؤۃ منھا لتضیٔ ما بین المشرق والمغرب"

بیشک ان (جنتیوں) کو تاج پہنائے جائیں گے جن کا ادنی (سب سے کم درجہ) موتی اتنی چمک رکھتا ہوگا۔کہ وہ مشرق ومغرب کے درمیان تمام جگہ کو روشن کردے اور اسی طرح کنگن سونے اور موتی سے بنائے جائیں گے " یرصع الذھب باللؤلؤ کمایرصع ببعض الاحجار" سونے کے کنگنوں پر موتیوں کا جڑاؤ ہوگا جیسے کئی پتھری ہیروں کے جڑاؤ سے سونے کو مزین کیا جاتا ہے۔جنتیوں کا لباس خالص ریشم کا ہوگا۔ (روح المعانی)

جنتی لوگوں کے سبز کپڑے

﴿ یُحَلَّوۡنَ فِیۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّ یَلۡبَسُوۡنَ ثِیَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ ﴾ (پ۱۵/۱۶)

وہ اس میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سبز کپڑے کریب اور قناویز پہنیں گے جنت

میں لوگ شان وشوکت سے ہوں گے۔ جنت کا ہر نظام دنیا کے نظام سے بلند تر ہوگا، اس لئے وہاں کا سونا، چاندی اور موتی صرف نام کے لحاظ پر دنیا کے سونے، چاندی اور موتیوں سے مشابہت ہوگی ورنہ ان کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ جب کم از کم درجہ کا موتی مشرق ومغرب کے درمیان کو روشن کرسکتا ہے تو اعلیٰ کا مقام کیا ہوگا۔

ہر جنتی کو تین تین کنگن پہنائے جائیں گے سونے اور چاندی اور موتیوں کے، حدیث صحیح میں ہے کہ وضوء کا پانی جہاں جہاں پہنچتا ہے وہ تمام اعضاء بہشتی زیوروں سے آراستہ کیے جائیں گے۔ (خزائن العرفان)

سندس: ھو رقیق الدیباج، باریک، نفیس ریشمی کپڑا، جس کو دیباج بھی کہا گیا گے۔ اطلس یا دلپاس بھی اس کے نام کسی وقت رہے ہیں۔ اور باریک ریشمی کپڑے پر قنادیز بھی استعمال ہوا ہے۔

استبرق: انہ غلیظ الدیباج۔ ریشمی کپڑا لیکن ذرا موٹا۔ اسی طرح سونے کے تاریں جس کپڑے میں استعمال ہوں اسے بھی استبرق کہا گیا ہے۔ ریشمی موٹے کپڑے کو کریب بھی کہا جاتا ہے

(از روح المعانی)

کپڑوں کا سبز رنگ اس طرح روشن چمکدار ہوگا جو نظر کو پسند آئے گا۔ بلکہ نظر کی روشنی کی زیادتی کا سبب ہوگا۔ ''ان الرجل یکسی فی الساعۃ الواحدۃ سبعین ثوبا'' جنتی شخص کو ایک ایک وقت میں ستر ستر کپڑے دیئے جائیں گے۔ ایک ایک گھڑی میں وہ لباس تبدیل کرتا رہے گا۔ جو اسے پسند ہوگا وہ پہنے گا۔

(روح المعانی)

جنتی لوگ تختوں پر تکیہ لگائے ہوں گے:

﴿ مُتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴾ (پ ۱۵، ۱۶٪)

وہاں تختوں پر تکیہ لگائے ہوں گے، کیا ہی اچھا ثواب اور جنت کیا ہی اچھی آرام کی جگہ۔

ارائک: جمع ہے اریکہ کی۔ یہ اس تخت کو کہتے ہیں جس کے ارد گرد پالکی بنائی گئی ہو یعنی جس طرح دلہن کی ڈولی ہوئی ہے یا دلہن کے لئے چارپائی پر پالکی بنا کر چارپائی کو سجایا جاتا تھا۔ اسی طرح کے وہ تخت خوبصورت سجائے ہوں گے۔

تخت اونچے ہوں گے: ﴿ وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴾ (پ۲۷ / ۱۴)

اور بستر بچھے ہوں گے اونچے اونچے پلنگوں پر۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا:

" ارتفاعها كما بين السماء والارض مسيرة ما بينما خمس مائة عام "

ان تختوں کی بلندی اتنی ہوگی جتنی زمین وآسمان کے درمیان بلندی ہے، ان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔

" ولا تستبعد ذالک فالعالم عالم آخر وراء طور عقلک "

یہ کوئی بعید بات نہیں۔ اس جہان کا نظام نظام ہی اور ہے، جو عقل کے ادارک سے ماوراء ہے۔ یعنی سمجھ سے بالاتر ہے۔ (از روح المعانی)

جنت میں بستر ریشمی ہوں گے:

﴿ مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى فُرُشٍ ۢ بَطَائِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ﴾ (پ۲۷ / ۱۳)

وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے بستروں پر جن جن کے استر موٹے ریشم کے ہوں گے۔

عام رواج یہی ہے کہ " استر" یعنی نیچے والا کپڑا بنسبت " ابری" یعنی اوپر والے کپڑے سے گھٹیا ہوتا ہے کوٹ، لحاف، رضائی وغیرہ میں اسی چیز کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ جب جنتی بستروں کا استر ریشمی استبرق کا ہوگا تو اوپر والے حصہ کا کیا مقام ہوگا؟

سبز خوبصورت آرام دہ مسند ہوگی:

﴿ مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴾ (پ۲۷ / ۱۳)

وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے سبز مسند پر جو از حد نفیس بہت خوبصورت ہوگی۔

" رفـرف " کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں۔ سبز رنگ کی ریشمی چادر جو بستر پر بچھائی جاتی ہے اور تکیہ جس پر ٹیک لگائی جاتی ہے " الرفرف ضرب من بسط و قبل الوسائد " (کشاف)

اور علامہ قرطبی نے رفرف کے بہت سے معانی بیان کئے ہیں ایک معنی یہ بھی لکھا ہے:

" قد قيل ان الرفرف شيء اذ استوى عليه صاحبه رفرف به واهوى به كالمرجاح

یمینا و شمالا و رفعا خفضا یتلذذ مع انیسته "

رفرف ایک ایسی چیز کو کہتے ہیں جس پر جب انسان بیٹھتا ہے تو کبھی وہ اوپر جاتی ہے کبھی نیچے کبھی دائیں کبھی بائیں۔ وہ جنتی اپنی مونس و ہمدم کے ساتھ بیٹھا لطف اندوز ہو رہا ہوگا لطف و مسرت کے لحاظ سے یہ معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عبقری: " ثیاب منقوشة تبسط " پھولدار نقش و نگار والا قالین۔ ایسا خود ہی خوبصورت ہوتا ہے لیکن اس کی خوبصورت اور نفاست کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اللہ تعالیٰ بھی اسے " حسان " بہت خوبصورت فرما رہا ہے۔ (ضیاء القرآن)

جنتی انعام پر خوش ہوں گے

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ...... تا ...... وَزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴾ (پ ۳۰۔ الغاشیۃ)

کتنے ہی چہرے اس دن بارونق ہوں گے، اپنی کاوشوں پر خوش ہوں گے۔ عالی شان جنت میں نہ سنیں گے وہاں کوئی لغو بات۔ اس میں چشمہ جاری ہوگا۔ اس میں اونچے اونچے تخت (بچھے) ہوں گے۔ اور ساغر قرینے سے رکھے ہوں گے۔ اور گاؤ تکیے قطار در قطار لگے ہوں گے اور قیمتی قالین بچھے ہوں گے۔

ناعمة: تروتازہ جن پر نعمت و راحت کے آثار نمایاں ہوں گے۔ " لسعیہا " جو کوشش وہ زندگی بھر کرتے رہے ہوں گے ان کی جگر سوزیوں، عرق ریزیوں اور جد جہد کے عوض جو انعامات انہیں ملیں گے۔ انہیں دیکھ کر ان کی خوشی کی کوئی حد نہ رہے گی۔ فردوس بریں میں یہ اقامت گزیں ہوں گے۔ کوئی ایسی بات یہ نہ سنیں گے جو انہیں ناگوار ہو۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے ہر طرف بہہ رہے ہوں گے۔ جگہ جگہ ان کے لئے اونچے پلنگ بچھے ہوں گے بڑے قرینے (سلیقے) سے ساغر اور بلوریں جام رکھے ہوں گے۔

نمارق: جمع ہے اس کا واحد نمرقہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے تکیے اور وہ گدیلے جو کجاوے (پالان) کے اوپر ڈالے جاتے ہیں ان کو بھی نمارق کہتے ہیں۔ زرابی اس کا واحد زربیہ ہے قالین، چاندنی جو فرش پر بچھائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ان مہمانوں کی جنت میں جو خاطر و مدارات ہوگی۔ان کے آرام وآسائش کے جو سامان مہیا کیے جائیں گے۔انہیں جو شرف پذیرائی بخشا جائے گا،ان کا دلنواز تذکرہ آپ نے سنا جو لوگ ان وعدوں کی سچائی پر ایمان رکھتے ہیں انہیں سب کچھ چھوڑ کر بلکہ جان دے کر بھی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا پڑے تو انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

نبی کریم ﷺ کا رو کر دعا کرنا:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق نازل شدہ اللہ تعالیٰ کے قول (آیۃ کریمہ) کو تلاوت کیا۔

﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ وَمَنْ عَصَانِىْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

اے میرے رب بیشک ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔پس جس شخص نے میری تابعداری کی بیشک وہ میرا ہے۔اور جس نے میری نافرمانی کی بیشک تو ہی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے

اور حضرت عیسیٰ نے کہا ﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ﴾ اگر تو ان کو عذاب دے تو بیشک وہ تیرے بندے ہیں۔پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا اور روتے ہوئے عرض کیا ''اللھم امتی امتی'' اے اللہ میری امت،میری امت (اس کو بخش دے،میری امت کا مجھے غم نہ دینا) اللہ تعالیٰ نے کہا اے جبرائیل محمد ﷺ کے پاس جاؤ اور تمہارا رب جانتا ہے۔(وربک اعلم جملہ معترضہ ہے) ان سے پوچھو تمہیں کس چیز نے رلایا ہے۔جبرائیل آپ کے پاس حاضر ہوئے،آپ سے سوال کیا،رسول اللہ ﷺ نے جو عرض کیا تھا (اللھم امتی امتی) اس کے متعلق خبر دی۔رب تعالیٰ نے فرمایا اے جبرائیل محمد (ﷺ) کے جا کر کہو'' انا سنرضیک فی امتک ولا نسوءك'' ہم تمہیں امت کے بارے میں راضی کریں گے کوئی غم نہیں پہنچائیں گے

(مسلم ، مشکوٰۃ باب الحوض والشفاعۃ)

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں اس حدیث پاک سے یہ فوائد حاصل ہوئے۔نبی کریم ﷺ کو اپنی امت پر کامل شفقت حاصل ہے۔آپ اپنی امت کی بہتری اور ان کے تمام بھلائی کے امور کا اہتمام فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کو راضی کرنے اور امت کا غم نہ پہنچانے کا آپ سے وعدہ فرمانا یہ

آپ کی امت کے لئے بہت بڑی بشارت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور بنسبت باقی انبیاء کرام حضور ﷺ کا عظیم مرتبہ ہے۔ جبرائیل امین کو آپ کے پاس بھیج کر سوال کرنے میں بھی یہی حکمت ہے کہ آپ کے مرتبہ کو واضح کرنا مقصود تھا کہ تمام کو آپ کی فضیلت، برتری کا علم ہو جائے۔

(مرقاة)

اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ باقی انبیاء کرام نے گناہگاروں کو رب کے سپرد کیا کہ اللہ وہ تیرے ہیں تو ہی ان سے اپنی مرضی کے مطابق سلوک فرما۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے عرض کیا:

اے اللہ! ہیں تو گناہگار! لیکن جب میرے امتی ہیں تو وہ میرے ہی ہیں، ان پر رحم فرما۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا عجیب انداز:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (قیامت کے دن) جہنم پر پل بچھایا جائے گا۔ تمام رسولوں سے پہلے میں اپنی امت کو اس سے گذاروں گا۔ اس دن سوائے رسولوں کے کسی کو کلام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور اس دن رسولوں کا کلام ہوگا ''اللھم سلم سلم'' اے اللہ سلامتی سے (ہماری امتوں کو) گذار دے۔ اور جھنم میں آگے سے ٹیڑھی کی ہوئی لوہے کی سلاخیں اس طرح ہوں گی جس طرح سعدان پودے کے کانٹے ہوتے ہیں، وہ سلاخین کتنی بڑی ہوں گی ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔ ان سے لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق کھینچا جائے گا۔ بعض لوگ ھلاک ہو جائیں گے (کافر ھلاک ہو جائیں گے) اور بعض کو گرا دیا جائے گا اور بعد میں ان کو نجات دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرما کر فارغ ہو جائے گا تو کچھ لوگوں کو جہنم سے نکالنے کا ارادہ فرمائے گا، جب کو نکالنے کا ارادہ فرمائے گا یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے یہ شہادت دی ہوگی اللہ کے بغیر کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا جن لوگوں نے اللہ کی عبادت کی تھی ان کو نکال لو۔ فرشتے ان کو نکال لیں گے۔ اور سجدہ کی علامات (چہرے پر نورانیت) سے انہیں پہچان لیں گے اللہ تعالیٰ آگ پر حرام کر دے گا کہ وہ جن (اعضاء) پر سجدہ کے اثرات ہیں ان کو کھائے۔ تمام انسانوں کو آگ کھا جائے گی سوائے ان کے جن پر سجدہ کے علامات ہوں گی۔ جب ان کو آگ سے نکالا جائے گا تو وہ آگ سے جل چکے ہوں گے۔ ان پر آب حیات ڈالا جائے گا وہ اسی

طرح صحیح وسلامت ہو جائیں گے جس طرح بہتے پانی پر دانہ کھل کھلا رہا ہوتا ہے۔

ایک آدمی جنت اور دوزخ کے درمیان باقی رہ جائے گا۔ یہ سب دوزخیوں میں سے آخر میں جنت میں داخل ہونے والا ہوگا۔ اس کا چہرا ابھی تک آگ کی طرف ہوگا۔ یہ عرض کرے گا اے میرے رب میرے چہرے کو آگ سے پھیر لے، مجھے اس کی گرم لو ہلاک کر رہی ہے۔ اور اس کے شعلوں نے مجھے جلا کر رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں ایسا کر دوں تو ہو سکتا ہے تو اور سوال کرنا شروع کر دے تو وہ کہے گا اے اللہ تیری عزت کی قسم میں اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ اور تقدیر کے مطابق اسے یہ عطا کر دے گا (اس کی دعاء قبول کر لے گا) اس کے چہرے کو آگ سے پھیر دے گا، تو اتنی دیر خاموش رہے گا جتنی دیر اللہ تعالیٰ اس کے خاموش رہنے کو چاہے گا۔

پھر کہے گا: اے اللہ! مجھے جنت کے دروازے کے پاس پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو نے وعدہ نہیں کیا تھا؟ کہ میرا یہ سوال پورا کر دے تو میں اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ وہ شخص عرض کرے گا اے میرے رب (تیری مہربانی) مجھے اپنی تمام مخلوق سے زیادہ بد بخت نہ بنا۔ رب تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر میں تیرا یہ مطالبہ پورا کر دوں تو ہو سکتا ہے تو اور کوئی سوال کرنا نہ شروع کر دے۔ وہ کہے گا اے اللہ! تیری عزت کی قسم اور تو کچھ نہیں مانگوں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق جو اس نے خود ہی پسند فرمایا، اسے جنت کے دروازہ کے پاس جانے کی اجازت فرما دے گا۔ وہ شخص دروازہ پر پہنچ کر جنت کی عیش و عشرت رونق، حسن و جمال اور جنت کے محلات، حور و غلماں دیکھے گا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق کچھ دیر خاموش رہے گا۔ پھر عرض کرے گا: اے اللہ! مجھے جنت میں داخل کر دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھ پر بہت تعجب ہے تو کتنا ہی وعدہ خلاف ہے۔ کیا میں نے تیرے سارے وعدے پورے نہیں کر دیئے، کیا میں نے تیرے سوالوں کے مطابق تجھے عطا نہ کر دیا۔ تیرا وعدہ بھی تھا کہ یہ مجھے دے دے میں اور کچھ نہیں مانگوں گا۔

وہ عرض کرے گا۔ اے میرے رب (میرے حال پر رحم فرما) مجھے اپنی تمام مخلوق سے زیادہ بد بخت (بدنصیب) نہ بنا۔ وہ اسی طرح سوال کرتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہو جائے گا۔ جب راضی ہو جائے گا تو اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت فرما دے گا پھر وہ شخص اسی طرح تمنا کرتا رہے گا۔ اور نعمتوں کا سوال کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کی تمام خواہشات کو پورا

فرمادے گا۔ بلکہ اس کے سوالات کے مطابق اسے انعامات سے نواز کر پھر اپنی مہربانی اور فضل وکرم سے اسے اس کی تمنا کے مطابق اتنی مقدار میں اور مزید انعامات عطا فرمادیگا۔

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الحوض والشفاعۃ)

جنت میں سب سے عظیم نعمت اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہے

حضرت ابو سعید فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جنت والوں کو کہے گا۔ اے جنت والو۔ وہ کہیں گے اے ہمارے رب! لبیک وسعدیک (ہم تیری خدمت میں بار بار حاضر ہیں) رب تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم راضی ہو؟ وہ کہیں گے۔ اے ہمارے رب ہم کیوں نہ راضی ہوں۔ تحقیق تو نے ہمیں وہ (نعمتیں) عطا کی ہیں جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دی ہیں۔ رب تعالیٰ فرمائے گا۔ ''الا اعطیکم افضل من ذالک'' کیا میں تمہیں اس سے افضل عطا نہ کروں وہ کہیں گے اے رب ''وای شئی افضل من ذالک'' اس سے افضل اور کیا چیز ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ''احل علیکم رضوانی فلا اسخط علیکم بعدہ ابدا'' میں تمہیں اپنی رضامندی عطا کرتا ہوں، اس کے بعد میں تم پر کبھی بھی ناراض نہیں ہوں گا۔

(بخاری، مسلم مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ)

یعنی تمہیں ہمیشہ میری رضامندی حاصل رہے گی۔ اس لئے کہ ضروری نہیں کہ کثرت عطاء سے رضاء بھی حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے بھی یہی حاصل ہو رہا ہے کہ تمام نعمتوں سے اللہ تعالیٰ کی رضاء ''اعلیٰ نعمت'' ہے۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ (پ ۱۰/ ۱۵)

اللہ نے مسلمانوں مردوں اور مسلمان عورتوں کو باغوں کا وعدہ دیا ہے جن کے نیچے نہریں رواں (جاری ہیں) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ مکانوں کا بسنے کے باغوں میں (وعدہ فرمایا ہے) اور اللہ کی رضاء سب سے بڑی (نعمت ہے)۔

کیونکہ ہر کامیابی اور سعادت کا سبب اللہ تعالیٰ کے رضاء ہے۔ جنتی لوگ اللہ کی رضاء کی وجہ سے ہی اس کی تعظیم وکرامت کو حاصل کریں گے۔ اور ہر قسم کے ثواب سے بڑھ کر اللہ کی کرامت کا حصول ہے۔

''لان العبد اذا علم ان مولاہ راض عنہ فھو اکبر فی نفسہ مما ورائہ من النعم''

اس لئے کہ انسان کو جب یہ مغلوم ہو جائے کہ اس کا مولیٰ اس سے راضی ہے وہ اپنے دل میں سب نعمتوں سے بڑھ کر یہی نعمت سمجھتا ہے۔ اپنے مولیٰ کی رضاء مندی پر انسان خوش ہوتا ہے جس طرح اس کی ناراضگی پر انسان ہر چیز کو گھٹیا سمجھتا ہے بڑی سے بڑی نعمتیں بھی انسان کو حاصل ہو جائیں لیکن مولیٰ راضی نہ ہو تو انسان کو لذت حاصل نہیں ہوتی۔ (مرقاۃ المفاتیح)

یہی وجہ ہے کہ محبّ رسول ﷺ اپنے لئے سب سے بڑی نعمت آقا و مولیٰ حبیب خدا کی رضاء اور نظر عنایت کو سمجھتا ہے۔ کیونکہ رضاء مصطفےٰ ﷺ ہی رضاء خدا کا ذریعہ ہے۔

محمد کی غلامی دین حق کی شرط اول ہے
اسی میں اگر ہو خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

سب سے بڑی کرامت اللہ کا دیدار ہے:

"اکبر اصناف الکرامۃ رؤیۃ اللہ تعالیٰ" (مرقاۃ ج ۸ ص ۳۲۸)

اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہونا ہی حقیقت میں سب سے بڑی کرامت ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انکم سترون ربکم عیانا۔ (مشکوٰۃ باب رؤیۃ اللہ تعالیٰ)

بے شک تم اپنے رب کو ظاہر ظاہر دیکھو گے۔

﴿ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ (پ۲۹، ۱۷)

کئی چہرے اس روز تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

سعادت مند لوگوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو ساری عمر اپنے رب کریم کی محبت اور یاد میں سرشار رہے ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے محبوب کریم کے عشق سے رنگین رہا اور ان کا ایک ایک سانس اس کے لائے ہوئے دین حنیف کے سربلندی کے لئے وقف رہا۔ فرمایا کئی ایسے چہرے ہوں گے جن کے حسن و جمال۔ تر و تازگی و شیفتگی کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ وہ اپنے رب کے مشاہدہ و دیدار میں مستغرق ہو جائیں گے۔

اہل سنت کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ دار آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کو اپنے دیدار سے

مشرف فرمائیں گے۔ لیکن معتزلہ اور خوارج اور دیگر بدعتی فرقے اس بات کا انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رویت (دیکھنے) کیلئے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ ذات باری تعالیٰ ان سے مبرّا (پاک) ہے۔ اس لئے رویت کا تحقق ناممکن ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ رویت کے لئے دیکھنے والے کا بینا ہونا، جس کو دیکھا جا رہا ہے اس کا محسوس ہونا، کسی جہت میں پایا جانا، نہ زیادہ نزدیک اور نہ زیادہ دور ہونا ...... ضروری ہے ...... اور جب اللہ تعالیٰ جہت سے، محسوس ہونے سے، دوری اور نزدیکی سے پاک ہے تو اس کی رویت کیسے متحقق ہو سکتی ہے؟

اہل سنت اس کا جواب دیتے ہیں کہ تم ''عالم آخرت'' کے حقائق کو ''عالم دینا'' پر قیاس کر رہے ہو جو سراسر نادانی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ رویت متحقق ہوگی۔ اور ان شرائط کے پائے جانے کے بغیر متحقق ہوگی، کیف، جہت اور ثبوت مسافت کے تکلفات کے بغیر آنکھیں رب کریم کا دیدار کریں گے۔ نیز کثیر احادیث سے جو مجموعی طور پر حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ رویت خداوندی کا ثبوت ملتا ہے۔ اتنی کثیر احادیث کا انکار کیونکر ممکن ہے؟

صحیحین (بخاری و مسلم) کی حدیث ہے جو جریر البجیلی سے منقول ہے:

" قال کنا جلوسا عند النبی ﷺ اذا نظر الی القمر لیلة البدر فقال انکم سترون ربکم کما ترون ھذا القمر لیلة البدر لا تضامون فی رؤیة "

ترجمہ: ہم حضور کریم علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، اچانک حضور نے چودھویں کے چاند کیطرف دیکھا اور فرمایا تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح چودھویں کے چاند کو دیکھ رہے ہو۔

زید بن حارثہؓ کہتے ہیں حضور یہ دعاء مانگا کرتے تھے:

" اللھم انی اسألک برد العیش بعد الموت ولذة النظر علی وجھک والشوق الی لقاءک "

الٰہی میں تجھ سے موت کے بعد آرام دہ زندگی کا سوال کرتا ہوں مجھے اپنے رخ انور کو دیکھنے کی لذت عطا فرما اور اپنی ملاقات کا شوق بخش۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ☆ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾

''بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے، مچھر ہو یا اس کے بڑھ کر تو وہ جو ایمان لائے وہ تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے، رہے کافر وہ کہتے ہیں ایسی کہاوت میں اللہ کا کیا مقصود ہے۔ اللہ بہتروں 1 کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہتروں ۲ کو ہدایت فرماتا ہے۔ اور اس سے انہیں گمراہ کرتا ہے جو بے حکم ہیں وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی نقصان میں ہیں''

''بیشک اللہ ترک نہیں فرماتا کہ وہ بیان کرے مچھر کی مثال یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی، تو وہ جو ایمان والے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ لیکن وہ جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں ایسی کہاوت میں اللہ کا کیا مقصد ہے۔ بہتوں کو اللہ اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت فرماتا ہے۔ اور اس سے سوائے نافرمانوں کے کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد، اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا حکم اللہ نے دیا، اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

شان نزول: آیۃ کریمہ کے شان نزول میں مختلف قول ہیں۔لیکن ان تمام کے واقع ہونے کے بعد آیۃ کریمہ نازل ہوئی:

(۱) ﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ﴾ جب یہ آیۃ کریمہ اوراس کے بعدوالی آیات نازل ہوئیں۔جن میں منافقوں کے حال کو بیان کیا گیا،تو وہ کہنے لگے رب تعالیٰ کا ان مثالوں کو بیان کرنے کا کیا مقصد ہے؟ یعنی انہوں نے یہ سمجھا کہ رب تعالیٰ کا مثالیں بیان کرنا اس کی شان کے لائق نہیں تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

ابھی جس قول کا ذکر کیا ہی اسی سے آیۃ کریمہ کا پہلی آیات سے تعلق بھی واضح ہوگیا اور قریب ہی کافروں کے لئے جہنم اور مومنوں کے لئے جنت کا ذکر ہو چکا ہے۔یہاں بھی ایمان والوں کا مثالوں کو حق سمجھنا اور کافروں کا اعتراض کرنا ذکر کیا گیا۔جس سے ماقبل سے تعلق واضح ہوگیا۔

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بت پرستوں اوران کے معبودان باطلہ کا ذکر ان الفاظ سے کیا:

" یا ایها الناس ضرب مثل فاستمعوا له ، ان الذین تدعون من دون الله لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا له وان یسلبهم الذباب شیا لا یستنقذوه منه ضعف الطالب والمطلوب "

''اے لوگوایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سنو،وہ جنہیں اللہ کے سواتم پوجتے ہو، ایک مکھی نہ بنا سکیں گے اگرچہ سب اس پر اکٹھے ہوجائیں اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین کر لے جائے تو اس سے چھڑا نہ سکیں کتنا عاجز ہے چاہنے والا اور جسے چاہا گیا''

اوراسی طرح اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا ذکر یوں بیان کیا:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾

''ان کی مثال جنہوں نے اللہ کے بغیر اور مالک بنالئے ہیں مکڑی کی طرح ہے،اس نے جالے کا گھر بنایا اور بیشک سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے کیا اچھا ہوتا اگر وہ جانتے''

ان آیات پر یہود نے طنز کیا:

" ای قدر الذباب والعنكبوت حتى يضرب الله المثل بهما فنزلت هذه الآية "

''مکھی اور مکڑی کی قدر ہی کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مثالیں بیان کرے، ان کے اس کہنے پر یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی''

(۳) مکھی اور مکڑی کی مثالوں پر مشرکین اور کفار نے طنز کیا انہوں نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ بڑی شان کا مالک ہے وہ ان حقیر چیزوں کی مثالیں کیوں بیان کرتا ہے، تو اس وقت یہ آیۃ نازل ہوئی۔

اعتراض: یہ آخری قول تو درست نہیں کیونکہ مظہری میں ذکر ہے " والآیة مدنیة ومعارضة المشرکین کانت بمکة " آیت مدنی ہے اور کفار سے مقابلہ مکہ میں تھا تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کفار و مشرکین کے طنز کے بعد یہ آیت نازل ہوئی یہ قول تو بہت ہی کمزور نظر آتا ہے۔

جواب: سورۃ مدثر مکی ہے اس میں کفار اور منافقین کا ذکر آ چکا تھا تو یہود کے اعتراض اور طنز پر، اور مشرکین و کفار کو دوبارہ جھنجھوڑنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ سورۃ مدثر میں رب تعالیٰ نے اسی مضمون کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمادیا:

﴿ وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ﴾

''اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے اور کافر کہیں گے اللہ ان مثالوں سے کیا ارادہ کرتا ہے، اسی طرح اللہ جسے چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے ہدایت دے''

اسی وجہ سے علامہ رازی رحمہ اللہ نے آیۃ کریمہ کے شان نزول میں تینوں اقوال نقل کرنے کے بعد فرمایا:

" اذا ثبت هذا فنقول احتمال الكل ههنا قائم لان الكافرين والمنافقين واليهود كانوا متوافقين فی ايذاء رسول الله ﷺ وقد مضى من اول السورة الى هذه الموضع ذكر اليهود وذكر المنافقين وكر المشركين وكلهم من الذين كفروا "

''جب یہ ثابت ہو گیا کہ آیۃ کریمہ کے شان نزول میں تین قول ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہاں سب قول پائے جانے کا احتمال ہے اس وجہ سے کہ کفار، منافقین، مشرکین تمام کے تمام ہی نبی کریم ﷺ وایذاء پہنچانے (تکلیف دینے) میں ایک دوسرے سے متفق تھے اس قسم کا طنز بھی دراصل ایذاء پہنچانے کا ہی ایک حصہ تھا''

سورۃ کی ابتداء سے یہاں تک یہود، منافقین اور مشرکین کا ذکر ہو چکا ہے، کیونکہ وہ سب ہی کافر تھے

تو اس آیۃ میں بھی ان سب کے لغویات کا ذکر ہے اور انکا رب تعالیٰ نے رد فرما دیا۔ (از کبیر)

کیا مچھر کی مثال بیان کی گئی:

آیۃ کریمہ میں یہ تو ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ مچھر کی مثال بیان کرنے سے حیا نہیں فرماتا لیکن قرآن پاک میں کہیں مچھر کی مثال بیان کی گئی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث پاک میں مچھر کی مثال بیان ہے جیسا کہ ابو جعفر رازی نے ربیع بن انس کے قول سے ذکر کیا کہ انہوں نے اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مثال مچھر سے بیان فرمائی:

" ان البعوضة تحیی ما جاعت فاذا سمعت ماتت "

"بیشک مچھر جب تک بھوکا رہتا ہے تو زندہ رہتا ہے جب زیادہ کھا کر موٹا ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے"

یہی حال ہے دنیا کے مال و دولت کی طرف ہی توجہ کرنے والے اور رب تعالیٰ کی یاد کو چھوڑ دینے والوں کا کہ جب دنیا کا مال و دولت ان کے پیٹوں کو بھی بھر دیتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کے احکام سے عدولی کرنے کی وجہ سے باغی ہو جاتے ہیں۔ تو رب تعالیٰ ان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے پھر انہوں نے اپنے اس قول پر بطور دلیل یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ☆ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

"پھر جب انہوں نے بھلا دیا جو نصیحتیں ان کو کی گئی تھیں، ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ خوش ہوئے اس پر جو انہیں ملا تو ہم نے اچانک انہیں پکڑ لیا اب وہ آس ٹوٹے رہ گئے تو جڑ کاٹ دی گئی ظالموں کی اور سب تعریفیں اللہ کی ہیں جو تمام جہانوں کا مالک ہے" (از کبیر)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ : بیشک اللہ تعالیٰ حیا نہیں فرماتا۔ لا یستحی "حیاء" سے ماخوذ ہے:

" اعلم ان الحیاء تغیر وانکسار یعتری الانسان من خوف ما یعاب به ویذم "

حیاء کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان پر عیب اور مذمت کے خوف کی وجہ سے ایسی حالت کا طاری

ہونا جس کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جائے اور چہرا مرجھا جائے۔

اس معنی کے لحاظ سے رب تعالیٰ کی طرف حیاء کی نسبت نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ تغیر اور اس قسم کی کیفیت کا تعلق بدن اور جسم سے ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ جسم سے پاک ہے۔ اس قسم کا تغیر جسموں سے ہونے کی وجہ واضح ہے کہ کہا جاتا ہے " والتغیر منکسر القوة منغص الحیاة " کہ حیاء کی وجہ سے اس میں وہ تغیر پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے اس کی قوت ختم ہوئی اس کی زندگی خاک آلود ہوگئی۔ اسی طرح کہا جاتا ہے " فلان ھلک حیاء من کذا " فلاں شخص اس طرح حیاء سے ہلاک ہو گیا " ومات حیاء" حیاء سے مر گیا۔ " ورایت الھلاک فی وجھه من شدة الحیاء " میں نے دیکھا کہ اس کے چہرہ پر شدت حیاء کی وجہ سے ہلاکت دکھائی دے رہی تھی " وذاب حیاء " وہ شخص حیاء کی وجہ سے پگھل گیا۔

اس قسم کے تمام الفاظ کا تعلق اجسام سے ہے، رب تعالیٰ جسم سے پاک ہے۔ اس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ رب تعالیٰ حیاء سے پاک ہے۔ اور رب تعالیٰ کے لئے حیاء کا استعمال بھی ہے جیسا کہ اسی آیت میں استعمال ہوا ہے اور حدیث پاک میں بھی مذکور ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان اللہ تعالیٰ حیی کریم بستحی اذا رفع العبد الیه یدیه ان یردھما صفرا حتی یضع فیھما خیرا "

" بیشک اللہ تعالیٰ حیاء فرمانے والا کریم ہے جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے حیاء آتی ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے یہاں تک کہ ان میں خیر رکھ دیتا ہے "

اسی طرح حدیث شریف میں ہے:

" ان اللہ یستحی من ذی الشیبة المسلم ان یعذبه "

" بیشک اللہ تعالیٰ حیاء فرماتا ہے کہ سفید بالوں والے مسلمان کو عذاب دے "

حیاء کا استعمال رب تعالیٰ کے لئے کیسے صحیح ہے؟ جب کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کے لئے حیاء کا استعمال درست نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر وہ صفت جس کا تعلق اجسام سے ہو جب وہ

رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگی تو اس کی ابتداء والا معنی مراد نہیں ہوگا بلکہ انتہاء والا معنی مراد ہوگا کہ اس کی غایت اور اس کا مقصد کیا ہے۔

حیاء کا بھی ایک مبدا ہے اور ایک منتہیٰ ہے۔ مبدا یہ ہے کہ انسان پر برائیوں کی طرف منسوب کرنے کی وجہ سے خوف طاری ہونے پر تغیر پیدا ہوجائے چہرے کا رنگ بدل جائے چہرہ مرجھا جائے۔ منتہیٰ یہ ہے کہ انسان اس کام کو چھوڑ دے:

" فاذا ورد الحیاء فی حق اللہ تعالیٰ فلسی المراد منه ذلک الخوف الذی هو مبدا الحیاء و مقدمته بل ترک الفعل الذی هو منتهاه و غایته "

''جب اللہ تعالیٰ کے حق میں حیاء کا ذکر ہو اس وقت اس سے مراد حیاء کا مبدا اور مقدمہ نہیں ہوتا جس کا مطلب خوف طاری ہونا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے حق میں مقصد اور منتہی مراد ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے چھوڑ دینا''

اب ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖٓ ﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ چھوڑتا نہیں مثال بیان کرنے کو ...... الخ۔ راقم نے یہی معنی کیا ہے تاہم جب معنی یہ کیا جائے کہ ''بیشک اللہ تعالیٰ حیاء نہیں فرماتا'' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو ''حیاء'' اس کی شان کے لائق ہے اب بھی مطلب درست ہے۔

اسی طرح غضب کا مطلب ہوتا ہے دل میں خون کا جوش مارنا، انتقام کی خواہش پیدا ہونا اور کسی کو عذاب دینا۔ جب رب تعالیٰ کی طرف غضب کی نسبت ہوگی تو صرف عذاب دینا مقصود ہوگا دل میں خون کا جوش مارنا اور انتقام کی خواہش کا پیدا ہونا مقصود نہیں ہوگا۔ (از کبیر و مظہری)

اَنْ یَّضْرِبَ: بیان کرنا، ضرب کئی معنی میں استعمال ہے:

(۱) ضرب بمعنی مارنا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا " فاضربوا فوق الاعناق واضربوا منهم کل بنان " اور اسی طرح فضرب الرقاب اور اضرب بعصاک البحر ان تمام مقامات میں ''ضرب'' کا معنی مارنا ہی ہے۔

(۲) چلنا، سیر کرنا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ ﴾ جب تم زمین میں چلو۔ اسی طرح ﴿ وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ ﴾ اسی طرح ﴿ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ

ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ﴾ ان تمام مقامات میں "ضرب "کا معنی چلنا اور سیر کرنا ہے۔

(۳) بیان کرنا، جس طرح یہاں استعمال ہوا ﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَایَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ ﴾ اور ﴿ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً ﴾ اور ﴿ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ مَثَلًا ﴾ ان مقامات میں "ضرب" کا معنی بیان کرنا۔

(۴) چھاجانا، جیسا کہ کہا جاتا ہے " ضرب الخيمة " اس نے خیمہ لگایا یعنی خیمہ چھا گیا۔ اور رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ﴾ ان پر ذلت مسلط کردی گئی یعنی ان پر ذلت چھا گئی۔ (از مفردات راغب)

مَثَلاً مَّا: ایک احتمال اس میں یہ ہے کہ " مـا " میں عموم ہے۔اب معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ترک نہیں فرماتا مثال بیان کرنے کو خواہ چھوٹی چیز کی مثال ہو یا بڑی چیز کی مثال ہو۔

ایک اور احتمال یہ ہے " ما ههنا للتقليل وتكون بعوضة منصوبة على البد ل " کہ "ما " یہاں تقلیل کے لئے ہو اور " بعوضة " منصوب ہو اور بدل واقع ہو رہا ہو۔جس طرح کہا جاتا ہے " لا ضربن ضربا ما " میں ضرور بضرور کوئی چھوٹی سے مثال بیان کروں گا۔

اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ " بیشک اللہ تعالیٰ چھوٹی سی چھوٹی مثال بیان کرنے کو ترک نہیں فرماتا

ایک اور احتمال یہ ہے کہ " ما " موصولہ ہو اور " بعوضة " پر وہی اعراب ہو جو " ما " کا اعراب ہو۔ کیونکہ " ما " اور " من " کے صلہ کا اعراب وہی ہوتا ہے جو ان کا اپنا اعراب ہوتا ہے۔جیسا کہ حضرت حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس شعر میں " ما " اور اسکے صلہ کا اعراب ایک ہی ہے:

يكفى بنا فضلا على من غيرنا ... حب النبى محمد ايانا

"ہمیں اوروں پر یہی فضیلت کافی ہے ... کہ نبی کریم محمد مصطفیٰ علیہ السلام کو ہم سے محبت ہے"

(از ابن کثیر)

بَعُوْضَةً: (مچھر) صاحب کشاف نے بیان کیا ہے کہ " بعوض "مشتق ہے بعض سے جس کا معنی ہے کاٹنا، اسی طرح "بضع " کا معنی بھی " کاٹنا " اور " عضب " کا معنی بھی کاٹنا۔تینوں کلموں میں حرف ایک ہی ہیں ب ، ع ، ض ، اگرچہ ترتیب حروف علیحدہ علیحدہ ہے لیکن معنی ایک ہے۔

فَمَا فَوْقَهَا: (تو اس سے بڑھ کر) یعنی اللہ تعالیٰ ترک نہیں فرماتا کہ مثال بیان کرے مچھر کی یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی " فوق " کا لفظ "تحت" کا مقابل ہے جس کا معنی ہے اوپر ہونا " ھا" ضمیر " بعوضۃ " کی طرف لوٹ رہی ہے۔اب یہاں " فوق " میں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے۔

" فما فوقها یعنی الذباب والعنکبوت وما هو اعظم منهما فی الجنة "

''کہ مچھر سے بڑی چیز ہو جسم کے لحاظ پر جیسے مکھی اور مکڑی''

یعنی اللہ تعالیٰ ترک نہیں فرماتا کہ مثال بیان کرے مچھر کی یا مچھر سے وہ بڑی ہو جسامت میں خواہ مکھی ہو، یا مکڑی ہو۔

دوسرا احتمال اس میں یہ ہے " وقیل معناه فما دونها واصغر منها وهذا القول اشبه " کہ اس کا معنی یہ ہے کہ مچھر سے وہ چھوٹی چیز ہو اور حقیر ہو۔ یہ قول زیادہ مناسب ہے اور آیۃ کریمہ کے شان نزول کے قریب ہے۔اس لئے کہ کفار نے جب اعتراض اس بات پر کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ مکھی اور مکڑی کی مثالیں بیان کرے یہ تو حقیر چیزیں ہیں۔

ان کے جواب میں جب ارشاد ہوا تو مقصد بیان اس سے زیادہ واضح ہوتا ہے کہ تمام مخلوق رب تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہی ہے چھوٹی چیزوں میں اس کی قدرت زیادہ پائی جاتی ہے اس لئے رب تعالیٰ چاہے تو مچھر کی مثال بیان کرے یا اس سے بھی چھوٹی چیز کی مثال بیان کرے یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔اس کی شان کے لائق ہے۔اس کی عظمت، اس کی قدرت واضح ہوگی اور مقصد لوگوں کو سمجھانا ہے جو اس سے زیادہ حاصل ہوتا ہے۔

اعتراض: جب " فوق " کا معنی ''اوپر'' ہے تو اس کا معنی ''کم'' اور ''گھٹیا'' کرنا کیسے صحیح ہے؟

جواب: اس صورت میں بامحاورہ کلام ہے۔جیسا کہ کوئی شخص نالائق اور دوسرا اس سے بھی زیادہ نالائق ہو تو کہا جاتا ہے کہ فلاں نے تو اس سے بھی زیادہ نمبر لے لئے حالانکہ نمبر اس کے کم ہوتے ہیں۔

اب مقصد یہ ہوگا کہ مچھر کی مثال ہو یا مچھر سے بھی حقارت اور چھوٹا پن ہونے میں اسے فوقیت حاصل ہو۔(از خازن) یہی دوسرا احتمال زیادہ مناسب ہے کیونکہ کسائی، ابو عبید اور علامہ رازی اور کئی

محققین نے اس قول کو ہی ترجیح دی ہے اور اس پر ایک حدیث پاک سے تائید بھی حاصل ہو رہی ہے وہ ارشاد گرامی یہ ہے:

"لو ان الدنیا تزن عند الله جناح بعوضة لما سقی کافرا منها شربة ماء"

"اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی ایک مچھر کے پر کے برابر بھی قدر و منزلت ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا" (از خازن وابن کثیر)

مچھر سے رب تعالیٰ کی قدرت کا عظیم اظہار:

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ مچھر اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے عجیب مخلوق ہے جس کا وجود بہت چھوٹا ہے (اعضاء تمام حاصل ہیں جو ہاتھی کو حاصل ہیں) اور اسے سونڈ بھی بہت چھوٹی سی حاصل ہے۔ جو اندر سے خالی ہے۔ یعنی ٹھوس مضبوط کیل کی طرح نہیں لیکن بڑے مضبوط چمڑے والے بڑے بڑے جسیم جانوروں اونٹ، ہاتھی، گائے، بھینس وغیرہ کے چمڑے میں بڑی آسانی سے گھسا دیتا ہے جس طرح انسان اپنی انگلی کو حلوہ نما نرم کھانے میں گھسا دیتا ہے اسی کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سونڈ میں زہر رکھ دیا گیا ہے۔ خازن میں یہ بھی ذکر ہے "حتی ان الجمل یموت من قرصه" یہاں تک کہ مچھر کے ڈنگ مارنے سے بعض اوقات اونٹ مرجاتا ہے نعیمی میں ذکر ہے کہ یہ ہاتھی کی سونڈ میں گھس جائے تو ہاتھی مرجاتا ہے۔ (کبیر، خازن، نعیمی)

بہت ہی نصیحت آموز ارشاد: سلطان مامون رشید خطبہ پڑھ رہا تھا کہ ایک مچھر اس کی آنکھ پر آ بیٹھا بار بار اڑایا مگر وہ دفع نہ ہوا آخر کار سلطان کو خطبہ چھوڑنا پڑا اور کہنے لگا کہ مچھر کو خدا نے کیوں پیدا کیا ہے؟

حضرت مولانا ابو ہذیل بصری نے فرمایا کہ مچھر اس لئے پیدا ہوا ہے کہ اس سے بڑے جابر بادشاہ مجبور ہو کر رب تعالیٰ کی قہاری معلوم کریں۔

مچھر نے ایک بادشاہ کا غرور خاک میں ملا دیا:

بڑے بڑے بادشاہ مچھر سے عاجز آگئے اس سے بچنے کی کئی تدبیریں کیں لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے نہ انہیں مچھر سے امن مل سکا، نمرود جیسے جابر اور خدائی کے دعویدار بادشاہ کو ایک مچھر

نے اتنے جوتے لگوائے کہ اسکا خدائی کا نشہ دور ہوگیا۔ اور آخرکار مچھر نے ہی اس کو ہلاک کیا۔

جس سے معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑا انسان ایک مچھر کو برداشت نہیں کرسکتا تو قبر میں سانپ اور بچھوؤں کو کیسے برداشت کرے گا۔

" اللهم نعوذ بک من عذاب القبر " (از نعیمی)

شیعہ حضرات کے نزدیک شان نبی وشان علی:

" ان هـذا المثل ضربه الله لا مير المؤمنين عليه السلام فالبعوضة امير المؤمنين عليه السلام وما فوقها رسول الله ﷺ " (قمی)

'' بیشک یہ مثال اللہ تعالیٰ نے امیر المؤمنین (حضرت علی) علیہ السلام کی بیان کی ہے مچھر سے مراد حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام ہیں اور اس سے اوپر سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں''

جب یہ واضح ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ پائی جاتی ہے تو شیعہ حضرات کے نزدیک معاذ اللہ نبی کریم ﷺ کا مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں مکھی اور مکڑی جیسا ہے۔ اور حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا مقام مچھر جیسا ہے۔ سبحان اللہ کیسی عقل، کیسی محبت، صرف دعوی کرنے سے بات نہیں بنتی کی ہم محبان علی ہیں۔ کاش کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام سمجھ بھی آئے آپ کی عظمت کا بھی پتہ چلے اور مقام مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء سمجھ آئے۔

یاروں میں مطابقت پھر لڑتے کیوں ہیں؟

دیوبندیوں کے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اسی عقیدہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ '' اور یقین جان لینا چاہئے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے'' (تقویۃ الایمان ص ۱۰) نظریات دونوں فریقوں کے ایک جیسے ہی ہیں بظاہر لڑتے رہتے ہیں لیکن اندر سے ایک ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ :

لیکن ایمان والے جانتے ہیں کہ بیشک یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔

فَا: برائے تفصیل ہے۔ کیونکہ جب رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ ﴾ تو تحقیق اور ارتیاب (شک کرنا) میں شک واقع ہوگیا۔ اس کی تفصیل کو شروع فرمایا کہ بعض لوگ حق پر ہیں ایمان

والے ہیں۔اور بعض کافر ہیں۔رب تعالیٰ کے مثالیں بیان کرنے میں ان کے نظریات مختلف ہیں۔
"فا" یا تفریعیہ ہے یعنی جو بات پہلے اشارہ سے سمجھ آ رہی ہو اس کے اوپر ایک چیز کو مترتب کیا جائے اور متفرع کیا جائے۔" **وتقدیم بیان حال المؤمنین لشرفه** " اگر چہ رب تعالیٰ کے مثالیں بیان کرنے میں دو فریق مختلف اقوال کہتے ،اور ان دونوں کا یہاں ذکر بھی کیا جا رہا ہے لیکن مومنوں کے حال کو پہلے بیان کیا جا رہا ہے کیونکہ مومنوں کو شرافت حاصل ہے رب تعالیٰ کے ہاں ان کو خصوصی قرب حاصل ہے۔

اَمَّا: شرط کے معنی کو متضمن ہوتا ہے۔اسی وجہ سے اس کے بعد " فا " زیادہ طور پر لازم ہوتی ہے اور جس جملہ پر یہ داخل ہو اس جملہ میں حکم کی تاکید اس میں پائی جاتی ہے۔اور پہلے جو چیز اجمالی طور پر مذکور ہو یا اجمال طور پر ذہن میں پائی جاتی ہو اس کی تفصیل بھی اس میں پائی جاتی ہے۔جس طرح کوئی شخص کہے " **رایت حامدا وزاهدا فاما حامد فخاطب واما زاهد فجالس** "میں نے حامد اور زاہد کو دیکھا لیکن حامد کو تو خطاب کرتے ہوئے پایا اور زاہد کو بیٹھے ہوئے اس مثال میں توجہ فرمائیں تو تمام معانی بیک وقت موجود ہیں۔اجمال کے بعد تفصیل حکم میں تاکید اور معنی شرط۔

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا: اگر چہ آمنوا ماضی کا صیغہ ہے لیکن اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ جو ایمان لا چکے ہیں وہ ان مثالوں کو حق سمجھتے ہیں۔اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے علم میں ایمان لا چکے ہیں۔اس معنی کے لحاظ سے کہ رب تعالیٰ کے علم میں تو ایمان والے ازلی طور پر ہیں مطلب یہ ہوگا کہ تا قیامت ایمان لانے والے اور ایمان پر قائم رہنے والے اسے حق ہی سمجھتے رہیں گے۔

اَنَّهُ: "ان" تحقیق کے لئے ہے جس کا معنی ہے بیشک، تحقیق اور ضمیر یا تو لوٹ رہی ہے **"مثلا"** کی طرف یا " **ضرب** " کی طرف جو " **ان یضرب** " سے سمجھ میں آ رہا ہے یا " **عدم ترک** " کی طرف جو " **لا یستحی** " سے سمجھ میں آ رہا ہے یا قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے۔
راقم کے نزدیک تمام معانی بیک وقت مراد ہیں۔کہ ایمان والے جانتے ہیں کہ بیشک وہ مثالیں جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں وہ حق ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کا مثالیں بیان کرنا حق ہے۔اور اللہ تعالیٰ کا ترک نہ کرنا بلکہ مثالیں بیان کرنا حق ہے۔اور قرآن جس میں مثالوں کا ذکر ہے وہ ان کے رب کی

طرف سے حق ہے۔

الْحَقُّ: حق، باطل کا مقابل ہے حق یحق حقا، باب ضرب اور نصر پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی واجب ہونا ثابت ہونا، آتا رہتا ہے۔ علامہ راغب اصفہانی نے بیان فرمایا کہ حق میں مطابقۃ اور موافقۃ پائی جاتی ہے۔ اسی طرح حکمت کے مطابق اور حکمت کے موافق کسی چیز کے ایجاد کرنے کو حق کہا جاتا ہے۔ حکم جو واقع کے مطابق ہو اسے بھی حق کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اقوال، عقائد، ادیان، مذاہب صحیحہ تمام کو حق کہا جاتا ہے۔ یعنی جو بھی واقع کے مطابق ہوں وہ حق ہیں۔

ابھی تک جو ذکر کیا ہے اس سے پتہ چلا کہ حق اور صدق میں فرق نہیں دونوں کا مطلب ایک ہے ہاں کبھی فرق بھی کیا جاتا ہے۔ عقد واقع کے مطابق ہو تو حق اور قول واقع کے مطابق ہو تو صدق اور کبھی واقع قول کے مطابق ہو تو حق اور قول واقع کے مطابق ہو تو صدق۔

مِنْ رَّبِّهِمْ: ضمیر " الذین آمنوا " کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی ایمان والے جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اس کی ربوبیت کا ذکر کیا کہ ایمان والے جانتے ہیں کہ قرآن حاصل ہونا اور بڑے بڑے انعامات کا حصول در حقیقت اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ چونکہ وہ رب العلمین ہے اور اس کی ربوبیت کے خصوصی فیضان مومنوں کو ہی حاصل ہیں۔

اسی پر رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی دلالت کر رہا ہے ﴿ نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا ﴾ ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل کیا۔ یعنی اپنے مقرب بندے پر قرآن پاک کا اتارنا اور ان کے ذریعے تمہیں قرآن عطا کرنا ہمارا خصوصی انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ربویت کو ماننا بھی مومنوں کو ہی حاصل ہوا کافروں کو یہ حاصل نہ ہو سکا اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ رب تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ " فیعلمون " سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مومن صرف جانتے ہی نہیں تھے کیونکہ یہاں ایمان والوں کو علم یقینی اور اسے تسلیم کرنا مراد ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا :

"اور لیکن کافر کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا کیا ارادہ ہے اس مثال میں"

پہلے جب ایمان والوں کا ذکر کیا تو فرمایا " یعلمون " وہ جانتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں فرمایا

"**لایعلمون**" کہ کافرنہیں جانتے اس لئے کہ کافروں کی زیادہ مذمت کرنی مقصود تھی کہ وہ بہت بڑے جاہل ہیں۔اس لئے کہ "**مـاذا**" استفہامیہ ہے۔استفہام یاعلم نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔یاانکار کی وجہ سے دونوں ہی اس شخص کی کامل جہالت پر دلالت کرتے ہیں۔

خیال رہے کہ "**مـاذا**" میں چھ وجہ ہیں راقم نے ایک وجہ کوذکر کردیا ہے۔طلباء کرام روح المعانی کودیکھیں۔

اَرَادَ: علامہ راغب اصفہانی نے فرمایا" **راد یرود اذا سعی فی طلب شئی**" کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنا اراد ہے "**وھی فی الاصل قوة مرکبة من شھوة وخاطر وامل**" اصل میں ارادہ اس قوت کانام ہے جس میں شہوت اوردل میں واقع ہونااورامید پائی جائے۔اللہ تعالیٰ کیطرف جب ارادہ کی نسبت ہوتو صرف یہ معنی ہوگا۔کہ کسی کام کومصلحت کے پیش نظر کرنے کاارادہ کرنا۔

بِھٰذَا: اس مقام پر "**ھـذا**" اشارہ قریب کاحقارت کے معنی پردلالت کررہا ہے۔اگرچہ کبھی عظمت پربھی دلالت کرتا ہے۔

مَثَلاً: "**نصب علی التمیز عن نسبة الاستغراب**" مثلا پرنصب بوجہ تمیز کے ہےاورنسبت میں غرابت پائی گئی ہے۔اب پورے جملہ کامطلب اس طرح ہوگیا۔

لیکن کافراپنی شدید جہالت کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ اس قسم کی گھٹیامثالیں بیان کرنے میں کیاارادہ رکھتا ہے۔ہمیں توعجیب ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی مثالیں بیان کرنے میں ارادہ رکھے۔

لیکن ان عقل کے اندھوں کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ تمام چیزیں رب تعالیٰ کی مخلوق ہیں جواس کی قدرت عظیمہ پردلالت کررہی ہیں۔خصوصاً چھوٹی چیز میں وہ تمام اعضاء پائے جائیں جوبڑی چیز میں پائے جاتے ہیں تواس میں اورہی قدرت باری تعالیٰ کے کرشمے نظرآئیں گے۔لہذا وہ اپنی مخلوق میں سے جس کی مثال دیناچاہے اسی میں کمال ہے۔

یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا

(بہتوں کواس سے گمراہ کرتا ہے۔اور بہتوں کواس سے ہدایت دیتا ہے)۔

یعنی رب تعالیٰ مثالیں بیان فرماتا ہے بہت سے لوگ ان پر اعتراض کر کے کجروی اختیار کر کے راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔اور بہت سے انہیں حق مان کر ہدایت پر قائم رہتے ہیں۔

اعتراض: اس آیۃ کریمہ میں ایمان والوں کو کثیر (بہت) کہنے کا کیا مطلب ہے۔جب کہ دوسرے مقامات پر ان کو قلیل کہا گیا ہے اور کفار کو کثیر۔جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ میرے بندوں میں سے شکر گزار کم ہی ہیں۔اور ارشاد فرمایا ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ﴾ یہاں بھی ایمان والے اور اچھے عمل کرنے والوں کو قلیل کہا ہے اور ارشاد فرمایا ﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ ان میں سے کچھ لوگ مومن ہیں اور ان میں سے زیادہ کافر ہیں (اس مقام پر فاسقون، کافرون کے معنیٰ میں استعمال ہے)

جواب: قلت اور کثرت کی دو قسمیں ہیں۔ایک بذاتہ اور دوسری قسم بنسبت غیر کے۔مؤمنین پہلی قسم کے لحاظ سے بہت ہیں۔یعنی کافروں کے ساتھ مقابلہ نہ کیا جائے تو بہت ہیں۔اسی لحاظ سے اس آیت میں بہت کہا گیا ہے۔اور جب دوسری قسم کا لحاظ کیا جائے کہ کافروں کی تعداد کے مقابل مومنوں کی تعداد کم ہوگی۔اسی لحاظ سے دوسری آیات مبارکہ میں مومنوں کو کم اور کافروں کو زیادہ کہا گیا ہے۔

(از عزیزی)

تنبیہ: اس آیۃ کریمہ میں کافروں کے گمراہ ہونے کا ذکر پہلے کیا اور ایمان والوں کی ہدایت کا بعد میں اگرچہ بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ ایمان والے اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں اور ان کو ایمان کی وجہ سے خصوصی شرافت حاصل ہے اس لحاظ سے ان کا ذکر پہلے ہونا چاہئے تھا لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ جب کفار کا قرآن پاک پر اعتراض اور ان کی کج روی کا ذکر مقصود تھا تو ان کی گمراہی کو پہلے ذکر کرنا مقصود کے مطابق ہے۔

(از عزیزی)

اعتراض:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا: (اس کے ذریعے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے) سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں مثالیں بیان کر کے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے جسے رب تعالیٰ خود ہی گمراہ کر دے اس کا ہدایت پر آنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اور اسے گمراہی پر عذاب دینا کیسے ممکن ہے۔

جواب: اس مسئلہ کو زیادہ تفصیلی طور پر سمجھنے کیلئے ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ ......الخ ﴾ میں کی گئی بحث کا پھر سے مطالعہ کریں تو انشاء اللہ امید ہے کہ آپ کی ذہنی الجھن ختم ہو جائے گی۔ تاہم کچھ بحث بفضلہٖ تعالیٰ یہاں بھی بیان کی جاتی ہے۔ تاکہ آئندہ کہیں بھی ''اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف ہو تو اسی سے مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے۔

غزالی دوراں حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے بہت خوب انداز پر تحریر فرمایا جو عوام وخواص کے لئے یکساں مفید ہے۔ آپ فرماتے ہیں کفار اور معاندین جو حق قبول کرنے کی صلاحیتیں ضائع کر چکے اور ضرب الامثال کی حکمتوں کے منکر ہیں۔ از راہ کفر وعناد کہتے ہیں کہ اس مثل (مثال، کہاوت) کے بیان کرنے سے اللہ کا کیا ارادہ ہے؟ ان کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہت سے لوگوں کو ہدایت فرماتا ہے اور بہتوں کو گمراہ کرتا ہے یعنی ان کی گمراہی میں انہیں چھوڑے رکھتا ہے اور یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی طاعت سے روگردانی کر کے سرکشی اور بغاوت اختیار کرتے ہیں جو اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں۔ اللہ کے کسی حکم پر وہ عمل نہیں کرتے اور فساد انگیزی پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ ہدایت کی راہیں ان کے لئے بھی کشادہ تھیں مگر انہوں نے جان بوجھ کر ضلالت کا راستہ اختیار کیا۔ سنت الٰہیہ یہی ہے کہ جس نے روشن دلیلوں کے باوجود حق سے انحراف کر کے باطل کی راہ اختیار کی اللہ تعالیٰ اسے اسی راہ پر چلاتا ہے:

﴿ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ﴾ (نساء آیۃ ۱۱۵)

''جس نے مؤمنین کے خلاف کوئی راہ اختیار کی ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرا اور اسے جہنم میں پہنچائیں گے جو بہت برا ٹھکانا ہے'' (التبیان مع البیان)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''معناه ما ذكره المفسرون اهل التاويل من الحق انه يخذل به كثيرا من الناس مجازاة للكفرهم''

''اہل حق مفسرین کرام نے اس کے جو مطالب بیان کئے ہیں ان کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کفر کا بدلہ دینے کے لئے رسوا اور ذلیل کرتا ہے'' (از قرطبی)

مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں مثالوں سے مسائل کو سمجھاتا ہے تو جو لوگ ان پر

اعتراض کرتے ہیں اور غلط راہ پر چل پڑتے ہیں وہ کافر ہو جاتے ہیں اور کافروں کو رب تعالیٰ ذلیل وخوار کرے گا۔ رب تعالیٰ کے گمراہ کرنے کا یہی مطلب ہے۔

مولانا عبداللہ بن احمد بن محمود ابوالبرکات نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" والاضلال خلق فعل الضلال فی العبد والهداية خلق فعل الاهتداء هذا هو الحقيقة عند اهل السنة " (مدارک التنزیل)

رب تعالیٰ کی طرف اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت کا یہ مطلب ہے کہ (وہ تمام چیزوں کا خالق ہے۔

یعنی اعمال کا بھی وہی خالق ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارا اور تمہارے اعمال کا خالق ہے۔ وہ گمراہی کو پیدا کرتا ہے اور بندے اپنی مرضی اور اپنے کسب سے اس گمراہی کو حاصل کرتے ہیں یعنی گمراہی کی راہ کو بندے خود اختیار کرتے ہیں۔ یہی مطلب ہے ہدایت دینے کا کہ اللہ تعالیٰ ہدایت حاصل کرنے کو پیدا فرماتا ہے اور بندے اپنے اختیار سے اسے حاصل کرتے ہیں۔ یہی جواب جو مدارک میں ذکر کیا گیا ہے تفسیر ابی السعود میں بھی ہے بلکہ اس میں زیادہ وضاحت ہے۔

قاضی ابوالسعو دمحدم بن محمد عمادی فرماتے ہیں:

" واسناد الاضلال ای خلق الضلال اليه سبحانه مبنی علی ان جميع الاشياء مخلوقة له تعالیٰ وان كان افعال العباد من حيث الكسب مستندة اليهم "

" اضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے ہے کہ وہ ضلالت کا بھی خالق ہے کیونکہ سب چیزیں اسی کی مخلوق ہیں اور گمراہی کی نسبت بندوں کی طرف اس لحاظ سے ہے کہ وہ کسب کرتے ہیں" (ابو السعود)

نتیجہ واضح ہوا کہ بندے اپنے اختیار اور مرضی سے گمراہی والے کام کر کے گمراہ ہوتے ہیں اور اس گمراہی کو حاصل کر لیتے ہیں جس کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے یہاں بہت تفصیلی بحث کی ہے۔ جبریہ اور قدریہ فرقوں کے ایک دوسرے کے خلاف دلائل بیان کئے ہیں۔ آپ کی بحث کا خلاصہ آسان لفظوں میں پیش کر رہا ہوں۔ قطع نظر اس

کے کہ معتزلہ نے کیا کہا ہے یا جبریہ نے کیا کہا۔ گمراہی کی نسبت بندوں کی طرف بھی ہے کہ بندے گمراہ ہوتے ہیں۔ گمراہ کرنے کی نسبت کفار کی طرف شیطان کی طرف اور لوگوں کے نفسوں کی طرف بھی ہے۔ اور گمراہ کرنے کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف بھی لیکن ہر نسبت میں معنی علیحدہ علیحدہ معتبر ہے۔

گمراہی کی نسبت لوگوں کی طرف:

یعنی لوگ گمراہ ہوتے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہے کہ لوگ ایسے اعمال کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ گمراہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں بیان ہونے والی مثالوں پر انہوں نے اعتراض کیا اور حق راہ کو چھوڑا تو گمراہ ہو گئے ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو "فانی تصرفون اور فانی تؤفکون" کہاں بھٹکے جا رہے ہیں ان آیات سے یہی واضح ہو رہا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے حق باطل راہ کو اختیار کرتا ہے۔

شیطان وغیرہ کی طرف اضلال کی نسبت:

یعنی جب اضلال کی نسبت شیطان وغیرہ کی طرف ہوگی تو اس وقت اس کا معنی یہ ہوگا:

"ان معنى الاضلال عن الذين في اللغة هو الدعاء الى ترك الذين وتسبيحة في عينه"

"دین سے ہٹانے اور گمراہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ دین کو چھوڑنے کی طرف بلانا اور دین کو برا اور گھٹیا کر کے دکھانا"

"وهذا هو الاضلال الذى اضافه الله تعالىٰ الى ابليس"

"یہی وہ اضلال ہے جس کی نسبت رب تعالیٰ نے ابلیس کی طرف کی"

اور ارشاد فرمایا ﴿ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ بیشک وہ (انسانوں کا) کھلا دشمن اور گمراہ کرنے والا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ ﴾ (شیطان نے کہا) قسم ہے میں ضرور بر ضرور ان کو بہکا دوں گا اور ضرور بر ضرور ان کو آرزوئیں دلاؤں گا۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَا اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا ﴾

"اور (جہنم میں) کافر کہیں گے اے ہمارے رب ہمیں وہ دونوں دکھا جن اور آدمی جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا کہ ہم انہیں اپنے پاؤں کے نیچے روند دیں"

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ ﴾ شیطان نے ان کے لئے (برے) اعمال کو مزین کیا اور ان کو سیدھی راہ سے روکا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِيْ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ﴾

''کہ شیطان قیامت کے دن لوگوں کو کہے گا مجھے تو تم پر کچھ غلبہ حاصل نہیں تھا ہاں مگر میں نے تمہیں بلایا تو تم نے اسے قبول کر لیا''

اسی طرح اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت فرعون کی طرف کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ ﴾ فرعون نے اپنی قوم کو بھٹکا دیا۔

ابھی جن آیات مبارکہ کو ذکر کیا گیا ہے ان میں اضلال کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے لیکن ان سب کا مطلب یہ ہے کہ شیطان لوگوں کو غلط راہ پر چلنے کی دعوت دیتا رہا اور ان کو دین قبیح (بری بدصورت) کر کے دکھاتا ہے اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اضلال کی نسبت شیطان اور فرعون کی طرف کر دی۔ کیونکہ فرعون بھی یہی کرتا رہا کہ وہ اپنی خدائی کا دعویٰ کر کے اللہ تعالیٰ کے دین اور اللہ کی وحدانیت کا انکار کرتا رہا۔ اور باطل راہ کو مزین کر کے دکھاتا رہا اور حق راہ کی معاذ اللہ برائیاں بیان کرتا رہا۔

یہی آج بھی ہو رہا ہے۔ دین اسلام اور دین اسلام کے متوالوں، دینداروں، اسلام کے پیروکاروں کو ہر طرف سے نصاریٰ اور یہود و ہنود کے ایجنٹوں کی طنزیہ جملے سننے پڑ رہے ہیں۔ ہر طرف سے سازشوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے لیکن اے دین کے متوالے صبر سے اپنا کام کئے جا اللہ تعالیٰ تیرا حامی و ناصر ہے۔ بادشاہوں کی تعریف چھوڑ کر مصطفےٰ کریم کی تعریف کر یہی سبق یاد کر:

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں میری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا، میرا دین پارہ نان نہیں

اضلال کی نسبت بتوں کی طرف:

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ﴾ (ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور یوں عرض کیا) اے میرے رب بیشک ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا۔

سی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَقَدْ اَضَلُّوْا کَثِیْرًا ﴾ نوح علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور یوں عرض کیا تحقیق ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کر دیا۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ اس مقام پر اضلال کی نسبت بتوں کی طرف اس معنی کے لحاظ پر تو نہیں ہو سکتی کہ بتوں نے ان کی غلط راہنمائی کی اور حق راہ کو باطل کر کے دکھایا بلکہ یہ معنی مراد ہوگا کہ ان لوگوں نے اپنے اختیار سے بت پرستی کو اختیار کیا مجازی طور پر نسبت بتوں کی طر کر دی کہ بتوں نے ان کو گمراہ کیا۔

نوح علیہ السلام نے کفار کے دین سے دور ہونے کو اپنی تبلیغ کیطرف منسوب کیا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلاً وَّنَهَارًا ، فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآئِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ﴾

''نوح علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو دن رات بلایا تو میرے بلانے سے ان کا بھاگنا ہی زیادہ ہوا''

یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ اے اللہ میں تو اپنی قوم کو دن رات تبلیغ کرتا رہا تیری راہ کی طرف بلاتا رہا لیکن وہ بھاگ بھاگ کر اس راہ سے دور ہوتے رہے۔ جتنا زیادہ میں ان کو راہ حق پر بلاتا رہا وہ تو راہ حق سے ہٹ کر گمراہ ہوتے رہے۔ تو آپ نے بھی ان کے بھاگنے کو مجازی طور پر اپنے بلانے کی طرف منسوب کر دیا۔

قرآن کی طرف کفر اور سرکشی کی نسبت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرمایا:

" ولیزیدن کثیرا منهم ما انزل الیک من ربک طغیانا و کفرا "

''اور اے محبوب یہ جو تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اترا اس سے ان میں بہتوں کو سرکشی اور کفر میں ترقی ہوگی''

مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک جیسے جیسے نازل ہوتا رہے گا وہ انکار کر کے اور اپنی سرکشی اور شرارتوں کی وجہ سے دین کے باغی ہو کر گمراہ ہوتے رہیں گے۔ گمراہ تو وہ خود ہوں گے۔ غلط راہ پر تو وہ

اپنے اختیار سے چلیں گے۔لیکن مجازی طور پر ان کے کفراور سرکشی کو قرآن کی طرف منسوب کردیا

رب تعالیٰ کی طرف اضلال کی نسبت کا کیا معنی:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ضلالت کو پیدا کیا۔اور بندوں نے اپنے اختیار سے اسے حاصل کیا۔

(۲) رب تعالیٰ نے بندوں کو مہلت دے رکھی ہے ان کو جلدی ہی گرفت نہیں کرتا وہ اپنی مرضی سے گمراہ ہو رہے ہیں۔لیکن رب تعالیٰ کے مہلت دینے کی وجہ سے اضلال کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کردیا گیا۔

(۳) " اضل " کا معنی " اھلک "بھی آتا رہتا ہے۔اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اس کے ذریعے یعنی قرآن پاک کے انکار کے ذریعے رب تعالیٰ ان کو ہلاک کردے گا۔

(۴) ضلال کا معنی عذاب اور اضلال کا معنی عذاب دینا بھی آتا رہتا ہے۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلَالٍ وَّسُعُرٍ ﴾ اس آیۃ میں ایک معنی ضلال کا عذاب ہے۔اب اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ ان بہتوں کو عذاب دے گا جو قرآن پاک میں بیان کردہ مثالوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

(۵) اگر "اضلال " میں ہمزہ وجدان کیلئے ہو،تو مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ بہتوں کو گمراہ پاتا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ ان مثالوں کو بیان کرنے میں کیا ارادہ رکھتا ہے۔

ابھی تک جو بحث کی گئی ہے اس سے بہت واضح ہو چکا ہے کہ بندوں کی طرف نسبت گمراہی کی اس لئے ہے کہ وہ اپنے اختیار سے گمراہی کی راہ کو اختیار کرتے ہیں۔شیطان،کفار اور گمراہ کرنے والے تمام انسانوں اور جنوں کی طرف نسبت اس لئے ہے کہ وہ باطل راہ کی دعوت دیتے ہیں اور حق راہ کو برا کر کے دکھاتے ہیں۔قرآن پاک،بتوں اور انبیاء کرام کی تبلیغ کی طرف نسبت مجازی طور پر ہے حقیقی نہیں۔ اور رب تعالیٰ کی طرف اس لئے ہے کہ گمراہی کو پیدا کرنے والا وہی ہے۔شیطان اور کافروں کو پیدا کرنے والا وہی ہے جو گمراہی کا سبب بنتے ہیں۔رب تعالیٰ قہر و جبر سے ان کو گمراہی سے روکتا نہیں۔ان کو عذاب دے گا اور تباہ و برباد کردے گا۔رب تعالیٰ کی طرف گمراہ کرنے کا یہی مطلب ہے امید ہے

کہ قارئین کرام بڑی آسانی سے سمجھ چکے ہوں گے :

" واعلم ان الامة مجتمعة علی ان الاضلال بھذا المعنی لایجوز علی اللہ تعالٰی لانہ تعالٰی ما دعا الی الکفر وما رغب فیہ بل نھی عنہ وزجر وتوعد بالعقاب علیہ "

علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے " اضــــلال " کا معنی بیان کیا کہ کسی کو دین کے چھوڑنے کی دعوت دینا اور اسے دین قبیح کر کے دکھانا، اس کے بعد فرمایا کہ تم یقین کرلو کہ تمام امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے اضلال اللہ تعالٰی پر سچا نہیں آ سکتا ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کفر کی طرف بلائے اور کفر کی راہ کو پسند کرے۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو کفر سے روکتا ہے اس پر زجر (ڈانٹ) فرماتا، اور کافروں کو عذاب سے ڈراتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

" وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ " اور اس سے سوائے نافرمانوں کے کسی کو گمراہ نہیں کرتا:

" والفسق اصلہ فی کلام العرب الخروج عن الشئی "

'' کلام عرب میں فسق کا معنی ایک چیز کا دوسری سے باہر نکلنا ''

اسی طرح کہا جاتا " فسـقـت الـرطبة " کہ تر پھل چھلکے سے باہر آ گیا۔ اسی طرح چوہا جب اپنی بل سے باہر آ جائے تو اسے " فـويسـقـــــه " کہا جاتا ہے۔ شرارت اور ایذاء دینے کے لئے حد اعتدال سے باہر آ جانا بھی فسق کہلاتا ہے مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" خـمـس فـواسـق يـقـتـلـن فـی الحل والحرم الحية والغراب الا بقع والفارة والكلب العقور والحديا "

'' پانچ جانور فاسق ہیں (یعنی ایذا دینے والے ہیں) ان کو حل اور حرم میں (کہیں بھی ہوں) قتل کر دیا جائے وہ پانچ یہ ہیں سانپ، سیاہ، سفید داغوں والا کوا، چوہا، کاٹنے والا کتا، چیل ''

یہ بھی خیال رہے " حــديا " حداءة کی تصغیر ہے اس کے جھپٹنے اور رزالت کی وجہ سے تصغیر کو ذکر فرمایا اور ایک روایت میں سانپ کی جگہ بچھو کا ذکر ہے۔ یعنی ان پانچ کے ساتھ بچھو بھی مراد ہے۔ تعدا

حد بیان کرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف وضاحت کے لئے ہے۔" فاطلق صلی الله علیه وسلم سم الفسق لا ذیتها " نبی کریم ﷺ نے ان جانوروں کو فاسق اس لئے فرمایا کہ یہ اذیت (تکلیف) دیتے ہیں (از قرطبی) " والفسیق " (فا مکسور، سین مکسور اور مشدد) دائم الفسق۔ ہمیشہ فسق کرنے والے کو فسیق کہا جاتا ہے۔

اصطلاح شرع میں فسق:

" والفسق فی عرف الاستعمال الشرعی الخروج عن طاعة الله عزوجل " (قرطبی)

''اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلنا اصطلاح شرع میں فسق کہلاتا ہے''

" والفاسق فی الشرع الخارج عن امر الله بارتکاب الکبیرة "

''شرع میں فاسق اسے کہا جاتا ہے جو گناہ کا مرتکب ہو کر اللہ تعالیٰ کے امر سے نکل جائے یعنی عمل نہ کرے''

(بیضاوی)

" امر " سے مراد یا تو اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کی طرف ﴿ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا رَسُوْلَ ﴾ اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور یا " ترک امر " سے مراد " ترک امتثال " ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق عمل نہ کرنا خواہ وہ امر ہو یا نہی ہو

گناہ کبیرہ کیا ہے؟ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں:

" قال صاحب النهایة والاصح فی تفسیر الکبیرة ان ما کان شنیعا بین المسلمین وفیه هتک حرمة الله تعالیٰ والدین فهو کبیرة والا فهو صغیرة "

''صاحب نہایہ نے بیان فرمایا کہ کبیرہ کی بہت صحیح تفسیر یہ ہے کہ جس کام کو مسلمان برا سمجھیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کی حرمت اور دین کی حرمت کی ہتک لازم آئے وہ کبیرہ ہے اگر ایسا نہیں تو وہ صغیرہ ہے''

(شیخ زادہ)

فاسق تین قسم پر ہیں:

فسق کا پہلا درجہ : تغابی: گناہ کبیرہ کا ارتکاب پایا جائے لیکن انسان گناہ کبیرہ کبھی کبھی کرے اور اسی برا بھی سمجھے۔ اس قسم کے فسق کو تغابی کہا جاتا ہے۔ تغابی کا لفظ مشتق ہی غباوت سے ہے

جس کا معنی ہے کم سمجھ رکھنا، کند ذہن ہونا۔

فسق کا دوسرا درجہ : انہماک : وہ یہ ہے کہ انسان گناہ کبیرہ کو عادت ہی بنالے اور کوئی پرواہ نہ کرے کہ یہ برا کام ہے اس سے مجھے اجتناب کرنا چاہیے۔ انہاک کا مطلب ہی یہ ہے کہ کسی کام کو کوشش سے کرنا اور اس سے چمٹ جانا۔

فسق کا تیسرا درجہ: جحود : انکار کرنا، یعنی انسان گناہ کبیرہ کو اچھا کام سمجھ کر کرے اُس کے گناہ ہونے کا ہی انکار کرے۔

جحود کا معنی واضح ہے انکار کرنا، یعنی گناہ کا ارتکاب گناہ سمجھ کر گناہ ہے۔ گناہ کو گناہ نہ سمجھنا اور گناہ کا انکار کرنا کفر ہے۔ جب انسان فسق کے اس تیسرے درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو کافر ہو جاتا ہے۔ اور گویا کہ گناہوں کی وجہ سے اس پر گناہگار ہونے اور درجہ کفر تک پہنچ جانے کی علامت کو نقش کر دیا جاتا ہے۔

تنبیہ : پہلی دونوں قسم کے فسق انسان کو اسلام سے خارج نہیں کرتے۔ اگر چہ وہ انسان گناہگار ہوتا ہے۔ اور فاسق بھی کہلاتا ہے۔ لیکن تیسری قسم کا فسق کفر ہے۔ انسان کو اسلام سے نکال دیتا ہے ہاں اگر توبہ کرے تو پھر اسلام میں داخل ہو جائے گا۔ اس آیۃ میں یہی آخری قسم کا سق پایا گیا ہے۔ کیونکہ فاسقین کی جن علامت کا آگے تذکرہ آرہا ہے وہ کافروں میں ہی پائی جاتی ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ قرآن میں فاسق گناہگاروں کو بھی کہا گیا ہے اور کافروں کو بھی، ہر محل کے ماقبل اور مابعد کو دیکھا جائے کہ یہاں کون سا معنی مراد لیا جا سکتا ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ

''وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد''

یہاں سے فاسقین کی علامات کو بیان کیا جا رہا ہے جن فاسقین کا یہاں ذکر ہے یعنی قرآن پاک کی امثال پر اعتراض کرنے والے کفار، اور تمام کفار کی یہی علامات ہیں۔ ان میں سے پہلی علامت ان کی یہ بیان کی گئی کہ وہ اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں حالانکہ وہ پہلے پکا وعدہ کر چکے ہوتے ہیں۔

یَنْقُضُوْنَ : نقض اگر چہ ظاہری اجسام کی ترکیب کو توڑنے کا نام ہے۔ جس طرح رسی بٹی ہوئی

ہوتو اسے ادھیڑ دیا جائے، یا کہ کوئی عمارت توڑ دی جائے لیکن مجازی طور پر عہد کے توڑنے کو بھی "ینقضون" سے تعبیر کردیا گیا، گویا کہ وعدہ کرنے والے ایک دوسرے کے درمیان وعدہ سے اسے طرح تعلق جوڑتے ہیں جس طرح رسی دو چیزوں کو ایک دوسرے سے ملانے کا ذریعہ بنتی ہے۔

(از بیضاوی)

عَہْدَ: دو آدمیوں کے درمیان پختہ وعدہ جو طے ہو جائے، اور اس کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری پائی جائے۔ اور وعدہ مطلق وعدہ کرنے کو کہا جاتا ہے، خواہ خیر ہو یا شر ہو، پختہ ہو یا نہ ہو۔ وعید کا استعمال صرف شر میں ہوتا ہے خیر میں نہیں، یعنی عذاب وغیرہ دینے کے وعدہ کو وعید عام طور پر کہا جاتا ہے۔ میثاق اس وعدہ کو کہا جاتا ہے جس میں قسم بھی پائی جائے۔ لیکن یہاں صرف پختہ وعدہ مراد ہے اس کے ساتھ قسم کا پایا جانا مراد نہیں ہے۔ (از بیضاوی، مفردات راغب، المعجم الوسیط)

عہد اللہ سے مراد کون سا وعدہ ہے؟:

اس میں اگرچہ مختلف قول ہیں لیکن وہ تمام ہی مراد ہیں۔ کیونکہ فاسقین سے مراد جب تمام کافر ہیں۔ تو یقیناً یہاں بھی وہی مراد ہیں اس لئے کہ فاسقین کی ہی صفات تو بیان ہو رہی ہیں۔

پہلا قول: جب کوئی شخص اسلام قبول کرے اللہ تعالیٰ کے نبی یا اللہ کے نبی کے کسی خلیفہ (علماء انبیاء کے وارث ہیں) کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اللہ تعالیٰ کے نبی کو اسی کا بھیجا ہوا رسول اور اسی ذات باری تعالیٰ کا نائب تسلیم کرلیا اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرلیا کہ جو تیری طرف سے احکام ہم تک تیرے نبی کے واسطہ سے پہنچے ہیں۔ ہم انہیں تسلیم کرتے ہیں اور ان پر ہمیشہ کے لئے عمل جاری رکھیں گے۔ پھر وہ اللہ کے رسول کی صحبت میں آ گئے یا اللہ کے نبی کے خلیفہ کی صحبت میں آ کر سیرت کی کتب کا مطالعہ کیا قرآن وحدیث کے مسائل پر مطلع ہوئے۔ انبیاء کرام کے معجزات اور اولیاء کرام کی کرامات پر مطلع ہوئے پھر اپنے وعدہ کو اور پختہ کیا دین اسلام پر قائم رہنے کا اور زیادہ پختہ وعدہ کرلیا۔

"بعد ازیں حالت اگر معاذ اللہ شبہ در امر اسلام بخاطر خود جادہد وبسبب آں شبہ طعن دراحکام شرعیہ شروع نماید، یقین است کہ ایں شخص از حد عقل وشرع خارج شد وبمرتبۂ اعلیٰ از گمراہی ترقی نمود"

اس حالت کے بعد اگر اس شخص کے دل میں معاذ اللہ شریعت کے احکام میں شک پیدا ہو گیا اور اس نے احکام شرعیہ میں طعن و تشنیع شروع کر دی، تو یقینی بات ہے کہ وہ عقل اور شریعت سے دور ہو گیا۔ اور وہ گمراہی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا یعنی پاگل اور کافر ہو گیا۔

دوسرا قول: اس عہد سے مراد ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى ﴾ (کیا میں تمہارا رب نہیں انہوں نے کہا کیوں نہیں) والا عہد ہے۔ مسند احمد میں ایک طویل حدیث ہے جو مشکوۃ باب الایمان بالقدر میں مذکور ہے۔ جس کا کچھ حصہ یہ ہے:

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ آیۃ کریمہ کے متعلق ارشاد فرمایا رب نے سب کو جمع کیا اور ان کو جوڑے بنایا پھر ان کو صورتیں عطا کیں پھر ان کو بولنے کی طاقت دی اور ان سے کلام کرنے کے متعلق فرمایا انہوں نے کلام کیا پھر رب تعالیٰ نے ان سے عہد و میثاق لیا اور ان کو ہی ان کے نفسوں پر گواہ بنایا، اور فرمایا ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ ﴿ قَالُوْا بَلٰى ﴾ انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ رب نے کہا میں تم پر سات آسمانوں اور سات زمینوں کو گواہ بنا رہا ہوں اور میں تم پر تمہارے باپ آدم کو گواہ بنا رہو ہوں تم قیامت کے دن کہو گے کہ ہمیں تو اس عہد و میثاق کا علم ہی نہیں یقین کر لو، جان لو میرے بغیر کوئی معبود نہیں، میرے بغیر کوئی رب نہیں۔ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا بیشک میں تمہاری طرف اپنے رسول بھیج کر اور کتابیں نازل کر کے تمہیں میرے ساتھ کئے ہوئے تمہارے عہد و میثاق کو یاد دلاتا رہوں گا۔

(تو اس وقت رب تعالیٰ سے وعدہ کرتے ہوئے) سب نے کہا:

"شهدنا بانك ربنا والهنا لارب لنا غيرك ولا اله لنا غيرك"

''ہم گواہی دیتے ہیں بیشک تو ہمارا رب ہے اور ہمارا اللہ ہے تیرے بغیر ہمارا کوئی رب نہیں، اور تیرے بغیر ہمارا کوئی اللہ نہیں'' (مشکوۃ)

اس وعدہ کو پختہ کرنے کا مطلب بھی حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ ان کو اپنے نفسوں پر گواہ بنا کر (اشهدهم على انفسهم) ان سے وعدہ کو پختہ کرا لیا گیا۔ اور ان کی طرف رسول بھیج اور کتابیں نازل کر کے اس میں اور پختگی پیدا کر دی، لیکن ان میں سے بعض نے اس وعدہ کو توڑ دیا اور کفر کی راہ اختیار کی۔ (ماخوذ از عزیزی)

تیسرا قول: " الذین ینقضون عهد الله فی التوراة ان یبینوا امر محمد ﷺ وینصروه " جس وعدہ کو توڑنے کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ یہ وہ وعدہ ہے جو توراۃ میں اہل کتاب سے لیا گیا کہ جب آخری نبی محمد ﷺ آئیں تو ان کے وہ اوصاف بیان کرنا جن کا ذکر توراۃ میں ہے۔ اور ان کی امداد کرنا یعنی ان پر ایمان لا کر ان کی معاونت کرنا۔ اسی کو رب تعالیٰ نے اس طرح ذکر فرمایا:

﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ ﴾

"اور یاد کرو جب اللہ نے عہد لیا ان سے جنہیں کتاب عطا ہوئی کہ تم ضرور اسے لوگوں سے بیان کر دینا اور نہ چھپانا، تو انہوں نے اسے پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا"

لیکن انہوں نے اس وعدہ کو توڑ دیا نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپایا اور تبدیل کر دیا اور آپ پر ایمان نہ لایا نہ ہی آپ کی کوئی امداد کی بلکہ کفر اور نفاق اختیار کیا۔ (از تبصیر الرحمن)

چوتھا قول: " ان المراد بهذا المیثاق حججه القائمة علی عباده الدالة لهم علی صحة توحیده وصدق رسوله " اس میثاق سے مراد وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر قائم فرمائے ہیں جو باری تعالیٰ کی توحید پر دلالت کر رہے ہیں کہ اس کو " وحده لا شریک له " (ایک مانا جائے اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرایا جائے) مانا جائے۔ وہ دلائل عطاء کر کے گویا کہ ان سے وعدہ لے لیا گیا کہ ان دلائل پر نظر و فکر کرتے ہوئے میری توحید پر ایمان لانا اور میرے رسولوں کو سچا ماننا۔ لیکن کفار نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے روشن دلائل کو اور انبیاء کرام کے معجزات کو دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لا کر اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو توڑ دیا۔

پانچواں قول: اس سے مراد وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا

﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴾

"اور انہوں نے اللہ کی قسم اٹھائی اپنی قسموں میں حد سے زیادہ کوشش کی کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈر سنانے والا آیا تو وہ ضرور کسی نہ کسی گروہ سے زیادہ راہ پر ہوں گے۔ پھر جب ان کے پاس ڈر سنانے والا آیا تو اس سے نہ زیادہ ہوئی سوائے نفرت کے"

یعنی نبی کریم ﷺ کے بعثت سے پہلے قریش نے یہود ونصاریٰ کے اپنے رسولوں کو نہ ماننے اور ان کو جھٹلانے کی نسبت کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے کہ ان کے پاس اللہ کی طرف سے رسول آئے اور انہوں نے انہیں جھٹلایا اور نہ مانا خدا کی قسم اگر ہمارے پاس کوئی رسول آئے تو ہم ان سے زیادہ راہ پر ہوں گے اور اس رسول کو ماننے میں ان کے بہتر گروہ پر سبقت لے جائیں گے۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے ایمان نہ لایا۔ اور حق راہ پر نہ آ کر آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کر کے وعدہ کو توڑ دیا۔ (از کبیر وخزائن العرفان)

چھٹا قول: جس عہد کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے " ما رکز فی عقولهم من الحجة علی التوحید کان امرهم وصاهم به " کہ ان کو عقل عطا کی اور اس عقل میں یہ صلاحیت رکھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائیں پھر ان کو حکم بھی دیا اور نصیحت بھی کی کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لا کر اپنے آپ کو خسارے سے بچالو۔ لیکن انہوں نے اپنی عقل سے کام نہ لیا رب تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لا کر اپنے آپ کو خسارے سے بچالو۔ لیکن انہوں نے اپنی عقل سے کام نہ لیا رب تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان نہ لا کر وعدہ کو توڑ دیا۔

ساتواں قول: اس آیۃ کریمہ میں جس عہد کا ذکر ہے، اس کا ذکر رب تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا

﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝

"اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب (قرآن) آئی جو ان کے ساتھ والی کتاب (تورات) کی تصدیق فرماتی ہے اور اس سے پہلی وہ اسی نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو بیٹھے تو اللہ کی لعنت منکروں پر"

یعنی وہ لوگ جب نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپ کے وسیلہ سے دعاء مانگ کر فتح حاصل کرتے تھے۔ آپ کے آنے کی انتظار کر رہے تھے، یہ پختہ وعدہ کر رہے تھے کہ آپ کے آنے کے بعد آپ پر ایمان لائیں گے۔ لیکن آپ کے آنے کے بعد وہ حسد اور عناد کی وجہ سے آپ پر ایمان نہ لائے، آپ کی نبوت کا انکار کر کے، آپ پر ایمان نہ لا کر وعدہ کو توڑ دیا۔ (راقم)

جتنے اقوال ذکر کیے ہیں تمام ہی معتبر ہیں۔ کیونکہ فاسقین سے مراد کفار ہیں۔ اور کفار کی علامت بیان کی جارہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے پختہ وعدہ کرنے کے بعد وعدہ کو توڑ دیتے ہیں لہٰذا جس وعدہ کو بھی توڑنے سے کفر لازم آئے وہی مراد ہے۔ جتنی قسم کے وعدہ ذکر کیے سب کے توڑنے والے کافر تھے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے تین وعدے لئے:

(۱) "**عهد اخذه على جميع ذرية آدم بان يقروا بربوبيته**" ایک وعدہ آدم علیہ السلام کی تمام اولاد سے لیا جب ان کو چھوٹے چھوٹے ذرات کی شکل میں آدم علیہ السلام کے دائیں طرف اور دوسرے طرف بٹھایا اور ان سے اپنے رب ہونے کا اقرار کرایا۔ اور اس پر ان کو ہی گواہ بنایا کہ تم اس پر قائم رہنا۔ لیکن اولاد آدم میں کچھ اس وعدہ پر قائم رہ کر مؤمن رہے، اور کچھ وعدہ کو توڑ کر کافر ہوگئے کافر ہونے والے اس آیۃ کے حکم میں داخل ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔

(۲) "**وعهد اخذه على النبيين**" دوسرا وعدہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام سے لیا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

﴿ وَاِذَا اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ﴾

"اور یاد کرو جب پیغمبروں سے اللہ نے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور بر ضرور اس کی مدد کرنا"

یہ عہد اس آیۃ کریمہ میں داخل نہیں، کیونکہ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انبیاء کرام (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو توڑ دیں۔

(۳) "**وعده اخذه على العلماء بان بينوا الحق ولا يكتموه**" تیسرا وعدہ علماء سے لیا گیا کہ حق بات کو واضح کر کے بیان کرنا اور حق کو نہ چھپانا۔ اس وعدہ کو توڑنا تو کسی حد تک پایا جاسکتا ہے۔ اور حق کو چھپانے اور نہ بیان کرنے والے علماء کے لئے احادیث مبارکہ میں وعید بھی پائی گئی ہے لیکن وہ اس آیت میں اس لئے نہیں آتے کہ حق کو چھپانا گناہ تو ہے، لیکن کفر نہیں۔ جس آیت کی وضاحت بیان کی جارہی ہے اس میں کفار کا ذکر ہے۔

خیال رہے کہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ان تین وعدہ کا ذکر اسی آیت کی تفسیر میں کیا ہے بظاہر وہم ہوتا تھا کہ شائد یہ تینوں عہد اس آیۃ میں داخل ہیں۔تو اس وہم کا ازالہ حضرت علامہ شیخ زادہ محمد بن مصلح الدین رحمہ اللہ نے اس طرح کیا ہے "هذا الكلام ذكر استطرادا " یہ تین وعدہ کا ذکر ضمنی طور پر کر دیا گیا ہے، مقصودی نہیں۔آگے چل کر بیان فرماتے ہیں:

" وليس المقصود منه ان كل واحد من هذه والعهود الثلاثة من العهد المنقوض المذكور فى هذه الآية"

'' یہاں ان تین وعدوں کے ذکر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تینوں اس آیت میں مذکور عہد میں آتے ہیں جس کو توڑنے کا ذکر کیا جا رہا ہے'' (از بیضاوی، شیخ زادہ)

قارئین کرام مقصودی بحث اور ضمنی بحث میں فرق ضرور ذہن میں رکھا کریں تا کہ انسان غلطی کا شکار نہ ہو۔

﴿ وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ ﴾

''اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا''

اللہ تعالیٰ نے کس چیز کو جوڑنے کا حکم دیا:

اس کے لئے ضابطہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اسی سے انسان کئی مثالیں خود سمجھ سکتا ہے۔تاہم چند مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں ان کو بھی یہاں نقل کیا جا رہا ہے اور یہ بھی خیال رہے کہ یہاں فاسقین سے مراد کفار ہیں۔اس لئے مثالوں میں جو گناہ کبیرہ ذکر ہوں گے ان سے مراد ان کو جائز سمجھ کر ان کا ارتکاب کرنا کیونکہ گناہ کو جائز سمجھنا کفر ہے۔

وہ ضابطہ یہ ہے:

" يحتمل كل قطيعة لا يرضاها الله تعالىٰ وسائر ما فيه رفض خير او تعاطى شر "

یہاں یہ ہی قوی احتمال ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے دور رہنے کو ناپسند فرماتا ہو اس سے دور رہنا ہی قطع کرنا ہے۔اور اس پر قائم رہنا ہی اسے جوڑنا ہے ہر وہ کام جس میں خیر ہو اسے چھوڑنا اور برائیوں کا حصول اور ان پر عمل کرنا در حقیقت جن چیزوں کو رب تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ان کو توڑنا ہے۔

فائدہ جلیلہ:

" فانه يقطع الوصلة بين الله وبين العبد المقصودة بالذات من كل وصل وفصل "

''اصل میں سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان رب تعالیٰ سے اپنا تعلق جوڑے، تمام قسم کے تعلقات جوڑنے سے یہی تعلق جوڑنا بہت عظیم''

نیکیوں کو چھوڑنا اور برائیوں کا ارتکاب کرنا اور نہیں جائز سمجھنا، انسان کو رب تعالیٰ سے دور کر دیتا ہے، کافر بنا دیتا ہے جو رب تعالیٰ سے تعلق توڑنے کے ذرائع ہیں۔ تمام قسم کے تعلقات کو توڑنے سے بہت عظیم جرم یہ ہے کہ انسان رب تعالیٰ سے اپنا تعلق توڑ دے۔

جوڑنے، توڑنے کی چند مثالیں:

کقطع الرحم: جیسا کہ رحم کو قطع کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامِ ﴾ اور اللہ سے ڈرو جس کے نام پر مانگتے ہو اور رشتوں کا لحاظ رکھو۔ یعنی رشتوں کو قطع نہ کرو حدیث شریف میں جو رزق کی کشادگی چاہیے اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے اور رشتہ داروں کے حقوق کا لحاظ کرے۔ یعنی قرابت کو قائم رکھنا صلہ رحمی ہے اور توڑنا قطع رحمی ہے۔ رب تعالیٰ نے صلہ رحمی کرے کا حکم دیا یعنی تعلق کے جوڑنے کا حکم دیا لیکن وہ قطع رحمی کرتے ہیں یعنی قرابت داروں سے تعلق کو توڑتے ہیں۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَهَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ☆ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓی اَبْصَارَهُمْ ﴾

'' تو کیا تمہارے یہ لچھن نظر آتے ہیں کہ اگر تمہیں حکومت ملے تو زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رشتے کاٹ دو، یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ نے لعنت کی اور انہیں حق سے بہرا کر دیا اور ان کی آنکھیں پھوڑ دیں''

واضح ہوا کہ قطع رحمی کو جائز سمجھنا باعث کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کا سبب ہے اور حق بات کے سننے سے دوری کا سبب ہے۔ اور حق راہ کو دیکھنے سے محروم کرنے کا ذریعہ ہے۔

صلہ رحمی کا ذکر احادیث مبارکہ سے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

"الرحم شجنة من الرحمن قال الله من وصلک وصلته ومن قطعک قطعته"
(رواہ البخاری، مشکوۃ باب البر والصلة)

رحم مشتق ہے رحمٰن سے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے تمہیں بلایا ملایا، میں اسے ملاؤں گا اور جس نے تمہیں قطع کیا میں اس سے قطع کروں گا۔

وضاحت حدیث:

الرحم: "قال سیوطی ای رحم الاقارب کیف کانوا" علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں جو لفظ "رحم" استعمال ہے، اس سے مراد قرابت داروں سے تعلق ہے۔ خواہ وہ کسی قسم کے بھی کیوں نہ ہوں۔

شجنة: شین (معجمۃ) کے نیچے کسرہ بھی پڑھا گیا ہے اور اس پر ضمہ بھی، جیم ساکن ہے اسکے بعد نون ہے "وھی فی الاصل عروق الشجرة المتشبکة" اس کا اصل لغوی معنی تو گنجان درختوں کے ٹہنیاں ہیں "والمراد منھا ھنا انھا مشتقة" یہاں مراد یہ ہے کہ "رحم" کا لفظ "رحمن" سے مشتق ہے کیونکہ "رحم" میں بھی وہی لفظ ہیں جو رحمٰن میں ہیں یہاں مشتق کا مطلب یہ ہے کہ رحم کا معنی رحمٰن کے معنی سے ماخوذ ہے۔ یعنی رحم بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار میں سے ایک اثر ہے۔ رب تعالیٰ نے رحم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ جس نے تمہیں جوڑا یعنی قرابت داروں سے تعلق کو جوڑا، میں اس کا تعلق اپنی رحمت سے جوڑ دوں گا اور جس نے تمہیں منقطع کیا۔ یعنی جس شخص نے قرابت داروں سے تعلق کو توڑا میں بھی اس کا تعلق اپنی رحمت سے توڑ دوں گا۔ (مرقاۃ ج۹ ص۱۹۶)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الرحم معلقة بالعرش تقول من وصلنی وصله الله ومن قطعنی قطعه الله" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب البر والصلة)

رحم عرش سے معلق ہو کر کہتی ہے، جس نے مجھے ملایا اللہ نے اسے ملایا جس نے مجھے توڑا اللہ نے اسے قطع کیا۔

وضاحت حدیث: عرش سے معلق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے عرش سے وہ سہارا لے

کر قطع کرنے سے پناہ پکڑتی ہے۔اور جوڑنے کی خبر دیتی ہے۔

تقول: وہ کہتی ہے اس میں کئی احتمال ہیں۔ایک یہ کہ وہ ابتدائی طور پر خبر دیتی ہے۔دوسرا یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جو سنتی ہے اس کی حکایت بیان کرتی ہے۔تیسرا یہ کہ جو اللہ تعالیٰ سے اس نے سنا ہوتا ہے اسے ذکر کر کے لذت محسوس کرتی ہے چوتھا یہ کہ ہوسکتا ہے کہ یہ ماضی کا صیغہ امر کے معنی میں استعمال ہو، اور رحم کی طرف سے دعا ہو کہ اے اللہ جو صلہ رحمی کرے تو بھی اسے اپنی رحمت کے قریب کر، اور جو قطع رحمی کرے تو بھی اسے اپنی رحمت سے دور کر " فالوصل كناية عن الاقبال اليه و القبول منه " اللہ تعالیٰ کے وصل سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے اس کی طرف توجہ کرتا ہے، اور اس کے صلہ رحمی کے عمل کو قبول کرتا ہے " والقطع عبارة عن الغضب عليه و الاعراض عنه " اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطع کا یہ مطلب ہے کہ رب تعالیٰ اس پر غضب فرماتا ہے اور اپنی خصوصی توجہ اس کی طرف نہیں فرماتا " قطعه الله عن عين غايته ومن كمال رحمته ورافته " اللہ تعالیٰ اسے اپنی خاص عنایت، کامل رحمت اور کامل مہربانی سے دور کر دیتا ہے۔

رحم میں کون سے رشتہ دار آتے ہیں؟:

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

○ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتَابِ اللّٰهِ ؕ

"اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے کہ اولوا الارحام بعض، بعض سے زیادہ حق دار ہیں"

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے " ثم ادناک ثم ادناک " پھر جو تمہارے قریبی ہیں پھر جو تمہارے قریبی ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ " ذو رحم محرم " (یعنی دو رشتہ داروں میں سے ایک کو مذکر تصور کیا جائے اور دوسرے کو مؤنث ان کا آپس میں نکاح نہ ہو سکے) زیادہ قریبی رشتہ دار ہیں اسی طرح وراثت کی ترتیب کے لحاظ سے بھی قرب اور بعد کا لحاظ کیا جا سکتا ہے۔تمام ہی رشتہ داروں سے اچھا سلوک کیا جائے، مہربانی کی جائے۔ مالی امداد کی کسی کو ضرورت ہو اور معاونت کی طاقت ہو تو اپنی وسعت کے مطابق معاونت کی جائے۔ (از مرقاۃ ج ۹ ص ۱۹۷)

☆ " عن ابن عمر وقال قال رسول الله ﷺ ليس الواصل بالمكافئ ولكن الواصل الذي اذا قطعت رحمه وصلها " (رواہ البخاری، مشکوۃ باب البر والصلة)

حضرت ابن عمرو نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا نہیں، جو بدلے کے طور پر صلہ رحمی کرے، حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص ہے کہ جب اس سے قطع رحمی کی جائے وہ پھر بھی صلہ رحمی کرے۔

وضاحت حدیث: المکافئ، المجازی کسی کی صلہ رحمی کے بدلہ میں صلہ رحمی کرنا "**قطعت**" ماضی مجہول کا صیغہ ہے، یعنی جب اس سے قطع رحمی کی جائے۔ نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد گرامی میں مکارم اخلاق کا درس دیا کہ انسان مکارم اخلاق سے ہی اعلیٰ منصب کو حاصل کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ﴾ (المؤمنون آیة ۹۶)

''سب سے اچھی بھلائی سے برائی کو دفع کرو''

اسی جملہ جمیلہ کے معنی بہت وسیع ہیں، اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ توحید جو اعلیٰ بہتری ہے اس سے شرک کی برائی کو دور کرو، اور یہ معنی بھی ہے کہ طاعت اور تقوی کو رواج دے کر معصیت کو دور کرو، اور اس کا معنی یہ بھی ہے کہ اپنے مکارم اخلاق (اچھے اخلاق) سے خطا کاروں پر اس طرح عفو و رحمت کرو جس سے دین میں کوئی سستی نہ ہو۔ (از خزائن العرفان)

اس طرح اللہ تعالیٰ کا اور ارشاد گرامی یہ ہے:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴾

''برائی کو بھلائی سے ٹال، جبھی وہ کہ تجھ میں اور اس میں دشمنی تھی ایسا ہو جائے گا جیسا کہ گہرا دوست''

یعنی مکارم اخلاق سے انسان جب کسی کی برائی کے بدلے میں اچھائی کرے گا۔ تو دشمن بھی گہرا دوست بن جائے گا۔ اسی طرح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**صل من قطعک واحسن الی من اساء الیک وقل الحق ولو علی نفسک هذا**"

''جو شخص تمہارے ساتھ قطع رحمی کرے اس سے صلہ رحمی کرو، اور جو تمہارے ساتھ برائی کرے تم اس سے بھلائی کرو، اور حق بات کرو اگرچہ تمہیں اپنے نفس کے خلاف ہی کہنا پڑے'' (از مرقاة ج ۹ ص ۱۹۷)

☆ "**عن ابی هریرة ان رجلا قال یا رسول اللہ ان لی قرابة اصلهم ویقطعونی واحسن الیهم ویسیئون الی واحلمهم عنهم ویجهلون علی فقال لئن کنت کما قلت**

فکانما تسفهم الملّ ولا یزال معک من اللہ ظهیر علیهم ما دمت علی ذلک "

(رواہ مسلم مشکوۃ باب البر والصلة)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ، بیشک میرے قریبی رشتہ دار ہیں میں ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں وہ مجھ سے قطع تعلقی کرتے ہیں میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں میں ان سے برداشت کرتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ جہالت سے درپیش آتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو تم نے ان (کے چہروں) کو راکھ لگادی۔ جب تک تم اس حال پر رہو گے تو اللہ تعالیٰ کی امداد تمہیں حاصل رہے گی''

وضاحت حدیث: تسفهم باب افعال ہے سفوف سے ماخوذ ہو جس کا معنی سفوف بنانا، اور کہا جاتا ہے " اسفته غیری ، ای تلقی وجوههم "کسی کے منہ میں (مٹی، راکھ) ڈالنا " الملّ " (میم پر فتحہ لام مشدد) گرم راکھ کو کہا جاتا ہے جس میں روٹی کو دبا دیا جائے کہ پک جائے۔ اگرچہ اس جملہ کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، لیکن تمام کا مفہوم یہ ہے کہ جب وہ تمہاری صلہ رحمی کا بدلہ قطع رحمی سے دے رہے ہیں، تمہارے احسانوں کے بدلہ تمہارے ساتھ برائی سے درپیش آرہے ہیں تو یہ ایسا ہی جیسے کہ کسی منہ پر راکھ ڈال دیا جائے تو یہ اس کی ذلت ہے۔ یعنی وہ اگرچہ ذلت آمیز کام کر رہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس وقت تک تمہاری امداد فرماتا رہے گا جب تک تم اچھے اخلاق پر قائم رہو گے۔

تنبیہ: اگرچہ اللہ تعالیٰ نے قرابت داروں سے اچھا تعلق رکھنے کو پسند فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے صلہ رحمی پر برانگیختہ فرمایا اور قطع رحمی پر وعید بھی فرمائی لیکن نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کو بھی نہ بھولئے " ان احب الاعمال الی اللہ تعالیٰ الحب فی اللہ والبغض فی اللہ "

(روی ابو داؤد عن ابی ذر ، مشکوۃ باب الحب فی اللہ ومن اللہ)

بیشک تمام اعمال سے اچھا عمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے ہی کسی سے محبت کی جائے اور اسی کی رضاء کے لئے کسی سے ناراضگی رکھی جائے:

" من احب فی اللہ یحب انبیاءہ واولیاءہ ومن شرط محبتهم ان یقفوا اثرهم "

''محبت فی اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام اور اس کے اولیاء کرام سے محبت رکھے اور ان کے نقش قدم پر چلے''

" وکذالک من البغض فی اللہ ابغض اعداءہ و بذل جهده فی

المجاهدة معهم بالسنان و اللسان "

"بغض فی اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے بغض رکھا جائے۔ان کی مخالفت میں کوشش کی جائے ان سے زبان سے مقابلہ کیا جائے ضرورت پڑے تو نیزہ سے مقابلہ کرے"

واضح ہوا بے دین، رب تعالیٰ کے احکام سے دور، دین مصطفےٰ ﷺ کا باغی، گستاخ انبیاء کرام، گستاخ اولیاء کرام سے بغض رکھنا عین ایمان ہے۔کنجروں سے تعلق جوڑنا، یہود و نصاریٰ سے تعلق جوڑنا کہ امریکہ راضی ہوگا، اور اقتدار ملے گا، اور دین اکبری کی طرح اس نعرہ پر عمل کرنا:

مسلم، ہندو اور عیسائی ، ہیں سب بھائی بھائی

درحقیقت دین اسلام سے دور ہونے کے مترادف ہے ایسے اسلام کے دعویداروں سے دور رہیں۔یہ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر یہودیوں اور عیسائیوں کا کام کرنے والے ہوتے ہیں۔

قطع اور ایصال کی مثالیں: اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو جوڑنے کا حکم دیا فاسقین ان کو توڑتے ہیں اس کا پہلے ضابطہ بیان کر دیا گیا۔پھر اسی ضابطہ کے مطابق مثالوں کو شروع کیا تھا جس میں ایک مثال ذکر کی کہ رب تعالیٰ نے صلہ رحمی یعنی قرابتداروں سے تعلق جوڑنے کا حکم دیا لیکن فاسقین اسے توڑتے ہیں قطع رحمی سے کام لیتے ہیں۔اس کی اور مثالیں قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمائیں:

"والاعراض عن موالاۃ المؤمنین" "مومنوں سے دوستی قائم کرنے اور محبت رکھنے سے اعراض کرنا"

یعنی اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ مومن حضرات مومنوں سے ہی محبت کریں ان سے ہی دوستی قائم کریں ان سے ہی اپنا تعلق جوڑیں کفار، یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ رکھیں ان سے محبت نہ کریں۔لیکن فاسقین مومنوں سے تعلق توڑتے ہیں مومنوں کو تکالیف پہنچاتے ہیں۔مومنوں کو پابند سلاسل کرتے ہیں، کہ یہود و نصاریٰ خوش ہو جائیں، خواہ ملک تباہ ہی کیوں نہ ہوتا رہے اس طریقہ کو جائز سمجھنے والے، کفار سے دلی محبت کرنے والے یقیناً کافر ہیں، وہ اس آیت میں داخل ہیں۔خیال رہے کہ موالاۃ کفار (کافروں سے دوستی) کی ممانعت پر تفصیلی بحث انشاءاللہ اور کسی مناسب مقام پر ذکر کی جائے گی۔

" والتفرقة بين الانبياء عليهم السلام والكتب في التصديق"

"انبیاء کرام اور کتب کی تصدیق میں تفریق کرنے والے بھی اس آیت میں داخل ہیں کہ وہ بھی فساق و کفار ہیں"

یعنی اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ تمام انبیاء کرام پر ایمان لاؤ، تمام انبیاء کرام کی نبوت کو حق اور سچ مانو، اور

آسمانی تمام کتب پر ایمان لاؤ کہ جو کتابیں رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں ان کی حقانیت پر ہمارا ایمان ہے۔ البتہ تحریف کے بعد ہمارا ان پر ایمان نہیں اور عمل بھی ہمارا شریعت مصطفوی پر ہی ہے کیونکہ یہی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام پر ایمان لا کر اور آسمانی تمام کتابوں کی تصدیق کر کے تعلق جوڑنے کا حکم دیا، لیکن فساق و کفار بعض نبیوں پر ایمان لا کر اور بعض پر ایمان نہ لا کر اور بعض کتابوں کی تصدیق کر کے اور بعض کی تصدیق نہ کر کے اس تعلق کو توڑتے ہیں۔ خیال رہے کہ اس کی تفصیل بھی انشاءاللہ " لا نفرق بین احد من رسله "کے ضمن میں آئے گی۔

وترک الجماعات المفروضة:

" ای ترک الاجتماعات المفروضة ، یعنی فرض اجتماعات کو چھوڑنا"

اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا:

﴿ وتعاونو ر پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہم مدد نہ دو"

یعنی اللہ تعاونُوا علَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾

"اور نیکی الٰی نے حکم کیا کہ تم ایک دوسرے کی نیکی اور تقوی پر امداد کر کے تعلق جوڑو کیونکہ نیکی اور تقوی پر امداد مومنوں کو مومنوں کے قریب کرے گی اور نیک لوگوں کو نیک لوگوں کے قریب کرے گی۔ اور گناہوں اور زیادتیوں پر دوسرے کا ساتھ نہ دو اس سے بظاہر انسان کو نفع نظر آتا ہے کہ ظالم سے مل کر حکومت میں حصہ دار بن جاؤں گا، بہت مال بٹور لوں گا۔ لیکن اس کا انجام دنیا اور اخرت میں خسارے کے بغیر کچھ نہیں۔ لیکن فساق نے رب تعالیٰ کے اس حکم کو بھی توڑ دیا۔ کہ وہ نیکی اور تقوی پر امداد کر کے تعلق جوڑنے کی بجائے گناہ اور ظلم پر امداد کر کے اس تعلق کو توڑ رہے ہیں۔

اور رب تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾

"اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی"

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی شان بیان فرمائی جو خسارے سے بچے ہوئے ہیں۔ وہ ایمان والے ہیں جن کے اعمال اچھے ہیں اور ایک دوسرے کو حق پر چلنے کی حق بات کہنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو صبر کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔ تو یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کر کے اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کر کے تعلق جوڑو لیکن فاسقین نے اس

کے خلاف کام کر کے اس حکم کو توڑ دیا۔اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" کونوا عباد اللہ اخوانا ، اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ"

یعنی اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی امت کو حکم دیا کہ تم اللہ کے بندے بن جاؤ ،ایمان پر قائم رہو اللہ کی عبادت کرو اور ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن جاؤ۔یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی زبان ذیشان سے کہلایا کہ مومن بن کر بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے سے تعلق جوڑو لیکن فساق نے اس سے پھر کر کفر کی راہ کو اختیار کر کے اسے توڑ دیا۔اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

" وعلیکم بالسواد الاعظم تم پر لازم ہے کہ بڑی جماعت کو لازم پکڑو"

یعنی رب تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی زبان مبارک سے کہلایا کہ بڑی جماعت کے ساتھ تعلق جوڑو لیکن فاسقین نے اس حکم کو بھی توڑ دیا۔لیکن یہ خیال رہے کہ اس تعلق کا مطلب سیاسی جماعتوں یا چھوٹی چھوٹی تنظیموں سے وابستگی نہیں۔بلکہ اس کا مطلب یہ ہے:

" ای بما اجمع علیہ الجماعۃ الکثیرۃ من الامۃ فانھم لا یجتمعون علی الضلالۃ" (شیخ زادہ)

"یعنی اس عقیدہ پر قائم رہو جس پر بڑی جماعت قائم ہے۔کیونکہ تمام لوگ گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتے" (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

اس لئے چھوٹی چھوٹی تنظیموں والے جب " من شذ شذ فی النار" (جو جماعت سے بکھر گیا وہ آگ میں پڑا) حدیث پاک کو اپنے دستوری کتابچوں میں لکھتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے کہ حدیث پاک کے مطلب کو بدلنے کی کیوں کوشش کی جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ قطعوہ بالتکذیب والعصیان:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے اور ان کے ارشادات پر عمل کرنے کا حکم دیا لیکن فاسقین یعنی کفار نے اس حکم کو توڑ دیا آپ کی تکذیب کی اور نافرمانی کی۔ (روح المعانی)

فانہ تعالیٰ امر ان یوصل بالعمل فلم یصلوہ ولم یعلموا:

وظاھر ھذا انھا نزلت فی المنافقین ، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ خلوص قلب سے عمل کر کے رب سے تعلق جوڑو لیکن منافقین نے ظاہری طور پر عمل کر کے اور دل سے انکار کر کے اس حکم کو توڑ دیا۔ (روح المعانی)

تنبیہ: اس آیت کریمہ میں کفار، یہود، نصاریٰ، منافقین تمام ہی داخل ہیں۔تو اس سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ منافقین کی چھ علامتیں ہیں:

(۱) بات کریں تو جھوٹ بولیں (۲) ان کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کریں

(۳) کسی سے وعدہ کریں تو خلاف ورزی کریں (۴) اللہ تعالیٰ سے وعدہ کریں تو توڑ دیں

(۵) اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیا ان کو توڑ دیں۔

(۶) اور زمین میں فساد پھیلائیں۔ (از ابن کثیر)

وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ: (اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں) اس کریمہ میں جن فاسقین یعنی کفار کا ذکر ہے ان کی یہ تیسری صفت بیان کی گئی کہ وہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔

زمین میں فساد پھیلانے کا مطلب کیا ہے؟

ان کے زمین میں فساد پھیلانے کے لئے بھی ایک ضابطہ موجود ہے جس کے ضمن میں کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

وہ ضابطہ یہ ہے: "بانهم يرتكبون كل معصية يتعدى ضررها ويطير في الآفاق شررها"

وہ ہر ایسی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں کہ جس کے نقصانات متعدی (آگے پھیلنے والے) ہیں۔اور ان کے فسادات کی بھڑکائی ہوئی آگ کے چنگاریاں دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔ان کے شر اور فساد کی لپیٹ میں تمام ملک آجاتا ہے جس سے کوئی مقام محفوظ نہیں رہتا۔ (از روح المعانی)

ان کے فساد کے متعدی ہونے پر دلیل:

"ذكر في الارض اشارة الى ان المراد فساد يتعدى دون ما يقف عليهم"

رب تعالیٰ نے ان کے فساد کو "یفسدون" سے ذکر کیا اسی پر اکتفا نہیں فرمایا کہ وہ فساد پھیلاتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ "فی الارض" ذکر فرما کر یہ اشارہ کر دیا کہ ان کا فساد صرف ان کو ہی نقصان نہیں دیتا بلکہ ان کے فساد کے برے اثرات تمام زمین پر پھیلتے ہیں ان کی نحوست کا اثر روئے زمین پر پڑتا ہے۔

ان کے فساد کی چند مثالیں:

(۱) " افسادهم باستدعائهم الى الكفر والترغيب فيه وحمل الناس عليه "

ان کے فساد پھیلانے کا یہ طریقہ تھا کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی کفر کی طرف بلاتے تھے کفریہ عقائد واعمال کو مزین کر کے دکھاتے اور اس کی رغبت دلاتے اور یہ کہتے کہ یہی راہ حق ہے کہ اس پر چلنے والے مالدار ہیں۔ دین اسلام پر چلنے والے غریب ہیں ان کی غربت سے ہی سمجھ آ رہا ہے کہ ہمارا طریقہ درست ہے۔ اس طرح کی خوبصورت باتوں سے لوگوں کو کفر پر برانگیختہ کرتے تھے۔

آج تک یہی طریقہ چلا آ رہا ہے دین اسلام کے خدمت گزاروں کو عیاش طبقہ، یہود ونصاری سے محبت کرنے والا گروہ ہر وقت طعن وتشنیع کا نشانہ بنا رہا ہے۔ یہی فسادی لوگ ہیں جن کے متعدی فساد کی لپیٹ میں اقوام عالم (جہان کی تمام قومیں) مبتلا ہیں ''لیکن الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' محاورہ کے مطابق علماء کو فسادی کہتے ہیں۔

(۲) " او باخافتهم السبل وقطعهم الطرق على من يريد الهجرة الى الله تعالىٰ ورسوله ﷺ "

اور ان کے فساد پھیلانے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ راستہ میں خوف دلاتے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضاء کی خاطر ہجرت کرنے والوں پر لوٹ مار کرتے۔ آیئے سوچئے عبادت گاہوں پر حملہ کرنے، قتل وغارت کا بازار گرم کرنے والے نماز ادا کرنے کے لئے مساجد پر پولیس اور سیکورٹی گارڈ کا پہرہ لگوانے والے، اور خوف اور ڈر پیدا کر کے مساجد سے عبادت سے روکنے کی مذموم کوشش کرنے والے کہیں انہیں کی ذریت معنوی تو نہیں؟ (ماخوذ از روح المعانی)

(۳) " ويفسدون في الارض بتعويق الناس عن الايمان وحثهم على القتال حفظا على الرشا " (تبصیر الرحمن)

اور ان کے فساد پھیلانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں پر ایمان لانے کے راستے تنگ کر دیتے ہیں اور قتل وغارت پر لوگوں کو برانگیختہ کرتے ہیں اور رشوت کے کلچر اور زیادہ مضبوط بناتے ہیں اور رشوت کے بازار کی حفاظت کرتے ہیں۔ قارئین کرام خدرا انصاف سے کام لیتے ہوئے ذرا یہ تو بتائیں کیا اس قسم کے لوگوں کی ہمارے ہاں کوئی کمی ہے؟ نہیں نہیں بڑی تعداد میں موجود ہیں ہوسکتا ہے کافر تو نہیں ہوں گے لیکن کافروں کے یار ضرور ہیں۔

(۴) " ویفسدون فی الارض بالمعاصی والکفر بالقرآن وبمحمد ﷺ ویھلکون الحرث والنسل "
(مظہری)

ان کے زمین میں فساد پھیلانے کا یہ مطلب ہے کہ وہ گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔اور قرآن پاک کا انکار کر کے اور نبی کریم محمد مصطفےٰ ﷺ پر ایمان نہ لا کر کفر کی راہ کو اختیار کرتے ہیں اور مسلمانوں کی کھیتیاں برباد کرتے ہیں اور مسلمانوں کی نسل کو ختم کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

مسلمانو! سوچنے، سمجھنے کی ضرورت ہے جن نصاریٰ، یہود، ہنود کو تم اپنا خیر خواہ سمجھ بیٹھے ہو، اپنا مددگار سمجھتے ہو انہوں نے تمہیں سود پر قرض دے کر کنگال کر دیا تخریب کار انہوں نے خرید رکھے ہیں وہ تمہارا مال برباد کر رہے ہیں۔قتل تمہیں کرا رہے ہیں تمہاری نسل کو دین سے دور کر کے قتل عام کرا رہے ہیں تمہیں کب سمجھ آئے گی۔تباہ ہو کر بھی نہیں سمجھ رہے کب سمجھو گے؟ کسی بڑی تباہی کا انتظار کر رہے ہو؟

(۵) " ویفسدون فی الارض بالمنع عن الایمان والاستھزاء بالحق وقطع الوصل التی علیھا یدور فلک نظام العالم وصلاحہ "
(ابو السعود)

ان کا زمین میں فساد پھیلانے کا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگوں کو ایمان سے روکتے تھے اور حق کا مزاح اڑاتے تھے اور جن اچھے کاموں اور اچھے عقائد پر جہان کا نظام قائم ہے اور جہان کی صلاحیت ان پر قائم ہے اسے وہ تباہ کرتے تھے۔آج بھی یہی طریقہ ان کا چلا آ رہا ہے کہ وہ نظام عالم کو برباد کر رہے ہیں۔اچھائیوں کو برائیوں سے بدلنے کی کوشش میں رہتے ہیں اور دین اسلام کے شعار سے مزاح اڑانے کا کوئی وقت ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

(۶) " والاظھر ان المراد منہ الصد عن طاعۃ الرسول ﷺ لان تمام الصلاح فی الارض بالطاعۃ "

زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ انکے فساد پھیلانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طاعت سے روکتے زمین میں امن وسکون، ہر قسم کی بھلائی نبی کریم ﷺ کی طاعت سے ہی حاصل ہوتی ہے۔آپ کی طاعت ہی شریعت ہے۔انسان جب شریعت پر چلے تو وہ ظلم نہیں کرتا، عدل کو نہیں چھوڑتا لیکن شریعت سے دور ہو کر انسان ظالم بن جاتا ہے وہ انسان کی شکل میں خونخوار درندہ نظر آتا ہے۔

قارئین کرام ذرا توجہ فرمائیں کیا حقیقت یہ نہیں کہ جب تک نبی کریم علیہ السلام کو اپنی اولاد اپنے والدین اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ مانے ایمان نہیں حاصل ہوتا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ماننا ضروری ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ نبی کریم ﷺ پر جان قربان کرنا شہادت کا اعلیٰ مرتبہ ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ نبی کریم ﷺ کا کوئی ثانی نہیں مخلوق میں آپ کی کوئی نظیر نہیں؟

ہاں ہاں یہی حقائق ہیں جن کو مٹانے میں انگریز کے آلہ کار نکھٹو، الو، گدھے مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں نبی کریم ﷺ کو ایک عام انسان کا درجہ دے رہے ہیں تاکہ ان نظریات کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھا کر اطاعت رسول اللہ ﷺ کو مٹا دیں، تاکہ نبی کریم ﷺ پر جان قربان کرنے والا کوئی نہ رہے۔ دین کے متوالے مٹ جائیں اور دین مٹ جائے۔ یہی کوشش ابتداء اسلام سے لے کر آج تک جاری ہے۔ لیکن انشاء اللہ یہ ذلیل و خوار ہوں گے:

﴿مٹ گئے، مٹ جائیں گے سب اعداء تیرے ۔ نہ مٹا ہے، نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا﴾

اُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ: ”وہی نقصان اٹھانے والے ہیں“

قرآن پاک میں رب تعالیٰ کی طرف سے بیان کردہ مثالوں پر اعتراض کرنے والوں کے گمراہ ہونے اور فاسق (کافر) ہونے کا ذکر کیا گیا پھر ان کی صفات کو بیان کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے پختہ وعدہ کرنے کے بعد وعدہ کو توڑ دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جن کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے وہ توڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اب اس کا نتیجہ اور انجام بیان کیا جا رہا ہے کہ وہی خسارے میں ہیں:

”ان الخاسر اسم عام يقع على كل من عمل عملا لا يجزى عليه فيقال له خاسر“

”ہر وہ شخص جسے اس کے اعمال پر کوئی اچھا بدلہ، نفع نہ مل سکے اسے خاسر (نقصان اٹھانے والا) کہا جاتا ہے“

کافروں کو بھی ان کے اعمال کا کوئی نفع نہیں ہوگا اس لئے وہ خسارے میں ہوں گے۔ ایمان والے اور نیک عمل کرنے والے خسارے سے محفوظ رہیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ☆ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾

''بیشک تمام انسان خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ایمان لایا اور اچھے عمل کئے''

ان کے خسارے کی وجوہ:

(۱) " انهم خسروا نعيم الجنة " بیشک وہ جنت کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔ ہر شخص کے لئے جنت میں مقام بنایا گیا ہے " فان اطاع الله وجده " اگر اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تو اس مقام کو پالے گا " وان عاصه ورثه المؤمنون " اور اگر اس نے نافرمانی کی تو وہ اس مقام سے محروم ہو جائے گا وہی مقام مومنوں کو دے دیئے جائیں گے اسی کو رب تعالیٰ نے یوں ذکر فرمایا:

﴿ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ☆ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

''یہی لوگ وارث ہیں کہ جنت فردوس کی میراث پائیں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''

(۲) یہود و نصاریٰ نے جو اپنی شریعت میں نیک عمل کئے اور منافقین کی ظاہری طور پر کی ہوئی نیکیاں ضائع ہو جائیں گی کیونکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لا کر کفر اختیار کر کے اپنے اعمال کو برباد کر دیا۔ جو ان کے لئے خسارا کا سبب بنا۔ (از کبیر)

(۳) " اذ خسروا ديارهم واموالهم والعقل " (تبصیر الرحمٰن) انہوں نے اپنے شہروں، مالوں اور اپنی عقلوں کو کفر کی وجہ سے برباد کر کے رکھ دیا جس کی وجہ سے وہ خسارے میں پڑ گئے

(۴) ان لوگوں نے اپنی اصل پونجی (راس المال) یعنی عقل کو بھی ضائع کر دیا تو یقیناً جب اصل مال ہی نہ رہے تو اس پر مرتب ہونے والے فوائد بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ لہذا انہوں نے کتاب اللہ پر ایمان لانے سے دنیا میں حاصل ہونے والے فوائد اور جنت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کو کفر کی وجہ سے برباد کر دیا اور اس کے بدلے موت کے بعد قبر میں بچھوؤں اور سانپوں کے ڈسنے کا عذاب حاصل کر لیا اور آخرت میں جہنم کا عذاب حاصل کر لیا۔ یہی ان کے لئے خسارے کا سبب بنا۔ (ماخوذ از عزیزی)

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

" اولئک اشارة الى الفاسقين باعتبار ما فصل من صفاتهم القبيحة

وفیه رمز الی انهم فی المرتبة البعیدة من الذم "

" اولئک " بعید کا اشارہ ذکر کیا ہے۔ جس کا مشار الیہ " فاسقین " ہے حالانکہ وہ قریب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بری صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ بیشک وہ اپنی قباحتوں اور برائیوں کی وجہ سے رب تعالیٰ کی رحمت سے دور ہیں وہ اشارہ قریب کے قابل نہیں اگرچہ ان کا ذکر قریب ہی ہے۔

" وحصر الخاسرین علیهم باعتبار کما لهم فی الخسران حیث اهملوا العقل عن النظر ولم یقتنصوا المعرفة المفیدة للحیاة الابدیة والمسرة السرمدیة "

" اولئک " معرفہ ہے اور " الخاسرون " بھی معرفہ ہے۔ درمیان بھی " هم " ضمیر منفصل مذکور ہے جس سے حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے یعنی " وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں " کیونکہ انہوں نے کفر کو اختیار کر کے باطل راہ پر چل کر اپنی عقلوں کو بھی ضائع کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ نظر و فکر سے خالی ہو گئے۔ حیات ابدیہ اور ہمیشہ کے لئے آخرت میں حاصل ہونے والی مسرت کو ضائع کر بیٹھے۔ لہٰذا کامل نقصان ان کا ہی ہوا اس لئے ان کو ان میں ہی منحصر کر دیا۔ ان کے کامل نقصان کی وجوہ بھی واضح ہیں " واشتروا النقض بالوفاء " انہوں نے وعدہ کی وفا کے بدلے وعدہ کو توڑنا حاصل کیا:

" الفساد بالصلاح " اور انہوں نے امن و سکون اور صلاح کے بدلے فساد کو حاصل کیا۔

" والقطیعة والصلة " رب تعالیٰ نے جن کو جوڑنے کا حکم دیا انہوں نے اس کے بدلہ ان کو توڑنا حاصل کیا۔

" والثواب بالعقاب " انہوں نے ثواب حاصل کرنے کے بجائے عذاب حاصل کیا۔

لہٰذا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "فضاع منهم الطلبتان راس المال والربح " ان سے دونوں مقاصد ضائع ہو گئے اصل مال یعنی عقل ضائع ہوئی اور اس سے حاصل ہونے والا نفع بھی ضائع ہو گیا یعنی ایمان اور نیکیوں پر مرتب ہونے والے دنیوی اور اخروی فوائد سے وہ محروم ہو گئے۔ " وحصل لهم الضرر الجسیم وهذا هو الخسران العظیم " اور ان کو اسی وجہ سے بہت بڑا ضرر پہنچا یہی وہ ان کا کامل نقصان ہے جو ان میں ہی منحصر ہے۔ (از روح المعانی)

﴿ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ کُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ج ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴾

1 ''بھلاتم کیونکر خدا کے منکر ہو گے حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں جلایا پھر تمہیں مارے گا، پھر تمہیں جلائے گا، پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے''

2 ''تم اللہ سے کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے اس نے تم میں جان ڈالی پھر تمہیں مارے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر تمہیں اسی کی طرف لوٹایا جائے گا''

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کا ذکر ﴿ یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ سے کیا پھر نبوت کا ذکر ﴿ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا ﴾ سے کیا پھر قیامت کا ذکر ﴿ فَاتَّقُوْا النَّارَ ﴾ سے اور ﴿ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے کیا پھر جنت والوں کے لئے نعمتوں کا ذکر کیا۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی نعمتوں کا ہی ذکر ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا زندگی عطا کرنا اور موت عطاء کرنا نعمتیں ہیں۔ زندگی کا نعمت ہونا تو واضح سمجھ آتا ہے۔ لیکن موت کا نعمت ہونا اگر چہ بظاہر نہیں سمجھ آتا، لیکن جب غور کیا جائے کہ موت کے بعد ہی حیاۃ ابدیۃ حاصل ہوتی ہے اور اسی حیاۃ ابدیۃ میں جنت حاصل ہوتی ہے اور جنت کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ تو خود بخود سمجھ آجائے گا کہ موت جب اتنی عظیم نعمتوں کا ذریعہ ہے، اور موت کے بغیر اتنی عظیم نعمتیں حاصل نہیں ہوتی تو موت بھی بہت بڑی نعمت ہے۔

اس آیۃ کریمہ میں رب تعالیٰ نے ان پر تعجب کرتے ہوئے انہیں زجر کرتے ہوئے اور کفر سے روکتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ ﴾ تم اللہ سے کیسے کفر کرتے ہو۔ اگر چہ ''کیف'' استفہام (سوال) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں استفہام (یعنی پوچھنا) مقصود نہیں۔ کیونکہ استفہام کبھی تعجب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی انکار کے لئے جیسا کسی کو کہا جائے یہ کام تم نے کیا ہے یعنی تمہیں نہیں کرنا

چاہئے تھا۔اگر چہ مفسرین کرام نے ایک ایک معنی لیا کسی نے ایک کسی نے دوسرا یا تیسرا۔

لیکن راقم کے نزدیک تمام معنی ایک ساتھ مراد لئے جاتے ہیں۔جب یوں کہا جائے تم نے رب تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے اس کے عذاب سے ڈرو تم کیسے کفر کر رہے ہو(یہ توبیخ ہے) تمہیں رب تعالیٰ کی نعمتیں نظر نہیں آرہیں ہیں تم کیسی کفر کر رہے ہو تمہیں کفر نہیں کرنا چاہئے (یہ انکار ہے) اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کے باوجود تم اس سے کفر کیسے کر رہے ہو(یہ تعجب ہے)

وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا: حالانکہ تم بے جان تھے،اس مقام پر اموات سے مراد وہ موت اور مردہ ہونا نہیں جو ہم سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص پہلے زندہ تھا اب مر گیا۔بلکہ اس مقام پر یہ مراد ہے "وکنتم امواتا نطفا فی الاصلاب" تم اپنے آباء کی پشتوں میں نطفہ کی شکل میں تھے یعنی اس دنیا میں ظاہری طور پر موجود ہونے سے پہلے تم معدوم تھے بے جان تھے۔

فَاَحْيَاكُمْ: اس نے تم میں جان ڈالی۔یہاں بھی موت کے بعد زندہ کرنے کا وہ مقصد نہیں،جو ہمارے ذہنوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ بے حس وحرکت کر دیا اور پھر اسے حس وحرکت والا کر دیا۔بلکہ یہاں یہ مراد ہے "فاحیاکم فی الارحام والدنیا بنفخ الروح فیکم" رب تعالیٰ نے تمہاری ماؤں کی رحموں (بچہ دانیوں) میں جان ڈال کر تمہیں دنیا میں موجود کیا۔

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ: پھر تمہیں مارے گا،اس موت سے مراد وہی موت ہے جو ہمارے ذہنوں میں مراد ہے کہ ہم کہتے ہیں فلاں شخص فوت ہو گیا،اسی لئے مفسرین کرام نے بیان فرمایا" ثم یمیتکم عند انتهاء آجالکم" کہ تمہاری زندگی کے وقت کے ختم ہونے پر تمہیں مارے گا۔

ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ: پھر تمہیں زندہ کرے گا۔اس زندگی سے مراد کون سی زندگی ہے؟اس پر روح البیان نے جو بیان کیا حاشیہ جلالین میں اسے بالاختصار یوں بیان کیا گیا:

> "اما المحققون فذهبوا الی ان المراد بقوله تعالیٰ ثم یحییکم حیاة القبر وقال فی روح البیان ودل ثم التی للتعقب علی سبیل التراخی علی انه لم یرو به حیاة البعث فان الحیاة یومئذ یقارنها الرجوع"

"محققین حضرات نے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ﴾ (پھر تمہیں زندہ کرے گا) سے مراد "قبر کی زندگی" ہے روح البیان میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس پر

﴿ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ میں لفظ " ثم " دلالت کر رہا ہے کیونکہ لفظ " ثم " تراخی پر دلالت کرتا ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ کام کچھ دیر کے بعد ہوگا ، یعنی تمہیں زندہ کرے گا پھر کچھ دیر کے بعد تمہیں رب تعالیٰ کی طرف لوٹایا جائے گا "

اگر اس سے مراد قیامت کی زندگی ہو تو اس میں " ثم " کا حقیقی معنی مراد نہیں لیا جا سکے گا کیونکہ قیامت کی زندگی کے ساتھ ہی رب تعالیٰ کی طرف رجوع ہوگا اس میں دیر نہیں ہوگی۔

(جلالین ، حاشیہ جلالین)

لیکن خیال رہے کہ ﴿ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ﴾ سے مراد عام مفسرین نے " قیامت کی زندگی " بھی مراد لی ہے اب اس قول کے بعد یہ کہنا پڑے گا کہ رب تعالیٰ کی طرف لوٹائے جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ جب رب تعالیٰ مومنوں سے کلام رحیمانہ فرمائے گا اور کفار سے غیظ و غضب کا کلام فرمائے گا۔ اب اس کے درمیان حشر اور حساب و کتاب پایا جائے گا اس لئے لفظ " ثم " کا معنی بھی حقیقی مراد لے لیا جائے گا۔

(از حاشیہ جلالین)

اس سے قبر کی زندگی مراد لینا بہتر ہے:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی یہی فرمایا کہ جب " ثم " تراخی کے لئے آتا ہے۔ اور قیامت کی زندگی کے بعد تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بغیر دیر کے ہوگا لہذا اس یہ واضح ہو رہا ہے کہ " **فلو جعلنا الآیة من هذا الوجه دلیلا علی حیاة القبر کان قریبا** " اگر ہم اس آیۃ کریمہ میں اس دلیل کے پیش نظر ﴿ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ﴾ سے مراد قبر کی زندگی لیں تو عقل و فہم کے زیادہ قریب ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: اگر قبر کی زندگی مراد لی جائے تو زندگیاں دو سے زیادہ ہو جائیں گی حالانکہ قرآن پاک میں صرف دو زندگیوں کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ثُمَّ اِنَّکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُوْنَ ☆ ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴾

" پھر اسے (انسان کو) اور صورت میں اٹھان دی تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا ہے پھر اس کے بعد تم ضرور مرنے والے ہو پھر تم سب قیامت کو اٹھائے جاؤ گے "

اس آیت کریمہ میں صرف دو حیاتوں کا ذکر ہے تیسری حیات کا ثابت کرنا کیسے صحیح ہے؟ خیال

رہے بعض حضرات نے یہی اعتراض " قالوا ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین " سے کیا ہے کہ اس میں دوموتوں اور حیاتوں کا ذکر ہے۔لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس آیت سے استدلال پسند نہیں فرمایا کہ یہ کفار کے کلام کی حکایت ہے۔جس کو دلیل بنانا درست نہیں البتہ پہلے جس آیۃ کریمہ کو اعتراض میں ذکر کیا گیا ہے اسی کو اعتراض میں دلیل بنانا کسی حد تک درست ہے۔

پہلا جواب: جس آیۃ کریمہ کو معترض نے پیش کیا ہے اس میں دوموتوں اور حیاتوں کا ذکر ضرور ہے لیکن یہ ذکر نہیں کہ دوموتوں اور دوحیاتوں سے زائد کا پایا جانا منع ہے۔تین موتیں اور تین حیاتیں ہوسکتی ہیں۔بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ انسان پہلے مردہ ہوتا ہے یعنی اپنے آباء کی پشتوں میں اور ماؤں کی رحموں میں نطفہ ہوتا ہے۔پھر رحموں سے منتقل کر کے یعنی پیدا کر کے اسے حیات عطا ہوتی ہے پھر اس حیات کے بعد موت آجاتی ہے۔پھر قبر میں زندگی حاصل ہوتی ہے۔پھر قبر میں نفخہ اولی (پہلی مرتبہ صور پھونکنے) کے وقت موت آئے گی پھر حشر کی طرف نشر کے وقت زندگی عطاء ہوگی۔جس کے بعد کوئی موت نہیں آئے گی " **فعلی هذا التاويل هي ثلاث موتات وثلاث احياء ات** " اس تاویل کے مطابق تین موتیں اور تین حیاتیں ثابت ہوگئیں دو سے زائد کے نہ پائے جانے کی بات ختم ہوگئی۔چار موتیں اور چار حیاتیں بھی ہوسکتی ہیں۔کیونکہ جن تین موتوں اور تین حیاتوں سے پہلے اگر ایک اور موت وحیات کو تسلیم کیا جائے تو یہ بھی صحیح ہے،کیونکہ سب سے پہلے تمام انسان اپنے سب سے پہلے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں مردہ تھے پھر ان کی پشت سے تمام چھوٹے چھوٹے ذرات کی شکل میں نکال کر اپنی ربوبیت کا ذکر ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ (کیا میں تمہارا رب نہیں) سے کیا،جس کا جواب قیامت تک آنے والوں نے ان الفاظ سے دیا ﴿ قَالُوْا بَلٰى ﴾ انہوں نے کہا کیوں نہیں (یعنی ہاں اے اللہ تو ہمارا رب ہے) یہ ایک موت وحیات ہوگئی۔تین کا ذکر اسے پہلے کر دیا گیا جن سے پہلے یہ موت وحیات پائی گئے "**فعل هذا اربع موتات واربع احياء ات** '' اس سے پتہ چلا کہ چار موتیں پائی گئیں اور چار ہی مرتبہ زندہ کرنا پایا گیا۔پانچ موتوں اور پانچ حیاتوں کا پایا جانا بھی صحیح ہے۔جن چار موتوں اور چار مرتبہ زندہ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے ان سے پہلے بھی ایک موت وحیات کا ذکر ملتا ہے:

" ان الله تعالىٰ اوجدهم قبل خلق آدم عليه السلام كا لهباء ثم اماتهم فيكون على هذا خمس موتات وخمس احياء ات "

بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے تمام انسانوں ایک مرتبہ ایسے موجود فرمایا جس طرح سورج کی کرنوں کے پڑنے سے روشن دان سے چھوٹے چھوٹے ذرات نظر آتے ہیں، یعنی اس طرح بہت ہی چھوٹے ذرات کی صورت میں موجود کر کے پھر معدوم کر دیا۔ اس صورت میں پانچ موتوں اور پانچ مرتبہ زندہ کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ چھٹی موت وحیات کا ذکر بھی ملتا ہے جیسا کہ حدیث پاک سے واضح ہے کہ جہنم میں کافروں پر تو موت طاری نہیں ہوگی۔ لیکن مومن گنہگاروں کو جہنم میں مار دیا جائے گا پھر زندہ کیا جائے گا حدیث پاک ملاحظہ فرمائیں:

" عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله ﷺ اما اهل النار والذين هم اهلها فانهم لا يموتون فيها ولا يحيون ولكن ناس اصابتهم النار بذنوبهم اوقال بخطايا هم فاماتهم الله اماتة حتى اذا كانوا فحما اذن فى الشفاعة فجئى بهم ضبائر ضبائر فبثوا على انهار الجنة ثم قيل يا اهل الجنة افيضوا عليهم فينبتون نبات الحبة تكون فى حميل السيل " (اخرجه مسلم)

" حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم والے لوگ جو اس کے اھل ہیں (یعنی کفار) بیشک ان کی اس میں موت نہیں آئے گا اور نہ ہی موت کے بعد پھر زندگی (یعنی ان کی زندگی برقرار رہے گی ہمیشہ عذاب میں رہیں گے) لیکن کچھ لوگوں (یعنی گہنگاروں) کو آگ پہنچے گی ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ موت طاری کر دے گا یہاں تک کہ جب وہ کوئلہ بن جائیں گے تو ان کیلئے شفاعت کی اجازت دے دی جائے گی ان کو متفرق جماعتوں کی صورت میں وہاں سے نکالا جائے گی جنت کی نہروں پر پھیلا دیا جائے گا، پھر کہا جائے گا، اے جنت والوان پر پانی بہاؤ وہ ایسے ہو جائیں گے جیسے ندی کی جھاگ میں سبزی وغیرہ کے بیجوں سے پودے اگ پڑیں"

" ضبـــائـــر " جمع ہے ضبارۃ کی۔ جس کا معنی ہوتا ہے مجتمع ہونا یعنی متفرق متفرق جماعتیں۔

"حبة" جب حاء کے نیچے کسرہ ہو تو سبزیوں کا بیج اور جب حاء پر فتح ہو تو گندم جو وغیرہ کا دانہ مراد ہوتا ہے۔

" حميل السيل " ندی کا کسی چیز کو اٹھا کر رکھنا مراد اس سے پانی پر تیرنے والی جھاگ ہے۔ (از قرطبی)

دوسرا جواب: " لم يلزم من عدم الذكر فى هذه الآية ان لا تكون حاصلة " اس آیت میں نہ ذکر کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حیات قبر حاصل بھی نہ ہو (از کبیر) یعنی اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے

کہ " تم یحییکم " سے مراد قیامت کی زندگی ہے تو پھر بھی یہ ثابت نہیں ہو سکے گا، کہ قبر میں زندگی حاصل ہی نہ ہو اس لئے کہ رب تعالیٰ کے دوسرے ارشادات گرامیہ سے قبر کی زندگی واضح طور پر ثابت ہے۔ اور احادیث مبارکہ بھی واضح طور پر ثابت کر رہی ہیں۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

" وحاق بآل فرعون سوء العذاب ، النار یعرضون علیها غدوا وعشیا ویوم تقوم الساعة ادخلوا آل فرعون اشد العذاب "

" فرعون اور اس کے متبعین کا سخت ترین عذاب نے احاطہ کر لیا وہ صبح و شام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اور جس دن قیامت قائم ہوگی اللہ رب العزت ملائکہ کو حکم فرمائے گا کہ فرعونیوں کو شدید ترین عذاب میں داخل کر دو"

" قال القرطبی الجمهور علی ان هذا العرض یکون فی البرزخ وهذا حجة فی تثبیت عذاب القبر وقال غیره وقع ذکر عذاب الدارین فی هذه الآیة مبینا ومفسرا " (فتح الباری ج ۵ ص ۷۰۳ مطبع انصاری دهلی)

" علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علامہ قرطبی نے کہا جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ "النار یعرضون علیها" سے عالم برزخ میں آگ پر پیش کیا جانا مراد ہے اور یہ آیہ کریمہ اثبات عذاب قبر میں حجت و دلیل ہے"

علامہ قرطبی کے علاوہ دوسرے علماء حضرات نے فرمایا کہ اس میں دار آخرت اور عالم برزخ دونوں کے عذاب کا واضح اور تفصیلی بیان ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا " احتج اصحابنا بهذه الآیة علی اثبات عذاب القبر " (کبیر) اسی آیۃ سے ہمارے علماء متکلمین نے عذاب قبر کے اثبات پر استدلال کیا ہے۔ اگر کوئی شخص تفصیلی طور پر اس مسئلہ کو سمجھنا چاہے تو استاذی المکرم حضرت مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی کی کتاب "جلاء الصدور" کا مطالعہ کرے۔

تنبیہ: اس آیۃ سے مجسمہ فرقہ غلطی کا شکار ہوا ہے۔ کہ انہوں نے کہا ہے کہ رب تعالیٰ کا مکان ہے۔ کیونکہ جب رب نے خود فرمایا ہے ﴿ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ اس کا مکان ہے لیکن یہ ان کا کہنا غلط ہے اس لئے کہ کہا جاتا ہے "رجع الامر الی الامیر" امیر کی طرف حکم لوٹا لیکن اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے "رجع الامر الی حیث لایحکم غیره" یہ معاملہ وہاں پہنچ چکا ہے کہ اس کا حکم امیر (حاکم) کے بغیر کوئی اور نہیں دے سکتا۔

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

(۱) صرف اللہ تعالیٰ ہی زندگی اور موت عطاء کرنے والا ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے زندگی عطاء کرنے اور موت عطاء کرنے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اس سے ان لوگوں (اھل الطبائع) کا رد ہو گیا، جو ستاروں کو، افلاک کو، مزاج وغیرہ کو موت اور زندگی کے مستقل اسباب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے مزاج وغیرہ تو اس کی مخلوق ہے۔

(۲) اسی آیۃ کریمہ سے حشر ونشر پر دلیل واضح ہو جاتی ہے اور عقل سلیم بھی اسے مانتی ہے کہ جو رب تعالیٰ انسان کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے وہی موت کے بعد بھی حیات عطاء کرنے پر قادر ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا کہ وہ زندگی عطاء کرنے والا ہے اور وہی موت عطاء کرنے والا ہے جو تمہارے لئے نعمتیں ہیں اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ اس میں خوف بھی دلایا گیا ہے کہ جب تم نے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے تو اس کے عذاب سے بھی ڈرتے رہو۔ اسی سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ انسان کو مکلّف بنانے میں ترغیب اور ترھیب (رغبت دلانے اور خوف دلانے) دونوں سے ہی کام لیا گیا ہے۔ (از کبیر)

فائدہ عظیمہ: موت وحیات کے کئی معانی ہیں۔ جب تک ان کا علم نہ ہو تو انسان غلط معنی کر کے خود بھی گمراہ ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ اس لئے ان معانی کی طرف توجہ فرمائیں:

پہلا معنی: موت کا معنی روح روح کا جسم سے تعلق ٹوٹنا، اور حیوۃ کا معنی روح کا جسم سے تعلق برقرار رہنا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ﴾ ہر جان چکھنے والی ہے موت کو۔ اگر "نفس" کا معنی بدن ہو تو ذائقہ کا معنی ہوگا نازل ہونا، واقع ہونا یعنی ہر بدن سے روح کا تعلق ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح ہر بدن پر موت واقع ہوگی۔ اگر نفس سے مراد روح لیا جائے تو ذائقہ کا معنی چھکنا ہوگا جو سیر ہو کر کھانے کا مدمقابل ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ روح کے ساتھ موت کا اتنا ہی تعلق ہوگا کہ روح کا رابطہ بدن سے ٹوٹے گا لیکن روح میں زندگی برقرار رہے گی۔

دوسرا معنی: زمین میں نباتات اگانے کی تاثیر کا پایا جانا "حیوۃ" اور نہ پایا جانا "موت" ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ﴾

''اور وہ جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو اس سے زندہ کردیا''

اس مقام پر زمین کے مردہ ہونے سے مراد بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے زمین کا نباتات کے اگانے سے غیر مؤثر ہو جانا ہے۔ اور زمین کے مردہ ہونے سے مراد بارشوں کی وجہ سے زمین میں نباتات اگانے کی تاثیر کا پایا جانا ہے۔

تیسرا معنی: ایمان و کفر یعنی ''حیوۃ'' سے مراد ''ایمان'' اور ''موت'' سے مراد ''کفر''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ، اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾

''اور برابر نہیں زندہ اور مردے بیشک اللہ سناتا ہے جسے چاہے اور تم نہیں سنانے والے انہیں جو قبروں میں پڑے ہیں''

اس آیۃ کریمہ میں ''احیاء'' سے مراد ''مؤمنین'' اور ''اموات'' سے مراد ''کفار'' ہیں کفار کو مردوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح مردے سنی ہوئی بات یعنی پند و نصائح سے نفع نہیں حاصل کر سکتے۔ کیونکہ عمل کا دار و مدار دنیاوی زندگی سے تھا اسی طرح کفار کا بھی یہی حال ہے کہ جن کی موت کفر پر یقینی ہے وہ ہدایت و نصیحت سے کوئی نفع نہیں حاصل کر سکتے۔

خیال رہے کہ اس آیۃ کریمہ میں قبروں والوں سے مراد کفار ہیں فوت شدہ انسان نہیں روح المعانی، مدارک اور ان کے علاوہ معتبر تفاسیر کو دیکھیں یہاں سے یہ ثابت کرنا کہ قبر والے انسان نہیں سنتے یہ گمراہی ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا ہے۔

چوتھا معنی: توجہ کرنا حیات، اور توجہ نہ کرنا موت ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ما من احد یسلم علی الارد اللہ روحی حتی اردہ علیہ السلام'' (مسند احمد ابو داؤد) جو شخص مجھ پر سلام پیش کرتا ہے اللہ تعالیٰ میری توجہ اس کی طرف مبذول کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی تجلیات کے انوار کے مشاہدہ میں مستغرق ہوتے ہیں دنیا سے بے نیاز ہوتے ہیں جب درود شریف پڑھنے والا آپ پر درود

وسلام پیش کرتا ہے تو اس وقت آپ استغراقی حالت سے واپس لوٹ کر اس شخص کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس کو سلام کا جواب دیتے ہیں۔ اس حالت کو "رد روح" (روح کا لوٹنا) یعنی حیوۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سبحان اللہ نبی کریم ﷺ پر سلام پیش کرنے والے کی کتنی شان ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ بنفس نفیس آپ اس کو سلام کا جواب دیتے ہیں۔

یہاں سے واضح طور پر سمجھ آیا کہ موت کا معنی ہمیشہ مردہ ہونا ہی نہیں بلکہ دنیا سے توجہ ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح متوجہ کرنا کہ استغراقی حالت پیدا ہو جائے یہ بھی بنسبت دنیا کے موت ہے۔ اور دنیا کی طرف متوجہ ہونا اس معنی کے لحاظ سے حیوۃ ہے۔

پانچواں معنی: حیوۃ کا معنی بیداری اور موت کا معنی نیند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

" وهو الذی یتوفاکم باللیل ویعلم ماجرحتم بالنھار ثم یبعثکم فیه لیقضی الی اجل مسمی "

''اور وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ دن میں کماؤ پھر تمہیں دن میں اٹھاتا ہے کہ ٹھہرائی میعاد پوری ہو''

اس آیۃ کریمہ میں اس مسئلہ پر دلیل قائم فرمائی ہے کہ آخرت میں زندگی عطا ہوگی۔ یعنی موت کے بعد پھر زندہ ہونا ہے جس طرح روزمرہ سونے کے وقت تم پر ایک قسم کی موت مسلط کی جاتی ہے یعنی تمہارے حواس معطل ہو جاتے ہیں چلنا پھرنا، کھانا پینا کسی چیز کو پکڑنا وغیرہ تمام افعال جو انسان بیداری میں کرتا ہے وہ معطل ہو جاتے ہیں اس کے بعد جو انسان جاگتا ہے تو بیداری کے تمام تصرفات پھر اللہ تعالیٰ اسے لوٹا دیتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نیند میں افعال کو سلب کر لیتا ہے اور جاگتے وقت پھر عطا کرتا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ موت عطا کر کے بظاہر تمام تصرفات کو معطل کر کے پھر قبر اور حشر میں زندگی عطا کر کے ان تصرفات کو لوٹا دے۔

چھٹا معنی: حیوۃ سے مراد دلوں کا زندہ ہونا اور موت سے مراد دلوں کا مردہ ہونا۔

ساتواں معنی: حیوۃ سے مراد عزت کی زندگی موت سے مراد ذلت کی زندگی جو مردہ ہونے کی طرح ہے۔

آٹھواں معنی: حیوۃ سے مراد شہادت جو دنیا کی زندگی سے اعلیٰ زندگی عطا کرتی ہے۔ اور موت سے مراد دنیاوی زندگی جو بنسبت شہادت کے گھٹیا ہوتی ہے۔ ان آخری تینوں معنوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ

ارشادگرامی دلالت کررہاہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ﴾

''اے ایمان والواللہ اوراس کے رسول کے بلانے پر حاضر ہوجاؤ جب رسول تمہیں اس چیز کے لئے بلائیں جوتمہیں زندگی بخشے گی''

وہ کیا چیز ہے جوزندگی بخشنے والی ہےاورزندگی سے مراد کیا ہے؟

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کاقول ہے وہ چیز قرآن ہے کیونکہ اس سے دلوں کوزندگی حاصل ہوتی ہےاوراس سے نجات حاصل ہوتی ہےاوراس میں عصمت دارین ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ حیوۃ کا معنی کبھی دل کی زندگی اور موت کا معنی دل کی مزدگی ہوتا ہے۔اور اگردل اللہ تعالیٰ کی یاد میں رہااورغفلت میں مبتلا نہ ہوا تو وہ زندہ ہوگا۔اوراگراللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہاتومردہ ہوگا۔محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ کاقول یہ ہے کہ وہ چیز جہاد ہےجس سے زندگی حاصل ہوتی ہے اس لئے کہ جہاد کے ذریعے اللہ تعالیٰ عزت فرماتا ہے:

اس سے یہ واضح ہوا کہ عزت کی زندگی ہی درحقیقت زندگی اور ذلت کی زندگی موت ہے۔بعض مفسرین نے فرمایا کہ وہ شہادت ہے جوزندگی بخشتی ہےاس طرح شہادت سے حاصل ہونے والی زندگی اعلیٰ قسم کی زندگی ہونے کی وجہ سے درحقیقت زندگی کہلانے کی حقدار ہےاس کے مقابل دنیا کی زندگی اگرچہ بظاہرزندگی ہی ہےلیکن گھٹیاہونے کی وجہ سے مردگی کی طرح ہی ہے۔ (قرطبی ، روح المعانی ، کبیر وغیرہ)

نواں معنی: موت کا معنی سکون اورحیات کا معنی حرکت جس طرح کہا جاتا ہے ماتت الریح ہوارک گئی۔یعنی ہوا کے رکنے،ٹھہرنے کوموت کہا گیا ہےاورہوا کے چلنے کوحیات

دسواں معنی: قوت عاقلہ کے زوال یعنی جہالت کوموت کہہ لیا جاتا ہےاورعلم کوحیات۔

گیارھواں معنی: فقرکوکبھی موت کہہ لیا جاتا ہےاورغناءکوحیات۔

بارھواں معنی: معصیت کوموت کہا جاتا ہےاورنیکی کرنے کوحیات۔

تیرھواں معنی: بڑھاپے کوموت سے کبھی تعبیر کرلیا جاتا ہےاورجوانی کوحیات سے۔

(ماخوذ ازحاشیہ مشکوۃ ص ۲۰۸)

☆☆☆

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾

''(رب) وہی ہے جس نے تمہارے لئے بنایا جو کچھ زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف استواء (قصد) فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وہ سب کچھ جانتا ہے''

''(اللہ) وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پھر متوجہ ہوا آسمان کی طرف تو ٹھیک سات آسمان بنائے وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے''

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا ذکر فرمایا کہ اس نے تمہیں زندگی عطا فرمائی اب ایک اور نعمت کا ذکر کیا جارہا ہے کہ اس نے تمہارے نفع کے لئے زمین میں تمام چیزوں کو پیدا فرمایا۔ اور ساتھ ہی آسمانوں کی تخلیق کا ذکر فرمایا گویا کہ انسانوں کو تدبر کرنے کا سبق دیا کہ وہ ذات جو زمین وآسمان کی تخلیق پر قادر ہے وہ تمہاری موت کے بعد زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے کوئی چیز اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں۔

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ اس مقام پر ''خلق'' کا معنی ''اخترع واوجد بعد العدم'' (یعنی عدم کے بعد معرض وجود میں لایا) ہے۔ ''لکم ای لانتفاعکم'' زمین میں تمام چیزیں تمہارے لئے پیدا کی ہیں یعنی رب تعالیٰ نے تم پر انعام فرمایا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بھی پتہ چل گیا کہ اس کے بغیر زمین میں تمام چیزوں کا کوئی خالق نہیں اور اسی سے سوچنے کا موقع بھی مل گیا کہ جو ذات تمام چیزوں کے پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ہمیں بھی موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے۔

اعتراض: زمین کی چیزوں میں تو سانپ اور بچھو بھی ہیں جو انسان کے لئے ضرر انداز ہیں ان میں تو انسان کو کوئی نفع نہیں تو کس طرح تمام چیزیں نفع مند ہوئیں؟

جواب: انسان جب یہ سوچے کہ کافروں کے لئے سانپ اور بچھو عذاب ہوں گے تو اسے ایمان حاصل ہوگا اور وہ گناہوں کو چھوڑ دے گا اس سے بڑھ کر اور عظیم نفع انسان کو کیا حاصل ہوگا۔ (از قرطبی، مدارک)

فائدہ: ارباب معانی نے کہا ہے کہ ﴿ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ (زمین میں تمام چیزیں تمہارے لئے پیدا کیں) کا مطلب یہ ہے کہ " لتتقووا به علی طاعته لا لتصرفوه فی وجوه معصیته " تم ان چیزوں سے قوت حاصل کرو کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کرسکو اور ان چیزوں کو معصیت میں نہ لگاؤ۔

فائدہ جلیلہ: ابو عثمان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تمام چیزیں انسانوں کو عطا فرمادی ہیں " لتستدل به علی سعة جوده " تا کہ انسان اسی سے سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ کے جود میں بہت وسعت ہے۔ اور اس کی عظیم نعمتیں آخرت میں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ اور انسان کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس کی نعمتیں شمار میں نہیں آسکتیں۔ اور اس نے انسان کو عمل سے پہلے ہی بہت بڑی نعمتیں عطا فرمادیں۔ ان تمام چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا پتہ چلتا ہے۔ اور انسان کو بھی سخاوت کرنے کا درس ملتا ہے۔ سخاوت کو ہی سرکار دو عالم ﷺ نے پسند فرمایا۔

☆ "عن عمر بن خطاب رضی الله عنه ان رجلا اتی رسول الله ﷺ فساله ان یعطیه فقال رسول الله ﷺ ما عندی ولکن ابتع علی فاذا جاء شی قضیان فقال له عمر " هذا عطیت اذا کان عندک فما کلفک الله ما لا تقدر فکره رسول الله ﷺ قول عمر فقال رجل من الانصار یارسول الله" انفق ولا تخش من ذی العرش اقلالا فتبسم رسول الله ﷺ وعرف السرور فی وجهه لقول الانصاری ثم قال رسول الله ﷺ بذالک امرت "

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بیشک ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا آپ سے اس نے سوال کیا کہ آپ مجھے کچھ عطا کریں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس اس وقت کوئی چیز نہیں۔ البتہ تم (ادھار) خرید لو اس کا قرض مجھ پر ہوگا جب کوئی چیز ملے گی تو ہم ادا کردیں گی۔ (حضرت) عمر نے عرض کیا جب آپ کے پاس کوئی چیز ہوئی تو آپ اسی کو دے دینا (ابھی سے قرض اپنے ذمہ لینے کی کیا ضرورت ہے) آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس چیز کی تکلیف تو نہیں دی جس پر

آپ قادر ہی نہیں۔تو نبی کریم علیہ السلام (حضرت) عمر کے اس قول کو ناپسند فرمایا۔انصاری میں سے ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ آپ خرچ کرتے رہے صاحب عرش (رب تعالیٰ) سے کمی کا خوف نہ کریں انصاری صحابی کی بات سن کر نبی کریم علیہ السلام مسکرائے اور خوشی کے آثار آپ کے چہرہ مبارک پر نظر آ رہے تھے آپ نے فرمایا ہاں مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے۔

اس حدیث پاک سے بھی یہ واضح ہوا کہ انسان سخاوت کرتا رہے مال کی کمی سے نہ ڈرے کیونکہ رب تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا اور مال بڑھتا رہے گا۔خصوصاً جب انسان اس آیۃ کریمہ میں تفکر کرے کہ ﴿ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾رب تعالیٰ نے ہمیں خطاب فرماتے ہوئے جب ارشاد فرمادیا کہ ''زمین میں تمام چیزیں تمہارے لئے پیدا کیں'' تو پھر ہمیں کس چیز کی کمی ہے۔اور جب اس آیۃ کریمہ ﴿ وَسَخَّرَلَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ﴾ (اور تمہارے لئے مسخر فرمادیں زمین وآسمان کی تمام چیزیں) میں انسان غور وفکر کرے تو اس پر یہ واضح ہوجائے گا کہ جب زمین وآسمان کی تمام چیزیں ہمارے لئے مسخر فرمائی ہیں تو ہمیں بھی چاہئے کہ ہم اس کے احکام کو تسلیم کریں۔انسان کو یہی چاہئے '' لیکون له عبدا كما خلقه عبدا '' کہ رب کا عبادت گزار بن جائے کیونکہ انسان کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی عبادت کرے۔رب تعالیٰ کے ارشادگرامی سے یہ مقصد روز روشن کی طرح واضح ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ﴾

''میں نے انسانوں اور جنوں کو اپنی عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے''

انسان جب رب تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے مال کی کمی کا ڈر نہ رکھے اور یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور عطا کرے گا تو یقیناً اس کے مال میں برکت ہوتی رہے گی۔

☆ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿ وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴾اور جو چیز تم (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اللہ اس کے بدلے اور عطا کرے گا وہ بہتر رزق دینے والا ہے

☆ حضرت سلیمان علیہ السلام کے کلام کی رب تعالیٰ نے ان الفاظ سے حکایت بیان فرمائی ہے ''فان ربی غنی کریم '' بیشک میرا رب غنی اور کریم (صاحب جود وکرم) ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ فرماتا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے):

" سبقت رحمتی غضبی یا ابن آدم انفق انفق علیک یمین اللہ ملای سحا لایغیضها شئی اللیل والنهار "

'' اے ابن آدم (انسان) میری رحمت کو میرے غضب پر سبقت حاصل ہے تو خرچ کر، تو خرچ کر، تجھ پر اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ فیضان کرنے والا رحمت بھرا دست قدرت ہے رات اور دن میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی''

☆ " وقال رسول اللہ ﷺ ما من یوم یصبح العباد فیه الا وملکان ینزلان فیقول احدهما اللهم اعط منفقا خلفا ویقول الآخر اللهم اعط ممسکا تلفا، وکذا فی المساء عند الغروب ینادیان ایضا "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندوں کے پاس ہر صبح دو فرشتے آتے ہیں ایک ان میں سے یہ کہتا ہے اے اللہ (اپنی راہ میں) خرچ کرنے والے کو اور عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ جو تیری راہ میں نہ خرچ کرے اس کے مال کو برباد کر اور ہر شام غروب آفتاب کے وقت بھی وہ دونوں فرشتے ضرور ہی آتے ہیں اور یہی دعاء کرتے ہیں۔

مذکورہ احادیث کو بیان کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "وهذا کله صحیح رواه الائمة والحمد لله " الحمدللہ یہ تمام کی تمام روایات صحیح ہیں جن کو ائمہ احادیث نے بیان کیا ہے۔ نتیجہ واضح ہوا کہ جس شخص کا سینہ روشن ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ میرا رب غنی اور کریم ہے وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا اسے کسی قسم کی کمی کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اسی طرح جس شخص نے اپنی دنیاوی خواہشات کو ختم کر دیا اور تھوڑی روزی گزر اوقات پر صابر و شاکر رہا اپنی نفسانی خواہشات کو منقطع کر دیا تو وہ ہر مشکل اور آسانی میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا اسے کسی قسم کی مال کی کمی کی کوئی فکر نہیں ہوگی۔ خوف وہی کرے گا جسے خود اپنی خواہشات کی زیادہ فکر ہوگی کہ میں نے آج مال خرچ کیا تو میں خود کل کیا کروں گا ایسا شخص دراصل رب تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے۔

" روی مسلم عن اسماء بنت ابی بکر قالت قال لی رسول اللہ ﷺ انفحی او انضحی او انفقی ولا تحصی فیحصی اللہ علیک ولا توعی فیوعی علیک "

مسلم نے اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ہے وہ کہتی ہے رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا تم (اللہ کی راہ میں) مال دو اور زیادہ دو یہاں تک خرچ کرو کہ اسے گن گن کر (تھوڑی مقدار میں) خرچ نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہیں تھوڑا مال ہی عطا کرے گا اور مال کو جمع کر کے نہ رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے خزانہ رحمت کو تم پر جمع کر کے رکھے گا۔

وضاحت حدیث: نفح اور نضح کا معنیٰ عطا کرنا اور نضح کا معنیٰ پانی کا بہانا بھی آتا ہے۔ یہاں یہی معنیٰ مناسب ہے یعنی زیادہ سے زیادہ عطا کرنا۔ اور انفقی میں او کا استعمال راوی کے شک کے پیش نظر بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے الفاظ آپ نے ذکر فرمائے یا بعد والے۔

لیکن راقم نے "او" کو "الی ان" (یہاں تک) کے معنیٰ میں لے کر ترجمہ کیا ہے جس میں عجیب ذوق محسوس ہوتا ہے (واللہ اعلم بالصواب) "ایعاء" کا معنیٰ ہوتا ہے برتن وغیرہ میں کسی چیز کو جمع کر کے رکھنا لاتوعی (مؤنث) جمع کر کے نہ رکھو۔ باقی حدیث پاک کا مفہوم ترجمہ سے ہی بہت واضح ہو رہا ہے۔

☆ "روی النسائی عن عائشة قالت دخل علی سائل مرة وعندی رسول اللہ ﷺ فامرت له بشی ثم دعوت به فنظرت الیه فقال رسول اللہ ﷺ اما تریدین الا یدخل بیتک شئی ولا یخرج الا بعلمک قلت نعم قال مهلا یا عائشة لا تحصی فیحصی اللہ عزوجل"

نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی۔ آپ فرماتی ہیں ایک مرتبہ ایک سائل آیا میں نے (اپنی خادمہ کو) اسے کچھ عطا کرنے کا حکم دیا (جب وہ خادمہ اسے دینے لگی) تو میں نے وہ چیز واپس طلب کی پھر اسے دیکھنے لگی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ کیا تم یہ نہیں چاہتی کہ تمہارے گھر کوئی چیز نہ داخل ہو اور (تمہارے گھر سے) سوائے تمہارے علم کے کوئی چیز نہ نکلے میں نے کہا (ہاں یارسول اللہ میں یہی چاہتا ہوں) آپ نے فرمایا اے عائشہ ٹھہر جاؤ، کوئی چیز گن کر نہ دو (یعنی تھوڑی چیز نہ دو) ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہیں گن کر (تھوڑی چیز ہی) عطاء کرے گا۔ (ماخوذ از قرطبی)

نکتہ عظیمہ: غزالی دوراں حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ کیا خوب فرماتے ہیں ذرا

توجہ سے پڑھئے۔

اس آیۃ کریمہ اور دیگر آیات قرآنیہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کی دلیلوں اور نعمتوں کو بیان فرما کر اپنے بندوں کو اپنی طرف متوجہ فرمایا ہے اور " **هوى الذى ارسل رسوله بالهدى** "(فتح ت ۲۸) فرما کر رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدسہ کو بھی اپنی معرفت کی روشن دلیل اور نعمت عظیمہ کی حیثیت سے پیش فرما کر اپنے بندوں کو اپنی طرف بلایا ہے گویا تمام دلائل معرفت کا مجموعہ رسول کریم ﷺ کی ذات مقدس ہے۔ اسی طرح تمام نعمتوں کا خزینہ بھی حضور ﷺ ہی کا وجود اقدس ہے بلکہ کوئی دلیل جب تک انوار رسالت کی روشنی میں نہ دیکھی جائے معرفت کا فائدہ نہیں دیتی۔

یہی وجہ ہے کہ علوم عقلیہ میں مہارت تامہ رکھنے والے مشہور اکابر عقلاء وحکماء نے ان دلائل سے معرفت حاصل نہیں کی کیونکہ نور نبوت سے انہوں نے روشنی حاصل نہیں کی تھی اسی طرح یہ سب نعمتیں صحیح معنی میں ہمارے لئے اسی وقت نعمت قرار پاسکتی ہیں جب ان کا حصول رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہو۔ اس کے بغیر کوئی نعمت حقیقی نہیں ہوسکتی بلکہ جس نعمت کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس سے نہ ہو وہ زحمت بن جاتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی پاک نعمتیں (مال ہو یا اولاد) حضور ﷺ سے الگ ہو کر مثلاً زنا، سود، رشوت، غصب اور سرقہ کے ذریعے حاصل کی جائیں تو وہ بظاہر نعمت ہونے کے باوجود حقیقتاً زحمت ہوں گی۔ پھر یہ کہ یہ سب دلیلیں معرفت الھیہ کی خاموش دلیلیں ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی عبادت کرتے رہے اور یہ سب دلیلیں خاموش رہیں۔ ناطق دلیل رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس ہے یا وہ دلیلیں جن کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے روحانی فیض سے ناطق بنا دیا۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ تمام دلائل معرفت اور اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کو حضور ﷺ کے واسطہ سے حاصل کیا جائے۔ (التبیان مع البیان)

مسئلہ:

" واستدل كثير من اهل السنة الحنيفية والشافعية بالآية على اباحة الاشياء النافعة قبل ورود الشرع وعليه اكثر المعتزلة واختاره الامام فى المحصول والبيضاوى فى المنهاج "

کثیر اہل سنت نے خواہ حنفی ہوں یا شافعی ہوں اسی آیۃ سے دلیل پکڑی ہے کہ شرع کے وارد

ہونے سے پہلے تمام نفع دینے والی اشیاء مباح ہیں۔ اکثر معتزلہ کا بھی اہل سنت سے اس مسئلہ میں اتفاق ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب محصول میں اسی سے اتفاق کیا ہے۔ اور قاضی بیضاوی نے بھی اپنی کتاب منہاج میں اسی سے اتفاق کیا ہے۔

(روح المعانی)

کمال کی بات یہ ہے کہ صدیق بھوپالوی نے فتح البیان میں بھی یہی تحریر کیا ہے:

" وفیہ دلیل علی ان الاصل فی الاشیاء المخلوقة الاباحة حتی یقوم دلیل یدل علی النقل عن ھذا الاصل "

(فتح البیان)

اس میں دلیل ہے اس پر کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے جب تک اس کے خلاف کوئی دلیل نہ پائی جائے۔

ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ : پھر آسمان کی طرف استواء (قصد) فرمایا۔ استواء کا مشہور معنی جو اکثر مترجمین نے لیا ہے وہ یہ ہے:

" الاستواء ھھنا مضمن معنی القصد و الاقبال لانہ عدی بالی "

اس مقام پر "استواء" قصد اور توجہ کے معانی کو متضمن ہے کیونکہ " الی " سے متعدی ہے یعنی جب " استواء " کے بعد " الی " آجائے تو اس وقت اس کا معنی قصد کرنا اور توجہ کرنا ہوتا ہے

(ابن کثیر)

اسی کے پیش نظر اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "استواء (قصد) فرمایا" ترجمہ کیا ہے اور راقم نے "متوجہ ہوا" ترجمہ کیا ہے تقریباً مقصود ایک ہی ہے۔ یعنی آسمانوں کے بنانے کی طرف رب تعالیٰ نے توجہ فرمائی اور ارادہ کیا کسی چیز کو ذہن میں رکھ کر وہ کام کرنے کا جب کوئی انسان ارادہ کرتا ہے تو اس وقت ہمارے روزمرہ معمول کے مطابق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں کی توجہ تو آج کل صرف اس کام کی طرف ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ سیدھا قصد ہو یعنی صرف ایک طرف توجہ ہو ادھر ادھر نظر نہ ہو تو "استواء" ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "استوی الیہ کالسھم المرسل " چھوڑے ہوئے تیر کی طرح سیدھا قصد کیا۔ فراء نے اس کا معنی غالب ہونا مالک ہونا لیا ہے اور " الی " کو " علی " کے معنی میں لیا ہے کہ پھر رب تعالیٰ نے آسمانوں پر غلبہ حاصل کیا۔ لیکن علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا " وھو خلاف الظاھر " یہ معنی خلاف ظاہر ہے " السماء " سے مراد کیا ہے؟" والمراد بالسماء الاجرام

العلوية وجهة العلو " السماء سے مراد یا تو آسمان ہیں اور یا بلندی مراد ہے۔(روح المعانی) اکثر مترجمین نے ''آسمان'' ہی معنی کیا ہے تاہم مفکر السلام مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے دوسرا معنی ذکر فرمایا ہے آپ کا ترجمہ یوں ہے ''پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف'' (ضیاء القرآن)

فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ: تو ٹھیک سات آسمان بنائے "هن" ضمیر " السماء " کی طرف لوٹ رہی ہے معنی اس کا یہ ہے:

''عدلهن وخلقهن مصونة من العوج والفطور''

آسمانوں کو ٹیڑھا پن، سوراخوں دراڑوں اور عیب وخلل سے محفوظ بنایا۔

سات آسمان، سات زمینیں:

اس آیۃ کریمہ سے سات آسمانوں کا ثبوت تو واضح طور پر ہے۔البتہ سات زمینوں کا ذکر دوسری آیۃ کریمہ سے ہو رہا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾ (الطلاق آية نمبر ١٢)

''اللہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور انہیں کے برابر زمینیں''

اس آیۃ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ آسمان سات ہیں اور زمینیں بھی ان کی مثل سات ہی ہیں

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے سات زمینیں ثابت کرنا کوئی یقینی بات نہیں کیونکہ اس میں کئی اقوال ملتے ہیں۔اس میں ایک قول یہ ہے کہ "مثلهن" سے مراد کیفیت میں مثلیت ہے کہ آسمانوں کی طرح زمینوں میں بھی موٹائی پائی جاتی ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ مثل سے مراد یہ ہے کہ جس طرح آسمانوں کے درمیان فاصلہ ہے۔اسی طرح زمینوں کے درمیان بھی فاصلہ ہے تو کس طرح سات زمینیں ثابت ہو سکتی ہیں۔

جواب: معتبر قول یہ ہے:

" ومن الارض مثلهن ای فی العدد لان الكيفية والصفة مختلفة بالمشاهدة والاخبار فتعين العدد "

زمینوں کا آسمانوں کے مثل ہونے سے مراد تعداد میں مثل ہونا ہے۔کیونکہ کیفیت اور صفات

میں آسمان اور زمین مختلف ہیں۔ یہ مشاہدہ سے بھی ثابت ہے اور اخبار سے بھی ثابت ہے۔ جب زمین و آسمان ایک دوسرے کے کیفیت وصفات میں ایک دوسرے کی مثل نہیں تو تعداد میں مثل ہونا معین ہو گیا اسی قول کو احادیث مبارکہ سے تائید حاصل ہے کیونکہ احادیث میں سات زمینوں کا واضح طور پر ذکر ہے

☆ " روی مسلم عن سعید بن زید قال سمعت رسول الله ﷺ یقول من اخذ شبرا من الارض ظلما طوقه الی سبع ارضین "

مسلم نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے کسی کی زمین ایک بالشت برابر ظلم سے لے لی وہ زمین اس کے گلے میں (قیامت کے دن) سات زمینوں تک طوق بنا کر ڈال دی جائے گا۔

☆ " ومن حدیث ابی هریرة لا یاخذ احد شبرا من الارض بغیر حقه الا طوقه الله الی سبع ارضین "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث میں ذکر ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک شخص بھی کسی کی زمین ایک بالشت برابر ناحق (ظلم کے طور) پر نہیں لیتا مگر یہ کہ وہ زمین اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دے گا جو سات زمینوں تک ہو گا۔

☆ " وروی النسائی عن ابی سعید الخدری عن رسول الله ﷺ قال قال موسی علیه السلام یا رب علمنی شیا اذکرک وادعوک به قال یاموسی قل لا اله الا الله قال موسی یارب کل عبادک یقول هذا قال قل لا اله الا الله قال لا اله الا انت انما ارید شیا تخصنی به قال یاموسی لو ان السموات السبع وعامرهن غیری والارضین السبع فی کفة ولا اله الا الله فی کفة مالت بهن لا اله الا الله "

نسائی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ رب کے حضور عرض کیا اے میرے رب مجھے ایسے الفاظ کی تعلیم عطا فرما جن سے میں تیرا ذکر کروں اور تجھ سے دعاء کروں۔ رب تعالیٰ نے کہا اے موسیٰ تم یہ کہا کرو " لا الہ الا اللہ " موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب یہ تو تیرے سارے بندے ہی کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا تم کہا کرو " لا الہ الا اللہ " موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا " لا الہ الا انت " تیرے بغیر

اور کوئی معبود نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مجھے خصوصی طور پر کچھ عطا فرما (یعنی جو صرف مجھے ہی حاصل ہو میرے بغیر اور کسی کو حاصل نہ ہو اس میں تو میرا بھی ایمان ہے کہ تیرے بغیر اور کوئی معبود نہیں) رب تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ اگر سات آسمان اور ان میں میرے بغیر جو مخلوق ہے اور سات زمینیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیئے جائیں اور " لا الہ الا اللہ " کو دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا تو وہ پلڑا جھکے گا (یعنی وہی بھاری ہوگا) جس میں "لا الـــہ الا اللہ" ہوگا۔ ان احادیث سے سات زمینوں کا ثابت ہونا بہت واضح طور پر مذکور ہے۔ جو شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ زمین کی تخلیق پہلے ہے اور آسمانوں کی بعد میں لیکن دوسری آیۃ میں ذکر ہے " والارض بعد ذلک دحاھا " اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمین کی تخلیق بعد میں ہے دونوں آیتوں میں تطبیق کیسے۔

جواب: حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول اس مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے وہ یہ ہے:

" ان اللہ تعالیٰ خلق اولاد خان السماء ثم خلق الارض ثم استوی الی السماء وھی دخان فسواھا ثم دحا الارض بعد ذلک "

"بیشک اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمانوں کے دھواں کو پیدا فرمایا پھر زمین کو پیدا فرمایا۔ پھر آسمانوں کی طرف توجہ فرمائی ان کو دھوئیں سے ٹھیک ٹھیک بنایا پھر زمینوں کو پھیلایا" (قرطبی)

یعنی آسمانوں کا مادہ پہلے پیدا کیا۔ پھر اصل زمین کو پیدا کیا۔ پھر آسمانوں کے مادہ سے آسمانوں کو پیدا فرمایا پھر زمین کو پھیلایا۔ " دحا الشئی بسطه " کسی چیز کو پھیلایا جائے تو "دحا الشئی" بولا جاتا ہے " والارض بعد ذلک دحاھا " کا معنی یہ ہے " ثم دحا الارض بعد ذلک وکانت اذ خلقھا غیر مدحوۃ " یعنی پہلے فقط اصل زمین کو پیدا کیا گیا اس وقت اسے پھیلایا نہیں گیا پھر اسے آسمانوں کی تخلیق کے بعد پھیلایا گیا۔

اعتراض: حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کے قول سے پتہ چلتا ہے کہ آسمان دھوئیں سے بنا ہے حالانکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ ہر چیز کی پیدائش پانی سے ہوئی:

" عن ابی ھریرۃ قال قلت یا رسول اللہ اذا رایتک طابت نفسی

وقرت عینی انبئنی عن کل شئی قال کل شئی خلق من الماء ، فقلت اخبرنی عن شئی اذا عملت به دخلت الجنة قال اطعم الطعام وافش السلام وصل الارحام وقم اللیل والناس ینام تدخل الجنة (ابن ماجه ، مسند ابی حاتم بستی) قال ابو حاتم قول ابی هریرة ، انبئنی عن کل شئی ، اراد به عن کل شئی خلق من الماء "

" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے کہا یارسول اللہ جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو میرا نفس خوش ہوتا ہے (یعنی آپ کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور میرے دل کو قرار حاصل ہوتا ہے) اور میری آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے مجھے ہر چیز (جو پانی سے پیدا ہوئی) کی خبر دیں آپ نے فرمایا ہر چیز ہی پانی سے پیدا ہوئی پھر میں نے کہا مجھے کسی ایسے عمل کی خبر دیں جس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہوں۔ آپ نے فرمائی (غرباء ومساکین کو) طعام کھلاؤ اور سلام عام کرو (یعنی ہر ملنے والے کو سلام دو) اور صلہ رحمی کرو اور رات کو قیام کرو ایسے حال میں کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں تو جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا " مجھے ہر چیز کی خبر دو " اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ یہ پوچھ رہے تھے کہ مجھے ہر اس چیز کے متعلق خبر دیں جو پانی سے پیدا ہوئی "

نبی کریم ﷺ کا جواب اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ نے فرمایا ہر چیز کو ہی پانی سے ہی پیدا کیا گیا ہے۔

جواب: سدی نے ابو مالک سے اور ابوصالح نے حضرت ابن عباس سے اور مرہ ہمدانی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے ایک روایت ذکر کی کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام سے بعض حضرات نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی:

" هو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعا ثم استوی الی السماء فسواهن سبع سماوات "

کی تفسیر میں بیان کیا ہے:

" ان الله تبارک وتعالی کان عرشه علی الماء ولم یخلق شیئا قبل الماء فلما اراد ان یخلق الخلق اخرج الماء دخانا فارتفع فوق الماء فسما علیه ، فسماه سماء "

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے پانی کو پیدا کیا گیا پانی کے اوپر دھوئیں کو پیدا کیا اس دھوئیں سے آسمان کو بنایا۔ (ماخوذ از قرطبی)

تنبیہ: یہ اولیتِ اضافیہ ہے۔ ورنہ تمام مخلوق سے پہلے نبی کریم ﷺ کے نور کو پیدا کیا جس کی تفصیل انشاء اللہ آیت کریمہ میں آ رہی ہے۔

اعتراض: آیۃ کریمہ میں سات آسمانوں کا ذکر ہے اہل ہیئت نے تو آسمانوں کا ذکر کیا ہے، اور اہل شرع نے بھی کہیں کہیں نو کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ پند نامہ میں شیخ عطار رحمہ اللہ نے نو کا ہی ذکر کیا۔ سات آسمان کہنا کیسے صحیح ہے؟ یا نو آسمان کہنا کیسے صحیح ہے۔

جواب: اہل شرع نے سات آسمانوں کا ذکر کیا ہے البتہ "سماء" کا لغوی معنی بلند ہونا اور رفیع الشان ہونا ہے اس لحاظ پر عرش اور کرسی کو بھی سماء کہہ لیا جاتا ہے۔ اس لحاظ پر نو آسمانوں کو بھی ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح علم ہیئت والوں اور اہل شرع میں اتفاق ہوگا مقصد ایک ہی ہوگا۔ (شیخ زادہ)

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: وہ سب کچھ جانتا ہے۔ یعنی وہ تمام چیزوں کے حقائق کو جانتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے ہر چیز کو کامل بنایا اور ہر چیز کو نفع مند بنایا بلکہ ہر چیز کا عجیب طریقہ پر پایا جانا اور عمدہ ترتیب کا ہونا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ علیم، حکیم اور رحیم ہے۔ تمام افعال کا پختہ ہونا نفع مند طریقہ پر پایا جانا سوائے علیم و حکیم و رحیم کے کسی اور سے ممکن نہیں۔ اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ جب لوگ مر جائیں گے ان کے بدن کے اجزاء بکھر جائیں گے تو ان کو جمع کرنا اور پھر زندہ کرنا کیسے ہو سکے گا اس لئے کہ جب وہ رب تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے ہر چیز کو جانتا ہے تو کوئی چیز نہ اس کی قدرت سے باہر ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس کے علم سے باہر ہے وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز قادر ہے " لھذا " فیعاد منھا کما کان " ان بکھرے ہوئے اجزاء سے (کہیں بھی ہوئے، مکمل کر راکھ بن گئے خواہ ہوا میں اڑا دیئے گئے) دوبارہ جسموں کو موجود کر لیا جائے گا جیسا کہ وہ پہلے تھے۔

فائدہ: پہلی آیت میں ذکر کیا گیا ہے ﴿ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ پھر اس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے یعنی اللہ تمہیں زندہ کرے گا، حشر قائم ہوگا۔ حشر کے قائم ہونے کی دار و مدار تین مقدمات پر تھا جن کو ان دونوں آیتوں میں بیان کر دیا گیا ہے وہ تین مقدمات یہ ہیں:

(۱) بدن کے اجزاء جمع ہونے کے قابل ہیں اور ان میں حیات آ سکتی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ ہر بدن کے تمام اجزاء اور ان کی جگہ کو کہ وہ کہاں ہیں جانتا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ ان تمام اجزاء کو جمع کرنے اور زندہ کرنے پر قادر ہے۔

پہلے مقدمہ پر دلیل یہ قائم کی ﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ﴾ تم بے جان تھے تمہیں معرض وجود میں لایا۔ یعنی جس ذات نے تمہیں نہ ہونے کے باوجود موجود کیا ہے وہ تمہیں مار کر پھر زندہ بھی کرلے گا اس سے کوئی چیز بھی بعید نہیں اور کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں۔

دوسرے اور تیسرے مقدمہ پر یہ دلیل قائم کی کہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا خالق ہے۔ جب وہ ہر چیز کو جانتا ہے تو واضح ہوا کہ وہ بدن کے بکھرے ہوئے اجزاء کے مقامات کو جانتا ہے کوئی ذرا اس سے او جھل نہیں اور کسی ذرہ کے مقام سے وہ بے خبر نہیں۔ اور وہ جب ہر چیز کا خالق ہے تو بکھرے ہوئے اجزاء کو جمع کر کے پھر زندہ بھی کر دے گا۔

یہ بھی واضح بات ہے کہ جس ذات نے بغیر کسی نمونہ کے ابتدائی طور پر تمہیں موجود کیا ہے جو بظاہر انسانی عقل کے مطابق مشکل تھا وہ تمہیں پھر سے تمہاری عقل کے مطابق ہی آسانی سے لوٹا دے گا اس لئے کہ رب تعالیٰ کے لئے تو نہ ابتداء مشکل ہے اور نہ لوٹانا مشکل ہے البتہ انسان یہ سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کو ابتدائی طور پر بغیر نمونہ کے بنانا مشکل ہے اور اس کا لوٹانا آسان ہے۔ جو انسان قیامت میں رب تعالیٰ کے زندہ کرنے کو نہیں تسلیم کرتے وہ عقل سے ہی خالی ہیں کیونکہ جس چیز کو عقل تسلیم کرے اس کے خلاف عقیدہ رکھنا بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

قرآن اور سائنس: جب رب تعالیٰ نے یہ فرمایا ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ﴾ اللہ وہی ہے جس نے تمہارے نفع کے لئے زمین میں ہر چیز کو پیدا کیا۔ جب زمین میں ہی معدنیات ہیں اور زمین پر پہاڑ ہیں اور جنگل ہیں اور مختلف ممالک ہیں تو ان میں غور وفکر کرنا اور نفع مند چیزوں کو کام میں لینا تو خود منشا ایزدی ہے:

"کیف تکون الکھرباء شاملة لا جزائها والاضواء والحرارة والخواص الطبیعة الکامنة فی هذه المخلوقات"

جب یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے اور اس کا انکار ممکن نہیں کہ اجزاء برقیہ، روشنی اور حرارت اور خاص اثر رکھنے والی اشیاء زمین میں ہی پائے جاتی ہیں تو یقیناً ان میں غور وفکر کرنا اور ان کو

کام میں لانا اوران سے نفع حاصل کرنا تو رب کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اسلئے اے مسلمانو رب تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اسباب کو ظاہری اسباب سمجھتے ہوئے مؤثر حقیقی رب تعالیٰ کو سمجھتے ہوئے زمین کی مخلوقات سے نفع حاصل کرنے کیلئے سائنسی علوم ضرور حاصل کرو یہ میدان صرف غیر مسلموں کے لئے نہ چھوڑو، ورنہ وہ تم پر چھا جائیں گے تم مغلوب ہو کر ان کے سامنے عاجز ہو کر زندگی بسر کرو گے۔ قرآن پاک نے تو کسی علم کو حاصل کرنے سے منع نہیں کیا شریعت کے باغی نہ ہو جانا، خدا کا انکار نہ کر بیٹھنا، عظمت مصطفی ﷺ کو دل سے نہ نکال دینا، دینداروں کو مولوی کہہ کر ان کا تمسخر نہ اڑانا، پھر علوم کو حاصل کر کے اسلام اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچانا۔ یہ کام اگر تم نے کیا تو راقم تمہیں سلام کرے گا۔ ورنہ تمہیں یہود و نصاریٰ کا ایجنٹ سمجھے گا۔ راقم تو طنطاوی کی طرح یہی نظریات رکھتا ہے:

"فهل ظننتم ايها الناس ان الموجه له كاف الخطاب هم امم الفرنجة فيقول هو الذى خلق لكم ما فى الارض جميعا يا امم الفرنجة، اولستم داخلين فى كاف الخطاب اليس من العار عليكم ان تجعلوا نعمة ربكم ولعمرى ان هذا الكفر النعمة وقلة عقل وغاية الجهل"

"اے مسلمانو لوگو رب تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے "هو الذى خلق لكم" (اللہ نے تمہارے لئے نفع کے لئے زمین کی تمام چیزیں پیدا کیں) کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ خطاب صرف فرنگیوں (عیسائیوں) کو ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے صرف عیسائیوں کو کہا ہے کہ تمہارے نفع کے لئے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ نہیں نہیں ذرا غور کرو کیا یہ خطاب تمہیں نہیں۔ کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم رب کی نعمتوں سے جاہل ہو قسم ہے مجھے اپنی عمر کی کہ یہ خیال رکھنا رب تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرنا ہے اور عقل کی کمی ہے اور بہت بڑی جہالت ہے۔ بلکہ انسان اس وقت تک رب تعالیٰ کا شکر گزار بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کی نعمتوں سے نفع نہ حاصل کرے اور اس کی نعمتوں سے کامل نفع اسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جب کہ ان کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی آتا ہے" (ماخوذ از طنطاوی)

انتباہ: سائنس جب مذہب کے تابع ہو، انسان کو اسلام سے دور نہ کرے انسان کو بے حیاء نہ بنائے صرف مسلمان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرے تو کوئی عالم دین اس کا مخالف نظر نہیں آئے گا۔ مخالفت صرف غلط راہوں پر چلنے، مذہب سے دور ہونے، دین کی مخالفت، یہودیوں اور عیسائیوں کے نظریات کے پرچار کی وجہ سے ہے۔

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴾

☆ اور (یاد کرو) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، بولے کیا ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے اور خونریزیاں کرے اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے، اور تیری پاکی بولتے ہیں، فرمایا مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔

☆ اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا، بیشک میں بنانے والا ہوں زمین میں خلیفہ (اپنا نائب) انہوں نے کہا، کیا تو زمین میں اسے خلیفہ بنائے گا جو وہاں فساد پھلائے اور خون بہائے؟ اور ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں، فرمایا بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی کیفیت کو ذکر فرمایا، اور رب تعالیٰ نے آپ کو جو عظمت سے نوازا اس کا ذکر ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو وہ علوم عطاء کیے گئے ہیں جو فرشتوں کو بھی عطاء نہیں کیے گئے، اور فرشتوں نے آپ کو سجدہ کیا۔ یہ انعام آپ کے واسطہ سے آپ کی ساری اولاد کو حاصل ہوا۔ پہلی آیات میں بھی نعمتوں کا ذکر کیا جارہا تھا۔ اور اس آیت میں اور نعمت کا تذکرہ فرمادیا۔

آیۃ کریمہ کا مختصر مفہوم: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے ارادہ کی خبر دی، یا ان سے بطور مشورہ کہا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے تعجب کے طور پر عرض کیا کہ اے اللہ! زمین میں تو ایسا نائب بنائے گا جو فساد پھیلائے گا، اور خون بہائے گا۔

اور ہم تیری تسبیح وتحمید بیان کر رہے ہیں ،اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں ۔ مقصد یہ تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے اور خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔

اور خلیفہ بنانے میں ہمیں تو مفاسد نظر آ رہے ہیں ، کہ وہ زمین میں فساد پھیلائیں گے ، قتل وغارت کریں گے ، اس طرح کا خلیفہ بنانے میں کیا فائدہ ہوگا۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے ۔ یعنی جن حکمتوں کو میں جانتا ہوں تم ان سے بے خبر ہو۔

آیۂ کریمہ کی تفصیلی وضاحت:

" واذ " (اور جب) "اذ" اور " اذا " دونوں ہی وقت کے معنی کے لئے آتے ہیں ۔ " اذ" ماضی کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ اور " اذا " مستقبل کے لئے ۔ اور کبھی ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ (از قرطبی)

البتہ مبرد نحوی نے کہا " اذ " مستقبل پر داخل ہوتو اسے ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے ۔ اور " اذا " ماضی پر داخل ہوتو اسے مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں (یاد کرو) بریکٹ میں ہے ۔ اس کی وجہ تفسیر جلالین میں دیکھئے۔

﴿ واذکر یا محمد اذ قال ربک ﴾ " اور یاد کرو اے محمد جب آپ کے رب نے کہا "

اس پر محشی لکھتے ہیں:

"اشاره به الی ان اذ فی محل النصب وان العامل فیها اذکر مقدر قال ابو البقاء فی تفسیر اذ قال هو مفعول به تقدیره اذکر اذ قال "

یعنی یہاں اشارہ ہے کہ " اذ " محل نصب میں ہے ، اور اس کا عامل " اذکر " مقدر ہے۔

ابوالبقاء نے اذ قال کی تفسیر میں کہا ہے " اذ قال " مفعول بہ ہے اور تقدیر عبارت کی یہ ہے " اذکر اذ قال " اسی کا لحاظ کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے " یاد کر " کے لفظ کو بریکٹ میں بڑھایا ہے۔

اسی طرح مدارک میں ہے " اذ نصب با ضمار اذکر " یعنی " اذ "، اذکر کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ﴾: ''اور یاد کرو جب کہا تیرے رب نے'' اس مقام پر رب تعالیٰ نے ''ربک'' ذکر فرمایا، جس کا معنی ہے (تیرا رب) اس نسبت میں کیا عظمت، کیا شان ہے، آیئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے الفاظ میں دیکھئے:

''ولا یخفی لطف الرب ھنا مضافا الی ضمیرہ صلی اللہ علیہ وسلم بطریق الخطاب وکان فی تنویعہ والخروج من عامہ الی خاصہ رمزا الی ان المقبل علیہ بالخطاب لہ الحظ الاعظم والقسم الاوفر من الجملۃ المخبر بھا فھو ﷺ علی الحقیقۃ الخلیفۃ الاعظم فی الخلیفۃ والامام المقدم فی الارض والسموٰت العلی و لو لاہ ما خلق آدم بل (ولا ولا)''

رب تعالیٰ نے اپنی نسبت ''ک'' ضمیر کی طرف کی، جو نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس نسبت میں خصوصی کمال اور رب تعالیٰ کی مہربانی کا ذکر پایا گیا ہے۔ کہ عظمت شان کے پیش نظر گویا کہ خطاب کے قابل آپ ہی ہیں۔ گویا کہ پہلے عام لوگوں کا ذکر تھا، اب اخص الخواص کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اور اسی سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ مخلوق میں حقیقت میں خلیفہ اعظم حضور ﷺ ہی ہیں۔ اور زمین و آسمان میں سب سے پہلے امام آپ ہی ہیں۔

اگر آپ نہ ہوتے تو نہ آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جاتا، اور نہ ہی کسی اور کو پیدا کیا جاتا۔ یعنی اگر مصطفیٰ کریم ﷺ کو نہ پیدا کیا جاتا تو کائنات میں کوئی چیز بھی پیدا نہ کی جاتی۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں، میرے سردار ابن الفارض نے حقیقت محمدیہ کی زبان کی ترجمانی کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا:

وانی ان کنت ابن آدم صورۃ ۔ فلی فیہ معنی شاھد بابوتی

گویا کہ نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا:

بیشک میں اگرچہ ظاہری طور پر آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہوں
لیکن میرے اندر وہ حقیقت موجود ہے جو میرے باپ ہونے کی شاہد ہے

یعنی ظاہر طور پر تو میں ابن آدم ہوں، لیکن حقیقت میں میں اصل ہوں اور آدم علیہ السلام فرع

ہیں۔اس لحاظ پر حقیقی ابوۃ مجھے ہی حاصل ہے۔
اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے اسی مضمون کو کیا ہی خوبصورت انداز میں پیش فرمایا:

مقصود یہ ہیں آدم و نوح و خلیل سے — تخم کرم میں ساری کرامت ثمر کی ہے
ان کی نبوت ان کی ابوت ہے سب کو عام — ام البشر عروس انہیں کے پسر کی ہے
ظاہر میں میرے پھول حقیقت میں میرے نخل — اس عمل کی یاد میں یہ صدا ابوالبشر کی ہے

یعنی نبی کریم ﷺ تمام عالم کے معنوی طور پر باپ ہیں، کہ سب کچھ انہیں کے نور سے پیدا ہوا، اسی لئے حضور کا نام ابوالارواح ہے، تو آدم علیہ السلام اگرچہ صورت میں حضور کے باپ ہیں مگر حقیقت میں وہ بھی حضور کے معنوی بیٹے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ام البشر تمام انسانوں کی ماں حضرت حوا نبی کریم ﷺ کے معنوی بیٹے حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ ہیں۔
آدم علیہ السلام جب حضور کو یاد کرتے تو یوں فرماتے " یا ابنی صورۃ و ابی معنی " اے ظاہر میں میرے بیٹے اور حقیقت میں میرے باپ۔ (الا حدائق بخشش ص ۷۵)

☆ " وروی عبد الرزاق بسنده عن جابر بن عبد الله قال قلت یا رسول الله بابی انت وامی اخبرنی عن اول شئی خلقه الله تعالیٰ قبل الاشیاء قال یا جابر ان الله تعالیٰ قد خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نوره فجعل ذلک النور یدور بالقدرة حیث شاء الله ولم یکن فی ذلک الوقت لوح ولا قلم ولا جنة ولا نار ولا ملک ولا سماء ولا ارض ولا شمس ولا قمر ولا جنی ولا انس " (زرقانی ج ۱ ص ۴۶، انوار محمدیه ص ۱۳، مواهب)

عبدالرزاق نے اپنی سند سے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے یہ خبر دیجئے کہ تمام چیزوں سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کسے پیدا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، اے جابر بیشک اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے اپنے نور سے تیرے نبی کے نور کو پیدا کیا۔پھر وہ نور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جہاں بھی اسے منظور تھا سیر کرتا رہا۔اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم اور نہ جنت اور نہ دوزخ اور نہ فرشتے اور نہ آسمان اور نہ زمین اور نہ سورج اور نہ چاند اور نہ جن اور نہ انسان تھے۔

خیال رہے کہ یہ حدیث مولوی اشرف تھانوی صاحب دیو بندی نے اپنی کتاب نشر الطیب میں بھی نقل کی ہے۔

☆ '' عن العرباض بن سارية عن رسول الله ﷺ انه قال انی عند الله مكتوب خاتم النبيين وان آدم لمنجدل فی طينة ''

(شرح السنة، مشکوة باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳، مواهب مع زرقانی ص ...)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، بیشک میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس وقت خاتم النبیین تھا جب کہ آدم علیہ السلام ابھی تک اپنے خمیر میں تھے۔

مولوی اشرف علی تھانوی صاحب دیو بندی اپنی کتاب نشر الطیب میں بیان کرتے ہیں کہ اسے احمد، بیہقی اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور مشکوۃ میں یہ حدیث شرح السنۃ سے مذکور ہے۔

اس حدیث پاک کی وضاحت میں استاذی المکرم حضرت مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ فرماتے ہیں

'' اس حدیث پاک سے آنحضرت ﷺ کا تحقیقاً آدم علیہ السلام سے قبل نبی ہونا بھی ثابت اور خاتم النبیین کے منصب پر فائز ہونا بھی ثابت، موجود ہونا بھی ثابت اور آپ کی حقیقت کا نور ہونا بھی ثابت، کیونکہ بشروں کا باپ بعد میں پیدا کیا جا رہا ہے اور آپ کی حقیقت پہلے ہی موجود متحقق تھی اور ان صفات کمال کے ساتھ متصف ''

اس مقام پر مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے بیان کردہ نکتہ اور ایک توہم کا ازالہ بھی ملاحظہ فرماتے جائیں:

'' اگر کسی کو شبہ ہو کہ شائد مراد یہ ہے کہ میرا خاتم النبیین ہونا مقدر ہو چکا تھا سو اس لئے آپ کے وجود کا تقدم آدم علیہ السلام پر ثابت نہ ہو ''۔

جواب یہ ہے اگر یہ مراد ہوتی تو آپ کی کیا تخصیص، تقدیر تمام اشیاء مخلوقہ کی ان کے وجود سے مقدم ہے۔ پس یہ تخصیص خود دلیل ہے اس کی مقدر ہونا مراد نہیں بلکہ اس صفت کا ثبوت مراد ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی صفت کا ثبوت فرع ہے مثبت لہ کے ثبوت کی۔ پس اس سے آپ کے وجود کا تقدم ثابت ہو گیا، اور چونکہ مرتبہ بدن متحقق نہیں تھا۔ اس لئے نور اور روح کا مرتبہ متعین ہو گیا۔

اس سوال وجواب نے واضح کر دیا کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت محض علم الٰہی کے لحاظ سے نہیں تھی، بلکہ خارج اور واقع میں آپکا نور انور اور روح اقدس اور حقیقت محمدیہ اس صفت کمال کے ساتھ موصوف ومتصف تھی اور یہی ہمارا نظریہ وعقیدہ ہے کہ بشریت کے لحاظ سے اولاد آدم بھی ہیں مگر حقیقت کے لحاظ سے اصل موجودات ہیں، اور آدم علیہ السلام اور تمام انبیاء کرام کی اس لحاظ سے آپ بنیاد ہیں۔

یہی تھانوی صاحب ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں، سوال یہ ہے جب انبیاء علیھم السلام موجود ہوتے تو ان کے خاتم کا موجود ہونا بھی متصور ہوسکتا تھا، جب ان کا بلکہ ان کے والد اور معدن واصل کا وجود نہیں تھا تو آپ خاتم النبین کس طرح ہو گئے؟

تھانوی صاحب کی زبانی سوال وجواب ملاحظہ فرمائیں:

اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس وقت ختم نبوت کے ثبوت بلکہ خود نبوت ہی کے ثبوت کے کیا معنی؟ کیونکہ نبوت آپ کو چالیس برس کی عمر میں عطا ہوئی اور چونکہ آپ سب نبیوں کے بعد مبعوث ہوئے اس لئے ختم نبوت کا حکم دیا گیا یہ وصف تو خود تاخیر کو مقتضی ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ تاخیر مرتبہ ظہور میں ہے۔ مرتبہ نبوت میں نہیں جیسے کسی کو تحصیلداری کا عہدہ آج مل جائے، اور تنخواہ بھی آج ہی سے چڑھنے لگے، مگر ظہور ہوگا کسی تحصیل میں بھیجنے کے بعد یعنی جس طرح اس تحصیلدار کے منصب کا لوگوں کو علم اس وقت ہوگا جب وہ تحصیل میں جا کر چارج سنبھالے گا، وہ اس وقت معلوم کریں گے کہ یہ ہمارے تحصیلدار صاحب ہیں۔ حالانکہ سرکار کے نزدیک وہ اس وقت سے تحصیلدار ہے جب سے اسے نامزد کیا گیا ہے۔

تو نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاتم النبیین کے مرتبہ اس وقت فائز ہو چکے تھے، جب آدم علیہ السلام ہنوز عالم آب وگل میں تھے، اگر چہ لوگوں کو اس وقت پتہ چلا جب آپ کا ظہور ہوا۔

الغرض ظہور اگر چہ بعد میں ہوا لیکن وجود پہلے تھا، اور یہی ہمارا عقیدہ ہے کہ حقیقت نوریہ کے لحاظ سے آپ اصل موجودات اور بنیاد آدم علیہ السلام ہیں اگر چہ ظہور اور نشاۃ دنیویہ کے لحاظ سے اولاد آدم ہیں۔

(تنویر الابصار از ص ۱۹)

☆ "عن ابی هریره قال قالوا یا رسول اللہ متی وجبت لک النبوۃ قال و آدم بین الروح والجسد"

(ترمذی، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳ زرقانی ج ۱ ص ۳۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا:

یارسول اللہ آپ کے لئے نبوت کس وقت ثابت ہو چکی تھی۔ آپ نے فرمایا، جس وقت آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے، یعنی ان کے جسم میں جب جان بھی نہیں آئی تھی میں اس وقت سے نبی ہوں۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے، اور اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ اور ایسے ہی الفاظ میسرہ ضبی کی روایت میں بھی آئے ہوئے ہیں۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابونعیم نے حلیہ میں اسے روایت کیا ہے، اور حاکم نے اس کی تصریح کی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے پوچھنے اور سوال کرنے سے کہ آپ کب سے نبی بنے ہو۔ پتہ چل گیا کہ جن کے گھر آپ پیدا ہوئے اور عمر شریف کے چالیس سال گزارے تھے اور اس قدر طویل عرصہ گزارنے کے بعد نبوت کا اعلان فرمایا، جب وہ اس طرح کا سوال کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آپ کب سے نبی ہیں تو معلوم ہوا کہ ان کے ایمان نے گواہی دی کہ نبی اکرم ﷺ نے اگرچہ نبوت کا اعلان اور اظہار چالیس سال کے بعد کیا، لیکن آپ نبی بنے ہوئے پہلے کے تھے۔ انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے اعلان نبوت ورسالت کب فرمایا۔ بلکہ پوچھا ہے "متی وجبت لک النبوۃ یا رسول اللہ" آپ کے لئے یارسول اللہ نبوت کس وقت سے ثابت ہے؟

اور نبی کریم ﷺ کا یہ جواب کہ میں اس وقت سے نبی ہوں جب تمہارے باپ آدم علیہ السلام کی روح ابھی ان کے جسم میں پھونکی نہیں گئی تھی۔ صحابہ کرام کے اس نظریہ وعقیدہ پر مہر تصدیق ہے کہ تم نے درست سمجھا واقعی میں عمر شریف کے چالیس سال گزار کر نبی نہیں بنا بلکہ اس وقت سے یہ منصب اور اعزاز مجھے حاصل ہے جب کہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے تن بدن میں جان نہیں آئی تھی۔

اس روایت کو ترمذی شریف میں نقل کیا گیا ہے اور ترمذی شریف حدیث کی وہ کتاب ہے جس کے متعلق محدثین نے فرمایا جس کے گھر میں یہ کتاب موجود ہو وہ یوں سمجھے کہ رب تعالیٰ کا رسول میرے گھر میں موجود اور تشریف فرما ہے۔

امام ترمذی نے اس حدیث کو موضوع (من گھڑت) نہیں کہا، بلکہ انہوں نے اس کو حسن کہا ہے اصول حدیث میں یہ واضح ہے کہ حسن حدیث حجت اور دلیل وسند ہوسکتی ہے۔

اور پھر اشرف علی تھانوی صاحب نے تصریح کر دی ہے کہ میسرہ ضبی کی روایت میں بھی اسی طرح کے الفاظ آتے ہیں۔ گویا کہ یہ روایت دو صحابیوں سے مروی ہوئی۔ اس طرح کل چار صحابیوں (حضرت جابر بن عبداللہ انصاری، حضرت عرباض بن ساریہ، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت میسرہ ضبی رضی اللہ عنہم) کی شہادت اور گواہی اب تک آ چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ نور ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق وایجاد سے پہلے نبوت ورسالت اور خاتم النبیین کے منصب پر فائز ہو چکے تھے۔

علاوہ ازیں اس کو امام احمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے جو اہل سنت کے چوتھے امام ہیں، اور امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمھم اللہ کے بعد ان کا درجہ ہے۔

پھر امام بخاری نے اس کو اپنی تاریخ اور امام بخاری کے استاذ ابو نعیم نے اس کو حلیہ میں نقل کیا ہے ، اور حاکم جیسے محدث نے اس کی تصحیح کی۔ حاکم وہ محدث ہے جس نے بخاری ومسلم سے رہ جانے والی صحیح احادیث کو جمع کیا ہے اور اس کتاب کا نام مستدرک رکھا ہے۔ (تنویر الابصار از ص ۲۲)

اولیت مصطفیٰ دلیل ہے امتناع نظیر پر:

امتناع نظیر کا یہ مطلب ہے کہ نبی کریم ﷺ کا مثل پیدا کرنا رب تعالیٰ کی قدرت سے خارج ہے یہ ضرور خیال میں رہے کہ جو چیزیں محال بالذات، ممتنع بالذات ہیں وہ اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج ہوں تو رب تعالیٰ کی شان اور قدرت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ کیونکہ وہ اشیاء اس قابل نہیں کہ رب تعالیٰ کی قدرت میں آسکیں۔ اس مسئلہ کو سید الاولیاء حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مقدمات:

1: ممتنعات ذاتیہ کا احاطہ قدرت سبحانہ وتعالیٰ سے خروج کمال ذاتی باری تعالیٰ پر دھبہ نہیں لگاتا، بلکہ یہ قصور راجع بجانب قابل ہے کہ ممتنع ذاتی قبولیت کا صالح نہیں۔

2: انقلاب حقائق واقعیہ کا خواہ معدودات سے مثل انسان، فرس، بقر، غنم کے، یا مراتب عددیہ سے ہوں مثل ایک دو تین چار کے، یا مراتب مختلطہ یعنی معدود بحیثیت عروض مرتبہ عددی مثلاً زید جو اول مولد ہے بنسبت باقی اولادِ عمرو کے ممتنع بالذات ہیں۔

3: کسی چیز کی نظیر اس چیز کو کہا جاتا ہے کہ علاوہ مشارکت نوعی کے اوصاف ممیزہ کاملہ میں اس چیز کی ہم پلہ ہو۔

4: آنحضرت ﷺ بحسب الحقیقۃ الروحانیۃ النوریہ اول مخلوق ہیں۔

"اول ما خلق اللہ نوری ، اول ما خلق اللہ العقل"

تصریحات محققین از اہل کشف و شہود اس پر شاہد ہیں۔

"کما قال الشیخ الاکبر قدس سرہ الاطہر" فلم یکن اقرب الیہ قبولا فی ذلک الھباء الاحقیقۃ محمد ﷺ المسماۃ بالعقل فکان مبدأ العالم باسرہ واول ظاہر فی الوجود فکان وجودہ من ذلک النور الالہیٰ"

نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرے نور کو پیدا کیا ہے، یا یہ ارشاد کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا ہے، ان دونوں کا مطلب ایک ہے۔

شیخ قدس سرہ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ وہی نور جس کو سب سے پہلے پیدا کیا گیا اور حقیقت محمدیہ کہلایا اسی کا نام عقل بھی ہے، جو تمام عالم کا مبدأ ہے، تمام جہان سے پہلے اسی نور کا وجود ہے، اور وہ نورِ الٰہی سے معرض وجود میں آیا ہے۔

جس طرح نبی کریم ﷺ اولیت کی صفت سے متصف ہیں، اسی طرح آخریت کی صفت سے بھی متصف ہیں کہ آخر الانبیاء ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ ﴿ ولکن رسول و خاتم النبیین ﴾ لیکن آپ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

مقام توجہ: اہل بصیرت کو ان مقدمات پر گہری نظر ڈالنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ نظیر آنحضرت ﷺ کا وجود ممتنع بالذات بایں معنی ہے کہ خالق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو ایسا بنایا ہے اور ایسی کاملہ ممیزہ مختصہ صفات کے ساتھ سنوارا ہے کہ جس سے یہ کہا جا سکتا ہے "کہ درصورت فرض وجود نظیر، انقلاب حقیقت لازم آتا ہے" کیونکہ فرض نظیر کا وجود آپ کے بعد ہی ہوگا، تو لامحالہ ایسا معدود ہوگا

جس کو مرتبہ ثانیہ عدد عارض ہو، اور نظیر کہلانے کا مستحق جب ہی ہوسکتا ہے کہ وصف ممیز کامل یعنی اول مخلوقیت وختم نبوت میں مشارک ہوتو معروض مرتبہ ثانیہ کا معروض مرتبہ اول کا ہو(یہ ممتنع بالذات ہے، ایسا ہو نہیں سکتا)۔

ایسا ہی بلحاظ ختمیت، فرض کیا کہ آپ مثلاً چھٹے مرتبہ میں ہیں تو نظیر آپ کی معروض ساتویں مرتبہ کو مثل ہو کر معروض مرتبہ سادسہ کی ہوگی" وھو خلف " (یعنی یہ حقیقت کے خلاف ہے)

ہاں اس میں شک نہیں کہ ممتنعات ذاتیہ میں سے دو قسم اولین اور قسم ثالث میں فرق ظاہر ہے کیونکہ قسم ثالث کا امتناع اوصاف عارضہ کے لحاظ سے ہے۔اس لئے کہ محل بحث امتناع یا امکان نظیر ہے نہ کہ امتناع یا امکان مثل۔

خلاصہ یہ ہے کہ آئینہ احمد ﷺ میں خالق عز مجدہ نے جداگانہ کمال دکھایا، یعنی ایسا بنایا کہ نظیرش امکان ندارد (جس کی نظیر ممکن نہیں)

" فهذا الكمال راجع اليه سبحانه كما ان الجمال مختص به من منع الله تعالىٰ سبحان من خلقه واحسنه واجمله واكمله "(فتاوی محمدیہ ص ۹)

نبی کریم ﷺ کو اس شان سے پیدا کرنا درحقیقت رب تعالیٰ کا ہی کمال ہے، جس طرح یہ شان اور جمال نبی کریم ﷺ سے مختص ہے، وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عطاء سے ہی ہے، وہ ذات پاک جس نے آپ کو اس جداگانہ شان سے بنایا اور آپ کو سب سے زیادہ حسین بنایا، اور سب سے زیادہ جمیل بنایا، اور سب سے زیادہ باکمال بنایا۔

خلاصہ کلام:۔ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ سب کائنات سے اول معرض وجود میں لایا۔ اور آپ کو خاتم الانبیاء بنایا اگر آپ کی نظیر کوئی اور بھی بن سکے تو اسے بھی یہ دونوں وصف حاصل ہوں گے، حالانکہ اول تو ایک ہی ہوتا ہے، اس کے بعد آنے والے تو دوسرے درجہ میں ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح خاتم بھی ایک ہی ہوتا ہے، اس کے بعد کسی کو اگر خاتم کہا جائے، تو پہلی ذات کا خاتم ہونا باطل ہوگا یہ دونوں صورتیں ممتنع بالذات ہیں۔

ممتنع بالذات قدرت باری تعالیٰ سے خارج ہیں، ان میں یہ صلاحیت نہیں کہ یہ رب تعالیٰ کی

قدرت میں آسکیں، ان کا رب تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہونا رب کی قدرت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا

خلیفہ بنانے کے متعلق ملائکہ سے کلام کا کیا مقصد؟

ملائکہ سے رب تعالیٰ کا یہ کہنا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں اس کی چند وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ: ملائکہ (فرشتوں) پر حضرت آدم علیہ السلام اوران کی اولاد کی عظمت کا اظہار تھا، اسی وجہ سے اس واقعہ کی خبر نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کو بھی دی۔

" یخبر تعالیٰ بامتنانه علی بنی آدم بتنویهه بذکرهم فی الملأ الأعلی قبل ایجادهم "

''رب تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ بنی آدم پر میرا عظیم احسان ہے کہ ان کی عظمت، بلندی شان کا تذکرہ ملاءاعلیٰ میں ان کے ایجاد سے پہلے ہورہا تھا''

اس سے بہت واضح ہوگیا کہ ملائکہ کے سامنے ذکر کرنے کی بھی ایک وجہ یہی تھی کہ ملائکہ کو بھی معلوم ہوجائے کہ جس کے پیدا کرنے سے پہلے اس کا ذکر نورانی مخلوق میں کیا جارہا ہے وہ کتنا ہی عظیم منصب والا ہوگا۔ اسی وجہ سے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلَائِکَةِ ﴾

" ای واذکر یا محمد اذ قال ربک للملائکة واقصص علی قومک ذلک "

اور اے محمد (ﷺ یاد کرو جب آپ کے رب نے فرشتوں کو کہا، اور یہی آپ اپنی قوم کو بھی بتادیں۔ (صابونی)

دوسری وجہ:

" وفائده قوله هذا للملائکة تعلیم المشاورة وتعظیم شان المجعول بانه بشر بوجوده سکان ملکوته " (بیضاوی)

''ملائکہ سے کہنے کا ایک مقصد مشورہ کرنا تھا۔ اوردوسرا جس ذات کو خلیفہ بنانا تھا اس کی عظمت کا اظہار مقصود تھا کہ وہ بشر ہونے کے باوجود ملکوت میں ٹھہرے گا''

خیال رہے کہ مشورہ کبھی تو اس لئے طلب کیا جاتا ہے کہ مشورہ کرنے والا خود نہیں جانتا، دوسرا شخص اس سے زیادہ علم رکھتا ہے اور زیادہ مہارت رکھتا ہے۔ تو اس کے علم اور اس کی مہارت سے فائدہ اٹھانا مقصود ہوتا ہے۔

لیکن کبھی مشورہ کرنے والا خود صاحب علم ہوتا ہے، وہ کسی سے مشورہ صرف اس لئے کرتا ہے کہ جس سے مشورہ کیا جارہا ہے اس کی عظمت ظاہر ہوجائے، کہ ایک عظیم ذات نے اس سے مشورہ کیا ہے رب تعالیٰ کا ملائکہ سے مشورہ کرنے کا یہی مقصد تھا کہ ملائکہ کی عظمت واضح ہوجائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم مخلوق ہے، اور رب تعالیٰ کے ہاں ان کا عظیم مقام ہے۔

اسی لئے رب تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ﴿ وشاورھم فی الامر ﴾ یعنی اپنے معاملات میں صحابہ سے مشورہ کریں کہ صحابہ کی عظمت واضح ہوجائے کہ وہ کتنے عظیم لوگ تھے جن سے سید الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ کیا کرتے تھے۔ (ص ۳۹۳)

حدیث مرفوع، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے:

"ان ربی تبارک و تعالیٰ استشارنی فی امتی" (مسند احمد ج ۵ ص ۳۹۳)

"بیشک میرے رب تعالیٰ نے مجھ سے میری امت کے بارے میں مشورہ کیا"

یہ مشورہ بھی (معاذ اللہ) رب تعالیٰ کی احتیاجی کی وجہ سے نہیں، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کی عظمت کو ثابت کرنے کیلئے ہے کہ وہ کیسے عظیم نبی ہیں جن سے رب تعالیٰ مشورہ کررہا ہے، اور وہ کتنی عظمت والی امت ہے، جس کے متعلق رب تعالیٰ اپنے برگزیدہ نبی سے مشورہ کررہا ہے۔

فائدہ: علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو فرشتوں اور جنات سب پر خلیفہ مقرر کرنے والا تھا، مگر ان کی خلافت کے متعلق مشورہ صرف فرشتوں سے طلب کیا جنات سے کوئی رائے نہیں لی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرشتوں میں اس کی اہلیت پائی گئی تھی، اور جنات سرکش و نافرمان تھے، ان میں خیر کی کوئی صلاحیت نہیں تھی اس لئے ان میں رائے دینے کی اہلیت بھی نہیں تھی۔

معلوم ہوا کہ جو رائے دینے کا اہل نہ ہو اس سے رائے طلب کرنا سنت الٰہیہ کے خلاف ہے۔ (انتہی)

کاش کہ حکام اور بڑے بڑے ادارے قائم کرنے والے منتظمین کو بھی یہ بات سمجھ آئے، نا اہل مشیر ہی تباہی کا سبب بنتے ہیں، لیکن نا اہل خوشامدی، منافقانہ چال والے ہی مقبول نظر ہوتے ہیں کسی اہلیت رکھنے والے کو کھو جانے سے افسوس کرتے ہوئے کف دست ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بروقت

مخلص اور خودغرض میں فرق کو سمجھنا ہی دانشمندی اور کامیابی ہے۔

خلیفہ کون ہے؟

الخلیفة من یخلف غیرہ وینوب منابہ خلیفہ اسے کہا جاتا ہے جو کسی کے بعد اس کا جانشین بنے اور اسی طرح جو کسی کا نائب ہو کر اس کے امور کو بیان کرے اسے بھی خلیفہ کہا جاتا ہے "خلیفة" میں تا مبالغہ کے لئے ہے، تانیث کے لئے نہیں، جیسا کہ علامة میں تا مبالغہ کے لئے ہے یہاں مراد خلیفہ سے، حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اس وجہ سے کہ زمین میں سب سے پہلے خلیفہ بنانے کے متعلق جو مشورہ کیا جارہا تھا اس سے مراد آپ ہی ہیں۔

اسی طرح آپ کے بعد ہر نبی کو خلیفہ بنایا گیا، تا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام زمین میں نافذ کر کے زمین کو امن وسکون کا گہوارہ بنایا جائے، اور لوگوں میں سیاست کی جائے، اور لوگوں کے نفوس کی تکمیل کی جائے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاری کیا جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿ یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ ﴾

"اے داؤد بیشک ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا"

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: مِن؟

﴿ وَاذْکُرُوْا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَاءَ فِی الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ ﴾

"اور یاد کرو جب تمہیں نوح کی قوم کے بعد زمین میں خلیفہ بنایا"

اس سے واضح ہوا کہ زمین میں سب سے پہلے خلیفہ آدم علیہ السلام ہیں، پھر تمام انبیاء کرام پھر نبی کریم ﷺ کی امت کے علماء ہیں۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

مصطفیٰ کریم ﷺ کا فرمان ذیشان:

" عن ابی حازم قال قاعدت ابا ھریرة خمس سنین فسمعتہ یحدث عن النبی ﷺ قال کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک

نبی خلفه و انه لا نبی بعدی و ستکون خلفاء "

(مسلم ج ۲ ص ۱۲۴ باب وجوب الوفاء ببعة الخلیفة الاول)

''ابوحازم کہتے ہیں، میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پانچ سال بیٹھتا رہا، میں نے ان کو نبی کریم ﷺ کی حدیث بیان کرتے ہوئے سنا، کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کرام کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وصال فرماجاتے تو ان کی جگہ دوسرے نبی آجاتے، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اسلئے (میرے بعد میری امت سے ہی) خلفاء ہوں گے''

" والساسیة القیام علی الشئی بما یصلحه " سیاست کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی مصلحت کے کام کرنا اور خلفاء کا مطلب یہ ہے " یتولون امورهم " لوگوں کے امور کا ولی بننا، لوگوں کے معاملات طے کرنا، غرباء کی امداد کرنا، لوگوں کے درمیان نزاع کو دور کرنا، ہر بہتری کا کام کرنا۔ (از نووی)

مقام افسوس! آج کل سیاست جھوٹ فراڈ کا نام بن گیا۔ جتنا بڑا جھوٹا اتنا بڑا سیاسی۔ سچی سیاست کوئی کرے تو کیا کرے جب انگریز کے پٹھوؤں، غاصبوں، لیڑوں کا ڈنڈا اسکے سر پر سوار ہے ملک کے محافظ جب کفار کے آلہ کار بن جائیں تو یہی حال ہوتا ہے جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

محبّ وطن کو پلک جھپکتے ہوئے مکار بنا دیا جاتا ہے۔ مکار اپنے آپ کو محبّ وطن بنا کر پیش کرتا ہے، تو اس کے ہمنوا بھی اسی قسم کے نظر آتے ہیں۔ " الامان ، الحفیظ "

اعتراض:

" ان الخلافة عن الغیر توهم عجز الغیر عن القیام بالامر بنفسه اما لغیبة او موته او مرضه او نحو ذلک وهو لا یتصور فی حقه تعالیٰ فما وجه الاستخلاف "

''کسی کو خلیفہ اس وقت بنایا جاتا ہے جب وہ شخص خود عاجز آجائے، خواہ اس نے کہیں جانا ہو، تو وہ اپنی غیر موجودگی میں خلیفہ بنادے، جیسا کہ بادشاہ کسی دوسرے ملک میں جاتے ہوئے اپنا قائم مقام بنا جاتے ہیں، لیکن رب تعالیٰ سے یہ بھی متصور نہیں، کیونکہ وہ ہر جگہ ہر گھڑی موجود ہے''

خود رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾ جب رب تعالیٰ ہر شخص کی

شہ رگ سے قریب ہے، تو اس کے غائب ہونے کا تصور ہی ممکن نہیں۔ بھی خلیفہ بنانے کی اس وقت ضرورت درپیش آتی ہے جب اصل فوت ہو جائے لیکن رب تعالیٰ جب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ، قائم ودائم ہے " حی لا یموت " صفت کا مالک ہے، تو اس لحاظ پر بھی اسے خلیفہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ اور کوئی محتاجی بھی نہیں کہ وہ سو جائے تو اپنے سونے کی حالت میں خلیفہ بنادے، جس ذات کی صفت خود اس کے اپنے ارشاد سے یہ سمجھ آ جائے:

﴿ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾ اسے اونگھ اور نیند نہیں آتی

تو اس ذات کو خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت درپیش آئی؟

جواب:

لا لحاجة له تعالىٰ الى من ينوبه بل لقصور المستخلف عليه عن قبول فيضه وتلقى امره بغير وسط ولذلك لم يستنبئ ملكا كما قال الله تعالىٰ ﴿ لو جعلناه ملكا لجعلناه رجلا ﴾

"خلیفہ بنانے کی رب تعالیٰ کو کوئی محتاجی نہیں تھی، بلکہ جن کی طرف خلیفہ بنانے کا ارادہ ہو چکا تھا وہ محتاج تھے کیونکہ وہ رب تعالیٰ سے بغیر واسطہ کے فیض حاصل نہیں کر سکتے تھے، اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے کسی فرشتے کو نبی نہیں بنایا، خود رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اگر کسی فرشتے کو وہ نبی بناتا تو اسے بھی انسانی شکل میں بھیجتا ﴾

واضح ہوا کہ خلیفہ بنانے میں جب رب تعالیٰ کو احتیاج نہیں تھی تو اعتراض بھی خود بخود ختم ہو گیا۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

لوگ رب تعالیٰ سے براہ راست فیض کیوں حاصل نہیں کر سکتے؟

" لما انه فی غاية الكدورة والظلمة الجسمانية وذاته تعالى فی غاية التقدس، والمناسبة شرط فی قبول الفيض على ما جرت به العادة الالهية فلا بد من متوسط ذی جهتی تجرد و تعلق يستفيض من جهة و يفيض باخرى "

(روح المعانی)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہاں خلیفہ کا معنی پیچھے آنے والا نہیں بلکہ نائب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا

نائب ہوکر زمین وآسمان کی اشیاء میں تصرف کرنے والا، نائب بنانے کی ضرورت بھی اللہ تعالیٰ کی نہیں تھی وہ محتاج نہیں بلکہ جن کی طرف خلیفہ بنانا تھا انہیں محتاجی تھی۔اس لئے کہ انسان بہت زیادہ کدورت اور ظلمات جسمانیہ رکھتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ بہت ہی زیادہ متقدس ہے اور لطیف ہے فیض لینے والے اور دینے والے میں کوئی مناسبت ہونی چاہئے۔جب مخلوق میں اور اللہ تعالیٰ میں کوئی مناسبت نہیں تھی : مخلوق کو وجود میں لانا بھی رب تعالیٰ کی مشیت تھی ،تو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے پیدا فرمانے سے پہلے ہی ان کے فیض لینے کا یہ اہتمام فرمایا کہ انبیاء کرام کو واسطہ بنایا جو اپنی نورانیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے فیض لے کر اپنی بشریت کے وصف کی وجہ سے انسانوں تک وہ فیض پہنچادیں۔

جس طرح انسانوں اور حیوانوں کے جسموں میں ہڈیاں اور گوشت ہے، ہڈیاں سخت ہیں، گوشت نرم ہے، ہڈی اپنی سختی کی وجہ سے گوشت سے غذا حاصل نہیں کرسکتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے ہڈیوں اور گوشت کے درمیان پٹھے بطور واسطہ رکھے۔پٹھے اپنے نرم حصہ سے گوشت سے غذا حاصل کرتے ہیں۔اور اپنے سخت حصہ سے ہڈی کو غذا پہنچاتے ہیں۔ (ماخوذ از بیضاوی ، شیخ زادہ ، روح المعانی ، خفاجی)

نکتہ: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کے متعلق جو مشورہ کیا۔اس سے مراد صرف آدم علیہ السلام نہیں اور آپ کی تمام اولاد بھی مراد نہیں ، بلکہ آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد سے بعض حضرات جو اس خلافت کے منصب کے اہل ہوں گے یہ سب مراد ہیں۔اور وہ افراد آدم علیہ السلام کی اولاد میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک پیدا ہونے والے تمام انبیاء کرام ورسل کرام علیہم السلام ہیں۔ انبیاء کرام تمام ہی فرداً فرداً معصوم ہیں۔لیکن صدیقین ،اولیاء، صالحین فرداً فرداً تو معصوم نہیں، البتہ اجتماعی طور پر معصوم ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کا اجتماعی فیصلہ امت کو قبول کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ جب یہ ثابت ہوا کہ خلافت کا حقدار وہ ہے جس میں یہ استعداد پائی جائے تو خود واضح ہوا کہ عورت کی فطرت سلیمہ اور طبیعت مستقیمہ اس قابل نہیں کہ جمعہ یا باقی نمازوں کی امامت یا خلافت یعنی حاکمیت اس کے سپرد کردی جائے ،عورت اپنی فطرت اور طبعی کمزوری کی وجہ سے یہ کام سرانجام نہیں دے سکتی۔

مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجہ:

خلافت راشدہ عادلہ کے بعد مسلمانوں پر دنیا کی محبت غالب آگئی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ ﷺ کی محبت ان کے دلوں میں راسخ نہ رہی۔دنیا کی محبت کی وجہ سے موت سے ان کے دلوں

میں کراہت پیدا ہو گئی اور اللہ کی راہ میں جان دینے کا جذبہ کامل نہ رہا، جس کی وجہ سے امت مسلمہ بدحالی کا شکار ہو گئی۔ غیروں پر اس کو غالب رہنے کی نعمت سے محرومی حاصل ہو گئی۔

ابوداؤ اور بیہقی کی حدیث میں امت مسلمہ کی اس بدحالی کا ذکر نہایت ہی المناک صورت میں وارد ہے۔ حضرت ثوبان سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے مسلمانو! قریب ہے کہ کافروں کی جماعتیں تم پر حملہ آور ہونے کے لئے اس طرح ایک دوسرے کو بلائیں گی جیسے کسی پیالے میں کھانا رکھا ہو اور اسے کھانے کے لئے ہر طرف سے لوگوں کو بلایا جائے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ حضور کیا اس وقت ہم قلیل ہوں گے؟ فرمایا نہیں اس وقت بہت کثیر تعداد میں ہو گے لیکن اس وقت تم سیلاب کے جھاگ اور خس و خاشاک کی طرح ہو گے (یعنی ایمانی قوت و شجاعت تم میں باقی نہ رہے گی) اللہ تمہاری ہیبت اور تمہارا رعب دشمن کے دل سے نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں بزدلی اور کمزوری پیدا کر دے گی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا حضور بزدلی اور کمزوری کا سبب کیا ہو گا؟ حضور ﷺ نے فرمایا:

"حب الدنیا و کراھیة الموت ، دنیا کی محبت اور موت کی کراھیت (مکروہ سمجھنا)"

ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا سے محبت کرے گا موت اسے ناپسند ہی ہو گی۔ عرصہ دراز سے مسلمان اسی بدحالی میں مبتلاء ہیں اور موجودہ دور میں یہ بدحالی ایسی خوفناک صورت اختیار کر گئی ہے کہ اس کے نتائج کے تصور سے بھی دل لرز جاتا ہے۔

خیال رہے کہ ہر دور میں نیک لوگ، اصحاب علم و تقوی رہے ہیں، انہیں کے دم سے نظام دنیا چل رہا ہے، اور دنیا کی بقاء ہے لیکن اکثریت جب گناہوں میں مبتلاء ہو جاتی ہے تو کم تعداد میں نیک لوگ بھی ہلاکت کی زد میں آ جاتے ہیں، اگرچہ وہ ہلاکت ان کے لئے عذاب نہ ہو، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے۔

" اذا انزل اللہ بقوم عذابا اصاب العذاب من کان فیھم ثم بعثوا علی اعمالھم "

(بخاری ج ۲ ص ۱۰۵۳)

"یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتا ہے تو نیک و بد بھی اس میں ہلاک ہو جاتے

ہیں، پھر جب وہ اٹھائے جائیں گے تو ہر ایک کا اٹھایا جانا اس کے اچھے یا برے اعمال کے مطابق ہوگا''

مسلمان اگر اپنے دور رفتہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی تمنا یہ ہے کہ وہ کافروں پر غالب آ جائیں تو اس کا واحد حل یہ ہے کہ تمام مسلمان مجموعی طور پر کامل ایمان رکھیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پر کسی اور کو ترجیح نہ دیں۔ اسی محبت اور کامل ایمان کی وجہ سے جذبہ جہاد اور شوق شہادت پیدا کریں، تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان اپنے اس دور کو حاصل نہ کرلیں، جو صحابہ کرام کے دور میں کفار پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل تھا۔ مسلمانوں کی ہیبت سے کفار کے اعضاء پر کپکپی طاری ہوتی۔
(از التبیان مع البیان للکاظمی)

انسان کو خلیفہ بنانے میں راز حقیقت:

مفکر اسلام، مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جملہ مخلوقات سے صرف یہی ایک مخلوق ہے جو منصب خلافت کی اہلیت رکھتی ہے، علماء ربانیین نے اس مشت خاک میں پنہاں توانائیوں سے جیسے پردہ اٹھایا ہے، اس کی گرد راہ کو نفسیات انسانی کے ماہرین نہیں پہنچ سکتے، عارف کامل اسمٰعیل حقی کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

" ان فی الانسان صورة من عالم الشهادة المحسوسة وروحامن عالم الغيب الملكوتي غير المحسوس وسرا مستعدا لقبول فيض الانوار الالهية فبا لتربية يترقى من عالم الشهادة الى عالم الغيب وبسر المتابعة يترقى من عالم الملكوت الى عالم الجبروت والعظموت ويشاهد بنور الله المستفاد من سر المتابعة انوار الجمال والجلال......الخ" (روح البیان)

''یعنی انسان مختلف عناصر سے مرکب ہے، اس کی صورت کا تعلق عالم محسوس سے ہے، اور اس کی روح کا تعلق عالم غیب ملکوتی سے ہے، صورت و روح کے علاوہ اس میں ایک پوشیدہ قوت ہے جو انوار ربانی کے فیض کو قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہے، اچھی تربیت سے وہ عالم محسوس سے ترقی کر کے عالم غیب تک رسائی حاصل کرتا ہے اور رسالت مآب کی سچی پیروی سے اس پر عالم جبروت و عظموت کی راہیں کھلتی ہیں۔ وہ الٰہی نور جو اس اطاعت و پیروی کی برکت سے اسے حاصل ہوتا ہے اس سے وہ جمال و جلال کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے'' فسبحانه الله احسن الخالقین''

انسان کو جو صرف خاک کا پتلا سمجھتے ہیں کاش اس کی حقیقت پر غور کریں تا کہ ان میں اپنے بلند مقام پر پہنچنے کی تڑپ پیدا ہو۔ یہ وہ ذرہ ہے جس کے سامنے آسمان کی رفعتیں سرنگوں ہیں، اور یہ وہ قطرہ ہے جس میں سمندروں کی گہرائیاں ہیں۔

(ضیاء القرآن)

زمین میں خلیفہ بنانے کی وجہ:

﴿ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ ﴾

" ای التی هی محل الکون والفساد فهو محل التصرف عن عناصرها ومن الروح السماوی "

(تبصیر الرحمن)

رب تعالیٰ نے فرمایا: "میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں" زمین کا ذکر اس لئے فرمایا کہ زمین ہی وہ مقام ہے جہاں فساد وغیرہ پائے جاتے ہیں، اور زمین میں ہی عناصر اربعہ، سماوی (آسمانی) روح سے مل کر تصرفات کرتے ہیں۔ اس لئے زمین میں ہی ان کی اصلاح کی ضرورت تھی لہٰذا زمین میں خلیفہ بنانے کی مشیت کا اظہار کیا۔

رب تعالیٰ سے ارشاد پر فرشتوں نے کہا:

﴿ قالوا اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک ﴾

"انہوں نے کہا، ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بولتے ہیں"

فرشتوں نے یہ سوال تعجب سے کیا:

فرشتوں نے رب تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، اور نہ ہی بنی آدم پر کوئی حسد تھا اسی مضمون کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا:

" وقول الملائکة هنا لیس علی وجه الاعتراض علی الله ولا علی وجه الحسد لبنی آدم "

(ابن کثیر)

فرشتوں کے سوال کی وجہ یہ تھی:

" استکشاف عن الحکمة الخفیة او تعجب من ان یستخلف لعمارة الارض واصلاحها من یفسد فیها"

مخفی حکمت کے پتہ چلانے کے لئے، یا اس پر تعجب کرنے کے لئے یہ سوال کر دیا کہ جو فساد پھیلانے والے ہوں گے، اور خون بہانے والے ہوں گے ان سے زمین کو کیسے آباد کیا جائے گا۔ (روح المعانی)

یا ان کے سوال کی وجہ یہ تھی: " فان کان المراد عبادتک فنحن نسبح بحمدک ونقدس لک " اے اللہ زمین میں خلیفہ بنانے کی کیا حکمت ہے؟ اگر اس میں یہ حکمت ہے کہ وہ تیری عبادت کریں گے تو ہم پہلے ہی تیری عبادت کر رہے ہیں، یعنی تیری تسبیح وتحمید کر رہے اور تیری تقدیس ہم بیان کر رہے ہیں، کیا وجہ ہے کہ ہماری عبادت پر اقتصار نہیں کیا گیا؟ (ابن کثیر)

رب تعالیٰ نے جواب دیا:

﴿ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾

"رب نے فرمایا بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"

یعنی اے فرشتو جو تم نے اس مخلوق کے مفاسد ذکر کیے ہیں میں اسکی تخلیق میں جو مصلحت جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے وہی مصلحت ان مفاسد پر راجح ہے جو تم نے ذکر کیے ہیں۔ وہ مصلحت یہ ہے:

﴿ ساجعل فیھم الانبیاء وارسل فیھم الرسل ویوجد منھم الصدیقون والشھداء والصالحون والعباد والزھاد والاولیاء والابرار والمقربون والعلماء الصالحون والخاشعون والمحبون لہ تبارک و تعالیٰ المتبعون رسل صلوات اللہ وسلامہ علیھم ﴾

"کہ میں ان میں انبیاء کرام پیدا کروں گا اور ان میں رسول بھیجوں گا اور ان میں صدیقین، شہداء، صالحین، عبادت گزار، زاہدین، اولیاء، نیک لوگ، مقربین، علماء صالحین، خشوع کرنے والے، اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تابعداری کرنے والے ہوں گے"

مقصد جواب یہ تھا کہ اے فرشتو تمہاری نظر فساد پھیلانے اور خون بہانے والوں پر ہے اس لئے زمین میں میرے خلیفہ بنانے کی حکمت تمہیں سمجھ نہیں آ رہی لیکن میری نظر رحمت ان مقربین پر ہے جن کو میرے قریب کا سزاوار (لائق) ٹھہرالیا گیا ہے۔

رب تعالیٰ دن رات اپنی حکمت کا فرشتوں کو مشاہدہ کرا رہا ہے:

صحیح حدیث میں یہ مذکور ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان الملائکۃ اذا صعدت الی الرب تعالیٰ باعمال عبادہ یسالھم وھو اعلم کیف ترکتم عبادی فیقولون اتیناھم وھم یصلون وترکناھم وھم یصلون "

''بیشک فرشتے جب رب تعالیٰ کے حضور بندوں کے اعمال لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ تو رب تعالیٰ ان سے اپنے بندوں کے اعمال کے بارے میں سوال کرتا ہے، حالانکہ وہ جانتا بھی ہے، کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا وہ کہتے ہیں جب ہم ان کے پاس پہنچے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ہم نے جب ان کو چھوڑا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے''

رات کے فرشتے عصر کی نماز میں آ کر شریک ہوتے ہیں اور صبح کی نماز جماعت سے پڑھ کر تے ہیں، اور دن کے فرشتے صبح کی نماز میں جماعت میں شریک ہوتے ہیں اور عصر کی نماز جماعت ہ کر جاتے ہیں۔

اسلئے خواہ وہ فرشتے رات کے اعمال لکھنے والے ہوں یا دن کے اعمال لکھنے والے ہوں انکے آتے ہوئے بھی اللہ کے بندے نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ واپس لوٹتے ہیں تو اس وقت بھی وہ اللہ کے بندوں کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھ کر جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ رب کے حضور عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ ہم گئے تھے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے ہم آئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

اسی پر نبی کریم ﷺ کا ایک اور ارشاد گرامی بھی دلالت کر رہا ہے " یرفع الیہ عمل اللیل قبل النھار وعمل النھار قبل اللیل " اللہ تعالیٰ کے حضور لوگوں کے رات کے عمل دن سے پہلے پہنچائے جاتے ہیں اور دن کے عمل رات سے پہلے:

" فقولھم اتیناھم وھم یصلّونْ وترکناھم وھم یصلون منْ تفسیر قولہ لھم انی اعلم مالا تعلمون "

''فرشتوں کا یہ کہنا کہ جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کو چھوڑ کر آئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے''

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ انی اعلم مالا تعلمون ﴾ بیشک جو میں جانتا ہوں تم نہیں

(ابن کثیر)

جانتے، کی تفسیر ہے۔

گویا کہ یوں کہا جائے کہ رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کے اعمال کو لکھنے اور دیکھنے پر فرشتوں کو مقرر کر کے ان پر واضح کر دیا کہ اے فرشتو میرے مقربین کے اعمال دیکھو وہ میرے حکم کے مطابق کیسے سجدہ ریز ہیں؟

رب تعالیٰ اپنی حکمت کا مشاہدہ دن، رات فرشتوں کو کرا رہا ہے، اور ان پر یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ ہم نے جو یہ کہا تھا کہ ''وہ فساد پھیلائیں گے اور خون بہائیں گے'' اس کے برخلاف رب تعالیٰ کے مقرب بندے خواہشات نفسانیہ رکھنے کے باوجود رب تعالیٰ کے احکام فریضہ پر ہی صرف عمل نہیں کر رہے، بلکہ ساری ساری راتیں، سحری کے اوقات میں رب کو یاد کر رہے ہیں واقعی اس مخلوق کی شان کو رب تعالیٰ ہی جانتا تھا ہم بے خبر تھے۔

ہاں یقین کیجئے فرشتوں کی عبادت سے انسانوں کی عبادت فوقیت رکھتی ہے کیونکہ فرشتوں کو خواہشات نفسانیہ حاصل نہیں لیکن انسان کو خواہشات نفسانیہ حاصل ہیں، پھر اپنی خواہشات کو ترک کر کے راتیں جاگ کر گزار دینا، گرمیوں، سردیوں میں سحری کے وقت اٹھ کر رب کے حضور سجدہ ریز ہو جانا بہت بڑا کام ہے۔

اے انسان رب نے تجھے اپنا مقرب بنایا، تو رب تعالیٰ کی عبادت سے منہ موڑ کر کہیں اسے سے دور نہ ہو جانا۔

فرشتوں کو کیسے پتہ چلا کہ انسان فساد پھیلائیں گے:

ان کو اس کا علم چند وجوہ سے حاصل تھا۔ جو تمام ہی مراد ہیں:

(۱) رب تعالیٰ نے فرشتوں کو بتایا کہ میں ایک مخلوق کو زمین میں پیدا کرنے والا ہوں تو اسی وقت ان کو یہ بھی بتا دیا تھا:

" قال قتادة وقد تقدم اليهم انهم يفسدون فيها فقالوا "﴿ اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء﴾

''حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ فرشتوں کو پہلے ہی رب تعالیٰ نے بتا دیا تھا کہ وہ مخلوق جو میں پیدا کرنے والا ہوں ان میں سے کچھ فساد پھیلانے والے بھی ہوں گے''۔

اسی وجہ سے فرشتوں نے تعجب کرتے ہوئے حقیقت حال کو جاننے کے لئے عرض کیا (اے اللہ اس میں حکمت کیا ہے) کیا تو اس مخلوق کو خلیفہ بنائے گا جو فساد پھیلائیں گے اور خون بہائیں گے

(۲) "وقیل عرفوا ذلک من اللوح" بعض حضرات نے کہا کہ فرشتوں نے لوح محفوظ سے دیکھ کر یہ کہا تھا کیونکہ لوح محفوظ میں یہ محفوظ تھا کہ انسان فساد پھیلائیں گے اور خون بہائیں گے۔

اسی پر اگرچہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یہ اعتراض کیا ہے "ویبعده عدم علم الجواب" یہ بعید ہے کہ لوح محفوظ سے فرشتوں نے یہ تو دیکھ لیا ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے جانے والے جواب کو نہ دیکھا ہو۔

(از روح المعانی)

لیکن راقم کے نزدیک کوئی بعید نہیں اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کا اظہار کرنا تھا، تو ان پر یہ واضح کر دیا کہ انسان فساد پھیلانے والے ہوں گے، اور خون بہائیں گے۔ لیکن رب تعالیٰ نے اپنی حکمت اور اپنے مقربین کو ان سے مخفی رکھا، تا کہ فرشتے بھی رب تعالیٰ کی قدرت کے سامنے اپنے عجز کا برملا اعلان کر دیں۔

(۳) فرشتوں کو "خلیفہ" نام رکھنے سے معلوم ہوا کہ خلافت اصلاح کا تقاضا کرتی ہے۔ اور جن پر خلیفہ بنایا گیا ان پر قہر کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی سے انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ لوگ جن پر خلیفہ مقرر ہو گا وہ اپنی خواہشات کے مطابق کسی چیز کو نہ پا کر فساد پھیلائیں گے خون بہائیں گے۔ اور خصوصاً جب خلیفہ میں جمال ہوگا اور جلال بھی تو یقیناً جلال کے مطابق لوگوں کی غلطیوں پر گرفت بھی ہوتی ہے، تو وہ اس کے خلاف فساد پھیلانے والے اور خون بہانے والے ہوں گے۔ (از روح المعانی)

(۴) "ویحتمل انهم عرفوا ذلک بقیاسهم حال المجعول خلیفة علی حال الجن الذین کانوا فی الارض قبل آدم فافسدوا فیها انواعا من الفساد"

اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے جنات کو انسانوں سے پہلے پیدا کیا تو انہوں نے زمین میں مختلف قسم کے فساد پھیلائے تھے تو اسی سے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب آنے والی نئی مخلوق کا بھی وہی حال ہوگا، جو ان سے پہلے والی مخلوق یعنی جنوں کا تھا تو انہوں نے کہا وہ تو فساد پھیلائیں اور خون بہائیں۔ (شیخ زادہ)

(۵) حضرت ابن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آگ کو پیدا کیا تو فرشتوں کو

بہت زیادہ خوف لاحق ہوا تو فرشتوں نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا ﴿ ربنا لم خلقت هذه النار قال لمن عصانی من خلقی ﴾ اے ہمارے رب تو نے آگ کو کیوں پیدا کیا؟ تو رب تعالیٰ نے فرمایا اس کے لئے جو میری مخلوق سے جو میری نافرمانی کرے گا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ جنات کو بھی رب تعالیٰ نے ابھی پیدا نہیں کیا تھا اور نہ ہی انسان پیدا ہوئے تھے اس وقت صرف فرشتے ہی تھے۔

فرشتوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہم سے تو گناہ سرزد ہونے نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوت شہویہ اور قوت سبعیہ (درندگی) سے پاک رکھا ہوا ہے۔

جب کسی چیز میں درندوں والی قوت ہو تو وہ خون بہاتا ہے اور چوپاؤں والی قوت (یعنی صرف خواہشات والی قوت ہو) پائی جائے تو وہ فساد پھیلاتا ہے۔

اس سے فرشتوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ ایسی مخلوق ہو گی جس میں چوپاؤں اور درندوں والی قوتیں بھی ہوں گی جن کی وجہ سے وہ فساد پھیلائیں گے اور خون بہائیں گے۔ (شیخ زادہ)

لیکن فرشتے اس سے بے خبر رہے کہ ان میں مقربین رب تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہوں گے اسی کو رب تعالیٰ نے ﴿ انی اعلم ما لا تعلمون ﴾ بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے سے بیان فرمایا۔

(۲) "من یفسد فیها لکونها من العناصر المختلفة الداعیة الی اللذات السفلیة ویسفک الدماء اذ فیه قوة غضبیة من النار"

فرشتوں کو اس لئے پتہ چل گیا تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو پہلے اس کا علم دے دیا گیا تھا کہ وہ مخلوق مختلف عناصر (آگ، مٹی، پانی، ہوا) سے بنے گی، تو فرشتوں نے کہا کہ ان کی جب ایک حالت دوسرے پر غالب ہوگی تو انہوں نے فساد ہی پھیلانا ہے، اور خصوصاً جب ان کی آگ والی قوت غضبیہ غالب ہوگی تو وہ خون بہائیں گے۔ (از تبصیر الرحمن)

خلیفہ اعظم سید الانبیاء علیہ السلام:

پہلے یہ ذکر کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ کی تخلیق حضرت آدم علیہ السلام سے پہلی ہوئی۔ اب یہاں یہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرانے کی وجہ نبی کریم ﷺ ہی ہیں اور خلیفہ اعظم بھی

آپ ہی ہیں علامہ کاظمی رحمہ اللہ کی تفسیر کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں۔

اگرچہ ظاہر طور پر سب سے پہلے خلیفہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں لیکن حقیقت میں سب سے پہلے خلیفہ ہمارے نبی کریم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ کیونکہ آپ کا اپنا ارشاد گرامی یہ ہے:

"کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد"

(ابو نعیم، ابن سعد، طبرانی، جامع صغیر ج ۲ ص ۹۲)

"میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے"

جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کریم ﷺ کی قبر انور کی جگہ سے مٹی لے گئے، آب تسنیم سے اسے گوندھا گیا، جنتوں کی نہروں میں غوطے دیئے گئے زمینوں، آسمانوں میں پھرایا گیا (اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ہی فرشتوں نے نبی کریم ﷺ کو پہچان لیا تھا) پھر اس مٹی کو آدم علیہ السلام کے جسم سے ملا دیا گیا اور نور محمدی ﷺ سے آدم علیہ السلام کی پیشانی کو چمکایا گیا۔

(تفسیر ثعالبی ملخصا خلاصۃ التفاسیر ج ۱ ص ۲۵)

وہی نور محمدی دراصل فرشتوں سے سجدہ کرانے کا سبب بنا تھا، امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں فرمایا

"ان الملائکۃ امروا بالسجود لآدم لاجل ان نور محمد ﷺ کان فی جبھۃ آدم"

(کبیر ج ۲ ص ۴۵۵)

"بیشک فرشتوں کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ آپ کی پیشانی میں محمد ﷺ کا نور رکھا گیا تھا"

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فھو ﷺ علی الحقیقۃ الخلیفۃ الاعظم فی الخلیقۃ والامام المقدم فی الارض والسموات العلی ولو لا ماخلق آدم بل ولا ولا"

(روح المعانی ج ص ۲۱۸)

"یعنی درحقیقت حضور ﷺ ہی اللہ کی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اعظم ہیں اور زمینوں اور بلند آسمانوں میں سب سے مقدم امام حضور ہی ہیں اگر حضور ﷺ نہ ہوتے تو نہ آدم پیدا ہوتے نہ ان کے علاوہ کوئی اور چیز"

علامہ رازی اور علامہ آلوسی رحمہما اللہ کی ان عبارات سے واضح ہوا کہ خلیفہ اعظم حضور ﷺ ہی ہیں آدم علیہ السلام کی خلافت کا ظہور ہے۔ (از تبیان مع البیان)

اسی مضمون کو سمجھنے کے لئے پھر سے اس عبارت کو دیکھیں جس سے اولیت مصطفیٰ کریم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ آپ کا خلیفہ ہونے بھی سمجھ میں آئے گا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ انی جاعل فی الارض خلیفة ﴾ میں خلیفہ سے کیا مراد ہے؟

" وھو آدم ای فھو ابو البشر والخلیفة الاول باعتبار عالم الاجساد واما باعتبار عالم الارواح فھو سیدنا محمد علیہ السلام "

"وہ آدم علیہ السلام جو تمام بشروں (انسانوں) کے باپ ہیں لیکن آپ جسموں کے لحاظ سے خلیفہ اول ہیں۔ لیکن باعتبار عالم ارواح کے خلیفہ اول ہمارے سردار محمد علیہ السلام ہیں"

قال العارف فانی وان کنت ابن آدم صورة فلی فیه معنی شاهد بابوتی

یعنی نبی کریم علیہ السلام کے ارشادات سے یہ مطلب بیان کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے گویا کہ یوں فرمایا:

بیشک میں اگر چہ بظاہر آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہوں

لیکن مجھے وہ حقیقت حاصل ہے جو میرے باپ ہونے پر شاہد ہے (از صاوی)

شیخ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا:

تو اصل وجود آمدی از نخست — دگر ہر چہ موجود شد فرع تست

سب سے پہلے تم ہی اصل کائنات بن کے آئے — باقی ہر چیز جو بھی موجود ہے وہ آپ کی فرع ہے

(بوستان)

ملائکہ کیا ہیں؟ پہلے تو اس لفظ کے متعلق سمجھیں یہ لفظ " الـوکة " سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے "رسالت" جیسے کہا جاتا ہے " الکنی الیه ای ارسلنی الیه " اسنے مجھے فلاں کی طرف بھیجا۔ اصل میں لفظ ہوتا ہے "ملئک" ہمزہ کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا جاتا ہے اور اس کی حرکت ماقبل کو دے دی جاتی ہے۔ اس طرح " ملک " بن جاتا ہے۔

صاحب کشاف نے کہا:

" الملائک جمع ملئک علی الاصل کالشمائل جمع شمال والحاق التاء لتانیث الجمع "

ملائک جمع ملاک کی جیسے شمائل جمع ہے شمال کی، پھر جمع کی وجہ سے تاء تانیث کو لاحق کر دیا گیا۔ (از کبیر)

" فذهب اکثر المسلمین الی انها اجسام نورانیة "اکثر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ فرشتے نورانی مخلوق ہیں مختلف شکلیں بدل لیتے کی اللہ تعالیٰ نے ان کو اجازت دے رکھی ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ فرشتے گھٹیا چیزوں کی صورت اختیار نہیں کرتے، جیسے کتے، خنزیر وغیرہ کی شکل نہیں بناتے، استاذ المکرّم حضرت مولنا عبدالحکیم شرف قادری مدظلہ العالیٰ نے منطق کی کتاب مرقاۃ کے عربی حاشیہ میں اس کی وضاحت کی ہے۔

دیگر مذاہب بعضوں نے کہا کہ فرشتے اجسام ھوائیہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے مختلف شکلیں بدل لیتے ہیں۔ نصاری کا مذہب یہ ہے کہ فرشتے نفوس ناطقہ ہیں صاف اور بہتر بدنوں سے جدا ہوتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک اجسام خبیثہ جن اور شیطان ہیں۔

بت پرستوں کا مذہب یہ ہے کہ فرشتے ستارے ہیں کبھی وہ نیک بختی کی علامت ہوتے ہیں ان کو ملائکہ رحمت کہا جاتا ہے۔ اور کبھی وہ نحوست کی علامت ہوتے ہیں ان کو ملائکہ عذاب کہا جاتا ہے

فلاسفہ کا مذہب یہ ہے کہ فرشتے جواہر مجردہ ہیں جو حقیقت میں نفوس ناطقہ سے مختلف ہیں۔ یعنی فرشتوں کی حقیقت اور ہے اور نفوس ناطقہ کی حقیقت اور ہے۔

بعض نے وضاحت کی ہے کہ فرشتے عقول عشرہ ہیں اور نفوس فلکیہ ہیں جو آسمانوں کو حرکت دیتے ہیں۔

(روح المعانی)

فرشتوں کی تعداد:

فرشتوں کی تعداد کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا اس کے رسول ﷺ جانتے ہیں، جن کو تمام زمینوں، آسمانوں کا علم دیا گیا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے بھی فرشتوں کی معین تعداد کو نہیں بیان فرمایا۔ البتہ فرشتوں کی کثرت کو علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس بحث سے سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔ تو اتنا پتہ چل جائے گا کہ فرشتوں کی تعداد کثیر ہے:

" قال علیه الصلوة والسلام ، اطت السماء وحق لها ان تئط ما فیها موضع قدم الا وفیه ملک ساجد او راکع"

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا، آسمانوں میں چرچراہٹ پیدا ہوئی اور حق بھی یہی ہے کہ ان میں چرچراہٹ پیدا ہو، کیونکہ آسمانوں میں ایک قدم کی بھی جگہ نہیں کہ وہاں کوئی فرشتہ سجدہ یا رکوع کرنے والا موجود نہ ہو''

روایت میں آیا ہے: تمام انسان جنوں کا دسواں حصہ ہیں، اور تمام انسان اور تمام جن خشکی کے جانوروں کا دسواں حصہ ہیں اور تمام انسان اور تمام جن اور خشکی کے تمام جانور، پرندوں کا دسواں حصہ ہیں، اور تمام انسان، تمام جن، خشکی کے تمام جانور اور تمام پرندے، پانی والے حیوانات کا دسواں حصہ ہیں۔

یہ تمام مخلوق زمین کے موکلین فرشتوں کا دسواں حصہ ہیں، پھر یہ ساری تعداد پہلے آسمان کے فرشتوں کا دسواں حصہ ہیں۔ پھر یہی ترتیب ساتوں آسمانوں تک، پھر یہی نسبت کرسی کے اردگرد فرشتوں سے، پھر یہی تناسب عرش کے پردوں میں پہلے پردے سے متعلق فرشتوں سے، بھی اسی تعداد کو دوسرے، تیسرے پردے سے آخر تک جب کہ پردوں کی کل تعداد چھ لاکھ ہے...... واللہ اعلم بالصواب

(از کبیر)

آسان لفظوں میں یہی عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ فرشتوں کی تعداد کو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔ البتہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے ہمیں معلوم ہے کہ آسمانوں میں ایک قدم کی جگہ بھی نہیں جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ رکوع اور سجدہ کرنے والا موجود نہ ہو۔

ملائکہ کی دو قسمیں:

اگرچہ ملائکہ کی کئی قسمیں ہیں کوئی زمین پر موکل، کوئی حاملین عرش، کوئی جنت کے دروازے پر مقرر، کوئی جہنم کے دروازے پر مقرر اس طرح بہت سی قسمیں بن جاتی ہیں۔ لیکن سارے فرشتے دو قسموں میں آجاتے ہیں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے دو قسمیں بیان کی ہیں، جب کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے تفصیلی طور پر بہت سی قسمیں بیان کی ہیں اختصار کے پیش نظر دو قسموں کو بیان کیا جارہا ہے:

(۱) بعض فرشتے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق رہتے ہیں۔ رب تعالیٰ کے بغیر کسی اور میں مشغولیت سے وہ پاک ہیں۔ دن رات رب کی تسبیحات بیان کرتے ہیں۔ وہ کبھی اس سے تھکتے نہیں یہی وہ ہیں جو بلند شان رکھنے والے ہیں اور رب تعالیٰ کے مقرب ہیں ان کے نام ہی '' ملائکہ

العلیون والمقربون" مشہور ہوگئے۔

(۲) **مدبرات امر**: ان میں سے کوئی سماوی ہیں اور کوئی ارضی ان کی تعداد کو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں جس طرح پہلے حدیث شریف بیان کی جا چکی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" اطت السماء وحق لها ان تئط ، ما فیها موضع قدم الا فیه ملک ساجد او راکع "
''آسمان میں چرچراہٹ پیدا ہوئی، کوئی اس میں قدم رکھنے کی جگہ نہیں جہاں کوئی فرشتہ رکوع کرنے والا اور سجدہ کرنے والا نہ ہو''

یہ فرشتے مختلف شکلیں رکھتے ہیں اور ان کے مختلف درجات ہیں یعنی عظمت کے لحاظ پر ان میں تفاوت (فرق) پایا جاتا ہے۔

فائدہ جلیلہ:

" لا یراهم علی ما هم علیه الا ارباب النفوس القدسیة وقد یظهرون با بدان یشترک فی رؤیتها الخاص والعام وهم علی هم علیه ، حتی قیل ان جبریل علیه السلام فی وقت ظهوره فی صورة دحیة الکلبی بین یدی المصطفیٰ صلی الله علیه وسلم لم یفارق سدرة المنتهی "

''فرشتوں کے منصب ومقام کو صرف ارباب نفوس قدسیہ (پاک نفوں والے) ہی جانتے ہیں۔ کبھی یہ فرشتے کئی بدنوں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں، یعنی ان کے اجسام مختلف جگہ پائے جاتے ہیں۔ اس وقت ان کو خواص وعوام دیکھتے کہ وہ کسی شکل پر نمودار ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ بیان کیا گیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس اکثر اوقات حضرت دحیہ کلبی کی شکل میں حاضر ہوتے (جب آپ انسانی شکل میں آتے اس وقت ان کو صحابہ کرام بھی دیکھ لیتے تھے) لیکن آپ اس وقت سدرۃ المنتھیٰ سے بھی جدا نہیں ہوتے تھے''

اس کے بعد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ومثله یقع للکمل من الاولیاء وهذا ما وراء طور العقل ، وانا به من المومنین "

''یہی حالت اللہ تعالیٰ کے اولیاء کاملین کو بھی حاصل ہے کہ وہ مختلف بدنوں کے ساتھ ایک وقت میں کئی جگہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ مسئلہ عوام کی عقل سے بالاتر ہے لیکن علم والے اور پاک نفوس والے اس پر ایمان رکھتے ہیں، میں بھی اسی پر ایمان رکھتا ہوں'' (از روح المعانی)

فائدہ عظیمہ: صوفیاء کرام، اولیاء عظام کی نگاہ جہاں تک کام کرتی ہے۔ وہاں تک کسی اور کی نظر کی رسائی (پہنچ) نہیں۔ اس لئے صوفیاء کرام نے فرمایا کہ یہ ظاہری جہانوں کے بغیر اور جہان بھی ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو ہی ودیعت (امانت) کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ یعنی اسی کی ذات وصفات کی معرفت کے حصول میں مستغرق مخلوق رہتی ہے۔ جو اس ظاہری جہان کے احکام کے خطاب میں نہیں آتے۔ اور نہ ہی ان کو سجدہ کا حکم دیا گیا تھا۔ کیونکہ ان کو سوائے رب تعالیٰ کی ذات کی معرفت میں مستغرق ہونے کے اور کوئی شعور ہی نہیں تھا۔

اسی جہان میں ایک فرشتہ ہے۔ جس کا نام روح، قلم اعلیٰ اور عقل اول ہے:

'' وهو المرآة لذاته تعالىٰ فلا يظهر بذاته الا فى هذا الملک ''

'' وہی فرشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان کے لئے آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے، اسی میں اللہ تعالیٰ کا ظہور ہوتا ہے، یعنی وہ ذات باری تعالیٰ کا مظہر ہے''

اور وہی فرشتہ تمام مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے، وہی عالم دینوی اور عالم اخروی کا قطب، اور وہی جنت و دوزخ کا قطب ہے، اگر کوئی جنگل میں کسی ٹیلے پر رہنے والا ہے تو اس کا بھی وہی قلب ہے۔ اور اعراف والوں کا بھی وہ قطب ہے۔ اور اسی فرشتے نے لوح (محفوظ) پر ماکان ومایکون کو لکھا۔ وہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کو بھی جانتا تھا اور آپ کے مراتب کو بھی جانتا تھا۔ لوح کو قلم کے لکھتے وقت علم ذوق حاصل ہوا (کیونکہ اس میں وہ فرشتہ پہلے ہی لکھ چکا تھا):

'' وقد ظهر هذا الملک بكما له فى الحقيقة المحمدية كما يشير اليه قوله تعالىٰ ، وكذالک اوحينا اليک روحا من امرنا ، ولهذا كان ﷺ افضل خلق الله تعالىٰ على الاطلاق ، بل هو الخليفة على الحقيقة فى السبع الطباق ، وليس هذا بعيد فليفهم ''

'' وہی فرشتہ کامل طور پر حقیقت محمدیہ میں ظاہر ہوا۔ جس کی طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد اشارہ کر رہا ہے اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف روح کو وحی کیا اپنے حکم سے (اس روح سے

مُراد اگر چہ قرآن پاک بھی لیا گیا ہے۔لیکن علامہ آلوسی نے یہاں وہی ملک مراد لیا ہے)
اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ مطلقاً تمام مخلوق سے افضل ہیں اور حقیقۃً سات طبقوں میں خلیفہ آپ ہی ہیں۔اور یہ قول عقل سے بعید نہیں۔اسے سمجھنا چاہیے'' (از روح المعانی)

اسی سے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ خلیفہ اعظم نبی کریم ﷺ ہی ہیں۔اور تمام جہانوں کے قطب آپ ہی ہیں۔یعنی تمام جہانوں کی مخلوق آپ کے اردگرد گھومتی ہے۔اور آپ ہی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے مظہر ہیں۔اور آپ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور مراتب کو جانتے تھے۔اور آپ کو یہ حکم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ بھی حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو حالانکہ آپ کے نور کو پہلے پیدا کر دیا گیا تھا۔بلکہ آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے آپ کی وجہ سے ہی سجدہ کیا تھا۔

تنبیہ: ابھی علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی عبارت سے ''ملک'' کا معنی راقم نے فرشتہ کیا ہے۔یہ ظاہری معنی ہے،ورنہ حقیقی معنی ہی اس کا ''نور'' ہے وہ نور ہی سب سے پہلے تخلیق ہوا جو نور نبی کریم ﷺ کی اصلیت اور حقیقت ہے۔انشاءاللہ مزید بحث نبی کریم ﷺ کے نور کی آگے آئے گی۔

مصطفیٰ کریم ﷺ روحِ عالم ہیں:

" ولم تنزل تلک الخلافة فی الانسان الکامل الی قیام الساعة وساعة القیام ، بل متی فارق هذا الانسان العالم مات العالم لانه الروح الذی به قوامه " (روح المعانی)

''وہی خلافت عظمیٰ قیامت تک اور اٹھنے کی گھڑی تک کامل انسان (حضرت محمد ﷺ) کو حاصل رہے گی۔بلکہ یہ کامل انسان اگر جہان سے جدا ہو جائیں تو جہان ہی مر جائے۔کیونکہ وہی تو جہان کی روح ہیں۔اور ان ہی سے جہان قائم ہے واضح بات ہے کہ روح کی جسم سے جدائی باعث موت ہے''

فرشتوں کی صفات:

فرشتے نہ مذکر ہیں،نہ مونث۔نورانی مخلوق ہیں حقیقی علم ان کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ہی ہے کہ وہ کیسے ہیں۔کھلانے پینے سے وہ بے نیاز ہیں،خواہشات نفسانیہ سے وہ پاک ہیں سونے کی ضرورت نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"فمنهم سجود لا يركعون، وركوع لا ينتصبون، وصافون لا يتزايلون، ومسبحون لا يسأمون، لا يغشاهم نوم العيون، ولا سهو العقول ولا فترة الابدان ولا غفلة النسيان ومنهم امناء على وحيه والسنة الى رسله ومختلفون بقضائه وامره ومنهم الحفظة لعباده"

"بعض فرشتے سجدہ میں ہیں (ہمیشہ اسی سجدہ میں مشغول ہوتے ہیں) رکوع نہیں کرتے اور جو رکوع میں ہیں وہ اس سے اٹھتے نہیں جو صف بنا کر کھڑے ہیں وہ اس سے ہٹتے نہیں۔ اور تسبیح پڑھنے والے اس سے تھکتے نہیں۔ ان کی آنکھوں کو نیند ڈھانپتی نہیں ان کی عقلوں میں بھول نہیں ان کے بدن تھکتے نہیں وہ غافل نہیں ہوتے کہ بھول جائیں۔ ان میں کئی وحی کے امین ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں تک وحی پہنچاتے ہیں اور ان میں کئی مختلف قضاء وتدبیر پر مقرر ہیں اور ان میں سے کئی بندوں کے اعمال لکھنے پر مقرر ہیں یعنی کراما کاتبین ہیں" (کبیر)

فرشتے رب تعالیٰ کا خوف رکھتے ہیں:

فرشتے اگر چہ گناہوں سے پاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید میں ہر وقت مشغول رہتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا خوف وہ اپنے دلوں میں ایسا رکھتے ہیں جیسا کہ کوئی گنہگار دل میں خوف رکھے:

"يكونون خائفين وجلين حتى كان عبادتهم معاصى"

"وہ اس طرح خوف رکھتے ہیں کہ گویا اپنی عبادت کی کمی کو معصیت سمجھتے ہیں"

رب تعالیٰ نے ان کے خوف کو ذکر فرمایا ﴿يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ﴾ اور ارشاد فرمایا: ﴿وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ﴾

عقیدہ:

"رسل البشر افضل من رسل الملائكة ورسل الملائكة افضل من عامة البشر، وعامة البشر افضل من عامة الملائكة" (شرح عقائد ص ۱۲۲)

"تمام انبیاء کرام مقربین فرشتوں سے افضل ہیں۔ اور مقربین فرشتے عام انسانوں سے افضل ہیں۔ عام انسان مومنین عام فرشتوں سے افضل ہیں"

خیال رہے کفار " اولئک کالانعام بل هم اضل " کا مصداق ہیں یعنی وہ تو جانوروں سے بھی گھٹیا ہیں کیونکہ جانوروں جتنا بھی انہیں شعور نہیں۔

فائدہ: ایک مرتبہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ صبح نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے یا نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں رب تعالیٰ کو کون سا کلام زیادہ پسند ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

" ما اصطفاه الله لملائكته ، سبحان الله وبحمده"

وہی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے پسند فرمایا (یعنی یہ پڑھایا جائے) سُبْحَانَ اللهِ وَ بِحَمْدِهِ

☆ جبرائیل نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرشتوں کی صلوۃ کے متعلق سوال کیا، آسمان دنیا کے فرشتے سجدہ میں ہیں، قیامت تک سجدہ میں ہی رہیں گے اور یہ تسبیح وہ پڑھ رہے ہیں: ﴿سُبْحَانَ ذِی الْمُلْکِ وَالْمَلَکُوْتِ﴾ اور دوسرے آسمان کے فرشتے قیامت تک یہ پڑھتے رہیں گے ﴿سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوْتِ﴾ تیسرے آسمان کے فرشتے قیامت تک رکوع میں یہ پڑھتے رہیں گے ﴿سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ﴾ (از کبیر)

الفائدة الجليلة:

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ یہ آیت دلیل ہے اس پر کہ امام اور خلیفہ مقرر کیا جائے تا کہ اس کی بات کو سنا جائے، یعنی جو وہ حکم دے اس کو سنا جائے اور اس کی اطاعت کی جائے تا کہ وہ لوگ ایک کلمہ پر جمع ہو جائیں اور اسی کے ذریعے احکام جاری ہوں۔

(از قرطبی)

خلیفہ بنانا واجب ہے:

" ولا خلاف فی وجوب ذلک بین الامة ولا بین الائمة "

''امام وخلیفہ بنانے کے واجب ہونے میں امت کا کوئی اختلاف نہیں۔ اور نہ ہی اس میں کسی امام کا اختلاف ہے بلکہ تمام اس پر متفق اور مجتمع ہیں کہ امام وخلیفہ مقرر کرنا واجب ہے''

ہاں اس میں اختلاف صرف معتزلہ کے رئیس ابوبکر اصم نے کیا ہے " حیث کان عن الشریعة اصم " اس کا لقب ''اصم'' اسی وجہ سے پڑھا تھا کہ وہ شریعت کو سمجھنے اور حق بات کو سننے سے بہرا تھا، گویا کہ پتھر کی طرح تھا۔ پھر اس کی راہ پر چلنے والے کئی اس کے ہمنوا بن گئے۔

صرف اس کا مذہب یہ تھا کہ شریعت میں خلیفہ مقرر کرنے کا کوئی حکم نہیں اور نہ ہی واجب ہے اس کا قول یہ تھا کہ خلیفہ مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے لوگ خود ہی حج کریں، جہاد کریں، آپس میں ایک دوسرے پر انصاف کریں، اپنی طرف سے خود ہی حق پر عمل کریں، خود ہی مال غنیمت تقسیم کریں مال کا انتظام خود ہی کریں، صدقات مستحقین میں خود ہی تقسیم کریں، جن پر حدود واجب ہوں ان پر لوگ خود ہی حدود قائم کریں۔

یہی وجوہ ہیں خلیفہ مقرر کرنے کی جب ان تمام وجوہ پر خود بخود عمل کر سکتے ہیں تو امام وخلیفہ مقرر کرنا ضروری نہ رہا۔ (از قرطبی)

لیکن یہ اس کے عقلی من گھڑت اقوال ہیں بغیر امام اور خلیفہ کے از خود لوگ عمل کریں۔ ایسا نہ کبھی ہوا اور نہ ہو سکے گا۔

خلیفہ بنانے کے وجوب پر دلائل:

(1) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ انی جاعل فی الارض خلیفة ﴾ بیشک میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔

رب تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کرنے سے پہلے ان کے خلیفہ بنانے کا فیصلہ فرمایا اگر خلیفہ کی

ضرورت نہ ہوتی تو انسانوں کو پیدا کر دیا جاتا اور ان کو کھلی آزادی دے دی جاتی کہ تم اپنی مرضی سے سارے کام خود بخود کرتے رہنا۔ لیکن رب تعالیٰ نے انسانوں کو شتر بے مہار نہیں بنایا۔

(2) اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ ﴾

اے داؤد بیشک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا۔

اگر زمین میں خلیفہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی تو داؤد علیہ السلام کو خلیفہ کیوں بنایا گیا۔

(3) اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ ﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ایمان والوں اور اچھے عمل کرنے والوں سے کہ ان کو خلیفہ بنائے گا زمین میں''

اس سے بھی پتہ چلا کہ خلیفہ بنانا ضروری ہے از خود لوگوں کا اچھے کاموں پر اتفاق، برے کاموں سے اجتناب ممکن نہیں۔

(از قرطبی)

(4) نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''من مات ولم یعرف امام زمانه فقد مات میتة جاهلیة''

''جو شخص فوت ہو گیا اور اس نے اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانا تو وہ جاہلیت کی موت مر گیا''

(5) ''ولانه الامة قد جعلوا اهم المهمات بعد وفات النبی صلی الله علیه وسلم نصب الامام حتی قدموا علی الدفن وكذا بعد موت كل امام''

''اور بیشک نبی کریم ﷺ کی امت (صحابہ کرام) نے نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد سب سے اہم کام امام کا مقرر کرنا ہی سمجھا، کیونکہ امام کا مقرر کرنا نبی کریم ﷺ کے دفن سے بھی پہلے ضروری سمجھا گیا''

اور یہی دستور ہی امام کی وفات پر چلا آ رہا ہے کہ امام کی وفات پر اس کے دفن سے پہلے دوسرا امام مقرر کیا جاتا ہے۔

(از شرح عقائد)

(6) صحابہ کرام کے اجماع سے بھی ثابت ہے کہ خلیفہ مقرر کرنا واجب ہے، اس لئے کہ سقیفہ بنی

ساعدہ میں جب صحابہ کرام خلیفہ مقرر کرنے کے لئے جمع ہوئے تو ابتدائی طور پر انصار اور مہاجرین میں کچھ اختلاف ہوا، یہاں تک کہ انصار نے کہا" **منا امیر ومنکم امیر** " ہمارا اپنا امیر ہوگا، اور تمہارا اپنا امیر ہوگا۔

لیکن جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد پیش فرمایا" **الائمة من قریش** " امام قریشی ہوں گے۔" **اجمعت الصحابة علی تقدیم الصدیق** " اب تمام صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہوگیا کہ ابوبکر سب سے مقدم ہیں، ان کو ہی خلیفہ بنایا جائے " **فرجعوا واطاعو القریش** " انصار اپنے موقف سے ہٹ کر قریش کی اطاعت میں آ گئے۔ اس سے واضح ہوا کہ خلیفہ مقرر کرنا واجب تھا ورنہ اختلاف یا غور وخوض کرنے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ (از قرطبی)

خلیفہ کون مقرر کرے؟

اس میں امامیہ (اہل تشیع) فرقہ کا مذہب یہ ہے کہ خلیفہ مقرر کرنے کا راستہ صرف " **ھو النص من الرسول علیه السلام ولا مدخل للاختیار فیه** " نبی کریم ﷺ کا فرمان ہوسکتا ہے یعنی آپ نے خود خلیفہ مقرر فرما دیا ہے اس میں اور کسی کو کوئی اختیار نہیں۔

اہل سنت و جماعت کا اس میں مذہب یہ ہے کہ خلیفہ مقرر کرنے میں اہل علم جو اجتہاد کا مقام رکھتے ہوں ان کو اختیار ہے کوئی نص کسی کے متعلق نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے امام مقرر فرمایا ہو۔ البتہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اشارات ملتے ہیں۔ تاہم واضح ارشاد مصطفوی کسی کے متعلق بھی نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بلا فصل پر (اہل تشیع) کے دلائل:

(۱) نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** " جس کا میں مولی ہوں اس کے علی مولی ہیں

اس حدیث پاک سے اہل تشیع نے یہ دلیل پیش کی ہے:

" **والمولی فی اللغة بمعنی اولی، فلما قال فعلی مولاہ بفاء التعصیب**

علم ان المراد بقوله مولی انه احق واولی ، فوجب ان یکون اراد بذلک الامامة وانه مفترض الطاعة" (قرطبی)

کہ مولی کالغت میں معنی ہے " اولی " (بہتر، حقدار) اور " فعلی مولاہ " میں فاءذکر ہے جوتعقیب کے لئے آتی ہے اب معنی یہ ہوگا۔ کہ جس کا میں مولی ہوں۔ میرے بعد متصل ہی علی اس منصب کے لئے اولیٰ اور حقدار ہوں گے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس حدیث سے مراد امامت ہی ہو۔ لہذا فرض ہے کہ اس حدیث پر عمل کیا جائے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلافصل مانا جائے۔

اسی حدیث کی آڑ میں حد سے تجاوز:

" عن ابی عبد الله علیه السلام فی قول الله عزوجل ان الذین آمنوا ثم کفروا ثم امنوا ثم کفروا ثم ازدادوا کفرا لن تقبل توبتهم ، قال نزلت فی فلان وفلان آمنوا بالنبی ﷺ وکفروا حیث عرضت علیهم الولایة حین قال النبی ﷺ " من کنت مولاه فهذا علی مولاه " ثم آمنوا بالبیعة لامیر المؤمنین علیه السلام ثم کفروا حیث مضی رسول الله ﷺ فلم یقروا بالبیعة ثم ازدادوا کفرا باخذهم من بایعه لهم فهؤلاء لم یبق فیهم من الایمان شئی "

(صافی شرح اصول کافی کتاب الحجة جزء سوم حصه ۲ ص ۹۸)

"(اہل تشیع نے بیان کیا) " ان الذین امنوا ثم کفروا " یہ آیت فلاں، فلاں کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے نبی کریم اور ان کی آل پر ایمان لایا پھر جب نبی علیہ الصلوۃ وآلہ نے ان پر ان الفاظ سے " من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ " (جس کا میں ولی ہوں، اس کے علی ولی ہیں) ولایت امیر المؤمنین کو پیش کیا تو کافر ہو گئے۔ پھر امیر المؤمنین کی بیعت کر کے ایمان لے آئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بیعت پر قائم نہ رہنے کی وجہ سے کافر ہو گئے۔ پھر ان کا کفر اور زیادہ ہو گیا، جب انہوں نے ان لوگوں سے اپنے لئے بیعت لے لی جنہوں نے امیر المؤمنین کی بیعت کر لی تھی، یہاں تک کہ ان کا ایمان ذرا بھی باقی نہ رہا"

اس عبارت کی شرح صافی میں دیکھیں کہ فلاں، فلاں سے مراد کون ہیں؟ صافی میں ہے "ایں آیت نازل شد در ابوبکر و عمر و عثمان " کہ یہ آیت ابوبکر اور عمر اور عثمان کے حق

میں نازل ہوئی یعنی تینوں حضرات معاذ اللہ مرتد ہوگئے ان کا ایمان ذرا بھی باقی نہ رہا۔

اس کے بعد صافی میں ہی اسی مقام پر ہے کہ کچھ صحابہ کرام معاذ اللہ مرتد ہوگئے اور کچھ گمراہ ہو گئے۔یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے والے تو تمام ہی صحابہ کرام تھے، اس لئے ان حضرات کے قول کے مطابق کوئی صحابی گمراہی سے نہ بچ سکا۔صافی کی عبارت یہ ہے:

" بعض تابعان ایشاں وہر کدام در باطن مومن بود مرتد شد مثل اکثر تابعان ائمه ضلالت "

''بعض ان کی (ابوبکر، عمر، عثمان کی) تابعداری کرنے والے جو باطن میں مومن تھے وہ مرتد ہوگئے اور اکثر ان گمراہ اماموں کی تابعداری کرنے کی وجہ سے گمراہ ہوگئے'' (معاذ اللہ)

اسی طرح اصول کافی کے اسی باب میں مندرجہ بالا مضمون سے آگے یہ ذکر ہے۔

" ان الذین ارتدوا علی ادبارهم من بعد ما تبین لهم الهدی فلان و فلان ارتدوا عن الایمان فی ترک ولایة امیر المؤمنین "

''اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی " ان الذین ارتدوا " سے مراد فلاں، فلاں، فلاں ہیں جو امیر المؤمنین کی ولایت کو چھوڑنے کی وجہ سے ایمان سے مرتد ہوگئے''

اس پر شرح صافی کی یہ عبارت دیکھیں:

امام گفت مراد عثمان و ابوسفیان ومعاویه است برگشتند از ایمان در مجلس منافقان بسبب ترك ولایت امیر المؤمنین علیه السلام۔

امام نے کہا اس سے مراد (یعنی فلان، فلان، فلان ہے مراد) عثمان، ابوسفیان، معاویہ ہیں جو امیر المؤمنین کی ولایت کو ترک کرنے کی وجہ سے ایمان سے دور ہوگئے اور منافقوں کی جماعت میں آگئے۔

سوائے تین کے سب مہاجرین وانصار مرتد ہوگئے: (معاذ اللہ)

" المهاجرون والانصار ذهبوا الا واشار بیده ثلاثة "

(اصول کافی، کتاب الایمان باب فی قلة عدد المؤمنین)

''سوائے تین کے تمام مہاجرین وانصار ایمان سے دور ہوگئے یہ ہاتھ کے اشارے سے حضرت جعفر نے بتایا''

" عن سدید عن ابی جعفر علیه السلام قال کان الناس اهل الردة بعد

النبی ﷺ الا ثلاثة فقلت من الثلاثة فقال المقداد بن الاسود وابوذر الغفاری وسلمان الفارسی " (معرفت اخبار الرجال ، بحوالہ تحفہ شیعہ ص ٦٥)

''سدید کہتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر علیہ السلام سے سنا کہ آپ فرماتے ہیں کہ سب لوگ نبی کریم کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد سوائے تین کے مرتد ہو گئے۔ میں نے کہا وہ تین کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا مقداد ابن اسود، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی''

صحابہ کرام نے حضور ﷺ کا حکم دل سے نہیں مانا: (معاذ اللہ)

" فلما نزلت الولاية واخذ رسول الله ﷺ الميثاق عليهم لا مير المؤمنين عليه السلام آمنوا اقرار لا تصديقا فلما مضى رسول الله ﷺ و آله كفروا وازدادوا كفرا " (تفسیر قمی جلد اول ص ١٥٦)

''جب ولایت کا حکم آیا تو رسول اللہ نے ان (صحابہ) سے امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے لئے وعدہ لیا۔ انہوں نے صرف زبانی اقرار کیا لیکن دل سے تسلیم نہیں کیا، پھر جب رسول اللہ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو وہ کافر ہو گئے، اور ان کا کفر زیادہ شدید ہو گیا''

صحابہ کرام وعدہ خلاف اور لعنت کے مستحق: (معاذ اللہ)

﴿ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ ﴾ اس آیۃ کی تفسیر میں اہل تشیع کی تفسیر قمی جلد اول ص ١٦٣ میں مذکور ''یعنی نقض عہد امیر المؤمنین علیہ السلام'' یعنی اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کے وعدہ کو توڑ دیا رب نے کہا ہماری ان پر لعنت ہے۔

اہل تشیع کی اس تفسیر کے مطابق واضح ہو گیا کہ صحابہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے حضرت علی کی بیعت کا وعدہ توڑا اور وہ لعنت کے مستحق ہوئے۔

اس وعدہ سے مراد وہی وعدہ ہے جس کا ذکر ان حضرات کی کتب کے حوالہ سے ہو چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق صحابہ سے وعدہ لیا کہ تمہارے امام میرے بعد امیر المومنین علی علیہ السلام ہوں گے۔ صحابہ نے اس حکم کو مان کر پھر توڑ دیا۔ لہذا اس وعدہ کے توڑنے کی وجہ سے وہ تمام ہی لعنت کے مستحق ہوئے۔ (معاذ اللہ)

اھل تشیع کے دلائل کے جوابات:

جن آیات سے اہل تشیع نے صحابہ کرام کو مرتد، کافر، کفر میں زیادہ ہونا، ایمان سے مکمل خارج ہونا نبی کریم کا حکم دل سے نہ ماننا، وعدہ خلاف اور لعنت کا مستحق ہونا ثابت کیا ہے۔ وہ تمام آیات منافقین یا یہود یا نصاری یا کفار کے حق میں نازل ہوئیں جن کی غلط تفسیر بیان کر کے صحابہ کرام پر چسپاں کر دی گئیں ان آیات کی تفسیر انشاء اللہ اپنے اپنے محل میں ہوگی۔ یہاں اتنی وضاحت کافی ہے کہ وہ آیات جو کفار، منافقین، یہود اور نصاری کے حق میں نازل ہوئیں ان کو صحابہ کرام پر چسپاں کرنا۔ قرآن پاک کی تحریف معنوی نہیں تو اور کیا ہے؟ مقام افسوس یہ ہے کہ ایک اور فریق بتوں اور کفار کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کر کے لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔

اے اللہ تعالیٰ حق بات سمجھنے اور کہنے کی توفیق عطا فرما باطل فرقوں اور ان کے باطل نظریات سے مسلمانوں کو بچا۔

اھل تشیع کی پیش کردہ حدیث کا جواب:

پہلے ایک مرتبہ حدیث پاک کی طرف نظر کریں پھر جوابات کو دیکھیں مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ عوام کو بھی سمجھ آئے گا کہ حدیث پاک کا مطلب کیا ہے۔

حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی روایت کرتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع سے واپسی پر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام " غدیر خم " میں جلوہ افروز ہوئے تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور اس وقت جتنے مسلمان حاضر تھے ان کی موجودگی میں یہ ارشاد فرمایا:

"یا معشر المسلمین الست اولی بکم من انفسکم قالوا بلی قال من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ"

''اے مسلمانوں کی جماعت کیا میں تمہاری جانوں سے زیادہ تم پر حقدار نہیں ہوں؟ سب نے کہا ہاں یارسول اللہ آپ ہم تمام سے ہماری جانوں سے بھی اولیٰ (حقدار) ہیں آپ نے فرمایا جس کا میں مولیٰ ہوں اس کے علی مولیٰ ہیں''

اے اللہ جو علی سے محبت کرے تو اس سے محبت کر اور جو علی سے دشمنی کرے تو بھی اسے اسی کی

دشمنی کا بدلہ دے۔اس حدیث سے اہل تشیع نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلا فصل مانا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔آیئے اسکے جوابات کو دیکھئے کہ اس حدیث کا اصل مقصد کیا ہے اور بیان کیا کہا جاتا ہے۔

پہلا جواب :

" انہ لیس بمتواتر ، وقد اختلف فی صحتہ ، وقد طعن فیہ ابو داود السجستانی و ابو حاتم الرازی "

''یہ حدیث متواتر نہیں (اور اس میں صراحۃً خلافت کا ذکر ہی نہیں) اس حدیث کی سند پر ابوداؤد اور ابوحاتم رازی نے اعتراض کیا ہے''

ضعیف حدیث سے فرضیت ثابت کرنا اور اس پر عمل نہ کرنے والے صحابہ کرام کو کافر و مرتد کہنا کون سا انصاف ہے؟ اور یہ بھی خیال رہے کہ ابوداؤد اور ابوحاتم رازی نے اس حدیث پر یہ بحث کی ہے کہ اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل ثابت کی جائے تو دوسری حدیث اور اس میں تعارض لازم آئے گا۔دونوں میں سے ایک کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا۔اس لئے دونوں حدیثوں کا مفہوم اس طرح بیان کیا جائے کہ دونوں کا سچا ہونا لازم آئے۔

دوسری حدیث یہ ہے:

"مزینة و جھینة و غفار و اسلم موالی دون الناس کلھم لیس لھم مولی دون اللہ و رسولہ "

''مزینہ اور جہینہ اور غفار اور اسلم قبائل دوسرے لوگوں کے سوا میرے موالی ہیں۔اللہ اور اس کے رسول کے بغیر ان کا کوئی مولی نہیں''

اگر پہلی حدیث میں مولی کا معنی خلیفہ اور حاکم لیا جائے اور دوسری حدیث میں بھی یہی معنی لیا جائے۔تو مطلب یہ ہوگا کہ میرے بعد خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں گے،لیکن ان کی خلافت کے زیر اثر یہ قبائل نہیں ہوں گے جن کا ذکر دوسری حدیث میں ہے۔بلکہ یہ ثابت ہوگا کہ ان پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہوگا۔

یہ معانی غلط ہوں گے دونوں حدیثوں میں تعارض لازم آئے گا۔ایک کا سچا ہونا،دوسری حدیث کے کذب کو مستلزم ہوگا اس لئے جب یہ معنی لیا جائے کہ جن کا میں مددگار ہوں اور جن کا میں محب و محبوب ہوں۔ان کے علی بھی مددگار ہوں گے اور ان کے محبوب و محب ہوں گے۔

دوسری حدیث کا بھی یہی مفہوم لیں کہ مزینہ، جہینہ، غفار اور اسلم قبائل میرے مددگار ہیں، میرے ساتھ محبت کرتے ہیں اللہ اور اس کا رسول ان کے مددگار ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔ اس عظیم نعمت کی وجہ سے وہ کسی اور کی مدد کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ اب دونوں حدیثوں کا مفہوم واضح اور درست سمجھ آئے گا۔

دوسرا جواب: اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حدیث ثقہ (باوثوق، قوی) روایوں سے ثابت ہے تو پھر بھی اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت ثابت نہیں ہو سکتی، بلکہ حدیث پاک سے آپ کی فضیلت ثابت ہو رہی ہے:

" وذلک ان المولیٰ بمعنی الولی فیکون معنی الخبر من کنت ولیه فعلي ولیه "

" یعنی مولی بمعنی ولی ہے۔ اب حدیث پاک کا معنی یہ ہوا کہ جس کا میں ولی ہوں علی اس کے ولی ہیں "

جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فان اللہ ھو مولاہ ﴾ بیشک اللہ آپ کا مولی ہے یہاں بھی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کا ولی (دوست، محب، مددگار) ہے۔ حدیث پاک میں اصل مقصود یہ سمجھانا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہے، اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرا جواب: یہ حدیث پاک ایک خاص موقع پر وارد ہوئی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت اسامہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا کچھ جھگڑا ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو کہا " انت مولای " تم تو میرے غلام ہو، اور میں تمہارا مولی ہوں۔ اس کے جواب میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا " لست مولاک بل انا مولی رسول اللہ ﷺ " میں تمہارا غلام نہیں اور نہ ہی تم میرے مولی ہو بلکہ میں تو رسول اللہ ﷺ کا غلام ہوں اور وہی میرے مولی ہیں جب یہ معاملہ نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا " من کنت مولاہ فعلی مولاہ " جس کا میں مولی ہوں علی اس کے مولی ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ اس حدیث میں مولی کا معنی آقا اور غلام کا مالک ہونا ہے۔ اس میں امامت و خلافت کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

چوتھا جواب: جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا۔ آپ قافلہ سے پیچھے رہ گئیں تو منافقین نے آپ پر تہمت لگادی، نبی کریم ﷺ منافقین کے بیہودہ بکواس سے بہت پریشان تھے۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا "النساء سواها كثير" یارسول اللہ حضرت عائشہ کے بغیر اور بہت عورتیں ہیں۔ یہ بات حضرت عائشہ رضے اللہ عنہا کو بہت ناگوار گزری آپ کی پریشانی میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

"فوجد اهل النفاق مجالا فطعنوا عليه واظهروا البراءة منه"

"منافقوں کو موقع مل گیا انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی شروع کر لی اور اسی واقعہ کو آڑ بنا کر آپ سے بیزاری کا اعلان کر دیا"

عجیب بات یہ ہے کہ وہی منافق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والے بھی تھے اور وہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طرف دار بن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت بھی کر رہے تھے

اسی وجہ سے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے مروی ہے:

"ما كنا نعرف المنافقين على عهد رسول الله ﷺ الا ببغضهم لعلى عليه السلام"

"رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم منافقوں کو نہیں پہچانتے تھے سوائے اس کے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض کرتے تھے"

لہٰذا ان منافقوں کے باطل گمان اور ان کی چالبازیوں سے بچنے کے لئے صحابہ کرام کی راہنمائی کے لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "من كنت مولاه فعلى مولاه" جس کا میں مولی ہوں اس کے علی مولا ہیں۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کر کے میرے ہمدرد بننے والے جھوٹے ہیں وہ میری محبت سے دور ہیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

پانچواں جواب: اہل عربیت نے "مولی" بمعنی "اولیٰ" لینا غلط قرار دیا ہے بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ کسی مادے میں اور کسی جگہ بھی مفعل کا وزن "افعل" کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ ابوزید نے اسے جائز کہا ہے۔ اور اس نے جواز پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ ابوعبیدہ نے "هی

مولکم " کی تفسیر " اولی بکم " سے کی ہے۔لیکن جمہور اہل عربیت نے اس استدلال اور تمسک کو غلط قرار دیا ہے۔اس لئے کہ اگر کوئی شخص یہ کہنا چاہتا ہو کہ " فلان اولی منک " (فلاں آدمی تم سے بہتر ہے) تو چاہئے یہ کہ وہ یہ بھی کہہ سکے '' فلان مولی منک " حالانکہ یہ بالاتفاق باطل ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ ابو عبیدہ نے یہ نہیں بیان کیا کہ "مولی "،بمعنی " اولی " ہے بلکہ اس نے حاصل معنی بیان کیا ہے " هی مولکم " سے پہلے والے الفاظ گرامی کو دیکھا جائے تو مفہوم بہت زیادہ واضح ہو جائے گا۔اصل مکمل مفہوم اس وقت سمجھ آئے گا جب اتنے الفاظ پر نظر ہو ﴿ماواکم النار هی مولکم ﴾ آگ تمہارا ٹھکانا ہے اور تمہارے لوٹ کر جانے کا مقام ہے) یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔اگر یہاں مولیٰ بمعنی اولیٰ لیا جائے اور مولیٰ کا معنی خلیفہ، امام، صاحب ولایت کیا جائے تو آیت کریمہ کا مطلب ہی بدل جائے گا۔کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا'' آگ تمہارا ٹھکانا ہے اور وہی تمہاری حاکمہ، صاحبہ ولایت اور خلیفہ ہے۔کیا کوئی شخص آیت کریمہ کا یہ معنی درست سمجھ سکتا ہے؟ جب یقیناً یہ معنی درست نہیں تو واضح ہو گیا کہ اس آیت میں مولیٰ کو اولیٰ کے معنی میں لے کر ولایت کسی نے ثابت نہیں کی۔

چھٹا جواب: اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مولیٰ کا معنی اولیٰ ہے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اولیٰ بالتصرف ہوں گے، یعنی ان کو ولایت حاصل ہوگی، میرے بعد وہ خلیفہ بلافصل ہوں گے بلکہ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ آپ محبت اور تعظیم کے لحاظ سے اولیٰ ہیں آپ اس کے حقدار ہیں کہ آپ سے محبت کی جائے اور آپ کی تعظیم کی جائے۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾

''بیشک سب لوگوں سے ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ تھے جو ان کے پیرو ہوئے اور یہ نبی اور ایمان والے''

اس مقام پر لفظ ''اولیٰ'' صراحۃً ذکر ہونے کے باوجود ولایت کے معنی میں استعمال نہیں ہو سکتا، تو مولیٰ کو اولیٰ کے معنی میں لے کر کیسے ولایت اور خلافت کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

ساتواں جواب: لفظ مولیٰ سے جو ولایت سمجھ آ رہی ہے اس کا معنی محبت ہے، کیونکہ اس کے بعد آنے والے الفاظ مبارکہ اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ مراد محبت ہی ہے۔بعد میں آنے والے الفاظ مبارکہ یہ ہیں " اللهم وال من والاه وعاد من عاداه " اے اللہ جو شخص علی سے محبت کرے

تو اس سے محبت کر، اور جو ان سے عداوت رکھے تو بھی اسے عداوت کا بدلہ دے۔

اگر یہاں مراد " اولی بالتصرف " ہوتا تو اس طرح کہا جاتا " اللھم وال من کان فی تصرفہ وعاد من لم یکن کذالک " اے اللہ تو اس شخص سے محبت کر جو حضرت علی کی ولایت تصرف میں ہو، اور اس شخص کو سزا دے جو ان کی ولایت تصرف میں نہ ہو۔

حالانکہ ایسا نہیں فرمایا، بلکہ واضح طور پر محبت اور عداوت کا ذکر کیا، جس سے مقصد واضح ہے کہ مراد یہ ہے کہ آپ سے محبت کرنا ضروری ہے اور آپ کی عداوت سے بچنا ضروری ہے۔ جب ظاہر کلام سے مقصد یہی واضح ہے اگر اس کے بغیر اور کوئی مقصد نکالنے کی کوشش کی جائے تو نبی کریم ﷺ کی شان میں حرف آئے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے واجبات بلکہ مستحسنات و مستحبات بھی لوگوں کو فصیح اور بلیغ زبان میں اس طرح سمجھا دیئے کہ حاضرین نے ان کو سمجھا، اور بعد میں آنے والے جو لغت عرب سے واقف ہوں وہ بھی سمجھ جاتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

لیکن اگر یہ اتنا اہم مسئلہ ایسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہو جو ظاہری الفاظ سے اس کا مقصود سمجھ نہ آسکتا ہو تو لازم یہ آئے گا کہ معاذ اللہ نبی کریم ﷺ نے تبلیغ کرنے اور ہدایت دینے میں سستی اور لاپرواہی سے کام لیا اور فصیح و بلیغ زبان کو استعمال نہیں فرمایا۔

معلوم یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ کا مقصود یہی تھا جو کلام سے ظاہر طور پر سمجھ آرہا ہے اور عربی زبان کے منشا کے مطابق ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح میری محبت تم پر فرض ہے اسی طرح علی کی محبت تم پر فرض ہے اور جس طرح میرے ساتھ تمہیں عداوت رکھنا حرام ہے، اسی طرح علی سے عداوت رکھنا حرام ہے، یہی اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے اور خود اہل بیت نے بھی اس حدیث کا یہی مقصد لیا ہے۔

ابو نعیم نے حسن مثنیٰ ابن حسن السبط رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ حدیث " من کنت مولاہ فعلی مولاہ " کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص ہے؟ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اگر نبی کریم ﷺ اس سے خلافت کا ارادہ فرماتے تو یقیناً واضح طور پر ارشاد فرماتے جس سے تمام مسلمان سمجھ جائے اس لئے کہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ فصیح کلام فرمانے والے تھے۔ اگر آپ کا مقصد خلافت کا حکم دینا ہوتا تو یقیناً اس طرح فرماتے:

" یا ایها الناس هذا ولی امری والقائم علیکم بعدی فاسمعوا له واطیعوا "

''اے لوگو یہ (علی) میرے تمام امور کے والی ہوں گے اور میرے بعد تمہارے حاکم ہوں گے۔تم ان کی بات سننا اور اطاعت کرنا''

اس کے بعد آپ (حسن مثنیٰ) نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کام کے لئے اختیار کیا ہوتا، تو آپ پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت لازم ہوتی اور آپ کا اس امر سے پیچھے رہنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف ورزی کا سبب بنتا جو بہت بڑا گناہ ہے، یعنی خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خاموش رہنا اور خلافت کے حصول کے لئے میدان عمل میں نہ نکلنا ان کے لئے گناہ کا سبب بنتا۔

اس کے بعد ایک شخص نے کہا کیا نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا " من کنت مولاہ فعلی مولاہ " حضرت حسن مثنیٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: یاد رکھو خدا کی قسم اگر نبی کریم ﷺ خلافت کا ارادہ فرماتے تو آپ واضح طور پر اس طرح ارشاد فرماتے جس طرح نماز اور زکواۃ کو واضح بیان کیا۔یعنی اس طرح ارشاد ہوتا:

" یا ایها الناس ان علیا والی امرکم من بعدی والقائم فی الناس بامری "

''اے لوگو علی میرے بعد تمہارے حاکم ہوں گے اور لوگوں میں میرے تمام امور کو قائم کریں گے،یعنی میرے جانشین ہوں گے''

آٹھواں جواب: حدیث پاک سے ظاہر طور پر یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہاں دونوں ولایتیں یعنی نبی کریم ﷺ کی ولایت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت ایک زمانہ میں مجتمع ہیں، کیونکہ حدیث شریف میں لفظ " بعدی " نہیں ہے جس سے پتہ چلے کہ حضرت علی نبی کریم ﷺ کے بعد ولایت و خلافت کے حقدار ہوں گے۔نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں حضرت علی کا والی ہونا یعنی مسلمانوں کا حاکم ہونا عقلاً منع ہے۔

البتہ اگر ولایت سے مراد محبت لی جائے تو دونوں ولایتوں کا ایک زمانہ میں جمع ہونا منع نہیں، کیونکہ دونوں سے ایک زمانہ میں محبت کرنا جائز ہے۔لیکن دو کا ایک زمانہ میں حاکم ہونا اور امور میں تصرف کا والی ہونا، اس میں کئی خرابیاں ہیں جو محتاج بیان نہیں بلکہ روز روشن کی طرح واضح ہیں۔

ہاں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ثبوت فی الحال تو نہیں ، بلکہ صرف اتنا ثابت ہو رہا ہے کہ آپ خلیفہ ہوں گے، تو اس بات کو تسلیم کرنا اتفاق واتحاد کی دعوت دینا ہے، کیونکہ اہل سنت وجماعت بھی اس کے قائل ہیں کہ آپ خلیفہ ہوئے ہیں لیکن اپنے وقت میں اس وقت آپ کی خلافت برحق ہے۔ لیکن اس سے خلافت بلافصل کا ثبوت نہیں۔ کاش اس ایک نکتہ کو تسلیم کر لیا جائے تو سب جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔

بظاہر اس پر وہم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تخصیص کا کوئی مطلب نہیں نکلتا بلکہ اس طرح تو نبی کریم ﷺ کو خلفاء اربعہ (چار خلفاء راشدین) کا ذکر کرنا چاہئے تھا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقین کے درجہ تک یوں کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بذریعہ وحی خفی کے معلوم ہو چکا تھا کہ بعد میں اختلافات ہوں گے اور کئی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انکار کریں گے۔ اس لئے تاکید فرمائی کہ حضرت علی سے محبت کرنا، بغض وعناد نہ رکھنا، جب آپ کی خلافت کا وقت آئے تو آپ کی خلافت کو تسلیم کرنا، انکار نہ کرنا۔

اعتراض: حدیث شریف کی ابتداء میں لفظ ''اولیٰ'' موجود ہے۔ اس لئے '' مولیٰ '' کا معنی '' اولیٰ '' کر کے خلافت وامامت ثابت کرنا ہی صحیح ہے تم کیسے کہتے ہو کہ '' مولیٰ '' کا معنی '' اولی بالتصرف '' کرنا درست نہیں؟

جواب: یہ بات قابل تسلیم ہے کہ حدیث شریف کی ابتداء میں یہ الفاظ بھی پائے گئے ہیں '' الست اولی بالمومنین من انفسھم فی المحبة '' لیکن ان الفاظ مبارکہ کا صحیح معنی ہی یہ ہے ''کیا میں محبت میں مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ حقدار نہیں؟'' یعنی لوگ اپنی جانوں سے بھی زیادہ مجھ سے محبت کریں۔ اب اس معنی کے لحاظ سے یہ کہنا بھی ایمان کا حصہ ہے کہ لوگ اپنی جانوں سے زیادہ حضرت علی سے بھی محبت کریں۔

آیئے قرآن پاک میں دوسرے مقام پر دیکھئے جہاں لفظ '' اولیٰ ''استعمال ہے۔ وہاں بھی محبت اور شفقت کے معنی میں ہی آپ کو نظر آئے گا۔

زید بن حارثہ جن کو نبی کریم ﷺ نے متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنایا ہوا تھا۔ لوگ ان کو زید بن محمد کہنے

لگے تو اس سے منع فرمایا گیا کہ متبنیٰ حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا۔ اس لئے "زید بن محمد" نہ کہو۔ بلکہ نبی کریم ﷺ تمام مسلمانوں پر باپ کی طرح شفیق، بلکہ باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں۔ اور آپ کی ازواج مطہرات اہل اسلام کی مائیں ہیں۔

نسب کے لحاظ سے انسان اپنے آباء کے قریب ہوتا ہے لہذا ان کی طرف ہی منسوب ہو سکتا ہے۔ اور یہی حق ہے کہ اسے اپنے آباء واجداد کی طرف ہی منسوب کیا جائے۔ غیر کی طرف منسوب نہ کیا جائے، البتہ شفقت غیر سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ اسی طرح تعظیم کے لحاظ سے کوئی شخص اپنے آباء سے زیادہ معظم ہو سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ تمام مسلمانوں کے نسبی باپ تو نہیں لیکن باپ سے زیادہ شفیق اور باپ سے زیادہ معظم ہیں۔ اسی طرح آپ کی ازواج مطہرات اپنی نسبی ماؤں سے زیادہ شفقت کرنی والی اور زیادہ تعظیم کے لائق ہیں۔ اسی مندرجہ بالا مضمون کو قرآن پاک میں ان الفاظ مبارکہ سے پیش کیا گیا:

﴿ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾

"یہ نبی مسلمانوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ شفیق و مہربان ہیں اور آپ کی ازواج مطہرات ان کی مائیں ہیں اور رشتہ والے اللہ کی کتاب میں (کتاب اللہ کے حکم کے مطابق) ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں"

اعتراض: اگر اس حدیث سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صرف محبت کرنے کا حکم ہو، تو حدیث کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ قرآن پاک میں تمام مومنوں سے محبت کرنے کا حکم تو آچکا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ﴾

"مسلمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں یعنی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور مدد کرتے ہیں"

اس آیۃ کریمہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت بھی ثابت ہوگئی پھر حدیث سے محبت کرنے کے ذکر کا کیا فائدہ؟

جواب: آیۃ کریمہ سے اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ثابت ہو رہی ہے۔ لیکن وہ عام مسلمانوں کی محبت کے ضمن میں ہو رہی ہے اور حدیث پاک میں آپ کی محبت کا خصوصی حکم دیا جا رہا ہے عمومی ثبوت اور خصوصی حکم میں بہت بڑا فرق ہے۔ جیسے کوئی شخص کہے کہ میں تمام انبیاء کرام پر ایمان رکھتا ہوں۔ لیکن وہ خصوصی طور پر نبی کریم ﷺ کے اسم گرامی کو نہیں ذکر کرتا اور یہ نہیں کہتا کہ میرا ایمان نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر بھی ہے۔ تو اس شخص کا ایمان معتبر نہیں۔ حالانکہ وہ کہہ رہا ہے کہ میرا تمام انبیاء کرام پر ایمان ہے۔ انبیاء کرام کے ضمن میں نبی کریم ﷺ بھی آ گئے لیکن خصوصی ایمان نہ لانے کی وجہ سے اس شخص کا ایمان معتبر نہیں۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنے کا خصوصی حکم اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے۔

حضرات محترم خود غور فرمائیں کہ جو مضمون "اولیٰ" کا قرآن پاک کی آیۃ سے سمجھ آ رہا ہے۔ وہی حدیث پاک سے "مولیٰ" سے مراد لینا بہتر ہے یا کہ وہ معنی مراد لینا بہتر ہے، جس سے نبی کریم ﷺ پر نقص لازم آئے کہ آپ نے بہت اہم فریضہ کو بیان کرنے کا حق تبلیغ ادا نہیں کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حرف آئے کہ آپ نے اپنا حق نہ لے کر نبی کریم ﷺ کی حکم عدولی کی۔

حدیث پاک کا مفہوم بہت واضح ہے، جسے بیان کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(از تحفہ اثنا عشریہ)

دوسری حدیث سے استدلال اور اس کے جوابات:

نبی کریم ﷺ نے غزوہ تبوک میں جاتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب یہ حکم فرمایا کہ تم مدینہ طیبہ میں اہل بیت میں ہی رہو۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ عرض کیا "**یا رسول اللہ اتخلفنی فی النساء والصبیان**" یارسول اللہ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہو؟
نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"**اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ**"
"کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تمہارا میرے ساتھ اس طرح تعلق ہو جس طرح حضرت ہارون کا حضرت موسیٰ (علیہما السلام) سے"

''الا انه لا نبی بعدی ، ہاں البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا''

حضرت ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے بعد ولایت حاصل ہوئی اگر آپ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی زندہ رہتے تو وہ ولایت ختم نہیں ہوسکتی تھی۔ ورنہ نبی کا کسی منصب سے معزول ہونا لازم آئے گا اور یہ ناجائز ہے کہ نبی کو معزول کیا جائے، کیونکہ نبی کو کسی منصب سے معزول کرنا اس کی توہین ہے۔ اسی طرح حضرت امیر (علی رضی اللہ عنہ) کو منصب ولایت وخلافت سے معزول کرنا ان کی توہین ہے۔

ثابت ہوا یہ منصب ولایت (حاکمیت وخلافت) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی حاصل ہے تا کہ ان کی توہین لازم نہ آئے۔

پہلا جواب: یہ کہنا کہ ''اسم جنس کی اضافت جب علم کی طرف ہو تو وہ عموم کا فائدہ دیتی ہے'' یہ قول تمام اصولیین کے اقوال کے مخالف ہے بلکہ انہوں نے وضاحت کی ہے کہ یہ اضافت عہد پر دلالت کرتی ہے جیسے ''غلام زید'' میں غلام اسم جنس ہے، اور زید علم ہے، لیکن اضافت عموم پر دلالت نہیں کر رہی بلکہ اس میں خصوص پایا گیا ہے، جو عہد پر دلالت کر رہی ہے۔ چونکہ اضافت معنویہ میں تعریف باعتبار عہد کے اصل ہے۔

اور حدیث پاک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول '' اتخلفنی والنساء والصبیان '' قرینہ ہے کہ اس خلافت سے مراد وقتی خلافت ہے، اس لئے کہ حضرت ہارون علیہ السلام فقط حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے زمانہ میں خلیفہ تھے نہ کہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی نبی کریم ﷺ کے غزوہ تبوک میں جانے کے زمانہ میں خلیفہ تھے۔

اسی وجہ سے تو آپ یہ عرض کر رہے ہیں یا رسول اللہ آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہو اگر خلافت سے مراد نبی کریم ﷺ کی جانشینی ہوتی پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ نہ کہتے کیونکہ پھر تو آپ کو تمام مردوں اور عورتوں اور بچوں کی ولایت حاصل ہوتی۔

چونکہ آپ کو معلوم تھا کہ مجھے فقط حضور ﷺ کی غیر موجودگی میں یہ نیابت حاصل ہو رہی ہے اور

وہ عورتوں اور بچوں میں رہنا ہوگا کیونکہ مرد تو تمام غزوہ تبوک میں جا رہے ہیں۔ باقی معزولیت کا اعتراض اس لئے نہیں آتا کہ معزولیت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمل باقی ہو اور اس پر عمل کرنے والے کو معزول کر دیا جائے، جب عمل ہی ختم ہو جائے تو معزولیت لازم نہیں آتی۔

کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آ گئے تو ان کی غیر موجودگی ختم ہوگئی حضرت ہارون علیہ السلام کو موسی علیہ السلام نے اپنی غیر موجودگی میں ذمہ داری سونپی تھی۔ جب آپ واپس آ گئے تو ان کی ذمہ داری ختم ہوگئی معزول نہیں کیا گیا کہ توہین لازم آتی۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ طیبہ کی غیر موجودگی میں اپنا جانشین بنایا۔ جب آپ واپس تشریف لے آئے تو غیر موجودگی ختم ہوگئی۔ جو وجہ تھی خلیفہ بنانے کی جب وہ ہی ختم ہوگئی تو خلیفہ کی ضرورت از خود ہی ختم ہوگئی۔ معزولیت تو اسی وقت ہوتی کہ ضرورت خلیفہ موجود ہوتی اور خلیفہ کو معزول کر دیا گیا ہوتا۔ حالانکہ یہاں یہ صورت پائی ہی نہیں گئی۔ اور دلیل میں یہ پیش کیا جاتا ہے کہ صحت استثناء کے لئے مستثنی منہ میں عموم ضروری ہے یہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب مستثنی متصل ہو، لیکن یہاں تو منقطع ہے اس لئے کہ آپ کا ارشاد " انه لا نبی بعدی " جملہ خبریہ ہے اور " ان " کے داخل ہونے کی وجہ سے تاویل مفرد میں ہے مفہوم اس طرح ہو جائے گا " الا عدم النبوة " ظاہر بات ہے کہ نبوت کا نہ پایا جانا حضرت ہارون علیہ السلام کے مراتب میں کوئی مرتبہ نہیں کہ مستثنی متصل ہو۔ کیونکہ مستثنی متصل ماقبل کے حکم میں پہلے داخل ہوتا ہے پھر خارج کیا جاتا ہے۔

نقیض نہ جنس نقیض ہوتی ہے اور نہ ہی ماقبل کے حکم میں داخل ہوتی ہے ثابت ہوا کہ یہ مستثنی منقطع ہے متصل نہیں۔ عموم کی ضرورت متصل میں ہوتی ہے۔ اور اگر حدیث پاک سے یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام مراتب حاصل ہیں، تو اس سے کئی خرابیاں لازم آئیں گے اس لئے کہ حضرت ہارون علیہ السلام موسی علیہ السلام سے عمر میں بڑے تھے، اور موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ فصیح کلام فرماتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام کی طرح نبی بھی تھے اور ان کے حقیقی بھائی بھی تھے۔

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان مراتب میں سے کوئی بھی حاصل نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ عمر میں نبی کریم ﷺ سے چھوٹے تھے اور کلام میں فصاحت زیادہ تو دور کی بات ہے، نبی کریم ﷺ جیسی فصاحت بھی حاصل نہیں تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی نہیں تھے، اور نہ حضور کے حقیقی بھائی تھے۔

دوسرا جواب: یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کو خلافت کا حاصل ہونا آپ کا منصب تھا، یہ کس طرح تسلیم کیا جائے حضرت ہارون علیہ السلام تو خود نبی تھے۔ تبلیغ کرنے میں خود مستقل تھے، اگر خود موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی آپ زندہ رہتے پھر بھی آپ کو نیابت کا مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا اس لئے کہ جو خود نبی ہو اس کو نائب بنا کر اس کے مراتب کو کیسے کم کیا جا سکتا ہے جب یہ واضح ہے کہ اصالۃً نبوت میں شرف وقدر زیادہ ہے اور وہ قدر و منزلت نیابت میں نہیں۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد ثابت کرنا بھی ممکن نہیں۔

تیسرا جواب: نبی کریم ﷺ نے حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہ دے کر واضح کر دیا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو صرف اتنی دیر خلافت حاصل رہی جتنی دیر حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر رہے اور اپنی قوم سے غائب رہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اتنی دیر خلافت حاصل رہی جتنی دیر نبی کریم ﷺ غزوہ تبوک میں رہے اور مدینہ سے غائب رہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ کی خلافت حضرت یوشع اور حضرت کالب کو حاصل رہی۔

قربان جاؤں میں اپنے حبیب پاک علیہ السلام کے علم پر جنہوں نے ایسی کامل تشبیہ بیان فرمائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں آپ کے موجود نہ ہونے کے زمانے میں خلافت حضرت ہارون علیہ السلام کو حاصل رہی اور آپ کی وفات کے بعد حضرت یوشع اور حضرت کالب کو حاصل رہی۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کے موجود نہ ہونے کے زمانہ میں خلافت حضرت ﷺ کو حاصل رہی اور آپ کے وصال کے بعد دوسرے اصحابہ ثلاثہ (تینوں صحابہ کرام) کو پہلے خلافت حاصل ہوئی۔ حقیقت میں کامل تشبیہ ہی اس وقت حاصل ہو سکے گی جب اس طرح بیان کیا جائے جیسا کہ راقم نے بیان کیا ہے۔

اگر زیادہ سے زیادہ کوشش کر کے اس حدیث پاک سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ثابت کیا ہی جائے اور ہم تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی خلافت بلافصل پر اس حدیث کو کسی طرح بھی دلیل نہیں بنایا جاسکتا، اتنا ہی ثابت ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے وقت میں خلیفہ ہوں گے۔ یہی مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھے مرتبہ پر خلافت کا حاصل ہونا برحق ہے۔ اس وقت مخالفت کی وجہ اجتہادی خطاء تھی حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب تھا۔ (از تحفہ اثنا عشریہ)

اگر نبی ﷺ کا مقصد یہ ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے بعد خلیفہ ہوں گے، تو آپ یہ فرماتے " انت منی بمنزلة یوشع من موسی " تمہیں میرے نزدیک وہ مرتبہ حاصل ہے جو یوشع کو موسی علیہ السلام کے بعد حاصل ہوا تھا " فلما لم یقل هذا دل علی انه لم یرد هذا " جب آپ نے یہ نہیں فرمایا تو واضح ہوا کہ آپ کا مقصد ہی خلافت کو بیان کرنا نہیں تھا۔ بلکہ صرف بیان کرنا یہ مقصود تھا کہ تم میری غیر موجودگی میں اہل بیت کے خلیفہ ہو گے۔ جیسا کہ حضرت ہارون اپنے اہل بیت میں خلیفہ رہے۔ (از قرطبی)

چوتھا جواب: نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا ایک خاص محل اور موقع ہے وہ یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ غزوہ تبوک کی طرف تشریف لے جانے لگے تو آپ نے مدینہ طیبہ میں اپنی غیر موجودگی میں اپنے اہل اور پیچھے رہ جانے والے دوسرے حضرات پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ منافق کہنے لگے " انما خلفه بغضا وقلی له " کہ محمد (ﷺ) علی (رضی اللہ عنہ) سے ناراض ہو گئے ہیں اس لئے ان کے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ان کے کلام کو سنا تو پیچھے جا کر نبی کریم ﷺ سے مل کر بتایا کہ منافق یہ کہتے ہیں تو اس وقت نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ جھوٹے ہیں بلکہ میں نے تو تمہیں اس طرح پیچھے چھوڑا ہے جیسا کہ حضرت موسی علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو چھوڑا تھا اور ساتھ ہی یہ فرمایا "اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسی " کیا تم یہ نہیں پسند کرتے کہ تمہیں میرے نزدیک وہ مرتبہ حاصل ہو جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسی علیہ السلام کے ہاں حاصل تھا۔

اس سے واضح ہوا کہ یہ حدیث مطلق نہیں، بلکہ ایک خاص موقع اور محل پر یہ ارشاد فرمایا گیا اس سے خلافت ثابت کرنا درست نہیں۔

پانچواں جواب: نبی کریم ﷺ جب بھی کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تھے آپ کسی نہ کسی شخص کو مدینہ طیبہ میں خلیفہ بنا کر جاتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم کو بھی خلیفہ بنایا اور حضرت محمد بن مسلمہ (میم پر زبر) کو بھی خلیفہ بنایا۔ یقیناً یہ خلافت غیر موجودگی کی حالت میں ہوتی تھی۔ ورنہ ان دونوں صحابہ کے لئے بھی خلافت بلافصل ثابت کرنی پڑے گی۔

چھٹا جواب: جس روایت پر بحث جاری ہے وہ صرف حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے جو خبر واحد ہے اس کے مقابل جو روایات حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہیں وہ سند کے لحاظ سے قوی ہیں۔

روایت میں آتا ہے جب نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن میں (عامل بن کر) بھیجا۔ تو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا آپ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو کیوں نہیں بھیج رہے تو آپ نے فرمایا:

"انهما لا غنى بى عنهما ان منزلتهما منى بمنزلة السمع والبصر من الرآس"

"بیشک ان دونوں کی مجھے اپنے ساتھ بہت ضرورت ہے ان دونوں کو میرے ساتھ وہ مرتبہ حاصل ہے جو کانوں اور آنکھوں کو سر سے مرتبہ حاصل ہوتا ہے"

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **"هما وزيرا ى فى اهل الارض"** وہ دونوں زمین میں میرے وزیر ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت بھی ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا **"ابوبكر وعمر بمنزلة هارون من موسى"** ابوبکر اور عمر کو میرے ہاں وہ مرتبہ حاصل ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاں حاصل تھا:

"وهذا الخبر ورد ابتداء و خبر على ورد على سبب ، فوجب ان يكون ابوبكر اولى منه بالامامة ...... والله اعلم"

"جس روایت میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا ذکر ہے وہ مطلق ہے اس میں کوئی خاص وجہ اور کوئی خاص سبب نہیں، اور جس روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے اس میں منافقوں کا رد کیا گیا وہ خاص موقع اور محل کے مطابق ہے اسی سے سمجھ آ گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حقدار تھے اسی لئے آپ کو خلیفہ بنانے میں صحابہ کرام کا اجماع حاصل ہوتا ہے" (از قرطبی)

حدیث قرطاس اور اہل تشیع:

حدیث قرطاس کی وجہ سے اہل تشیع نے کتنا حد سے تجاوز کیا ذرا توجہ فرمائیں:

ای عزیز آیا بعد ازیں حدیث که همه عامه روایت کرده اند هیچ عاقل رامجال آں هست که شک کند در کفر کسیکه عمر را مسلمان داند"

(جلاء العیون ص ۴۵)

"اے عزیز کیا اس حدیث (قرطاس) کے بعد جس کو عام راویوں نے بیان کیا ہے کیا کسی عقل مند شخص کے لئے یہ ممکن ہے ... عمر کے کفر میں یا جو شخص عمر کو مسلمان جانے اس کے کفر میں شک کرے" (معاذ اللہ)

اس عبارت سے یہ بھی پتہ چلا کہ اہل تشیع تمام اہل سنت و جماعت کو کافر مانتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مسلمان ماننے والے کافر ہیں۔ حالانکہ اہل سنت و جماعت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا جلیل القدر صحابی اور دوسرا خلیفہ برحق مانتے ہیں۔

حدیث قرطاس کی وضاحت:

حدیث قرطاس سے مشہور روایات کو بیان کر کے اہل تشیع کے اعتراضات و جوابات کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے تحفہ اثناعشریہ، نووی رحمہ اللہ کی شرح مسلم، اور علامہ علی قاری رحمہ اللہ کی مرقاۃ شرح مشکوۃ کی روشنی میں بیان کیا جارہا ہے تاکہ اہل سنت و جماعت اور اہل تشیع کے عقائد کا واضح طور پر پتہ چل سکے۔ پہلے اصل روایات کو مدنظر رکھا جائے کہ اصل روایات کیا ہیں۔ پھر اہل تشیع کے اعتراضات اور ان کے جوابات اور اہل سنت و جماعت کا موقف سمجھنا آسان ہوگا۔

بخاری شریف سے دو حدیثیں اور ایک حدیث مسلم شریف سے پیش کی جارہی ہے:

(۱) حدثنا عبد الله بن محمد حدثنا عبد الرزاق اخبرنا معمر عن الزهری عن عبید الله بن عبد الله عن ابن عباس رضی الله عنهما قال لما حضر رسول الله ﷺ وفی البیت رجال فیهم عمر ابن الخطاب قال النبی ﷺ هلم اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعده فقال عمر ان النبی ﷺ قد غلب علیه الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب الله فاختلف اهل البیت فاختصموا منهم من یقول قربوا یکتب لکم النبی ﷺ کتابا لن تضلوا بعده ومنهم من

یقول ما قال عمر فلما اکثر واللغو والاختلاف عند النبی ﷺ قال رسول اللہ ﷺ قوموا قال عبید اللہ فکان ابن عباس یقول ان الرزیۃ کل الرزیۃ ما حال بین رسول اللہ ﷺ وبین ان یکتب لھم ذلک الکتاب من اختلافھم ولغطھم"
(صحیح بخاری جزء رابع کتاب الطب باب قول المریض قوموا عنی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ کے وصال شریف کا وقت قریب آ گیا۔آپ کے گھر کچھ حضرات موجود تھے اوران میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے حضور نے ارشادفرمایا سامان کتابت لاؤ میں تمہیں ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم گمراہ نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ پر درد غالب ہوگیا تمہارے پاس قرآن پاک موجود ہے ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔جولوگ اس وقت نبی کریم ﷺ کے گھر موجود تھے ان میں اختلاف ہوگیا اور وہ آپس میں جھگڑا کرنے لگے۔بعض کہنے لگے (قلم،دوات،کاغذوغیرہ) قریب کروتا کہ آپ کوئی ایسی تحریر لکھ دیں جس کی وجہ سے تم گمراہ نہ ہو۔اور بعض حضرات نے اسی طرح کہا جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔جب ان کا اختلاف اور شوروغل زیادہ ہوگیا تو نبی کریم ﷺ نے ارشادفرماؤ،اٹھ جاؤ ،عبیداللہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ مصیبت،بہت بڑی مصیبت وہ تھی جو ان حضرات کا اختلاف اور شوروغل نبی کریم ﷺ اور آپ کی تحریر کے درمیان حائل ہوگیا۔

(۲) " حدثنا قتیبۃ حدثنا سفیان عن سلیمان الاحول عن سعید بن جبیر قال قال ابن عباس یوم الخمیس اشتد برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجعہ فقال ایتونی اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ ابدا فتنازعوا ولا ینبغی عند بنی تنازع فقالوا ما شانہ اھجر استفھموہ فذھبوا یردون علیہ فقال دعونی فالذی انا فیہ خیر مما تدعونی الیہ واوصاھم بثلاث فقال اخرجوا الیھودوالمشرکین من جزیرۃ العرب واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم وسکت عن الثالثۃ اوقال فنسیتھا " (بخاری جزء ثالث باب عرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جمعرات کادن،وہ جمعرات کادن کتنا ہی سخت تھا،جس دن نبی کریم ﷺ کو درد شدید ہوگیا آپ نے فرمایا میرے پاس (لکھنے کا سامان) لاؤ میں تمہیں ایک ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو۔حاضرین نے اس میں جھگڑا کیا کسی نبی کے سامنے جھگڑا

مناسب نہیں، بعض نے کہا نبی کریم ﷺ کی کیسی شان ہے کیا آپ کی زبان مبارک سے ہذیان اور مختلط کلام صادر ہوسکتا ہے؟ آپ سے سوال کرو تو پھر دوبارہ انہوں نے وہ معاملہ آپ پر پیش کیا، اس پر آپ نے فرمایا کہ مجھے چھوڑ دو کیونکہ میں جس حال میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، اور آپ نے تین باتوں کی ان کو وصیت کی، مشرکین اور یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دینا اور (بیرون ممالک سے آنیوالے) قاصدوں کو اسی طرح انعام دینا (اچھا سلوک کرنا) جس طرح میں ان کو انعام دیتا تھا۔

سلیمان احول کہتے ہیں تیسری بات سے سعید بن جبیر خاموش رہے یا انہوں نے تو بیان فرمادیا لیکن مجھے یاد نہیں رہا۔

(۴) "حدثنا اسحق بن ابراهيم انا وكيع عن مالك بن مغول عن طلحة بن مصرف عن سعيد بن جبير عن ابن عباس انه قال يوم الخميس وما يوم الخميس ثم جعل تسيل دموعه حتى رايت على خديه كانها نظام اللؤلؤ قال قال رسول الله ﷺ ايتوني بالكتف والدواة او اللوح والدواة اكتب لكم كتابا لن تضلوا بعده فقالوا ان رسول الله ﷺ يهجر"

(مسلم جلد ثانی کتاب الوصية)

سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جمعرات کا دن، وہ جمعرات کا دن کیسا شدید دن تھا پھر آپ کے آنسو جاری ہوگئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے رخسار پر موتیوں کی طرح آنسو دیکھے، آپ نے کہا نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے پاس کاغذ اور دوات لاؤ یا آپ نے فرمایا "میرے پاس تختی اور دوات لاؤ (روای کو شک ہے) میں تمہیں ایک تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے انہوں نے کہا کیا نبی کریم ﷺ ہذیان اور مختلط کلام فرماسکتے ہیں؟

یہ وہ روایات جو حدیث قرطاس سے مشہور ہیں۔ ان روایات کو غلط بیان کرکے معاذ اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کافر کہا گیا۔

حدیث قرطاس کی وجہ سے اہل تشیع کے اعتراضات:

پہلا اعتراض: نبی کریم ﷺ کے ارشادات وحی ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوْحٰى﴾

''نبی کریم ﷺ اپنی خواہشات نفسانیہ سے کوئی کلام نہیں فرماتے سوائے اس کے جو آپ کی طرف وحی نازل کی اس پر خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی شاہد ہے:

﴿ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون ﴾

جو اللہ کے اتارے پر حکم نہ کرے وہی لوگ کافر ہیں۔

جواب: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ارشادگرامی کو رد نہیں فرمایا۔ بلکہ یہ کہنا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادگرامی کو رد کیا ہے یہ کسی طرح بھی درست نہیں ہر شخص اپنے بزرگ یا عزیز بیمار کو راحت پہنچانے کا خیال کرتا ہے اگر کوئی بیمار شخص از خود حاضرین کی مصلحت اور فائدہ کے لئے کوئی مشقت برداشت کرنا بھی چاہے تو اس کے خدام، عزیز و اقارب اس کو منع کرتے ہیں کہ تم پہلے ہی شدت مرض میں مبتلا ہو اب مزید کوئی تکلیف نہ اٹھاؤ۔

اسی طرح جب نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کی مصلحت کے پیش نظر شدت مرض کے دوران لکھنے کی تکلیف اٹھانے کا ارادہ فرمایا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے از روئے شفقت اور ادب واحترام کے پیش نظر نبی کریم ﷺ کو سنانے کی غرض سے عرض کیا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔ تا کہ نبی کریم ﷺ ہماری طرف سے مطمئن ہو جائیں کہ ہم انشاء اللہ کوئی کام کتاب اللہ کے خلاف نہیں کریں گے۔

اہل علم اور اہل عقل و دانش تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس شاندار عرض گزاشت اور دقیق نظر کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سبحان اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر اس مسئلہ کی طرف بھی تھی کہ یہ تو یقینی بات ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نیا کوئی ارشاد تو فرمانا ہی نہیں۔ کیونکہ اس واقعہ سے تین ماہ پہلے دین اسلام کی تکمیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے ہو چکی تھی:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

''آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا''

گویا کہ اس آیت کریمہ سے نسخ، تبدیلی، زیادتی و نقصان کے احتمال کو ختم کر دیا گیا، اس کے بعد اگر کوئی نیا حکم نافذ کرنا مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی اس آیت کریمہ کی تکذیب لازم آتی، حالانکہ نبی کریم ﷺ

سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ کوئی نیا حکم نافذ کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدل دیتے۔

یقینی بات ہے کہ آپ سابقہ احکام کی توثیق ہی فرمانا چاہتے ہوں گے اور اسی کو سمجھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو سنانے کے لئے عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ ہمارے متعلق کوئی فکر نہ کریں ہم انشاء اللہ کتاب اللہ پر عمل کریں گے۔

حدیث پاک کے الفاظ پر توجہ کریں تو مندرجہ بالا تقریر کو ذہن قبول کرے گا۔ حدیث پاک کے ان الفاظ کو پھر دیکھیں اور غور وفکر کریں:

"ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد غلبہ الوجع وعندنا کتاب اللہ حسبنا"

"بیشک نبی کریم ﷺ شدت درد و تکلیف میں ہیں ہمارے پاس کتاب اللہ ہے وہ ہمیں کافی ہے"

انکار بوجہ محبت مستحسن ہے:

اگر کوئی شخص اپنے کسی بزرگ مثلاً باپ، استاد، پیر و مرشد کا کوئی کام کرنا چاہتا ہو وہ از روئے شفقت اپنے عزیز کو کہے کہ تم یہ کام نہ کرو، چھوڑ دو، میں خود ہی کر لیتا ہوں۔

لیکن وہ عزیز اپنے بزرگ کی بات کو تسلیم نہ کرے بلکہ اصرار کرے کہ یہ کام مین نے کرنا ہی ہے تو اس کو نافرمان نہیں کہا جائے گا بلکہ اس کو باادب کہا جائے گا کہ اس نے باوجود اپنے بزرگ کے روکنے کے ادب کا بھی لحاظ کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح نبی کریم ﷺ کے آرام کی خاطر محبت سے انکار کیا جو یقیناً مقبول اور حسین ہے۔

حضرت علیؓ نے بوجہ محبت نبی کریمؐ کے ارشاد کا انکار کیا:

نبی کریم ﷺ نے جب مشرکین مکہ سے حدیبیہ کے مقام میں صلح کی اور اس میں چند شرائط پر صلح ہوئی اس صلح نامہ کی تحریر میں یہ واقع بھی در پیش آیا:

" فلما کتبوا الکتاب کتبوا ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ قالوا لا نقر بھا فلو نعلم انک رسول اللہ ما منعناک ولکن انت محمد بن عبد اللہ فقال انا رسول اللہ وانا محمد بن عبد اللہ ثم قال لعلی بن ابی طالب امح رسول اللہ قال لا امحوک ابدا فاخذ رسول اللہ ﷺ

ولیس یحسن یکتب فکتب هذا ما قاضی علیه محمد بن عبد الله "

(متفق علیه، مشکوۃ باب الصلح)

"جب صلح نامہ تحریر کیا تو اس میں لکھا یہ ہے جس پر محمد رسول اللہ (ﷺ) نے فیصلہ کیا۔ انہوں (مشرکین) نے کہا ہم آپ کی رسالت کا اقرار ہی نہیں کرتے اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ہم آپ کو (عمرہ کرنے سے) نہ روکتے۔ لیکن تم محمد بن عبداللہ ہو۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں محمد رسول اللہ بھی ہوں اور محمد بن عبداللہ بھی ہوں۔ پھر آپ نے علی بن طالب (رضی اللہ عنہ) کو کہا اس سے لفظ رسول اللہ کو مٹا دو آپ نے کہا میں آپ سے کبھی نہیں مٹاؤں گا (یعنی لفظ رسول اللہ کو آپ کے اسم گرامی سے کبھی نہیں مٹاؤں گا) پھر نبی کریم ﷺ نے وہ صلح نامہ خود لیا اگرچہ آپ خود لکھنا زیادہ پسند نہیں فرماتے تھے پھر بھی آپ نے خود اس پر لکھا " هذا ما قاضی علیه محمد بن عبد الله " یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے فیصلہ کیا ہے"

اس واقع سے بخوبی معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کو تسلیم نہیں کیا بلکہ رد کیا اب اگر کوئی نامراد، بد بخت یہ کہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ کو رد کر کے وحی خدا کو رد کر دیا ہے یہ کہنا اپنی ہی بدبختی ہے ورنہ ہر ذی عقل وشعور سمجھتا ہے کہ آپ کا یہ انکار کمال محبت پر دلالت کر رہا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ یا رسول اللہ جب آپ کو ہم دل و جان سے اللہ کا رسول مانتے ہیں تو پھر میں اپنے ہی ہاتھوں سے آپ کے اسم گرامی سے " رسول الله " کو مٹا دوں یہ ناممکن ہے۔ میرا ایمان یہ تسلیم ہی نہیں کرتا کہ یہ کام میں سرانجام دوں سبحان اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انکار کیسی محبت پر مبنی تھا۔

خدارا ذرا عقل و ہوش سے کام لیتے ہوئے انصاف کریں کہ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نبی کریم ﷺ کے ارشاد کو رد کرنے کے باوجود کمال ایمان اور عین محبت ہے یا نہیں؟ یقیناً آپ نے کامل ایمان اور کامل محبت سے ہی انکار کیا۔ یہ انکار ہی کیسا حسین ہے جو اپنے دامن میں محبت کے موجزن دریا کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کمال شفقت و رحمت کی وجہ سے انکار کیا جو عین ایمان اور حقیقی محبت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بوجہ عذر انکار کیا:

" حدثنا قتیبة بن سعید قال نالیث عن عقیل عن الزهری عن علی بن حسین ان الحسبن بن علی بن ابی طالب ان النبی ﷺ طرقه وفاطمة فقال الا تصلون فقلت یا رسول الله انما انفسنا بید الله فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا فتصرف رسول الله ﷺ حین قلت له ذلک ثم سمعته وهو مدبر یضرب فخذه ویقول وکان الانسان اکثر شئی جدلا "

(مسلم کتاب صلوة المسافرین باب الحث علی صلوة اللیل وان قلت)

" حضرت امام حسین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ ایک رات میرے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے ،فرمایا تم نماز تہجد ادا نہیں کرتے ؟ میں نے کہا یا رسول اللہ ہماری جانیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں جب ہمیں وہ اٹھانا چاہتا ہے ہم اٹھتے ہیں۔ (حضرت علی کہتے ہیں) جب میں نے یہ کہا تو نبی کریم ﷺ واپس لوٹ پڑے، پھر میں نے سنا کہ آپ واپس ہونے کے دوران اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمارہے ہیں " وکان الانسان اکثر شئی جدلا " انسان سب چیزوں سے زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے"

اسی حدیث کی شرح میں علامہ نووی ذکر کرتے ہیں:

" والمختار فی معناه انه تعجب من سرعة جوابه وعدم موافقته له علی الاعتذار بها ولهذا ضرب فخذه "

" اس حدیث پاک کے معنی میں مختار قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جلد بازی سے جواب دینے اور نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر بوجہ عذر جواب نہ دینے پر حضور کو تعجب ہوا، اسی تعجب کی وجہ سے آپ نے اپنی ران پر ہاتھ مارا"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہاں یہ عرض نہیں کیا کہ یا رسول اللہ نہیں اٹھ سکے اب اٹھتے ہیں۔ بلکہ عرض کیا ہمیں رب جب اٹھاتا ہے اس وقت اٹھتے ہیں۔ بظاہر یہ جواب رد پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں عذر پیش کیا جارہا ہے۔ اگرچہ جواب میں جلد بازی سے معمولی کوتاہی ہوگئی۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے بھی تعجب کیا ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ اس لئے اس جواب سے معاذ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان

میں کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا اعتراض: حضرت عمر نے نبی کریم ﷺ سے کلام کو ہذیان سے تعبیر کیا حالانکہ ہذیان تو اس شخص سے سرزد ہوتا ہے جس کا عقل نہ ہو مجنون ہو۔ انبیاء کرام میں جنون کا پایا جانا محال ہے اور ان سے ایسے کلام کا واقع ہونا جو بے اعتبار رہو مختلط (غلط اور صحیح سے خلط ملط) ہونا ممکن ہے ورنہ انبیاء کرام کے اقوال اور افعال بے اعتبار ہو جائیں گی۔ حالانکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے افعال اور اقوال ہر وقت قابل اتباع ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ وہ افعال انبیاء کرام کے ساتھ خاص نہ ہوں۔

لہٰذا حضرت عمر کا نبی کریم ﷺ کے کلام کو ہذیان سے تعبیر کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی ہے۔

جواب: یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا ہی غلط ہے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ کہا ہمارے پاس قرآن پاک ہے ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے۔ اس وقت صحابہ کرام دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ بعض حضرات کہہ رہے تھے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے وہ کافی ہے نبی کریم ﷺ شدید مریض ہیں ان کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔

یہ ہذیان والا کلام ان حضرات کا ہے جو لکھنے کو پسند فرما رہے تھے اور وہ استفہام انکاری کے طور پر کلام کر رہے تھے۔ استفہام انکاری کا یہ مطلب ہے کہ سوالیہ انداز پر کسی بات کو رد کر دیا جائے جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کو کہے یہ کام تم نے کیا ہے اور وہ جواب میں یہ کہے کہ کیا میں نے کیا ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسا کام میں نہیں کر سکتا:

"وقال القاضی عیاض وقوله اهجر رسول الله ﷺ، لکذا هو فی صحیح مسلم وغیره اهجر علی الاستفهام وهو اصح من روایة من روی هجر ویهجر لان هذا کله لا یصح منه صلی الله علیه وسلم لان معنی هجر هذی وانما جاء هذا من قائله استفهاما للانکار علی من قال لا تکتبوا ای لا تترکوا امر رسول الله ﷺ وتجعلوه کامر من هجر فی کلامه لانه صلی الله علیه وسلم لا یهجر"

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں قول "اهجر رسول الله ﷺ" مسلم

وغیرہ میں جو آیا ہوا ہے وہ استفہام کے طور رہے۔ یہ استفہام والی روایت " هجر اور یهجر " والی روایتوں سے زیادہ صحیح ہے، کیونکہ " هجر " کا معنی ہذیان ہے یعنی مختلط کلام کرنا۔ اور یہ کلام استفہام انکاری کے طور پر واقع ہے۔ یعنی وہ حضرات جو اس کے قائل تھے کہ امر کتابت کو نہ چھوڑا جائے بلکہ اس پر عمل کیا جائے وہ استفہام انکاری کے طور پر اس طرح کہہ رہے تھے کیا نبی کریم ﷺ کا کلام ہذیان ہو سکتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

اسلئے جب آپ سے ہذیان سرزد نہیں ہو سکتا تو آپ سے لکھانا چاہئے۔ کیونکہ آپ لکھنے کا حکم دے رہے ہیں وہ حق پر مبنی ہے یہ بھی خیال رہے کہ راقم کے نزدیک جن روایات میں " همزہ استفهام " ظاہر نہیں ان میں بھی یقیناً ہمزہ مقدر ہے۔ اس طرح تمام روایات میں مطابقت ہو گی۔ سب کا ترجمہ استفہام انکاری کے مطابق ہی صحیح ہے۔

اس طرح قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں، چاند اور سورج کو خدا کہنا استفہامیہ انداز پر ہے لیکن اکثر مترجمین اس کو نہ سمجھ سکے ترجمہ اقرار اور خبر کے مطابق کر کے غلطی کے مرتکب ہوئے۔ راقم کی کتاب تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان میں وضاحت دیکھیں۔

تیسرا اعتراض: نبی کریم ﷺ کی محفل پاک میں حضرت عمر نے اپنی آواز کو بلند کیا حالانکہ نبی کریم ﷺ کی محفل میں آواز کو بلند کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴾

"اے ایمان والو اپنی آوازیں اونچی نہ کرو اس غیب بتانے والے (نبی) کی آواز سے اور ان کے حضور بات چلا کر نہ کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے چلاتے ہو کہ کہیں تمہارے عمل برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو"

اس آیۂ کریمہ سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے حضور چلانا عمل کے ضائع کرنے کا سبب ہے، تو حضرت عمر نے اپنی آواز کو کیوں بلند کیا؟

جواب: یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے اور یا حق سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی

آواز مبارک پر کسی کی آواز بلند نہیں ہوئی نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اور نہ کسی اور صحابی کی۔ نبی کریم ﷺ کے حضور صحابہ کرام کا ایک دوسرے سے کلام کرنا ہمیشہ جاری رہا اس سے منع نہیں کیا گیا بلکہ قرآن پاک اس کے جواز کی طرف دو وجہ سے اشارہ کر رہا ہے۔

ایک وجہ یہ کہ قرآن پاک میں ہے:

◦ لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ﴾ تم اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اونچی نہ کرو یہ نہیں فرمایا:

﴿ لا ترفعوا اصواتکم بینکم عند النبی ﴾

تم اپنی آوازیں نبی کریم کے حضور ایک دوسرے پر بلند نہ کرو۔

اس سے صاف سمجھ آتا ہے کہ اپنی آوازیں نبی کریم ﷺ کی آواز پر بلند کرنا اعمال کے ضائع کرنے کا سبب تھا نہ کہ ایک دوسرے سے اپنی آواز کو بلند کرنا اعمال کے ضائع کرنے کا سبب تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ کجھر بعضکم لبعض ﴾ جیسے آپس میں ایک دوسرے سے چلاتے ہو (ایسی چلا کر نبی کریم ﷺ سے باتیں نہ کرو)۔ قرآن پاک کے یہ الفاظ صاف صاف بتا رہے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے سے بلند آواز سے بات کرنا جائز تھا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ ثابت کرنا ممکن ہی نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی آواز کو بلند کیا بلکہ آپ نے تو صرف اتنا کہا " حسبنا کتاب الله "ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔

اس پر صحابہ کرام کے دو گروہ بن گئے کچھ کہہ رہے تھے کہ سامان کتابت لانا چاہئے کچھ کہہ رہے تھے ضرورت نہیں۔ چونکہ وہاں کئی صحابہ کرام کا آپس میں ایک دوسرے سے کلام کرنے کی وجہ سے آواز بلند ہوئی یہ قدرتی امر ہے کہ جب کئی آدمی آپس میں کلام کریں تو آواز بلند ہو ہی جاتی ہے اس آواز کے بلند ہونے میں سب ہی شریک تھے جو صحابہ کرام لکھانے کے حق میں تھے وہ بھی کلام کر رہے تھے اور جو صحابہ کرام کہہ رہے تھے ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے وہ بھی کلام کر رہے تھے۔ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد گرامی " لا ینبغی عندی تنازع " (میرے پاس جھگڑا کرنا

مناسب نہیں) سے واضح ہو رہا ہے کہ کسی صحابی کی آواز نبی کریم ﷺ کی آواز پر بلند نہیں ہو رہی تھی ورنہ حضور ﷺ "لا ینبغی" کے الفاظ سے ذکر نہ فرماتے کیونکہ اس کا معنی ہے "مناسب نہیں"

اگر نبی کریم ﷺ کی آواز مبارک پر کسی کی آواز بلند ہو رہی ہوتی تو آپ واضح طور پر فرماتے کہ" میرے پاس جھگڑا کرنا حرام ہے" اور نبی کریم ﷺ نے جو ارشاد فرمایا "قوموا" (اٹھ جاؤ) اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ شدید مریض تھے یہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ مریض کا مزاج ہی ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے پاس باتوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ انبیاء کرام کا مریض ہونا بدن کا ضعیف ہونا جائز ہے یہ ان کی شان کے منافی نہیں اس لئے کہ مرض سے گنہگار مریض کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور نیک لوگوں کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔

چوتھا جواب: حضرت عمر نے ضروریاتِ دین کا انکار کیا اور حق تلفی کی ہے کیونکہ اگر نبی کریم ﷺ لکھ دیتے تو کوئی اختلاف نہ رہتا، آج اصول وفروع میں جو اختلاف ہیں وہ فقط حضرت عمر کے انکار کی وجہ سے ہیں۔لہٰذا ان تمام اختلافات کا وبال حضرت عمر کی گردن پر ہے۔

جواب: یہ کہنا ہی غلط ہے کہ نبی کریم ﷺ جو لکھنا چاہتے تھے وہ ضروریات دین سے تھا اس لئے کہ نبی کریم ﷺ جو لکھنا چاہتے تھے اس میں تین احتمال ہیں۔ایک یہ کہ آپ جتنے احکام پہلے بیان کر چکے تھے ان میں زیادتی فرمانا چاہتے تھی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ پہلے احکام کو منسوخ فرمانا چاہتے تھے، اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ آپ پہلے ہی احکام کی تاکید فرمانا چاہتے تھے۔ پہلے دونوں احتمال باطل ہیں۔ اس لئے کہ اس واقعہ سے تین ماہ پہلے یہ آیہ کریمہ نازل ہو چکی تھی:

﴿ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴾

"آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور میں نے اپنی نعمتیں تم پر مکمل کر دیں اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا ہے"

تین ماہ پہلے دین مکمل ہو چکا ہے اب اس میں زیادتی یا نسخ کرنے سے اس آیہ کریمہ کی

تکذیب لازم آتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن پاک کی آیت کی تکذیب ہو۔ اگر پہلے ہی احکام کی تاکید ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ پہلے یہ واضح طور پر بیان نہیں فرمایا کہ میرے جانشین حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ اگر ایسا آپ نے فرمایا ہوتا تو اب امید کی جاسکتی تھی کہ آپ نے دوبارہ اسی امر کی تاکید فرمائی ہو اور لکھنا چاہتے ہوں لیکن یہ ثبوت پیش کرنا ممکن نہیں۔

جن دو حدیثوں سے خلافت بلافصل کو پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا رد پہلے ہی کر دیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ جو وصیتیں لکھنا چاہتے تھے وہ آپ نے زبانی ہی ارشاد فرمادیں۔ وہ احادیث جو شروع بحث میں بیان کی جاچکی ہیں ان سے یہ واضح ہے کہ آپ نے یہ فرمایا:

(۱) مشرکین اور یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دینا۔

(۲) دوسرے ممالک سے آنے والے قاصدوں سے میری طرح اچھا سلوک کرنا اور ان کو میری طرح انعامات دینا۔

(۳) تیسری وصیت راوی کو بھول گئی لیکن محدثین نے وضاحت کی کہ وہ تیسری وصیت یقیناً وہی ہو گی جو آپ نے دوسرے اوقات میں بیان فرمادی تھی وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا "لشکر اسامہ کو غزوہ کے لئے بھیج دینا اسے روکنا نہیں اور اسی طرح یہ بھی فرمایا" میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔

اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ ضروریات دین سے کوئی مسئلہ لکھنا چاہتے ہوتے تو ضرور بضرور آپ واضح طور پر لکھتے اور اشارہ، کنایہ سے نہ ارشاد فرماتے کیونکہ آپ پر فرض تھا کہ آپ ضروریات دین کے تمام مسائل کو کھول کر بیان کریں۔

معاذ اللہ ایسے اہم مسائل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ یہ واقعہ جمعرات کا ہے اور نبی کریم ﷺ کا وصال پیر کو ہوا۔ جب بعد میں اہل بیت اطہار کو آپ کے پاس علیحدہ بیٹھنے کے واقع بھی میسر آئے لیکن نبی کریم ﷺ نے اتنے دنوں میں پھر لکھنے کا ارادہ نہیں فرمایا تو اس کی وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے کہ آپ کو اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ صحابہ کرام قرآن پاک پر عمل کریں گے ان کو وصیت لکھ کر دینے کی ضرورت نہیں۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضرورتِ دین کا انکار کیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ ایک اہم مسئلہ بھی مسئلہ خلافت تحریر فرمانا چاہتے تھے تو اس میں نبی کریم ﷺ کی شان میں فرق آئے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ﴾

''اے رسول پہنچا دو جو کچھ اترا تمہیں تمہارے رب کی طرف سے اور اگر ایسا نہ ہوا تو تم نے اس کا کوئی پیام نہ پہنچایا اور اللہ تعالیٰ تمہاری نگہبانی کرے گا لوگوں سے''

یعنی نبی کریم ﷺ پر ضروری تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کا پیغام بغیر خوف وخطر پہنچا دیں اس میں آپ سے معاذ اللہ کوئی کوتاہی لازم آئے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ اپنی امت پر رحیم وشفیق بھی ہیں، رحیم وشفیق نبی اپنی امت کو ضروری مسئلہ سے آگاہ نہ کرے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بلکہ یہ مسئلہ ضروریات دین سے تھا ہی نہیں۔ اسی وجہ سے آپ نے بیان نہیں فرمایا۔ آپ کی رحمت وشفقت کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے کریں کہ آپ کتنے ہی زیادہ رحیم وشفیق ہیں:

﴿ لَقَدْ جَاءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ ﴾

''بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہو تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمان پر کمال مہربان ہیں''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف:

" حدثنا اسحق اخبرنا بشر بن شعیب حدثنی ابی عن الزهری قال اخبرنی عبد الله بن کعب ان عبد الله بن عباس اخبره ان علی بن ابی طالب خرج من عند النبی ﷺ فی وجعه الذی توفی فیه فقال الناس یا ابا حسن کیف اصبح رسول الله ﷺ قال اصبح بحمد الله بارئا فاخذ بیده العباس فقال الا تراه انت والله بعد الثلاث عبد العصا والله انی لاری رسول الله ﷺ سیتوفی فی وجعه وانی لاعرف فی وجوه بنی عبد المطلب الموت فاذهب بنا الی رسول الله ﷺ فنساله فیمن یکون الامر فان کان فینا علمنا ذلک وان کان فی غیرنا امرناه فاوصی بنا قال علی والله لئن

سالناها رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فیمنعنا لا یعطیناها الناس ابدا وانی لا اسالنا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ابدا"

(بخاری حزء ۲۶ کتاب الاستیذان ، باب المعانقه وقول الرجل کیف اصبحت)

'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض وصال میں تھے تو آپ کے پاس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نکلے آپ سے لوگوں نے پوچھا اے ابا حسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے صبح کی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا بحمد اللہ آپ نے صبح حالت صحت میں کی یعنی آپ کو افاقہ ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا کیا تم دیکھتے نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرمانے والے ہیں۔ تم تین دنوں کے بعد غیروں کے تابع ہو گے، میں خاندان عبدالمطلب کے چہروں سے موت کو پہچان لیتا ہوں تم ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو، ہم آپ سے پوچھیں کہ امر خلافت کن لوگوں میں ہوگا۔ (یعنی آپ کے بعد آپ کا جانشین اور خلیفہ کون ہوگا) اگر آپ نے ہمارے متعلق فرمایا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر آپ نے ہمارے بغیر کسی اور کے متعلق فرمایا تو ہم عرض کریں کہ آپ ہمارے لئے وصیت فرمائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا خدا کی قسم اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امر خلافت کے متعلق پوچھیں تو آپ ہمیں منع فرما دیں لوگ ہمیں کبھی امر خلافت کا حق نہیں دیں گے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا کبھی سوال نہیں کروں گا''

اس حدیث پاک سے مسئلہ نکھر کر سامنے آ گیا کہ جن حدیثوں سے دلائل پیش کئے جاتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلا فصل بنا دیا تھا۔ لیکن معاذ اللہ صحابہ کرام نے انہیں اس حق سے محروم کر دیا۔ یہ بالکل بے سروپا دعوے ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا اور حدیث قرطاس سے مراد بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ہوتی تو آپ یہ کبھی نہ فرماتے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع کر دیا تو ہم ہمیشہ کے لئے اس سے محروم رہیں گے۔

خلیفہ بلافصل کہنے سے شانِ علی میں گستاخی:

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ بلافصل بنا دیا تھا۔ اور وہ احادیث جن سے آج دلائل پیش کئے جاتے ہیں، یقیناً ان احادیث کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بہتر سمجھا ہوگا۔ کیونکہ

آپ تو " باب مدینة العلم " (علم کے شہر کا دروازہ ہیں)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سمجھتے ہوئے کیوں خاموشی اختیار کی اپنے حق کا مطالبہ کیوں نہیں کیا۔ جب کہ آپ پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو ماننا ضروری تھا۔ اگر آپ کو جان بھی قربان کرنی پڑتی تو آپ خاموش نہ رہتے۔ کیونکہ آپ خود فرماتے ہیں کہ میں اپنی جان سے زیادہ ارشاد مصطفیٰ ﷺ کو ترجیح دیتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے: اگر آپ فرماتے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق اپنے حق کا مطالبہ کر رہا ہوں تو آپ کے ساتھ ہزاروں صحابہ کرام ہوتے۔ ہر صاحب دانش اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ خلافت بلافصل کے عقیدہ سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا مقصد ہی رائیگاں چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جب آپ نے دیکھا کہ ایسے شخص کو مسلمانوں کا خلیفہ، حکمران بنایا جا رہا ہے جو نا اہل ہے آپ نے اپنی جان اور اپنے تمام خاندان کو قربان کر دیا، شہادت عظمیٰ کے رفیع مرتبہ پر فائز ہو گئے۔ لیکن اس کے برخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ خلافت ان حضرات کے پاس ہے جو اس کے حقدار ہیں۔ تو آپ نے خاموشی اختیار کی۔

مقام غور وفکر ہے ان حضرات کے لئے جو خلافت بلافصل کی رٹ لگائے رہتے ہیں ان کے اس قول سے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں حرف لازم آتا ہے اور جو خارجی یا خارجیوں کے ہمنوا یزید کی مدح سرائی کرتے ہیں وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور ان کی شہادت کو فقط حکومت کی خاطر جنگ اور شہادت قرار دیتے ہیں۔ خارجیوں کی وجہ سے اہل تشیع صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کر رہے ہیں۔ اور اہل تشیع کی وجہ سے خارجی اہل بیت کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

سبحان اللہ شاندار عقیدہ حق اور سچ وہی ہے جس پر بفضلہ تعالیٰ اہل سنت وجماعت قائم ہیں۔ خدارا انصاف سے بتائیں کیا یہی کہنا حق نہیں خاندان اہل بیت حکومت کا چاہنے والا نہیں تھا بلکہ حق کا مطالبہ کرنے والا تھا، جب حق دیکھا خاموشی اختیار کی اور جب دیکھا کہ باطل کا ظہور ہو رہا ہے تو جان کی بازی لگا دی " اللھم نعوذ بک من المتعصبین "

نبی کریم ﷺ نے کوئی خلیفہ نامزد نہیں فرمایا:

" عن ابن عمر قال حضرت ابی حین اصیب فاثنوا علیه وقالوا جزاک الله خیرا فقال راغب وراهب فقالوا استخلف فقال اتحمل امرکم حیا ومیتا لوددت ان حظی منها لکفاف لا علی ولالی فان استخلف فقد استخلف من هو خیر منی یعنی ابابکر وان اترککم فقد ترککم من هو خیر منی رسول الله ﷺ قال عبد الله فعرفت انه حین ذکر رسول الله ﷺ غیر مستخلف "

(مسلم ج ۲ کتاب الامارۃ باب الاستخلاف وترکہ)

" حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں اپنے باپ کے پاس حاضر ہوا جب کہ ان کو زخمی کر دیا گیا (اور لوگ بھی آپ کے پاس حاضر ہوئے) انہوں نے آپ کی تعریف کی اور کہا "جزاک الله خیرا" (اللہ تعالیٰ تمہیں بہتر جزاء عطا فرمائے) آپ نے فرمایا امید وبیم پائی جاتی ہے سب نے عرض کیا آپ کوئی خلیفہ نامزد فرما دیں آپ نے فرمایا کیا میں نے ہی زندگی اور موت میں تمہارے معاملات کو اٹھانا ہے۔ میں تو یہی پسند کرتا ہوں کہ مجھے اس سے رک جانا چاہئے کہ اس میں میرا کوئی نفع ونقصان نہیں۔ اگر میں خلیفہ نامزد کر دوں (تو ٹھیک ہے) مجھ سے بہتر ذات نے خلیفہ نامزد کیا ہے اور اگر میں خلیفہ نامزد نہ کروں (تو پھر بھی ٹھیک ہے کیونکہ) مجھ سے بہتر ذات یعنی رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ نامزد نہیں کیا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جب آپ نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر فرمایا تو میں سمجھ گیا کہ آپ خلیفہ نامزد نہیں کریں گے"۔

وضاحت حدیث:

راغب: رغبت کرنا، امید کرنا راھب: ڈر رکھنا، خوف رکھنا۔

صحابہ کرام نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دعائیہ کلمات عرض کئے "جزاک الله خیرا" (اللہ تعالیٰ تمہیں بہتر جزاء عطا فرمائے) تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا "راغب وراھب" (امید کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے) ان الفاظ کا مقصد کیا ہے؟ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ نے فرمایا لوگ دو قسم کے ہیں ایک قسم امید کرنے والوں کی ہے، اور دوسری قسم ڈرنے والوں کی۔

یعنی " راغب فی حصول شئی مما عندی اور راهب منی " جو چیز میرے پاس ہے اس کے حصول میں کئی لوگ رغبت رکھتے ہیں۔اور کچھ لوگ اس کے حصول کی طلب میں ڈر رہے ہیں۔

راقم کے نزدیک یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی واضح کرامت ہے کہ آپ نے پہلے ہی اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا جو صحابہ کرام نے بعد میں عرض کیا " استخلف " آپ خلیفہ نامزد کردیں۔آپ کا اسی طرف اشارہ تھا کہ کئی لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان کو خلیفہ بنادوں۔اور کچھ لوگ یہ مطالبہ کرنے سے ڈر رہے ہیں۔

دوسرا معنی: علامہ نووی نے یوں بیان کیا" انی راغب فیما عند اللہ تعالیٰ وراهب من عذابه " کہ آپ پر چونکہ وہ دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آرہا تھا۔جسے آپ بھی محسوس فرمارہے تھے۔اور آپ اس وقت ایمان کے اعلیٰ درجہ کے مطابق کہہ رہے تھے۔مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی ہے اور اللہ کے عذاب کا خوف بھی ہے۔کیونکہ "الایمان بین الخوف و الرجاء " ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔

مقصد آپ کا یہ تھا کہ اب تم میرے لئے یہی دعاء کرو کہ میں اپنے ایمان کی سلامتی سے دنیا سے رخصت ہوکر رب تعالیٰ کے حضور پہنچ جاؤں،اب تمہارا تعریف کرنا،یا مطالبات کرنا میرے نزدیک بے معنی ہے۔

تیسرا معنی:

" المراد الخلافة ای الناس فیها ضربان راغب فیها فلا احب تقدیمه لرغبته و کاره لها فاخشی عجزه عنها "

" مقصد آپ کا خلافت ہی تھا کہ لوگ خلافت کے معاملہ میں دو قسم کے ہیں۔بعض لوگ تو چاہتے ہیں کہ میں ان کو خلیفہ بنادوں لیکن جو خود چاہتے ہیں میں ان کو خلیفہ بنانا پسند نہیں کرتا"

اور بعض لوگ ناپسند کرتے ہیں میں بھی سمجھتا ہوں کہ ہوسکتا ہے وہ اتنا عظیم بوجھ نہ اٹھا سکیں تو کہیں اس شخص کو خلیفہ نہ مقرر کردوں جو اس کو نہ چلا سکے۔اسلئے میں خلیفہ مقرر نہیں کرنا چاہتا جب

صحابہ کرام نے آپ سے صراحتہً مطالبہ کیا کہ آپ خلیفہ نامزد کردیں تو آپ نے فرمایا اگر میں خلیفہ نامزد کردوں تو یہ بھی شریعت کے مطابق ہی فیصلہ ہے کیونکہ مجھ سے بہتر ذات یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے وصال کے قریب (مجھے) خلیفہ نامزد فرمادیا تھا۔

لیکن اگر میں خلیفہ نامزد نہ کروں تو یہ بھی شریعت کے عین مطابق ہے اس لئے کہ وہ عظیم ذات جو مجھ سے بہتر ہیں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ نامزد نہیں فرمایا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ جب آپ نے یہ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ نامزد نہیں فرمایا۔ تو مجھے یقین ہوگیا تھا کہ آپ خلیفہ نامزد نہیں کریں گے۔

ساتھ ہی آنے والی دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں: "**فعلمت انه لم يكن ليعدل برسول الله ﷺ احدا وانه غير مستخلف**" جب آپ نے ذکر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ نامزد نہیں کیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو نہیں کریں گے لہٰذا اسی کو ترجیح دیں گے کہ کسی ایک کو خلیفہ نامزد نہ کریں۔

فائدہ عظیمہ: جس حدیث پاک کی وضاحت کی جارہی ہے اس میں "راغب" کا ایک معنی یہ کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ رغبت تو کرتے ہیں کہ ان کو خلیفہ نامزد کردیا جائے لیکن خود چاہنے والوں کو میں آگے لانا پسند نہیں کرتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد دراصل نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے ہی تابع تھا جو آخری وقت بھی آپ کے پیش نظر تھے۔

" حدثنا عبد الرحمن بن سرة قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم يا عبد الرحمن لا تسال الا مارة فانک ان اعطيتها عن مسالة وكلت اليها وان اعطيتها عن غير مسالة اعنت عليها "

(مسلم ج ۲ کتاب الامارۃ باب النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیھا)

" حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے عبدالرحمٰن تم حکومت نہ طلب کرو، اگر تمہارے مطالبہ کے بعد تمہیں حکومت دے دی گئی تو تمہیں اس کے سپرد کردیا جائے گا۔ اور اگر تمہیں حکومت بغیر مطالبہ کے دی دی گئی تو تمہاری امداد کی جائے گی"

☆ "عن ابی موسی قال دخلت علی النبی صلی الله علیه وسلم انا ورجلان عن بنی عمی فقال احد الرجلین یا رسول الله امرنا علی بعض ما ولاک الله عزوجل وقال الآخر مثل ذلک فقال انا والله لا نولی علی هذا العمل احدا ساله ولا احدا حرص علیہ"

(مسلم ج ۲ حوالہ مذکور)

حضرت ابوموسیٰ (اشعری) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں اور میرے دو چچازاد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان دونوں میں سے ایک نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کسی علاقہ کا حاکم بنادیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ علاقے دے رکھیں ہیں جن کے آپ والی ہیں۔

دوسرے نے بھی یہ عرض کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قسم ہے اللہ تعالیٰ کی جو شخص خود سوال کریں ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی حاکم نہیں بناتے اور نہ کسی ایسے شخص کو حاکم بناتے ہیں جو حاکمت کی حرص رکھنے والا ہو۔

حکومت طلب کرنے والے کو نبی کریم ﷺ نے حکومت کیوں نہ دی؟ بیان کردہ دونوں حدیثوں سے بہت واضح ہے تاہم مزید وضاحت علامہ نووی رحمہ اللہ ان الفاظ سے بیان کرتے ہیں:

> "قال العلماء والحکمة فی انه لا یولی من سأل الولایة انه یوکل الیها ولا یکون معه اعانة کما صرح به فی حدیث عبد الرحمن بن سمرة السابق واذا لم یکن معه اعانة لم یکن کفوا ولا یولی غیر الکفو ولان فیه تهمة للطالب والحریص......والله اعلم"
>
> "اہل علم حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ حکومت طلب کرنے والے کو حکومت عطا نہ کرنے کی واضح وجہ حدیث پاک میں آچکی ہے کہ جو شخص خود حکومت کا مطالبہ کرتا ہے، اسے مطالبہ پر اگر حکومت دے دی گئی تو گویا کہ اسے حکومت کے سپرد کر دیا گیا اسے کوئی معاونت حاصل نہیں ہوگی۔ اس کی حکومت ایسے ہی ہوگی جیسا کہ وہ اجنبی لوگوں کا حاکم ہے۔ حالانکہ اجنبیوں کی حکومت کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا"

دوسری وجہ یہ ہے کہ خود مطالبہ کرنے والا حریص ہونے کی تہمت میں مبتلاء ہوگا۔ راقم کے نزدیک تو حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت اور امداد سے محروم ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنی زندگی میں اسی کا مشاہدہ کیا ہے کہ بڑے بڑے نعرے لگانے والے ناکام ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کا خلیفہ مقرر کرنے کا طریقہ:

یہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ خلیفہ مقرر کرنا واجب ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ کے دفن سے پہلے خلیفہ مقرر کیا گیا:

" واجمعوا علی انه یجب علی المسلمین نصب خلیفة ووجوبه بالشرع لا بالعقل "

(نووی شرح مسلم ج۲ ص ۱۲۸)

''اس مسئلہ پر اجماع امت ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خلیفہ مقرر کریں، خلیفہ کے مقرر کرنے کا وجوب شرع سے ثابت ہے نہ کہ فقط عقل سے اس کا ثبوت ہے''

اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ خلیفہ یعنی مسلمانوں کا حاکم مقرر کرنے کا وہی طریقہ معتبر ہو گا جو شریعت کے مطابق ہو گا۔ اور شریعت کے مطابق خلفاء راشدین کی خلافت کے تقرر کو ہی معیار بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے ہٹ کر کوئی طریقہ استعمال کرنا درست نہیں ہو گا۔

حدیث ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تقرر:

نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے، جن میں انصار کے سردار حضرت سعد بن عبادہ بھی موجود تھے، مہاجرین میں سے بھی جلیل القدر صحابہ کرام موجود تھے۔ (سقیفہ کا وزن سفینہ کا ہے، چھت ہو، دیواریں نہ ہوں اسے سقیفہ کہا جاتا، جسے ہم چھپریا شلٹر کہہ لیتے ہیں)۔

اگرچہ ابتدائی طور پر انصار کی جانب سے یہ بھی کہا گیا کہ " منا امیر ومنکم امیر " ہمارا اپنا حاکم ہو اور تمہارا اپنا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم ﷺ نے فرمایا " الائمة من قریش " حکماء خلفاء قریش سے ہوں گے تو انصار نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا۔ (یہ بھی خیال رہے کہ یہ حدیث صحیح ہے تقریباً چالیس صحابہ کرام سے روایت کی گئی ہے)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ پیش کیا کہ میں دو شخصوں کو تمہارے لئے پسند کرتا ہوں ان میں سے ایک کو منتخب کر لو اس پر ہر طرف سے اپنی اپنی باتیں پیش ہو رہی تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"یا معشر الانصار الستم تعلمون ان رسول اللہ ﷺ امر بابی بکر یؤم الناس فی الصلوۃ فما لکم تؤخرونہ فقالوا معاذ اللہ ان تؤخرہ"

"اے قبیلہ انصار کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر کو نماز کی امامت کا حکم فرمایا (جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو آگے کیا) تو تمہیں کیا ہوا کہ تم انہیں مؤخر کر رہے ہو انصار نے کہا معاذ اللہ ہم ان کو مؤخر نہیں کر رہے"

بخاری میں ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم عمر یا ابو عبیدہ میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "بل نبایعک انت فانت سیدنا وخیرنا واحبنا الی رسول اللہ ﷺ" نہیں بلکہ ہم آپ کی بیعت کریں گی کیونکہ آپ ہمارے سردار ہیں آپ ہم سے بہتر ہیں ہم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ ہی محبوب ہیں:

"وقال سعد بن عبادۃ لابی بکر نحن الوزراء وانتم الامراء"

"حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہم آپ کے وزیر ہوں گے اور آپ حکام ہوں گے"

"فاخذ عمر بید ابی بکر فبایعہ ثم المھاجرون ثم الانصار"

"تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور آپ کی بیعت کی۔ پھر مہاجرین اور انصار نے بھی آپ کی بیعت کر لی"

"فاجمعوا علی ذلک" "حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔

"ولو لم تکن الخلافۃ حقا لما اتفق علیہ الصحابۃ"

"آپ کی خلافت پر صحابہ کرام کا متفق ہونا ہی آپ کی خلافت کی حقانیت پر بہت بڑی دلیل ہے"

"لان اجماع الامۃ علی الباطل ممنوع ولا سیما الصحابۃ ھم افضل البشر بعد الانبیاء"

"کیونکہ یہ کبھی نہ ہوا اور نہ ہو سکے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت باطل پر متفق و مجتمع ہو جائے یہ تو آپ کی عام امت کی بات ہے اور وہ حضرات جو انبیاء کرام کے بعد تمام انسانوں سے افضل ہیں"

یعنی صحابہ کرام ان کا باطل پر متفق ہونا تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔صحابہ کرام پر طنز کرنے والے اپنے آپ کو جہنمی بنا رہے ہیں۔صحابہ کرام کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

" وبايعه علی علی رؤس الاشهاد ای بمحضر الشاهدين علانية لاسرا وخفية بعد توقف كان منه "

'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی کچھ توقف کے بعد صحابہ کرام کی موجودگی میں ظاہر طور پر آپ کی بیعت کر لی کوئی چھپ چھپا کر بیعت نہیں کی''

یہ بھی خیال رہے کہ مستدرک حاکم ،بیہقی صحیح ابن حبان میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے مقام پر لوگوں کے بیعت کرنے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب منبر پر خطبہ دینے کیلئے آئے تو اسی وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی آپ کی بیعت کر لی۔

بخاری ومسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چھ ماہ بعد بیعت کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔اس پر شاندار محاکمہ نبراس میں پیش کیا گیا:

" الصحيح الجامع بين القولين انه بايعه فی اول الامر ثم تاخر عن صحبته حتی اعاد البيعة بعد ستة اشهر "

دونوں روایتوں میں تطبیق کے لئے یہ بہتر اور صحیح جامع بات ہے کہ آپ نے شروع میں ہی بیعت کر لی تھی۔پھر نبی کریم ﷺ کے وصال کے غم اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی بیماری کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت زیادہ نہ اختیار کر سکے۔اور زیادہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معاونت نہ کر سکے۔لیکن چھ ماہ کے بعد پھر دوبارہ بیعت کی اور باقاعدگی سے آپ کی معاونت اور آپ کے پاس صحبت کو اختیار کیا۔ (از شرح عقائد مع نبراس ص ۴۹۳،۴۹۴)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اشارات:

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کوئی خلیفہ نامزد نہیں فرمایا یہی عقیدہ اہل سنت وجماعت کا ہے تاہم نبی کریم ﷺ کے ارشادات مبارکہ سے ایسے اشارات ملتے ہیں،جن سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا پتہ چلتا ہے۔

☆ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے، جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " لا تبقین فی المسجد خوخة الا خوخة ابی بکر " مسجد میں کھلنے والے چھوٹے دروازے تمام بند کر دیئے جائیں سوائے ابو بکر کے دروازے کے۔

" فیه خصیصة و فضیلة ظاهرة لابی بکر "

اس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور خصوصیت واضح ہے۔

اس سے واضح طور پر اشارہ مل رہا ہے کہ مسجد کی طرف صحابہ کرام کے دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا گیا کہ کوئی شخص دروازے سے گزر کر مسجد سے نہ گزرے، لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دروازے کو کھلا رکھنے کا حکم دے کر آپ کے مستقل کے خلیفہ ہونے کا اشارہ فرما دیا۔

☆ " عن محمد بن جبیر بن مطعم عن ابیه ان امرأة سالت رسول الله صلی الله علیه وسلم شیأ فامرها ان ترجع الیه فقالت یا رسول الله ارایت ان جئت فلم اجدک ، قال ابی کانها تعنی الموت قال فان لم تجدینی فاتی ابابکر "

محمد بن جبیر بن مطعم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، بیشک ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کا سوال کیا تو آپ نے فرمایا بعد میں آنا، اس عورت نے کہا یا رسول اللہ آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں، محمد بن جبیر کہتے ہیں، میرے باپ نے کہا کہ وہ عورت حضور ﷺ کے وصال کو مراد لے رہی تھی آپ نے فرمایا اگر تم مجھے نہ پاؤ تو ابو بکر کے پاس آ جانا۔

" فلیس فیه نص علی خلافته و امر بها بل هو اخبار بالغیب الذی اعلمه الله تعالیٰ به...... والله اعلم "

'' نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ '' اگر مجھے نہ پاؤ تو ابو بکر کے پاس آنا '' آپ کی خلافت پر نص تو نہیں البتہ رب تعالیٰ نے آپ کو جو علم غیب عطا فرمایا ہے اس کے مطابق آپ نے خبر دی (جو ہو کر رہی) ''

میری برادری کے حضرات علم غیب کے لفظ سے مجھ پر خفا نہ ہوں یہ علامہ نووی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں میں تو صرف ناقل ہوں۔

☆ " عن عائشه قالت قال لی رسول الله ﷺ فی مرضه ادعی لی ابابکر اباک

واخاک حتی اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنی متمن ویقول قائل انا اولی ویابی اللہ والمؤمنون الا ابا بکر"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے اپنی مرض (وصال) میں فرمایا کہ میرے پاس اپنے باپ ابوبکر اور اپنے بھائی (عبدالرحمٰن) کو بلاؤ تاکہ میں خط لکھ دوں بیشک میں خوف کرتا ہوں کہ تمنا کرنے والا تمنا کرے گا، اور کہنے والا کہے گا میں زیادہ حق دار ہوں حالانکہ اللہ تعالیٰ اور مومن سوائے ابوبکر کے انکار کرتے ہیں۔

اس حدیث پاک سے واضح طور پر یہ پتہ چل رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان فرمائی اور خبر دی کہ آپ کے وصال کے بعد آپ کا خلیفہ ہونا واقع ہوگا۔ مسلمان اور کسی کو خلیفہ بنانے سے انکار کر دیں گے۔ اور اس طرف بھی اشارہ تھا کہ ابتدائی طور پر کچھ اختلاف بھی ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی اسی کے مطابق ہوا۔

(مسلم ج ۲ نووی باب فضائل من ابی بکر الصدیق)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تقرر:

"ثم ان ابابکر لما ایس من حیوته دعا عثمان واملی علیه کتاب عهده لعمر"

''جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تو آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھوا دیا کہ میرے بعد یہ خلیفہ ہوں گے ان کی بیعت کرنا''

یقیناً آپ نے ایسے شخص کا انتخاب کیا۔ جن کے عدل وانصاف نے اور ان کی خلافت کے دوران اسلامی فتوحات اور کفار کے ڈر کر رہنے نے ثابت کر دیا کہ واقعی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ایک عظیم مدبر کا فیصلہ تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ اپنے بیٹے کے متعلق نہیں تھا اپنے کسی رشتہ دار کے متعلق نہیں تھا۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فیصلہ تھا جس میں صرف دین کی بھلائی اور مسلمانوں کی بھلائی مدنظر تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق وصیت کو لکھوایا تو اس میں جو کچھ لکھا گیا اسے پڑھ کر صاحب ایمان خود ہی سمجھ جاتا ہے کہ مقصد عظیم کیا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصیت نامہ:

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

" هذا ما عهد ابوبكر بن قحافة في آخر عهد وفي الدنيا خارجا منها وعند اول عهده بالآخرة داخلا فيها حيث يؤمن الكافر ويوقن الفاجر ويصدق الكاذب، انى استخلفت عليكم بعدى عمر بن الخطاب فاسمعوا له واطيعوه وانى لم آل الله ورسوله ودينه ونفسى واياكم خيرا فان عدل فذالك ظنى فيه وعلمى به وان بدل فلكل امرئ ما اكتسب والخير اردت ولا اعلم الغيب وسيعلم الذين ظلموا اى منقلب ينقلبون والسلام عليكم ورحمة الله "

''اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع جو بہت مہربان ہے''

''یہ وہ وصیت ہے جو ابوبکر بن قحافہ نے اپنی زندگی کے آخری وقت میں دنیا سے جاتے وقت لکھوائی ہے۔ اور یہ آخرت کی طرف جانے کا پہلا وقت ہے۔ یہ وہ وقت ہے جس میں کافر بھی ایمان لے آتے ہیں۔ اور فاسق وفاجر بھی راہ راست پر آنے کا یقین کر لیتے ہیں اور جھوٹے بھی سچ بولتے ہیں۔ بیشک میں اپنے بعد عمر بن خطاب کو تمہارا خلیفہ مقرر کر رہا، ان کے ارشادات کو سننا اور ان کی اطاعت کرنا بیشک میں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کرنے میں اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات کو ماننے میں اور دین اسلام کے مطابق چلنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اور میں نے اپنے لئے اور تمہارے لئے خیر خواہی میں بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اگر حضرت عمر بن خطاب نے عدل وانصاف سے کام لیا تو بہتر ہوگا میرا غالب گمان یہی ہے کہ وہ عدل وانصاف سے کام لیں گے۔ بلکہ مجھے تو ان کے عدل وانصاف پر یقین کا درجہ حاصل ہے۔ اگر میرے گمان کے خلاف انہوں نے کوئی کام کیا۔ میرے گمان کو انہوں نے تبدیل کر دیا تو ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال کے مطابق جزا دی جاتی ہے۔ میں نے بھلائی کا ارادہ کیا ہے البتہ میں غیب نہیں جانتا۔ ظالموں کو خود ہی پتہ چل جائے گا کس کروٹ پر پلٹا کھائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ اور تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو)''

آپ نے یہ وصیت نامہ لکھوا کر سربمہر کر دیا، اسی وصیت نامہ کے مطابق صحابہ کرام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی:" وبالجملة وقع الاتفاق على خلافته " حاصل کلام یہی ہے کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے اور آپ کو خلیفہ تسلیم کرنے میں صحابہ کرام متفق ہو گئے۔

(از شرح عقائد مع نبراس ص ۴۹۸، ۴۹۹)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تقرر:

" ثم استشهد عمر وترک الخلافة شوری بین ستة عثمان وعلی وعبدالرحمن بن عوف وطلحة والزبیر وسعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم "

'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کے وقت خلیفہ نامزد نہیں فرمایا، بلکہ چھ جلیل القدر صحابہ کرام کی مشاورتی کمیٹی بنادی کہ تم جسے چاہو خلیفہ مقرر کرلو، مشاورتی کمیٹی کے ارکان یہ حضرات تھے، حضرت عثمان، حضرت علی المرتضٰی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم''

پھر ان چھ حضرات میں سے پانچ حضرات نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اختیار دے دیا کہ تم جسے چاہو منتخب کرلو، ہم تمام حضرات اس پر اتفاق کرلیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے علیحدہ علیحدہ ہر ایک سے مشورہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشاورت میں یہ عرض کیا کہ اگر میں تمہاری بیعت نہ کروں تو تم کس کے متعلق مشورہ دو گے؟ آپ نے فرمایا حضرت عثمان کے متعلق۔ پھر آپ نے حضرت زبیر سے مشورہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں تمہاری بیعت نہ کروں تو تم کس کے متعلق مشورہ دو گے؟ انہوں نے کہا حضرت علی یا حضرت عثمان کے متعلق میری رائے ہوگی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا کہ اگر میں تمہاری بیعت نہ کروں تو تم کس کے متعلق مشورہ دو گے؟ آپ نے فرمایا میری رائے کے مطابق حضرت علی کو مقرر کردیا جائے۔ پھر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا میں اور آپ تو خلافت کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے اس لئے میری رائے کے مطابق حضرت عثمان کو منتخب کرلینا بہتر ہے پھر حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مشاورتی کمیٹی سے باہر جلیل القدر صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو اکثریت کی رائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق ہی تھی:

" فاختار هو عثمان وبايعه بمحضر من الصحابة فبايعوه وانقادوا والاوامره وصلوا معه الجمع والاعياد "

''اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تین دن کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے غور وفکر اور مشورہ کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت صحابہ کرام کی موجودگی میں کی۔ پھر دوسرے صحابہ کرام نے بھی آپ کی بیعت کرلی۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے احکام کو تمام صحابہ نے ماننا شروع کرلیا اور آپ کی اقتداء میں ہی جمعہ اور عید کی نمازیں ادا کرنے لگے''

اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ کرام کا اتفاق ہوگیا۔

(از شرح عقائد مع نبراس و حاشیہ ص ۴۹۹، ۵۰۰)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تقرر:

"ثم استشهد عثمان وترک الامر مهملا فاجتمع کبار المهاجرین والانصار علی علی والتمسوا منه قبول الخلافة وبایعوه لما کان افضل اهل عصره واولاهم بالخلافة"

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کے وقت خلافت کے معاملہ کو اسی طرح رہنے دیا یعنی نہ ہی آپ نے خلیفہ نامزد فرمایا اور نہ ہی مشاورتی کمیٹی بنائی، آپ کی شہادت کے بعد مہاجرین اور انصار صحابہ کرام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اجتماعی طور پر عرض کی کہ اب آپ خلافت کے معاملہ کو قبول فرمائیں''

بیعت کرلی اور یہی فیصلہ درست بھی تھا کیونکہ اس وقت تمام صحابہ کرام میں افضل آپ ہی تھے اور خلافت کے حقدار بھی سب سے زیادہ آپ ہی تھے۔

اعتراض: حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں صحابہ کرام کا اجماع ثابت نہیں بلکہ بعض حضرات نے اختلاف بھی کیا تو آپ کی خلافت کو کیسے خلافت راشدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

پہلا جواب:

" وما وقع من المخالفات والمحاربات لم یکن عن نزاع فی خلافة بل کان المحاربون یسلمون خلافته بل عن خطا فی الاجتهاد والخطاء هو الاستعجال فی طلب قصاص عثمان زعما ان التاخیر یوجب جرءة العوام علی الاکابر "

'' جو حضرات مخالفت کررہے تھے۔ ان کی مخالفت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلافت

کے مسئلہ پر نہیں تھی ۔ بلکہ وہ آپ کی خلافت کے ماننے کے باوجود، اجتہادی خطا کی وجہ سے آپ سے مخالفت کر رہے تھے ۔ وہ اجتہادی خطا ان کی یہ تھی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا جلدی مطالبہ کر رہے تھے کیونکہ تاخیر میں عوام کو حکام پر جرات کا موقع ملتا رہے گا''۔

دوسرا جواب:

" والحق ان صحة الخلافة غير محتاجة الى الاجماع بل يكفى بيعة بعض اهل الحل والعقد حتى قيل يكفى الواحد منهم وقد بايع عليا الوف المهاجرين والانصار "

'' حق بات یہ ہے کہ کسی شخص کے حاکم ہونے کو صحیح کہنے کے لئے تمام لوگوں کو متفق ہونا ضروری نہیں ۔ بلکہ بعض اہل حل وعقد بھی بیعت کر لیں تو وہ خلیفہ برحق ہے ۔ اگرچہ بعض حضرات نے تو اہل حل وعقد میں سے کسی ایک کے بیعت کر لینے کو بھی خلافت کو صحیح قرار دیا ہے ۔ تاہم معتبر قول یہی ہے کہ اکثر اہل حل وعقد جب کسی کو منتخب کریں تو وہی خلیفہ برحق ہوگا ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت تو ہزاروں مہاجرین وانصار صحابہ کرام نے کی آپ کی خلافت کے حق ہونے پر میں شک کرنا دیوانگی ہے''

(شرح عقائد مع نبراس ص ۵۰۱)

اہل حل وعقد کون؟

" اهل الحل والعقد اى المجتهدون الحل كشادن والعقد بستن والمجتهد صاحب التجويز والمنع "

''حل'' کا معنی ہے ''کھولنا'' اور ''عقد'' کا معنی ہے ''باندھنا'' اہل حل وعقد مجتہد علماء کرام اور فقہاء عظام کو کہا جاتا ہے کیونکہ مجتہد کو تجویز دینے کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق یہ کہے کہ ہاں اسے خلیفہ بنانا جائز ہے ۔ اس وجہ سے وہ ''اہل حل'' ہے ، اور مجتہد کو منع کرنے کا بھی حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ یہ کہے کہ اس شخص میں خلافت کی صلاحیت نہیں کہ شرعی شرائط میں یہ پورا نہیں اترتا ۔ اس کے روکنے کی صلاحیت کی وجہ سے وہ ''اہل عقد'' ہو گیا'' (نبراس ص ۵۰۳)

خلاصہ کلام: اسلامی قوانین کے مطابق حاکم منتخب کرنے کے چار طریقے ہیں:

پہلا یہ کہ تمام لوگوں کا اس کی حکمرانی پر اتفاق ہو جائے ۔ دوسرا یہ کہ پہلا خلیفہ کسی دوسرے

شخص کو نامزد کر دے بشرطیکہ اس میں خلیفہ بننے کی شرعی شرائط موجود ہو۔ اپنی ہی اولاد کا انتخاب بھی نہ کرے تاکہ ملوکیت قائم نہ ہو۔ تیسرا یہ کہ پہلا خلیفہ اپنی وفات کے قریب مشاورتی کمیٹی قائم کر کے خلافت کا معاملہ ان کے سپرد کر دے۔ لیکن اس میں بھی شرط یہی ہے کہ کمیٹی کے ارکان شرعی شرائط پر پورے اترتے ہوں۔ شرعی شرائط کا ذکر انشاء اللہ آگے آئے گا۔ چوتھا یہ کہ اکثر اہل حل وعقد مل کر کسی کو خلیفہ بنالیں۔

آج مسلمانوں کو اسی وجہ سے سکون حاصل نہیں کہ وہ غیر مسلموں کے تابع ہو کر جمہوریت، جمہوریت کی رٹ لگا کر، مرد، عورت، عالم، جاہل کے ووٹ کو برابر سمجھ کر کامیابی سمجھ رہے ہیں۔ جو دراصل اسلامی قوانین سے عدولی کی وجہ سے ان کے لئے باعث زوال ہے جس کا ہم آئے دن مشاہدہ کر رہے ہیں۔

دو حدیثوں میں تطبیق:

"عن سماک بن حرب قال سمعت جابر بن سمرة يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول لا يزال الاسلام عزيزا الى اثنى عشر خليفة ثم قال كلمة لم افهمها فقلت لابى ما قال فقال كلهم من قريش"

"سماک بن حرب کہتے ہیں میں نے حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوا سنا (وہ کہہ رہے تھے) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اسلام بارہ خلفاء تک غالب رہے گا۔ اس کے بعد آپ نے کچھ فرمایا جسے میں نہ سمجھ سکا تو میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے کیا فرمایا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ نے فرمایا وہ تمام قریش سے ہوں گے"

☆ دوسری حدیث پاک میں ہے " الخلافة بعدى ثلاثون سنة ثم تكون ملكا " میرے بعد تیس سال تک خلافت رہے گی پھر ملوکیت ہو جائے گی۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ یہاں دو سوال وارد ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تیس سال حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے خلافت کے خاتمہ پر مکمل ہوتے ہیں۔ اس وقت تک بارہ خلفاء مکمل نہیں ہوئے تو دونوں حدیثوں میں مطابقت کس طرح صحیح ہوگی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث پاک میں تیس سال کا ذکر ہے اس میں مراد خلافت نبوت ہے یعنی آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد مسلسل تیس سال تک تو خلافت برقرار رہے گی۔ اس کے بعد اس کا برقرار رہنا ضروری نہیں۔

"وقد جاء مفسرا فی بعض الروایات خلافة النبوة بعدی ثلثون سنة ثم تکون ملکا ولم یشترط هذا فی الاثنی عشر"

"کیونکہ بعض روایات میں واضح طور پر ذکر ہے کہ آپ نے فرمایا میرے بعد خلافت نبوت تیس سال تک رہے گی۔ لیکن جہاں آپ نے بارہ خلفاء کا ذکر فرمایا اس میں خلافت نبوت کا ذکر نہیں"

دوسرا سوال یہ لازم آتا ہے کہ اچھے خلفاء بنی عباسیہ میں گزرے ہیں جن کو اہل حل وعقد (مجتہدین فقہاء وعلماء) نے منتخب کیا ہے اور انہوں نے عدل وانصاف کو بھی قائم کیا تو بارہ خلفاء کا ذکر کیسے درست ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے:

"ویحتمل ان یکون المراد مستحقی الخلافة العادلین وقد مضی منهم من علم ولا بد من تمام هذا لعدد قبل قیام الساعة"

"کہ خلفاء راشدین کی طرح کامل عدل وانصاف کرنے والے جن کی خلافت پر اتفاق ہوگا وہ قیامت تک کل بارہ خلفاء ہوں گے مطلقاً انصاف کرنے والوں کی نفی نہیں فرمائی"

مطلب واضح ہوا کہ اچھے برے خلفاء آتے رہیں گے کوئی ظالم ہوں گے، کوئی انصاف کرنے والے ہوں گے، ان میں سے پھر کوئی تھوڑا انصاف کریں گے کوئی زیادہ، لیکن کامل انصاف کرنے والے کل بارہ خلفاء ہوں گے ان کاملین میں سے میرے بعد مسلسل رہنے والے تیس سال تک رہیں گے۔
(مسلم ونووی ج ۲ کتاب الامارة ص ۱۲۷)

خلیفہ کا ظاہر ہونا ضروری ہے:

جب یہ واضح ہے کہ خلیفہ کے مقاصد میں عدل وانصاف کو قائم کرنا، مظلوموں کو ظالموں سے انصاف دلانا، شرعی احکام نافذ کرنا، حدود قائم کرنا، ملکی سرحدوں کی حفاظت کرنا وغیرہ شامل ہے تو یہ کام

وہی سرانجام دے سکتا ہے جو ظاہر موجود ہو۔ جو ہمیشہ کے لئے چھپا ہوا اس کی انتظار رہی رہے وہ امور خلافت سرانجام نہیں دے سکتا۔

لہٰذا اہل تشیع کا یہ نظریہ باطل ہے کہ سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کے بعد امام وخلافت کے حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ پھر آپ کے بیٹے حضرت امام حسن، پھران کے بھائی حضرت امام حسین پھران کے بیٹے حضرت علی زین العابدین۔ پھران کے بیٹے ابوجعفر محمد باقر، پھران کے بیٹے ابوعبداللہ جعفر صادق، پھرانکے بیٹے موسیٰ کاظم، پھران کے بیٹے ابوالحسن علی رضاء، پھرانکے بیٹے ابوجعفر محمد تقی، پھرانکے بیٹے ابوالحسن علی نقی، پھران کے بیٹے ابوالحسن حسن عسکری پھرانکے بیٹے محمد قاسم ہیں

ان کے آخری خلافت کے حقدار کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ایک مکان میں چھپ گئے ہیں۔ان کے چھپنے کی وجہ خلفاء عباسیہ سے مخالفت تھی۔لیکن وہ قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گے اور دنیا کے اندر عدل وانصاف قائم کریں گے۔

لیکن جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا کہ ظاہر خلیفہ ہی خلافت کے مقاصد کو پورا کرسکتا ہے۔اس لئے یہ نظریہ مقصد خلافت کے خلاف ہے۔ (شرح عقائد نبراس ص ۵۲۰ تا ۵۲۳)

تنبیہ: اختلاف صرف مستحق خلافت ہونے میں ہے ورنہ اہل بیت کے یہ حضرات اہل سنت وجماعت کے نزدیک نہایت افضلیت اور بزرگی کے مالک ہیں۔اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اہل سنت وجماعت کے دلوں میں جتنا ادب واحترام اہل بیت اور صحابہ کرام اور اولیاء کرام کا ہے اتنا کوئی اور فرقہ ثابت نہیں کرسکتا۔

اسلام میں حاکم کے لئے شرائط:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اسی آیۃ کی تفسیر میں (جس کی وضاحت راقم کر رہا ہے) ان شرائط کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں کے حاکم کے لئے ضروری ہیں:

(۱) مسلمانوں کے حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ قریش سے ہو، جیسا کہ پہلے احادیث سے وضاحت کردی گئی۔

(۲) "والثانی ان یکون ممن یصلح ان یکون قاضیا من قضاۃ المسلمین مجتھدا

لایحتاج الی غیرہ فی الاستفتاء فی الحوادث"

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ صلاحیت رکھے کہ اسے مسلمانوں کا قاضی بنایا جاسکے یعنی وہ شرعی مسائل پر خود عبور رکھتا ہو، اتنا علم ہو کہ وہ شخص درجہ اجتہاد میں پہنچا ہوا ہو، تاکہ جب کبھی اسے مسائل کا سامنا ہو تو دوسرے حضرات سے فتویٰ طلب کرنے کا محتاج نہ ہو۔

(۳) وہ شخص اتنا صاحب عقل اور مدبر ہو کہ کفار کے ساتھ جہاد کرنے کی اس میں صلاحیت پائی جاسکے اپنے اسلامی لشکر کو ترتیب دے سکے، سرحدوں کی حفاظت کر سکے۔ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کر سکے۔ مظلوموں کو ظالموں سے انصاف دلا سکے۔

(۴) حدود اور تعزیرات وغیرہ کو نافذ کرنے میں نرم دلی کا مظاہرہ نہ کرے، قصاص اور رجم وغیرہ میں کسی کو قتل کرانے میں نہ گھبرائے۔

صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ حاکم وہی بن سکتا ہے جس میں یہ شرائط پائی جائیں جس میں یہ شرائط نہ پائی جائیں وہ مسلمانوں کا حاکم بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

"ولن یصلح لذلک کله الامن کان عالما یذلک کله قیما به"

''ان تمام صفات کی صلاحیت وہی شخص رکھتا ہے جو عالم ہو، اور ان تمام صفات کو جاری رکھنے اور قائم رکھنے کی صلاحیت اس میں پائی جائے''

(۵) وہ شخص آزاد ہو، غلام نہ ہو، کیونکہ غلام اپنے آپ پر ولایت نہیں رکھتا تو دوسروں پر کیسے ولایت رکھے گا۔ غلام اگرچہ آج کل بین الاقوامی قوانین کے مطابق نہیں پائے جاتے، لیکن راقم کے خیال کے مطابق یہود و نصاریٰ سے ہر معاملہ میں مشورہ لینے والے، ان کی خواہش کے مطابق مسلمانوں پر حکمرانی کرنے والے بھی یہود و نصاریٰ کے غلام ہی ہیں ایسے بکاؤ مال کسی صورت میں بھی مسلمانوں کے حاکم بننے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

(۶) حاکم بننے کے لئے بالغ ہونا ضروری ہے۔ نابالغ چونکہ مکلف نہیں اور نہ ہی اسے کسی پر ولایت حاصل ہے اس لئے وہ حکومت کرنے کا اہل نہیں۔ نابالغ چونکہ عقل بھی کامل نہیں رکھتا۔ اس لحاظ پر حکومت کرنے کی اہلیت سے خالی ہوتا ہے۔

(۷) حاکم بننے کے لئے عاقل ہونا ضروری ہے بے عقل، پاگل، دیوانہ حکومت نہیں کر سکتا۔ افسوس

کہ علم اور تقوی کے نابالغ اور بے عقل حکمران ہی ہماری قسمت میں لکھے ہوئے ہیں۔ کاش کہ کوئی عالم، زاہد، متقی حاکم ہمیں بھی اپنی زندگی میں دیکھنا نصیب ہو جائے۔

(۸) اعضاء اس کے سلامتی میں ہوں ہاتھ، پاؤں کٹے ہوں یا اس کے اعضاء بے کار اور شل ہوں تو اس کی عزت ملک میں بھی نہیں ہوگی اور کفار پر بھی اس کا رعب طاری نہیں ہوگا۔

(۹) مسلمان ہونا ضروری ہے کیونکہ کافروں کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا ﴾ کافروں کو مومنوں پر اللہ تعالیٰ کوئی راہ نہیں دے گا۔

(۱۰) مسلمانوں کے حاکم کیلئے مذکر ہونا ضروری ہے مؤنث کو حاکمیت کی شرعاً کوئی اجازت نہیں۔

☆ " عن ابی بکرۃ قال لما بلغ رسول اللہ ﷺ ان اھل فارس قد ملکوا علیکم بنت کسری قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ " (بخاری، مشکوۃ کتاب الامارۃ والقضاء)

ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کو یہ خبر ملی کہ بیشک فارس والوں نے کسریٰ (شاہ فارس) کی بیٹی کو اپنا حاکم بنالیا تو آپ نے فرمایا وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے اپنا حاکم عورت کو بنالیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت کی فطری کمزوریاں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ حکمرانی کی اہل نہیں کیونکہ عورت کا مردوں سے اختلاط، اور مردوں کے جلسوں میں خطاب کرنا اور مردوں کے ہجوم میں پھنس جانا بلکہ پس جانا عورت کی عزت کے ہی خلاف ہے۔

☆ حضرت ابو اسید انصاری فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، جب آپ مسجد سے باہر آرہے تھے آپ نے مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو راستہ میں دیکھتے ہوئے عورتوں کو فرمایا:

" استاخرن فانہ لیس لکن ان تحققن الطریق علیکن بحافات الطریق "
" تم پیچھے ہو جاؤ، تمہیں راستہ کے درمیان نہیں چلنا چاہئے بلکہ راستے کے کنارے کنارے پر چلو"۔

آپ کے اس ارشاد گرامی کے بعد عورتیں دیوار کے ساتھ ساتھ چلیں یہاں تک کہ عورتوں کے

کپڑے دیواروں کے ساتھ لگ رہے ہوتے تھے۔ (ابو داؤد باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق)

☆ " عن ابن عمر ان النبی ﷺ نهی ان یمشی (یعنی الرجل) بین المراتین "
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے سے منع فرمایا۔ (ابو داؤد باب فی مشی النساء مع الرجال)

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " لو ترکنا هذا الباب للنساء " کاش کہ ہم (مسجد میں آنے جانے کے لئے) عورتوں کے لئے یہ دروازہ مختص کر دیں۔
حضرت ابن عمر سے روایت کرنے والے حضرت نافع فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کے بعد حضرت ابن عمر زندگی بھر اس دروازے سے داخل نہیں ہوئے۔
(ابو داؤد باب اعتزال النساء فی المساجد من الرجال)

فائدہ: نبی کریم ﷺ کا کیسا حکیمانہ ارشاد گرامی ہے کہ آپ نے صحابہ کرام کو حکم نہیں فرمایا بلکہ تمنا کا اظہار فرمایا '' کاش ایسا ہو جائے '' اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کامل اتباع کو تو دیکھو کہ وہ حضور ﷺ کی فقط تمنا پر ہی سر جھکا دیتے تھے خصوصی حکم کے منتظر نہیں رہتے تھے۔

☆ " عن نافع قال ان عمر بن الخطاب کان ینهی ان یدخل من باب النساء "
حضرت نافع سے مروی ہے بیشک حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عورتوں کے دروازے سے مسجد میں داخل ہونے سے (مردوں کو) منع فرماتے تھے۔
ابھی تک جن احادیث کو ذکر کیا ان سے یہ فوائد حاصل ہوئے کہ عورتیں مساجد میں مردوں کے ساتھ مل جل کر نماز ادا نہ کریں بلکہ مسجد کی ایک جانب علیحدہ پردہ میں نماز ادا کریں۔
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی کامل اتباع کرتے تھے اسی لئے نبی کریم ﷺ کے اظہار تمنا پر زندگی بھر اس دروازے سے داخل نہیں ہوئے جس کو نبی کریم ﷺ نے عورتوں کے لئے خاص کرنے کے لئے خواہش کا اظہار فرمایا۔
جب یہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو ناپسند فرمایا ہے تو عورت حکمران بن کر مردوں سے مل جل کر کام کرنے کی وجہ سے کیا نبی کریم ﷺ کے احکام کی مخالفت نہیں کر رہی ہوگی۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا کان امراؤکم خیارکم واغنیاء کم سمحاء کم

وامورکم شوری بینکم فظهر الارض خیر لکم من بطنها واذا کان امراؤکم شرارکم واغنیاء کم بخلاء کم وامورکم الی نساء کم فبطن الارض خیرلکم من ظهرها " (ترمذی ، مشکوۃ باب تغیر الناس)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارے حکام تم سے بہتر ہوں (نیک، صالح ،متقی) اور تمہارے غنی لوگ سخی ہوں اور تمہارے معاملات مشاورت سے طے ہوں تو تمہارے لئے زمین کے اوپر کا حصہ اندر کے حصہ سے بہتر ہے۔ اور جب تمہارے حکام برے ہوں (ظالم، فاسق وفاجر) اور تمہارے غنی لوگ کنجوس ہوں اور تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے سپرد ہوں تو تمہارے لئے زمین کے اندر کا حصہ اوپر کے حصہ سے بہتر ہے۔

وضاحت حدیث: یعنی جو معاملات مشاورت سے طے ہوں گے ان میں الفت ومحبت اتفاق واتحاد پیدا ہوگا اور اگر مشاورت نہ پائی جائے بلکہ ظالمانہ انداز پایا جائے تو اس میں اختلاف وافتراق ہوگا۔

حکام کون سے بہتر ہوں گے؟ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

" خیار ائمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم وتصلون علیھم ویصلون علیکم "

" تمہارے بہتر حکام وہ ہوں گے جو تمہارے ساتھ محبت کرتے ہوں گے اور تم ان سے محبت کرتے ہوگے اور وہ تمہارے لئے دعا کرتے ہوں گے اور تم ان کیلئے دعا کرتے ہوگے"

برے حکام کون سے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" شرار ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنوھم ویلعنوکم "

(مسلم ، مشکوۃ باب الامارۃ والقضاء)

" تمہارے برے حکام وہ ہوں گے جن کو تم ناپسند کرتے ہوگے اور وہ تمہیں ناپسند کریں گے اور تم ان پر لعنت بھیج رہے ہوگے اور وہ تم پر لعنت بھیج رہے ہوں گے"۔

حکام کی اطاعت کب لازم ہے؟

" قال العلماء تجب طاعة ولاة الامور فیما تشق وتکرھه النفوس وغیرہ مما لیس بمعصیة فان کانت معصیة فلا سمع ولا طاعة "

(نووی باب وجوب طاعة الامراء)

" علماء حق نے بیان فرمایا کہ امراء حکام کی ان معاملات میں اطاعت لازم ہوگی جو شریعت کے مطابق ہوں، خواہ انسان اپنے لئے ان میں مشقت سمجھے اور نفوس ان کو

ناپسند کریں۔ لیکن اگر ان میں گناہ پایا جاتا ہو شریعت کے مخالف ہوں تو ان میں حکام کی اطاعت لازم نہیں ہوگی"۔

جن احادیث میں مطلق امراء، حکام کی اطاعت لازم ہونے کا ذکر ہے ان کا یہی مطلب ہے کہ ان میں معصیت نہ پائی جائے کیونکہ دوسری حدیث میں صراحۃً ذکر کیا گیا ہے "لا سمع ولا طاعة في المعصية" معصیت کے کاموں میں ان کی بات کو سن کر قبول نہ کیا جائے ان کے احکام کی فرمانبرداری نہ کی جائے۔

اغنیاء کے سخی ہونے میں کیا فائدہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"السخي قريب من الله قريب من الجنة قريب من الناس بعيد من النار"

"سخی کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے وہ جنت کے قریب ہوتا ہے اور لوگوں کے قریب ہوتا ہے اور آگ سے دور ہوتا ہے"

یعنی سخی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے اور غرباء، محتاج لوگوں کی امداد کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوگا اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کا قریب جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اور سخی کی مہربانیوں اور اچھائیوں اور حسن اخلاق کی وجہ سے لوگ بھی اس سے محبت کریں گے۔

اغنیاء کے کنجوس ہونے میں نقصانات:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"والبخيل بعيد من الله بعيد من الجنة بعيد من الناس قريب من النار"

"کنجوس اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے جنت سے دور ہوتا ہے، لوگوں سے دور ہوتا ہے آگ کے قریب ہوتا ہے"

چونکہ کنجوس اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ادا نہیں کرتا۔ اسلئے رب تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اس کو جنت سے دور اور جہنم کے قریب کر دیتی ہے اور اس کی بے رخی اور فقراء و غرباء کو اس کا ڈانٹ ڈپٹ کرنا جب لوگ دیکھتے ہیں، تو وہ اس کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس سے دور ہو جاتے ہیں۔

"ولجاهل سخي احب الى الله من عابد بخيل" (ترمذی، مشکوۃ باب الانفاق)

"جاہل سخی، اللہ تعالیٰ کو، عبادت گزار کنجوس سے زیادہ محبوب ہے"

اپنے معاملات عورتوں کے سپرد نہ کیے جائیں:

جب عورت کو صرف گھریلو معاملات کا خود مختار سربراہ بنا دینا خسارہ کا سبب ہے تو یقیناً ملکی معاملات سپرد کرنے سے عظیم نقصان ہونا ہی ہونا ہے۔ یقیناً عورت عقل کی کمی، بے صبری اور انتقامی کاروائی کرنے کی حریص ہونے کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہیں کرسکتی بلکہ اس کے اکثر و بیشتر فیصلے غلط ہی ہوتے ہیں۔

خیال رہے حدیث پاک میں استعمال کئے گئے الفاظ " ظهر الارض " کا مطلب زندگی اور "بطن الارض " کا مطلب موت ہے۔ یعنی جب معاملات عورتوں کے سپرد ہوں اور مجلس مشاورت ختم کردی جائے صرف ایک ڈکٹیٹر من مانیاں شروع کردے غرباء اور فقراء پر رحم کرنا چھوڑ دیا جائے تو یقیناً شرفاء لوگ ایسے حالات میں زندگی سے موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۱۱) مسلمان حاکم کے لئے اور شرط یہ ہے:

" ان یکون عدلا ، لانه لا خلاف بین الامة انه لا یجوز ان تعقد الامامة لفاسق "

کہ وہ عادل ہو، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے مسلمان اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ فاسق کو مسلمانوں کا حاکم بنانا جائز نہیں"

اور یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کا حاکم علم میں افضلیت رکھنے والا ہو۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" انمتکم شفعاء کم فانظروا بمن تستشفعون "

"تمہارے حکام تمہارے شفیع ہوں گے تم دیکھو کس کو اپنا شفیع بنا رہے ہو"

قرآن پاک میں بھی حکام کے لئے علم میں افضل ہونا ذکر فرمایا، طالوت کے متعلق رب تعالیٰ نے بیان فرمایا:

" ان الله اصطفاه علیکم وزاده بسطة فی العلم والجسم "

بیشک اللہ تعالیٰ نے اسے تم پر چن لیا ہے اور اسے تم پر علم اور جسم میں کشادگی زیادہ دی"

علم کا ذکر پہلے فرمایا اور جسمانی قوت کا ذکر بعد میں فرمایا اور رب تعالیٰ نے " اصطفاه " ذکر

فرمایا جس کا معنی "اختارہ" یعنی طالوت کو تم پر اختیار کرنا، چن لینا اس وجہ سے ہے کہ وہ تم پر علم میں اور جسمانی قوت میں فوقیت رکھتا ہے۔

تنبیہ: " الامام اذا نصب ثم فسق بعد انبرام العقد فقال الجمهور انه تنفسخ امامته ویخلع بالفسق الظاهر المعلوم "

ابتدائی طور پر تو فاسق کو حاکم مقرر کرنا ہی ناجائز ہے لیکن کسی کو نیک سمجھ کر اگر حاکم مقرر کرلیا گیا بعد میں وہ فاسق ہوگیا تو جمہور حضرات اس طرف ہیں کہ حق یہ ہے کہ اب اس کی حکومت ختم ہوجائے گی اور جب اس کا فسق ظاہر طور پر معلوم ہو تو وہ خود بخود معزول ہونے کے قابل ہوجائے گا۔ حکومت کے ختم ہونے اور معزول ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ معزول ہونے کا مستحق ہوجائے گا۔ اس کے معزول ہونے کی وجہ واضح ہے کہ اسے حاکم اس لئے بنایا گیا تھا کہ وہ حدود قائم کرے اور حقوق شرع پر عمل کرائے اور تیموں کے مال کی حفاظت کرے اور مجنونوں کے مال کی حفاظت کرے اور تمام امور شرعیہ میں نظر رکھے۔ جب وہ خود ہی فاسق ہوگیا تو وہ امور شرع کا پاس نہیں کرسکتا۔ اس لئے وہ حاکمیت کا اھل نہیں رہا۔

اعتراض: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ذکر ہے:

" ولا تنازع الامر اهله قال الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من الله فیه برهان "

(مسلم ج ۲ کتاب الامارۃ ص ۱۳۳)

"کہ حاکم کی اس وقت تک مخالفت نہ کی جائے جب تک اس میں ظاہر کفر نہ دیکھ لیا جائے ہاں اگر وہ کافر ہوجائے تو خود ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مخالفت کی دلیل حاصل ہوگئی"

اس صریح حدیث کے ہوتے ہوئے صرف فسق سے حاکم کی معزولیت کو کیسے بیان کیا جاسکتا ہے؟

جواب: حدیث پاک میں " کفر بواحا " کا معنی اصطلاحی کفر نہیں بلکہ اس سے مراد گناہ ہے:

" ومعناهما (ای معنی کفر بواحا) کفرا ظاهرا والمراد بالکفر هنا المعاصی ، ومعنی عندکم من الله فیه برهان ای تعلمونه عن دین الله "

(نووی حوالہ مذکور)

"حدیث شریف میں " کفر بواحا " کا معنی " کفرا ظاهرا " ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب حاکم میں ظاہری طور پر گناہ دیکھو یعنی وہ فاسق ہوجائے تو اس کی اطاعت

تم پر لازم نہیں کیونکہ تمہیں دین کے قوانین کا علم ہے کہ وہ مستحق خلافت نہیں رہا اس لئے تمہیں رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت مل گئی کہ تم اس کی اطاعت کو چھوڑ دو"۔

حدیث پاک کا معنی یہ ہو گیا:

" لا تنازعوا ولاة الامور فی ولایتهم ولا تعترضوا علیهم الا ان تروا منهم منکرا محققا تعلمونه من قواعد الاسلام فاذا رایتم ذلک فانکروه علیهم وقولوا بالحق حیث ما کنتم "

"حاکموں کی ان کے دور حکومت میں مخالفت نہ کرو اور ان کے خلاف کسی قسم کا کوئی قدم نہ اٹھاؤ ہاں اگر ان میں تم واضح طور پر شریعت کے خلاف گناہوں کو دیکھو تو پھر ان پر انکار کرو، اور جہاں بھی تم ہو ان کے خلاف کلمہ حق کہو، اس لئے کہ تمہیں معلوم ہے کہ اسلامی قوانین کا تقاضا یہی ہے"۔

" واما الخروج علیهم وقتالهم فحرام باجماع المسلمین وان کانوا فسقة ظالمین "

"البتہ یہ خیال رہے کہ حکام فاسق اور ظالم ہو جائیں تو ان کے خلاف بغاوت اور قتل وغارت حرام ہے اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے"۔

فاسق کو چاہئے: حق تو یہ ہے کہ مسلمانوں کا حکمران جب فاسق ہو جائے تو خود بخود حکومت کو چھوڑ دے اس لئے کہ وہ معزول ہونے کے قابل ہو چکا ہے اس کی حکومت کے خاتمہ کا استحقاق ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن اگر وہ حکومت سے چمٹا ہی رہے، نہ چھوڑے تو اس کی حکومت قائم ہے، اس کے غیر شرعی امور کو نہ تسلیم کیا جائے، اور شریعت کے مطابق اس کے احکام کو تسلیم کیا جائے:

" واجمع علیه اهل السنة انه لا ینعزل السلطان بالفسق..... قال العلماء وسبب عدم انعزاله وتحریم الخروج علیه ما یترتب علی ذلک من الفتن واراقة الدم وفساد ذات البین فتکون المفسدة فی عزله اکثر منها فی بقائه "

"مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ فاسق حاکم اگرچہ مستحق ہے کہ وہ معزول کر دیا جائے لیکن جب تک وہ حکومت سے چمٹا ہوا ہے وہ معزول نہیں ہوا اس کے خلاف بغاوت نہ کی جائے۔ اس لئے کہ اس کے خلاف بغاوت کرنے میں فتنے اٹھیں گے، قتل وغارت ہوگی، فسادات مرتب ہوں گے۔ اس لئے اس کے باقی رکھنے میں اتنے

نقصانات نہیں جتنے اس کے معزول کرنے اور اس کے خلاف بغاوت میں ہیں"۔

فائدہ: ابھی تک جو بحث کی ہے اس سے یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ فاسق حاکم مستحق معزولیت ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے خلاف فساد اور قتل و غارت کی وجہ سے اس سے بغاوت کرنے کی ممانعت ہے۔

فاسق بادشاہ کے معاصی جب رعایا کو تباہ کر رہے ہوں تو کیا کیا جائے؟

" قال القاضی عیاض اجمع العلماء علی ان الامامة لا تنعقد لکافر وعلی انه لو طرا علیه الکفر انعزل قال و کذا لو ترک اقامة الصلوات والدعاء الیها و کذلک عند جمهورهم البدعة "

'' قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر کو ابتدائی طور پر مسلمانوں کا حاکم بنانا جائز نہیں۔ اگر مسلمانوں کا حاکم کسی مسلمان شخص کو بنالیا گیا العیاذ باللہ وہ کافر ہو گیا تو معزول ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک عادل، نیک شخص کو حاکم بنایا تھا وہ فاسق ہو گیا اس نے نمازیں چھوڑ دیں، لوگوں کو بھی نماز کا حکم نہیں دیتا یعنی اس کی وجہ سے لوگ بھی بے نماز ہو رہے ہیں تو وہ بھی حکومت سے معزول ہو گیا''۔

اسی طرح جمہور علماء کے نزدیک خلاف شرع نئے نئے کام ایجاد کرنے کی وجہ سے بھی معزول ہو جائیگا:

" قال القاضی فلو طرأ علیه الکفر او تغییر للشرع او بدعة خرج عن حکم الولایة وسقطت طاعته ووجب علی المسلمین القیام علیه وخلعه ونصب امام عادل ان امکنهم ذلک فان لم یقع ذلک الا لطائفة وجبت علیهم القیام بخلع الکافر ولا یجب فی المبتدع الا اذا ظنوا القدرة علیه فان تحققوا العجز لم یجب القیام ولیها جر المسلم عن ارضه الی غیرها ویفر بدینه "

'' قاضی عیاض رحمہ نے فرمایا اگر مسلمانوں کا حاکم کافر ہو جائے، یا شرعی احکام تبدیل کرنے کا مرتکب ہو جائے یا شریعت کے خلاف نئے نئے احکام جاری کرنے شروع کر دے تو اس کی حکومت درحقیقت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی طاعت ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے احکام کو نہ تسلیم کیا جائے۔ اگرچہ حقیقت میں وہ معزول تو ہو چکا ہے لیکن معزول ہونے کے باوجود لٹھ برداروں کے سہارے حکومت کر رہا ہو، تو مسلمانوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اسے ہٹا کر کسی عادل شخص کو اپنا حاکم مقرر کر لیں۔ لیکن یہ اس وقت ہو گا جب مسلمانوں

کے اس کو خلاف قدم اٹھانے کی طاقت بھی حاصل ہو''

اگر مسلمانوں کا ایک گروہ سمجھتا ہے کہ ہمیں بادشاہ کی مخالفت اور مقابلہ کی طاقت نہیں تو پھر بھی جب حاکم کافر ہو جائے تو وہ لوگ اس کے خلاف جان پر کھیل جائیں، خود شہادت کا اعلیٰ منصب حاصل کر کے اسکی حکومت کی جڑوں کو متزلزل کر دیں تاکہ جلدی ہی مسلمانوں کو اس سے نجات حاصل ہو جائے۔

اگر حاکم کافر تو نہیں ہوا لیکن وہ احکام شرع کو تبدیل کر رہا ہے شریعت کے خلاف نئے نئے احکام پر عمل کرنے پر مجبور کر رہا ہے تو اب دیکھا جائے اگر اس سے مقابلہ ممکن ہے تو اسے معزول کر دیا جائے اور اسکی جگہ کسی عادل اور نیک شخص کو مقرر کر دیا جائے۔ اگر اس سے مقابلہ ممکن نہیں اور وہ غیر شرعی کام کرنے پر مجبور بھی کر رہا ہے تو ہجرت کر کے اپنے دین کو بچا لیا جائے، اور اپنے آپ کو اسکے غیر شرعی امور سے الگ تھلگ کر لیا جائے۔ (از نووی کتاب الامارۃ) (بحث خلافت ماخوذ از قرطبی بزیادۃ)

مقام افسوس یہ ہے کہ آج کل یہ شرعی اصول چھوڑ کر لوگ مغربی جمہوریت میں کامیابی کا راز سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ مسلمانون کے حکمران کو منتخب کرنا اہل علم مجتہدین فقہاء کرام، علماء عظام کا کام ہے مغربی جمہوریت میں عالم، جاہل، مرد اور عورت کا ووٹ برابر ہے جسے چاہیں منتخب کریں۔ اسلام میں حکمران کیلئے جو شرائط رکھی گئی ہیں مغربی جمہوریت میں ان کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ ہر فاسق و فاجر حاکم بن سکتا ہے۔ اسلام میں مجلس مشاورت کے لئے انتخاب نہیں بلکہ حاکم وقت جن لوگوں کو اھل سمجھے ان سے مشورہ لے لیکن مغربی جمہوریت میں بغیر کسی اھلیت کے مشاورت کے لئے اسمبلی کے ممبران کو منتخب کیا جاتا ہے۔

اسلام میں مشیر قومی خزانہ پر بوجھ نہیں ہوتے ان کی معین تعداد نہیں ہوتی، لیکن مغربی جمہوریت میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران قومی خزانہ پر بلاوجہ بوجھ بنے ہوتے ہیں اور ان کی معین تعداد ہوتی ہے۔ اسلام میں مشیر قرآن و حدیث کے تابع ہوتے ہیں وہ کوئی قانون خود نہیں بنا سکتے بلکہ قرآن و حدیث کے قوانین کی تشریح کر سکتے ہیں لیکن مغربی جمہوریت میں قومی اسمبلی کے دوتہائی ممبران جو چاہیں قانون بنا دیں۔

اسلام میں یہ کوئی تصور نہیں کہ ووٹ قومی اسمبلی کے ممبران کو دیا جائے اور وہ وزیر اعظم کا انتخاب کریں۔ یہ تصور صرف مغربی جمہوریت میں ہے اور خصوصاً باعث نقصان اور قابل مذمت بات یہ ہے کہ

ووٹ دینے والے وزیر اعظم کو مدنظر رکھ کر ووٹ دیتے ہیں۔ لیکن کئی بے ضمیر، بکاؤ مال ووٹ اور نام پر لیتے ہیں اور اسمبلی میں جا کر ساتھ اور کا دیتے ہیں اسلام میں حاکم جب تک انصاف سے کام کرتا ہے اس کی میعاد ختم نہیں ہوتی اور اگر انصاف کو چھوڑ دے تو اس کے رہنے کا حق ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن مغربی جمہوریت میں حاکم خواہ نیک ہو، منصف ہو، وہ مقرر میعاد پر معزول ہو جائے گا اور خواہ کتنے مظالم ڈھائے وقت سے پہلے معزول نہیں ہوگا۔ اسلام میں حاکم کی غلطی پر عام شخص کو بھی حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حاکم سے پوچھے کہ تم نے یہ غلط کام کیوں کیا ہے۔ مغربی جمہوریت میں حاکم سے پوچھنے والے پر جھوٹے ان گنت مقدمے بنا دیئے جاتے ہیں۔

اسلام میں حاکم بھی عام آدمی کی طرح عدالت میں اپنے خلاف مقدمات کا جواب دینے کا ذمہ دار ہے لیکن مغربی جمہوریت میں حاکم کو عدالت میں جواب دینے سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔ اسلام میں قومی خزانہ لوٹنے پر، بیت المال کو نقصان پہنچانے پر ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ حاکم سے باز پرس کرے۔ مغربی جمہوریت میں یہ حق نہیں دیا گیا۔ صرف ذاتی نقصان پر کسی کو مقدمہ کرنے کا بظاہر حق حاصل ہے لیکن مقدمہ درج ہی کوئی نہیں کرتا۔ مقدمہ درج ہو جائے تو حاکم کے خلاف کوئی فیصلہ ہی نہیں کرتا۔

آیئے پاکستان میں حاکم کے مقرر کرنے کا طریقہ دیکھیں؟ یہ طریقہ تمام قوانین سے بالاتر ہے اسلامی قوانین پر عمل کا تو تصور ہی نہیں لیکن مغربی جمہوریت کا صرف نام ہے مغربی جمہوریت پر بھی کوئی عمل نہیں۔ لٹھ بردار جسے چاہیں الیکشن کا ڈھونگ رچا کر رات ہی رات میں اس کی صندوقچیاں پرچیوں سے بھر کر اسے محب وطن کا سرٹیفکیٹ دے دیں اور اسے حاکم بنا دیں۔ جب تک وہ لٹھ برداروں کے سامنے سر نہ اٹھائے۔ خوشامدی بن کر رہے جی حضوری بن کر رہے (تھلے لگ کے رہے) وہ محب وطن کہلاتا ہے وہ ملک کا خیر خواہ کہلاتا ہے وہ لائق اور ذہین کہلاتا ہے۔ لیکن جب وہ سر اٹھائے اپنے آپ کو حاکم سمجھے اپنی سمجھ کے مطابق کوئی فیصلہ کرے جی حضوری نہ کر رہے اسے کرپٹ، غدار، لٹیرا کہا جاتا ہے لٹھ بردار اسے چلتا بناتے ہیں۔ کفار کے سامنے شرمناک طریقہ سے سرنگوں ہونے والے ملک کو دولخت کرنے والے، اپنے ہی ملک کو بار بار فتح کر کے اپنی فتح کے شادیانے بجا کر اپنے دل کو تسلیاں دیتے ہیں اور قوم کو الو بناتے ہیں۔

اب قوم بھی بے وقوف نہیں رہی قوم نے سمجھ لیا ہے کہ ملک کو برباد کرنے والے کون ہیں اصل غاصب اور لیٹرے کون ہیں ہاں البتہ قیام پاکستان کے وقت کانگرس کے پٹھو رہنے والے بھی ملک کے برباد میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے۔ بین الاقوامی سازش، یہود و نصاری کی سازش سے ملک عزیز کے باوقار، باعزت ادارہ کو لوگوں کی نظر میں بے عزت اور بے وقار کر دیا گیا نفرت کے بیج بو دیئے گئے۔

﴿ قَالُوٓا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ﴾:

''انہوں (فرشتوں) نے کہا کیا تو زمین میں اسے خلیفہ بنائے گا جو وہاں فساد پھیلائے اور خون بہائے''

ان الفاظ مبارکہ کی تفسیر بیان ہو چکی ہے کیونکہ اصل مقصودی بحث "للملئکة" کے متعلق تھی لیکن یہ بحث بھی اسی کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ اب مختصر صرف دو لفظوں کو ذکر کیا جا رہا ہے "اتجعل" جعل سے ماخوذ ہے کبھی اس کا معنی ہوتا ہے پیدا کرنا اس وقت اس کا ایک مفعول ہوتا ہے اور کبھی اس کا معنی ہوتا ہے بنانا، پھیرنا، اس وقت اس کے دو مفعول ہوتے ہیں "ویسفک" سفک سے مضارع ہے جس کا معنی ہے بہانا کبھی کہا جاتا ہے "سفک الدم" خون بہانا، اور کبھی کہا جاتا ہے "سفک الدمع" آنسو بہانا۔ سفاک اور سفاح کا معنی ہوتا ہے خون بہانے والا اور کبھی ان کا معنی ہوتا ہے ''کلام پر قدرت رکھنے والا'' اسی طرح بولا جاتا ہے "سفک الکلام" اس نے نثر کلام کیا۔ تاہم زیادہ طور پر "سفک" کا استعمال خون بہانے کے معنی میں ہوتا ہے۔ دوسرے معانی میں کم استعمال ہے۔

(از قرطبی)

﴿ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ ﴾: ''اور ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں''

"وهو مشتق من السبح وهو الجری والذهاب" نسبح مشتق ہے "سبح" سے۔ جس کا معنی ہے جاری ہونا، تیرنا، جانا۔

ونحن نسبح بحمدک، ای ننزهک عما لا یلیق بصفاتک ونخلط التسبیح بالحمد ونصله به"

''فرشتوں کے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ اے اللہ ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں ان صفات سے جو تیری شان کے لائق نہیں، اور ساتھ ہی تیری حمد بیان کرتے ہیں''

اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "بحمدک" جملہ معترضہ ہو اور "ونحن نسبح ونقدس"

کا ایک دوسرے پر عطف ہو۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔

" ثم اعترضوا علی جهة التسليم ای وانت المحمود فی الهداية الي ذلک "

" پھر انہوں نے جملہ معترضہ کے طور پر ذکر کیا کہ اے اللہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تسبیح وتقدیس کی ہدایت بھی ہمیں تو نے ہی عطا کر رکھی ہے اور تو ہی محمود ہے یعنی حمد کے لائق تو ہی ہے "

☆ " روی عن طلحة بن عبيد الله قال سالت رسول الله ﷺ عن تفسير سبحان الله فقال هو تنزيه الله عزوجل عن كل سوء "

حضرت طلحہ بن عبید اللہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ " اللہ تعالیٰ کی شان کے جو بھی لائق نہیں اس سے رب تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرنا "

ملائکہ کی تسبیح:

" فقال ابن مسعود وابن عباس تسبحهم صلاتهم " " ملائکہ کی تسبیح سے مراد ان کا نماز ادا کرنا ہے "

وقيل تسبيحهم رفع الصوت بالذكر "

" بعض حضرات نے کہا کہ ملائکہ کی تسبیح کا مطلب ہے بلند آواز سے ذکر کرنا یہ قول مفضل کا ہے "

" وقال قتادة تسبيحهم سبحان الله علی عرفه فی اللغة "

" حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، فرشتوں کی تسبیح " سبحان اللہ " کہنا ہے لغت کے مطابق یہی معنی مراد لیا جاتا ہے "

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس آخری معنی کو صحیح قرار دیا ہے اور اسی کی تائید میں ایک حدیث پیش کی ہے۔ لیکن راقم کے نزدیک تمام معانی مراد لینے میں کوئی مشکل نہیں کیونکہ فرشتے اپنی عبادت کے ذریعے بھی رب تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور بلند ذکر سے بھی رب تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں اور زیادہ طور " سبحان الله " کہہ کر بھی رب تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ اب حدیث پاک کا مفہوم بھی آسانی سے سمجھ آ جائے گا کہ زیادہ طور پر ان کی تسبیح یہ ہوتی تھی۔

☆ " عن ابی ذر ان رسول الله ﷺ سئل ای الكلام افضل ؟ قال ما اصطفی الله لملائكته (او لعباده) سبحان الله وبحمده " (مسلم)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کون سا کلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے پسند فرمایا یعنی " سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ "

☆ " عن عبد الرحمن بن قرط ان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة اسرى به سمع تسبيحا في السموات العلا سبحان الله العلى الا على سبحانه وتعالىٰ " (بیهقی)

عبدالرحمٰن بن قرط فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات کو آسمان بالا میں یہ تسبیح سنی:

﴿ سُبُحَانَ اللهِ الْعَلِيِّ الْاَعْلٰى سُبُحَانَهٗ وَتَعَالىٰ ﴾

﴿ وَنُقَدِّسُ لَکَ ﴾:

" اى نعظمک ونمجدک ونطهر ذكرک عما لا يليق بک مما نسبک اليه الملحدون "

" ہم تیری عظمت بیان کرتے ہیں اور تیری بزرگی بیان کرتے ہیں اور تیرے ذکر کو ہر اس چیز سے پاک رکھتے ہیں جو تیری شان کے لائق نہیں اور بے دینوں نے تیری طرف منسوب کیا ہے"

یہ قول حضرت مجاہد اور حضرت ابو صالح رحمہما اللہ اور ان کے بغیر کچھ دوسرے حضرات کا ہے۔ اور ضحاک وغیرہ نے یہ معنی بیان کیا ہے:" نطهر انفسنا لک ابتغاء مرضاتک " ہم اپنے نفوں کو پاکیزہ رکھتے ہیں تیری رضامندی حاصل کرنے کے لئے۔ حضرت قتادہ اور کچھ دوسرے حضرات نے کہا "نقدس لک " ، معناه نصلى ، والتقديس ، الصلوة " کہ " نقدس لک " کا معنی یہ ہے کہ ہم نماز ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ " التقديس "کا معنی "نماز" ہے اس معنی کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے تائید بھی حاصل ہے آپ فرماتی ہیں:

" كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول في ركوعه وسجوده سبوح قدوس رب الملئكة والروح " (مسلم)

رسول اللہ ﷺ رکوع اور سجود میں یہ پڑھتے تھے ﴿ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ ﴾ لیکن یہ خیال رہے کہ رکوع میں " سبحان ربى العظيم " پڑھنے کے بعد اور سجود میں

''سبحان ربی الاعلی'' پڑھنے کے بعد یہ تسبیحات پڑھتے اور نماز بھی نفلی مراد ہے فرض نماز مراد نہیں جیسا کہ شارحین نے وضاحت کی ہے: ''تقدیس'' کا معنی نماز لینا عقل کے بھی مطابق ہے:

''ان الصلوۃ تشتمل علی التعظیم و التقدیس و التسبیح''

''بیشک نماز تعظیم، تقدیس، تسبیح کو شامل ہے''

﴿ قَالَ اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴾: ''رب نے کہا بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''

اس کی وضاحت بھی پہلے کافی حد تک ضمنی طور پر گزر چکی ہے البتہ مختصر طور پر یہاں بھی ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے ''کہ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے؟'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مطلب یہ بھی ہے کہ فرشتے جب یہ کہہ رہے تھے کہ ہم تیری تسبیح وتحمید وتقدیس بیان کرتے ہیں تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے کیونکہ تمہارے اندر ابلیس بھی ہے جس کے دل میں تکبر آ چکا ہے اس نے میرے حکم کا انکار کرنا ہے اور مردود ہو جانا ہے۔ اور ایک معنی یہ بھی ہے:

''انی اعلم مالا تعلمون مما کان ومما یکون ومما ھو کائن'' (از قرطبی)

''بیشک جو ہو چکا ہے جو ہو رہا ہے، جو ہونا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں تمہیں اس کا علم نہیں''

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش:

رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پیدائش کے مختلف مراحل کو ذکر فرمایا یعنی آپ کے جسم اطہر کیلئے پہلے خشک مٹی کو لایا گیا، پھر اسے گوندھ کر کیچڑ بنایا گیا پھر چپکنے والی مٹی بنایا گیا پھر اسے اسی طرح رہنے دیا گیا یہاں تک کہ وہ خشک ہوگئی اور بجنے لگی اور اس کی بو میں تغیر آ گیا پھر اور زیادہ رکھنے پر ٹھیکری کی طرح ہوگئی۔ ان تمام مراحل کا ذکر قرآن پاک کی مختلف آیات میں دیکھنے سے واضح ہو جائے گا:

﴿ فانا خلقنکم (ای اصلکم آدم) من تراب ﴾ (پ ۱۷ ۸ جلالین)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا بیشک ہم نے تمہارے اصل (باپ) آدم کو مٹی سے پیدا کیا''

﴿ و اذ قال ربک للملائکۃ انی خالق بشرا من طین (ھو آدم) ﴾ (پ ۲۳ ۱۲ جلالین)

''یاد کرو اس وقت کو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا بیشک میں ایک بشر کیچڑ سے بنانے

والا ہوں اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں''

﴿ انا خلقناهم من طين لازب (انا خلقناهم ای اصلهم آدم) ﴾

''بیشک ہم نے انسانوں کو چپکتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا یہاں بھی انسانوں سے مراد ان کے اصل آدم علیہ السلام ہیں''

﴿ ولقد خلقنا الانسان (آدم) من صلصال (طين يابس تسمع له صلصلة ای صورت اذا نقر) من حمأ(طين اسود) مسنون (متغير) ﴾ (پ ۱۴ ۳ جلالین)

''بیشک ہم نے انسان یعنی آدم کو سیاہ خشک متغیر کیچڑ سے پیدا کیا''

''صلصال'' اس کیچڑ کو کہتے ہیں جو خشک ہو جائے کھٹکانے پر اس سے آواز آئے سیاہ کیچڑ کو ''حمأ'' کہتے ہیں جس کی بو میں تغیر آ جائے اسے ''مسنون'' کہتے ہیں۔

﴿ خلق الانسان (آدم) من صلصال (طين يابس يسمع له صلصلة ای صوت اذا نقر) كالفخار (وهو ما طبخ من طين) ﴾ (پ ۲۷ ۱۲ جلالین)

''انسان یعنی آدم کو خشک بجنے والی ٹھیکری کی طرح کیچڑ سے پیدا کیا''

آدم علیہ السلام کے جسم کے لئے مٹی کیسے لی گئی؟

آدم علیہ السلام کے جسم اطہر کی تخلیق کے لئے مٹی لانے کے لئے حضرت جبرائیل کو زمین پر بھیجا گیا، آپ جب تشریف لائے تو زمین سے مٹی لینے کا ارادہ فرمایا، تو زمین نے بڑی عاجزی وانکساری اور گریہ وزاری سے عرض کیا کہ میرے مٹی سے بننے والے شخصوں نے اگر خونریزیاں کیں یا اور جرائم کی وجہ سے وہ جہنم میں گئے تو مجھے تکلیف ہوگی۔ اس لئے آپ میری مٹی نہ لے کر جائیں۔

حضرت جبرائیل زمین کی عاجزی کو دیکھ کر واپس چلے گئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور ماجرا عرض کر دیا۔ اسی طرح اسرافیل بھی آئے وہ بھی زمین کی بات سن کر واپس چلے گئے اور میکائیل آئے وہ بھی اسی طرح واپس چلے گئے۔ ان تمام کے بعد عزرائیل آئے ان کی خدمت میں بھی زمین نے وہی عاجزانہ گفتگو کی۔ لیکن آپ نے کہا میں تیری بات تسلیم کروں یا اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کروں۔

مجھے اللہ تعالیٰ کا حکم اس لئے میں نے تو مٹی ضرور لے کر جانا ہے۔آپ نے زمین کی انکساری کی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ رب تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق زمین سے مٹی لے کر رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے روح قبض کرنا بھی ان کے سپرد کیا کہ ایسا نہ ہو کہ جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل میں سے کسی کے ذمہ لگایا تو یہ روح قبض کرنے کے لئے جائیں تو اس کے اقرباء کو روتے ہوئے پا کر اسی طرح چھوڑ کر نہ آ جائیں۔ (از عزیزی)

سوال: زمین کو کیسے پتہ چلا کہ انسان خونریزیاں کریں گے اور فساد پھیلائیں گے اور کئی لوگ جہنم میں جائیں گے؟

جواب: ''جبریل گفت کہ حق تعالیٰ از تو مخلوق را خواھد آفرید کہ خلافت زمین باو خواھد بخشید واو چنیں وچناں خواھد کرد، ودر ثواب وعذاب خواھد افتاد'' (از عزیزی)

جبرائیل نے خود ہی زمین کو اللہ تعالیٰ کا پیغام واضح طور پر دیا تھا کہ رب تعالیٰ تجھ سے ایک مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے۔ جسے زمین میں ہی منصب خلافت عطا کرنا ہے۔ البتہ انکے اعمال مختلف ہوں گے کئی لوگ نیک ہوں گے، ان کو ثواب عطا کیا جائے گا۔ اور کئی لوگ گنہگار ہوں گے ان کو عذاب دیا جائے گا۔ زمین پر یہ حقائق خود رب تعالیٰ کی طرف سے جبرائیل نے واضح طور پر کھول کر رکھ دیئے تھے۔ اسی وجہ سے زمین نے عاجزانہ طور پر عرض کیا تھا کہ مجھ سے مٹی لے کر نہ جائیں۔

کسی طرح کی مٹی لی گئی؟

'' عن ابی موسی قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان اللہ خلق آدم من قبضة قبضها عن جمیع الارض فجاء بنو آدم علی قدر الارض منهم الاحمر والابیض والاسود وبین ذلک والسهل والحزن والخبیث والطیب '' (رواہ احمد والترمذی وابو داؤد، مشکوۃ باب الایمان والقدر)

''حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹھی بھر مٹی سے پیدا کیا، وہ مٹی تمام زمین سے (مختلف قسم کے ذرات کی صورت میں) حاصل کی گئی۔ اسی لئے آپ کی

اولاد مٹی کے ان ہی ذرات کی شکل میں موجود ہے کوئی سرخ ہیں، کوئی سفید ہیں، کوئی
سیاہ ہیں کوئی ان کے درمیان ہیں (یعنی گندم گوں رنگ کے ہیں) کوئی نرم مزاج ہیں،
کوئی سخت مزاج ہیں کوئی ناپاک ہیں اور کوئی پاک ہیں"

یعنی آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت آپ کے جسم میں جس قسم کے ذرات رکھے گئے آپ کی اولاد میں بھی اسی طرح کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ جتنے رنگوں کے ذرات آپ کی مٹی میں تھے اتنے ہی آپ کی اولاد میں پائے جاتے ہیں۔آپ کی مٹی میں کوئی سخت ذرات اور کوئی نرم ذرات تھے۔اس لئے آپ کی اولاد میں بھی کوئی سخت دل اور کوئی نرم دل ہیں اور اسی طرح آپ کی اولاد میں کوئی نیک اور کوئی برے ہیں۔

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی میں ساٹھ قسم کے رنگ شامل تھے، وہ تمام آپ کی اولاد میں پائے جاتے ہیں۔ (صاوی)

زمین میں چشمے جاری ہونے کی وجہ:

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو زمین کو بتایا کہ میں تجھ سے اپنی ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہوں، جو میرے مطیع ہوں گے ان کو جنت میں داخل کروں گا اور جو میرے نافرمان ہوں گے ان کو میں جہنم کی آگ میں ڈال دوں گا۔ یہ سن کر زمین نے پھر پوچھا۔اے اللہ تعالیٰ مجھ سے پیدا ہونے والی مخلوق جہنم کی آگ میں جائے گی؟

رب تعالیٰ نے فرمایا ہاں زمین نے رب تعالیٰ کے ارشاد کو جب سنا: " **فبکت فانبعت العیون من بکائها وهی تجری الی یوم القیمة** " (صاوی) تو زمین اتنا روئی کہ اس کے رونے سے چشمے جاری ہوگئے وہ قیامت تک چشمے جاری رہیں گے۔

انسان کو خوشی کم اور غم زیادہ کیوں؟

حضرت عزرائیل جب مٹی کو لائے تو انہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اسے صفا و مروہ پہاڑیوں کے پاس رکھ دو یعنی وہاں رکھ دینے کا حکم دیا جہاں آج کل کعبہ شریف ہے۔پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ اسکا

مختلف پانیوں سے گارا بنائیں، پھر اس پر چالیس روز بارش ہوئی۔ انتالیس دن تو غم ورنج کا پانی برسا اور ایک دن خوش کا۔ اسی لئے انسان کو رنج زیادہ اور خوشی کم ہوتی ہے۔ پھر اس گوندھی ہوئی مٹی کو مختلف ہواؤں سے خشک کر کے کھنکنے والی مٹی بنا کر اللہ تعالیٰ نے خود اپنی قدرت کاملہ سے آپ کے قالب کو تیار کیا۔ (از عزیزی)

آدم علیہ السلام کی صورت جنت میں تیار ہوئی:

" قد ترک في الارض حتى استعد للصورة الانسانية ثم نقل الى الجنة وصور هناک " (حاشیه مشکوة ص ٥٠٦)

" آدم علیہ السلام کی مٹی کو زمین میں رکھا گیا جب وہ انسانی صورت بنانے کے قابل ہو گئی تو اسے جنت کی طرف منتقل کر دیا گیا پھر وہاں اسے صورت عطا کی گئی "

" عن انس ان رسول الله ﷺ قال لما صور الله آدم في الجنة تركه ماشاء الله ان يتركه فجعل ابليس يطيف به ينظر ما هو فلما رآه اجوف عرف انه خلق خلقا لا يتمالک " (مشکوة باب بدا الخلق)

" حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو جنت میں صورت عطا کر دی (یعنی آپ کا جسم بنا دیا گیا) تو جنت میں کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیا گیا، یعنی جتنی دیر رب تعالیٰ کی مشیت تھی اتنی دیر آپ کے جسم کو (بغیر روح کے) جنت میں رکھ دیا گیا ابلیس اسے پھیر کر دیکھتا، جب اس نے دیکھا کہ اس میں پیٹ ہے تو اس نے سمجھا کہ یہ وہ مخلوق ہے جو اپنے آپ پر قدرت نہیں رکھے گی "۔

آدم علیہ السلام کی صورت دیکھ کر فرشتے حیران ہو گئے:

فرشتوں نے کبھی ایسی صورت نہیں دیکھی تھی وہ حیران ہو کر اس کے ارد گرد پھرتے تھے، اور اس کی خوبصورتی پر تعجب کرتے تھے۔ ابلیس کو بھی اس کی خبر ہو چکی تھی۔ ابھی تک وہ مردود نہیں ہوا تھا، وہ بھی اس قالب کو دیکھنے آیا، اور اس کے ارد گرد پھر کر بولا تم اس پر تعجب کرتے ہو یہ تو اندر سے ایک خالی جسم ہے جس میں جگہ جگہ سوراخ ہیں اور اس کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر بھوکا ہو تو گر پڑے اور اگر خوب سیر ہو جائے تو چل پھر نہ سکے، اس خالی قالب سے کچھ نہ ہو سکے گا، پھر کہنے لگا ہاں اس کے سینے کے

بائیں طرف ایک بند کوٹھڑی (دل) ہے یہ خبر نہیں کہ اس میں کیا ہے۔ شائد یہی لطیفہ ربانی کی جگہ ہو، جس کی وجہ سے یہ خلافت کا حق دار ہوا ہو۔ (از عزیزی)

آدم علیہ السلام کے قالب میں روح کا دخول:

اللہ تعالیٰ نے روح کو حکم دیا کہ اس قالب میں داخل ہو جا اور تمام حصوں میں پھیل جا جب روح قالب کے پاس پہنچی تو جسم کو تنگ و تاریک پایا اندر جانے سے ٹھہر گئی۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ تب نور مصطفیٰ ﷺ سے وہ قالب جگمگا دیا گیا یعنی وہ نور آدم علیہ السلام کی پیشانی میں امانت رکھا گیا اب روح آہستہ آہستہ داخل ہونے لگی ابھی سر میں تھی کہ آپ کو چھینک آئی اور زبان میں پہنچی، تو آپ نے **الحمد للہ** پڑھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں **یرحمک اللہ** کہا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابو محمد (ابو محمد اور ابو البشر آدم علیہ السلام کی کنیت ہے) میں نے تمہیں اپنی حمد کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ جب روح کمر تک پہنچی تو آپ نے اٹھنا چاہا لیکن آپ گر پڑے کیونکہ روح ابھی آپ کے نیچے والے حصہ میں نہیں پہنچی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ **خلق الانسان من عجل** ﴾ انسان جلد باز پیدا کیا گیا۔ پھر روح تمام جسم میں پھیل گئی تو آپ کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو سلام کرو، آپ نے کہا" **السلام علیکم** "فرشتوں نے جواب دیا" **وعلیکم السلام**" اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ ہی آپ کیلئے اور آپ کی اولاد کے لئے سلام کا طریقہ ہوگا۔ آپ نے عرض کیا میری اولاد کون سی ہوگی؟ تو آپ کی تمام اولاد کو آپ کے سامنے کر دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ پھر ان کی پیٹھ پر اپنا دست قدرت پھیرا اور آپ کی باقی اولاد کو ظاہر فرمایا اور رب تعالیٰ نے کہا کہ ان لوگوں کو میں نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے یہ جہنمیوں والے عمل کریں گے۔

(ماخوذ از خازن ج ۱ ص ۴۶، نعیمی ج ص ۲۵۰، ابو داؤد مشکوۃ باب الایمان بالقدر)

آدم علیہ السلام کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی:

"**عن ابی هریرة قال اخذ رسول الله ﷺ بیدی فقال خلق الله التربة یوم**

السبت وخلق فیها الجبال یوم الاحد وخلق الشجر یوم الاثنین وخلق المکروہ یوم الثلثاء وخلق النور یوم الاربعاء وبث فیها الدواب یوم الخمیس وخلق آدم بعد العصر من یوم الجمعة فی آخر الخلق وآخر ساعة من النہار فیما بین العصر الی اللیل "(رواہ مسلم مشکوۃ باب بدأ الخلق)

''حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر فرمایا اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتے کے دن پیدا فرمایا (مٹی سے مراد زمین ہے) اور اسمیں پہاڑوں کو اتوار کے دن پیدا فرمایا اور درختوں کو پیر کے دن پیدا فرمایا۔ اور مکروھات (مصائب وغیرہ) کو منگل کے دن پیدا فرمایا۔ اور نور کو بدھ کے دن پیدا فرمایا، اور چوپاؤں کو زمین میں جمعرات کے دن پھیلایا، اور آدم (علیہ السلام) کو جمعہ کے دن عصر کے بعد تمام مخلوق کے آخر میں دن کی آخری گھڑی عصر سے شام تک کے درمیان میں پیدا کیا؛

فائدہ: احادیث میں مروی ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بہترین دنوں میں جمعہ کا دن ہے کیونکہ جمعہ کو ہی حضرت آدم علیہا السلام کی تخلیق ہوئی اور جمعہ کے دن ہی آپ کو جنت میں داخل کیا گیا۔ اور جمعہ کے دن ہی آپ جنت سے باہر تشریف لائے اور جمعہ کے دن ہی آپ کی وفات ہوئی اور جمعہ کے دن ہی قیامت قائم ہوگی۔ (از عزیزی)

سیدالاولیاء کا کلام:

سیدالاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ حضرت الشیخ نے فتوحات کے متعدد مقامات میں اشعار تحریر فرمائے ہیں ان میں سے ایک مصرعہ یہ ہے " یا اخت عمتی المعقولة "اس مصرع کا لفظی معنی یہ ہے کہ اے میری بہن بلکہ میری پھوپھی کہ تو معقولہ ہے یہ اشارہ ہے اس حدیث شریف کی طرف جس میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی خلقت سے کچھ مٹی باقی رہ گئی جس سے کھجور کا درخت بنایا گیا، لہذا کھجور کا درخت آدم کی بہن اور ہماری پھوپھی ٹھہرا۔

جب اس کی خلقت کے بعد کچھ مٹی بمقدار ایک دانہ تل باقی بچی تو اس سے اللہ تعالیٰ نے ایک زمین نہایت وسیع پیدا فرمائی کہ ساتوں آسمان اور زمینیں اس کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے صحرا میں ایک حلقہ، اس کو ارض حقیقی بولتے ہیں:

ایں جھان را آں جھانے دیگر است — اس جہان کے مقابلہ میں وہ جہان ہی اور ہے

اس میں صرف اللہ تعالیٰ کے اولیاء ہی داخل ہوتے ہیں اور اس کا علم بھی ان کو ہی حاصل ہے

(از ملفوظات مہریہ ص ۱۷)

آدم علیہ السلام کا قد:

"عن ابی ھریرۃ قال ان رسول اللہ ﷺ قال کان طول آدم ستین ذراعا فی سبع اذرع عرضا" (مشکوۃ باب بدأ الخلق)

"حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدم علیہ السلام کی لمبائی ساٹھ ذراع تھی (یعنی نوے فٹ) اور آپ کی چوڑائی سات ذراع تھی"۔

﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ☆ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ☆ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾

(۱) "اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام (اشیاء کے) نام سکھائے۔ پھر سب (اشیاء) کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ ☆ بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں، مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بیشک تو ہی علم و حکمت والا ہے ☆ فرمایا اے آدم بتا دے انہیں سب (اشیاء کے) نام، جب اس نے (یعنی آدم نے) انہیں سب کے نام بتا دیئے فرمایا میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو"۔

(۲) "اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطا کر دیا پھر تمام چیزوں کو فرشتوں پر پیش فرمایا پھر کہا ان چیزوں کے نام کی مجھے خبر دو اگر تم سچے ہو ☆ انہوں نے عرض کیا پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں علم عطاء کیا ہے، بیشک تو ہی علم و حکمت والا ہے ☆ (رب) نے کہا اے آدم تم ان کو ان چیزوں کے ناموں کی خبر دے دو جب اس نے (آدم نے) انہیں (فرشتوں کو) تمام چیزوں کے نام بتا دیئے (تو رب تعالیٰ نے) کہا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی تمام چھپی ہوئی چیزیں اور میں جانتا

ہوں جو تم ظاہر کرتے اور جو تم چھپاتے تھے“

مختصر مطلب: جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مشورہ کیا اور اپنے ارادہ سے مطلع کیا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے اس پر تعجب کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ تو ایسی مخلوق کو خلیفہ بنائے گا جو خونریزیاں کریں گے اور زمین میں فساد پھیلائیں گے۔ حالانکہ اے اللہ ہم تیری تسبیح وتحمید وتقدیس بیان کرتے ہیں تو رب تعالیٰ نے فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

ان آیات میں رب تعالیٰ نے فرشتوں پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ زمین میں، میں جو خلیفہ بنانے والا ہوں اسی میں خلافت کی اہلیت پائی گئی ہے جو اہلیت تمہیں عطاء نہیں ہوئی اسلئے کہ رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطاء فرما دیا، فرشتوں میں اتنے علوم کو حاصل کرنے کی استعداد ہی حاصل نہ تھی۔ پھر وہ تمام چیزوں کو فرشتوں پر پیش کر کے کہا کہ تم ان چیزوں کے نام بتاؤ لیکن فرشتوں نے اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے رب کے حضور عرض کیا کہ اے اللہ تو پاک ذات ہے ہمیں تو اتنا ہی علم حاصل ہے جو تو نے ہمیں عطا کر رکھا ہے اس سے زائد ہم کچھ بھی نہیں جانتے

وہی تمام چیزیں آدم علیہ السلام پر پیش کر کے رب تعالیٰ نے کہا اے آدم تم ان کو ان چیزوں کے نام بتلاؤ آدم علیہ السلام نے جب نام بتلا دیئے تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں نہیں بتلا دیا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اور میں ہی آسمانوں اور زمینوں کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہوں۔ ساتھ ہی فرشتوں کو یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو فرشتوں کو بھی واضح طور پر جب اللہ تعالیٰ کی حکمت سمجھ آئی تو برملا عرض کیا اے مولائے کائنات بیشک تو ہی علیم وحکیم ہے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿وعلم ادم الاسماء کلھا﴾ ”اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے“

” علم معناه عرف وتعليمه هنا الهام علمه ضرورة “

”یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے دل میں القاء کر کے تمام چیزوں کا علم اس طرح عطا کر دیا جس طرح بدیہات کا علم حاصل ہوتا ہے“

آدم علیہ السلام کی وجہ تسمیہ:

یعنی آدم علیہ السلام کا نام آدم رکھنے کی وجوہ کا تذکرہ:

(۱) " قیل سمی بذلک لکون جسدہ من ادیم الارض " اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ لفظ آدم کا معنی لیا گیا ہے "ادیــم الارض " سے جس کا معنی ہے زمین سے اوپر کا حصہ۔ چونکہ آپ کے جسم اطہر کو زمین کی مختلف رنگوں اور مختلف صفات والی مٹی سے بنایا گیا ہے اس لئے آپ کا نام بھی ''آدم'' رکھ دیا

(۲) " وقیل لسمرۃ فی لونہ یقال رجل آدم نحو اسم " آدم کا معنی گندم گوں ہونا بھی لیا جاتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے " رجل آدم " فلاں شخص کا رنگ گندمی ہے۔آدم علیہ السلام کا نام بھی اس لئے آدم رکھا گیا کہ آپ کا رنگ بھی گندمی تھا۔

(۳) " وقیل سمی بذلک لکونہ من عناصر مختلفۃ وقوی متفرقۃ کما قال اللہ تعالیٰ امشاج نبتلیہ ویقال جعلت فلانا ادمۃ اھلی ای خلطتہ بھم "

اور وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں " جعلت فلانا ادمۃ اھلی " میں نے فلاں شخص کو اپنے گھر کے افراد سے ملالیا ہے۔یعنی اسے اپنے گھر کا فرد سمجھتا ہوں۔

مطلب یہ ہوا کہ لفظ آدم لیا ہوا ہے " ادمۃ " سے جس کا معنی ہے ''خلط ملط کرنا'' اور ملانا۔ چونکہ آدم علیہ السلام میں بھی رب تعالیٰ نے مختلف عناصر (اصول) کو رکھا اور مختلف قوتیں آپ کو عطاء کیں اسی وجہ سے آپ کا نام ''آدم'' رکھ دیا۔اس پر رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی دلالت کر رہا ہے:

﴿ انا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج ﴾ ''بیشک ہم نے آدمی کو پیدا کیا ملی ہوئی منی سے''

ملی ہوئی منی (نطفہ) سے مراد ''مرد اور عورت کے نطفہ کا ملنا'' ہے۔یا نطفہ کا دوسرے عناصر سے ملنا مراد ہے۔

(۴) " وقیل سمی بذلک لما طیب بہ من الروح المنفوخ فیہ المذکور فی قولہ " ونفخت فیہ من روحی " وجعل بہ العقل والفھم والرؤیۃ التی فضل بھا علی غیرہ ، کما قال اللہ تعالیٰ " وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا " وذلک من قولھم الادام وھو ما یطیب بہ الطعام "

اور وجہ یہ ہے کہ لفظ ''آدم'' لیا ہوا ہے " ادام " سے " ادام " اسے کہا جاتا ہے جس چیز سے روٹی کو اچھی طرح کھایا جا سکے جیسا کہ سالن، سرکہ، چٹنی، اچار وغیرہ تمام چیزیوں پر ادام بولا جاتا ہے۔ چونکہ آدم علیہ السلام میں بھی رب تعالیٰ نے اپنی طرف سے خود روح کو پھونک کر آپ کو وہ کمال عطا فرما دیا کہ جس کے ذریعے آپ کو عقل کامل، فہم کامل اور بصارت وبصیرت عطا کر دی جس کی وجہ سے انسان کو

دوسری مخلوق پر فضیلت دے دی۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے:

﴿وفضلناهم علی کثیر ممن خلقنا تفصیلا﴾

ہم نے اپنی بہت سی مخلوق پر ان کو فضیلت دی ہے (از مفردات راغب)

سبحان اللہ آدم علیہ السلام کا نام ہی کیسا با کمال ہے کہ صرف نام سے ہی یہ پتہ چل گیا کہ آپ کے جسم میں مختلف رنگوں کی مٹی رکھی گئی تھی اور اس مٹی کو مختلف صفات حاصل تھیں یہی وجہ ہے کہ آپ کی اولاد میں مختلف رنگ پائے جاتے ہیں اور ان کو مختلف صفات حاصل ہیں۔ آدم علیہ السلام کا رنگ گندمی تھا۔ اور آدم علیہ السلام کو مختلف عناصر سے بنایا گیا۔ اور آپ کو مختلف قوتیں عطا کی گئیں۔ اور آدم علیہ السلام کو عقل کامل فہم کامل اور بصارت و بصیرت عطا کر کے دوسری مخلوق پر فضیلت دی جیسا کہ ادام جس روٹی سے مل جائے اسے دوسری روٹی پر فوقیت دے دیتا ہے۔

آدم علیہ السلام کی کنیت:

" آدم علیه السلام یکنی ابو البشر وقیل ابا محمد ، کنی بمحمد خاتم الانبیاء صلوات الله علیهم قاله السهیلی وقیل کنیته فی الجنة ابو محمد وفی الارض ابو البشر " (قرطبی)

" آدم علیہ السلام کی کنیت ابو البشر ہے کیونکہ آپ انسانوں کے باپ ہیں۔ اور آپ کی کنیت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کی نسبت سے ابو محمد بھی ہے "۔

جنت میں آپ کی کنیت ابو محمد ہے اور زمین میں ابو البشر، یعنی جنتیوں کو آپ کی پہچان اس انداز پر کرائی گئی کہ یہ آدم! گرچہ میرے خلیفہ ہیں میرے نبی ہیں میرے مقرب ہیں، لیکن سب سے بڑا کمال ان کو یہ حاصل ہے کہ سید الانبیاء اور خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کا باپ ہونے کا بھی شرف رکھتے ہیں۔

آدم علیہ السلام کے علوم:

" وعلم آدم الاسماء ای اسماء المسمیات کلها حتی القصعة والقصیعة " (جلالین)

" حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے یہاں تک کہ چھوٹے اور بڑے پیالے کے نام بھی بتا دیئے "

" ان اللہ تعالیٰ اطلع آدم علی المسمیات جمیعھا و علم اسماء ھا واطلع الملئکۃ علی المسمیات ولم یعلمھم اسماء ھا فاشترک آدم مع الملئکۃ فی معرفۃ المسمیات واختص آدم بمعرفۃ الاسماء بجمیع اللغات وتلک اللغات تفرقت فی اولادہ " (صاوی)

''بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کوتمام چیزوں پر مطلع کیا۔اوران تمام چیزوں کے ناموں کا علم بھی عطا کیا ۔ اور فرشتوں کوتمام چیزوں کا علم دیا لیکن ان چیزوں کے ناموں کا علم نہیں دیا۔تمام چیزوں کے علم میں آدم علیہ السلام فرشتوں کے ساتھ شریک ہیں۔لیکن ان تمام چیزوں کے ناموں کا علم صرف آدم علیہ السلام کودیا گیا ہے اس لحاظ پرآدم علیہ السلام کوخصوصیت حاصل ہے آدم علیہ السلام کوتمام چیزوں کے نام ہرزبان میں بتادیئے گئے تھےاور وہی زبانیں آپ کی اولاد میں بکھیردی گئیں۔یعنی دنیامیں جتنی زبانیں ہیں اتنی زبانیں ہی حضرت آدم علیہ السلام کو عطا کردی گئی تھیں''۔

" ومعنی تعلیمہ اسماء المسمیات انہ تعالیٰ اراہ الاجناس التی خلقھا و علمہ ان ھذا اسمہ فرس وبعیر وھذا اسمہ کذا " (مدارک)

''آپ کوتمام چیزوں کا علم دیا گیایعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے ایک ایک جنس آپ کودکھادی اوراس کا نام ہرزبان میں آپ کو بتادیا۔مثلاً گھوڑادکھایا پھر بتایااسے گھوڑا، اسپ،فرس،ہارس وغیرہ کہتے ہیں''

اسی طرح آپ کواونٹ دکھایا پھر بتایااسے اونٹ،شتر،جمل،بعیر،کیمل وغیرہ کہا جاتا ہے۔اسی طرح ایک ایک چیز کا نام ہرزبان میں آپ کو بتادیا گیا۔حضرت ابن عباس اور عکرمہ اور قتادہ اور مجاہد اور ابن جبر رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے:

" علمہ اسماء جمیع الاشیاء کلھا جلیلھا و حقیرھا "

''کہ آپ کوتمام چھوٹی اور بڑی چیزوں کے ناموں کا علم عطاء کردیا گیا''

حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے غلام سعد کہتے ہیں ۔ میں ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا ہوا تھا،آپ کے سامنے کچھ برتنوں کے ناموں کا ذکر ہوا۔کوڑے (درے) کے نام کا ذکر ہواتو آپ نے فرمایا:

﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ﴾ " آدم علیہ السلام کوتمام چیزوں کے ناموں کا علم عطا کردیا گیا"

" واللغات کلها اسماء فهی داخلة تحته "

" تمام زبانیں نام ہی ہیں اس لئے واضح بات ہے کہ آپ کو تمام زبانوں کا علم عطا کر دیا گیا تھا" (قرطبی)

" علمه اسماء جمیع الاشیاء حتی القصعة والقصیعة " (ابو سعود)

" اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطا کیا یہاں تک کہ بڑے اور چھوٹے پیالے کے نام بھی بتائیے"

" وقیل المراد بها اسماء ما کان وما یکون الی یوم القیمة وعزی الی ابن عباس رضی الله عنهما " (روح المعانی)

" بعض حضرات نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف قول منسوب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے " ما کان وما یکون " (جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونا ہے) کا علم عطا فرمایا"۔

پہلے معانی جو ذکر کئے ہیں ان اور اس معنی کے لحاظ سے مقصد ایک ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں اور ان کے ناموں کا علم عطا کر دیا، خواہ وہ پہلے پائی جا چکی ہیں یا بعد میں انہوں نے پایا جانا ہے " المراد بالاسماء صفات الاشیاء ونعوتها وخواصها " (کبیر)

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کو تمام چیزوں کی صفات اور نعتیں اور خواص تک کا علم عطا فرما دیا گیا تھا۔

" وعلمه احوالها وما یتعلق بها من المنافع الدینیة والدینویة " (البحر المحیط)

" اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں کو احوال اور جو ان کے ساتھ دینی اور دنیاوی منافع متعلق ہیں ان تمام کا علم عطاء کر دیا"

اسی طرح ایک قول کے مطابق آپ کو تمام ملائکہ کے ناموں سے مطلع کر دیا گیا۔ اور ایک قول کے مطابق آپ کو تمام ستاروں کے ناموں پر مطلع کر دیا گیا۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد حکیم ترمذی کا قول نقل کیا "اسماوہ تعالیٰ" کہ اس آیت کریمہ میں اسماء سے اسماء الٰھیہ ہیں۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا میرے نزدیک حق یہ ہے اور تمام اللہ والے بھی اسے حق مانتے ہیں اور منصب خلافت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ کو تمام اشیاء کے اسماء کا علم عطا کیا گیا ہے۔

" وهو انها اسماء الاشیاء علویة او سفلیة جوهریة او عرضیة ویقال

لها اسماء الله تعالیٰ عندهم باعتبار دلالتها علیه وظهوره فیها غیر متقیدبها "

(روح المعانی)

''وہ اشیاء خواہ علوی ہوں یا سفلی، جوہری ہوں یا عرضی ان تمام کے اسماء کو اللہ تعالیٰ کے اسماء ہی کہا جاتا ہے، کیونکہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے جلوے تمام اشیاء سے ظاہر ہوتے ہیں''۔

فائدہ: جب آدم علیہ السلام کو ماکان و ما یکون کا علم دیا گیا ہر چیز کے نام ہر زبان میں سکھائے گئے تو سید الانبیا ﷺ کے علم کا مقام کیا ہوگا۔ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان﴾ (پ ۲۷) کا ترجمہ ان الفاظ میں تحریر فرمایا ہے: ''رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا، انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا ماکان و ما یکون کا بیان انہیں سکھایا'' (کنز الایمان) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کو انسانیت کی جان کہا۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے " وما ارسلناک الا رحمة للعلمین " کی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے " العالم جسد روحه النبوة ولا قیام للجسد بدون روحه " (روح المعانی) تمام جہان ایک جسم ہے اور نبی کریم ﷺ اس کی روح ہیں جسم کا قیام بغیر روح کے ممکن نہیں۔

اسی سے روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کائنات کی جان ہیں تو یقیناً انسانیت کی بھی جان ہیں اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ میں یہ واضح کیا ہے کہ " علمه البیان " کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو " ماکان و ما یکون " کا علم عطا کیا گیا اس پر علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی الجامع لاحکام البیان کی تفسیر ملاحظہ ہو:

" (علمه البیان) وعن ابن عباس وایضا عن ابن کیسان الانسان ههنا یراد به محمد ﷺ "

یعنی " علمه البیان " میں ضمیر منصوب کا مرجع " الانسان " ہے اس سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں

" والبیان بیان الحلال والحرام والهدی من الضلال وقیل ما کان وما یکون لانه بین عن الاولین والآخرین ویوم الدین "

''اور " علمه البیان " میں بیان سے مراد یا تو حلال و حرام کا علم اور گمراہی سے ہدایت دینا اور یا جس طرح بیان کیا گیا ہے کہ بیان سے مراد " ما کان و ما یکون " (جو

ہو چکا ہے اور جو ہونا ہے) کا علم ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اولین وآخرین اور قیامت کا ذکر فرمادیا ہے''۔

یعنی آپ نے تمام گزرے ہوئے اور آنے والے واقعات اور قیامت کے احوال سے مطلع فرما دیا ہے۔تو یقیناً آپ کو " ما کان و ما یکون " کا علم حاصل ہے۔میں نے تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے اپنی کتاب ''تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان'' میں بہت سی تفاسیر کی عبارات نقل کر کے واضح کیا کہ یہاں اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی باکمال ہے۔ابھی منزل بہت دور ہے کہیں انشاء اللہ ستائیسویں پارہ میں پہنچ گیا تو مزید وضاحت کروں گا۔

﴿ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾

" ھم "ضمیر کا مرجع مسمیات ہے جس پر اسماء دلالت کر رہا ہے " انبونی " اخبرونی (مجھے خبر دو)" ھؤلاء " کا مشار الیہ مسمیات ہے۔اب مطلب یہ ہوا پھر پیش کیا ان چیزوں کو فرشتوں پر پھر کہا ان چیزوں کے ناموں کی مجھے خبر دو اگر تم سچے ہو۔

اعتراض: ھم، ضمیر تو ذوی العقول کی طرف لوٹتی ہے حالانکہ آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کا اور تمام چیزوں کے ناموں کا علم دیا گیا جن میں غیر ذوی العقول زیادہ ہیں یہاں " ھم " ضمیر کا استعمال کیسے درست ہے؟

جواب: " وفیہ تغلیب العقلاء "اس میں عقلاء کو ان کی شرافت کے پیش نظر غالب سمجھتے ہوئے "ھم" ضمیر کا استعمال کیا گیا ہے جو ذوی العقول کی طرف لوٹتی ہے(از جلالین) " ان کنتم صادقین " کا مطلب کیا؟ اس میں کئی وجوہ ہیں جو مفسرین کرام نے بیان کی ہیں۔

(۱) " ان کنتم صادقین فی انی لا اخلق اعلم منکم "

''فرشتوں کو اس پر تعجب آرہا تھا کہ جو مخلوق فساد بھی پھیلائے گی اور خونریزیاں بھی کرے گی وہ ہم سے زیادہ کیسے علم والی ہوگی''۔رب تعالیٰ نے تمام چیزوں کو فرشتوں کو پیش کر کے فرمایا کہ مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم اس چیز میں سچے ہو کہ میں تم سے زیادہ علم والی مخلوق نہیں پیدا کروں گا۔

خیال رہے کہ فرشتوں کی یہ سوچ بھی تعجب پر مبنی تھی۔ رب تعالیٰ کے ارشاد کا بھی یہی مطلب ہے کہ ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم اپنے تعجب میں سچے ہو فرشتوں کا رب تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اور نہ ہی رب تعالیٰ کی قدرت میں شک تھا۔

(۲) " ان کنتم صادقین فی انکم احق بالخلافۃ "

تم مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم اپنے اس تعجب میں سچے ہو کہ ہمیں مستحق خلافت کیوں نہیں سمجھا گیا۔

یعنی فرشتے اس پر تعجب کر رہے تھے کہ ہم رب تعالیٰ کی تسبیح وتحمید وتقدیس بیان کرتے ہیں پھر رب تعالیٰ نے ہمیں خلافت کا مستحق کیوں نہیں سمجھا۔ تو رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے علم کو ظاہر فرما کر فرشتوں کے اس تعجب کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔

(از جلالین)

(۳) " معناہ اعلمونی اسماء ھؤلاء ان علمتم انکم تکونون صادقین فی ذلک الاعلام "

تم مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم جانتے ہو اگر تم نے خبر دے دی تو یقیناً تم اس خبر دینے میں سچے ہو گے۔

(۴) " معناہ اخبرونی ولا تقولوا الا حقا وصدقا "

مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو لیکن وہ خبر حق اور سچ ہو۔ غرض اس میں یہ تھی کہ ان کے عجز کو تاکیدی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر وہ خبر دینے کی طاقت رکھتے تو یہ کہنے کا کوئی مقصد نہ رہتا (ان کنتم صادقین) اگر تم سچے ہو۔

(کبیر)

(۵) " معنی صادقین عالمین حکاہ النقاش " یعنی اس میں نقاش کا یہ قول ہے کہ اس مقام پر " صادقین " کا معنی ہی " عالمین " ہے اب مطلب یہ ہوا کہ ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم جانتے ہو۔

(قرطبی)

(۶) " ان کنتم صادقین انی لا اخلق خلقا الا و کنتم اکرم علی سنہ وافضل واعلم "

تم مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم اپنے اس گمان میں سچے ہو کہ میں کوئی مخلوق بھی پیدا کروں تو تم اس سے میرے نزدیک مکرم ہو گے اور افضل ہو گے اور زیادہ علم رکھو گے۔

یعنی فرشتوں کا خیال تھا کہ وہ مخلوق جس میں فساد پھیلانے والے اور خونریزیاں کرنے والے ہوں گے ان سے یقیناً رب تعالیٰ کے ہاں مکرم ہم ہی ہوں گے۔ افضل ہم ہی ہوں گے علم ہمارا ہی زیادہ ہوگا پھر اس مخلوق کو خلیفہ بنانے کا کیا مقصد ہوگا۔

تمام معانی کا مقصد ایک ہے:

فرشتے تعجب اور حیرانگی سے یہ سوچ رہے تھے کہ ہم رب تعالیٰ کے ہاں مکرم بھی ہیں۔ ہمیں افضلیت بھی حاصل ہے ہمیں علم بھی عطاء کیا گیا ہے ہم رب تعالیٰ کی تسبیح وتحمید وتقدیس بھی بیان کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ جس مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے وہ تو فساد پھیلانے والے ہوں گے خونریزیاں کرنے والے ہوں گے وہ مستحق خلافت کیسے ہوں گے ہمیں مستحق خلافت کیوں نہیں سمجھا گیا۔

رب تعالیٰ نے ان کی حیرانگی کو دور کرنے کے لئے ان پر یہ واضح کیا کہ تم عام مخلوق کے فساد اور ان کی خونریزیاں کو دیکھ رہے ہو تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ان میں میرے خلفاء یعنی انبیاء کرام کو کتنے علوم کی استعداد حاصل ہوگی۔ اور ان کو کتنے علوم حاصل ہوں گے یہی وجہ ہوگی ان کے خلیفہ بننے کی۔ تم بیشک مکرم ہو، فضیلت رکھنے والے ہو، علم والے ہو، لیکن انبیاء کرام سے تمہارا مقام پست ہوگا لہٰذا مستحق خلافت وہی ہوں گے۔

نتیجہ واضح ہوا:

"فمن لم یقدر علی معرفة مراتب الاشیاء لا یستحق ان یکون خلیفة علیها" (طنطاوی)

"جو ذاتیں اشیاء کی معرفت پر قادر نہیں وہ مستحق خلافت بھی نہیں" اس سے فرشتوں کا تعجب جاتا رہا حیرانگی ختم ہوگئی سمجھ گئے کہ ہاں آنے والے خلفاء کا علمی مقام کیا ہے۔

علم کی فضیلت: یہ آیت علم کی فضیلت پر دلالت کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق میں اپنی حکمت کا اظہار ان کے علم سے ہی کیا۔ اگر کوئی اور وجہ ہوتی تو اسے بھی ظاہر کیا جاتا علم کی فضیلت قرآن پاک سے، حدیث پاک سے اور سلف صالحین کے اقوال سے ثابت ہے۔

قرآن پاک سے علم کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے علم کو حکمت کہا پھر حکمت کی عظمت شان کو بیان کیا حکمت کی عظمت شان سے خود بخود علم کی عظمت شان سمجھ آ جاتی ہے۔علم کو حکمت کہا گیا اور حکمت کو قرآن پاک میں چار معانی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔مقاتل کا یہی قول ہے:

(۱) حکمت بمعنی مواعظ قرآن (قرآن پاک کے پند و نصائح) سورۃ بقرۃ میں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:﴿ وما انزل علیکم من الکتاب والحکمة ﴾ (یعنی مواعظ القرآن) اور جو تم پر نازل کیا کتاب اور حکمت اس مقام میں حکمت کا معنی قرآن پاک کی نصیحتیں ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر قرآن پاک کو نازل کیا اور اس میں پند و نصائح کو ذکر کیا۔اسی طرح سورۃ نساء میں بھی ذکر کیا گیا ﴿ وانزل علیکم الکتاب والحکمة ﴾ یہاں بھی حکمت کا معنی ''نصیحتیں'' ہے اور اسی طرح سورۃ آل عمران میں بھی حکمت اسی معنی میں استعمال ہے۔

(۲) حکمت بمعنی فہم اور علم رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ واتیناه الحکم صبیا ﴾ اور ہم نے اسے (حضرت یحیٰ کو) بچپن میں علم اور فہم عطاء کئے۔اور سورۃ لقمان میں ہے ﴿ ولقد آتینا لقمان الحکمة ﴾ اور تحقیق ہم نے لقمان کو علم اور فہم عطاء کئے۔

(۳) حکمت بمعنی نبوت، سورۃ نساء میں ذکر کیا گیا ہے ﴿ فقد آتینا آل ابراھیم الکتاب والحکمة ﴾ اور ہم نے اسے (حضرت داؤد علیہ السلام کو) نبوت عطا کی۔سورۃ ص میں بھی اسی معنی میں استعمال ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ وآتیناه الحکمة ﴾ اور ہم نے اسے (حضرت داؤد علیہ السلام کو) نبوت عطا کی۔

(۴) حکمت بمعنی قرآن پاک سورۃ نحل میں ہے ﴿ ادع الی سبیل ربک بالحکمة ﴾ اپنے رب کی راہ کی طرف قرآن پاک کے ذریعے بلاؤ۔سورۃ بقرہ میں ہے ﴿ ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا ﴾ جسے قرآن پاک کا علم عطا کر دیا گیا اسے بہت بڑی بھلائی عطاء کر دی گئی۔

یہ جتنے معانی بیان کئے گئے ہیں۔ان میں علم کا اعتبار پایا جاتا ہے۔اس لئے کہ مواعظ قرآن ہو یا فہم و علم ہو یا نبوت ہو یا قرآن ہو تمام معانی کی دار و مدار علم پر ہی ہے۔گویا کہ حکمت میں علم کا

اعتبار کیا گیا ہے۔

مقام تفکر: اللہ تعالیٰ نے عام انسانوں کو قلیل علم عطاء کیا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ﴾ تمہیں علم نہیں عطا کیا گیا مگر تھوڑا

اسی طرح دنیا کے تمام مال و دولت کو قلیل کہا گیا" قل متاع الدنیا قلیل "اے محبوب فرمادو دنیا کا مال و متاع قلیل ہے:

" فما سماه قلیلا لا یمکننا ان ندرک کمیته فما ظنک بما سماه کثیرا "

''جن چیزوں کو رب نے قلیل کہا ہے ہم ان کی مقدار کو حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تو تیرا کیا گمان ہے کہ جن کو رب تعالیٰ نے کثیر کہا ہے ان کی مقدار کیا ہوگی''

یعنی رب تعالیٰ نے انبیاء کرام کو کثیر علوم عطاء فرمائے ہیں اور انبیاء کرام کو حکمت عطا فرمائی ہے اور جن کو حکمت عطاء فرمائی گئی ان کو خیر کثیر عطا کیا گیا۔ اب خود ہی اندازہ کریں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو جو علوم کثیرہ اور خیر کثیرہ عطا کیے ہیں کیا کوئی انسان ان کی حد معلوم کر سکتا ہے؟ نہیں نہیں کبھی نہیں ان کی حد کو صرف رب تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

برھان عقلی: عقل بھی اسے مانتا ہے کہ دنیا قلیل ہے کیونکہ اس کی انتہاء ہے اس کی تعداد، اس کی مقدار اور اس کی مدت سب متناہی ہیں یعنی تمام کے ختم ہونے کی ایک حد ہے۔ لیکن علم کی نہ کوئی مقدار مقرر ہے اور نہ ہی کوئی تعداد مقرر ہے اور نہ ہی کوئی مدت مقرر ہے۔ یعنی علم نہ ختم ہونے والی چیز ہے بلکہ علم سے حاصل والی سعادات (نیک بختیاں) بھی ختم ہونے والی نہیں ہیں۔ اسی سے واضح ہو گیا کہ علم کو وہ فضیلت حاصل ہے جو تمام دنیا کے مال و دولت کو وہ مقام حاصل نہیں۔

علم کی فضیلت پر قرآن پاک سے اور دلیل:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون ﴾

''اے محبوب فرمادیں کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں''

خیال رہے کہ یہاں استفہام انکاری ہے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ علم والے اور بے علم برابر

نہیں ہو سکتے۔قرآن پاک میں سات چیزوں میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ان کی ضدیں ان کے برابر نہیں ایک یہی جس کا ابھی ذکر ہوا کہ جہالت، علم کے برابر نہیں ہو سکتی۔

دوسری چیز: ﴿قل هل يستوی الخبيث والطيب﴾

فرمادیجئے اے محبوب کیا خبیث اور طیب برابر ہو سکتے ہیں۔

خبیث سے مراد حرام اور طیب سے مراد حلال چیزیں ہیں یعنی حرام اشیاء کبھی حلال اشیاء کے برابر نہیں ہو سکتیں۔

تیسری چیز: ﴿قل هل يستوی الاعمی والبصير﴾

اے محبوب فرمادیجئے کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتے ہیں۔

یعنی تاریکیاں کبھی نور کے برابر نہیں ہو سکتیں۔

چوتھی چیز: ﴿ام هل تستوی الظلمات والنور﴾ کیا اندھیرے اور نور برابر ہو سکتے ہیں؟ یعنی تاریکیاں کبھی نور کے برابر نہیں ہو سکتیں۔

پانچویں چیز: ﴿ولا الظلمات ولا النور﴾ جنت اور نار میں فرق بیان کیا گیا کہ آگ یعنی جہنم کبھی جنت کے برابر نہیں ہو سکتی۔

چھٹی چیز: ﴿ولا الظل ولا الحرور﴾ سایہ اور حرارت برابر نہیں، یعنی حرارت سایہ کے برابر نہیں ہو سکتی۔

ساتویں چیز: ﴿وما يستوی الاحياء ولا الاموات﴾

زندہ اور مردہ برابر نہیں یعنی مردہ زندہ کے برابر نہیں ہو سکتے

ان تمام چیزوں میں بنیادی طور پر مراد علم ہی ہے کہ جہالت علم کے برابر نہیں ہو سکتی۔زیادہ تفصیل تو ہر آیت کی اس کے محل میں ہی انشاءاللہ بیان ہو گی یہاں تو اختصار سے ذکر کیا جا رہا ہے۔

قرآن پاک سے اور دلیل:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اطيعوا الله واطيعو الرسول واولی الامر منكم﴾

"اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو اولوالامر ہیں ان کی اطاعت کرو" "والمراد من اولی الامر العلماء فی اصح الاقوال لان الملوک يجب

علیهم طاعة العلماء ولا ینعکس"

"اولی الامر" سے مراد علماء ہیں تمام اقوال سے یہی قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ بادشاہوں پر واجب ہے کہ وہ علماء کی اطاعت کریں لیکن علماء پر لازم نہیں کہ وہ بادشاہوں کی اطاعت کریں"

بادشاہوں کی اطاعت کب لازم ہے اور کب لازم نہیں اس کا ذکر تفصیلی طور پر خلیفہ کی بحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔

قرآن پاک سے اور دلیل:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ یایها الذین آمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح الله لکم واذا قیل انشزوا فانشزوا یرفع الله الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات والله بما تعلمون خبیر﴾ (پ ۲۸)

"اے ایمان والو جب تم سے کہا جائے مجلسوں میں جگہ دو تو جگہ دو اللہ تمہیں جگہ دے گا اور جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو اللہ تمہارے ایمان والوں کے اور ان کے جن کو علم دیا گیا اور درجے بلند فرمائے گا اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے"

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے علم والوں کے درجات کی بلندی کا ذکر فرمایا جس سے علم کی فضیلت واضح ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ نے چار قسم کے لوگوں کے درجات کا ذکر فرمایا:

(۱) غزوہ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کرام کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے فرمایا:

﴿ انما المؤمنون الذین اذا ذکر الله وجلت قلوبهم واذا تلیت علیهم آیاته زادتهم ایمانا وعلی ربهم یتوکلون ☆ الذین یقیمون الصلوة ومما رزقنا هم ینفقون ☆ اولئک هم المؤمنون حقا لهم درجات عند ربهم ومغفرة ورزق کریم ﴾ (پ ۹)

"ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل ڈر جائیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں ان کا ایمان ترقی پائے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کریں وہ جو نماز قائم کریں اور ہمارے دیئے سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کریں۔ یہی سچے مسلمان ہیں ان کے لئے درجے ہیں ان کے رب

کے پاس اور بخشش ہے اور عزت کی روزی''۔

(۲) مجاہدین کی شان بیان کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فضل اللہ المجاھدین باموالھم وانفسھم علی القاعدین درجۃ ﴾ (پ ۵)

''اللہ تعالیٰ نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کا درجہ بیٹھنے والوں سے بڑا کیا''

(۳) صالحین کا رب تعالیٰ نے بیان فرمایا:

﴿ ومن یاتہ مومنا قد عمل الصالحات فاولئک لھم الدرجات العلی ﴾ (پ ۱۶)

''اور جو اس کے حضور ایمان کے ساتھ آئے کہ اچھے کام کیے ہوں تو ان کے درجے بلند ہوں گے''

(۴) علماء کے درجات بلند فرمائے، جو پہلے ذکر کیا جا چکا ہے:

﴿ یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات ﴾

''تمہارے ایمان والوں اور علم والوں کے اللہ تعالیٰ درجات بلند فرماتا ہے''

ان تمام پر اپنے اپنے زمانہ میں علماء کو ہی فضیلت رہی جیسا کہ بدر والوں میں خلفاء راشدین کا ہی مقام بلند تھا کیونکہ وہی تمام سے زیادہ علم والے تھے اسی طرح مجاہدین اور صالحین میں بھی علم والے ہی افضل ہوتے ہیں۔

قرآن پاک سے اور دلیل:

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے علماء کی شان کو ان الفاظ گرامیہ سے بیان کیا:

﴿ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء ﴾

''بیشک اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں''

خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں علماء کے پانچ وصف بیان کئے ہیں۔ کامل طور پر اور مجموعی طور پر وہ اوصاف علماء کو ہی حاصل ہیں۔ بلکہ یوں کہنا بھی بہتر ہوگا کہ جن علماء کو وہ پانچ اوصاف حاصل ہوں گے وہی کامل علماء ہوں گے وہ قابل تعریف ہوں گے ان کا ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں خصوصی مرتبہ ہوگا۔

(۱) رب تعالیٰ نے علماء کے کامل وصف ایمان کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا:

﴿ ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابھات

فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة و ابتغاء تاویله وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم یقولون امنا به کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب ﴾
(پ۳)

''وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری اس کی کچھ آیتیں صاف معنی رکھتیں ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں گمراہ چاہنے اوراس کا پہلو ڈھونڈنے کو اوراس کا ٹھیک پہلو اللہ کو ہی معلوم ہے اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے''۔

اس آیت میں پختہ علم والوں کو کامل ایمان والا بیان کیا گیا ان کے مقابل کم علم یا جہلاء کو ٹیڑھی راہ پر چلنے والے اور گمراہی حاصل کرنے والے کہا گیا ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے علماء کی توحید اور اسکی وحدانیت پر ان کی شہادت کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿ شهد الله انه لا اله الا هو والملائكة واولوا العلم قائما بالقسط لا اله الا هو العزيز الحكيم ﴾
(پ۳)

''اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور عالموں نے انصاف سے قائم ہوکر گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی ہے عزت والا، حکمت والا''

(۳) اللہ تعالیٰ نے علماء کے رونے اور سجدہ کرنے کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿ ان الذین اوتوا العلم من قبله اذا یتلی علیهم یخرون للاذقان سجدا ☆ ویقولون سبحن ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا ☆ ویخرون للاذقان یبکون ویزیدهم خشوعا ﴾ (پ۱۵)

''بیشک وہ لوگ جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا جب ان پر (قرآن) پڑھا جاتا ہے ٹھوڑی کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں پاکی ہے ہمارے رب کو بیشک ہمارے رب کا وعدہ پورا ہونا تھا اور ٹھوڑی کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور یہ قرآن ان کے دل کا جھکنا بڑھاتا ہے''

(۴) علماء کے خشوع کا ذکر بھی ان آیات میں ہی چکا ہے ﴿ ویزیدهم خشوعا ﴾ ''قرآن ان کے خشوع کو بڑھاتا ہے

(۵) علماء کرام کی خشیت (رب تعالیٰ سے ڈرنا) کو رب قدوسی نے ان الفاظ مبارکہ سے بیان کیا:

﴿ انما یخشی الله من عباده العلماء ﴾ ''بیشک اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں علماء ہی ڈرتے ہیں''
(از کبیر)

علم کی فضیلت احادیث مبارکہ سے:

" عن معاویة قال قال رسول اللہ ﷺ من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین وانما انا قاسم واللہ یعطی " (بخاری، مسلم مشکوۃ کتاب العلم)

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ جسے خیر کثیر عطاء فرمانے کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔ بیشک میں ہی تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے"

وضاحت حدیث:

لفظ خیر کو نکرہ ذکر کیا گیا جو تفخیم شان پر دلالت کر رہا ہے لہٰذا معنی ہوگا "خیر کثیر" (بہت بھلائی) ﴿یفقھہ فی الدین﴾ کا معنی ہے کسی کو عالم دین بنا دینا، یعنی احکام شریعت، طریقت اور حقیقت کا علم عطا کر دینا۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ فقہ صرف احکام شرعیہ عملیہ میں بند نہیں بلکہ اعتقادیات پر بھی فقہ کا اطلاق ہے البتہ زیادہ مشہور احکام شرعیہ عملیہ میں اس کا استعمال ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" انما الفقیہ الزاھد فی الدنیا الراغب فی الآخرۃ البصیر بامر دینہ المداوم علی عبادۃ ربہ "

"فقیہ وہ ہے جو دنیا میں زاہد ہو آخرت کی طرف رغبت کرنے والا ہو امور دینیہ میں نظر رکھنے والا ہو بلکہ اسے امور دینیہ میں بصارت تامہ حاصل ہو اور اپنے رب کی عبادت میں ہمیشگی کرنے والا ہو" (از مرقاۃ)

وانما انا قاسم واللہ یعطی:

ونیستم من مگر قسمت کنندہ وخدا مید ھد ھر کرا وھرچہ میخواھد از فقہ وفہم در دین وغیر آن
"اور نہیں ہوں میں مگر تقسیم کرنے والا جسے خدا دیتا اور جو کچھ دیتا ہے خواہ دین میں علم وفہم ہو یا اس کے بغیر" (اشعۃ اللمعات)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی رحمت کے خزانوں سے جو کچھ عطا فرماتا ہے وہ میں ہی تقسیم کرنے والا ہوں۔ رب تعالیٰ کسی کو علم دے تو میرے ذریعے ہی دیتا ہے کسی کو رزق حلال دے تو وہ میرے ذریعے ہی عطا کرتا ہے۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے بھی مختلف قول نقل فرمائے کہ نبی کریم صرف علم تقسیم فرمانے والے ہیں، یا رزق حالال بھی۔ اس کے بعد ذکر فرماتے ہیں " والاظهر ان لا منع من الجمع وان كان المقام يقتضى العلم " اگرچہ مقام چاہتا ہے کہ یہاں علم کی تقسیم ہی مراد ہو کیونکہ اس سے پہلے علم کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ رب تعالیٰ کے تمام خزانے مراد لینے میں کوئی مانع (منع کرنے والی چیز) نہیں۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لاحسد الا فى اثنين رجل آتاه الله مالا فسلطه على هلكته فى الحق ورجل آتاه الله الحكمة فهو يقضى بها ويعلمها " (بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب العلم)

" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سوائے دو شخصوں کے کسی پر رشک نہیں کرنا چاہیے ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہو پھر اسے اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہو اور دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت (علم) عطا کیا ہو وہ اس کے مطابق فیصلے کرے اور دوسروں کو تعلیم دے "

حدیث پاک کا جس انداز پر ترجمہ کیا ہے اس سے حدیث پاک کو سمجھنا آسان ہے، زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔

☆ " عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ...... ومن سلك طريقا يلتمس فيه علما سهل الله له به طريقا الى الجنة وما اجتمع قوم فى بيت من بيوت الله يتلون كتاب الله ويتدارسونه بينهم الا نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة وحفتهم الملائكة وذكرهم الله فيمن عنده " (مسلم، مشکوۃ کتاب العلم)

" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے راہ اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اس شخص کے لئے جنت کی راہ آسان فرما دیتا ہے۔ اور جب بھی کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتی ہے اور اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور ایک

دوسرے کو پڑھاتے ہیں تو ان پر آرام وسکون نازل ہوتا ہے اور ان کو رحمت ڈھانپ لیتی ہے۔ اور ملائکہ ان کا احاطہ کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر فرماتا ہے جو اس کے حضور ہوتے ہیں"

وضاحت حدیث:

"من سلک طریقا" سے مراد عام ہے خواہ وہ اپنے گھر سے قریب ہی علم حاصل کرنے کے لئے جائے یا کہیں دور کا سفر اختیار کرے: "یلتمس فیه علما" میں علم سے مراد عام ہے خواہ وہ تھوڑا علم حاصل کرنے کی غرض سے گھر سے باہر جائے یا زیادہ علم حاصل کرنے کے لئے جائے۔ البتہ علم سے مراد دین کا علم ہے اور یہ شرط ہے کہ اس میں نیت اللہ کا قرب حاصل کرنا خود نفع حاصل کرنا اور غیروں کو نفع پہنچانا مقصود ہو۔ ضمناً یہ بھی سمجھ آ گیا کہ دینی علوم کے حاصل کرنے کے لئے گھر کو چھوڑ کر باہر جانا مستحب ہے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کو پسند ہے:" سهل الله به طریقا الی الجنة "علم کے حاصل کرنے کی وجہ سے راہ پر چلنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس شخص کے لئے جنت کی راہ آسان کر دیتا ہے: " وما اجتمع قوم فی بیت من بیوت الله "اللہ کے گھر کہہ کر یہود اور انصاری کے عبادت خانوں کو نکال دیا، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کے بعد پہلے دین منسوخ ہو گئے ان کے عبادت خانوں کی حیثیت بھی ختم ہو گئی۔

> " والعدول عن المساجد الی بیوت الله لیشمل کل ما یبنی تقربا الی الله تعالیٰ من المساجد والمدارس والربط "
>
> "مساجد نہیں ذکر فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے گھر کہا ہے تا کہ مراد ہر وہ مقام ہو جائے جو بھی اللہ تعالیٰ کے تقرب کے لئے بنایا گیا ہو خواہ مساجد ہوں، یا دینی مدارس ہوں، یا ایسی سرائے جس میں تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری ہو، یا اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہو"۔

﴿یتلون کتاب الله﴾ اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن پاک کی وہ تلاوت کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ اگرچہ قرآن پاک کا صرف پڑھنا بھی ثواب ہے جیسا کہ مقدمہ میں، میں نے ذکر کر دیا ہے لیکن اس مقام میں قرآن کو پڑھنا اور اس کے معانی کو سمجھنا بھی مراد ہے۔

﴿ویتدارسونه بینهم﴾ تدارس کا مطلب ہے بعض کا بعض پر پڑھنا تا کہ الفاظ کی ادائیگی صحیح ہو اور معانی کی وضاحت حاصل ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد دینی مدارس کی پڑھائی مراد ہو۔

﴿نزلت علیھم السکینة﴾ ،سکینة کا معنی وقار اور خشیت جس سے سکون قلب، اطمینان اور وقار حاصل ہو جائے اور انوار کا دل پر نزول ہو، اور بعض حضرات نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن پاک پڑھنے سے نورانیت حاصل ہو جس سے دل کی صفائی حاصل ہو اور ظلمات نفسانیہ دور ہوں اور ذوق وشوق حاصل ہو۔

اسی طرح " سکینة " کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے جو قرآن پاک پڑھنے اور پڑھانے والے مؤمنین کے دلوں کو تسلی دیتا ہے اور ان کو امن دیتا ہے اور ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے۔

﴿وغشیتھم الرحمة﴾ ،رحمت ان پر بلند ہوتی ہے اور ان کے پاس رحمت آتی ہے اور ان پر چھا جاتی ہے۔

﴿و حفتھم الملائکة﴾ رحمت و برکت کے فرشتے ان کا احاطہ کرتے ہیں، اور ان کے اور ان کے گھروں کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ فرشتے آسمان دنیا تک ان کے ارد گرد ہوتے ہیں ان کا قرآن پاک پڑھنا اور پڑھانا سنتے ہیں۔ اور آفات وبلیات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور ان کی زیارت کرتے ہیں اور ان سے مصافحہ کرتے ہیں اور ان کی دعاء پر آمین کہتے ہیں۔

﴿وذکرھم اللہ فیمن عندہ﴾ اللہ تعالیٰ ملأ اعلیٰ اور فرشتوں کے طبقہ اولیٰ میں ان لوگوں کی بلندی شان کا ذکر فرماتا ہے اور کہتا ہے " انظروا الی عبیدی یذکروني ویقرؤن کتابی " میرے بندوں کو دیکھو جو میرا ذکر کر رہے ہیں اور میری کتاب پڑھ رہے ہیں۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن کثیر بن قیس قال کنت جالسا مع ابی الدرداء فی مسجد دمشق فجاءہ رجل فقال یا ابا الدرداء انی جئتک من مدینة الرسول ﷺ لحدیث بلغنی انک تحدثہ عن رسول اللہ ﷺ ما جئت لحاجة قال فانی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من سلک طریقا یطلب فیہ علما سلک اللہ بہ طریقا من طرق الجنة وان الملائکة لتضع اجنحتھا رضا لطالب العلم وان العالم یستغفرلہ من فی السموات ومن فی الارض والحیتان فی جوف الماء وان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب وان العلماء ورثة الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما وانما ورثوا العلم فمن اخذہ اخذ بحظ وافر " (رواہ احمد والترمذی، وابوداؤد وابن ماجہ والدارمی مشکوۃ کتاب العلم)

''کثیر بن قیس (ترمذی نے قیس بن کثیر ذکر کیا ہے) کہتے ہیں میں حضرت ابوالدرداء کے پاس دمشق کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا ایک شخص ان کے پاس آیا اس نے کہا اے ابوالدرداء بیشک میں تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ کے شہر (مدینہ طیبہ) سے آیا ہوں ایک حدیث (تم سے سننے) کے لئے مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بیان کرتے ہو۔ میرے آنے کی اور کوئی وجہ نہیں۔ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے کسی راستہ پر چلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس شخص کو جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ پر چلاتا ہے۔ اور بیشک ملائکہ طالب علم کی رضا کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ اور بیشک عالم کے لئے زمین و آسمان کی تمام مخلوق مغفرت طلب کرتی ہے۔ اور پانی میں مچھلیاں اس کے لئے مغفرت طلب کرتی ہیں۔ اور بیشک عالم کو عابد پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے چودویں کے چاند کو باقی ستاروں پر فضیلت حاصل ہے، اور بیشک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور بیشک انبیاء دراھم و دنانیر وراثت کے طور پر نہیں چھوڑتے۔ وہ علم کو بطور وراثت چھوڑ کر جاتے ہیں۔ جس نے علم کو حاصل کیا اس نے بہت کامل حصہ حاصل کر لیا۔

وضاحت حدیث:

یہی حدیث جو حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے بیان کی اسے ہی سننے کیلئے وہ شخص حاضر ہوئے تھے۔ انہیں اس حدیث کے متعلق اجمالی پر علم حاصل ہوا تھا۔ تفصیلی طور پر سننا چاہتے تھے، یا ان کا خیال تھا کہ میں نے یہ حدیث واسطہ سے سنی تھی لیکن میں چاہتا ہوں آپ سے براہ راست سنوں۔

کیا خوب علم دین سے سلف صالحین کی محبت تھی کہ مدینہ طیبہ سے ملک شام میں ایک حدیث سننے کے لئے وہ شخص گئے جب کہ اس وقت اتنا سفر کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اور کوئی مقصد بھی نہیں تھا کہ کسی کام کے لئے گئے ہوں اور حدیث سننے کا ارادہ بن گیا ہو۔ بلکہ صرف ایک حدیث سننے کے لئے گئے۔ شرح السنۃ میں امام ثوری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا گیا ہے وہ فرماتے ہیں: ''**ما اعلم الیوم شیأ افضل من طلب العلم**'' علم کے طلب کرنے سے کسی چیز کو میں افضل نہیں سمجھتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''**طلب العلم افضل من صلوۃ النافلۃ**'' علم کا طلب کرنا نفل نماز سے افضل ہے۔ اس کی وجہ علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لانه اما فرض عین او فرض کفایة وھما افضل من النافلة "

''اس لئے کہ علم حاصل کرنا یا فرض عین ہے یا فرض کفایہ ہے وہ دونوں ہی نفل نماز سے افضل ہیں۔ واضح ہوا کہ علم حاصل کرنا نفلی نماز سے افضل ہے''

فرشتوں کے پر بچھانے کا مطلب کیا ہے؟

" قیل معناہ انھا تتواضع لطالبہ توقیرا لعلمہ کقولہ تعالیٰ واخفض لھما جناح الذل من الرحمة "

''بیان کیا گیا کہ فرشتوں کے پر بچھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طالب علم کے علم کی عزت کی خاطر عجز کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے والدین کے لئے پر بچھانے کا حکم دیا ہے مراد اس سے بھی یہی ہے کہ والدین کے سامنے تواضع (عجز) اختیار کرو''

" او المراد الکف عن الطیران والنزول للذکر " اور اس کا یہ مطلب ہے کہ فرشتے طالب علم کی علمی بحثوں کو سننے کے لئے اڑنے سے رک جاتے ہیں اپنے پر زمین پر بچھا دیتے ہیں "والمراد حقیقة وان لم تشاھد" اور یہ معنی مراد لینا بھی کوئی بعید نہیں کہ وہ حقیقۃ اپنے پر بچھا دیتے ہیں اگر چہ ہم اس کا مشاہدہ نہ کرسکیں۔ یعنی وہ حقیقی طور پر طالب علم کی عزت و توقیر کے لئے اپنے پر بچھا دیتے ہیں کہ طالب علم ان پہ چلے۔

حدیث پاک سے مزاح اڑانے والوں کا انجام:

احمد بن شعیب کہتے ہیں ہم بصرہ میں بعض محدثین کے پاس تھے، ہم نے یہی حدیث بیان کی وہاں ایک معتزلی طالب علم بھی موجود تھا وہ مزاح اڑاتے ہوئے کہنے لگا اچھا کل میں راستہ میں چلتے ہوئے اپنے جوتے زور زور سے زمین پر ماروں گا تا کہ فرشتوں کے پروں کو اپنے پاؤں اور جوتوں سے روند ڈالوں، دوسرا دن ہوا اس نے ایسا ہی کیا " ومشی فی النعلین فجفت رجلاہ ووقعت فیھما الاکلة " اور اپنے جوتے پہن کر تکبرانہ انداز پر فرشتوں کے پروں کو (معاذ اللہ) روندنے کی غرض سے چلا ہی تھا کہ اسکے دونوں پاؤں شل ہو گئے ان میں ایسی جلن پیدا ہوئی کہ وہ کھوکھلے ہو کر رہ گئے۔

طبرانی کہتے ہیں میں نے ابن یحیی ساجی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم بصرہ کی گلی، کوچہ میں چل رہے تھے کیونکہ ہم ایک محدث کے پاس علم کے حصول کی غرض سے جا رہے تھے ہمارے ساتھ ایک شخص تھا جو

مفت کا دیندار بنا بیٹھا تھا، حقیقت میں اسے دین سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ طنز اڑاتے ہوئے کہنے لگا اپنے پاؤں کو فرشتوں کے پروں سے اٹھا اٹھا کر چلو کہیں ان کے پر توڑ نہ دینا، اس کا یہ کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک سے مزاح اڑانا تھا:

" فما زال عن موضعه حتى جفت رجلاه وسقط الى الارض "

''ابھی وہ اپنی جگہ سے ہٹا بھی نہیں تھا یہاں تک کہ اس کے پاؤں شل ہو گئے اور زمین پر گر گیا''

عالم کے لئے استغفار:

زیر بحث حدیث پاک میں مذکور ہے کہ عالم کے لئے زمین والے اور آسمان والے مغفرت طلب کرتے ہیں اور پانی میں مچھلیاں مغفرت طلب کرتی ہیں۔ آسمان والے عالم دین کی مغفرت کیسے طلب کرتے ہیں ان کو کیسے پتہ چلا کہ وہ شخص عالم دین تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے " **لانهم عرفوا بتعريف العلماء وعظموا بقولهم** " آسمان والے علماء کی تعریف اور عظمت کے بیان سے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ یہ لوگ عظیم مرتبہ کے مالک ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ زمین والے علماء کے لئے استغفار کیوں کرتے ہیں " **لان بقائهم وصلاحهم مربوط برائى العلماء وفتواهم** " اس لئے کہ زمین کی مخلوق کی بقاء اور ان کی بہتری کی دارومدار علماء کی رائے اور فتوی کے ساتھ ہی متعلق ہے:

" ولذلک قيل ما من شئى من الموجودات حيها وميتها الاوله مصلحة متعلقة بالعلم "

''اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ تمام موجودات خواہ زندہ ہوں یا مردہ ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس کی مصلحت علم سے متعلق نہیں''

مچھلیوں کی عالم کے لئے استغفار کی کیا وجہ ہے؟

" **وقال الطيبى تخصيص الحيتان للدلالة على ان انزال المطر ببركتهم حتى ان الحيتان تعيش بسببهم وفى الحديث بهم تمطرون وبهم ترزقون** "

''مچھلیاں علماء کے لئے اس لئے مغفرت طلب کرتی ہیں کہ علماء کی برکت سے بارش برستی ہے گویا کہ مچھلیوں کی زندگی کی دارومدار بھی علماء پر ہے کیونکہ مچھلی کی زندگی پانی پر ہے پانی کا حصول بارش سے ہے اور بارش کا حصول علماء سے ہے۔ حدیث پاک میں

بھی ذکر ہے کہ تمہیں علماء کی برکت کی وجہ سے ہی بارش حاصل ہوتی ہے اور ان کی برکت کی وجہ سے ہی تمہیں رزق دیا جاتا ہے"

عالم اور عابد سے کیا مراد ہے؟ عالم سے مراد وہ عالم ہے جو فرائض اور سنت مؤکدہ کو ادا کرے لیکن زیادہ وقت تعلیم و تعلم میں مشغول رہے عالم سے مراد وہ عالم نہیں جو بے عمل ہو فرائض اور سنت مؤکدہ کا بھی تارک ہو۔ اسی طرح عابد سے مراد خالص جاہل مراد نہیں ۔ بلکہ جو صاحب علم تو ہو۔ لیکن زیادہ وقت عبادات میں مشغول رہے اور تعلیم و تعلم سے دور رہے ۔ یعنی عالم سے مراد جس کے علم کو عبادت پر غلبہ حاصل ہے اسی طرح عابد سے مراد جس کی عبادت اس کے علم پر غالب ہو۔ عالم کو عابد پر اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ عالم سے اور لوگ بھی فائدہ حاصل کرتے ہیں ۔ اس کی طرف سے اور لوگوں کو بھی نفع حاصل ہوتا ہے لیکن عابد کی عبادت اس کی اپنی ذات تک موقوف رہتی ہے۔

ایک عظیم نکتہ: اس حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے عالم کو چودھویں کے چاند سے اور عابد کو ستاروں سے تشبیہ دی ارشاد فرمایا:

" ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب "

" بے شک عالم کو عابد پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے چودھویں کے چاند کو ستاروں پر فضیلت حاصل ہے"

دوسری حدیث شریف میں آپ کا ارشاد گرامی ہے:

" فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم "

" عالم کو عابد پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے تم میں سے کسی ادنی پر فضیلت حاصل ہے"

دونوں حدیثوں کا ایک ہی مطلب ہے کیا خوب علامہ علی قاری رحمۃ اللہ نے بیان فرمایا ذرا سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔

" کفضل القمر لیلة البدر ای لیلة الرابع عشر وبه اول طه علی حساب الجمل و اريد به النبی ﷺ يعنی المشبه به فی نهاية النور وغاية الظهور فيكون فيه تلميح الی قوله كفضلی علی ادنا كم كمافی قوله (علی سائر الكواكب) ايماء الی قوله اصحابی كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم فان نور المؤمن ولو كان عابدا ضعيف اذا لم ی كن عالما " (مرقاة)

عابد کو نبی کریم ﷺ نے ستاروں سے تشبیہ دی اور عالم کو چودھویں کے چاند سے کیونکہ مومن جب تک عالم نہ ہو بیشک عبادت گزار ہی کیوں نہ ہو اس کا نور کم ہوتا ہے اور عالم کو نورانیت زیادہ حاصل ہوتی ہے "لیلة البدر" کا معنی چودھویں رات ہے جیسا کہ بعض حضرات نے "طه" کا بحساب ابجد بھی معنی چودھویں کا چاند مراد لیا ہے یہاں چودھویں کے چاند سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں جیسا کہ دوسری حدیث پاک میں واضح طور پر فرمایا کہ عالم کو عابد پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے تم میں سے کسی ادنی پر فضیلت حاصل ہو۔

چاند سے تشبیہ دی کہ اس کی نورانیت اور اس کے ظاہر ہونے کو تو لوگ مانتے ہی ہیں ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں نبی کریم ﷺ کی نورانیت بھی آ جائے حدیث شریف میں ستاروں سے مراد صحابہ کرام ہیں کیونکہ دوسری حدیث میں صحابہ کرام کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں ان میں جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ (از مرقاۃ)

علماء انبیاء کرام کے وارث:

انبیاء کرام کو یقین ہوتا ہے کہ دنیا فانی ہے وہ دنیا سے محبت نہیں کرتے مال و دولت جمع نہیں کرتے صرف گزراوقات کے لئے ان کے پاس مال ہوتا ہے، وہ بھی بطور وراثت تقسیم نہیں ہوتا۔ تا کہ یہ کوئی نہ کہے کہ شائد انہوں نے ورثاء کے لئے یہ مال جمع کیا تھا۔ لیکن علم باقی رہنے والی چیز ہے وہی ان کی وراثت ہوتی ہے اس کے حقدار بھی خاص اپنے اہل و عیال ہی نہیں ہوتے بلکہ امت کا جو فرد بھی حاصل کرنا چاہے وہی حاصل کر لے۔

اسی مسئلہ کو ایک اور حدیث سے سمجھئے:

"ابو هريرة مر يوما في السوق بقوم مشتغلين بتجاراتهم فقال انتم ههنا وميراث رسول الله ﷺ يقسم في المسجد فقاموا سراعا اليه فلم يجدوا فيه الا القرآن والذكر ومجالس العلم فقالوا اين ما قلت يا ابا هريرة فقال هذا ميراث محمد ﷺ يقسم بين ورثته وليس بمواريثه دينا كم" (مرقاة ج ۱ ص ۲۸۱)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک دن بازار سے گزرے لوگ اپنی اپنی تجارت میں مشغول تھے تو آپ نے فرمایا تم یہاں ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت مسجد میں تقسیم ہو رہی ہے۔ لوگ جلدی جلدی مسجد میں آ گئے۔ وہاں سوائے قرآن پاک پڑھنے، ذکر کرنے اور علمی مجالس کے انہوں نے کچھ نہ پایا وہ کہنے لگے اے ابو ہریرہ جو تم کہہ رہے تھے وہ کہاں ہے آپ نے فرمایا نبی کریم ﷺ کی وراثت یہی ہے (جو تم مسجد میں دیکھ رہے ہو) جو آپ کے ورثاء میں تقسیم کی جا رہی ہے آپ کی وراثت تمہاری دنیا کا مال و دولت نہیں''

فوائد:

'' الصوفی لا یملک ولا یملک وفیه ایماء الی کمال توکلهم علی الله تعالیٰ فی انفسهم و اولادهم ''

''صوفیاء کرام، اولیاء عظام کسی چیز کے نہ مالک ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی کو مالک بناتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر ان کو اپنی جانوں اور اپنی اولاد کے متعلق کامل توکل ہوتی ہے۔

خیال رہے کہ رزق حلال، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہونے والا مال قابل تعریف ہے اسی لئے بعض اولیاء کرام نے شاہی میں فقیری کی، یعنی مال و دولت حاصل ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے مقرب رہے۔ اور بعض اولیاء کرام نے فقیری میں شاہی کی یعنی ان کے پاس مال و دولت تو زیادہ نہیں تھا لیکن بے نیازی سے وہ وقت کے بادشاہوں سے زیادہ (تھوڑے مال پر صابر و شاکر رہنے کی وجہ سے) مطمئن رہے۔

☆ '' وفیه اشعار بان طالب الدنیا لیس من العلماء الورثة ''

اسی حدیث پاک سے یہ سمجھ میں آیا کہ دنیا کو طلب کرنے والے علماء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث نہیں بن سکتے۔ مقصد صرف دین کی خدمت ہو رب تعالیٰ کی مہربانی سے اگر مال بھی حاصل ہو جائے تو اسے رب تعالیٰ کا فضل ہی سمجھے۔

☆ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' اقل العلم بل اقل الایمان ان یعرف ان الدنیا فانیة وان العقبیٰ باقیة ''

''کم از کم علم کا درجہ بلکہ ایمان کا کم درجہ یہ ہے کہ آدمی کو یہ معلوم ہو کہ دنیا فانی اور آخرت باقی رہنے والی ہے''۔

اس علم کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ فانی چیز سے اعراض کرے گا اور باقی رہنے والی چیز کی طرف متوجہ ہوگا
(از مرقاۃ)

اعتراض: نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت آپ کے پاس فدک اور خیبر وغیرہ کی زمین تھی۔ اور حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کے وصال کے مطابق ان کے پاس بھی کثیر مال تھا۔ تو کس طرح درست ہوگا کہ انبیاء کی وراثت مال نہیں ہوتا۔

جواب:

" ان المراد انه ما ورثت اولادهم وازواجهم شيأ من ذلك بل بقى بعدهم معدا لنوائب المسلمين "

''بیشک مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام کے پاس اگر کوئی مال دولت آیا بھی تو وہ ان کی اولاد اور ان کی بیویوں میں وہ بطور وراثت تقسیم نہیں ہوا بلکہ انکے بعد وہ مسلمانوں کی حاجات کیلئے وقف رہا''۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ تعلموا الفرائض والقرآن وعلموا الناس فانى مقبوض "
(رواہ الترمذی، مشکوۃ کتاب العلم)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم فرائض حاصل کرو، قرآن کا علم حاصل کرو اور لوگوں کو علم سکھاؤ، بیشک میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں''۔

وضاحت حدیث:

علم فرائض سے مراد ''علم میراث'' اور جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے اس کا علم، اوامر و نواہی کا علم، حدیث پاک کا علم۔ آخری معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے (راقم) تا کہ اس کا مفہوم یوں واضح ہو جائے " تعلموا الكتاب والسنة " قرآن اور حدیث کا علم حاصل کرو، یہ معنی جب مراد ہوگا تو دوسرے معانی خود بخود اس میں داخل ہو جائیں گے۔

" وعلموا الناس فانى مقبوض، اى سا قبض وينقطعان "

''لوگوں کو بھی علم فرائض اور قرآن کی تعلیم دو ایسا نہ ہو کہ میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو علوم ختم نہ ہو جائیں''

(از مرقاۃ)

موجودہ دور میں ایک حدیث پاک سے مغالطہ دینے کی کوشش:

"عن ابی هريرة رواية يوشک ان يضرب الناس اكباد الابل يطلبون العلم فلا يجدون احدا اعلم من عالم المدينة" (ترمذی، مشکوۃ، کتاب العلم)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوع روایت بیان کرتے ہیں کہ عنقریب لوگ علم کی طلب کے لئے سفر کریں گے لیکن مدینہ طیبہ کے عالم سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں پائیں گے"۔

اسی حدیث پاک سے لوگوں کو مغالطہ دینے کی یہ کوشش کی جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں علم والوں کی تعریف کی ہے لہٰذا آج کل مدینہ میں رہنے والے ہی بڑے عالم ہیں انکے اقوال کو ہی دین سمجھا جائے۔ یہ بالکل غلط ہے، حدیث پاک کا مفہوم غلط بیان کرنے کی ناپاک کوشش ہے۔ آیئے علامہ علی قاری رحمہ اللہ سے حدیث پاک کی وضاحت پوچھئے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

"(فلا يجدون احدا) اى فى العالم (اعلم من عالم المدينة) قيل هذا فى زمان الصحابة والتابعين واما بعد ذلک فقد ظهرت العلماء الفحول فى كل بلدة من بلاد الاسلام اكثر ما كانوا بالمدينة فالا ضافة للجنس وقيل المراد به ذاته عليه الصلوة والسلام فالاضافة للعهد" (مرقاۃ ج ۱ ص ۳۰۱)

"عالم المدينة" میں اضافت پائی گئی ہے اس اضافت میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ اضافت جنس کے لئے ہو اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اضافت عہد کے لئے ہو۔ پھر اضافت جنس کے لئے ہو تو اس سے مراد صحابہ کرام اور تابعین کرام ہیں۔ اب معنی یہ ہوگا کہ لوگ علم حاصل کرنے کے لئے سفر کریں گے۔ ان کو جہان میں کہیں بھی میرے صحابہ اور ان کے بعد آنے والے تابعین جو زیادہ طور پر مدینہ طیبہ میں ہوں گے ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ملے گا"۔

ورنہ بعد میں عالم اسلام کے شہروں میں سے ہر شہر میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء کرام پائے گئے ہیں اور اگر اضافت عہد کے لئے ہو تو مراد خود نبی کریم ﷺ کی ذات ہوگی۔ اب معنی یہ ہوگا کہ عنقریب لوگ سفر کریں گے علم حاصل کرنے کے لئے لیکن جہان میں ان کو کہیں بھی مدینہ طیبہ میں رہنے والے عالم سے زیادہ کوئی عالم نہیں ملے گا وہ مدینہ طیبہ میں رہنے والا عالم تو میں خود ہی ہوں۔ دنیا کے لوگ تمام جہان میں پھر کر تو دیکھ لیں کیا مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی عالم انہیں نظر آئے گا۔

راقم کے نزدیک اضافت عہد کے لئے ہی راجح قول ہے جسے دو وجہ سے تائید حاصل ہے۔ایک لفظ " یوشک " ذکر ہے۔وافعال مقاربہ سے ہے۔جس کا حقیقی معنی ہی ''قریب ہونا'' ہے حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی لینے کی کوئی ضرورت اور مجبوری نہیں۔دوسری تائید لفظ " اعلم من عالم المدینة " سے مل رہی ہے۔جس میں مفرد الفاظ کا استعمال ہے۔بلکہ تیسری وجہ ترجیح بھی ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین کے زمانہ میں ہی مدینہ طیبہ کے باہر ہی بڑے بڑے علماء موجود تھے جو صحابہ کرام اور تابعین سے ہی تھے۔

☆ **" وعن انس قال قال رسول الله ﷺ طلب العلم فریضة علی کل مسلم وواضع العلم عند غیر اهله کمقلد الخنازیر الجوهر واللؤلؤ والذهب "**

(رواه ابن ماجه وروی البیهقی فی شعب الایمان الی قوله مسلم . مشکوة کتاب العلم)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا علم کا طلب کرنا ہر مسلم پر فرض ہے۔اور علم کو غیر اہل کے پاس رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ خنزیروں کے گلے میں جواہر اور موتیوں اور سونے کے ہار ڈالنے والا ہو''۔

وضاحت حدیث:

" (طلب العلم) ای الشرعی (فریضة) ای مفروض فرض عین (علی کل مسلم) او کفایة "

''حدیث پاک میں جس علم کا ذکر ہے وہ علم شرعی مراد ہے یعنی شریعت کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے فرض عین ہے یا فرض کفایہ ہے''

خیال رہے کہ شرعی علم حاصل کرنا ہر مسلمان ''مرد ہو یا عورت'' کے لئے فرض ہے۔قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں بہت جگہ مذکر کے صیغے استعمال ہیں۔جن سے مراد مؤنث بھی ہیں۔اور علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے تو یہ بھی بیان کیا ہے "ومسلمة کما فی روایة " کسی ایک روایت میں "مسلمة " کا ذکر بھی ہے ''علم فرض عین'' یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہو کہ رب تعالیٰ کی ذات موجود ہے اور وہ واحد لاشریک لہ ہے۔اور نبوت کا علم اور نماز کی کیفیت کا علم ہو وغیرھا۔''علم فرض کفایہ'' تفصیلی طور پر شرعی علوم کو حاصل کرنا کہ درجہ افتاء واجتہاد حاصل کرنا۔

غیر اھل کون ہے؟

" وواضع العلم عند غير اهله ، بان يحدثه من لا يفهمه او من يريد منه غرضا دنيويا اومن لا يتعلمه لله "

'' جس شخص کو تعلیم دی جائے وہ اسے سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، یا اس کا علم حاصل کرنا دنیا کی غرض کے لئے ہو یا وہ اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے لئے علم حاصل نہ کرے وہ نااہل ہے''۔

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر علم ایسے شخص کو پڑھایا گیا جس میں اس کی استعداد پائی گئی ہو تو وہ اس کا اہل ہے نااہل شخص کو علم عطاء کرنا ظلم ہے جس طرح اخس (بہت ہی گھٹیا) جانور کے گلے میں قیمتی جواہر، موتیوں اور سونے کا ہار ڈال کر مال ضائع کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا جائے۔

اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا:

" حدثوا الناس بما يفهمون او يعرفون اتحبون ان يكذب الله ورسوله "

'' لوگوں سے بات کرو جسے وہ سمجھتے ہوں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کی جائے ''

یعنی ایسے نااہل سے کوئی علمی بات نہ کریں جو سوچنے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرے بلکہ انکار ہی کرتا چلا جائے " **وعلى العالم ان يخص كل طالب بما هو مستعد له** " عالم کے لئے ضروری ہے کہ ہر طالب علم جتنی اہلیت رکھے اسی طرح کا اسے علم پڑھایا جائے (چھوٹی کلاسوں کو مشکل مسائل پڑھا کر اپنی علمت کو ظاہر کرنے والے دراصل جاہل ہوتے ہیں)۔

تنبیہ: اس حدیث کو بیھقی نے بیان کرنے کے بعد کہا ہے " **واسناده ضعيف** " اور اس کی سند ضعیف ہے:" **وقال الجزری فی البداية الا اصل له ای ليس له اصل صحيح** " جزری نے بدایہ میں بیان کیا ہے کہ اس کی اصل صحیح نہیں " **ولكن قال العراقی قد صحح بعض الائمة** " لیکن عراقی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو بعض ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے کہا:

" ولكن كثرة الطرق تدل على ثبوته ويقوى بعضه ببعض "

'' اگرچہ بیہقی نے ضعیف کہا ہے لیکن کثرت طرق سے ثابت ہے، اس لئے بعض اسناد

کو بعض سے تقویت حاصل ہے"

" قال المزی تلمیذ النوی ان طرقه تبلیغ رتبة الحسن"

"مزی رحمہ اللہ جو علامہ نووی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں وہ فرماتے ہیں کہ یہ متعدد طرق سے ثابت ہونے کی وجہ حسن کے مرتبہ تک پہنچی ہوئی ہے"۔

" وقال العلقمی فی شرح الجامع الصغیر رایت له خمسین طرق جمعتها فی جزء وحکمت بصحته لکن من القسم الثانی وهو الصحیح بغیره"

"علقمی نے جامع صغیر کی شرح میں بیان کیا ہے کہ میں نے اس حدیث کے پچاس سند کے طریقے دیکھے ہیں ان تمام کو میں نے "جزء" میں جمع کیا ہے۔ اور میں نے اس حدیث کے صحیح ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ البتہ یہ صحیح کی قسم ثانی ہے یعنی "صحیح لغیرہ" ہے۔ (از مرقاۃ ج ۱ ص ۲۸۵)

راقم نے یہ بحث اس لئے تحریر کر دی کہ بعض بدطینت لوگ صرف جزری کا قول پیش کر کے راقم پر معترض نہ ہوں کہ یہ حدیث کیوں نقل کی کیا صرف جزری کے قول کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر قبول کر لیا جائے اور باقی تمام بزرگوں کے اقوال کو رد کر دیا جائے یہ کون سا انصاف ہے۔ ایک ایک قول کو لے کر جب بعض وہ جہلاء جو علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی کتب کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی عاری ہیں علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے متعلق یوں لکھتے ہیں کہ ان کی کتب میں موضوع حدیثوں کو درج کیا گیا ہے" تو مجھے بڑا ہی افسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ سنیت کا لبادہ اوڑھ کر منافقت کے طور پر اغیار کا کام کر رہے ہیں " اللھم انا نعوذبک من الجاهلین الشیاطین المفسدین"

☆ " قال علیه السلام معلم الخیر اذا مات بکی علیه طیر السماء ودواب الارض وحیتان البحور"

(کبیر)

نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا دینی علم کی تعلیم دینے والا عالم جب فوت ہوتا ہے تو اس پر آسمانوں کے پرندے اور زمین کے جانور اور دریاؤں کی مچھلیاں روتی ہیں۔

☆ "حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مرفوع حدیث روایت کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" رحمة الله علی خلفائی فقیل من خلفاؤک یا رسول الله قال الذین یحیون سنتی ویعلمونها عباد الله"

(کبیر)

"اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو میرے خلفاء پر آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ آپ کے خلفاء کون ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ لوگ جو میری سنت کو زندہ کرتے ہیں اور اللہ کے بندوں

کو اس کی تعلیم دیتے ہیں''۔

☆ '' قال علیه السلام لعلی حین بعثه الی الیمن لان یهدی الله بک رجلا واحدا خیر لک مما تطلع علیه الشمس او تغرب '' (کبیر)

نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری وجہ سے کسی ایک شخص کو ہدایت دے دی تو تمہارے لئے بہتر ہوگا ہر اس چیز سے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے یا غروب ہوتا ہے۔ یعنی تمام روئے زمین کے مال و دولت سے تمہارے لئے بہتر ہوگا۔

☆ '' ابو وافد اللیثی قال ، انه علیه السلام بینما هو جالس والناس معه اذا قبل ثلاثة نفر اما احدهم فرآی فرجة فی الحلقة فجلس الیها واما الآخر فجلس خلفهم واما الثالث فانه رجع وفر فلما فرغ علیه السلام من کلامه قال اخبرکم عن النفر الثلاثة اما الاول فآوی ای الله فآواه الله واما الثانی فاستحیا من الله فاستحیا الله منه واما الثالث فاعرض عن الله فاعرض الله عنه ''

(رواہ مسلم ، کبیر)

ابو واقد لیثی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ ایک محفل میں تشریف فرما تھے لوگ بھی آپ کے پاس موجود تھے (آپ خطاب فرما رہے تھے) تین شخص آئے ان میں سے ایک نے حلقہ میں خالی جگہ دیکھی تو وہاں آ کر بیٹھ گئے۔ ان میں دوسرا شخص مجلس کے آخر میں بیٹھ گیا اور تیسرا شخص واپس لوٹ گیا۔ نبی کریم ﷺ جب اپنے کلام سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کیا میں تمہیں تین شخصوں کے متعلق خبر نہ دوں؟ ان میں سے پہلے شخص نے اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے جگہ حاصل کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اسے اپنا قرب عطاء کر دیا۔ لیکن دوسرے شخص نے رب تعالیٰ سے حیاء کی تو رب تعالیٰ نے بھی اس سے حیاء کی۔ لیکن تیسرے نے رب تعالیٰ سے اعراض کیا تو رب تعالیٰ نے بھی اس سے اعراض کیا۔

حدیث پاک کا تقریباً مفہوم واضح ہے کہ جو شخص محفل میں جگہ دیکھ کر نبی کریم ﷺ کے قریب پہنچ گئے اور آپ کے کلام کو سنا اور مسائل کا علم حاصل کیا انہیں رب تعالیٰ نے اپنا قرب عطا کیا، وجہ تقرب اس میں علم دین کو حاصل کرنا ہی ہے۔ دوسرے شخص بہت پیچھے ہی بیٹھ گئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے کلام کو سننے کی کامل توجہ نہ کی اور حیاء کی وجہ محفل میں کشادہ جگہ دیکھ کر قریب نہ ہوئے تو رب تعالیٰ نے بھی

ان کو اپنا تقرب عطاء نہ کیا، رب تعالیٰ کے حیاء کرنے کا یہی مطلب ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے تقرب سے محروم رہے۔ تیسرا شخص محفل میں لوگوں کو دیکھ کر چلا گیا، گویا کہ تعلیم سے اعراض کیا تو رب تعالیٰ بھی اس سے ناراض ہو رب تعالیٰ کی ناراضگی کو ہی اعراض سے تعبیر کیا گیا۔

علم کی فضیلت آثار سے:

یعنی علم کی فضیلت میں سلف صالحین کے اقوال ذھبیہ (سنہری اقوال) بیشمار پائے گئے ہیں۔ چندلن میں سے ذکر کئے جاتے ہیں:

(۱) "العالم ارأف بالتلميذ من الاب والام لان الاباء والامهات يحفظونه من نار الدنيا وآفاتها والعلماء يحفظونه من نار الآخرة وشدائدها"

"عالم اپنے شاگرد پر بنسبت اس کے ماں، باپ کے زیادہ مہربان ہے، اس لئے کہ اس کے ماں باپ اسے دنیا کی آگ اور دنیا کے مصائب سے بچاتے ہیں لیکن علماء ان کو آخرت کی آگ اور اس کی شدتوں سے بچاتے ہیں"۔

(۲) "حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا:" بم وجدت هذا العلم قال بلسان سؤول وقلب عقول" تو انہوں نے فرمایا سوال کرنے والی زبان اور عقل رکھنے والے دل سے۔

علم حاصل کرنے کا راز اسی میں بند ہے کہ طالب علم کو جو بات نہ آئے وہ اپنے احباب سے پوچھے یا اساتذہ سے پوچھے اور پڑھتے وقت بڑی توجہ سے استاذ کی بات کو سنے۔ مطالعہ کرے سبق کا تکرار کرے، عقل رکھنے والے دل کا یہی مطلب ہے۔ استاذ کی بات کو کھیل میں مشغول رہتے ہوئے نہ سننا باعث محرومیت ہے۔

(۳) بعض حضرات نے کیا خوب کہا " سل مسألة الحمقى واحفظ حفظ الاكياس " سوال بے وقوفوں کی طرح کرو اور یاد عقلمندوں کی طرح کرو۔ بے وقوفوں کی طرح سوال کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ نہ آنے پر بار بار سوال کرتا رہے۔ ایک دوسرے سے پوچھتا رہے۔ جو طلباء اساتذہ سے اپنی برتری کا اظہار کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں وہ راقم کے نزدیک حقیقی احمق ہوتے ہیں ان کو اساتذہ کی طرف سے " خسر الدنيا والآخرة " کا تمغہ ملتا ہے، جو زندگی بھر ان کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے

زعم باطل میں بڑے مجتہد ہوتے ہیں لیکن ہر طرف سے ان پر لعنت کے تیر برس رہے ہوتے ہیں۔

(۴) مصعب بن زبیر نے اپنے بیٹے کو کیا خوب نصیحت کی:

" یا بنی تعلم العلم فان کان لک مال کان العلم لک جمالا وان لم یکن لک مال کان العلم لک مالا "

'' اے میرے پیارے بیٹے علم حاصل کرو اگر تمہارے پاس مال بھی ہوا تو علم اس کیلئے جمال ہوگا، اگر تمہارے پاس مال نہ ہو تو علم خود ہی بہت عظیم مال و دولت ہے''۔

(۵) '' قال علی ابن ابی طالب لا خیر فی الصمت عن العلم کما لا خیر فی الکلام عن الجهل "

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا علم سے خاموش رہنے میں کوئی بھلائی نہیں جیسا کہ جہالت کے کلام میں کوئی اچھائی نہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ جب مسئلہ بیان کرنے کی ضرورت ہو اس وقت خاموش رہنا نیکی کے کام سے دور ہونے کے مترادف ہے۔ اسی طرح جہالت کی باتیں کرنا بھی بھلائی سے دور ہونا ہے۔

راقم کے نزدیک قوم کی تباہی دو چیزوں سے ہو رہی ہے۔ ہر جاہل کہتا ہے میں بھی دین کو سمجھتا ہوں۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ جو چاہو کرتے رہو اور یہ کہہ دو کہ کچھ نہیں ہوتا جی دین میں تنگی نہیں، یہ جائز، ناجائز تو مولویوں نے بنا رکھا ہے۔

(۶) عالم تین قسم پر ہیں ایک ان میں سے وہ ہیں جو " عالم باللہ غیر عالم بامر اللہ " ہوں یہ وہ ہیں کہ ان کے دلوں پر معرفت الٰہیہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نور جلال کے مشاہدہ میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اور رب تعالیٰ کی کبریائی کا ان پر غلبہ ہوتا ہے۔ علم احکام کو حاصل کرنے کا ان کو وقت ہی میسر نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض تو وہ ہوتے ہیں جو کچھ نہ کچھ احکام حاصل کر لیتے ہیں اور بعض وہ ہوتے ہیں جو مقام مجذوبیت تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ مقام اتنا بلند نہیں جیسا کہ " اھدنا الصراط المستقیم " کی بحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔

تین قسموں میں سے دوسری قسم کے عالم وہ جن کے متعلق یوں کہا گیا ہے " عالم بامر اللہ غیر عالم باللہ " یہ حضرات حلال و حرام کو پہچانتے ہیں احکام کے حقائق کو جانتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے

جلال کو اسرار کو نہیں جانتے۔ تیسری قسم ان میں سے یہ ہے " عالم باللہ و بامر اللہ " یہ وہ حضرات ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بھی جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی جانتے ہیں۔ یہ عالم معقولات اور عالم محسوسات کے درمیان ایک حد مشترک پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔

" فهو تارة مع الله بالحب له وتارة مع الخلق بالشفقة و الرحمة "

"وہ کبھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے میں مشغول ہوتے ہیں اور کبھی مخلوق کے ساتھ شفقت ورحمت میں مشغول ہوتے ہیں"

کبھی ان کی توجہ مخلوق کی طرف ہوتی ہے اس وقت رب تعالیٰ کی طرف توجہ میں کچھ کمی ہوتی ہے۔ اور کبھی ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اس وقت مخلوق کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ یہ مقام اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام، مرسلین اور صدیقین کو حاصل ہے جو " واصل باللہ و بالمخلوق " کے درجہ پر ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے علم والوں کی ان تینوں قسموں کا پتہ چلتا ہے آپ نے فرمایا:

" سائل العلماء وخالط الحكماء وجالس الكبراء "

"علماء سے مسائل پوچھیں حکماء سے میل جول رکھیں اور بڑے حضرات کی مجالس میں بیٹھیں"

علماء سے مراد وہی لوگ ہیں جو " عالم بامر الله وغير عالم بالله " ہیں۔ اور حکماء سے مراد وہی ہیں جو " عالم بالله وغير عالم بامر الله " ہیں۔ اور کبراء سے مراد وہی ہیں جو " عالم بالله وبامر الله " ہیں۔ کبراء کی مجالس میں بیٹھنے سے دین ودنیا کی بھلائی حاصل ہوتی ہے۔

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اکثر علماء کو مقام صدیقین حاصل ہے وہ درجہ کبراء میں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے جلال کے اسرار کو بھی جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی جانتے ہیں۔ اگر کسی عقل کے اندھے کو یقین نہ آئے تو وہ نبی کریمؐ کے اس ارشاد گرامی کو دیکھے اور سمجھنے کی کوشش کرے " العلماء ورثة الانبياء " علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ انبیاء کرام کے وہی وارث ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے جلال کے اسرار کو بھی جانتے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی جانتے ہیں۔

اب دوسرے ارشاد گرامی کو سمجھنا واضح ہو جائے گا کہ " سائل العلماء "علماء سے صرف مسائل پوچھنے کا مطلب یہ ہے اگر بعض علم والے لوگ صرف مسائل کو جانتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دور

ہوں تو ان سے مسائل پوچھنے کا حکم آپ نے فرمایا لیکن وہ علماء جو " العلماء ورثة الانبياء " کے درجہ پر ہیں ان سے مسائل بھی پوچھے جائیں ان کی محافل میں بیٹھا جائے انشاء اللہ ان کے قرب سے خدا کا قرب حاصل ہوگا۔

راقم اگر چہ بہت گنہگار ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے راقم کے قرب سے بھی کئی احباب کے عقائد درست ہوئے اور کئی احباب کو نیکی اور تقوی کا مقام حاصل ہوا۔ آیئے امام شفیق بلخی رحمہ اللہ کے قول کو دیکھیں تو یہ مسئلہ اور واضح ہو جائے گا اور سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ آپ فرماتے ہیں تینوں کی تین تین علامات ہیں:

" اما العالم بامر الله فله ثلاث علامات ان يكون ذاكرا باللسان دون القلب وان يكون خائفا من الخلق دون الرب وان يستحى من الناس فى الظاهر ولا يستحى من الله فى السر "

" وہ شخص جو صرف احکام کو جاننے والا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتا اس کی تین علامتیں یہ ہیں وہ زبان سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور دل سے یاد نہ کرے۔ اور مخلوق سے ڈرے رب تعالیٰ سے نہ ڈرے، لوگوں سے ظاہری طور پر حیاء کرے اور اللہ تعالیٰ سے پوشیدگی میں حیاء نہ کرے "

" واما العالم بالله فانه يكون ذاكرا خائفا مستحييا اما الذكر فذكر القلب لا ذكر اللسان واما الخوف فخوف الرياء لا خوف المعصية واما الحياء فحياء ما يخطر على القلب لا حياء الظاهر "

" وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کو جاننے والا ہے احکام کو کامل طریقہ سے نہیں جانتا یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں مستغرق ہے وہ ذکر کرنے والا ڈرنے والا، حیاء کرنے والا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ذکر دل کا ذکر ہوتا ہے، زبان کا ذکر نہیں ہوتا۔ اسے ڈر ریاء کاری سے ہوتا ہے معصیت کا خوف نہیں ہوتا۔ اور اسے دل پر کھٹکنے والے خطرات سے حیاء آتی ہے۔ ظاہر سے اسے حیاء محسوس نہیں ہوتی "۔

" واما العالم بالله وبامر الله فله ستة اشياء الثلاثة التى ذكرناها للعالم بالله فقط مع ثلاثة اخرى كونه جالسا على الحد المشترك بين عالم الغيب والشهادة وكونه معلما للقسمين الاولين وكونه بحيث يحتاج الفريقان

الاولان الیه وھو یستغنی عنھا "

''وہ شخص جواللہ تعالیٰ کو جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی جانتا ہے اس میں چھ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ تین تو وہی جن کو اس شخص کے لئے بیان کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو جانتا ہے احکام کو نہیں جانتا، یعنی وہ ذکر کرنے والا ڈرنے والا اور حیاء کرنے والا ہو، اور مزید تین چیزیں یہ ہیں کہ وہ عالم غیب اور عالم شہادۃ کے درمیان حد مشترک پر بیٹھنے والا ہو۔ یعنی ظاہری احکام کو بھی جانتا ہو اور باطنی احکام کو بھی جانتا ہو۔ اور ظاہری احکام کی تعلیم دینے والا ہو اور باطنی احکام کی بھی تعلیم دینے والا ہو۔ یعنی جہاں احکام شرعی سکھائے وہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی معرفت بھی سکھائے۔ اور وہ اس درجہ پر ہو کہ پہلے دونوں فریق (یعنی فقط عالم باللہ اور فقط عالم بامر اللہ) اس کے محتاج ہوں لیکن وہ خود ان دونوں سے مستغنی ہو''

امام شفیق بلخی رحمہ اللہ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے یوں بیان فرمایا:

" مثل العالم باللہ وبامر اللہ کمثل الشمس لایزید ولا ینقص ومثل العالم باللہ فقط کمثل القمر یکمل تارۃ وینقص تارۃ اخری ومثل العالم بامر اللہ فقط کمثل السراج یحرق نفسہ ویفتی لغیرہ "

''وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی رکھتا ہے اور اس کے احکام کو بھی جانتا ہے وہ سورج کی طرح ہے جو نہ کبھی گھٹتا ہے اور نہ ہی بڑھتا ہے ایک حال پر رہتا ہے۔ یہ وہ علماء جو بکتے نہیں ہر سورج کے پجاری نہیں صوفیوں والا لبادہ اوڑھ کر، یا علمیت کے دعویدار بن کر حاکموں کے سامنے کاسہ گدائی نہیں پھیلاتے فتوے بیچتے نہیں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضاء کی خاطر حق اور سچ بیان کرتے ہیں اور اسی پر قائم رہتے ہیں''۔

اور وہ اشخاص جو صرف رب تعالیٰ کی معرفت رکھیں اور وہ احکام کی کامل معرفت نہ رکھیں وہ چاند کی طرح ہیں۔ جیسے چاند گھٹتا اور بڑھتا ہے اسی طرح وہ بھی گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں یعنی ان کے مدارج میں اتار، چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ اور وہ لوگ جو صرف احکام کی معرفت رکھیں اللہ تعالیٰ کی معرفت ان کو حاصل نہ ہو وہ چراغ کی طرح ہیں جو خود جلتا ہے اور دوسروں کو روشن کرتا ہے۔ گھٹیا قسم کے علماء بھی دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کے علماء کا کتنا ہی عظیم مقام ہوگا۔

(۷) " قال فتح الموصلی، الیس المریض اذا امتنع عنہ الطعام والشراب والدواء

یموت ، فکذا القلب اذا امتنع عنه العلم والفکر والحکمة یموت "

''فتح موصلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کیا ایسا نہیں کہ مریض کا جب کھانا، پینا اور دواء رہ جائے تو وہ مر جاتا ہے؟ اسی طرح جب دل میں علم ،فکر اور حکمت نہ آئے تو دل مر جاتا ہے''۔

(۸) " قال الشیخ البلخی ،الناس یقومون من مجلسی علی ثلاثة اصناف : کافر محض، ومنافق محض ، ومؤمن محض ، وذلک لانی افسر القرآن فاقول عن الله وعن الرسول فمن لا یصدقنی فهو کافر محض ، ومن ضاق قلبه منه فهو منافق محض ومن ندم علی ما صنع وعزم علی ان لا یذنب کان مؤمنا محضا "

''شیخ بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میری مجلس میں آ کر جانے والے تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں خالص کافر، خالص منافق، خالص مومن چونکہ میں قرآن پاک کی تفسیر بیان کرتا ہوں وہی کچھ بتاتا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامیہ ہوتے ہیں یا نبی کریم ﷺ کے ارشادات گرامیہ ہوتے ہیں جو شخص میری تصدیق نہ کرے وہ خالص کافر ہوتا ہے۔اور جو شخص اس سے دل تنگی محسوس کرے وہ خالص منافق ہے اور جو شخص اپنے کئے ہوئے پر نادم ہو جائے اور آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلے وہ خالص مومن ہے''

(۹) " وقال ایضا ثلاثة من النوم یبغضها الله تعالیٰ وثلاثة من الضحک : النوم بعد صلوة الفجر وقیل صلوة العتمة والنوم فی الصلوة والنوم عند مجلس الذکر ، والضحک خلف الجنازة والضحک فی المقابر والضحک فی مجلس الذکر "

''شیخ بلخی رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ تین وقت سونے کو اور تین وقت ہنسنے کو رب تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔نماز فجر کے بعد اور عشاء کی نماز سے پہلے سونا، اور نماز میں سونا اور مجلس ذکر یعنی وعظ ونصیحت کی مجلس میں سونا رب تعالیٰ کو ناپسند ہے جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے ہنسنا، قبرستان میں ہنسنا اور مجلس ذکر میں ہنسنا رب تعالیٰ کو ناپسند ہے''۔

مطلب واضح ہے کہ دوران تعلیم سوئے رہنا اور ہنستے رہنا ہر وہ کام جو متعلم کی توجہ کو معلم سے ہٹا دے وہی رب تعالیٰ کو ناپسند ہوگا۔

(۱۰) " فاحتمل السیل زبدا رابیا " (تو پانی کی روانگی ابھرے ہوئے جھاگ اٹھا لائی) اس

آیہ کریمہ کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ ''سیل'' سے مراد ''علم'' ہے۔

اگر مراد علم ہی لیا جائے تو علم کو پانی سے تشبیہ دینے کی پانچ وجہ ہوں گی ان میں ایک یہ ہے کہ پانی بھی آسمانوں سے نازل ہوتا ہے اور علم بھی آسمانوں سے نازل ہوا ہے اور دوسری یہ ہے کہ جس طرح زمین کی اصلاح پانی سے ہوتی ہے اسی طرح مخلوق کی اصلاح علم سے ہوتی ہے اور تیسری وجہ ان میں سے یہ ہے کہ جس طرح کھیتیاں اور نباتات پانی کے بغیر پیدا نہیں ہوتے۔ اسی طرح اعمال اور طاعات بغیر علم کے حاصل نہیں ہوتے۔ اور چوتھی وجہ ان میں سے یہ ہے کہ جس طرح بارش میں بجلی کی چمک اور کڑک پائی جاتی ہے، اسی طرح علم کے ساتھ وعد اور وعید پائے جاتے ہیں۔ اور پانچویں وجہ ان میں سے یہ ہے کہ جس طرح بارش میں نفع بھی ہے اور نقصان بھی۔ اسی طرح علم میں نفع بھی ہے اور نقصان بھی۔ کیونکہ علم کے مطابق عمل کیا جائے تو اس میں نفع ہے اور علم کے مطابق عمل نہ ہو تو اس میں نقصان ہے۔ اسی طرح علم حق ہو یعنی قرآن وحدیث کے مطالب صحیح بیان کرے تو علم نفع مند ہے اور اگر قرآن پاک اور احادیث کے مطالب غلط بیان کرے جیسا کہ بتوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو انبیاء کرام اور اولیاء عظام پر چسپاں کرنا اور کافروں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو مسلمانوں پر چسپاں کرنا یہ علم نقصان دہ ہے اسے ہی علم سوء کہا جاتا ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ حکام کی ہاں میں ہاں ملانے والے، ہر جائز اور ناجائز کو جائز کہنے والے جدھر پیسہ جائے ادھر فتویٰ جائے یہ بھی علم سوء (برا) رکھنے والے ہی ہیں۔

(۱۱) دنیا کا باغ پانچ چیزوں سے مزین ہے علماء کے علم سے امراء کے عدل سے، عبادت کرنے والوں کی عبادت سے، تاجروں کی امانت سے، کسب کرنے والوں کے خلوص سے۔ لیکن ابلیس نے پانچ جھنڈے لا کر ہر ایک کے ارد گرد ایک ایک جھنڈا گاڑ دیا۔ جس کی وجہ سے ہر ایک کے کمال میں زوال آ گیا۔ ہاں صرف وہی با کمال رہے جن کو اللہ تعالیٰ نے شیطان سے محفوظ رکھا۔

☆ شیطان نے حسد کا جھنڈا علم کے پاس گاڑ دیا ہے۔ علماء حسد کی وجہ سے زوال میں آ رہے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔

☆ شیطان نے ظلم کا جھنڈا عدل کے قریب گاڑ دیا ہے۔ حکام ظلم کی وجہ سے برباد ہوتے جا رہے

ہیں۔ جوان کی ہر ناجائز کام میں ہاں میں ہاں ملاتے چلے جائیں وہ مخلص، محب وطن، وفادار، نیک، متقی ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ناجائز کاموں کو ناجائز کہیں ان کو للکاریں اور کہیں کہ ظلم بند کرو انہیں پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے۔ ان کو غاصب اور لیٹرا کہا جاتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ غاصب خود دوسرے کو غاصب کہتا ہے چور دوسرے کو چور کہہ کر شور کر رہا ہے، لیڑا دوسرے کو لیڑا کہہ کر قوم کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ یہ دراصل اسکے قریب شیطان نے ظلم کا جھنڈا جو گاڑ دیا ہے اسی کے سب کرشمے ہیں عادل ظالم بن گیا جس کے عدل سے زمین نے آباد ہونا تھا اس کے ظلم سے زمین برباد ہو کر رہ گئی۔

☆ شیطان نے ریاء (دکھلاوے) کا جھنڈا عبادت کے قریب گاڑ دیا ہے۔ جب عبادت کرنے والے اپنی عبادت پر ناز کرنا شروع کر دیں تو ان کے عبادت میں زوال آ جاتا ہے۔

☆ شیطان نے خیانت کا جھنڈا امانت کے قریب گاڑ دیا ہے۔ تاجر جب تک امین اور صادق ہوتا ہے وہ اللہ کا حبیب ہوتا ہے لیکن جب وہ امانت کا دامن چھوڑ دے کھوٹ، ملاوٹ، کم تولنا، جھوٹ بولنا جب اس کا وطیرہ ہو جائے تو وہ شیطان کا دوست بن جاتا ہے رب سے دور ہو جاتا ہے۔

☆ شیطان نے کھوٹ کے جھنڈے کو خلوص کے قریب نصب کر دیا ہے۔ کسب کرنے والے، کسی پیشہ کو اختیار کرنے والے جب کسی چیز کے بنانے میں کھوٹ سے کام لیتے ہیں۔ تو ان کا خلوص ختم ہو جاتا ہے۔

(۱۲) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تابعین میں سے جلیل القدر تابعی ہیں۔ ان کو درجات کی بلندی، مقام میں افضلیت پانچ چیزوں سے حاصل ہوئی۔ ان میں سے ایک یہ ہے " لم یامرا حد بشئی حتی عمله " کہ آپ نے کسی ایک کو کسی کام کا حکم اس وقت تک نہیں دیا۔ یہاں تک کہ آپ نے پہلے خود اس پر عمل کیا۔ ان میں سے دوسری چیز یہ ہے " لم ینه احدا عن شئی حتی انتهی عنه " آپ نے کسی ایک کو کسی چیز سے اس وقت تک نہیں منع کیا یہاں تک خود اس سے آپ نے آپ کو روک لیا۔ ان میں سے تیسری چیز یہ ہے:

" کل من طلب منه شیا مما رزقه الله تعالیٰ لم یبخل به من العلم والمال "

" کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم اور مال کی دولت سے نوازا۔ اس میں سے کسی نے کچھ طلب کیا تو آپ نے اس میں بخل (کنجوس) نہیں کیا "۔

ان میں چوتھی چیز یہ ہے " کان یستغنی بعلمه عن الناس " آپ اپنے علم کی وجہ سے لوگوں سے مستغنی رہے۔ حقیقت یہی ہے کہ خودداری انسان کو باوقار بناتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات لوگ اسے متکبر بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اور ان میں سے پانچویں چیز یہ ہے " کانت سریرته وعلانیته سواء " آپ کا ظاہر و باطن ایک جیسا تھا۔ علامات نفاق کو آپ سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

(۱۳) جب تو یہ چاہے کہ تجھے معلوم ہو جائے کہ تیرا علم تجھے نفع پہنچا رہا ہے یا نہیں۔ تو تو پانچ چیزوں کو طلب کر، تیرا علم یقیناً تیرے لئے نفع مند ہوگا وہ پانچ چیزیں یہ ہیں " حب الفقر لقلة المؤنة " مشقت کم اٹھانے کے لئے فقر سے محبت کی جائے۔ یقینی بات ہے کہ فقیر کو تمام مصائب کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی فکر نہیں ہوتی وہ آزاد ہوتا ہے۔

" وحب الطاعة طلبا للثواب " "ثواب کے حاصل کرنے کیلئے طاعت سے محبت کیجائے"

" وحب الزهد فی الدنیا طلبا للفراغ " "فراغت حاصل کرنے کیلئے دنیا میں زہد سے محبت کیجائے"

" وحب الحکمة طلبا لصلاح القلب " "دل کی اصلاح کیلئے علم سے محبت کیجائے"

" وحب الخلوة طلبا لمناجاة الرب " "رب تعالیٰ سے مناجات کیلئے خلوت سے محبت کیجائے"

(۱۴) پانچ چیزوں کو پانچ میں تلاش کرو:" اطلب العز فی التواضع لا فی المال والعشیرة " عزت عاجزی میں طلب کرو، نہ کہ مال اور قبیلہ میں۔ یعنی انسان جتنا زیادہ عاجز ہوگا، اتنا ہی زیادہ عزت والا ہوگا، انسان کی یہ خام خیال ہے کہ وہ مال و دولت میں عزت سمجھتا ہے، یا وہ یہ سمجھے کہ میری برادری بڑی ہے، یا میرے ساتھ لٹھ بردار پشت پناہی کرنے والے ہیں:" اطلب الغنی فی القناعة لا فی الکثرة " غناء کو قناعت میں تلاش کرو، نہ کہ مال و دولت کے کثیر ہونے میں۔ تھوڑے مال پر اکتفاء کر لینا، جتنا مال رب تعالیٰ نے دیا اسی پر صابر رہنا قناعت ہے، اسی سے غناء حاصل ہوتی ہے۔ زیادہ مال ملے اور زیادہ ملنے کی خواہش پائی جائے، اس سے انسان غنی نہیں ہو سکتا۔ جو بے پرواہ نہیں وہ غنی کب ہے۔ غنی تو وہ ہے جو بے پرواہ ہے:" اطلب الأمن فی الجنة لا فی الدنیا " یہ خواہش رکھو کہ جنت میں امن حاصل ہو جائے۔ دنیا میں امن حاصل کرنا ضروری نہیں کیونکہ دنیا میں مصائب

وآلام گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں درجات کی بلندی کا ذریعہ بنتے ہیں:" **اطلب الراحة فی القلة لا فی الکثرة** " قلیل مال میں ہی راحت طلب کرو، کثیر مال میں آرام نہیں بلکہ ذہنی طور پر ہر وقت بے چینی ہی رہتی ہے:" **اطلب منفعة العلم فی العمل لا فی کثرة الروایة** " علم کا نفع عمل میں حاصل کرو زیادہ تقریروں سے علم کا نفع حاصل نہیں ہوگا۔

(۱۵) ابن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس امت میں فساد صرف پانچ قسم کے خاص لوگوں سے ہوتا ہے وہ خواص یہ ہیں: علماء، غزاۃ (غازی لوگ) زھاد، تاجر اور حکام:

" **اما العلماء فهم ورثة الانبیاء فاذا کان العالم واضعا للدین وللمال رافعا فبمن یقتدی الجاهل** "

''علماء چونکہ انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ جب عالم دین ہی دین کو پست کرے مال کو ترجیح دے تو کون سا جاہل اس کی اقتداء کرے گا''۔

یعنی دین کو چند ٹکوں پر بیچنے والے حاکموں کو خوش کرنے کے لئے مسائل کو بدل دینے والے حاکم بدلے تو ان کے مسائل بدل جائیں حاکم بدل جائے تو ان کی دعائیں بدل جائیں ان کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ بکے ہوئے ہیں یہ دین کو بیچنے والے ہیں۔ان کی کوئی اقتداء نہیں کرتا۔

" **واما الزهاد فعماد اهل الارض فاذا کان الزاهد فی الدنیا راغبا فبمن یقتدی التائب** "

''زاہد لوگ زمین والوں کا ستون ہیں۔ جب زاہد ہی دنیا کی طرف راغب ہو جائیں تو کس وجہ سے ان کی اقتداء کر کے کوئی توجہ کرے گا''۔

" **واما الغزاة فجند الله فی الارض فاذا کان الغازی طامعا مرائیا فکیف یظفر بالعدو** "

''غازی حضرات زمین میں اللہ تعالیٰ کا لشکر ہیں لیکن جب غازی ہی طمع ولالچ کرنے والا بن جائے غازی ہی جب دکھلاوے کا کام کرے تو وہ دشمن پر کیسے کامیاب ہوسکتا ہے''۔

" **واما التجار فامناء الله فی ارضه فاذا کان التاجر خائنا فکیف تحصل الامانة** "

''لیکن تاجر اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے امین ہوتے ہیں۔ جب تاجر ہی خائن ہو جائے تو امانت کیسے حاصل ہوگی''

" واما الولاۃ فهم الرعاۃ فاذا کان الراعی ذئبا فکیف تحصل الرعایۃ "

"حکام اپنی رعیت کے محافظ ہوتے ہیں لیکن جب محافظ ہی بھیڑیا بن جائے تو حفاظت کیسے ہوگی"

(۱۶) حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں علم کو مال پر سات وجہ سے فضیلت حاصل ہے:

" اولها العلم میراث الانبیاء والمال میراث الفراعنة "

"ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ علم انبیاء کرام کی وراثت ہے اور مال و دولت فرعونوں کی وراثت ہے"

" ثانیها العلم لا ینقص بالنفقة والمال ینقص "

"ان میں سے دوسری وجہ یہ ہے کہ علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا، لیکن مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے"

" وثالثها یحتاج المال الی الحافظ والعلم یحفظ صاحبه "

"ان میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ مال کو محافظ کی ضرورت ہے لیکن علم خود صاحب علم کی حفاظت کرتا ہے"

" ورابعها اذا مات الرجل یبقی ماله والعلم یدخل مع صاحبه قبره "

"ان میں سے چوتھی چیز یہ ہے کہ انسان جب فوت ہو جاتا ہے اس کا مال پیچھے رہ جاتا ہے یعنی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے لیکن علم انسان کے ساتھ قبر میں جاتا ہے"

سبحان اللہ علم کیسا ساتھی ہے جو ساتھ نہیں چھوڑتا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے مال بے وفاء ہے اس میں علامت نفاق پائی جاتی ہے اور علم باوفاء ہے اس میں خلوص پایا جاتا ہے۔

" وخامسها المال یحصل للمؤمن والکافر والعلم لا یحصل الا للمؤمن "

"ان میں سے پانچویں وجہ یہ ہے کہ مال مومنوں کو حاصل ہے اور کافروں کو بھی حاصل ہے لیکن علم (چونکہ علم سے مراد علم دین ہی ہے) صرف مومنوں کو حاصل ہے"

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ سمجھ آیا کہ مومنوں اور کفار کا اشتراک باعث زوال ہے اور صرف مومنوں کے ساتھ رہنے میں ہی حصول کمال ہے۔ کاش کسی کو سمجھ آئے کفار کی دوستی نے ہی مسلمانوں کو تباہ کر دیا ہے۔

" وسادسها جمیع الناس یحتاجون الی صاحب العلم فی امر دینهم ولا یحتاجون الی صاحب المال"

''اوران میں سے چھٹی وجہ یہ ہے کہ تمام لوگ دینی معاملات میں عالم دین کے محتاج ہوتے ہیں لیکن مال دار کے تمام لوگ محتاج نہیں ہوتے''۔

بڑے بڑے خناس، بڑے بڑے منحوس دین اسلام کے باغی نام کے مسلمان بھی بچے کی پیدائش کے وقت اور کسی عزیز، بزرگ کی موت کے وقت اور نکاح کے وقت عالم دین کے محتاج ہوتے ہیں۔

" وسابعها العلم يقوى الرجل على المرور على الصراط والمال يمنعه "

''اوران میں سے ساتویں وجہ یہ ہے کہ علم انسان کو پل صراط سے گزرنے کی طاقت عطا فرمائے گا۔ اور مال پل صراط سے گزرنے میں رکاوٹ بنے گا''

خیال رہے کہ مال سے مراد وہ مال ہے جو حلال طریقہ سے حاصل نہ کیا گیا۔ یا اسے ناجائز کاموں میں خرچ کیا گیا۔ یا اس حال سے زکواۃ نہ ادا کی گئی۔ یا اس مال نے انسان کو رب تعالیٰ سے دور رکھا کہ وہ فرائض کا تارک رہا۔

(۱۷) فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص عالم کے پاس بیٹھتا ہے اور علم سے کوئی چیز وہ یاد کرنے پر قادر نہ بھی ہو تو پھر بھی وہ سات قسم کی چیزیں حاصل کر لیتا ہے جو اس کے لئے باعث تکریم بنتی ہیں۔

" اولها ينال فضل المتعلمين "

''ان میں سی پہلی چیز یہ ہے کہ وہ متعلمین کا مقام فضیلت حاصل کر لیتا ہے''

" والثاني مادام جالسا عنده كان محبوسا عن الذنوب "

''اور دوسری چیز یہ ہے کہ وہ جتنی دیر ایک عالم دین کی محفل میں بیٹھا رہے گا۔ اتنی دیر وہ گناہوں سے بچا رہے گا''

" والثالث اذا خرج من منزله طلبا للعلم نزلت الرحمة عليه "

''اور تیسری چیز یہ ہے کہ جب وہ اپنے گھر سے علم کی طلب کے لئے نکلتا ہے اس پر رحمت کا نزول ہوتا ہے''

" والرابع اذا جلس في حلقة العلم فاذا نزلت الرحمة عليهم حصل له منها نصيب "

''اور چوتھی چیز یہ ہے کہ جب وہ شخص علم کی مجلس میں بیٹھے گا تو جب معلمین اور متعلمین پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے بھی اپنے رحمت سے نوازے گا کیونکہ اس

کی شان کریمی کے یہ لائق ہی نہیں کہ وہ ایک ہی محفل میں بیٹھے ہوئے بعض لوگوں پر رحم فرمائے اور بعض کو محروم کرے"۔

" والخامس ما دام یکون فی الاستماع تکتب له طاعة "

" ان میں سے پانچویں چیز یہ ہے کہ جب تک وہ علمی مسائل سن رہا ہے اسی وقت تک اس کے نامہ اعمال میں طاعت کا درجہ لکھا جا رہا ہے"

" والسادس اذا استمع ولم یفهم ضاق قلبه لحرمانه عن ادارک العلم فیصیر ذلک الغم وسیلة له الی حضرة الله تعالیٰ لقوله عزوجل ان عند المنکسرة قلوبهم لاجلی "

" اور ان میں سے چھٹی چیز یہ ہے کہ جب انسان دینی مسائل سنے اور اسے وہ سمجھ نہ آئیں تو یقیناً وہ ان سے دل تنگ ہوگا کیونکہ وہ یہ سمجھے گا کہ میں علم کے حاصل کرنے سے محروم ہو رہا ہوں۔ یہ غم اور پریشانی اور دل تنگی اس کو رب تعالیٰ کے قریب پہنچانے کا ذریعہ بنے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد (غالباً حدیث یا کسی صاحب کشف کا قول) یہ ہے کہ جس کا دل میری وجہ سے ٹوٹے (یعنی جو پریشان رہے کہ مجھے رب تعالیٰ کا قرب حاصل کیوں نہیں ہو رہا) تو میں اس کے قریب ہوتا ہوں"

۔ یعنی اس شخص کو میرا ایسا قرب حاصل ہوتا ہے کہ میں خود اس کے قریب ہو کر اسے اپنا مقرب بنا لیتا ہوں۔

" والسابع یری اعزاز المسلمین للعالم واذلا لهم للفساق فیرد قلبه عن الفسق ویمیل طبعه الی العلم فلهذا امر علیه الصلوة والسلام بمجالسة الصالحین "

" اور ساتویں چیز ان میں سے یہ ہے کہ جب وہ شخص علماء کی عزت اور فاسق لوگوں کی ذلت کو دیکھے گا تو اس کی طبیعت خود بخود علم کی طرف میلان کرے گی (ہوسکتا ہے کچھ نہ کچھ علم بھی اسے حاصل ہو جائے) اسی لئے نبی کریم ﷺ نے نیک لوگوں کی محافل میں بیٹھنے کا حکم فرمایا"۔

(۱۸) فقیہ ابو اللیث رحمہ نے فرمایا جو شخص آٹھ قسم کے لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کیلئے آٹھ چیزوں کو زیادہ کرتا ہے:

" من جلس مع الاغنیاء زاده الله حب الدنیا والرغبة فیها "

جو شخص غنی لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دنیا کے ساتھ محبت اور رغبت بڑھا دیتا ہے۔

" ومن جلس مع الفقراء جعل الله له الشکر والرضا بقسمة الله "

''اور جو شخص فقیر لوگوں کے ساتھ بیٹھے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی تقسیم پر راضی اور شاکر بنا دیتا ہے''

یعنی فقراء کی مجلس کو اختیار کرنے والے کی رضاء اور اسکا شکر گزار ہونا اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے۔

" ومن جلس مع السلطان زاده الله القسوة والکبر "

''اور جو شخص بادشاہوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی قساوت قلبی (دل کی سختی) اور تکبر کو بڑھا دیتا ہے''

" ومن جلس مع النساء زاده الله الجهل والشهوة "

''اور جو شخص عورتوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی جہالت اور شہوت کو زیادہ کر دیتا ہے''

" ومن جلس مع الصبیان ازداد من اللهو والمزاح "

''اور جو شخص بچوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے مزاح اور کھیل کود میں زیادتی کر دیتا ہے''

" ومن جلس مع الفساق ازداد من الجرأة علی الذنوب وتسویف التوبة "

''اور جو شخص فاسقوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اس کا گناہوں پر دلیر ہونا اور توبہ میں ٹال مٹول کرنا زیادہ کر دیا جاتا ہے''

" ومن جلس مع الصالحین ازداد رغبة فی الطاعات "

''اور جو شخص نیک لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طاعات میں رغبت کو زیادہ کر دیتا ہے''

" ومن جلس مع العلماء ازداد العلم والورع "

''اور جو شخص علماء کے ساتھ بیٹھتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے علم اور ورع (تقوی، نیکیوں) کو بڑھا دیتا ہے''

فائدہ : اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم دیا رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿وعلم آدم الاسماء کلها﴾ کا یہی مطلب ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کو فراست کا علم دیا رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وعلمناه من لدنا علما ﴾ اور ہم نے ان کو اپنی طرف سے علم دیا (یعنی علم لدنی سے ان کو نوازا)۔ اور یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر کا علم دیا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رب قد آتیتنی من الملک وعلمتنی من تاویل الاحادیث ﴾

''اے میرے رب تو نے مجھے بادشاہت عطاء کی اور خوابوں کی تعبیر کا علم تو نے مجھے عطاء فرمایا''

اور حضرت داؤد علیہ السلام کو زرع بنانے کا علم عطا فرمایا رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وعلمناه صنعة لبوس لكم ﴾ اور ہم نے اسے تمہارے لئے زرع بنانے کا علم عطا فرمایا۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولیوں کا علم فرمایا یعنی آپ پرندے کے کلام کو سمجھتے تھے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ یا ایها الناس علمنا منطق الطیر ﴾ اے لوگو ہمیں پرندوں کے کلام کا علم عطا کیا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو توراۃ اور انجیل کا علم دیا گیا جیسا کہ رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا:

﴿ ویعلمه الکتاب والحکمة والتوراة والانجیل ﴾

''اور اسے کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے''

اور ہمارے نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو شرع اور توحید کا علم دیا گیا اور آپ پر مزید فیضان یہ فرمایا گیا ﴿ وعلمک ما لم تکن تعلم ﴾ سے آپ کو خطاب فرمایا جس میں " ما " عموم پر دلالت کر رہا ہے یعنی یوں فرمایا کہ آپ جو کچھ بھی نہیں جانتے تھے وہ سب کچھ آپ کو عطاء فرما دیا گیا اور ﴿ الرحمن علم القرآن ﴾ کہہ کر واضح کر دیا کہ آپ کو قرآن کا علم دیا گیا جو " علم الاولین والآخرین " تمام اگلوں اور پچھلوں کے علم پر مشتمل ہے اور " علمه البیان " کہہ کر واضح کر دیا کہ آپ کو " ما کان وما یکون " (جو ہو چکا ہے اور جو ہونا ہے) کا علم عطاء کر دیا گیا:

" فعلم آدم کان سببا له فی حصول السجدة والتحیة "

''حضرت آدم علیہ السلام کا علم فرشتوں کا انہیں سجدہ کرنے اور سلام کرنے کا سبب بنا''

" وعلم الخضر کان سببا لان وجد تلمیذا مثل موسی ویوشع علیهما السلام "

''حضرت خضر علیہ السلام کے علم کی وجہ سے ہی ان کے شاگرد موسیٰ علیہ السلام اور یوشع علیہ السلام بنے''

" وعلم یوسف کان سببا لوجد ان الاهل والمملکة "

''حضرت یوسف علیہ السلام کے علم کے سبب سے ہی آپ کو اہل اور مملکت حاصل ہوئی''

" وعلم داؤد کان سببا لوجد ان الریاسة والدرجة "

''حضرت داؤد علیہ السلام کو علم کی وجہ سے ہی ریاست اور درجات حاصل ہوئے''

" وعلم سلیمان کان سببا لوجدان بلقیس والغلبة "

''حضرت سلیمان علیہ السلام نے علم کی وجہ سے بلقیس کو حاصل کیا اور اس پر غلبہ حاصل کیا''

" وعلم عیسی کان سببا لزوال التهمة عن امه "

''اور عیسیٰ علیہ السلام کا علم ان کی والدہ مکرمہ سے تہمت کے زوال کا سبب بنا''

'' وعلم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کان سببا لوجود الشفاعة ''

''اور ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کا علم آپ کو شفاعت کا حق حاصل ہونے کا سبب بنا''

(علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں) پھر ہم کہتے ہیں کہ جب مخلوق کے اسماء کے علم کی وجہ سے فرشتوں کا سلام حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل ہوا۔ تو پتہ چلا کہ جسے خالق کائنات اور اس کی صفات کا علم حاصل ہوا یقیناً اسے بھی فرشتوں کا سلام حاصل ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اسے سلام حاصل ہوگا۔ جسے رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿ سلام قولا من رب رحیم ﴾

اور خضر علیہ السلام کو جب علم فراست کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کی صحبت حاصل ہوئی '' فیا امة الحبیب بعلم الحقیقة کیف لا تجدون صحبة محمد صلی اللہ علیہ وسلم '' تو اے حبیب پاک ﷺ کی امت تمہیں علم حقیقت کی وجہ سے۔ مصطفیٰ کریم ﷺ کی صحبت کیوں حاصل نہیں ہوگی جب کہ رب تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا:

﴿ فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین ﴾

''جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے ان کو انبیاء کرام کا ساتھ حاصل ہوگا''

اور جب یوسف علیہ السلام کو خوابوں کی تعبیر کی وجہ سے دنیا کے قید خانہ سے نجات حاصل ہوئی ''فمن کان عالما بکتاب اللہ کیف لا ینجو من حبس الشهوات '' جس شخص کو اللہ کی کتاب کا علم حاصل ہو وہ کیسے خواہشات کی قید سے نجات حاصل نہیں کرے گا جب کہ رب تعالیٰ نے خود ہی فرمایا:

﴿ ویهدی من یشاء الی صراط مستقیم ﴾

''اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے''

اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی ذات پر رب تعالیٰ کے انعامات کا ذکر یوں فرمایا:

﴿ وعلمتنی من تاویل الاحادیث ، اے اللہ تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمایا ﴾

تو اے شخص قرآن کا علم رکھنے والے ذرا غور کر اللہ تعالیٰ کا تجھ پر کتنا احسان عظیم ہے جس نے

تجھے اپنی کتاب کا علم عطا فرمایا اس سے بڑھ کر تیرے لئے اور کیا نعمت ہوسکتی ہے جس نے تجھے مفسر قرآن بنایا اور اپنا مقرب بنایا اور اپنے نبی کریم ﷺ کا وارث بنایا اور مخلوق کو دعوت حق دینے والا بنایا اور اپنے بندوں کو نصیحت کرنے والا بنایا اور اپنے شہروں کے باشندوں کے لئے تمہیں چراغ بنایا اور اپنی مخلوق کا جنت اور ثواب کے لئے تمہیں قائد بنایا اور جہنم کی آگ سے بچنے کے لئے لوگوں کو زجر کرنے والا تمہیں بنایا۔

حدیث پاک میں آتا ہے " العلماء سادة و الفقهاء قادة و مجالستهم زيادة " علماء کو سیادت (سرداری) حاصل ہے اور فقہاء کو قائد ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور ان کی مجالس میں بیٹھنے میں زیادتی ثواب حاصل ہے۔

تنبیہ: راقم اللہ تعالیٰ کے ان گنت انعامات کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ ان انعامات میں سے اس کا عظیم انعام یہ بھی ہے کہ اس نے مجھے مفسرین کرام کے اقوال کے نقل کرنے کی توفیق عطا فرمائی میں "ناقلِ اقوالِ مفسرینِ کرام "تو ہوں لیکن مجھے کوئی مفسر قرآن نہ سمجھے اس عظیم منصب کا میں اہل نہیں۔ (راقم نجوم الفرقان)

(۱۹) مؤمن علم کی طرف اس وقت تک کامل رغبت نہیں کرسکتا جب تک اس میں چھ صفات نہ پائی جائیں: ایک یہ کہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرائض کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے میں ان کو اس وقت تک ادا نہیں کرسکوں گا جب تک کہ مجھے علم حاصل نہیں ہوگا اور دوسری صفت یہ ہے کہ مؤمن یہ سمجھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے معاصی سے منع فرمایا ہے لیکن میں ان سے علم کے بغیر اجتناب نہیں کرسکتا اور تیسری صفت یہ ہے کہ مؤمن کو یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر لازم کیا ہے کہ میں اسکی نعمتوں کا شکریہ ادا کروں اور بغیر علم کے میں اس کا شکر گزار نہیں ہوسکتا۔ اور چوتھی صفت یہ ہے کہ مؤمن یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مخلوق پر انصاف کرنے کا حکم دیا ہے بغیر علم کے انصاف کرنا ممکن نہیں۔ اور پانچویں صفت یہ ہے کہ یہ معلوم ہو کہ مجھے اللہ تعالیٰ مصیبتوں پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے بغیر علم کے صابر بننا ممکن نہیں۔ اور چھٹی صفت یہ ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے شیطان کے ساتھ عداوت کرنے والا بنایا ہے۔ جب تک مجھے شیطان کا علم حاصل نہیں ہوگا میں اس سے کس طرح عداوت کرسکوں گا۔

(۲۰) چار آدمیوں کے ہاتھوں میں جنت کی راہ ہے وہ یہ ہیں عالم، زاہد، عابد اور مجاہد۔

" فالزاھد اذا کان فی دعواہ صادقا یرزقه الله الامن "
''زاہد جب اپنے دعویٰ میں سچا ہوتو اللہ تعالیٰ اسے امن عطافرماتا ہے''
" والعابد اذا کان صادقا فی دعواہ یرزقه الله الخوف "
''اورعبادت کرنے والاشخص جب اپنے دعوی میں سچا ہوتو اللہ تعالیٰ اسے خوف عطا فرماتا ہے''
" والمجاھد اذا کان فی دعواہ صادقا یرزقه الله الثناء والحمد "
''اورمجاہد جب اپنے دعویٰ میں سچا ہوتو اللہ تعالیٰ اسے ثناءاورحمد کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے''
" والعالم اذا کان صادقا فی دعواہ یرزقه الله الحکمة "
''اورعالم جب اپنے دعوی میں سچا ہوتو اللہ تعالیٰ اُسے حکمت عطافرماتا ہے''

یہی جنت کے راستے ہیں جوان حضرات سے حاصل ہوتے ہیں جن کا ذکرابھی کیا گیا ہے۔

(۲۱) چار چیزوں میں چار چیزوں کوتلاش کرو ایسی جگہ رہو جس میں سلامتی پائی جائے " فاذا لم تجد من الموضع السلامة فالسجن خیر منه " جب تمہیں رہنے کی جگہ میں سلامتی حاصل نہ ہو تواس سے قیدخانہ بہتر ہے۔دوست سے عزت حاصل کرو " فاذا لم تجد من صاحب الکرامة فالکلب خیر منه " جب تواپنے دوست سے عزت حاصل نہ کرسکےتواس سے کتا بہتر ہے۔مال سے فراغت حاصل کرویعنی مال تمہیں آرام پہنچائے " واذا لم تجد من مالک الفراغة فالمدر خیر منه " جب تمہیں مال سے فراغت میسر نہ ہوتواس مال سے مٹی کے ڈھیلے بہتر ہیں۔علم سے نفع حاصل کرویعنی علم تمہارے لئے نفع مند ہو" واذا لم تجد من العلم المنفعة فالموت خیر منه" اورجب تم علم سے نفع حاصل نہ کرسکو تواس سے موت بہتر ہے۔

(۲۲) چار چیزیں چار چیزوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں " لا یتم الدین الا بالتقوی فالدین بلا تقوی علی خطر " دین تقوی کے بغیر مکمل نہیں ہوتااس لئے کہ تقوی کے بغیر دین مقام پرخطر پر ہوتا ہے جوکسی وقت بھی نفس وشیطان کی زد میں آکر برباد ہوسکتا ہے:

" ولا یتم القول الا بالفعل والقول بلا فعل کالھدر "
''قول کی تکمیل فعل کے بغیر نہیں فعل کے بغیر قول اسی طرح ہے جس طرح کسی بیکار چیز

کو پھینک دیا جائے"

" ولا تتم المروءة الا بالتواضع والمروءة بلا تواضع کشجر بلا ثمر "

"مروت بغیر عاجزی کے مکمل نہیں ہوسکتی عاجزی کے بغیر مروت ایسے ہی ہے جیسے درخت بغیر پھل کے ہو"

" ولا یتم العلم الا بالعمل والعلم بلا عمل کغیث بلا مطر "

"علم کی تکمیل عمل کے بغیر نہیں کیونکہ علم عمل کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے بادل بغیر بارش کے ہوں"

(۲۳) لوگ چار قسم کے ہیں **ایک** شخص جو صاحب علم ہو اسے معلوم ہو کہ میں عالم ہوں یعنی وہ تبلیغ دین کر رہا ہو تو وہ حقیقتۂ عالم ہے اس کی تابعداری کرو۔

دوسرا وہ شخص ہے جو عالم تو ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ میں عالم ہوں یعنی وہ اپنے علم کے مطابق دین کا کوئی کام نہیں کر رہا" **فھو نائم فایقظوہ** "وہ سویا ہوا ہے اسے بیدار کرو۔ یعنی اسی کہوائے شخص اللہ تعالیٰ نے تجھے علم دین عطا کیا ہے اس کے مطابق کوئی کام بھی کر۔ خود بھی اس عظیم نعمت سے فائدہ حاصل کر اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا۔

تیسرا شخص وہ ہے جو صاحب علم نہیں لیکن اسے اپنے آپ کے متعلق معلوم ہے کہ میں عالم نہیں "**فھو مستر شد فارشدوہ** "وہ سیدھی راہ کو حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے اس کی راہنمائی کرو۔

چوتھا وہ شخص ہے:

" ورجل لا یدری ولا یدری انہ لا یدری فھو شیطان فاجتنبوہ "

جو جانتا بھی نہیں یعنی عالم نہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ میں نہیں جانتا، یعنی اسے اپنے آپ کا بھی علم نہیں وہ اپنے عالم نہ ہونے کو بھی نہیں جانتا وہ شیطان ہے اس سے بچ کر رہو۔

اسے ہی جاہل مرکب کہا جاتا ہے ایسا شخص خود تو گمراہ ہوتا ہی ہے لیکن دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ تقریر کرتا ہی رہتا ہے اپنی جہالت کو علم بتاتا ہے لوگ اس جاہل کو عالم سمجھ کر اس کے جال میں پھنستے رہتے ہیں۔ اگر کوئی عالم اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ کہتا ہے میں خود ہی عالم ہوں ایسے شخص کو سمجھانا ممکن نہیں۔

(۲۴) چار چیزوں سے کوئی شریف شخص عار (شرم) محسوس نہیں کرتا اگرچہ وہ حاکم وقت ہی کیوں نہ ہو "قیامه من مجلسه لابیه" اپنی مجلس سے اپنے باپ کے لئے کھڑا ہونے میں کسی شریف انسان کو کوئی عار نہیں۔ سبحان اللہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب ہی مسئلہ حل فرمادیا کہ باپ کی تعظیم کیلئے کھڑا ہونے میں کسی شریف انسان کو تو کوئی عار نہیں ہاں کوئی شریف ہی نہ ہو باپ کو باپ ہی نہ سمجھے تو وہ باپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہونے میں اپنے لئے عار سمجھ کر کہے کہ تعظیم کے لئے کھڑا ہونا منع ہے تو یہ اس کا حق ہے۔

آیئے حدیث پاک کی طرف توجہ فرمائیں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے جس میں یہ الفاظ مبارکہ ہیں:

"قال رسول اللہ ﷺ للانصار قوموا الی سیدکم"

"رسول اللہ ﷺ نے (حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے آنے پر) انصار کو فرمایا اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ" (مسلم باب جو از قتال من نقض العهد ج ۲ ص ۱۰۳)

اسی حدیث کے تحت علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فیه اکرام اهل الفضل وتلقیهم بالقیام لهم اذا اقبلو هکذا احتج به جماهیر العلماء لاستحباب القیام"

اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اہل فضل کی تعظیم کی جائے اور ان کے آنے پر دوسرے لوگوں کو کھڑا ہونے کا حکم دیا جائے جمہور علماء کرام نے اسی حدیث سے ثابت کیا ہے صالحین کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا مستحب ہے۔

"قال القاضی ولیس هذا من القیام المنهی عنه وانما ذاک فیمن یقومون علیه وهو جالس ویمثلون قیاما طول جلوسه"

"قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن احادیث میں عجمیوں کی طرح کھڑا ہونے سے منع کیا گیا ہے ان سے مراد تعظیم کے لئے کھڑا ہونے سے منع کرنا نہیں بلکہ پہلے بڑے لوگ یعنی سردار اور چوہدری یہ چاہتے تھے بلکہ لزومی طور پر دوسرے غرباء کو حکم دیتے ہیں کہ جب تک ہم بیٹھے رہیں تم کھڑے رہو اس قیام سے منع کیا گیا ہے"۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بھی اپنا مختار قول ان الفاظ سے ذکر فرمایا:

"قلت القیام للقادم من اهل الفضل مستحب وقد جاء فیه احادیث ولم

یصح فی النهی عنه شئی صریح "

''میں کہتا ہوں اہل فضل کے آنے پر ان کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا مستحب ہے۔ یہ احادیث مبارکہ سے ثابت ہے لیکن کسی حدیث میں قیام تعظیمی سے منع نہیں کیا گیا''۔

اعتراض: مسلم کی اسی حدیث پر سندھی کے حاشیہ میں یہ تحریر ہے:

" (قوموا الی سیدلکم) لا دلیل فیه علی قیام التعظیم والتکریم اذ لو ارید ذاک لقیل قوموا لسیدکم "

اس حدیث میں تعظیم وتکریم کی وجہ سے قیام ثابت نہیں کیونکہ اس میں لفظ " الی " ذکر ہے۔ جو انتہاء غایۃ پر دلالت کر رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کھڑے ہوکر اپنے سردار کے پاس پہنچو، ان کی سواری سے اترنے میں امداد کرو کیونکہ وہ مریض ہیں۔ اگر تعظیم کے لئے قیام مراد ہوتا تو "لام" ذکر ہوتا یوں ارشاد ہوتا:" قوموا لسیدکم "اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ کس طرح اس حدیث سے قیام تعظیم کو ثابت کیا جاتا ہے۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ کہاں علامہ نووی اور قاضی عیاض اور دوسرے جلیل القدر علماء جنہوں نے اسی حدیث پاک سے قیام تعظیمی ثابت کیا ہے اور کہاں سندھی صاحب۔ دوسری بات یہ ہے کہ " الی " ہمیشہ انتہاء مکان کے لئے تو نہیں آتا بلکہ تقرب کے لئے بھی آتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے " الیه یصعد الکلم الطیب " اسی کی طرف پاکیزہ کلمات بلند ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ مکان سے پاک ہے اس لئے " الی " اس مقام پر تقرب کے لئے استعمال ہے مطلب یہ ہے کہ پاکیزہ کلمات رب تعالیٰ کے حضور تقرب اور بلندی درجات حاصل کرتے ہیں۔

اب حدیث پاک کا مفہوم یہ ہوگا کہ تمہارے سردار آرہے ہیں ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور ان کا تقرب حاصل کرو۔

سیدالاولیاء کی شاندار تشریح:

سیدالاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ اسی حدیث پاک کی تشریح میں فرماتے ہیں قانون یہ ہے کہ مشتق کو ذکر کریں تو مبدأ اشتقاق علت ہوتا ہے اب حدیث پاک کا معنی یہ ہوگا:

" قوموا الی سید کم لسیادته تم اپنے سردار کے لئے ان کی سرداری کی وجہ سے کھڑے ہو جاؤ"
اگر صرف سواری سے اتارنے کی امداد کے لئے حکم ہوتا تو ایک یا دو آدمیوں کو کہا جاتا تمام انصار کو کہنے کا کیا مقصد تھا پھر " قوموا الی سعد " کہا جاتا کہ کھڑے ہو کر سعد کو اتارو " قوموا الی سید کم " کیوں کہا؟

دوسری چیز جس سے کوئی شریف انسان عار محسوس نہیں کرتا وہ یہ ہے " وخدمته لضیفه" اپنے مہمان کی خدمت کرنے سے۔

تیسری چیز جس سے کوئی شریف انسان عار محسوس نہیں کرتا وہ یہ ہے " وخدمته للعالم الذی یتعلم منه " اور عالم جس سے انسان تعلیم حاصل کرے اس کی خدمت سے۔ اکثر طور پر جلیل القدر علماء کرام کو دیکھا ہے جو اپنے استاذ کی نعلین مبارک کو اٹھانے اور خدمت گزاری کو اپنے لئے فخر اور باعث سعادت سمجھتے ہیں۔

چوتھی چیز جس سے کوئی شریف انسان عار محسوس نہیں کرتا وہ یہ ہے " والسؤال عمالا یعلم ممن هوا علم منه " اپنے سے زیادہ علم والے سے سوال کرنے میں۔ وہی انسان کامیاب ہے جو اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھے بزرگوں سے علمی سوال کرتا رہے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے۔

(۳۵) دل تمام اعضاء کا رئیس ہے یہ ریاست و سرداری اسے قوت کی وجہ سے حاصل نہیں " فان العظم اقوی منه " کیونکہ ہڈیوں کو اس سے زیادہ قوت حاصل ہے۔ اور یہ سرداری اسے بڑا عضو ہونے کی وجہ سے بھی حاصل نہیں " فان الفخذ اعظم منه " کیونکہ ران کو اس سے بڑائی حاصل ہے۔ اور دل کو یہ ریاست تیزی کی وجہ سے بھی حاصل نہیں " فان الظفر احد منه " کیونکہ ناخن اس سے زیادہ تیز ہیں۔

" وانما تلک الریاسة بسبب العلم فدل علی ان العلم اشرف الصفات "
" بیشک یہ ریاست دل کو علم کی وجہ سے حاصل ہے اسی سے واضح ہوا کہ علم تمام صفات میں سے اعلیٰ و اشرف صفت ہے"

علم کی تین قسمیں ہیں:

(۱) ایسا علم جو مذموم (برا) ہو خواہ تھوڑا حاصل کریں یا زیادہ حاصل کریں۔

(۲) وہ علم جو محمود (اچھا قابل تعریف) ہو۔ خواہ تھوڑا حاصل کریں یا زیادہ حاصل کریں بلکہ جتنا زیادہ حاصل کریں اتنا ہی زیادہ افضل اور احسن ہو۔

(۳) بقدر ضرورت علم کا حاصل کرنا اچھا ہو، لیکن زیادہ وقت اس پر خرچ کرنا، اسی علم میں تمام اوقات کو صرف کرنا اچھا نہیں۔ اور نہ ہی اس کی تعریف کی جا سکتی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسا کہ بدن کے احوال بعض قلیل وکثیر قابل تعریف ہیں۔ جیسا کہ صحت اور حسن وجمال اور بعض احوال مذموم ہوتے ہیں خواہ قلیل ہوں یا کثیر جیسا کہ قبیح شکل اور بدخلقی اور بعض وہ ہیں جو کسی حد تک تو قابل تعریف ہیں۔ لیکن حد سے بڑھ جانے پر قابل مذمت ہیں۔ جیسا کہ مال خرچ کرنا جب وہ میانہ روی پر ہو تو اچھا، لیکن جب حد سے بڑھ جائے جسے تبذیر کہا جاتا ہے وہ مذموم ہے۔

علم مذموم: وہ علم جو قلیل وکثیر مذموم ہے جس میں دین ودنیا میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس علم میں نفع سے نقصان زیادہ ہو جیسا کہ جادو کا علم اور اسی طرح علم نجوم۔ اس علم پر بہت ہی نفیس چیز کو خرچ کرنا یعنی عمر صرف کرنا درحقیقت عمر کو ضائع کرنا ہے اور نفیس چیز کو ضائع کرنا حماقت سے خالی نہیں۔ اور ان علوم میں دین ودنیا کے نقصانات سے غافل رہنا انسانیت نہیں۔

علم محمود: وہ علم جو قلیل وکثیر قابل تعریف ہے وہ علم دین ہے، جس سے رب تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے امور کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخرت دنیا پر مترتب ہے۔ جیسے دنیا میں اعمال ہوں گے ایسے ہی آخرت میں مدارج ہوں گے یعنی آخرت کی سعادت اسی علم پر موقوف ہے۔ اس علم کی حد کو کوئی نہ پا سکا۔ یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا کنارہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ ہاں البتہ انبیاء کرام، اولیاء کرام، اور علم میں راسخ حضرات نے اپنے اپنے مدارج کے مطابق اس علم کو حاصل کیا۔ ان حضرات کے علوم کی حد کو بھی کتابوں میں لکھا نہیں جا سکتا۔ اسلئے کہ ان کے علوم کی دارومدار اللہ تعالیٰ کی عطاء پر ہے ان کی محنت کو اس میں دخل نہیں۔

ایک حد تک علم محمود: وہ علم جو بقدر ضرورت تو محمود ہے لیکن حد سے زیادہ اس پر عمر صرف کرنا قابل تعریف نہیں۔ حساب، ریاضی، سائنس، انگلش وغیرہ کو ضرورت کے مطابق حاصل کرنا تو درست ہے۔ لیکن دینی علوم سے غافل رہ کر صرف ان علوم میں عمر صرف کر دینا کسی طرح بھی قابل تعریف نہیں۔ ان علوم سے آج کل کے نظام دنیا کے مطابق روٹی کمائی جاسکتی ہے۔ لیکن ان علوم سے دین حاصل نہیں ہوسکتا، آخرت میں سعادت حاصل نہیں ہوسکتی۔ (از احیاء العلوم جلد اول)

راقم کے نزدیک اگر ایک شخص پاکستان کا حدود اربعہ نہیں جانتا بلکہ اپنے شہر یا اپنے مکان کا حدود اربعہ نہیں جانتا تو وہ جاہل نہیں لیکن اگر وہ نماز کے ارکان، شرائط، واجبات وسنن کو نہیں جانتا تو وہ بدترین جاہل ہے۔ راقم مدارس ہے اور مصنف بھی ہے خطیب بھی ہے امام بھی لیکن اسلام آباد میں جس مکان میں بائیس سال سے رہ رہا ہے اس کے حدود ثلاثہ کا علم تو ہمیشہ سے حاصل رہا لیکن حدود اربعہ کے علم سے غافل رہا۔ لوگ مجھے عالم کہتے ہیں کوئی حسن ظن رکھتے ہوئے استاذ العلماء بھی کہہ لیتے ہیں اگر کوئی سر پھرا اس وجہ سے مجھے جاہل کہے کہ اسے تو اپنے مکان کا حدود اربعہ معلوم نہیں تو میں اس بدترین جاہل کی زبان کو تو بند نہیں کرسکتا۔

علم کے حصول میں کمی کے اسباب:

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھا جائے کہ علم کا محل دل ہے اور یہ آئینہ کی طرح ہے جس طرح آئینہ میں چیزوں کی صورتیں منقش ہوتی ہیں اسی طرح حقائق کی صورتوں کا دل میں منقش ہونا علم ہے یہاں تین چیزیں ہوں گی ایک آئینہ، دوسری اشیاء اور تیسری ان کی صورتیں۔

اسی طرح علم کے حصول کے لئے بھی تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے دل، حقائق اشیاء اور ان کی صورتیں۔ آئینہ میں چیزوں کے منقش ہونے میں کمی کی پانچ وجہ ہیں:

(۱) آئینہ کا جوہر ہی درست نہ ہو یعنی اس میں صورتوں کے نقش کے قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو یا اس کی بناوٹ میں کمی رہ جائے۔

(۲) آئینہ زنگ آلود ہو جائے میلا ہو جائے۔

(۳) آئینہ اس چیز کے سامنے نہ ہو جس کو آئینہ میں منقش کرنا مقصود ہو۔

(۴) آئینہ اوراس چیز کے درمیان پردہ حائل ہو جائے جس کی وجہ سے وہ چیز آئینہ میں منقش نہ ہو سکے

(۵) آدمی اتنا جاہل ہو کہ اسے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ آئینہ کی کس جانب صورت منقش ہوتی ہے۔

☆ یہی پانچ وجوہ دل سے متعلق ہیں جن کی وجہ سے علم میں کمی رہ جاتی ہے۔ان میں **پہلی** وجہ یہ ہے کہ دل میں کامل صلاحیت ہی نہ ہو کہ وہ تمام چیزوں کا علم حاصل کرے جیسا کہ بچے کے دل میں ابتدائی طور پر صلاحیت کم ہوتی ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے۔ایسے ہی صلاحیت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ان میں **دوسری** وجہ یہ ہے کہ گناہوں کی کدورت اور خباثت دل پر چھا جائے جس کی وجہ سے علم حاصل کرنے کی صلاحیت میں کمی آجائے۔ ہاں البتہ گناہوں سے اعراض کرنے پر اور رب تعالیٰ کی طاعت کی طرف کامل متوجہ ہونے سے دل کی کدورت ختم ہو جاتی ہے اور اس میں جلا پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں علم حاصل کرنے کی اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مسئلہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہو رہا ہے:

﴿ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا ﴾

''اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنی راہوں کی ضرور بر ضرور ہدایت دیں گے''

اور نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی سے بھی واضح ہے:

" من عمل بما علم ورثه الله علم ما لم يعلم "

''جس شخص نے علم کے مطابق عمل کیا اللہ تعالیٰ اسے وہ علم عطاء کرے گا جو اسے پہلے حاصل نہیں تھا''

ان میں **تیسری** وجہ یہ ہے کہ انسان کو جب دنیا کے مصائب و آلام حاصل ہوں اسباب معیشت میں تفکرات حاصل ہوں تو اسکے دل میں صلاحیت ہونے کے باوجود کامل توجہ نہیں رہتی جس کی وجہ سے وہ کامل طور پر علم حاصل نہیں کر سکتا۔ان میں **چوتھی** وجہ یہ ہے کہ خواہشات نفسانیہ وغیرہ دل کے سامنے حجاب کی حیثیت میں آجائیں۔ جنکی وجہ سے علم کے حاصل کرنے میں کمی واقع ہو۔ان میں **پانچویں** وجہ یہ ہے کہ طالب علم مقاصد اور غیر مقاصد کا فرق نہ کر سکے۔ یا استاذ صحیح راہنمائی نہ کرے تو وہ طالب علم اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔(ماخوذ از احیاء العلوم ج ۳ ص ۹)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی علمی فراست کی ایک درخشاں مثال:

بیان کیا جاتا ہے کہ اہل مدینہ کی ایک جماعت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس آئی تا کہ آپ سے امام کے پیچھے قراءت کے متعلق مناظرہ کریں اور ان کو اس مسئلہ میں خاموش کرادیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تم تمام سے علیحدہ علیحدہ گفتگو نہیں کرتا۔ تم اپنے مناظرہ کا معاملہ کسی ایک بڑے عالم کے سپرد کر دو جس سے میں کلام کر لیتا ہوں انہوں نے کہا ٹھیک ہے ان تمام حضرات نے اپنے میں ایک زیادہ علم رکھنے والے کو منتخب کر لیا کہ یہ صاحب تمہارے ساتھ مناظرہ کریں گے۔

آپ نے فرمایا " هذا اعلمكم " کیا یہ تم میں سے بڑے عالم ہیں؟ انہوں نے کہا جی ہاں یہ ہمارے بڑے عالم ہیں پھر آپ نے فرمایا" والمناظرة معه كالمناظرة معكم " کیا اس سے مناظرہ تم تمام سے مناظرہ متصور ہوگا؟ سب نے کہا جی ہاں ان سے مناظرہ ہم سب سے مناظرہ متصور ہوگا۔ پھر آپ نے فرمایا " والالزام عليه كالزامكم عليه" ان کو اگر میں نے کوئی الزامی جواب دیا کیا تم تمام کو وہ الزامی جواب ہوگا؟ انہوں نے ہاں ایسا ہی ہوگا۔ پھر آپ نے فرمایا "وان ناظرته والزمته الحجة فقد لزمتكم الحجة " اگر میں نے ان سے مناظرہ کیا اور ان پر حجت قائم کر دی کیا وہ حجت تم سب پر قائم ہو جائے گی؟ سب نے کہا جو حجت ان پر قائم ہوگی وہ ہم سب پر قائم ہوگی آپ نے ان لوگوں سے پوچھا یہ کیسے ہوگا؟ انہوں نے کہا" لانا رضينا به اماما فكان قوله قولنا" اس لئے کہ ہم اس کے امام بنانے پر راضی ہیں لہٰذا اس کی بات ہماری ہی بات ہوگی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جو مناظرہ تم میرے ساتھ کرنے آئے ہو اس کا جواب تو تمہارے اپنے کلام سے ہی تمہیں مل گیا۔ اس لئے کہ تم اپنے امام کی بات کو اپنی بات کہہ رہے ہو:

" فنحن لما اخترنا الامام في الصلوة كانت قراء ته قراة لنا "

"تو ہم نے جب ایک شخص کو نماز میں امام بنالیا ہے تو اس کی قراءت ہماری قراءت ہوگی"

جب کہ اس پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بھی دلالت کر رہا ہے:

" من كان له امام فقراء ة الامام قراة له "

"جس شخص کا امام ہے تو امام کی قراءت اس شخص کی قراءت ہے"

امام اعظم رحمہ اللہ کے اس شاندار جواب کو سن کر وہ لوگ لاجواب ہو گئے۔ وہ اپنے دلائل پیش کرنے سے ہی عاجز آ گئے۔ اس طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی علمی فراست واضح ہو گئی۔ (از کبیر)

﴿ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ﴾

''انہوں نے عرض کیا پاک ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے بیشک تو ہی علم وحکمت والا ہے''

رب تعالیٰ نے اشیاء کو فرشتوں پر پیش کر کے جب ان کے ناموں کے متعلق سوال کیا تو فرشتوں نے رب تعالیٰ کے حضور اپنے عجز کا اقرار کرتے ہوئے اور یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ انسان کو افضیلت حاصل ہے اور وہ مستحق خلافت ہے اور رب تعالیٰ نے جب ان پر انسان کی تخلیق کی حکمت کو واضح کیا تو اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا:

" سبحانک ای نسبحک سبحانا عن خلو افعالک عن الحکم و المصالح "

''اے اللہ ہم تیرے افعال کو حکمتوں اور مصلحتوں سے خالی ہونے سے تجھے پاک سمجھتے ہیں''

یعنی اے اللہ تعالیٰ ہمیں معلوم ہوگیا کہ تیرے افعال میں طرح طرح کی حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کو سمجھنے سے ہم قاصر تھے:" ذاشعار بان سؤالهم کان استفسارا ولم یکن اعتراضا " یہاں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ان کا رب تعالیٰ سے سوال کرنا (کیا بنائے گا اس میں (خلیفہ) جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا) صرف حقیقت کی وضاحت طلب کرنے کے لئے تھا رب تعالیٰ پر معاذ اللہ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ (از مظهری و بیضاوی)

﴿ سُبْحَانَ ﴾ : مصدر ہے غفران کی طرح، یہ بغیر اضافت کے بہت کم ہی کہیں استعمال ہوتا ہے۔ اور منصوب ہوتا ہے اس سے پہلے فعل محذوف ہوتا ہے جس طرح معاذ اللہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اس کا فعل بھی محذوف ہوتا ہے۔

" یؤدی عن معنی نسبحک تسبیحا معنی یہ ہوگا کہ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں''

(بیضاوی، قرطبی)

علمی نکتہ: دینی طلباء کرام کے ذوق کے لئے یہ ذکر کیا جارہا ہے " انک انت " میں " انت "

ضمیر میں تین احتمال ہیں۔ایک یہ کہ اسم ان اور خبر ان میں یہ فصل ہے کیونکہ مبتداء خبر کے درمیان اصل میں ضمیر فصل کو لایا جاتا ہے جو بعد میں ظاہر عامل کے آنے کے بعد بھی برقرار رہتی ہے۔جس طرح یہاں ہے اسی طرح " کنت انت الرقیب علیهم " میں بھی "انت "ضمیر فصل ہے اور اسی طرح " انـه هـوا لـغـفـور الرحیم " میں بھی " ھو " ضمیر فصل ہے۔دوسرا احتمال یہ ہے کہ "انت "کاف خطاب کی تاکید ہو گویا کہ معنی کاف کا تکرار پایا گیا ہے۔کیونکہ دونوں خطاب کی ضمیریں ہیں اگرچہ کاف ضمیر منصوب متصل ہے اور انت ضمیر مرفوع منفصل۔اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ " انـت "ضمیر مبتداء ہو اور مابعد والے الفاظ "العلیم الحکیم "خبر ہو اور مبتداء خبر مل کر " ان " کی خبر بن جائے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿ الْعَلِيْمُ ﴾ : فعیل کا وزن ہے مبالغہ کے لئے استعمال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے معلومات بے شمار ہیں

﴿ الْحَكِيْمُ ﴾ : "معناه ذوالحکمة " اس کا معنی ہے صاحب حکمت۔اب مفہوم یہ ہوا کہ اے اللہ بیشک تو ہی بہت جاننے والا ہے اور تمام حکمتوں کا مالک تو ہی ہے: " الـحـکیم معناه الحاکم " حکیم کا معنی حاکم بھی آتا ہے۔اسی طرح علیم اور حکیم میں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے:" وقـیـل معناه الـمحکم " بعض حضرات نے کہا حکیم کا معنی محکم (فاعل کا معنی) ہے۔جس طرح سمیع کا معنی مسمع اور علیم کا معنی معلم آتا رہتا ہے۔اور حضرات نے یہ کہا ہے " الحکیم المانع من الفساد "حکیم کا معنی فساد سے روکنے والا۔جیسا کہ کہا جاتا ہے " حکمة اللجام " چونکہ لگام بھی گھوڑے کو سوار کی مرضی کے بغیر چلنے اور ادھر ادھر ہونے سے روکتا ہے۔اسی معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے " الـسـورۃ المحکمة " کہ سورت تغیر و تبدل سے روکی گئی ہے۔بہر حال حکیم کا معنی جب صاحب حکمت کیا جائے تو تمام معانی اس میں آ جائیں گے۔

فائدہ: اگر کسی شخص سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے۔اسے وہ معلوم نہ ہو تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ یہ کہے " اللہ اعلم و لا ادری " اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے میں نہیں جانتا۔ (از روح المعانی وقرطبی)

اسلئے کہ اسے ملائکہ اور انبیاء کرام اور نیک علماء کی اقتداء حاصل ہو جائے گی۔کیونکہ فرشتوں نے رب تعالیٰ کے حضور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ہمیں

کوئی علم حاصل نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں عطاء کیا ہے بیشک تو ہی علیم وحکیم ہے۔

☆ " قد اخبر الصادق ان یموت العلماء یقبض العلم فیبقی ناس جهال یستفتون فیفتون برایهم فیضلون ویضلون "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ علماء کے دنیا سے رخصت ہو جانے پر علم اٹھ جائے گا۔ جاہل لوگ رہ جائیں گے جن سے مسائل پوچھے جائیں گے وہ اپنی رائے سے بیان کریں گے خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

☆ بستی نے مسند صحیح میں ذکر کیا ہے:

" عن ابن عمر ان رجلا سال رسول ال صلی اللہ علیه وسلم ای البقاع شر ؟ قال لا ادری حتی اسأل جبریل ، فسأل جبریل ، فقال لا ادری حتی اسأل میکائیل ، فجاء فقال خیر البقاع المساجد وشرها الاسواق "

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا (یارسول اللہ) تمام مقامات میں سے شر مقام کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا میں نہیں جانتا۔ البتہ جبرائیل سے پوچھوں گا (ہوسکتا ہے اس نے رب تعالیٰ سے کہیں سوال کیا ہو) آپ نے جبرائیل سے پوچھا اس نے کہا میں نہیں جانتا البتہ میکائیل سے پوچھتا ہوں (ہوسکتا ہے اس نے رب تعالیٰ سے سوال کیا ہو) میکائیل آئے انہوں نے بتایا کہ تمام مقامات سے بہتر مقام مساجد ہیں اور تمام مقامات سے برا مقام بازار ہیں''۔

خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد " لا ادری " (میں نہیں جانتا) سے کوئی ذہنی مریض خوش نہ ہو۔ نبی کریم ﷺ کے علم کے متعلق اہل سنت وجماعت کا عقیدہ تفاسیر میں سنہری الفاظ سے لکھا ہوا ہے۔ آیئے اس کی ایک مثال سیکھیے:

" انه ﷺ لم یخرج من الدنیا حتی اعلمه اللہ بجمیع مغیبات الدنیا والاخرة ولکن امر بکتم شیأ منها (حاشیه جلالین از صاوی) ص ۴۹۰ زیر آیته یسلونک عن الساعة ایان مرسها "

''بیشک نبی کریم ﷺ اس وقت دنیا سے تشریف نہیں لے گئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا وآخرت کے تمام غیبی علوم عطا فرما دیئے البتہ بعض چیزوں کے چھپانے

کا آپ کو علم دیا گیا تھا (جیسا کہ قیامت کے متعلق علم)''

☆ '' وقال الصدیق للجدة ارجعی حتی اسأل الناس ''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی جو اپنے پوتے کی وراثت سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہی تھی تو آپ نے فرمایا ابھی تم لوٹ جاؤ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود تو سنا نہیں کہ دادی کا کیا حق ہے۔ البتہ دوسرے حضرات سے پوچھوں گا ہوسکتا ہے آپ سے کسی نے سنا ہو اگر کسی نے بتایا کہ دادی کا یہ حق ہے تو تمہیں دے دیا جائے گا۔

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین مرتبہ یہ فرمایا '' وابردها علی الکبد '' (اس کو جگہ پر ٹھنڈا رکھو) کچھ حضرات نے آپ سے پوچھا اے امیر المؤمنین اس کا مطلب کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:'' ان یسأل الرجل عما لا یعلم فیقول الله اعلم '' کہ جب کسی شخص سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے وہ نہ جانتا ہو تو وہ یہ کہے '' الله اعلم '' (اللہ ہی بہتر جانتا ہے)۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا '' لا علم لی بها '' مجھے اس کا علم نہیں۔ جب وہ شخص چلا گیا۔ تو آپ نے فرمایا مجھ سے وہ مسئلہ پوچھا گیا تھا جس کا مجھے علم نہیں تو میں نے کتنا اچھا جواب دیا کہ میں نہیں جانتا۔ (رواہ الدارمی)

☆ حضرت قاسم بن عبید اللہ کا نسب باپ کی جانب سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اور ماں کی جانب سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ باپ کی جانب سے نسب اس طرح ہے قاسم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب، اور ماں کی جانب سے نسب اسی طرح ہے قاسم کی والدہ ام عبد اللہ بنت قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

ابو عقیل یحیی بن متوکل کہتے ہیں میں قاسم بن عبید اللہ اور یحیی بن سعید کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یحیی نے قاسم کو کہا اے ابو محمد آپ جیسے عظیم شخص سے اگر کسی امر دین کے متعلق سوال کیا جائے تو آپ کو اس کا علم نہ ہو تو یہ بہت قبیح ہے آپ نے فرمایا '' وعـــم ذاک ؟ اس کی کی وجہ ہے؟ یحیی بن سعید نے کہا '' لانک ابن امامی هدی ابن ابی بکر وعمر '' اس لئے کہ تم بڑے جلیل القدر دو راہنما اماموں کی اولاد سے ہو۔ حضرت قاسم بن عبید اللہ نے کہا کہ بہت بری بات یہ ہے '' ان اقول بغیر علم ''

کہ میں بغیر علم کے کوئی بات کہوں۔آپ کا یہ جواب سن کر یحی بن سعید خاموش ہو گئے۔

☆ حضرت مالک بن انس سے مروی ہے میں نے ابن ہرمز کو کہتے ہوئے سنا کہ ہر عالم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو " لا ادری " کہنا سکھائیں کہ ان کے ہاتھوں میں یہ قانون اور ضابطہ ہونا چاہیے کہ جب بھی کسی سے سوال کیا جائے اور وہ اس مسئلہ کو نہیں جانتا تو وہ کہے "لاادری" میں نہیں جانتا۔

☆ ہیثم بن جمیل کہتے ہیں:

" شهدت مالك بن انس سئل عن ثمان و اربعين مسالة فقال في اثنين و ثلاثين منها لا ادری "

"میں گواہی دیتا ہوں کہ مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے اڑتالیس مسائل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے بتیس مسائل کے متعلق فرمایا " لا ادری "میں نہیں جانتا۔

انصاف پسندی کی درخشاں مثالیں:

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ عورتوں کا مہر چالیس اوقیہ (بارہ درھم ایک اوقیہ میں ہوتے ہیں) سے زیادہ مقرر نہ کیا جائے لیکن ایک عورت نے کہا یہ تمہیں کوئی حق حاصل نہیں۔آپ نے فرمایا کیوں؟اس نے کہا رب تعالیٰ نے یہ فرمایا:

﴿ و آتيتم احداهن قنطارا فلا تاخذوا منه شيا ﴾

"اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بدلنا چاہو) اور اسے ڈھیروں مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو"

اس آیۃ میں مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی بلکہ ڈھیروں مال کہا گیا۔اس عورت کی اس دلیل کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: " امرأة اصابت و رجل اخطأ " عورت نے درست کہا اور مرد نے غلط کہا۔سبحان اللہ کتنا جلیل القدر حاکم جس کا نام سن کر قیصری و کسری کانپ جائیں۔لیکن حق بات پر وہ ایک عورت کے سامنے سر جھکا دے کاش آج بھی کوئی ایسا حاکم ملے۔

☆ محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھا آپ نے

بیان فرمایا اس شخص نے عرض کیا "یا امیر المؤمنین ولکن کذا و کذا" اے امیر المؤمنین یہ مسئلہ تو اس اس طرح ہے:" فقال علی اصبت و اخطأت وفوق کل ذی علم علیم" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم نے درست کہا ہے اور میں نے خطا کی ہے۔ ہر صاحب علم کے اوپر کوئی علم والا ہوتا ہے۔ سبحان اللہ علم کے شہر کے دروازہ سے اگر غلطی ہو سکتی ہے۔ تو ہم کیا چیز ہیں کہ ہم سے غلطی نہ ہو۔ غلطی کو مان لینا اپنے سے بڑے عالم نے اگر دلائل سے ثابت کر دیا ہو کہ یہ مسئلہ تم نے درست بیان نہیں کیا تو اعتراف کر لینا اور رجوع کر لینا ہی انصاف پسندی ہے۔ غلطی کو نہ تسلیم کرنے سے ہی اختلافات بڑھتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنی ضد پر قائم نظر آتا ہے اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿ قَالَ یٰاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَاتُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾

"(رب) نے فرمایا اے آدم تم ان کو ان چیزوں کے ناموں کی خبر دے دو۔ جب اس نے (آدم) نے ان کو (فرشتوں کو) تمام چیزوں کے نام بتا دیئے۔ (تو رب تعالیٰ نے) کہا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی تمام چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے تھے"۔

اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو کہا کہ تم ان فرشتوں کو تمام چیزوں کے ناموں کی خبر دو "فسمی کل شئی باسمه و ذکر حکمته التی خلق لها" تو آپ نے ہر چیز کا نام بتایا اور اس چیز کا فائدہ بیان کیا کہ اس کے پیدا کرنے میں حکمت کیا ہے۔ جب آدم علیہ السلام نے تمام چیزوں کے ناموں کی خبر فرشتوں کو دے دی تو رب تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں زمین و آسمان کی چھپی چیزوں کو جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو۔

﴿ اِنِّیٓ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴾ :

" ھو ما قصرت عنہ علوم الخلق وغاب علمہ عن اھلھما لکونہ بحیث لا دلیل علیہ ولا طریق الیہ "

'' زمین وآسمان کے غیب سے مراد یہ ہے کہ وہ علوم جن سے مخلوق کا علم قاصر ہو، اور زمین وآسمان میں رہنے والوں سے وہ علم غائب ہو اس لحاظ پر کہ اس پر کوئی دلیل نہ ہو اور نہ ہی اسے پہچاننے کا کوئی راستہ ہو''

" وفیہ دلیل علی ان ما اطلع اللہ تعالیٰ علیہ بعض عبادہ یسمی غیبا بالنسبۃ الی غیرہ لانہ دخل فی ذلک ما علمہ آدم علیہ السلام "

'' اور اس میں یہ دلیل پائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض خواص کو امور غیبیہ پر مطلع کر دیتا ہے ان کو غیب ہی کہا جاتا ہے کہ وہ بنسبت غیروں کے غیب ہے اس میں آدم علیہ السلام کا علم بھی داخل ہے کہ جن چیزوں کا علم فرشتوں کو نہیں تھا اس غیب پر آدم علیہ السلام کو مطلع کر دیا گیا''۔ (شیخ زادہ)

سبحان اللہ عوام کو بے وقوف بنانے والوں کے اعتراض کو مفسرین کرام نے کیا خوب رد فرما دیا، عوام کو کئی لوگ کہتے ہیں کہ جو چیز بتا دی جائے وہ غیب نہیں رہتی۔ کاش کہ وہ لوگ تفاسیر کا مطالعہ کریں اور مسائل کو سمجھیں جو مسائل کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے انہوں نے ضال اور مضل ہونا ہی ہے

" انی اعلم غیب السموات والارض ، دلیل علی ان احدا لا یعلم من الغیب الا ما اعلمہ اللہ کالانبیاء اومن اعلمہ من اعلمہ اللہ تعالیٰ فالمنجمون والکھان وغیرہ کذبۃ "

'' رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں (کہ میں زمین وآسمان کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہوں) دلیل ہے کہ رب تعالیٰ کے بغیر کوئی غیب نہیں جانتا البتہ رب تعالیٰ اپنے انبیاء کرام کو خود غیب پر مطلع کرتا ہے اس لئے وہ غیب جانتے ہیں پھر انبیاء کرام جن لوگوں کو غیب پر مطلع کریں وہ بھی غیب جانتے ہیں''۔

البتہ نجومی اور کاہن وغیرہ جھوٹے ہیں۔ ان کا دعویٰ کرنا کہ ہم غیب جانتے ہیں سراسر جھوٹ ہے (قرطبی)

سبحان اللہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے کیا خوب مسئلہ حل فرمایا لوگ تو آج تک انبیاء کرام کے علوم غیبیہ میں جھگڑا کر رہے ہیں۔ لیکن علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ غیب تو اولیاء کرام بھی جانتے ہیں۔

فائدہ:

" علوم آدم کائنة منه فاعجز بها الملائکة خاصة واما علوم رسول الله ﷺ فاعجز بها الخلائق جمیعا "

" رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اتنے علوم عطا فرمائے جن سے فرشتے عاجز آ گئے یعنی وہ علوم فرشتوں کو حاصل نہیں تھے لیکن نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اتنے علوم عطا فرمائے جن سے تمام مخلوق عاجز آ گئی، یعنی اتنے علوم اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو عطا فرمائے جو اپنی تمام مخلوق میں سے کسی کو بھی عطا نہیں فرمائے"۔ (از صاوی)

﴿ واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون ﴾

" اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے تھے"

" ما تبدون " سے مراد یہ ہے کہ جو انہوں نے ظاہر طور پر کہا تھا:

﴿ اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفک الدماء ﴾

" کیا تو بنائے گا اس میں جو زمین میں فساد پھیلائے گے اور خون بہائیں گے"

" وما کنتم تکتمون " سے مراد یہ ہے کہ جب انہوں نے آدم علیہ السلام کو عجیب صورت دیکھی اس میں پیٹ دیکھا جو اندر سے خالی اس پر وہ تعجب کر رہے تھے کہ اس صورت میں خلافت کے مستحق ہونے کی کیا وجہ ہے وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے اس باطن تعجب کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا" جو تم چھپاتے تھے میں اسے جانتا ہوں"۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد ابلیس ہے جس نے اپنے نفس میں تکبر اور معصیت کو چھپا رکھا تھا۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ تم میں سے بعض جو اپنی بات کو واضح کر رہے تھے میں اسے بھی جانتا ہوں اور تم میں سے بعض نے اپنے نفس میں جو چھپا رکھا تھا میں اسی بھی جانتا ہوں۔ (از قرطبی)

حاصل کلام:

" معناه انا الذی اعرف الظاهر والباطن والواقع والمتوقع "

" اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ گویا رب تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ میں ظاہر و باطن کو جانتا ہوں جو چیز واقع ہوتی ہے اسے جانتا ہوں جس کے واقع ہونے کی ابھی امید ہو میں اسے بھی جانتا ہوں"۔

" واعلم ان ما ترونه عابدا مطیعا سیکفر ویبعد من حضرتی ومن ترونه فاسقا بعیدا سیقرب من خدمتی "

" بیشک تم ایک شخص کو عبادت گزار اور مطیع دیکھتے ہو میں جانتا ہوں کہ وہ عنقریب کافر

ہو جائے گا اور میرے حضور سے دور ہو جائے گا اور تم ایک شخص کو فاسق سمجھتے ہو اور میری رحمت سے دور سمجھتے ہو میں جانتا ہوں کہ وہ میری خدمت اور میری طاعت کرنے والا ہے اور وہ میرے حضور قریب ہونے والا ہے''۔

اور رب تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی اور فرشتوں پر بھی واضح کر دیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو سمجھنے سے قاصر ہو اور انسان کی کامل عبودیت کی وجہ سے اس کے مرتبہ کو جب فرشتوں پر واضح کر دیا تو انہوں نے بھی اعتراف حقیقت کرتے ہوئے عرض کر دیا اے اللہ ہم تو صرف وہی جانتے ہیں جو تو نے ہمیں علم عطاء فرمایا۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیه: " والمراد بالغیب المذکور ما اجمل سابقا بقوله انی اعلم مالا تعلمون"

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے استفسار پر جو فرمایا " انی اعلم مالا تعلمون " (بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) اس میں اجمالی طور پر جو ذکر تھا اسی کو واضح طور پر " انی اعلم غیب السموات والارض "میں بیان کر دیا گیا۔

یعنی پہلے صرف یہ ذکر فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے پھر اسی کی وضاحت کر دی کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں زمین و آسمانوں کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہوں اور جسے تم ظاہر کرتے ہو اسے بھی جانتا ہوں اور جسے تم چھپاتے تھے اسے بھی جانتا ہوں۔ (از شیخ زادہ)

آدم علیہ السلام کو نام سکھائے ،فرشتوں کو نہیں کیا وجہ؟

الفاظ کے ذریعے معانی کا علم حاصل ہوتا ہے جس کے پڑھانے والے کو معلم کہتے ہیں اور پڑھنے والے کو متعلم صرف معلم کے پڑھانے سے متعلم کو علم حاصل ہونا ضروری نہیں بلکہ متعلم میں استعداد کا پایا جانا ضروری ہے۔ یعنی متعلم میں سمجھنے کی صلاحیت ہو تو معلم کی تعلیم کا اس پر اثر ہوگا۔ یہ روزمرہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں ایک ہی کلاس کے لڑکوں کو استاذ پڑھاتا ہے سب کو یکساں پڑھا رہا ہوتا ہے لیکن پھر کوئی لائق ہوتا ہے اور کوئی نالائق۔

اللہ تعالیٰ نے بھی جب آدم علیہ السلام کو منصب خلافت عطاء کرنا تھا تو آپ کو پہلے تمام اشیاء اور ان کی کیفیات اور انکے ناموں کو سمجھنے کی استعداد بھی عطاء فرمائی لیکن فرشتوں کو ہر ہر چیز کے حالات کی تفاصیل کو سمجھنے کی استعداد عطاء نہیں ہوئی تھی کیونکہ ان کو منصب خلافت پر فائز کرنا مقصود ہی نہیں تھا۔

مندرجہ بالا مضمون تفسیر ابی السعود سے لیا ہے طلباء کرام کی دل چسپی کے لئے عربی عبارت تحریر کر رہا ہوں تا کہ ان کا ذوق دوبالا ہو جائے:

" اذا العلم بالالفاظ من حيث الدلالة على المعانى مسبوق بالعلم بها والتعليم حقيقة عبارة عن فعل يترتب عليه العلم بلا تخلف عنه ولا يحصل ذلک بمجرد اضافة المعلم بل يتوقف على استعداد المتعلم لقبول الفيض ولقيه من جهته .... وهو السر فى ايثاره على الاعلام والانباء فانهما انما يتوقفان على سماع الخبر الذى يشترک فيه البشر والملک وبه يظهران جقيقته بالخلافة منهم عليهم السلام لما ان جبلتهم غير مستعدة للاحاطة بتفاصيل احوال الجزئيات الجسمانية خبرا " (تفسير ابى السعود)

اس کے بعد " انک انت العليم الحكيم " کی تفسیر میں ابوالسعود فرماتے ہیں گویا کہ فرشتوں نے کہا:

" انت العالم بكل المعلومات التى من جملتها استعداد آدم عليه السلام لما نحن بمعزل من الاستعداد له من العلوم الخفية المتعلقة بما فى الارض من انواع المخلوقات التى عليها يدور فلک خلافة الحكيم الذى لا يفعل الا ما تقتضيه الحكمة ومن جملته تعليم آدم عليه السلام ما هو قابل له من العلوم الكلية والمعارف الجزئية المتعلقة بالاحكام الواردة على ما فى الارض وبناء امرا الخلافة عليها "

اے اللہ تو ہی تمام معلومات کا علم رکھتا ہے۔ اور تو ہی جانتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو استعداد حاصل ہے تمام خفی علوم کی جن کا تعلق زمین کی مختلف مخلوقات سے ہے ہمیں وہ استعداد حاصل نہیں۔ اے اللہ ساری مخلوقات کا نظام بڑی حکمت کے تقاضا کے مطابق ہے۔ آدم علیہ السلام کو تمام علوم کلیہ اور معارف جزئیہ کا علم تو نے دیا ہے جن کا تعلق زمین میں رہنے والی مخلوق کو احکام عطاء ہونے سے ہے آدم علیہ السلام کی خلافت کی دارومدار بھی اسی استعداد پر ہے۔ (از تفسير ابى السعود)

تنبیہ: جب یہ واضح ہوگیا کہ فرشتوں میں اتنے علوم حاصل کرنے کی استعداد ہی نہ تھی جتنے علوم حضرت آدم علیہ السلام کو عطا کئے گئے تو اسے یہ سمجھنا آسان ہوگیا کہ آدم علیہ السلام کے بتانے کے بعد فرشتوں کو وہ تمام علوم حاصل نہ ہو سکے جو آدم علیہ السلام کو حاصل تھے اس لئے کہ تمام علوم کو حاصل کرنے کی ان میں استعداد ہی نہ تھی۔ ہاں البتہ آدم علیہ السلام کی افضلیت آپ کے علم کی فوقیت اور رب تعالیٰ کی حکمت کے متعلق وہ جان گئے۔

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ، اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ﴾

☆ ''اور (یادکرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا''

☆ ''اور (یادکرو) جب ہم نے فرشتوں کو کہا'' آدم کو سجدہ کرو'' تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافر ہو گیا''

مختصر مطلب: حضرت آدم علیہ السلام نے جب تمام چیزوں کے نام بتادیئے جن کے بتانے سے فرشتے عاجز آ گئے تھے۔ اور فرشتوں کو آدم علیہ السلام کی برتری کا علم ہو گیا، اور خلیفہ بنانے کی رب تعالیٰ کی حکمت سمجھ آ گئی۔ تو رب تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم علیہ السلام کو سجدو کرو، رب تعالیٰ کے اس حکم کو مانتے ہوئے تمام فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے سجدہ نہ کیا، بلکہ سجدہ کرنے سے صاف انکار کر دیا اور تکبر کیا جس کی وجہ سے وہ کافر ہو گیا۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ وَاِذْ قُلْنَا ﴾: ای واذکر، یعنی" اذ "سے پہلے " اذکر "مقدر ہے، جس کا معنی ہے 'یادکرو'

اگر چہ ابوعبیدہ نے " اذ "کو زائدہ کہا ہے، **فلیس بجائز " لان اذ ظرف "** اس کا یہ قول درست نہیں۔ کیونکہ "اذ" ظرف ہے جس سے پہلے اکثر طور پر " اذکر "مقدر ہوتا ہے:

" وقال قلنا لم یقل قلت لان الجبار العظیم یخبر عن نفسه بفعل الجماعة تفخیما واشادة بذکره "

''رب تعالیٰ نے اپنے قول کو " قلنا " (ہم نے کہا) سے تعبیر کیا ہے " قلت " (میں نے کہا) سے تعبیر نہیں کیا۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ جبار ہے اور عظیم ہے وہ اپنے فعل کو ایک جماعت کے فعل سے تعبیر کرتا ہے تا کہ سننے والے اس قول کی بلندی شان سمجھیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ حکم بہت پختہ ہے''۔

تنبیہ: رب تعالیٰ خود اپنا ذکر جمع کے صیغوں سے کرتا ہے۔لیکن بندے اسے واحد کے صیغہ سے ذکر کریں،اس لئے کہ رب تعالیٰ کی سب سے بڑی شان ہی یہ ہے کہ اس کو ایک کر کے بلایا جائے،تا کہ سنتے ہی معلوم ہو جائے کہ وہ ایک ہی عبادت کے لائق ہے،اس کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں۔

اذ کرمقدر سے ماقبل سے تعلق واضح ہو گیا:

انسانوں پر رب تعالیٰ کے جو انعامات ہیں ان کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اے انسان جب رب تعالیٰ نے تمہیں علم جیسی عظیم نعمت سے نوازا۔تو یہ بھی سمجھ کہ تیرے باپ آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنایا۔جس کی عظمت تجھے بھی حاصل ہے اور یہ تیرے لئے بھی عظیم نعمت ہے۔

سجدہ کا لغوی معنی:

" السجود معناه فی کلام العرب التذلل والخضوع "

''سجدہ کا لغوی معنی جھکنا اور عجز کا اظہار کرنا اس معنی میں عرب حضرات نے اس کو عام طور پر استعمال کیا ہے"

جیسا کہ شاعر نے کہا:

بجمع تضل البلق فی حجراته　　تری الاکم فیها سجدا للحوافر

شاعر نے بنی عامر سے کہا کہ میرا پتہ تمہیں اس وقت چلے گا جب میں بڑا لشکر لا کر تم پر حملہ کر دوں گا۔جس کا اطراف میں ابلق گھوڑوں کا پتہ نہیں چل سکے گا۔اور جس کے گھوڑوں کے ٹاپوں کے آگے ٹیلے سجدہ کریں گے،یعنی ان گھوڑوں کے ٹاپوں کے آگے ٹیلے بھی جھک جائیں گے۔

''**وقلن له اسجد لليلى فأسجدا**　عورتوں نے ایک اونٹ کو کہا لیلیٰ کے سامنے جھک جا تو وہ جھک گیا''

اسی طرح جن دراہم پر تصویریں ہوں ان کے لئے " **دراهم الاسجاد** " بولتے ہیں کہ دراہم تصویروں کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔　(قرطبی)

اصلاح شرع میں سجدہ:

شرعی طور پر سجدہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت خود نبی کریم ﷺ نے فرمادی:

"عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امرت ان السجد على سبعة اعظم على الجبهة واليدين والركبتين واطراف القدمين" (الكتب الستة)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں (اعضاء) پر سجدہ کروں، پیشانی، دونوں ہاتھوں، دونوں گھٹنے، اور قدموں کے اطراف (قدموں کی انگلیاں)"

فائدہ:

"ولابى حنيفة رحمه الله ان السجود يتحقق بوضع بعض الوجه وهو المامور به الا ان الخد والذقن خارج بالاجماع"

"امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چہرے کا بعض حصہ زمین پر لگانے سے سجدہ ادا ہو جائے گا لیکن صرف رخسار لگانے سے یا صرف ٹھوڑی لگانے سے سجدہ ادا نہیں ہوگا۔ اس پر تمام اہل علم کا اجماع ہے"

واضح ہوگیا کہ سجدہ پیشانی لگانے سے ادا ہوگا، رخسار یا ٹھوڑی لگانے سے سجدہ ہوتا ہی نہیں، کوئی شخص کسی قبر پر رخسار رکھ دے تو جہلاء کی طرف سے شرک کی مشین چل جاتی ہے۔ جو چیز سجدہ ہی نہیں اسے سجدہ بنا کر مسلمانوں کو مشرک کہہ کر کذب بیانی اختیار کر کے اپنی عاقبت برباد کر رہے ہیں۔

تنبیہ:

"واما وضع القدمين فقد ذكر القدوری انه فرض فی السجود فاذا سجد ورفع اصابع رجليه عن الارض لا يجوز كذا ذكره الكرخی والجصاص ولو وضع احداهما جائز قال قاضيخان ويكره". (عناية)

"سجدہ میں دونوں قدموں کا زمین پر رکھنا قدوری کے نزدیک فرض ہے۔ جب سجدہ کرے اور دونوں پاؤں کی انگلیوں کو زمین سے اٹھالے تو جائز نہیں۔ یہی قول علامہ کرخی اور جصاص کا ہے۔ تاہم اگر ایک پاؤں کو زمین پر رکھے تو قاضی خان رحمہ اللہ علیہ

نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن فرمایا کہ یہ مکروہ ہے۔ صاحب عنایہ نے اگرچہ اسی مقام پر تحریر فرمایا"۔

" وذکر الامام التمرتاشی ان الیدین و القدمین سواء فی عدم الفرضیة وھو الذی یدل علیه کلام شیخ الاسلام فی مبسوطه وھو الحق "

" امام تمرتاشی نے کہا ہے کہ دونوں ہاتھوں اور دونوں قدموں کا زمین پر لگنا فرض نہیں، اسی پر شیخ الاسلام کی کلام بھی مبسوط پر دلالت کر رہی ہے اور وہی حق ہے"

لیکن راقم کے نزدیک حق مذہب وہی ہے جو قاضی خان رحمہ اللہ کا ہے، اس مسئلہ کو مولنا محمود احمد رضوی نے بہت خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔

" واستقبل باطراف اصابع رجلیه القلبة " (بخاری) "اور پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ رکھنا"

فائدہ: اس حدیث سے فقہاء احناف نے یہ استدلال کیا کہ پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ اسی صورت میں ہوسکتی ہیں جب کہ پاؤں کی انگلیوں کے پیٹ زمین سے لگ جائیں، لہذا پاؤں کی ایک انگلی کے پیٹ کا زمین سے لگنا شرط ہے، تو اگر (دونوں) پاؤں زمین سے اٹھے رہے تو نماز نہ ہوئی۔ اسی طرح اگر صرف انگلی کی نوک زمین سے لگی جب بھی نماز نہ ہوگی۔ پاؤں کی دسوں (تمام) انگلیوں کے پیٹ زمین پر لگنا سنت ہے اور ہر پاؤں کی تین انگلیوں کے پیٹ زمین پر لگنا واجب ہے اور دسوں انگلیوں کا قبلہ رخ ہونا سنت ہے۔ (فیوض الباری شرح بخاری ج۲ پارہ سوم ص ۴۴۹)

سجدہ کی دو قسمیں ہیں: سجدہ کی ایک قسم سجدہ عبادت ہے اور دوسری قسم سجدہ تعظیمی

سجدہ عبادت اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کو جائز نہیں:

" ان السجود الشرعی عبادة وعبادة غیرہ سبحانه شرک محرم فی جمیع الادیان والازمان ولا ارھا حلت فی عصر من الاعصار " (روح المعانی)

" عبادت کی غرض سے سجدہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کے لئے شرک اور حرام ہے تمام دینوں اور تمام زمانوں میں شرک ہی رہا کسی زمانہ میں بھی اس کی حلت نظر نہیں آتی (ترجمہ میں راقم نے کچھ تغیر کیا ہے)"۔

سجدہ تعظیمی:

نبی کریم ﷺ سے پہلے سجدہ تعظیمی جائز تھا، لیکن آپ کی شریعت میں سجدہ تعظیمی بھی ناجائز قرار دے دیا گئی۔ پہلی شریعتوں میں سجدہ کے جواز پر خود قرآن پاک شاہد ہے " ورفع ابویہ علی العرش وخروا لہ سجدا " اور (یوسف نے) اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لئے سجدہ میں گرے۔

علامہ نعیم الدین مراد آبادی اس کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں: یہ سجدہ تحیۃ وتواضع کا تھا۔ جو ان کی شریعت میں جائز تھا۔ جیسا کہ ہماری شریعت میں کسی معظم کی تعظیم کے لئے قیام اور مصافحہ اور دست بوسی جائز ہے۔ سجدہ عبادت اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے بھی جائز نہیں ہوا نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ شرک ہے اور سجدہ تحیۃ وتعظیم بھی ہماری شریعت میں جائز نہیں۔ (خزائن العرفان)

لطف کی بات یہ ہے کہ مفتی محمد شفیع دیو بندی لکھتے ہیں: یہ تو ظاہر ہے کہ یہ (آدم علیہ السلام کو) سجدہ عبادت کے لئے نہیں ہوسکتا کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک وکفر ہے جس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ کسی وقت کسی شریعت میں جائز ہو سکے۔ اس کے سوا کوئی احتمال نہیں کہ قدیم انبیاء کے زمانہ میں سجدے کا وہی درجہ ہوگا جو ہمارے زمانے میں سلام، مصافحہ، معانقہ اور دست بوسی یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانے کا ہے۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں یہی فرمایا ہے کہ انبیاء سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور تحیۃ کیلئے سجدہ مباح تھا، شریعت محمدیہ میں منسوخ ہو گیا اور بڑوں کی تعظیم کیلئے صرف سلام مصافحہ کی اجازت دی گئی۔ رکوع اور سجدہ اور بہیت نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دے دیا گیا۔

(معارف القرآن جلد اول ص ۱۸۸)

☆ " عن قیس بن سعد قال اتیت الحیرۃ فرأیتھم یسجدون لمر زبان لھم فقلت رسول اللہ ﷺ احق ان یسجد لہ فاتیت رسول اللہ ﷺ فقلت انی اتیت الحیرۃ فرأیتھم یسجدون لمر زبان لھم فانت احق بان یسجد لک فقال لی ارأیت لو مررت بقبری اکنت تسجد لہ فقلت لا فقال لا تفعلوا لو کنت آمر احدا ان یسجد لاحد لامرت النساء ان یسجدن لازواجھن لما جعل اللہ لھم علیھن من حق "

(رواہ ابو داؤد ورواہ احمد عن معاذ بن جبل، مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

حضرت قیس بن سعد فرماتے ہیں میں حیرہ میں آیا تو میں نے ان لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو سجدہ کررہے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ رسول اللہ ﷺ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے کہا بیشک میں حیرہ میں گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے سردار کو سجدہ کررہے ہیں آپ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے آپ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تم میری قبر سے گزرے تو کیا میری قبر کو سجدہ کرو گے میں نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا تم (مجھے سجدہ) نہ کرو۔ اگر میں کسی ایک کو کسی کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کے عورتوں پر حقوق رکھے ہیں۔

وضاحت حدیث:

حیرۃ: حاء کے نیچے کسرہ ہے کوفہ کے علاقہ میں ایک قدیمی شہر کا نام ہے۔

مرزبان: میم پر فتح ہے اور زاء پر ضمہ بادشاہ سے کم درجہ ہو لیکن قوم سے اوپر درجہ رکھتا ہو بہادر اور شاہ سوار ہو حضرت قیس بن سعد کو یہ کیوں خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے؟

"لانه اعظم المخلوقات واکرم الموجودات"

"اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات سے عظیم درجہ رکھتے ہیں اور تمام موجودات سے آپ مکرم ہیں"

"فرأيتهم يسجدون لمرزبان لهم، تعظيما له و تكريما" حضرت قیس بن سعد نے کہا میں نے حیرہ میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو تعظیم وتکریم کے لئے سجدہ کررہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے جو جواب دیا اس میں "اظهار العظمة الربوبية واشعارا لمذلة العبودية" یہ بتایا گیا کہ رب تعالیٰ عظیم ذات ہے بندہ عاجز ہے اس لئے سجدہ خواہ عبادت کا ہو یا تعظیم کا ہو وہ صرف اسی ذات کے لائق ہے جو عظیم ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے ہی علامہ طیبی رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمایا کہ آپ کے ارشاد کا گویا کہ یہ مطلب تھا "اسجدوا للحی الذی لا یموت" سجدہ صرف اسی ذات کو کرو جو ہمیشہ کے لئے

زندہ ہے اس پر موت واقع نہیں ہوگا۔

(خیال رہے یہ روایت جامع صغیر، مستدرک حاکم، ترمذی، ابن ماجہ میں بھی مختلف الفاظ سے مذکور ہے)

دست بوسی: ابھی ماقبل فاضل مرادآبادی صاحب کی تفسیر خزائن العرفان اور مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کی تفسیر معارف القرآن سے ذکر کیا کہ دست بوسی جائز ہے۔ یعنی بزرگوں کے ہاتھ چومنے جائز ہیں۔ آیئے اسی مسئلہ کو احادیث کی روشنی میں دیکھئے:

☆ صفوان بن عسال کی حدیث میں مذکور ہے۔ دو یہودی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے "**فقبلا یدہ ورجلیہ**" ان دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں چومے۔

خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو منع نہیں فرمایا آپ کا نہ روکنا حدیث تقریری ہے۔ جس سے روز روشن کی طرح بزرگوں کی صرف دست بوسی ہی نہیں بلکہ قدم بوسی کا جواز بھی مل گیا۔

(مشکوٰۃ باب الکبائر وعلامات نفاق)

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک سریہ میں بھیجا۔ ہم اس میں پسپا ہوگئے۔ ہم مدینہ طیبہ میں آئے تو (حیاء کی وجہ سے) چھپ رہے تھے۔ ہم نے کہا ہم تو ہلاک ہوگئے۔ پھر ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہم نے عرض کیا "**نحن الفرارون**" ہم تو بھاگنے والے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "**لا بل انتم العکارون قال فدنونا فقبلنا یدہ**" (ابوداؤد، مشکوٰۃ باب القتال فی الجہاد) نہیں تم تو جنگ کی طرف لوٹنے والے ہو۔ حضرت ابن عمر کہتے ہیں ہم آپ کے قریب ہوئے ہم نے آپ کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔

نبی کریم ﷺ کی شفقت ورحمت کا اندازہ کریں کہ صحابہ کرام کی دل جوئی کے لئے کیا خوب حکمت بھرا ارشاد فرمایا۔ کہ جنگ میں وقتی طور پر پسپا ہونے سے شرمندہ نہ ہوں تم نے تو پھر جنگ میں جانا ہے اور کفار کو شکست دینی ہے۔ اور حدیث پاک سے ہاتھوں کا چومنا بھی واضح طور پر سمجھ آ گیا۔

☆ "**قال النووی تقبیل یدا لغیر ان کان لعلمه وصیانته وزهده ودیانته ونحو ذلک من الامور الدینیة لم یکره بل یستحب وان کان لغناه او جاهه فی دنیاه کره وقیل حرام**"

(مرقاۃ ج ۹ ص ۷۲)

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں غیر کے ہاتھوں کو چومنا اس شخص کے علم اور گناہوں سے بچنے اور اس کے زہد اور اس کے دین دار ہونے کی وجہ سے مکروہ نہیں بلکہ مستحب ہے۔اسی طرح کوئی بھی اس کا دینی منصب دیکھ کر ہاتھوں کو چوما تو یہ مستحب ہے۔

اگر کسی کے ہاتھ اس لئے چومے کہ یہ غنی ہے یا یہ سردار ہے اور دنیاوی طور بڑے منصب کا مالک ہے تو یہ مکروہ ہے بلکہ بعض حضرات نے اسے حرام کہا ہے۔

آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے کونسا سجدہ کیا؟

اگر چہ اس میں مختلف قول ہیں ایک یہ ہے کہ یہ سجدہ عبادت تھا حقیقت میں سجدہ رب تعالیٰ کو تھا آدم علیہ السلام قبلہ کی طرح تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ سجدہ حقیقی تھا ہی نہیں بلکہ صرف فرشتوں نے جھک کر سلام کیا اسی کو سجدہ کہا گیا۔لیکن صحیح قول یہ ہے:

"ان السجدة كانت لآدم عليه السلام تعظيما له وتحية له كالسلام منهم عليه وقد كانت الامم السالفة تفعل ذلك كما يحى المسلمون بعضهم بعضا بالسلام وقال قتاده في قوله (وخروا له سجدا) كانت تحية الناس يومئذ سجود بعضهم لبعض" (کبیر)

"حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کیا (یعنی پیشانی کو زمین یا آسمان پر رکھ کر) یہ سجدہ تعظیم کے لئے تھا جیسا فرشتوں نے آپ کو سلام بھی کہا تھا۔پہلی امتوں میں ایک دوسرے کو سجدہ کر کے ہی تحیۃ وتعظیم کی جاتی جیسا کہ مسلمان صرف سلام سے تحیۃ پیش کرتے ہیں۔حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وخروا له سجدا ﴾ کی تفسیر میں یہی بیان کیا ہے کہ اس وقت بعض لوگ دوسرے بعض کو سجدہ سے تحیۃ پیش کرتے تھے"۔

فائدہ جلیلہ:

جس طرح شروع میں ذکر کر دیا گیا کہ عالم اجسام میں حضرت آدم علیہ السلام ہی پہلے انسان

ہیں اور اللہ کے خلیفہ ہیں لیکن عالم حقائق میں سب سے اول اور خلیفہ اعظم نبی کریم ﷺ ہیں۔ آپ نے خود ارشاد فرمایا" کنت نبیا آدم بین الروح والجسد " میں اس وقت نبی تھا جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔

بعض مفسرین نے لکھا کہ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت محمد ﷺ کی قبر انور کی جگہ سے حضور کے اجزاء جسمیہ مبارکہ کی مٹی لے گئے اور یہ آب تسنیم سے گوندھی گئی اور اسے جنت کی نہروں میں غوطے دلوائے گئے۔ پھر اسے زمینوں اور آسمانوں میں پھرایا گیا آپ کو فرشتوں نے آدم سے پہلے پہچان لیا۔ پھر جسدِ آدم کی مٹی کے ساتھ اسے ملا دیا گیا پھر آدم میں روح پھونکی گئی اور نور محمد ﷺ آدم کی پیشانی میں چمکایا گیا۔ (تفسیر ثعالبی ملخصا بحوالہ خلاصۃ التفاسیر ج ۱ ص ۲۵)

پیشانی آدم میں نور محمدی کا چمکنا ان کے مسجود ملائکہ ہونے کا سبب ہوا جیسا کہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر فرمایا:

" ان الملئکة امروا بالسجود لآدم لاجل ان نور محمد ﷺ کان فی جبهة آدم " (کبیر ج ۲ ص ۴۵۵)

"یعنی فرشتوں کو آدم کے لئے سجدے کا حکم اسی لئے ہوا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا نور مبارک ان کی پیشانی میں تھا۔ اس عبارت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اعظم حضور ﷺ ہی ہیں، آدم علیہ السلام کی خلافت حضور ﷺ کی خلافت کا ظہور ہے"۔ (از التبیان مع البیان للکاظمی ص ۱۳۱)

﴿ فَسَجَدُوْا ﴾ :۔ "تو سب نے سجدہ کیا" چونکہ اللہ تعالیٰ کا خطاب بھی عام تھا، یعنی سب فرشتوں کو ہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ تو تمام فرشتوں نے رب تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرتے ہوئے سجدہ کیا۔ (سوائے ابلیس کے) اسی پر ارشاد باری تعالیٰ شاہد ہے:

﴿ فسجد الملئکة کلهم اجمعون ﴾ "تو سب فرشتوں نے سجدہ کیا" (خازن)

ملائکہ میں سب سے پہلے سجدہ کرنے والے حضرت جبریل ہیں۔ پھر میکائیل، پھر اسرافیل، پھر عزرائیل اور پھر تمام ملائکہ مقربین یہ سجدہ جمعہ کے روز زوال سے عصر تک ہوا۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ ملائکہ مقربین سو برس تک سجدہ میں رہے۔ اور ایک قول ہے کہ پانچ سو برس سجدہ میں رہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) (تفسیر الحسنات)

﴿ اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ ﴾: ''سوائے ابلیس کے'' یعنی رب تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرتے ہوئے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔

﴿ اَبٰی وَاسۡتَكۡبَرَ ﴾ : ''اس نے انکار کیا اور تکبر کیا''

﴿ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴾ : ''اور کافروں سے ہو گیا''

" ابلیس " عجمی لفظ ہے، غیر منصرف ہے علیت اور عجمہ ہونے کی وجہ سے اس لفظ کا وزن فعلیل ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ یہ لفظ عربی ہے مشتق ہے " ابلاس " سے اس کا معنی ہے خیر سے دور ہونا اور رحمت سے ناامید ہونا۔ اب اس کا وزن ہوگا " افعیل " غیر منصرف اس لئے ہوگا کہ اس کی نظیر عربی میں نہیں پائی گئی گویا کہ لفظ عجمی ہے۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: ابلیس کا نام ابلیس سجدہ سے انکار کرنے کے بعد رکھا گیا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو گیا:

" وكان اسمه عزازيل بالسريانية و بالعربية الحارث فلما عصى غير اسمه فسمى ابليس وغيرت صورته "

'' پہلے اسم کا نام سریانی زبان کے مطابق عزازیل تھا اور عربی میں حارث تھا۔ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی تو اس کا نام تبدیل کر دیا گیا اور اس کی شکل بھی تبدیل کر دی گئی'' (خازن)

﴿ اَبٰی وَاسۡتَكۡبَرَ ﴾ : '' (ابى) اى امتنع من السجود '' یعنی وہ سجدہ کرنے سے رک گیا، مطلب یہ ہے کہ اس نے رب تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی رب تعالیٰ کے حکم کے ماننے سے انکار کیا۔

" (واستكبر) من عطف العلة على المعلول اى ابى و امتنع لكبره و السين للتاكيد " (صاوی)

شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے تکبر کیا۔ یعنی سجدہ نہ کرنے کی علت اس کا تکبر ہے۔ یعنی یہاں علت کا معلول پر عطف ہے۔ کیونکہ اس کا تکبر کرنا علت ہے۔ اور

انکار کرنا معلول ہے اس کے تکبر کرنے کو رب تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا کہ اس نے کہا:

﴿ خلقتنی من نار و خلقته من طین ﴾

''کہ اے اللہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا''

ابلیس کی یہ سوچ بھی غلط تھی کیونکہ آدم علیہ السلام کی پیدائش عناصر اربعہ سے ہوئی۔ اگر چہ مٹی کا ذکر واضح تھا۔ اس لئے آدم علیہ السلام بحیثیت مادہ کے بھی افضل تھے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ تمام مخلوق کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ کون افضل ہے اور اس کی افضیلت کی وجہ کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے اسے افضل بنا دے۔ (از صاوی)

﴿ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾: اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ " کان هنا بمعنی صار " یہاں "کان " کا وہی معنی ہے جو " صار " کا ہے یعنی جب اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا تو کافر ہو گیا۔

جیسا کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے نے جب کشتی میں بیٹھنے سے انکار کیا " فکان من المغرقین " تو غرق ہو گیا۔ اس مقام پر بھی " کان " " صار " کے معنی میں استعمال ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ "کان " اپنے معنی میں ہی استعمال ہے یعنی معنی یہ ہے " کان فی علم الله تعالیٰ انه سیکفر " کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں کافر تھا۔ یعنی وہ عنقریب کافر ہو جائے گا۔

اس پر بخاری کی اس حدیث کو دلیل بنایا جا سکتا ہے " وانما الاعمال بالخواتیم " بیشک اعمال کی دارومدار فقط خاتمہ پر ہے۔ اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ " ان ابلیس عبد الله تعالیٰ ثمانین الف سنة " بیشک ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی اسی ہزار سال عبادت کی۔

- " واعطی الریاسة والخزانة فی الجنة علی الاستدراج "

''ابلیس کو آہستہ آہستہ جنت کی سرداری عطا کر دی گئی اور اسے جنت کا خازن بنا دیا گیا''

" فکان فی ریاسته والکبر فی نفسه متمکن "

''ریاست اور تکبر اس کے نفس میں راسخ ہو گئے''

"قال ابن عباس کان یری لنفسه ان له فضیلة علی الملائکة بما عنده فلذلک قال انا خیر منه "

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابلیس اپنے آپ کو فرشتوں سے

افضل سمجھنے لگ گیا تھا کیونکہ اسے سرداری اور خازن جنت ہونے کا مقام مل گیا تھا اسی وجہ سے اس نے کہا تھا میں آدم سے بہتر ہوں"۔

اعتراض: یہاں سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ آدم علیہ السلام نے جب فرشتوں کو تمام چیزوں کے نام بتا دیئے تو اس کے بعد رب تعالیٰ نے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔

لیکن دوسری آیۃ سے سمجھ آ رہا ہے کہ آدم علیہ السلام میں روح پھونکتے ہی فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ نام بتانے والا مسئلہ بعد میں درپیش آیا۔

رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اذ قال ربک للملئکة انی خالق بشرا من طین ☆ فاذا سویته و نفخت فیه من روحی فقعوا له سجدین ﴾

" جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں مٹی سے انسان بناؤں گا پھر جب میں اسے ٹھیک بنا لوں اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونکوں تو تم اس کے لئے سجدے میں گرنا"

اس آیۃ میں " فقعوا " میں فاء ہے جو تعقیب مع الوصل کا تقاضا کرتی ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ فرشتوں کو رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ آدم میں نفخ روح کے ساتھ ہی تم نے سجدہ کرنا ہے۔ ان میں تطبیق کیسے پائی گئی؟

جواب: " الفاء للسببیة لا للتعقیب " ،فقعوا ، میں فاء سببیت کیلئے ہے۔ تعقیب کیلئے نہیں۔
(روح المعانی)

قرآن پاک میں چونکہ بعض آیات بعض کا بیان ہیں۔ اس لئے دونوں آیتوں کو جمع کرنے سے نتیجہ واضح ہو جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشادات کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے خلیفہ بنانے کا مشورہ کیا۔ انہوں نے تعجب سے سوال کیا کہ وہ کیسے خلیفہ ہوں گے جو خونریزیاں کریں گے اور فساد پھیلائیں گے؟

تو رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے فرشتوں سے پوچھا وہ نہ بتا سکے آدم علیہ السلام نے جب فرشتوں کو بتا دیا۔ تو رب تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ میں تمہیں سجدہ کرنے کا حکم دے رہا ہوں لہٰذا میرے حکم کے بعد تم جلدی ہی سجدہ میں گر جاؤ۔

اگرچہ تفسیر عزیزی میں ایک اور جواب دیا گیا ہے۔لیکن راقم کو وہی جواب مناسب نظر آیا جو نقل کردیا گیا۔تاہم شاہ عبدالعزیز صاحب کا جواب بھی مدنظر رہے۔وہ یہ ہے:

" قبل از پیدائش حضرت آدم نیز حکم شده بود که حضرت آدم را بعد از پیدائش سجده نمایند اما وجوب اد ای سجده بایں امر دیگر ثابت شد "

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد تم نے سجدہ کرنا ہے لیکن سجدہ کرنے کا حکم یعنی اس پر عمل کرنے کا حکم اس آیۃ سے ہوا جس کی وضاحت جاری ہے۔

اس پر شاہ صاحب نے ایک مثال بھی دی ہے کہ جس طرح ایک بچے کو حکم دیا جائے کہ وقت نماز کا شروع ہونے پر تم نے وضوء کرنا اور نماز ادا کرنی ہے۔پھر دوبارہ اسے بطور تاکید کہا جائے کہ نماز کا وقت شروع ہو گیا، اٹھو وضوء کرو اور نماز ادا کرو۔

اور جواب یہ بھی دیا گیا کہ " مراد از نفخ روح ظهور آثار آں نفخ است " نفخ روح (روح پھونکنے) سے مراد یہ ہے کہ اس روح پھونکنے کے آثار جب ظاہر ہوں تو تم نے ان کو سجدہ کرنا ہے وہ آثار اسی وقت ظاہر ہوئے جب آپ نے فرشتوں کو تمام چیزوں کے نام بتادیئے۔ (ماخوذ از عزیزی)

اعتراض: ابلیس جب فرشتہ نہیں تو اس کو سجدہ کا حکم کیسے؟ سجدہ کا حکم تو فرشتوں کو تھا۔

جواب: " وان ابليس كان من الملائكة والا لم يتناوله امرهم ولم يصح استثناؤه منهم "

" یقینی بات ہے کہ ابلیس ملائکہ سے ہے۔اگر ملائکہ سے نہ ہوتا تو نہ اسے حکم ہوتا اور نہ ہی استثناء صحیح ہوتا" (بیضاوی)

اب البتہ دیکھنا یہ ہے کہ وہ ملائکہ سے کیسے ہے، اگرچہ اس میں کئی وجوہ کا ذکر کیا گیا ہے۔لیکن دو صورتیں زیادہ بہتر نظر آتی ہیں۔ان کو ہی ذکر کیا جارہا ہے۔

ایک وجہ تو اسی سے سمجھ آجاتی ہے۔جو قرطبی سے پہلے بیان کیا ہے:

" ان ابليس عبد الله تعالىٰ ثمانين الف سنة واعطى الرياسة والخزانة فى الجنة على الاستدراج " (قرطبی)

''بیشک ابلیس نے اللہ تعالی کی عبادت اسی ہزار سال (۸۰۰۰۰) کی۔ تو اللہ تعالی نے اسے سرداری عطا کر دی اور جنت کا خازن بنا دیا''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابلیس اگرچہ حقیقی طور پر فرشتہ نہیں تھا، لیکن کثرت عبادت کی وجہ سے حکمی طور پر فرشتوں میں داخل تھا، کیونکہ کئی فرشتوں پر بھی اسے سرداری حاصل تھی۔

دوسری وجہ تحقیقی تھی کہ ابلیس حقیقی طور پر فرشتوں میں سے تھا۔ اگرچہ اس پر دو وجہ سے اعتراض ہوتا ہے ایک یہ کہ اللہ تعالی نے فرمایا '' کان من الجن '' (ابلیس جن تھا) اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابلیس حقیقی طور پر فرشتہ نہیں تھا بلکہ جن تھا۔

دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جب ابلیس نے یہ کہا '' خلقتنی من نار ''(اے اللہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا) تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابلیس فرشتوں سے نہیں، کیونکہ اگر فرشتوں سے ہوتا، تو اسے یوں کہنا چاہئے تھا'' خلقتنی من نور ''(اے اللہ تو نے مجھے نور سے پیدا کیا) کیونکہ فرشتے نورانی مخلوق ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابلیس کے متعلق جو یہ کہا گیا ہے '' کان من الجن ''اس کی وجہ یہ تھی:

'' ان الجن ماخوذ من الاجتنان وھو الستر '' کہ جن ماخوذ ہے اجتنان سے جس کا معنی ہے پوشیدہ ہونا۔

اب جن کہنے کی وجہ واضح ہوگئی کہ وہ آنکھوں سے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جن کہلایا۔ (از کبیر)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' لامنا فاۃ کونہ جنا و کونہ ملکا فان الجن کما یطلق علی ما یقا بل الملک یقال علی نوع منہ ''

''ابلیس کو اگرچہ رب تعالی نے جن کہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں بھی اسے جن کہا گیا لیکن جن کہنے سے اس کے فرشتہ ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، ان میں کوئی منافات نہیں اس لئے کہ جن کبھی تو فرشتوں کے مدمقابل علیحدہ مخلوق کو بھی کہتے ہیں اور کبھی فرشتوں کی ایک قسم کو بھی جن کہا جاتا ہے''۔

فرشتوں کو جن کیوں کہا گیا:

'' لاجتنانھم و استتارھم عن اعین الناس ''

اس لئے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں چھپی ہوئی چیز کو جن کہا جاتا ہے۔

جہاں تک یہ سوال تھا کہ ابلیس آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور فرشتے نور سے تو ابلیس کو فرشتہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے:

"وکونہ مخلوقا من نار وھم مخلوقون من نور غیر ضار ایضا ولا قادح فی ملکیة لان النار والنور متحدا المادة بالجنس واختلافھما بالعوارض"

(روح المعانی)

''ابلیس کے آگ سے پیدا ہونے اور فرشتوں کے نور سے پیدا ہونے میں بھی کوئی ضرر نہیں اور اس کے فرشتہ ہونے میں اس سے کوئی عیب ثابت نہیں ہوسکتا، کیونکہ آگ اور نور کا مادہ ایک ہی ہے ایک ہی جنس سے ہیں، البتہ عوارض کے لحاظ پر مختلف ہیں''۔

یعنی جس کے ساتھ دھوئیں کی آمیزش ہے وہ آگ ہے اور جو صاف وشفاف ہے وہ نور ہے جس طرح مٹی، ریت، پتھر، سرمہ وغیرہ کا مادہ اور جنس ایک ہے عوارضات کے لحاظ سے مختلف ہیں۔

واضح ہوا کہ ابلیس اگرچہ نار سے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن نار اور نور کا جوہر ایک ہے لہٰذا یہ فرشتہ تھا اگرچہ نار کے عوارضات علیحدہ تھے، اسی لئے اس کی ذریت (اولاد) بھی ہے اور یہ معصوم بھی نہیں۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی عبارت اور زیادہ واضح ہے:

"فان المراد بالنور الجوھر المضئی والنار کذلک غیر ان ضوء ھا مکدر مغمور بالدخان محذور عنه بسبب ما یصحبه من فرط الحرارة والاحراق فاذا صارت مھذبة مصفاة کانت محض نور ومتی نکصت عادت الحالة الاولی جزعة ولا تزال تتز اید حتی ینطفی نورھا ویبقی الدخان الصرف"

(بیضاوی)

''نور سے مراد روشن جوہر ہے اور نار بھی اسی طرح (وہی جوہر) ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کی روشنی مکدر ہوتی ہے اور دھوئیں نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس میں بہت زیادہ حرارت اور جلانے کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ جب اسی جوہر کی کدورت اور دھواں داری ختم ہو جائے اور وہ خالص صاف شفاف ہو جائے تو وہی نور ہے، اسی طرح جب اس کی روشنی کم ہونی شروع ہو جائے اس میں کدورت آ جائے اور دھواں اس میں ہو تو وہ پھر پہلے حال کی طرف لوٹ آئے گا جسے نار کہا جائے گا''

فائدہ جلیلہ:

" ان جمیع المخلوقات علویها وسفلیها سعیدها وشقیها مخلوق من الحقیقة المحمدیة "

''بیشک تمام مخلوق حقیقت محمدیہ سے پیدا کی گئی ہے خواہ وہ آسمانی مخلوق ہو یا زمینی ہو، خواہ وہ نیک بخت ہو یا بد بخت''۔

" الا ان الملائکة العلویین خلقوا منه علیه الصلوٰة والسلام من حیث الجمال وابلیس من حیث الجلال "

''ہاں فرشتے نبی کریم ﷺ کی حقیقت ونورانیت سے پیدا کئے گئے ہیں بحیثیت جمال کے اور ابلیس آپ کی جلالی حیثیت سے پیدا کیا گیا۔

چونکہ نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے مظہر ہیں اس لئے بالواسطہ ابلیس رب تعالیٰ کی صفت جلالیہ کا مظہر ہوگا۔

" ولهذا کان منه ما کان ولم یجزع ولم یندم ولم یطلب المغفرة "

''اسی وجہ سے ابلیس سے وہ ہوا جو ہوا، نہ اس نے کوئی جزع وفزع کی نہ اسے کوئی ندامت ہوئی اور نہ ہی اس نے مغفرت طلب کی''

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے افعال میں تغیر وتبدل نہیں جب ابلیس بھی رب تعالیٰ کی صفت جلالیہ کا بالواسطہ مظہر بن گیا تو یقیناً اس نے بھی اپنے فعل میں کوئی تبدیلی نہیں کرنی تھی۔ (از روح المعانی)

ابلیس نے اپنی بخشش کا موقع ضائع کر دیا:

ابھی جو وجہ بیان کی کہ ابلیس نے نہ جزع وفزع کی اور نہ ہی اسے ندامت ہوئی اسی وجہ سے اس نے اپنی بخشش کا ایک موقع گنوا دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ تم اللہ تعالیٰ سے کلام کرتے وقت میری سفارش بھی کر دینا۔ آپ نے رب تعالیٰ کے حضور ابلیس کی درخواست پیش کر دی کہ۔

ابلیس نے یہ کہا رب تعالیٰ نے فرمایا:

اسجد لقبر آدم اقبل توبتک واغفر معصیتک فقال ما سجدت لقالبه و جسته فکیف

اسجد لقبرہ ومیتہ ﷺ

اے ابلیس آدم (علیہ السلام) کی قبر کو سجدہ کر لے تو تیری توبہ قبول کرلوں گا، اور تیرے گناہوں کو بخش دوں گا۔ ابلیس نے کہا جب آدم کے جسم کو (یعنی زندہ آدم کو) سجدہ نہیں کیا تو اب اس کی قبر کو اور مردہ آدم کو سجدہ کیسے کروں، اس طرح اس نے ایک مرتبہ پھر انکار کر دیا۔

بعض روایات میں ہے کہ ایک لاکھ سال کے بعد ابلیس کو جہنم سے نکال کر اور آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال کر پھر اسے کہا جائے گا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کر لیکن یہ پھر انکار کر دے گا اسے پھر جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

(از روح البیان حاشیہ جلالین ص ۸) (عزیزی)

فائدہ: نبی کو اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد قبر کی زندگی میں سب سے پہلے مردہ کہنے والا شیطان لعین ہے اب اس کے چیلے، چمچے، انبیاء کرام کو مردہ کہہ رہے ہیں، لیکن جو کام باپ کرے اس کی اولاد وہی کرے تو کوئی خاص تعجب نہیں، خواہ حقیقی اولاد ہو یا معنوی اولاد ہو۔

تنبیہ: جس طرح آدم علیہ السلام کو تعظیمی سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو تھا، اسی طرح ابلیس کو جو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرنے کا۔ جب یہ رب تعالیٰ کا حکم تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں۔

البتہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت میں رب تعالیٰ کے بغیر کسی کو سجدہ کرنا مطلقاً حرام ہے خواہ وہ سجدہ عبادت کا ہو یا تعظیم کا ہو۔ اسی طرح قبر کو سجدہ کرنا ناجائز ہے اگر صاحب قبر کو معبود سمجھ کر سجدہ کیا تو شرک ہے۔ اگر معبود نہیں سمجھا تو سجدہ کرنا حرام ہے۔

شیطان کا رونا:

" عن ابی هريرة عن النبی ﷺ اذا قرأ ابن آدم السجدة (فسجد) اعتزل الشيطن يبكی يقول يا ويله وفی رواية يا ويلی امر ابن آدم بالسجود فسجد فله الجنة وامرت بالسجود فابيت فلی النار "

(خرجه مسلم ، الزيادة من صحيح مسلم) (قرطبی)

" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب ابن آدم نے سجدہ کی آیت تلاوت کی (اور سجدہ کیا) تو شیطان ایک طرف ہو کر رو یا اور کہنے لگا ہائے افسوس انسان کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کر لیا اس کیلئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم ہوا تو میں نے انکار کیا اور میرے لئے آگ ہے۔"

حدیث پاک سے بہت واضح سمجھ آ رہا ہے کہ شیطان کا رونا ندامت کی وجہ سے نہیں تھا، اور نہ ہی توبہ کی غرض سے تھا۔ بلکہ اس کا رونا صرف اس لئے تھا کہ مجھے جنت سے نکال دیا گیا، اور میری سرداری میں زوال آ گیا۔

تکبر کی مذمت:

علامہ راغب اصفہانی بیان فرماتے ہیں کبر (تکبر) اس حالت کا نام ہے جس سے انسان اپنے آپ کو دوسرے سے بڑا سمجھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام ہوتے ہیں ان کو وہ تکبر اور اپنے آپ کو عظیم سمجھتے ہوئے انکار کر دیتا ہے اور عبادات پر اسے یقین نہیں رہتا۔

تکبر کرنے کی دو وجہ ہوتی ہیں ایک یہ کہ انسان بڑا بننے کی کوشش کرے۔ اگر اچھے کام میں بڑا بننے کی کوشش کی جائے تو یہ قابل تعریف ہے اور اگر بڑا بننے کی کوشش میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو ہی تسلیم نہ کیا جائے تو یہ تکبر قابل مذمت ہے۔

تکبر کی دوسری قسم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو سیر ہو کر دکھائے اور جو چیز اس کے پاس نہیں وہ اپنے آپ کو اس کا مالک بنائے یہ قابل مذمت ہے۔ ابلیس کا بھی یہی تکبر تھا کہ اس نے اپنے آپ کو آدم علیہ السلام سے اعلیٰ سمجھا حالانکہ وہ اعلیٰ نہیں تھا۔ یہی تکبر اس کے انکار کرنے کا ذریعہ بنا۔

علامہ غزالی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اگر ظاہری طور پر تکبر پایا جائے تو اسے اصطلاح میں بھی تکبر ہی کہتے ہیں اور اگر باطن میں ہو یعنی اس کے دل پر تکبر کے اثرات پائے گئے ہوں تو اسے اصطلاح میں کبر کہا جاتا ہے۔ (از مرقاۃ ج ۹ ص ۳۰۴)

☆ "عن حارثة بن وهب قال قال رسول الله ﷺ الا اخبركم باهل الجنة كل ضعيف متضعف لو اقسم على الله لابره الا اخبركم باهل النار كل عتل جواظ متكبر"

(بخاری، مسلم وفی روایة المسلم کل جواظ زنیم متکبر۔ مشکوۃ باب الغضب والکبر)

حضرت حارثہ بن وہب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں جنت والوں کی خبر نہ دوں؟ (پھر آپ نے ان کی خبر دی) ہر وہ شخص جو بہت زیادہ عاجزی کرنے والا ہو (وہ جنتی ہے) اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا دے کہ رب یہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا فرما دیتا ہے۔ کیا میں

تمہیں جہنم والوں کی خبر نہ دوں؟ (پھر آپ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا) ہر وہ شخص جو باطل طریقہ سے جھگڑا کرنے والا ہو، انکار کرنے والا ہو، تکبر کرنے والا ہو۔

مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ ہر شخص انکار کرنے والا، غلط نسب بیان کرنے وال اور تکبر کرنے والا (جہنمی ہے)

وضاحت حدیث:

حدیث شریف میں جو لفظ " ضعیف " مذکور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ متکبر اور جبار نہ ہو اور معانی بھی آتے رہتے ہیں وہ ماقبل اور مابعد کو دیکھ کر معانی بیان کئے جاتے ہیں۔

" متضعف " کا لفظ تاکید کے لئے آیا ہوا جیسے کہ کہا جاتا ہے " **جنود مجنده ، القناطير المقنطرة** " اور ظل ظليل یعنی " **ضعيف متضعف** " کا معنی ہے کامل عاجز۔

" **لو اقسم على الله لا بره** " اگر اللہ تعالیٰ پر وہ قسم اٹھادیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا فرمادے۔

یعنی یہ قسم اٹھادیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا۔ یا یہ قسم اٹھادیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے گا، تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی خواہش کے مطابق وہ ہی کام کر دیتا ہے۔ یا وہی کام چھوڑ دیتا ہے اس کے چھوڑنے کی اس عاجز شخص نے قسم اٹھائی تھی۔

جواظ: واؤ پر شد ہے اس کا معنی انکار کرنا، بہت خوشحالی کی وجہ سے موٹا ہو جانا، فاجر اور فخر کرنے والا۔

زنیم: کوئی شخص اپنے آپ کو کسی طرف منسوب کرے کہ میرا مرتبہ بڑا نظر آئے حالانکہ وہ اس قبیلہ سے نہیں۔ یہاں مطلقاً یہ معنی کیا جائے کہ وہ ذلیل ہے تو زیادہ مناسب ہے۔ (مرقاة ج ۹ ص ۳۰۶)

☆ " **وعن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لا يدخل النار راحد في قلبه مثقال حبة من خردل من ايمان ولا يدخل الجنة احد في قلبه مثقال حبة من خردل من كبر** "

(رواه مسلم مشكوة باب الغضب والكبر)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک شخص بھی آگ میں داخل نہیں ہوگا، جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہوا۔ اور کوئی شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر تکبر پایا گیا۔

وضاحت حدیث:

" لا یدخل النار ای دخول خلود " جس شخص کے دل میں ذرا بھر بھی ایمان ہوا وہ آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اگر کچھ وقت کے لئے سزا دینے کی غرض سے آگ میں ڈال بھی دیا گیا تو سزا ختم ہونے پر آگ سے نکال دیا جائے گا۔

ذرا بھر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ثمرات ایمان تھوڑے پائے گئے یعنی اخلاق جو ظاہر و باطن سے متعلق ہیں اور وہ نور ایمان اور ظہور ایقان سے صادر ہوتے ہیں ان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے۔ نفس ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے اس میں زیادتی اور کمی نہیں ہوتی۔ جس کے دل میں ذرا بھر تکبر ہوا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا اس کا ایک مطلب یہ ہے " لا یدخل الجنة مع السابقین " یعنی وہ جنت میں ان لوگوں کے ساتھ داخل نہیں ہوگا جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے، بلکہ وہ اپنے تکبر کی سزا حاصل ہونے کے بعد جنت میں داخل کیا جائے گا کیونکہ صرف تکبر سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ " ان یراد بالکبر الکفر والشرک " تکبر سے مراد کفر و شرک ہو، یعنی اتنا متکبر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ہی تسلیم نہ کرے اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرائے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہے گا۔ کبھی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (از مرقاۃ ج۹ ص۳۰۷)

☆ " وعن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل الجنة من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر فقال رجل ان الرجل یحب ان یکون ثوبہ حسنا ونعلہ حسنا قال ان اللہ تعالٰی جمیل یحب الجمال الکبر بطر الحق وغمط الناس "

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب الغضب والکبر)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا، جس کے دل میں ذرا بھر بھی تکبر ہوا۔ تو ایک شخص نے عرض کیا کہ بیشک ہر شخص اچھے کپڑے اور اچھے جوتے پہننا پسند کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جمیل ہے وہ جمال کو پسند فرماتا ہے۔ تکبر یہ ہے کہ حق پر اکڑ دکھائے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

وضاحت حدیث:

وہ شخص جو عرض کرنے والے تھے وہ معاذ بن جبل، یا عبداللہ بن عمرو بن عاص، یا ربیعہ بن عامر تھے:

" لما رأى الرجل العادة فی المتکبرین لبس الثیاب الفاخرة ونحو ذلک سأل ما سأل "

''جب سوال کرنے والے شخص نے دیکھا کہ عام طور پر متکبر لوگ فاخرانہ لباس پہنتے ہیں اور فاخرانہ جوتے پہنتے ہیں تو یہ پوچھا کہ اچھے کپڑے پہننے والا اور اچھے جوتے پہننے والا شخص آپ کے نزدیک متکبر ہے یا تکبر کی کوئی اور علامت ہے''۔

تو حضور ﷺ نے جواب دیا:

" ان الله جمیل ای فی ذاته وصفاته وفعاله وکل جمال صوری او جمیل معنوی فهو اثر جماله فلا جمال ولا جلال ولا کمال الا له سبحانه "

''بیشک اللہ تعالیٰ جمیل ہے۔ یعنی وہ اپنی ذات اور صفات اور افعال میں جمیل ہے بلکہ ہر قسم کا صوری اور معنوی جمال رب تعالیٰ کے جمال کا ہی اثر ہے۔ کوئی جلال اور کوئی جمال اور کوئی کمال رب تعالیٰ کے بغیر کسی کو حاصل نہیں۔ جو کسی کو حاصل ہے وہ اسی کے واسطہ سے''۔

یحب الجمال: رب تعالیٰ جمیل ہے وہ جمال کو پسند فرماتا ہے یعنی جمال اس کی مخلوق میں ظاہر ہو۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ انسان اپنے جمال ظاہر کرے اسی کو ایک حدیث پاک سے تائید بھی حاصل ہے:

" ان الله یحب ان یری اثر نعمته علی عبده "

''بیشک اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ وہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھے''

الکبر بطر الحق: تکبر حق سے روگردانی، نعمت کے حاصل ہونے پر سرکش ہونا، اللہ تعالیٰ کی توحید اور عبادت کو باطل سمجھنا حق کو ناحق سمجھنا۔

وغمط الناس: اور لوگوں کو حقیر سمجھنا اور بے وقوف سمجھنا۔ یعنی فاخرانہ اور تکبرانہ طور پر نہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی نعمت کے اظہار پر اچھا صاف ستھرا لباس پہننا علامت تکبر نہیں۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اسراف نہ ہو۔

اکثر طور پر دیکھا گیا ہے جہلاء فاخرانہ لباس پہنتے ہیں علماء صاف ستھرا، اچھا لیکن عاجزانہ لباس پہنتے ہیں۔ تکبر حق سے پھرنے باطل راہ پر چلنے، دوسروں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔ (از مرقاة ج ۹ ص ۳۰۸)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ یقول اللہ تعالیٰ الکبریاء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی واحدا منهما ادخلته النار وفی روایة قذفته فی النار "

(رواہ مسلم ، مشکوۃ باب الغضب والکبر)

" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کبریائی میری رداء ہے اور عظمت میری ازار ہے۔ جس شخص نے بھی ان دونوں میں کسی ایک کو بھی چھینا میں اسے جہنم میں داخل کر دوں گا۔ ایک روایت ہے کہ میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا"۔

وضاحت حدیث:

" رداء " اوپر اوڑھنے والی چادر کو کہا جاتا ہے اور " ازار " کمر میں تنگیز کو ڈھانپنے والی چادر کو کہا جاتا ہے۔ "الکبریا " اور " العظمة " کا معنی بادشاہی۔ اور کبھی ان دونوں کا معنی کیا جاتا ہے کمال ذات اور کمال وجود جو صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " الکبریاء ردائی " جب کبریائی کو رداء کہا ہے اور عظمت کو ازار کہا ہے تو اسی سے پتہ چل گیا کہ کبریائی میں بنسبت عظمت کے زیادہ درجہ پایا گیا ہے۔ کیونکہ رداء کو ازار پر فوقیت حاصل ہے۔

یعنی اپنی بڑائی بیان کرنا اور اپنی عظمت بیان کرنا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ اس طرح اپنی بڑائی اور عظمت بیان کرے کہ جس سے یہ سمجھ آئے کہ یہ حق سے روگردانی کر رہا ہے اور لوگوں کو حقیر سمجھ رہا ہے۔ اسی سے تواضع کا معنی سمجھ آ گیا وہ یہ ہے " التواضع هو الاذعان للحق وتوقیر الناس " تواضع یہ ہے کہ حق پر یقین رکھے اور لوگوں کی عزت کرے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا گیا " التعظیم لامر اللہ والشفقة علی خلق اللہ " اللہ تعالیٰ کے امر کی تعظیم اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت کرنا تواضع ہے۔

نتیجہ واضح ہوا:

" من تکبر علی اللہ وعلی الخلق ابتلاہ اللہ تعالیٰ فی الدنیا بالذل والھوان وفی الآخرة یقذفه فی اقصی درکات النیران ومن تواضع

مع الخلق رفع الله درجته فی الدنیا والآخرة "

''جس نے اللہ تعالیٰ پر اور مخلوق پر تکبر کیا اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں ذلت اور رسوائی میں مبتلاء کرتا ہے اور آخرت میں اسے جہنم کی آگ میں پھینک دے گا اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے مخلوق سے تواضع کی اللہ تعالیٰ اس کے درجات دنیا اور آخرت میں بلند کرے گا''

(از مرقاۃ ج ۹ ص ۳۰۹)

☆ " وعن عمر قال وهو علی المنبر یا ایها الناس تواضعوا فانی سمعت رسول الله ﷺ یقول من تواضع لله رفعه الله فهو فی نفسه صغیر وفی اعین الناس عظیم ومن تکبر وضعه الله فهو فی اعین الناس صغیر وفی نفسه کبیر حتی لهو اهون علیهم من کلب او خنزیر "

(مشکوۃ باب الغضب والکبر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا اے لوگو تواضع اختیار کرو بیشک میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے تواضع کی اللہ تعالیٰ اس کے درجات کو بلند کرے گا اگرچہ اس شخص نے اپنے آپ کو چھوٹا سمجھا لیکن لوگوں کی نظر میں وہ عظیم ہے۔ اور جس شخص نے تکبر کیا اللہ تعالیٰ اسے پست کر دیتا ہے اور لوگوں کی نظر میں بھی وہ حقیر ہوتا ہے اگرچہ وہ خود اپنے آپ کو بڑا ہی سمجھے یہاں تک کہ وہ لوگوں کے نزدیک کتے اور خنزیر سے بھی گھٹیا نظر آتا ہے۔

وضاحت حدیث:

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع کی اپنا حق اس نے خود پست بیان کیا یعنی حقیقت میں جو اس کا مرتبہ تھا "فجعل نفسه دون مرتبته" اس نے اپنے آپ کو اس کم مرتبہ سمجھا۔

" ثم ان الله یرفعه من تلک المنزلة التی هی حقه الی ما هی ارفع منها ویعظمه عند الناس "

''پھر اللہ تعالیٰ بیشک اس کے مرتبہ کو اس کے حقیقی مرتبہ سے بھی بلند کر دیتا ہے، اور لوگوں کے نزدیک بھی اسے عظیم مرتبہ عطا فرما دیتا ہے۔ تکبر کرنے میں اسی کو الٹ کریں نتیجہ واضح ہو جائے گا''۔

(مرقاۃ ج ۹ ص ۳۱۷)

یعنی جو شخص اپنے حقیقی مرتبہ سے اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ رب تعالیٰ اسے اس کے حقیقی مرتبہ سے بھی پست کر دیتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی اسے حقیر بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اسے کتوں اور خنزیروں سے بھی حقیر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔

﴿ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾

☆ اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے

☆ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو، اور دونوں اس سے کھاؤ جو چاہو بغیر رکاوٹ کے (ہاں البتہ) اور دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا کہ حد سے دونوں بڑھنے والے ہو جاؤ گے۔

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کی زوجہ حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے پیدا کیا اور انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ ہونے کا شرف بخشا پھر ان دونوں کو جنت میں رہنے کا حکم دیا۔ اور ان کو ارشاد فرمایا کہ تم جنت کے پھل جو چاہو کھاؤ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں، البتہ ایک درخت کے قریب جانے سے دونوں کو روک دیا کہ اس کے قریب نہ جانا۔ ورنہ تم حد سے تجاوز کرنے والے ہو جاؤ گے۔

تفصیلی وضاحت:

حضرت حوا کی پیدائش: جب حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کر لیا اور ابلیس انکار تکبر کی وجہ سے مردود ہو گیا، تو آدم علیہ السلام جو خاک سے پیدا ہوئے تھے آپ کا جنت میں کوئی ہم جنس نہ تھا، کیونکہ فرشتے علیحدہ جنس تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ پر نیند کو مسلط کیا، پھر آپ کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا، اور اس کی جگہ گوشت رکھ دیا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ نے اپنے پاس حضرت حوا کو بیٹھے ہوئے پایا پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا میں عورت ہوں پھر آپ نے کہا تمہیں کیوں پیدا کیا گیا؟ تو انہوں نے عرض کیا تا کہ تم مجھ سے سکون حاصل کرو۔

فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے علم کا امتحان لینے کے لئے پوچھا یہ کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا" هذه امرأة" یہ عورت ہے پھر انہوں نے پوچھا اسے " امرأة " (عورت) کیوں کہا گیا

ہے؟ آپ نے فرمایا چونکہ یہ " امـرأ " (مرد) سے بنی ہے پھرانہوں نے سوال کیا اس کا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا " حوا " پھرانہوں نے کہا اس کا نام حوا کیوں رکھا گیا؟ " قـال لانهـا خـلقت من شـئی حیّ " آپ نے فرمایا کہ یہ زندہ چیز سے پیدا کی گئی ہے۔ یعنی زندہ چیز کو چونکہ "حی" کہا جاتا ہے اس لئے اس کا نام بھی حوا رکھ لیا گیا۔

تنبیہ: ایک روایت کے مطابق حضرت حوا کی پیدائش فرشتوں کے سجدہ کے بعد جنت میں ہوئی۔ اور دوسری روایت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کا جسم زمین میں تیار کیا گیا اور اس میں روح کو داخل بھی زمین میں ہی کیا گیا اور حضرت حوا کی پیدائش بھی زمین پر ہی ہوئی پھر دونوں کو جنت میں لے جایا گیا۔ (روح المعانی)

عورت کے بائیں پسلی سے پیدا ہونے پر حدیث نبوی:

آج کل آزادیٔ نسواں کے دعویدار اور مادر، پدر آزاد شتر بے مہار عورتیں سب مل کر یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ عورت کا مرد کی بائیں پسلی سے پیدا ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ جہلاء کو تو الو بنایا جا سکتا ہے، لیکن اہل علم ان کے جال میں کیسے آئیں؟ آیئے اسی پر حدیث نبوی کو دیکھیں اور یہودیوں کے آلہ کار لوگوں کے چکر میں نہ آئیں۔

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ استوصوا بالنساء خيرا فانهن خلقن من ضلع اعوج وان اعوج شئی فی الضلع اعلاه فان ذهبت تقيمه كسرته وان تركته لم يزل اعوج فاستوصوا بالنساء " (بخاری، مسلم مشکوة باب عشرة النساء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا عورتوں کے متعلق میں تمہیں بہتر حکم دیتا ہوں، جسے قبول کرو، بیشک وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں، بیشک پسلی کا ٹیڑھا پن اوپر کی جانب ہوتا ہے اگر تم اسے سیدھا کرنا شروع کرو گے تو اسے توڑ دو گے اور اگر اسے اسی حال پر چھوڑو گے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی عورتوں کے متعلق میرا حکم قبول کرو۔

وضاحت حدیث: " استوصوا " کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ لفظ ''سین'' طلب کے لئے ہو تو اب معنی یہ ہوگا

" اطلبوا الوصية من انفسكم فی حقهن بخير "

اپنے نفسوں سے عورتوں کے حق میں بہتر نصیحت طلب کرو۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے " وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا " وہ (اہل کتاب) نبی کریم ﷺ کے آنے سے پہلے کافروں پر (آپ کے وسیلہ سے) فتح طلب کرتے تھے یعنی جس طرح "یستفتحون" میں سین طلب کے معنی میں ہے، اسی طرح "استوصوا" میں بھی سین طلب کے لئے ہے پھر "بخیر" پر جو باء ہے اس کو النساء پر داخل کیا تو "استوصوا بالنساء خیرا" ہوگیا۔

دوسرا معنی قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان کیا" الاستیصاء " کا معنی وصیت قبول کرنا اب معنی یہ ہوگا:

" اوصیکم بھن خیرا فاقبلوا وصیتی فیھن "

"میں تمہیں عورتوں کے حق میں بہت نصیحت کرتا ہوں وہ میری نصیحت قبول کرلو"

مقصد اس سے یہ ہے کہ ان سے نرم سلوک کیا جائے، نرمی کی جائے ان کے ٹیڑھا رہتے ہوئے کچھ ان کی خامیاں برداشت کی جائیں ان پر احسان کیا جائے ان کی غلطیوں کو برداشت کیا جائے۔ جس طرح کہا گیا ہے:

" الصبر عنھن ایسر من الصبر علیھن والصبر علیھن اھون من الصبر علی النار "

"ان کی خامیوں کو برداشت کرنا بنسبت ان کو روکنے سے آسان ہے اور ان کو غلطیوں سے روکنا آگ میں جلنے سے آسان ہے"

یعنی اگر ان میں کوئی خامی اور غلطی ایسی ہو جو خلاف شرع نہ ہو تو اس پر صبر کرنا آسان ہے کیونکہ اگر عورت کو روکا گیا تو وہ اپنے ٹیڑھے پن اور عقل کی کمی کی وجہ سے گھر کو برباد کردے گی سکون برباد ہوجائے گا۔

لیکن اگر اس کی غلطیاں شریعت کے خلاف ہوں تو پھر روکا جائے اگر نہ روکا گیا تو مرد کو خلاف شرع کاموں سے نہ روکنے کی وجہ سے جہنم کی آگ میں جلنا پڑے گا اور عورت کو گناہ کرنے کی وجہ سے آگ میں جلنا پڑے گا۔ عورت کا ٹیڑھا ہونا، کسی بات کو نہ ماننا اور اپنی بات منوانے پر زور دینا اس کی پیدائشی عادت وفطرت میں داخل ہے۔ کیونکہ حضرت حوا کو آدم علیہ السلام کی بائیں جانب اوپر کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ پیدائشی عادت کا بدلنا ممکن نہیں۔ خود ارشاد مصطفوی کے مطابق پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکن ہے لیکن پیدائشی عادت کا بدلنا ممکن نہیں۔ (از مرقاۃ و نووی)

نکتہ : عورت کو مٹی سے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ مرد کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہے تا کہ عورت کبھی بھی مرد کی برابری کا دعویٰ نہ کر سکے، کیونکہ اس کو پیدائش کے وقت سے ہی مرد کے تابع بنا دیا گیا ہے۔ پھر بائیں پسلی سے پیدا کرنا دائیں سے نہ پیدا کرنا بھی اس کے مرتبہ کی کمی پر دلالت کر رہا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی شادی اور مہر:

جب حضرت حوا کو پیدا کیا گیا تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان کی طرف میلان کرنا چاہا اور ارادہ فرمایا کہ دست محبت بڑھائیں تو فرشتوں نے کہا اے آدم ٹھہر جاؤ پہلے مہر ادا کر دو۔ آپ نے فرمایا:

" فما مهرها قالوا حتى تصلى على النبى صلى الله عليه وسلم "

''وہ مہر کیا ہے؟ فرشتوں نے کہا مہر یہ ہے کہ تم نبی کریم ﷺ پر درود پڑھو''

ایک روایت میں تین دفعہ اور ایک میں سترہ مرتبہ درود پاک پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ یعنی اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ آدم علیہ السلام کا مہر یہی تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھیں۔ آپ نے درود پڑھا، اور فرشتوں کو گواہی سے نکاح ہوا۔

" وفى ذلك اشارة الى انه عليه الصلوة والسلام الواسطة لكل موجود حتى ابيه آدم " (صاوی زیر آیته خلقکم من نفس واحدة پ ۲)

''اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ بیشک نبی کریم ﷺ ہر موجود چیز کے لئے وسیلہ ہیں یہاں تک کہ آپ اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا بھی وسیلہ ہیں''

دوسری روایت کے مطابق آپ کو اور حضرت حوا کو شادی کے بعد فرشتے سونے کے تخت پر بٹھا کر اس طرح اٹھا کر جنت میں لے گئے جس طرح بادشاہوں کو عزت کی خاطر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ (روح المعانی)

گویا کہ بارات کی واپسی پر فرشتے سنہری ڈولی میں دونوں میاں بیوں کو اٹھا کر لا رہے ہیں۔

قانون قدرت اور قانون عادت میں فرق:

اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ یہ ہے کہ عام طور پر کاموں کے اسباب بنا دیئے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کی پیدائش میں بھی قانون عادت اسباب کے تحت کر دیا گیا ہے۔ کہ ماں اور باپ سے اولاد کی پیدائش ہوتی ہے۔ لیکن یہ قانون قدرت نہیں۔

قانون قدرت کی اللہ تعالیٰ نے ایک ایک مثال قائم کر دی کہ میں اس طرح بھی کر سکتا ہوں اسباب کی مجھے کوئی محتاجی نہیں۔ مرد اور عورت کے بغیر اپنے دست قدرت سے مٹی کا قالب بنا کر اس میں روح پھونک کر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ اور عورت کے بغیر مرد کی پسلی چاک کر کے عام عادت کے خلاف حضرت حوا کو پیدا فرما کر یہ واضح کر دیا کہ میں بغیر عورتوں کے مردوں سے اولاد پیدا کرنے پر بھی قادر ہوں۔

اور عورت سے بغیر اس کے خاوند کے بیٹا پیدا کر کے بھی واضح کر دیا کہ میری قدرت سے یہ بھی کوئی بعید بات نہیں۔ یعنی حضرت مریم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش تو ایک عام طریقہ کے مطابق ہی ہوئی۔ لیکن اس میں مرد کا کوئی واسطہ نہیں، صرف جبرائیل امین کی پھونک کا اثر ہے ورنہ عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی باپ نہیں۔

﴿ یٰاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّةَ﴾ ''اے آدم تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو''

'' (اسکن) تنبیه علی الخروج لان السکنی لا تکون ملکا '' رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت میں رہنے کا جو حکم دیا۔ اس میں لفظ '' اسکن '' استعمال فرمایا۔ اس لفظ سے ہی اشارہ کر دیا گیا تھا کہ پھر آپ کو اس مقام سے نکلنا بھی ہوگا کیونکہ سکونت عارضی طور پر ٹھہرنے کو کہا جاتا ہے اس میں ملکیت نہیں پائی جاتی۔

اسی وجہ سے بعض عارفین نے کہا کہ سکونت ایک مدت تک ہوتی ہے پھر ختم ہو جاتی ہے ان دونوں کا جنت میں دخول ٹھہرنے کے لئے تھا، مستقل طور پر مقیم ہونے کے لئے نہیں تھا۔ ہاں البتہ کوئی قرائن پائے جائیں تو اپنے مملوکہ دار (مکان) میں ٹھہرنے کو بھی سکونت سے تعبیر کر دیا جاتا ہے اور کوئی شخص مکان دے دے عمر بھر ٹھہرنے کے لئے تو عمر بھر ٹھہرنے کی اجازت ہوگی۔ اور کوئی یہ کہے کہ تم اس مکان میں اپنی تمام عمر رہو بلکہ بعد میں بھی تمہارے ورثاء کا یہ مکان ہوگا تو اس سے ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن ان تمام صورتوں کی دارومدار قرائن پر ہے۔

کسی کو کوئی چیز دی جائے اس میں کئی لفظ استعمال ہوتے ہیں جو کچھ قریب قریب ہیں۔

دینی مدارس کے طلباء کے لئے: **العمریٰ:** (عین پر ضمہ اور آخر میں الف مکسورہ، فعلی کے وزن پر) کوئی شخص اپنا مکان کسی کو دے کہ تم عمر بھر اس میں آباد رہو یا یہ کہے جب تک میری عمر ہے تو اس میں آباد رہو اسے عمری کہا جاتا ہے۔ یہ موت کے بعد اصل مالک کے ورثاء کی طرف لوٹ آئے گا (جس کی عمر کا ذکر تھا اس کی موت کے بعد)۔

الرقبیٰ: (راء پر ضمہ اور آخر میں الف مکسورہ فعل کا وزن) اگر کوئی شخص دوسرے کو مکان دیتا ہے اور یہ کہتا ہے اگر تمہاری موت مجھ سے پہلے آ گئی تو یہ مکان میری طرف لوٹ آئے گا۔ اور اگر میری موت تمہاری موت سے پہلے آ جائے تو تم اس کے مالک ہو گے اسے رقبی کہا جاتا ہے۔

خیال رہے کہ رقبی بہتر نہیں اس لئے کہ ہر شخص دوسرے کی موت کا منتظر رہتا ہے۔

رقبی کی ممانعت پر بھی حدیث پاک موجود ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " **لا رقبی فمن ارقب شیاء فھو له حیاته ومماته** " تقریباً اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ رقبی اس طرح مناسب نہیں کہ ایک دوسرے کی موت کے منتظر ہوں ہاں رقبی ایسا ہو جو مطلق ہو زندگی اور موت میں اس کو مطلق مالک بنا دیا جائے رقبی کے جواز پر حدیث پاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف طور پر ثابت ہے " **العمری والرقبی سواء** "عمریٰ اور رقبی برابر ہیں۔

الافقار: یہ لفظ ماخوذ ہے " **فقار الظھر** " سے کوئی شخص دوسرے کو کہے " **فقرتک ناقتی** " تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی اونٹنی کی پیٹھ تم کو اعارہ کے طور پر دے دی تم اس پر سوار ہو کر فلاں جگہ تک جا سکتے ہو۔ یا اس سواری پر سوار ہو کر شکار کیلئے تیر اندازی کر سکتے ہو تو تمہیں اجازت ہے۔

الاخبال: عام طور پر کہا جاتا ہے " **اخبلت فلانا** " فلاں شخص کو میں نے اونٹ یا گھوڑا جہاد کیلئے اعارہ کے طور پر دے دیا ہے۔

المنحة: (میم کے نیچے کسرہ) یہ لفظ اس طرح ذکر کیا جاتا ہے " **منحت الناقة او الشاة فلانا** " میں نے فلاں شخص کو اونٹنی یا بکری دودھ دوہنے اور استعمال کرنے کے لئے دے دی۔ یعنی وہ اس کا دودھ استعمال کرتا رہے لیکن پھر میری اونٹنی یا بکری واپس کر دے۔

العارية: عاریہ عام ہے کسی کو کوئی چیز نفع حاصل کرنے کے لئے دے اور پھر وہ نفع حاصل کر کے واپس کر دے۔

الھبة: مطلقا کسی کو کوئی چیز بغیر کسی معاوضہ کے بطور ملکیت کے دے جب وہ اس چیز پر قبضہ کر لے تو وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔

الصدقة: کسی کو کوئی چیز مستقل طور پر دے دی جائے لیکن اس میں غرض اور نیت ثواب کی ہو۔

الاطراق: اعارۃ الفحل کوئی نر جانور کسی کو بطور اعارہ دینا جس طرح دیہاتوں میں عام رواج ہے۔ موسم بہار میں ریوڑ والے بعض اوقات دوسرے ریوڑ والے سے بکریوں کے لئے بکرا مانگ کر لے آتے ہیں۔
(ماخوذ از قرطبی)

﴿ اَنْتَ ﴾: یہ ضمیر تاکید ہے اس ضمیر کی جو " اسکن " میں مستتر ہے، کیونکہ ضمیر متصل پر منفصل کی تاکید کے واسطہ کے بغیر عطف درست نہیں۔ اس لئے " اسکن وزوجک " نہیں کہا جا سکتا۔

﴿ وَزَوْجُکَ ﴾: لفظ زوج مذکر اور مؤنث کے درمیان مشترک ہے یعنی خاوند کو بھی زوج کہہ لیا جاتا ہے۔ اور بیوی کو بھی زوج کہہ لیا جاتا ہے۔ یہاں " زوجک " (تمہاری زوجہ) سے مراد حضرت حوا ہیں۔ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

تاہم یہ بھی خیال رہے کہ مؤنث کے لئے لفظ " زوجة " بھی استعمال ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

" عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان مع احدی نسائہ فمربہ رجل فدعاہ فجاء فقال یا فلان ھذہ زوجتی فلانة فقال یا رسول اللہ من کنت اظن بہ فلم اکن اظن بک ، فقال رسول اللہ ﷺ ان الشیطن یجری من الانسان مجری الدم " (از قرطبی)

" حضرت انس فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ اپنی ازواج میں سے ایک کے ساتھ تھے یک شخص وہاں سے گزرا تو آپ نے اسے بلایا وہ حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا اے فلاں شخص یہ میری فلاں زوجہ ہے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ میں کون ہوتا ہوں آپ پر کوئی گمان کروں، میں نے آپ پر کوئی گمان نہیں کیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک شیطان انسان میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسا کہ خون سرایت کرتا ہے" (از قرطبی)

مقصد یہ ہے کہ اس حدیث پاک میں " زوجتی " استعمال ہے۔ لہٰذا واضح ہوا کہ مؤنث کے لئے دونوں لفظ استعمال ہیں " زوج " بھی اور " زوجة " بھی۔

﴿ الْجَنَّةَ ﴾: جنت کا ذکر پہلے تفصیلی طور پر ہو چکا ہے۔ جس کا لغوی معنی ہے باغ یہاں جس جنت کا ذکر ہے وہ وہی جنت ہے جو دار جزاء ہے:

" ولا التفات لما ذهبت اليه المعتزلة و القدرية من انه لم يكن في جنة الخلد وانما كان في جنة بارض عدن "

" معتزلہ اور قدریہ کے قول کی طرف کوئی توجہ نہ کی جائے کیونکہ ان کا کہنا باطل ہے کہ یہاں جس جنت کا ذکر ہے وہ جنۃ الخلد نہیں۔ بلکہ یہ عدن میں ایک باغ تھا جس میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو ٹھہرایا گیا تھا"

ان کا قول " اهبطوا " سے ہی مردود ہو جاتا ہے، کیونکہ جنت سے اتر آنے کا حکم آپ کو دیا گیا تھا معتزلہ جب ابتدائی طور پر بھٹکے تو بھٹکتے ہی رہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں " اهبطوا " کا معنی ہے منتقل ہو جاؤ، لیکن ان کا یہ معنی کرنا بھی لغت کے خلاف ہے۔ (از قرطبی)

خیال رہے کہ آج کل معتزلہ کی ذریت معنوی بھی وہی ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے جو انہوں نے پیٹا تھا

﴿ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ﴾: " رغدا " غین پر فتحہ ہے تاہم علامہ نخعی رحمہ اللہ نے غین کے سکون سے بھی پڑھا ہے اس کا معنی ہے " بغیر کسی مشقت کے کام کرنا، کسی کام میں وسعت کا پایا جانا، کوئی کام بغیر رکاوٹ کے کرنا۔ (از روح المعانی)

" الا كل الوغد ان ياكل ما شاء اذا شاء حيث شاء "

" رغدا " کے مفہوم میں وسعت پائی گئی ہے یعنی معنی یہ ہو گیا تم دونوں کھاؤ جو چاہو جب چاہو، جہاں سے چاہو۔ اس معنی کے لحاظ پر " حيث شئتما " تخصیص بعد از تعمیم ہوگی۔ پہلے عمومی معنی ذکر کیا پھر مکان کی وسعت بیان کی " حيث شئتما اى مكان من الجنة شئتما " جنت کے جس مقام سے جو پھل کھانا چاہو کھاؤ۔

﴿ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ﴾: "اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا"

﴿ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ﴾: " مگر اس درخت کے قریب نہ جانا" کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔

آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو اس خاص درخت (جس کی طرف اشارہ تھا) کے پھل کھانے

سے روکا گیا لیکن پھر بھی آپ نے پھل کھا لیا۔ جس سے بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ شائد وہ دونوں (معاذ اللہ) ظالم ہوگئے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ آدم علیہ السلام کو پہلے منصب خلافت عطاء کردیا گیا، یعنی آپ کو نبی بنا دیا گیا تھا۔ یہ پھل کھانے کا واقع بعد میں درپیش آیا۔

انبیاء کرام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک ہیں اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی یہ ہے:

﴿ لا ینال عھدی الظالمین ﴾ ''میرا وعدہ (نبوت عطاء کرنے کا) ظالموں کو نہیں پہنچے گا''

اس سے واضح ہوا کہ ظلم انبیاء کرام میں نہیں پایا جاسکتا کیونکہ ظلم انبیاء کرام کے منصب نبوت کے ہی خلاف ہے۔

" ومن نسب التعمعد والعصیان له بمعنی فعل الکبیرة او الصغیرة فقد کفر "

(صاوی ج اول ص ۴۳)

''جس شخص نے انبیاء کرام کی طرف یہ منسوب کیا کہ وہ جان بوجھ کر صغیرہ یا کبیرہ گناہ کر لیتے تھے وہ شخص کافر ہو جائے گا''

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ سے بھی بظاہر یہ سمجھ آ رہا ہے کہ پھل کھا کر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا (معاذ اللہ) ظالم ہوگئے۔ اور ان کا اقرار بھی یہ ہے " ربنا ظلمنا انفسنا " اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ (معاذ اللہ) انہوں نے ظلم کیا تو کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ظلم نہیں کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ظلم مختلف چیزوں پر بولا گیا ہے، ظلم انبیاء کرام کی طرف منسوب نہیں ہوسکتا اس کی اور وجوہ ہیں۔ اور ظلم کی نسبت ان کی طرف ہوسکتی ہے اس کی اور وجہ ہے۔ ظلم کا لغوی معنی یہ ہے " وضع الشئی فی غیر موضعه " کسی چیز کو اس کی اصل جگہ میں رکھنے کی بجائے دوسری جگہ رکھ دینا۔

ظلم چونکہ شرک پر بھی بولا گیا ہے ظلم سے مراد گناہ بھی ہے۔ ظلم سے مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی قصداً کرنا بھی ہے ان معانی کے لحاظ پر ظلم کا اطلاق انبیاء کرام پر نہیں ہوسکتا۔ ان معانی کے لحاظ پر اگر کوئی شخص انبیاء کرام کی طرف ظلم کو منسوب کرے گا تو یقیناً وہ کافر ہو جائے گا۔ ہاں اگر کوئی خلاف اولی (یعنی جو کام کرنا بہتر تھا اس کے خلاف) کام کر دیا تو اسے بھی ظلم کہہ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک کام کرنا تھا اس کے خلاف کر دیا لیکن بھول کر کر دیا اسے بھی ظلم کہہ لیا جاتا ہے، کیونکہ وہ کام مقصد کے خلاف ہو

گیا۔ اس لئے اس پر ظلم کی تعریف " وضع الشئی فی غیر موضعه " سچی آ ئی۔ ان معانی کا لحاظ کرتے ہوئے انبیاء کرام پر ظلم کا اطلاق اگر چہ ہو سکتا ہے لیکن مطلقاً انبیاء کرام کو ظالم کہنا ظلم ہوگا اس لئے کہ صرف ظلم کے لفظ بولنے سے دھیان شرک اور گناہ اور کسی پر بے جا زیادتی کی طرف ہی جاتا ہے جس سے انبیاء کرام پاک ہیں۔

یہ بھی واضح ہے کہ آدم علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھایا جس سے روکا گیا تھا لیکن وہ قصداً نہیں بلکہ بھول کر وہ پھل کھایا تھا۔ آپ کی بھول پر قرآن پاک شاہد ہے:

﴿ ولقد عهدنا الی آدم من قبل فنسی ولم نجد له عزما ﴾ (پ ۱۶ سورۃ طه آیۃ ۱۱۵)

"اور بیشک ہم نے اس سے پہلے آدم سے درخت کے قریب نہ جانے کا وعدہ لیا تو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا کوئی قصد نہ پایا" عصمت انبیاء کی تفصیلی بحث ان شاء اللہ اگلی آیۃ کریمہ میں آرہی ہے۔

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اس درخت کا پھل نہ کھانا، بلکہ یہ فرمایا کہ اس درخت کے قریب بھی نہ جانا اس کی وجہ یہ ہے کہ نہی (روکنے) کو قرب سے معلق کر کے، بہت زیادہ تاکید کر دی گئی ہے اور مبالغہ ثابت کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ قریب جانا ذریعہ ہے کھانے کا، جب قریب جانے سے منع کیا گیا ہے تو اسی سے واضح ہو گیا کہ پھل کھانے سے اجتناب لازم قرار دیا گیا۔ اور اس کی ممانعت میں مبالغہ ثابت کیا گیا ہے اور اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ:

" ان القرب من الشئی یورث داعية وميلا ياخذ بمجامع القلب ويلهيه عما هو مقتضى العقل والشرع "

"کسی چیز کا قرب اسے حاصل کرنے کی تمنا پیدا کرتا ہے۔ اور دلی میلان اس کی طرف ہو جاتا ہے۔ اور کثرت محبت اس سے عقل و شرع کے خلاف کام کرا دیتی ہے"۔

اس پر یہ روایت بھی شاہد ہے " حبک الشئی یعمی ویصم " کسی چیز کی محبت تمہیں اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ یہاں سے ہی ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا:

" فینبغی ان لا یحوما ما حول ما حرم الله علیها مخافة ان یقعا فیه "

"کہ مناسب یہی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کے اردگرد بھی نہ پھرو کہ کہیں اس حرام کے مرتکب نہ ہو جاؤ" (از بیضاوی)

فائدہ: جس طرح حرام چیزوں کے اسباب و ذرائع سے بھی بچنا ضروری ہے۔ تاکہ وہ حرام تک نہ

پہنچائیں۔ جیسا کہ کسی کی زمین میں کھیتی کو بچانا ضروری ہے اور کھیتی کو بچانے کیلئے اسکے اردگرد لگی ہوئی باڑ کے قریب جانے سے بھی جانوروں کو روکنا ضروری ہے۔ اسی طرح واجب چیزوں کے اسباب پر عمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ واجب پر عمل کیا جا سکے، نماز فرض ہے نماز کی شرط وضو ہے وضو کرنے کیلئے پاک پانی کا حاصل کرنا حتی الوسع بھی ضروری ہے۔ نبی کریم ﷺ کی تعظیم واجب ہے تو یقیناً تعظیم کے ذرائع واسباب یعنی نعت خوانی اور نبی کریم ﷺ کے ذکر کی محافل، میلاد کی محافل کا انعقاد بھی ضروری ہے تاکہ ان محافل میں نبی کریم ﷺ کی عظمت اور آپ کے اوصاف جمیلہ اور آپ کے معجزات و کمالات کو بیان کیا جائے جس سے لوگوں کے ایمان کی حفاظت ہو سکے۔

جس درخت سے روکا گیا وہ کون سا تھا؟

اگرچہ اس میں مختلف قول ہیں بعض حضرات نے کہا اس سے مراد انگور کی بیل ہے بعض نے کہا گندم کا پودا ہے بعض نے کہا سنبلہ (خوشبودار پودہ) ہے بعض نے کہا زیتون کا درخت مراد ہے بعض نے کہا کھجور کا درخت مراد ہے بعض نے کہا انجیر کا درخت مراد ہے۔

خیال رہے "شجرۃ" کا اطلاق عام ہے درختوں، بیلوں اور پودہ جات تمام پر بولا جاتا ہے:

"قال الامام ابو جعفر بن جریر رحمه الله والصواب في ذلك ان يقال ان الله عزوجل ثناؤه نهى آدم وزوجته عن اكل شجرة بعينها من اشجار الجنة دون سائر اشجارها فاكلامنها ولا علم عندي باى شجرة على التعبين لان الله لم يضع لعباده دليلا على ذلك في القرآن ولا من السنة الصحيحة" (صابونی)

"امام ابوجعفر بن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ درست یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور آپ کی زوجہ کو جنت کے تمام درختوں سے نہیں روکا بلکہ ایک معین درخت سے روکا، جس کا پھل آپ نے کھالیا وہ درخت کون سا تھا؟ اس کا ذکر قرآن پاک میں نہیں اور احادیث صحیحہ میں بھی نہیں البتہ ضعیف حدیثوں میں مختلف قول ملتے ہیں۔ جن کا ذکر اوپر بیان کیا جا چکا ہے"۔

اس لئے مناسب یہی کہ درخت کو معین کر کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور نہ ہی درخت کے معین کرنے پر مسائل موقوف ہیں اس لئے اس بحث پر پڑنے کے کوئی مقاصد نہیں۔

﴿ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴾

☆ شیطان نے جنت سے انہیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا، اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے۔

☆ تو شیطان نے انہیں (اس درخت کے ذریعے) پھسلایا، پس ان دونوں کو وہاں سے الگ کر دیا جہاں وہ رہتے تھے، اور ہم نے کہا تم تمام اتر جاؤ، بعض تمہارے بعض کے دشمن ہوں گے اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور نفع حاصل کرنا ہے ایک خاص وقت تک۔

مختصر مطلب: شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو پھسلا دیا انہوں نے اس درخت کا پھل کھالیا، جس کی وجہ سے انہیں جنت سے زمین میں آنا پڑا۔

رب تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ تم تمام یہاں سے نیچے زمین پر اتر جاؤ۔ اور یہ بھی خیال رکھنا کہ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہوں گے، یعنی دشمن سے محتاط رہنے کا حکم زمین پر اتارتے وقت ہی دے دیا گیا، اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ زمین میں ایک وقت تک تمہارا اقرار ہوگا اور تمہیں نفع حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔

اسی سے یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ جو انسان بھی روئے زمین پر آئے گا ایک وقت کے بعد اس نے جانا بھی ہے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا ﴾: تو شیطان نے جنت سے ان کو لغزش دی۔

" عنھا " میں ضمیر یا تو " شجرۃ " کی طرف لوٹ رہی ہے، اب معنی یہ ہوگا " حملھما علی الزلۃ " ان دونوں یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو وہ پھل کھانے پر برانگیختہ کیا جوان کی لغزش کا سبب بنا۔ غزالی دوران علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے بھی یہی معنی کیا اور راقم نے بھی وہی نقل کیا۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ " عنھا " میں ضمیر، سابقہ آیۃ میں مذکور " الجنۃ " کی طرف لوٹ رہی ہو، تو اب معنی یہ ہوگا " تو شیطان نے جنت سے انہیں لغزش دی" اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہی ترجمہ ہے۔
(ماخوذ از روح المعانی)

" فازلھما " ماخوذ ہے " زلۃ " سے اس کے لغوی معنی سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی یہ لغزش بلا ارادہ تھی۔ اسے گناہ یا ظلم سے تعبیر کرنا خود اپنی جان پر ظلم کرنا ہے۔

" الزلۃ فی الاصل استرسال الرجل من غیر قصد "

"بغیر ارادہ کے پاؤں کا پھسل جانا اصل میں زلۃ ہے"

" والمزلۃ مکان الزلق " "پھسلنے والی جگہ کو مزلۃ کہا جاتا ہے" (مفردات راغب)

پھسلنے کی وجہ واضح ہوگئی:

جب کہ زلۃ کا معنی ہی بلا ارادہ پھسل جانا ہے تو واضح ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کا پھسلنا بھول کی وجہ سے تھا، جو کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا " فنسی ولم نجد لہ عزما " آدم بھول گئے ہم نے ان کا کوئی ارادہ نہ پایا۔

" وقاسمھما انی لکما لمن الناصحین " اور ان سے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں

معنی یہ ہیں کہ ابلیس ملعون نے جھوٹی قسم کھا کر حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا دیا اور پہلا جھوٹی قسم کھانے والا ابلیس ہی ہے حضرت آدم علیہ السلام کو گمان بھی نہ تھا کہ کوئی اللہ کی قسم کھا کر جھوٹ بول سکتا ہے اس لئے آپ نے اس کی بات کا اعتبار کیا۔ (خزائن العرفان)

شیطان اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا:

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو جب یہ حکم دیا گیا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ شیطان

نے ان سے اس فرمان الٰہی کی نافرمانی کرانی چاہی۔اسلئے وسوسے کی زبان میں دونوں کو کہا:

" فوسوس الیہ الشیطن قال یا آدم ھل ادلک علی شجرۃ الخلد وملک لا یبلی "

''شیطان نے انہیں وسوسہ ڈالا،کہااے آدم کیا میں تمہیں ایسا درخت نہ دکھاؤں ،جس کے کھانے سے تم ہمیشہ جنت میں رہواور تمہیں ایسی بادشاہی نصیب ہوجائے جس میں کبھی کسی قسم کی کمزوری پیدا نہ ہو''

شیطان نے ان کے دلوں میں بار بار وسوسہ پیدا کیا اور وسوسہ کی زبان میں قسم کھا کر ان کو کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔اس درخت کے (پھل) کھانے سے تمہارے رب نے صرف اس لئے تمہیں روکا ہے کہ تم فرشتہ نہ ہوجاؤ،یا ہمیشہ تمہیں جنت میں رہنا نصیب نہ ہوجائے۔

بالآخر دھوکہ سے انہیں اس درخت کے کھانے پر آمادہ کرلیا اور آدم وحوا نے درخت سے کھالیا، اور کھاتے ہی ان کا جنتی لباس ان سے اتر گیا اور جنتی درختوں کے پتوں سے اپنے اپنے جسموں کو ڈھانپ لیا۔

﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾: ''جہاں وہ رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کردیا گیا''

یعنی وہ جنت سے زمین کی طرف اتار دیئے گئے ۔یہاں تک تو شیطان کی خواہش پوری ہوگئی، لیکن اس مقصد میں وہ کامیاب نہ ہوا اس کی اصل خواہش یہ تھی کہ آدم علیہ السلام کو جو روکا گیا ہے،اس نہی کو یاد رکھتے ہوئے قصدا اس درخت سے کھائیں اور اس طرح عاصی اور نافرمان ہوکر جنت سے نکالے جائیں،اسلئے اس نے وسوسہ کی زبان میں "مانھا کما ربکما عن ھذہ الشجرۃ " کہہ کر اللہ کی نہی بھی انہیں یاد دلادی۔

لیکن عصمت الٰہیہ نے انہیں معصیت سے بچالیا اور اس درخت کے کھانے سے پہلے نہی الٰہی کا انہیں نسیان ہوگیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا " فنسی ولم نجد لہ عزما " آدم بھول گئے ہم نے ان کا قصد نہ پایا۔

واضح ہوا کہ آدم علیہ السلام قصدا فرمان الٰہی کی خلاف ورزی سے بچ گئے اور شیطان اپنے اصل

مقصد میں ناکام ہوگیا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے " ازلھما " ذکر فرمایا کہ ان کو پھسلایا، یہ نہیں فرمایا" اضلھما " ان کو بھٹکایا۔ ان کو گمراہ کردیا۔ (از تبیان للکاظمی)

شیطان نے وسوسہ کیوں ڈالا؟

آدم علیہ السلام کو جب فرشتوں نے سجدہ کرلیا تو آپ کو اور آپ کی زوجہ کو جنت میں رہنے کا حکم ہوا اور ارشاد ہوا کہ آپ یہاں جو چاہیں بافراغت کھائیں یعنی تمہیں کسی چیز کے کھانے سے یہاں کوئی رکاوٹ نہیں۔ ہاں البتہ ایک درخت کے قریب جانے سے روک دیا گیا۔ تو اس منع کیے ہوئے درخت کی وجہ سے شیطان نے دونوں کو پھسلا دیا اور انہیں خوشحالی، بے فکری اور عیش و عشرت کے ماحول یعنی جنت سے دور کردیا۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے شیطان نے انکار کردیا اور تکبر کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا " فاخرج منها فانک رجیم " تو مردود ہے یہاں سے نکل جا۔

تو شیطان کے دل میں بغض و حسد کی آگ بھڑکنے لگی اور کہنے لگا کہ جس طرح میں ذلیل و خوار کر کے نکالا گیا ہوں آدم اور حوا اور ان کی نسل کو اسی طرح جنت سے نکالوں گا، اور انہیں اس طرح گمراہ کروں گا جس طرح مجھے گمراہ کیا گیا، یعنی میں ان سے پورا بدلہ لوں گا۔

شیطان پھسلانے پر کیسے قادر ہوا:

شیطان نے جب سجدہ سے انکار کیا اسے جنت سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ اسی وقت اس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت لے لی، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ تیرا داؤ میرے مخلص بندوں پر نہیں چلے گا، اس لئے شیطان آپ سے قصداً گناہ نہ کرا سکا بلکہ صرف اس مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کے دل میں وسوسہ ڈال کر آپ کو بھلا دیا۔

شیطان انسانوں کو کیسے وسوسہ ڈالتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ انه یراکم هو وقبیله من حیث لا ترونهم ﴾
''بیشک وہ (شیطان) اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے جہاں سے تم اس کو نہیں دیکھ سکتے''

یعنی شیطان اور اس کے زیر اثر دوسرے چھوٹے شیطان جہاں کہیں بھی ہوں انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں، اور انہیں وسوسہ میں ڈال سکتے ہیں حالانکہ انسان انہیں نہیں دیکھ رہے ہوتے

" ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم " (بخاری ، ابوداؤد ، ابن ماجه ، مسند احمد)

''بیشک شیطان انسان کے اندر اپنے اثرات اس طرح جاری وساری کرسکتا ہے، جیسے آدمی کی رگوں میں خون جاری ہوتا ہے'' (از تبیان للکاظمی)

شیطانی وسوسہ کے اثر ہونے یا نہ ہونے کے لحاظ سے لوگوں کی پانچ قسمیں:

انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے، روح عالم قدس کی ایک لطیف مخلوق ہے، جس میں عالم بالا کے حقائق وکمالات اور تمام منافع پائے جاتے ہیں، اور جسم کی تخلیق مٹی سے ہوئی اس لئے اس میں مادی اثرات اور خصوصیات اور زمین کی مخلوقات والے کمالات پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بننے کی استعداد ہر انسان کو جسم اور روح کے ضمن میں عطاء ہوئی، لیکن شیطان نے انسان کو جو اس نعمت سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے اس کے نتیجہ میں انسانوں کے پانچ گروہ بن گئے۔

<u>پہلا گروہ:</u> وہ ہے جو پوری طرح شیطان کے قبضہ میں آ کر خلافت الٰہیہ سے بغاوت کر بیٹھا اس نے خلافت الٰہیہ کی استعداد بالکل ضائع کردی۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اسکی معرفت سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا۔ دونوں جہانوں کی نیک نیتی اور ہمیشہ کی نجات کی راہوں سے دور جا پڑا۔ کوئی روحانی کمال حاصل کرنے کی اس میں طاقت نہ رہی۔ یہاں تک کہ مادی فوائد جاننے اور انہیں حاصل کرنے سے بھی وہ محروم رہا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عقل وخرد سے خالی ہیں۔ جاہل، کافر اور مشرک ہیں۔

<u>دوسرا گروہ:</u> وہ ہے جس میں استعداد تو باقی رہی مگر شیطان کے بھٹکانے سے بھٹک گیا اور روحانی استعداد کو ضائع کردیا۔ اس لئے روحانی تقاضوں کو بروئے کار لانے سے وہ محروم ہوگیا، معرفت الٰہیہ تو در کنار اللہ تعالیٰ کی ہستی سے بھی منکر ہوگیا۔ اس نے صرف جسم اور مادہ کو اپنا مقصد بنالیا اور اپنی بقیہ استعداد کا رخ مادیات ہی کی طرف موڑ دیا، وہ عقل کی پیچیدگیوں میں گم ہو کر رہ گئے۔

بعض نے جدید انکشافات اور مادی ایجادات میں بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی، بیشمار مفید چیزیں ایجاد کیں۔ فضاء میں اڑنے والے طیارے، خلانورد سیارے کے ذریعے زمین وآسمان تک رابطہ

قائم کرلیا، حیرت انگیز آلات ایجاد کر لئے اب ان کی ترقی کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ انہوں نے بنی نوع انسان کی ہلاکت کے لئے ہزاروں میل تک مار کرنے والے میزائل تیار کر لئے، ایٹم بم، نیپام بم بنانے، آواز سے زیادہ تیز رفتار ہوائی جہاز تیار کئے جن کے ذریعے چند سکینڈ میں روئے زمین کو ہلاکت خیز منظر میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اور ایٹم بموں کے ذریعے کرۂ ارض (زمینی کرہ) کو آنکھ جھپکنے کی مقدار میں اڑا کر تباہ و برباد کر دینا آسان ہے، خلافت الٰہیہ کی وہ استعداد جو بنی نوع انسان کی جسمانی، روحانی، دینوی اخروی فوائد کے لئے تھی، اسے انسانوں کے ہلاک کر دینے والے آلات کے لئے وقف کر دیا گیا۔

اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ان ہتھیاروں کو ایجاد کرنے والے خود اپنے آپ کو ان کی زد میں محسوس کر رہے ہیں۔ انہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہے کہ ہمارے ہی ایجاد کئے ہوئے آلات نہ معلوم کس وقت ہم پر پھٹ پڑیں اور کرۂ ارض کے ساتھ ہم بھی لقمہ اجل بن کر نہ رہ جائیں۔

تیسرا گروہ: وہ ہے جن میں استعداد تو موجود تھی مگر شیطان کے ورغلانے کا اتنا اثر ان پر ضرور ہوا کہ وہ غفلت اور سستی کا شکار ہو گئے کہ اپنی استعداد کو پوری طرح بروئے کار نہ لائے، یہ وہ عام مسلمان لوگ ہیں جنہوں نے قدرے قلیل جسمانی اور روحانی منافع حاصل کئے مگر اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں نہ لانے کی وجہ سے روحانیات یا مادیات پر کامل تصرف حاصل نہ کر سکے۔ بیشک وہ منصب خلافت پر فائز نہیں ہوئے مگر انہوں نے خلافت الٰہیہ سے بغاوت بھی نہیں کی۔ یعنی ایمان سے ہاتھ نہیں دھوئے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اس گروہ میں پھر دو قسمیں ہیں ایک وہ جن پر شیطان کا اثر کم ہے اور دوسرے وہ جن پر شیطان کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اگرچہ ایمان سے دور تو نہیں ہوتے لیکن بہت زیادہ گناہوں میں مبتلاء ہو جاتے ہیں۔

چوتھا گروہ: اللہ کے ان خاص بندوں کا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی جسمانی، روحانی، علمی، عملی پوری استعداد موجود تھی، اور شیطان کے بھٹکانے کا ان کو کوئی نقصان نہ پہنچ سکا۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مخاطب فرما کر پہلے ہی فرما دیا تھا "**ان عبادی لیس لک علیهم سلطن**" بیشک میرے خاص بندوں پر تجھے کوئی غلبہ حاصل نہ ہوگا۔

یہ مقدس گروہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام اور ان کے متبعین کاملین پر مشتمل ہے جنہوں نے

اللہ تعالیٰ کی عطاء فرمائی ہوئی استعداد کو پوری طرح کام میں لا کر خلافت الٰہیہ کے منصب کو پایا۔ حکمت ومصلحت کے مطابق روحانیات ومادیات پر متصرف ہوئے اور خلافت الٰہیہ کے تقاضوں کو انہوں نے صحیح معنوں میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

پانچواں گروہ: وہ ہے جس نے اپنے خیال میں صرف روح اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا اور جسمانیات اور مادیات کو نظر انداز کر دیا یہ وہ تارک الدنیا لوگ ہیں جو اپنے اپنے خیال کے مطابق ریاضت ومجاہدہ میں مشغول رہے۔ ان میں کچھ وہ ہوتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان ہوتا ہے وہ شیطان کی بھٹکانے سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان نہیں رکھتے ان کو شیطان نجات کی راہ سے مکمل طور پر ہٹا دیتا ہے اپنی ریاضت اور مجاہدہ سے کسی نے فائدہ اٹھا کر روحانیت کو حاصل کر لیا، البتہ دنیاوی اور مادی منافع سے محروم رہے اور کسی کو اپنے خیال کے مطابق اپنی کی ہوئی ریاضت ومجاہدہ سے نہ روحانیت ملی اور نہ ہی دنیاوی اور مادی منافع حاصل ہوئے۔

(ماخوذ از تبیان للکاظمی)

شیطان نے کہاں سے وسوسہ والی گفتگو کی:

شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا سے جو کلام کیا وہ صرف وسوسہ ڈالا، جس وسوسہ میں بہت زیادہ قوت پائی گئی تھی کیونکہ اس نے قسم اٹھا کر آپ کو وسوسہ ڈالا:

" وقیل خاطبه من الارض ولم یصعد الی السماء بعد الطرد واللعن وکان خطابه وسوسة "

(تفسیر بحر محیط ج ۱ ص ۱۶)

''اس نے زمین سے ہی آپ سے خطاب کیا یعنی زمین سے ہی وسوسہ والی گفتگو کی۔ کیونکہ جب سے اسے جنت سے نکال دیا گیا اور ملعون قرار دے دیا گیا پھر وہ آسمانوں پر نہ چڑھ سکا، کیونکہ اسے آسمان پر جانے کی اجازت ہی نہیں تھی''۔

قرآن پاک اور حدیث پاک میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ شیطان حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جنت میں پہنچا ہو۔ کیونکہ قرآن پاک میں صرف اسکے وسوسہ ڈالنے کا ذکر ہے " فوسوس لهما الشیطن " ان دونوں کو شیطان نے وسوسہ میں ڈال دیا۔ شیطان کو وسوسہ ڈالنے کیلئے جنت میں جانا ضروری ہی نہیں تھا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ شیطان جسے وسوسہ ڈالے وہ شیطان کو دیکھے بھی۔

" ان الشیطن یجری من الانسان مجری الدم "

" بیشک شیطان انسان میں ایسے سرایت کر جاتا ہے جیسے خون سرایت کئے ہوئے ہے "

تنبیہ: جن اقوال میں شیطان کا سانپ کے ذریعے یا مور کے ذریعے جنت میں جانے کا ذکر ہے وہ اقوال درست نہیں بلکہ اسرائیلی روایت ہیں۔

ابن کثیر میں ہے: " قد ذکر المفسرون ھھنا اخبار الا سرائیلیة "

یہاں مفسرین نے کئی اسرائیلی روایات کو ذکر کر دیا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی یہی بیان کیا ہے:

" اعلم ان ھذا وامثاله مما یجب ان لا یلتفت الیه " (کبیر)

" ضروری ہے کہ اس قسم کی روایات کی طرف بالکل توجہ نہ کی جائے "

اس بحث کو مدنظر رکھتے ہوئے آنے والے (اسی آیۃ مبارکہ کے) الفاظ مبارکہ کو سمجھنا آسان ہوگا۔

﴿ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ﴾:

" (وقلنا اهبطوا) الی الارض ای انتما بما اشتملتما علیه من ذریتکما (بعضکم) بعض الذریة (لبعض عدو) من ظلم بعضهم بعضا " (جلالین)

" یہ حکم حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو ہے کہ تم دونوں زمین پر اتر جاؤ۔ البتہ " اهبطوا " جمع کا صیغہ اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان کو بمع ان کی ذریت، (جو ابھی تک آدم علیہ السلام کی صلب میں تھی) کے زمین پر اترنے کا حکم دیا۔ " بعضکم لبعض عدو " کا مطلب بھی یہی ہے کہ تمہاری اولاد میں سے بعض لوگ بعض کے دشمن ہوں گے "۔

تنبیہ: تفسیر خازن میں ہے (اور دیگر کئی تفاسیر میں بھی ہے) " (وقلنا اهبطوا) ای انزلوا الی الارض یعنی آدم وحوا وابلیس والحیة " اور ہم کہا نے اتر جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا اور ابلیس اور سانپ کو حکم دیا کہ تم زمین پر اتر جاؤ۔

اسی طرح ﴿ بعضکم لبعض عدو ﴾ کا مطلب تفسیر خازن میں یوں ذکر کیا گیا ہے:

" (بعضکم لبعض عدو) یعنی العدواة التی بین المؤمنین من ذریة آدم و بین ابلیس والیه الاشارة بقوله عزوجل ان الشیطان لکم عدو

فاتخذوه عدوا "

"اس آیۃ میں جس عدوات کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو کہا گیا ہے کہ تمہاری اولاد میں سے مومن حضرات اور ابلیس کے درمیان عدوات ہوگی۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا"۔

ترجمہ: بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے اس کو دشمن پکڑو، یعنی شیطان کو دشمن سمجھو تا کہ اس سے اپنے آپ کو بچا سکو۔

" والعداوة التی بین ذریة آدم والحیة " اسی طرح آیۃ کریمہ میں جس عداوت کا ذکر ہے اس سے مراد وہ عداوت ہے جو آدم علیہ السلام کی اولاد اور سانپ کے درمیان ہے جس عداوت کا ذکر احادیث مبارکہ میں پایا گیا ہے۔

☆ " عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من ترک الحیة مخافة طلبهن فلیس منا ما سالمنا هن منذحا ربنا هن " (ابو داؤد)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سانپ کو چھوڑ دیا اس خوف سے کہ وہ اسے طلب کریں گے تو وہ ہم سے نہیں کیونکہ ہم نے ان سے صلح نہیں کی جب سے ان سے لڑائی کی"۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ سانپ کو دیکھو تو اسے قتل کردو، یہ خوف نہ کرو کہ وہ تم پر حملہ کرے گا، اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا قرب ہم سے نہیں ہوگا، کیونکہ سانپ انسان کا دشمن ہے، ہم نے اسے ہمیشہ اپنا دشمن ہی سمجھا ہے کبھی اسے اپنا دوست نہیں سمجھا۔

☆ " عن ابن مسعود ان رسول الله ﷺ قال اقتلوا الحیات کلهن فمن خاف من ثارهن فلیس منی " .... وفی روایة اقتلوا الکبار کلها الا الجان الابیض الذی کانه قضیب فضة " (مسلم)

"حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام سانپوں کو قتل کرو جو ان کے انتقام (حملہ کرنے، ڈسنے) سے خوف رکھے وہ ہم سے نہیں"

ایک روایت میں ہے تمام بڑے سانپوں کو قتل کرو سوائے چھوٹے سفید سانپوں کو جو چاندی کی چھڑی کی طرح ہوں۔

☆ " عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان بالمدینة جنا قد اسلموا فاذا رأیتم منھم شیأ فآذنوہ ثلاثة ایام فانه بدا لکم بعد ذلک فاقتلوہ فانما ھو شیطان ....وفی روایة ان بھذہ البیوت عوامر فاذا رأیتم عنھا شیأ فحرجوا علیه ثلاثا فان ذھب والا فاقتلوہ فانه کافر " (مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مدینہ طیبہ میں جن رہتے ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرلیا، اگر ان میں سے کوئی تمہارے سامنے ظاہر ہوتو اسے تین دن رہنے کی اجازت دو (اگر وہ چلا جائے تو درست ہے) ورنہ اسے قتل کردو کیونکہ وہ شیطان ہے.........ایک روایت میں ہے ان گھروں میں رہنے والے ہیں، جب تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو اس پر حرج پیش کرو (اسے ڈراؤ) تین دن تک، (اگر چلا جائے تو ٹھیک) ورنہ اسے قتل کردو وہ کافر ہے۔ (خازن)

" قال العلماء معناہ واذا لم یذھب بالانذار علمتم انه لیس من عوامر البیوت ولا ممن اسلم من الجن بل ھو شیطان فلاحرمة لکم فاقتلوہ ولن یجعل اللہ له سبیلا للانتصار علیکم بثارہ بخلاف العوامر ومن اسلم واللہ اعلم " (نووی علی المسلم ج ۲ ص ۲۱۳)

" علماء نے بیان کیا ہے کہ جب وہ تمہارے ڈرانے سے بھی نہ جائیں تو تم جان لو کہ وہ گھروں میں رہنے والے نہیں اور نہ ہی ان سے ہیں جو جنوں میں سے اسلام لائے ہیں۔ بلکہ وہ شیطان ہے۔ لہٰذا اس کو (نہ قتل کرنے کی) کوئی حرمت حاصل نہیں بلکہ اس کو قتل کردو، کیونکہ اس کے ڈسنے اور حملہ کرنے کے پیش نظر اسے قتل کردیا جائے، البتہ جو گھروں میں رہنے والے (سانپ) اور جنوں میں سے اسلام لانے والے (سانپ) ان کو تین دنوں کی مہلت دی جائے اور ڈرایا جائے وہ چلے جائیں تو ٹھیک ورنہ ان کو بھی قتل کردیا جائے"

ڈرانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو کہا جائے:

" انشدکن بالعھد الذی اخذ علیکن سلیمان بن داؤد ان لا تؤذونا ولا تظھرن لنا "

" میں تمہیں وہ وعدہ یاد دلاتا ہوں جو تم سے سلیمان علیہ السلام نے لیا تھا کہ تم ہمیں کوئی ایذاء (تکلیف) نہیں پہنچاؤ گے اور نہ ہی ہم پر ظاہر ہو گے" (نووی ج ۲ ص ۲۴۲)

خازن کی اس بحث کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ ساری بحث اس وقت صحیح ہوسکتی ہے جب یہ صحیح روایت سے ثابت ہو کہ ابلیس سانپ کے منہ میں داخل ہوکر جنت میں گیا اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو پھسلایا۔

لیکن جیسا کہ پہلے البحر المحیط کے حوالہ سے ثابت کیا جاچکا ہے کہ ابلیس نے زمین سے ہی وسوسہ ڈالا۔ اور ابن کثیر اور تفسیر کبیر سے ثابت کیا جاچکا ہے کہ یہ روایات غیر معتبر ہیں تو واضح ہوا کہ اترنے کا حکم حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو بمع ان کی ذریت کے دیا گیا، اسی لئے صیغہ جمع کا استعمال ہوا اور اس آیت میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ تمہاری اولاد بعض، بعض کے دشمن ہوگی۔

یہ بھی خیال رہے کہ مسئلہ اس آیت کے متعلق بیان ہو رہا ہے کہ اس آیت میں دشمنی سے مراد ابلیس یا سانپ کی دشمنی نہیں، یہ نہیں بیان کیا جارہا کہ ابلیس مؤمنین کا دشمن نہیں، ابلیس کی دشمنی قرآن پاک کی آیت سے واضح طور پر ثابت ہے جو خازن کے حوالہ سے ذکر ہوچکی ہے۔ اسی طرح یہ بھی بیان نہیں کیا جارہا کہ سانپ انسانوں کا دشمن نہیں وہ تو احادیث سے ثابت ہے۔

تفسیر مدارک میں بہت خوب بیان کیا گیا:

" (وقلنا اهبطوا) الهبوط النزول الى الارض والخطاب لآدم وحوا وابليس والحية والصحيح لآدم وحوا والمراد هما وذريتها لما كانا اصل الانس ومنشعبهم جعلا كانها الانس كلهم ويدل عليه قوله تعالى قال اهبطا منها جميعا (بعضكم لبعض عدو) المراد به ما عليه الناس من التباغي والتعادى وتضليل بعضهم لبعض "

" قلنا اهبطوا " میں اترنے کا حکم آدم علیہ السلام اور حضرت حوا اور ابلیس کو ہے۔ بعض نے کہا سانپ کو بھی حکم دیا گیا کہ زمین پر اتر جاؤ۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حکم حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو ہے۔ اس سے مراد وہ دونوں اور ان کی اولاد ہے، کیونکہ یہ دونوں تمام انسانوں کے اصل ہیں۔ اور باقی تمام انسان ان کی ہی اولاد ہیں، اس لئے ان دونوں کو ہی تمام انسانوں کا اصل ہونے کی وجہ سے تمام

انسان ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا دوسرا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے ﴿ قال اهبطا منها جميعا ﴾ رب تعالیٰ نے فرمایا تم دونوں ایک ساتھ ہی اتر جاؤ۔ چونکہ واقع ایک ہی ہے اس لئے ایک جگہ جب تثنیہ کا صیغہ ہے دو کو حکم ہے تو یقیناً دوسری جگہ جو جمع کا صیغہ ہے وہ بھی حکم دو ہی کو ہے البتہ ان کی تمام ذریت کو ساتھ ملا کر جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے " بعضكم لبعض عدو " سے مراد یہ ہے کہ بعض لوگ بعض پر بغاوت کریں گے، دشمنی کریں گے اور بعض لوگ دوسرے بعض کو راہ راست سے بھٹکائیں گے۔

﴿ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ :

"مستقر کا معنی "موضع استقرار" قرار کی جگہ" ومتاع ...... المتاع ما يستمتع به من اكل ولبس وحياة وحديث وانس وغير ذلك " متاع کا معنی یہ ہے کہ نفع حاصل کرنا کھانے، پینے، لباس، زندگی، کلام کرنے اور انس پکڑنے وغیرہ سے " الى حين "ایک وقت تک، اس سے مراد موت ہے۔

اب مطلب یہ ہوگیا کہ تم نے زمین میں رہنا ہے اور نفع حاصل کرنا ہے موت تک، اسی سے واضح ہو کر دیا گیا تھا کہ تمہاری زندگی دائمی نہیں ہوگی بلکہ اس نے ختم ہونا ہی ہے۔

" وقال السدى " مستقر " یعنی القبور، علامہ سدی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ مستقر کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں قبروں میں جائے قرار حاصل ہوگی۔ اس معنی کے لحاظ سے "الی حین" کا معنی ہوگا قیامت تک یعنی تمہیں قبروں میں قیامت تک رہنا ہوگا۔ (از قرطبی)

اس معنی کے لحاظ سے "متاع" کا معنی بھی واضح ہوگا کہ تمہیں قبروں میں نفع حاصل ہوگا، رزق، جنت کی ہوا، جنت کی خوشبو وغیرہ لیکن اس میں مؤمنین کی تخصیص ہوگی۔

فائده عظيمه:

" وانما كان اخراجهما من الجنة الى الارض لانهما خلقا منها لآدم وليكون آدم خليفة فى الارض ولم يقصد ابليس لعنه الله اخراجه منها وانما قصد اسقاطه من مرتبته وابعاده كما ابعد هو فلم يبلغ مقصده ولا ادرك مراده بل ازداد سخنة عين وغيظ نفس وخيبة ظن " (قرطبی)

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو جنت سے نکالنے کی دراصل وجہ ہی یہ تھی کہ بیشک وہ دونوں زمین سے ہی پیدا کئے گئے تھے یعنی آدم علیہ السلام کو زمین سے اور حضرت حوا کو آپ کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ اور آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا ﴿ انی جاعل فی الارض خلیفہ ﴾ بیشک میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو یقیناً آپ کو زمین میں بھیجنا ہی تھا تاکہ آپ کو زمین میں منصب خلافت حاصل ہو سکے۔

شیطان لعین کا مقصد بھی آپ کو صرف جنت سے نکالنا نہیں تھا بلکہ وہ تو چاہتا تھا کہ آپ کے مرتبہ کو کم کر دیا جائے اور ان کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے قرب سے اسی طرح دور کر دے جس طرح مجھے دور کر دیا گیا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ اس کی آنکھ کو گرمی حاصل ہوئی اس کے نفس میں غصہ بڑھا، اس کا گمان فاسد ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کی توبہ کو قبول کر کے ان کو منصب خلافت پر فائز کر دیا گیا۔

قرطبی کے اسی قول پر حاشیہ جلالین میں بیان کیا گیا آپ کو جنت سے اتارنے اور زمین پر ٹھہرانے کی وجہ ہی یہ تھی کہ حکمت ازلیہ ظاہر ہو اور آپ کی نسل پھیلے ان کے اعمال پر اخروی ثواب وعذاب مرتب ہو، کیونکہ جنت اور جہنم دار تکلیف نہیں۔

ابو مدینہ قدس سرہ سے پوچھا گیا کہ آدم علیہ السلام نے کس طرح وہ پھل کھا لیا تھا جس سے رب تعالیٰ نے منع فرمایا تھا؟ تو آپ نے بھی یہی جواب دیا کہ منشا ایزدی یہی تھا کہ رب تعالیٰ نے آپ کو زمین پر اتار کر ہی مخلوق کا نظام قائم کرنا تھا، یہی وجہ آپ کے بھولنے کی اور درخت کے پھل کو کھانے کی ہوئی۔

اس تمام واقعہ کی جو ان کے کلام سے سمجھ آ رہا ہے کیا خوب حکمت کیا ایمان افروز کلام فرمایا آپ فرماتے ہیں:

" لو کان ابونا یعلم انه یخرج من صلبه مثل محمد ﷺ لصاریا کل عرق الشجرة فکیف ثمرها یسارع فی الخروج علی وجه الارض لیظهر الکمال المحمدی و الجمال الاحمدی "

(روح البیان)

" اگر ہمارے باپ آدم علیہ السلام کو اس وقت یہ معلوم ہوتا کہ درخت کے پھل کھانے سے مجھے زمین میں جانا پڑے گا اور میرے زمین پر جانے سے ہی محمد ﷺ میری اولاد میں سے زمین پر ظاہر ہوں گے، تو صرف پھل ہی کیا آپ درخت کی ٹہنیاں بھی کھا جاتے تاکہ جنت سے

نکل کر جلدی زمین پر پہنچ جائیں کہ آپ کی ذریت میں کمال محمدی اور جمال احمدی کا ظہور ہو"

(از حاشیہ جلالین)

حضرت آدم وحوا علیہما السلام کا زمین پر تشریف لانا:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ فاخرجهما مما كان فيه ﴾ اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا گیا۔

یعنی جنت میں حضرت آدم وحوا علیہما السلام دونوں کو رہنے کی اجازت دی گئی اور ہر قسم کے جنت کے پھل اور نعمتیں کھانے کی اجازت دی گئی، البتہ ایک درخت سے منع کیا گیا، جب شیطان خیر خواہ بن کر، قسمیں اٹھا کر نصیحت دینے والے کی شکل میں آپ کو وسوسہ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تو آپ کو جنت اور جنت کی نعمتوں سے الگ ہونا پڑ آ۔ اور اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا ﴿ وقلنا اهبطوا بعضكم لبعض عدو ﴾ اور ہم نے کہا تم تمام اتر جاؤ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں اور دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ وقال اهبطا منها جميعا ﴾ اور رب نے فرمایا تم دونوں مل کر جنت سے اتر جاؤ۔

دونوں آیتوں کا مقصد یہ ہے کہ حضرت آدم وحوا کو بمع ان کی اولاد کے جو قیامت تک معرض وجود میں آنی تھی زمین پر ان کو اترنے کا حکم دے دیا گیا اور فرمایا تمہاری اولاد بعض دوسرے بعض کی دشمن ہوگی۔

خیال رہے کہ شیطان ان دونوں کے اتارنے سے پہلے ہی مردود کر کے روئے زمین پر بھیج دیا گیا تھا، یہاں اس کے اترنے کا ذکر نہیں، آدم علیہ السلام جب زمین پر تشریف لائے، آپ کا جنتی لباس اتار لیا گیا تھا اور جنت کے درختوں کے پتے اپنے جسم پر ڈھانپ کر تشریف لائے۔

آدم علیہ السلام کو سراندیپ (ہندوستان میں ایک جگہ کا نام) میں اتارا گیا اور حضرت حوا کو جدہ میں اور شیطان کو پہلے ہی ایلہ میں اتار دیا گیا تھا۔ (از روح المعانی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی زمین اس لئے عمدہ اور ہری بھری ہے اور عود قرنفل وغیرہ خوشبوئیں اس لئے وہاں پر پیدا ہوتی ہیں کہ آدم علیہ السلام جب اس زمین پر آئے تو ان کے جسم پر جنتی درخت کے پتے تھے، وہ پتے ہوا سے اڑ کر جس درخت پر پہنچے وہ ہمیشہ کے لئے خوشبودار ہو گیا۔

(حاکم و بیہقی بروایت ابن عباس بحوالہ عزیزی)

آدم علیہ السلام زمین پر اپنے ساتھ کیا لائے:

حضرت آدم علیہ السلام جنت سے مختلف قسم کے بیج اور تین قسم کے پھل، اور حجر اسود (سیاہ پتھر جو خانہ کعبہ میں لگا ہوا ہے) اور وہ عصا جو بعد میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، جس کی لمبائی دس ذراع تھی، اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور کچھ سونا، چاندی اور کچھ کھیتی باڑی وغیرہ کے اوزار بھی ساتھ لائے آدم علیہ السلام اس قدر گریہ وزاری میں مشغول ہوئے کہ ان تخموں سے بے خبر ہو گئے، شیطان نے موقع پا کر ان کو اپنا ہاتھ لگایا وہ زہریلا ہو گیا اور جو اس کے ہاتھ سے محفوظ رہا ان کا نفع برقرار رہا۔

سیدنا آدم علیہ السلام کے ساتھ تیس قسم کے پھل آئے جو پہلے زمین میں نہیں تھے۔ ان کی تین قسمیں ہیں ایک وہ ہیں جو سارے کھالئے جاتے ہیں جیسا کہ انگور وغیرہ اور ایک وہ ہیں جن کا اوپر کا حصہ کھالیا جاتا ہے اور گٹھلی کو پھینک دیا جاتا ہے جیسے آدم، خوبانی وغیرہ اور بعض وہ ہیں جن کے اوپر حصہ کو پھینک دیا جاتا ہے اور اندرونی حصہ کھالیا جاتا ہے جیسا کہ کیلا، مالٹا وغیرہ۔ اور آدم علیہ السلام جب جنت سے زمین پر آئے تو آپ ساتھ ہی کچھ لوہے کے اوزار بھی لائے، یعنی ان کے ساتھ سنڈاسی جس سے لوہا پکڑتے ہیں ہتھوڑا، ارن تھے۔

یہ بھی خیال رہے کہ جب حجر اسود جنت سے آیا اس کی بہت روشنی تھی ان شعاؤں کی روشنی جہاں تک پہنچی وہاں تک حرم کی حدود کو قائم کر دیا گیا۔ (از عزیزی)

نام محمد ﷺ سے دل کو تسلی:

حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں آ کر بہت وحشت اور گھبراہٹ ہوئی، حضرت جبرائیل علیہ السلام بحکم الٰہی زمین پر آئے اور آپ نے بلند آواز سے اذان کہی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جب اذان میں نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی سنا تو ان کی وہ وحشت اور گھبراہٹ جاتی رہی۔ (از عزیزی)

حضرت آدم علیہ السلام کا ذریعہ معاش:

آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے کپڑا بننے کا کام کیا۔ اور بعد میں آپ کھیتی باڑی کے کام میں مشغول ہو گئے۔ نوح علیہ السلام کا ذریعہ معاش لکڑی کا کام تھا، یعنی آپ نے بڑھئی کا پیشہ اختیار فرمایا۔

حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا کام کرتے تھے۔ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام تجارت کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کچھ مدت بکریاں چرائیں۔ داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے۔ سلیمان علیہ السلام اتنے بڑے عظیم بادشاہ ہونے کے باوجود درختوں کے پتوں سے پنکھے اور زنبیلیں وغیرہ بنا کر گزر کرتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے کوئی پیشہ اختیار نہ فرمایا، بلکہ ہمیشہ سیر کرتے رہتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس نے مجھے صبح کا کھانا دیا ہے وہی شام کا کھانا بھی دے گا۔ (از عزیزی)

فائدہ: حضرت آدم علیہ السلام نے کنوئیں کا پانی کبھی نہیں پیا بلکہ آپ ہمیشہ بارش کا پانی پیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے چاندی سے روپے اور سونے سے اشرفیاں بنائیں۔ (از عزیزی)

اعتراض: ابھی تک جو تم نے بیان کیا ہے اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ آدم علیہ السلام بھول گئے آپ سے کوئی خطاء نہیں ہوئی حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وعصی آدم ربہ فغوی ﴾ کا کئی مترجمین نے ترجمہ کرتے ہوئے "عصی" کا معنی حکم ٹالا۔ نافرمانی کی آپ سے قصور ہوا کیا ہے اور "غوی" کا معنی "راہ سے بہکا" گمراہ ہوئے غلطی میں پڑ گئے راہ راست سے بھٹک گیا کیا ہے، تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے صرف بھول واقع ہوئی، آپ نے کوئی جرم اور گناہ نہیں کیا؟

جواب: عام مترجمین نے یہاں معنی صحیح نہیں بیان کیا دیکھئے اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ "آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ نہ پائی" اس ترجمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ لغزش بھول کر تھی اس میں کوئی گناہ یا بھٹکنے والی بات نہیں تھی معترض نے جو آیت پ ۱۶ سے پیش کی اسی کی تفسیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں یہ ذکر فرمایا:

> "ان ظاهر القرآن وان دل علی ان آدم عصی و غوی لکن لیس لاحد ان یقول ان آدم کان عاصیا غاویا".
>
> "یعنی بے شک ظاہر قرآن پاک اگرچہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے عصیان وغوایت واقع ہوئے، لیکن کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حکم ٹالا، وہ گمراہ ہوئے، بھٹک گئے"۔

مقصد یہ ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے استعمال فرمائے ہیں۔ جس کو حق پہنچتا ہے وہ اپنے بندے کے حق میں جو الفاظ استعمال کرے، لیکن وہی حقیقۃً ان کے معانی سے بھی آ گاہ ہے۔

اسی مقام پر علامہ آلوسی رحمہ اللہ روح المعانی میں تحریر فرماتے ہیں:

"وقد صرح القاضی ابوبکر بن العربی بعدم جواز نسبة العصیان للآباء الادنین الینا المماثلین لنا فیکیف یجوز نسبة للانبیاء الاقدام والنبی المقدم المکرم وارتضی ذلک القرطبی"

"قاضی ابوبکر بن العربی نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ عصیان یعنی نافرمانی، بھٹک جانا، بہک جانا، گمراہ ہو جانا، اس قسم کے الفاظ کی نسبت جب ہم اپنے والدین، آباء واجداد کی طرف نہیں کر سکتے جو انسانیت میں ہمارے مماثل ہیں اور انبیاء کرام سے گھٹیا ہیں تو ایسے الفاظ کی نسبت انبیاء کرام اور خصوصا حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔ جو برگزیدہ مکرم اور ہر طرح تعظیم وتکریم کے لحاظ سے مقدم ہیں"۔

معالم التنزیل میں ہیں:" واعلم انه لا یجوز اطلاق العاصی وغیره علی آدم علیه السلام " یہ یقینی بات ہے کہ آدم علیہ السلام پر عاصی وغیرہ (نافرمان ہوا، بہک گیا، گمراہ ہوا) کے الفاظ کا اطلاق جائز نہیں۔

لفظ نبی انبیاء کرام کی رفعت شان پر دلیل ہے:

" النبی وهو لفظ منقول فی العرف عن مسماه اللغوی الی معنی عرفی اما المعنی اللغوی فقیل هو المنبیٔ واشتقاقه من النبافهو النبأ فهو حنیئذ مهموز لکنه یخفف ویدغم وهذا المعنی حاصل لمن اشتهر بهذا الاسم لانبائه عن الله تعالیٰ وقیل مشتق من النبوة وهو الارتفاع یقال ینبی فلان اذا ارتفع وعلا والرسول عن الله موصوف بذالک لعلو شانه وسطوع برهانه وقیل من النبی وهو الطریق لانه وسیلة الی الله واما مسماه فی العرف فهو عند اهل الحق من قال له الله تعالیٰ ممن اصطفاه من عباده"

(از شرح مواقف المرصد الاول فی النبوات المقصد الاول ص ۶۶۳ مطبوعہ نولکشور)

"لفظ نبی منقول عرفی ہے یعنی لغوی معنی سے عرف شرع کی طرف منقول ہے۔ لغوی

معنی خبر دینے والا کیونکہ یہ نباء سے مشتق ہے پس وہ اس وقت مہموز ہوگا۔ مخفف اور مشدد دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس لغوی معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے نبی کو اس لئے نبی کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو خبریں پہنچاتا ہے۔ نبی کا اور معنی یہ ہے کہ نبی لفظ نبوۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے بلند ہونا، مرتفع ہونا۔ جب کوئی شخص رفعت و بلندی کو حاصل کرتا ہے تو کہا جاتا ہے "ینبئی فلان" اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام کو نبی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رفعت شان اور روشن دلائل و معجزات سے نوازا ہوتا ہے۔ اور نبی کو نبی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ نبی سے مشتق ہے جس کا معنی ہے راستہ۔ جس طرح راستہ منزل مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اسی طرح انبیاء کرام لوگوں کے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا ذریعہ ہیں۔ عرف شرع میں نبی اسے کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے برگزیدہ بنایا ہو"۔

نبی کی عام لوگوں سے امتیازی شان:

"النبی من اجتمع فیه خواص ثلث یمتاز بها عن غیره احدها ان یکون له اطلاع علی المغیبات الکائنة والماضیة والاتیة وثانیهما ان یظهر منه الافعال الخارقة للعادة وثالثها ان یری الملائکة مصورة بصور محسوسة ویسمع کلامهم وحیا من الله تعالیٰ الیه"

(از شرح مواقف المرصد الاول فی النبوات المقصد الاول ص ۲۶۳ مطبوعه نو لکشور)

"نبی وہ ہے جس میں تین ایسے خصوصی اوصاف پائے جائیں جن کی وجہ سے باقی لوگوں سے ممتاز ہو۔ ان میں سے ایک وصف یہ ہے کہ نبی وہ ہوگا جو موجودہ اور گزرے ہوئے زمانہ اور آنے والے زمانہ پر مطلع ہو۔ دوسرا وصف یہ ہے کہ خرق عادات افعال یعنی معجزات اس سے ظاہر ہوں۔ تیسرا وصف یہ ہے کہ وہ ملائکہ کو ظاہری صورتوں میں دیکھ سکے اور ان کے کلام سے اللہ تعالیٰ کی وحی کو سن سکے"۔

انبیاء کرام معصوم ہیں:

عصمت کیا ہے؟ "العصمة ملکة اجتناب المعاصی مع التمکن منها"

(کتاب التعریفات ص ۶۵ مطبوعه تهران)

عصمت اس ملکہ کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے گناہوں سے بچا جا سکے باوجود اس کے کہ قدرت حاصل ہو۔

خیال رہے کہ ملکہ اس کیفیت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان سے بآسانی افعال سرزد ہوں۔ وہ کیفیت ایسی پختہ ہو کہ اسکا زوال نہ ہو۔ کیونکہ کسی وقت وہ کیفیت حاصل ہو اور کسی وقت حاصل نہ ہو وہ ملکہ نہیں بلکہ اس کیفیت کو "حال" کہتے ہیں۔ یعنی کیفیت راسخہ ملکہ ہے اور کیفیت غیر راسخہ حال ہے:

" وحقیقة العصمة ای ماهیتها ان لا یخلق الله تعالیٰ فی العبد الذنب مع بقاء قدرته واختیاره واختار الشارح فی شرح المقاصد التعریف بالملکة ولیس هذا تناقضا لعدم التفاوت فی المقصود من التعریفین " (شرح عقائد مع النبراس ص ۵۳۲)

" حقیقت یعنی ماہیت عصمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندے میں گناہ نہ پیدا کرنا باوجود اس کے کہ اس کو قدرت واختیار حاصل رہے۔ شارح نے یہاں حقیقت عصمت کا ذکر کیا ہے اور شرح مقاصد میں ملکہ ذکر کیا ہے مقصد دونوں تعریفوں کا ایک ہی ہے کوئی ان میں تناقض نہیں خیال رہے کہ صاحب نبراس نے بھی عصمت کی تعریف میں ملکہ ذکر کیا ہے"۔

" العصمة ملکة نفسانیة یخلقها الله سبحانه فی العبد فیکون سببا عادیا لعدم خلق الذنب فیه " (النبراس ص ۵۳۲ مطبوعه شاہ عبد الحق محدث اکیڈمی)

عصمت ملکہ نفسانیہ کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ بندے میں پیدا فرماتا ہے جو انسان میں گناہ کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح عصمت کی تعریف ان الفاظ میں بھی کی گئی ہے جو اگرچہ معتزلہ نے تعریف کی لیکن اشاعرہ کی تعریف کے مخالف نہیں اس لئے شارح نے تعریف کے تکملہ کے طور پر ذکر کی ہے۔

" هی ای العصمة لطف من الله تعالیٰ یحمله ای العبد علی فعل الخیر ویزجره عن الشر مع بقاء الاختیار " (شرح عقائد مع النبراس صفحه ۵۳۴)

عصمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے لطف ومہربانی انسان کو حاصل ہوتی ہے جو انسان کو نیکی کے کاموں کی طرف برانگیختہ کرتی ہے اور شر سے روکتی ہے باوجود اس کے کہ انسان کا اختیار باقی رہتا ہے"۔

قدرت واختیار کی بقاء عصمت کے لئے کیوں:

" ان بقاء الاختیار للابتلاء وان الا بتلاء هو الامتحان بالتکلیف ولا شک ان عدم القدرة علی الذنب ینافی التکلیف باجتنابه " (از النبراس ص ۵۳۴)

" اختیار وقدرت کو اس لئے باقی رکھا گیا ہے تاکہ امتحان لیا جا سکے، کیونکہ انسان کو مکلف بنایا گیا ہے اگر گناہوں کی طاقت ہی حاصل نہ ہو تو گناہوں سے بچنے کی تکلیف

دے کر امتحان نہیں لیا جا سکتا تھا''

یہ بھی حقیقت ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے امتحان تمام انسانوں سے عظیم تر امتحانات تھے، خصوصاً سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام انبیاء کرام سے بڑے امتحانات آئے۔

انبیاء کرام صغائر و کبائر سے پاک ہیں:

" الانبیاء معصومون قبل النبوة وبعدها عن کبائر الذنوب وصغائرها ولو سهوا علی ما هو الحق عند المحققین " (مرقاۃ شرح مشکوۃ باب الکبائر ج ۱ ص ۱۲۷)

''محققین کا مذہب یہی ہے کہ انبیاء کرام قبل از نبوت اور بعد از نبوت تمام صغائر اور کبائر گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی گناہ بھول کر بھی سرزد نہیں ہوتا''۔

" فالحق انه لا خلاف لاحد فی ان نبینا علیه السلام لم یرتکب صغیرة ولا کبیرة طرفة عین قبل الوحی وبعده کما ذکره ابو حنیفة رحمه الله فی الفقه الاکبر "

(تفسیرات احمدیه زیر آیت لاینال عهدی الظالمین ص ۳۱ مطبع فتح الکریم بمبئی)

''حق مذہب یہی ہے کہ کسی ایک کا اس میں اختلاف نہیں کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے وحی سے پہلے اور بعد ایک لحہ بھر بھی کسی صغیرہ اور کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ اکبر میں ذکر کیا ہے''۔

" والانبیاء علیهم السلام کلهم منزهون ای معصومون عن الصغائر والکبائر ای من جمیع المعاصی والکفر والقبائح والفواحش وفی شرح العقائد ان الانبیاء علیهم السلام معصومون عن الکذب "

(از شرح فقه اکبر ملا علی قاری ص ۸ مطبوعه مجتبائی)

''تمام انبیاء کرام علیہم السلام ہر قسم کے گناہوں سے کفر، برائی کے کاموں، بے حیائی کے کاموں یہاں تک کہ ہر قسم کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم ہیں۔ شرح عقائد میں ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام جھوٹ سے پاک ہیں''۔

انبیاء کرام کو جھوٹا کہنے سے راویوں کو جھوٹا کہہ دینا بہتر ہے:

علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" اضافة الکذب الی رواته اولی من ان یضاف الی الانبیاء علیهم السلام "

(تفسیر کبیر پ ۱۷ زیر آیت بل فعله کبیرهم)

بالفرض اگر ایسی کوئی روایت ہو جس میں انبیاء کرام علیہم السلام کا جھوٹا ہونا ثابت ہو رہا ہو اور اس روایت کی کوئی تاویل نہ ہو سکے یعنی کوئی ایسی وجہ نہ بیان ہو سکے جس سے انبیاء کرام کی صداقت ثابت ہو سکے تو ایسی صورت میں راویوں کو جھوٹا کہا جا سکتا ہے لیکن انبیاء کرام کو جھوٹا کہنا محال ہوگا یعنی روایت کو رد کر دیا جائے لیکن انبیاء کرام کی شان میں کوئی فرق نہیں آنے دیا جائے گا۔

انبیاء کرام سے بھول کر بھی کوئی گناہ صغیرہ سرزد نہیں ہوا:

اجماع امت سے ثابت ہے کہ انبیاء کرام سے بھول کر بھی کوئی گناہ صغیرہ سرزد نہیں ہوا:

"لا تجوزا الصغيرة التى تخرج صاحبها عن الشرافة الى الخساسة و الر ذالة لاعمدا ولا سهوا لانها توجب نفرة الناس عنه" (النبراس ص ۴۵۳)

"ایسے صغیرہ گناہ جو انسان کو شرافت سے نکالنے کا سبب بنیں اور ان کی وجہ سے انسان رذیل وخسیس نظر آئے ایسی گناہ باوجود اس کے کہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہوں انبیاء کرام سے سرزد نہیں ہوتی کیونکہ یہ لوگوں کی نفرت کا سبب بنتے ہیں"۔

"قال القاضى عياض ذهب طائفة من محققى الفقهاء والمتكلمين الى العصمة عن الصغائر كالعصمة عن الكبائر للاختلاف فى الصغائر" (النبراس ص ۴۵۳)

"قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ محققین فقہاء کرام اور متکلمین کا حق مذہب یہ ہی ہے کہ انبیاء کرام اسی طرح صغائر سے معصوم ہیں جس طرح کبائر سے معصوم ہیں اگرچہ صغائر میں اختلاف ہے لیکن محققین حضرات کا وہی مذہب ہے جو مذکور ہو چکا ہے"۔

مقام توجہ: شرح عقائد میں سہو کتابت یا سہو مصنف ہے جو یہ ذکر کیا گیا ہے "واما الصغائر فتجوز عمدا عند الجمهور" انبیاء کرام سے صغائر کا عمداً سرزد ہونا جمہور کے نزدیک جائز ہے۔ لیکن اسی عبارت کی شرح میں اس طرح مذکور ہے:

"وفيه قصور لان منع الصغيرة عمدا مختار مذاهب الا شاعرة كما فى شرح المواقف وهو مختار الشارح فى التهذيب وشرح المقاصد" (نبراس ص ۴۵۲)

"اس عبارت میں قصور پایا گیا ہے کیونکہ عمداً انبیاء کرام سے صغیرہ گناہ سرزد نہیں ہوتے یہی اشاعرہ کا مختار مذہب ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود شارح علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ انبیاء کرام سے عمداً کوئی صغیرہ سرزد نہیں ہوتا۔ مصنف کی

دوسری تصانیف تہذیب اور شرح مقاصد میں اسی طرح مذکور ہے"۔

اسی طرح شرح عقائد کی اس پہلی عبارت کے متصل عبارت میں بھی سہو پایا گیا ہے:" **وتجوز سهوا بالاتفاق** " سہواً صغائر بالاتفاق جائز ہیں یہ بھی درست نہیں جیسا کہ محققین فقہاء کرام اور متکلمین کا مذہب اس کے خلاف ذکر کیا جا چکا ہے وہ بحث بھی النبر اس کی اسی عبارت پر ہے خیال رہے کہ صغائر کا جواز ہے یا نہیں؟ یہ اختلاف اس میں نہیں کہ سہواً انبیاء کرام علیھم السلام سے فی الواقع صغائر گناہ سرزد ہوتے ہیں بلکہ یہ اختلاف اس میں ہے کہ عقلاً جواز ممکن ہے یا نہیں۔

" **وعلم ايضا ان هذا الاختلافات المارة انما هي في جواز الوقوع وعدمه لا في الوقوع نفسه فتامل** " (رسائل ابن عابدین ج ۱ ص ۳۱۳)

اس سے پہلے کی گئی بحث سے واضح ہوا کہ یہ اختلافات جو بیان ہوئے ہیں وہ اختلافات صرف اس میں ہیں کہ صغائر گناہوں کا سہواً وقوع ممکن ہے یا نہیں۔ یہاں کسی کا قول نہیں کہ انبیاء کرام علیھم السلام سے بھول کر بھی صغائر گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ انبیاء کرام کا بھولنا اور چیز ہے اور بھول کر گناہ کرنا اور چیز ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بھول انبیاء کرام سے واقع ہوئی لیکن بھول کر گناہ نہیں واقع ہوا۔

" **ان الانبياء كلهم عليهم الصلوة والسلام لم تقع منهم معصية قط لاقبل النبوة ولا بعدها** " (رسائل ابن عابدین ج ۱ ص ۳۱۲)

"بیشک تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے ہرگز کوئی گناہ سرزد نہیں نہ نبوت سے پہلے اور نہ ہی نبوت کے بعد"

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" **عفا الله عنك لم اذنت لهم فان ظاهره ايضامو هم وليس بمراد بل هو استفسار عن العلة وقدم قوله عفا الله عنك لئلا يتوهم التوبيخ** "

(رسائل بن عابدین ج ۱ ص ۳۱۲)

اس عبارت کے مفہوم کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ غزوہ تبوک میں منافقین کے عذر پیش کرنے اور غزوہ میں شریک نہ ہونے کی اجازت طلب کرنے کی خبر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو پہلے ہی دے دی تھی کہ وہ جھوٹی قسمیں اٹھائیں گے اور معذرت پیش کریں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو

منع نہیں فرمایا کہ ان کو اجازت نہ دینا۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں اجازت دے دی اس کے بعد رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ عفا الله عنک لم اذنت لهم ﴾ ''اللہ تمہیں معاف کرے تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا''

اب رسائل ابن عابدین کی مذکورہ عبارت کو سمجھیں۔

قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ سے بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ شائد ان الفاظ سے نبی کریم ﷺ کو کسی غلطی پر ڈانٹا گیا ہو حالانکہ ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ تو پیار و محبت سے اس وجہ کے متعلق سوال کیا جارہا ہے کہ اے حبیب وہ کیا وجہ ہے کہ آپ نے ان کو اجازت دے دی تھی۔ ﴿ عفا الله عنک ﴾ کے الفاظ پہلے ذکر کر کے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ آپ ﷺ پر کوئی توبیخ تو نہیں۔ البتہ آپ ﷺ سے وجہ کا سوال کیا جارہا ہے تاکہ آپ کی امت اس پر مطلع ہو جائے۔ علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" لا نسلم ان قولـه عفا الله عنک یوجب الذنب ولم لا یجوز ان یقال ان ذالک یـدل عـلی مبالغة الله فی تعظیمه وتوقیره کما یقول الرجل لغیره اذا کـان مـعـظـمـا عنده عفا الله عنک ما صنعت فی امری فلا یکون من هذا الا مزید التبجیل والتعظیم " (کبیر)

ہم ہرگز یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ عفا الله عنک ﴾ سے نبی کریم ﷺ کا کوئی گناہ ثابت ہو رہا ہے۔ کیوں جائز نہیں کہ یہ کہا جائے کہ یہ الفاظ مبارکہ تو اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بہت بڑی تعظیم و توقیر کا ذکر فرمایا ہے۔ جس طرح ایک شخص اس آدمی سے کلام کرے جو اسکے نزدیک بہت بڑا صاحب عظمت انسان ہے اور اسے کہے ''اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے میرے معاملہ میں کیا کیا ہے؟'' اس میں تو زیادہ اس کی عظمت اور بزرگی کا ذکر ہے۔ یہ تو نہیں کہ تم بہت بڑے قصوروار ہو اللہ تمہیں معاف کرے تم نے میرے معاملہ میں کیا کیا ہے؟

تنبیہ: اسی آیۃ کریمہ کے ماتحت علامہ رازی رحمہ اللہ کی بحث کو دیکھیں۔

انبیاء کرام کے صغائر و کبائر سے پاک ہونے پر علامہ رازی کے دلائل:

" والمختار عندنا انه لم یصدر عنهم الذنب حال النبوة البتة لا الکبیرة ولا الصغیرة "

ہمارا مختار مذہب یہی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے کوئی صغیرہ گناہ اور کبیرہ گناہ حالت نبوت

میں ہرگز ہرگز صادر نہیں ہوا۔اس پر چند دلائل موجود ہیں۔

(۱) "لو صدر عنهم لكانوا اقل درجة من عصاة الامت وذلک غير جائز"

اگر انبیاء کرام علیہم السلام سے گناہ سرزد ہوں تو وہ امت کے نافرمان لوگوں سے بھی کم درجہ ہوں گے۔اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام جلیل القدر ہیں اور شرافت ان کو عظیم درجہ کو حاصل ہے۔جتنی شان زیادہ ہو اسی کے مطابق معمولی جرم بہت عظیم جرم سمجھا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات جب شان کے لحاظ پر دوسری عورتوں سے عظیم مرتبہ رکھتی ہیں تو ان کو اللہ تعالیٰ اسطرح خطاب فرماتا ہے:

﴿ يا نساء النبي من يات منكن بفاحشة مبينه يضاعف لها العذاب ضعفين ﴾(پ ۲۱)

''اے نبی ﷺ کی بیبیو جو تم میں صریح حیا کے خلاف کوئی جرات کرے اس پر اوروں سے دونا عذاب ہوگا''

اسی طرح محصن بنسبت غیر محصن کے بلند شان رکھتا ہے تو محصن کی بدکاری پر اسے رجم کردیا جائے گا لیکن غیر محصن کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔اسی طرح غلام پر نصف حد بوجہ کم درجہ ہونے کے اور آزاد (حر) پر مکمل حد۔

"واما انه لا يجوز ان يكون النبي اقل حالا من الامة فذاک بالاجماع"

جب نبی امت کے کسی فرد سے بھی کم درجہ نہیں ہوتا اس پر اجماع امت ہے لہذا نبی سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا تاکہ نبی امت کے کسی فرد سے بھی کم درجہ نہ ہو۔

(۲) نبی اگر گناہ کرے تو فسق لازم آئے گا فاسق کی شہادت قبول نہیں، حالانکہ نبی کا مقبول الشھادۃ ہونا ضروری ہے۔ورنہ وہ امت کے عادل آدمیوں سے کم درجہ ہوگا کیونکہ امت کے عادل آدمیوں کا مقبول الشھادۃ ہونا ثابت ہے تو اس سے سمجھ میں آ گیا کہ نبی کا گناہ گار ہونا جائز نہیں، کیونکہ انبیاء کرام کا شاہد ہونا ضروری ہے۔

"وانه لا معنى للنبوة والرسالة الا انه يشهد على الله تعالىٰ بانه شرع هذا الحكم"

یعنی نبوت اور رسالت کی اس وقت تک تکمیل نہیں ہو سکتی جب تک وہ اللہ تعالیٰ پر اس کے نافذ کردہ احکام شرع کی شہادت نہ دیں۔

نیز یہ بھی ثابت ہے کہ قیامت کے دن آپ ﷺ تمام پر شاہد ہوں گے۔ جس طرح رب قدوس نے ارشاد فرمایا:

﴿ لتكونوا شهدا على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا ﴾ (پ ۲ ع ۱)

''اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمھیں کیا سب امتوں میں افضل کہ) تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ'' (کنز الایمان)

خیال رہے کہ ''یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ'' یہ ترجمہ صرف اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ہی ہے جس کی فوقیت میں نے تسکین الجنان میں واضح کی ہے۔

(۳) اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ (معاذ اللہ) نبی کریم ﷺ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو یہ کام یعنی کبیرہ کا ارتکاب تو حرام ہے حرام کام کرنے والے کی کوئی عزت نہیں ایسے شخص کو ایذاء پہنچانا حرام نہیں۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کو ایذاء پہنچانا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ ان الذين يؤذون الله ورسوله لعنهم الله في الدنيا والاخرة ﴾ (پ ۲۲ ع ۴ کنزالایمان)

''بیشک جو ایذا دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو ان پر اللہ کی لعنت ہے دنیا اور آخرت میں'' (کنزالایمان)

وہ ایذا دینے والے کفار ہیں جو شان الٰہی میں ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے وہ منزہ اور پاک ہے اور رسول کریم ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں ان پر دارین میں لعنت۔ (خزائن العرفان)

خیال رہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینا (یہ حقیقی معنی ہے) اور اللہ تعالیٰ کو ایذاء دینا (یہ مجازی معنی ہے) عموم الفاظ سے مطلقاً واضح ہے کہ ہر قسم کی ایذاء رسول اللہ ﷺ کو دینا حرام اور باعث عذاب ہے۔

(۴) بیشک محمد ﷺ سے اگر کسی قسم کا کوئی صغیرہ اور کبیرہ گناہ ہوتا تو ہم پر واجب ہوتا کہ ہم ان گناہوں میں آپ کی اقتداء کرتے کیونکہ آپ ﷺ کی اقتداء و اتباع کا اللہ تعالیٰ نے مطلقاً حکم دیا ہے ارشاد فرمایا ﴿ فاتبعوني ﴾ میری تابعداری کرو۔ تو اس طرح ایک کام حرام بھی ہوتا اور واجب بھی ہوتا یہ محال ہے کہ حرام اور واجب ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں۔ جب نبی کریم ﷺ کے حق میں ثابت ہو گیا تو تمام انبیاء کرام کے متعلق بھی ثابت ہو گیا کہ وہ بھی معصیت کے کاموں سے پاک ہیں کیونکہ کسی کا قول ایسا نہیں پایا گیا جس میں نبی کریم ﷺ اور باقی انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان گناہ کے ہونے یا نہ ہونے کا فرق بیان کیا گیا ہو۔

اس مذکورہ بالا مضمون پر دلالت کرنے والی تفسیر کبیر کی عبارت ملاحظہ ہو:

" ورابعها ان محمدا ﷺ لو اتی بالمعصیة لوجب علینا الاقتداء به فیها قوله تعالیٰ فاتبعونی فیفضی الی الجمع بین الحرمة والوجوب وهو محال واذا ثبت ذالک فی حق محمد ﷺ ثبت ایضا فی سائر الانبیاء ضرورة انه لا قائل بالفرق "

خیال رہے کہ گناہ صغیرہ کی اقتداء اور اتباع کا حکم بھی نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام ہر قسم کی معصیت یعنی صغائر اور کبائر سے پاک ہیں۔

(۵) اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز بری نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بلند مراتب عطا فرمائے ہوں اور اپنی وحی کا امین بنایا ہو اور اپنے بندوں اور اپنی سلطنت میں اسے اپنا خلیفہ بنایا ہو وہ اپنے رب کا پیغام سن رہا ہو کہ اسے رب قدوس کہہ رہا ہے:

" لا تفعل کذا فیقدم علیه ترجیحا للذته غیر ملتفت الی نهی به ولا منزجر بوعیده "

کہ یہ کام نہ کرو پھر بھی وہ اپنی نفسانی خواہشات ولذات کو ترجیح دے اور اپنے رب کی نہی کی طرف توجہ نہ دے اور اپنے رب کی وعید کے پائے جانے کے باوجود برائیوں سے نہ رکے یہ کبھی نہیں ہو سکتا ایسے شخص اور اس کے ایسے اعمال کی قباحت بہت واضح اور روشن ہے۔ اتنا قبیح انسان نبی نہیں ہو سکتا۔

(۶) بے شک اگر انبیاء رکام سے گناہ صادر ہوں تو وہ مستحق عذاب ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ ومن یعص الله ورسوله ویتعد حدوده یدخله نارا خالدا فیها ﴾ (پ ۴ ع ۱۳)

جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی کل حدوں سے بڑھ جائے بیشک اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں ہمیشہ رہے گا۔ اسی طرح اور یہ ہے کہ اگر انبیاء کرام علیہم السلام گناہگار ہوں تو وہ ظالم ہوں گے اور ظالم لعنت کا مستحق ہوتا ہے گویا کہ انبیاء کرام کا (معاذ اللہ) لعنت کا مستحق ہونا لازم آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ الا لعنة الله علی الظالمین ﴾ (پ۱۲ ع۲)

"خبردار ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے"۔

" واجمعت الامة علی ان احدا من الانبیاء لم یکن مستحقا للعن ولا

للعذاب فثبت انه ما صدرت المعصیة عنه"

''اجماع امت سے ثابت ہے کہ کوئی ایک نبی بھی لعنت اور عذاب کا مستحق نہیں تو اسی سے یہ ثابت ہو گیا کہ کوئی نبی بھی گناہ گار نہیں ہو سکتا''

(۷) بے شک انبیاء کرام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم دیتے ہیں اگر وہ خود اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کریں تو اللہ تعالیٰ کی اس ارشاد گرامی میں داخل ہوں گے۔

﴿ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتاب افلا تعقلون ﴾ (پ ۱ کنز الایمان)

''کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمھیں عقل نہیں''

اسی طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ وما ارید ان اخالفکم الی ما انھاکم عنه ﴾ (پ ۱۲ ع ۸)

(حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا) اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ جس بات سے تمھیں منع کرتا ہوں آپ اس کے خلاف کرنے لگوں۔ (کنز الایمان)

" فما لا یلیق بواحد من وعاظ الامة کیف یجوز ان ینسب الی الانبیاء علیھم السلام"

جو کام کسی امت کے ایک واعظ کی شان کے لائق نہیں وہ انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اوروں کو برائیوں سے روکنا اور خود برائی کا ارتکاب کرنا انبیاء کرام سے اس طرح دور ہے کہ اس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔

(۸) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ انھم کانوا یسارعون فی الخیرات ﴾ (۱۷ع۷) بیشک وہ بھلے کاموں میں جلدی کرتے تھے۔

(کنز الایمان)

اس سے قبل کئی انبیاء کرام کا ذکر کیا گیا اس کے بعد فرمایا یعنی انبیاء کرام مذکورین کی یہ شان ہے کہ وہ اچھے کاموں میں جلدی کرتے ہیں:

" ولفظ الخیرات للعموم فیتناول الکل ویدخل فیه ما ینبغی وترک مالا ینبغی فثبت ان الانبیاء کانوا فاعلین لکل ما ینبغی فعله وتارکین کل ما ینبغی ترکه و ذلک ینافی صدور الذنب عنھم"

آیت کریمہ میں لفظ خیرات استعمال ہوا ہے جو عموم کے لئے اور کل کو شامل ہے ہر اچھے کام کا کرنا اور ہر برے نامناسب کام کا چھوڑنا اسی میں داخل ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے خود انبیاء کرام علیہم السلام کے

متعلق فرمایا کہ وہ بھلے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور نامناسب کاموں کو چھوڑتے ہیں۔ اگر انبیاء کرام علیہم السلام سے کوئی گناہ صغیرہ یا کبیرہ صادر ہو تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے منافی ہوگا۔

(۹) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وانهم عندنا لمن المصطفين الاخيار ﴾ (پ ۲۳ ص ۱۴)

اور بیشک وہ ہمارے نزدیک چنے ہوئے پسندیدہ ہیں۔ (کنز الایمان)

" وهذا يتناول جميع الافعال والتروك " اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی جمیع اچھے کاموں کے کرنے اور جمیع نامناسب کاموں کے چھوڑنے کو شامل ہی۔ یعنی وہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہیں کہ وہ ہر اچھا کام کرتے ہیں۔ اور ہر برے کام سے اجتناب کرتے ہیں۔ یہاں سے مراد تمام افعال ہیں اس پر دلیل یہ ہے کہ اس سے استثناء صحیح ہو سکتا ہے جیسے یہ کہا جائے " فلان من المصطفين الاخيار الا فی الفعلة الفلانية " فلاں شخص برگزیدہ پسندیدہ لوگوں سے ہے لیکن فلاں کام میں یعنی فلاں کلام اس کا اچھا نہیں۔ چونکہ استثناء کی وجہ سے مستثنیٰ ماقبل کے حکم سے خارج ہوتا ہے۔ یہاں استثناء کا نہ پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حکم عام ہے:

" فثبت انهم كانوا اخيار فی كل الامور و ذلک ينافی صدور الذنب عنهم "

اس سے ثابت ہوا کہ تمام انبیاء کرام جمیع امور میں برگزیدہ اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ جو اللہ تعالیٰ کے تمام کاموں میں پسندیدہ ہوں ان سے گناہ سرزد ہوں ورنہ بعض کاموں میں پسندیدہ ہونا لازم آئے گا جو عموم کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ الله يصطفى من الملئكة رسلا و من الناس ﴾ (پ ۱۷ ع ۱۷)

"اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے رسول اور آدمیوں میں سے" (کنز الایمان)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

﴿ ان الله اصطفى آدم و نوحا و آل ابراهيم و آل عمران على العالمين ﴾ (پ ۳ ع ۱۲)

"بے شک اللہ (عزوجل) نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراھیم علیھم السلام کی آل اور عمران کی آل کو سارے جہاں سے" (کنز الایمان)

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿انی اصطفیتک علی الناس برسلتی وبکلامی﴾ (پ ۹ ع ۷)

''(فرمایا اے موسیٰ) میں نے تجھے لوگوں سے چن لیا اور اپنی رسالتوں اور اپنے کلام سے'' (کنز الایمان)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

﴿واذکرنا عبادنا ابراھیم واسحاق ویعقوب اولی الایدی والابصار انا اخلصناھم بخالصة ذکری الدار وانھم عندنا لمن المصطفین الاخیار﴾ (پ ۲۳ ع ۱۳)

اور یاد کرو ہمارے بندوں ابراھیم اور اسحاق اور یعقوب قدرت اور علم والوں کو بے شک ہم نے انہیں ایک کھری بات سے امتیاز بخشا کہ وہ اس گھر کی یاد ہے اور بیشک وہ ہمارے نزدیک چنے ہوئے پسندیدہ ہیں۔ (کنز الایمان)

" فکل ھذہ الایات دالة علی کونھم موصوفین بالاصطفاء والخیریة وذالک ینافی صدور الذنب عنھم "

'' یہ تمام آیات اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کا پسندیدہ ہونا اور تمام لوگوں سے بہتر ہونے کا خصوصی وصف حاصل ہے لہٰذا ایسی برگزیدہ ہستیوں سے گناہ کا سرزد ہونا ان کی شان کی منافی ہے''

(۱۰) بے شک اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فبعزتک لا غوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین﴾ (پ ۲۳ ع ۱۴)

''بولا تیری عزت کی قسم ضرور میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا مگر جو ان میں تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔ (کنز الایمان)''

" فاستثنی من جملة من یغویھم المخلصین وھم الانبیاء علیھم السلام "

تمام لوگوں کو شیطان نے راہ راست سے بھٹکانے کی کوشش کرنی ہے (کسی پر کامیاب ہوگا، کسی پر نہیں) لیکن انبیاء کرام جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہیں ان پر یقیناً اس کا داؤ نہیں چلے گا جس کا اقرار خود شیطان نے بھی کر لیا ہے۔ یعنی اس کی گرفت میں آنے سے انبیاء کرام کو مستثنیٰ کر دیا جب شیطان کی گرفت میں اللہ تعالیٰ کے مخلصین بندے نہیں آئیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انبیاء کرام کو اب رب قدوس نے اپنا مخلص بندہ کہا ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابراھیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے متعلق ارشاد فرمایا: ﴿انا اخلصناھم بخالصة ذکری الدار﴾ (پ ۲۳ ع ۱۳)

''بے شک ہم نے ان کو اپنا مخلص بنایا کہ وہ اس گھر کی یاد ہے''

یعنی دار آخرت کی وہ لوگوں کو اسی کی یاد دلاتے ہیں اور کثرت سے اس کا ذکر کرتے ہیں محبت دنیا نے ان کے قلوب میں جگہ نہیں پائی (خزائن العرفان) اور حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق مالک الملک نے فرمایا:

﴿ انه من عبادنا المخلصین ﴾ (پ ۱۲ ع ۱۳) ''بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں سے ہیں''

" واذا ثبت وجوب العصمة فی حق البعض ثبت وجوبها فی حق الکل لانه لا قائل بالفرق "

جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بعض انبیاء کرام (علیہم السلام) معصوم ہیں تو اسی سے تمام انبیاء کرام کا معصوم ہونا ثابت ہو گیا کیونکہ کوئی قائل بالفصل نہیں۔ یعنی یہ کسی کا عقیدہ نہیں کہ بعض انبیاء کرام ہی صرف معصوم ہیں اور بعض معصوم نہیں۔

(۱۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

﴿ ولقد صدق علیهم ابلیس ظنه فاتبعوہ الا فریقا من المؤمنین ﴾ (پ ۲۲ ع ۸)

''اور بے شک ابلیس نے انہیں اپنا گمان سچ کر دکھایا تو وہ اسکے پیچھے ہوئے مگر ایک گروہ کہ مسلمان تھا'' (کنزالایمان)

" فاولئک الذین ما اتبعوہ وجب ان یقال انه ما صدر الذنب عنهم والا فقد کانوا متبعین له "

پس وہ لوگ جنہوں نے ابلیس کی تابعداری نہیں کی یقیناً ان کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ ان سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوا اور نہ وہ اس کے متبع ہوتے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو اب دیکھتے ہیں کہ وہ گناہ نہ کرنے والا فریق کون سا ہے۔ انبیاء کرام ہیں یا دوسرا کوئی فریق ہے۔ اگر انبیاء کرام (علیہم السلام) ہیں تو مدعی ثابت ہو گیا کہ کوئی نبی کوئی گناہ نہیں کرتا اور اگر وہ فریق انبیاء کرام کے ماسوا کوئی اور فریق ہے جو گناہگار نہیں اور انبیاء کرام کا گناہگار ہونا ثابت ہو تو انبیاء کرام کا درجہ غیر انبیاء سے کم ہو جائے گا اور وہ غیر لوگ انبیاء کرام علیہم السلام سے زیادہ مرتبہ رکھنے والے ہو جائیں گے۔

" وذلک باطل بالاتفاق فثبت ان الذنب ما صدر عنهم "

''اور یہ (نبی کا دوسرے لوگوں سے کم درجہ ہونا اور دوسروں کا افضل ہونا) بالاتفاق

باطل ہے لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ بے شک کسی نبی سے کوئی گناہ نہیں صادر ہوا۔

(۱۲) اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی دو قسمیں بنائی ہیں۔ایک قسم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اولئک حزب الشیطن الا ان حزب الشیطن ھم الخاسرون ﴾ (پ ۲۸ ع ۳)

''وہ شیطان کے گروہ ہیں سنتا ہے (خبردار) بے شک شیطان ہی کا گروہ ہار (خسارہ) میں ہے''۔ (کنز الایمان)

اور مخلوق کی دوسری قسم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ اولئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون ﴾ (پ ۲۸ ع ۳)

''یہ اللہ کی جماعت ہے، سنتا ہے (خبردار) اللہ ہی کی جماعت کامیاب ہے''۔ (کنز الایمان)

کوئی شک نہیں یقیناً شیطان کا گروہ وہ ہے جو ایسے کام کرے جنہیں شیطان پسند کرے "والذی یرتضیہ الشیطان ھو المعصیۃ" جن کاموں کو شیطان پسند کرتا ہے انہیں معصیت کہا جاتا ہے۔ پس ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہوگا یعنی معصیت کا مرتکب ہوگا وہی شیطان کے گروہ کا ہوگا:

" فلو صدرت المعصیۃ من الرسول لصدق علیہ انہ من حزب الشیطن ولصدق علیہ انہ من الخاسرین "

اگر کسی نبی اور رسول سے معصیت صادر ہو تو یہ صادق آئے گا کہ بے شک وہ شیطان کا گروہ ہے اور یہ صادق آئے گا کہ وہ خسارے میں ہے۔ اور امت کے زاہد لوگوں پر صادق آئے گا کہ یہ اللہ (عزوجل) کی جماعت ہیں۔ اور بیشک یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

" فحینئذ یکون ذالک الواحد من الامۃ افضل بکثیر عند اللہ من ذالک الرسول وھذا الا یقولہ مسلم "

تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ امت کا ایک فرد اللہ (عزوجل) کے نزدیک رسول سے بہت ہی زیادہ فضیلت رکھنے والا ہو جائے، کوئی مسلمان اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ نبی سے امتی افضل ہو جائے

(۱۳) " ان الرسول افضل من الملک فوجب ان لا یصدر الذنب من الرسول "

''بیشک رسول فرشتوں سے افضل ہیں۔ پس ضروری ہے کہ کسی نبی اور رسول سے کوئی گناہ نہ صادر ہو''

﴿ وانما قلنا انہ افضل لقولہ تعالیٰ ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوحا و آل ابراھیم و آل عمران علی العالمین ﴾ (پ ۳ ع ۱۲)

''ہم نے کہا کہ نبی فرشتوں سے افضل ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو سارے جہان سے''۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام تمام مخلوقات سے (یعنی بمع ملائکہ کے) افضل ہیں۔اس مسئلہ پر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿ واذ قلنا للملئکة اسجدوا ﴾ (پ ا) میں طویل بحث کی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ انبیاء کرام ملائکہ سے افضل ہیں تو

''فوجب ان لا یصدر الذنب عن الرسول لانه تعالیٰ وصف الملائکة بترک الذنب''

تو ضروری ہے کہ انبیاء کرام سے کوئی گناہ نہ سرزد ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا وصف بیان کیا کہ وہ گناہ نہیں کرتے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لا یسبقونه بالقول وھم بامرہ یعملون ﴾ (پ ۱۷ ع ۲)

بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم پر کاربند ہوتے ہیں۔ (کنز الایمان)

اسی طرح رب قدوس کا ایک اور ارشاد گرامی یہ ہے:

﴿ لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یومرون ﴾ (پ ۲۸ ع ۱۹)

''وہ اللہ کا حکم نہیں ٹالتے اور جو انہیں حکم ہو وہی کرتے ہیں'' (کنز الایمان)

''فلو صدرت المعصیة عن الرسول لا متنع کونه افضل من الملک''

اگر رسولوں سے گناہ سرزد ہوں تو وہ فرشتوں سے افضل نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ ان کے متعلق ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ گناہگار نیکوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار ﴾ (پ ۲۳ ع ۱۲)

''کیا ہم انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان جیسا کر دیں جو زمین میں فساد پھلاتے ہیں یا ہم پرہیزگاروں کو شریر بے حکموں کے برابر ٹھہرا دیں'' (کنز الایمان)

(۱۴) حضرت خزیمہ ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے دعوی کے مطابق شہادت دی (حالانکہ آپ واقعہ کے گواہ نہیں تھے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے کیسے شہادت دے دی (تمہیں

تو اس واقعہ کا علم ہی نہیں تھا) تو عرض کیا یا رسول اللہ آپ پر سات آسمانوں سے اوپر سے نازل ہونے والی وحی کی میں تصدیق کرتا ہوں تو اتنی مقدار کی تصدیق نہ کرتا (یہ کیسے ہوسکتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے ان کی تصدیق فرمائی اور ان کا نام ذوشہادتین رکھا:

"ولو كانت المعصية جائزة على الانبياء لما جازت تلك الشهادة"

"اگر انبیاء کرام سے معصیت کا سرزد ہونا جائز ہوتا تو یہ شہادت جائز نہ ہوتی۔ پتہ چلا کہ تمام انبیاء کرام ہر قسم کے گناہ سے پاک ہوتے ہیں"۔

حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی دینے کا واقعہ:

عمارہ بن خزیمہ سے مروی ہے کہ ان کے چچا جو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے ہیں فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ آپ نے اس اعرابی کو کہا میرے پیچھے چلو تاکہ میں تمہیں گھوڑے کا ثمن ادا کردوں۔ نبی کریم ﷺ جلدی جلدی چلے اعرابی آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کئی اور لوگ اعرابی کے درپے ہوئے اس سے گھوڑے کا سودا کرنے لگے۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے گھوڑا خرید لیا ہے۔ وہ اعرابی رسول اللہ ﷺ کو ندا دینے لگا اگر تم نے یہ گھوڑا خرید لیا ہے (تو ٹھیک) ورنہ میں یہ گھوڑا بیچنے لگا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا میں نے تم سے یہ خرید نہیں لیا؟ اعرابی کہنے لگا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے تم پر یہ نہیں بیچا۔ (اس کو خیال ہوا کہ شائد دوسرے لوگوں سے قیمت زیادہ مل جائے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں میں تو تم سے یہ خرید چکا ہوں اعرابی کہنے لگا گواہ پیش کرو۔ خزیمہ بن ثابت نے کہا میں گواہی دیتا ہوں۔ بیشک آپ نے اس سے خرید لیا ہے نبی کریم ﷺ حضرت خزیمہ کی طرف متوجہ ہوئے آپ نے فرمایا "بتصديقك يا رسول الله" آپ کی تصدیق کرتے ہوئے یا رسول اللہ گواہی دے رہا ہوں طبقات سعد میں یہ الفاظ زائد ہیں "انا اصدقك بخبر السماء ولا اصدقك بما تقول" میں آپ کی آسمانوں کی خبروں کی تصدیق کرتا ہوں تو یہ تصدیق کیوں نہ کروں جو آپ فرمارہے ہیں تو نبی کریم ﷺ نے ان کی شہادت کو دو شخصوں کی شہادت کے برابر قرار دے دیا۔ (ابو داؤد)

تنبیہ: یہی واقعہ نور الانوار میں کچھ مختلف ہے جو میں تذکرۃ الانبیاء میں نقل کیا۔

(۱۵) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں یہ فرمایا:

﴿ انی جاعلک للناس اماما ﴾ (پ ۱ ع ۱۵)

''میں تمہیں لوگوں کا پیشوا (امام) بنانے والا ہوں'' (کنز الایمان)

" والامام من یوتم به فاوجب علی کل الناس ان یاتموا به فلو صدر الذنب عنه لوجب علیهم ان یاتموا به فی ذالک الذنب یفضی الی التناقض "

امام وہ ہوتا ہے جس کی اقتداء کی جائے تمام لوگوں پر واجب ہوتا ہے کہ امام کی اقتداء کریں اگر انبیاء کرام سے گناہ سرزد ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے امتوں کا امام بنایا ہوتا ہے تو امتوں پر واجب ہو جائے گا کہ ان گناہوں میں بھی اپنے ائمہ انبیاء کرام کی اقتداء کریں۔ اس میں تناقض لازم آئے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انبیاء کرام خود گناہ کریں اور لوگوں کو روکیں، اسی طرح رب تعالیٰ گناہوں سے منع بھی کرے اور انبیاء کرام معاذ (اللہ) اگر گناہگار ہوں تو انکی اقتداء کا حکم بھی دے یہ ناممکن ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ انبیاء کرام گناہوں سے پاک ہوتے ہیں اس لئے ان کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ صغیرہ گناہوں کی اقتداء بھی منع ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ امام کے صغیرہ گناہوں کو دیکھ کر ان کی اقتداء شروع کر لی جائے۔ جب صغائر کی اقتداء بھی نہیں ہو سکتی تو اس سے واضح ہوا کہ انبیاء کرام صغائر سے بھی پاک ہیں۔

(۱۶) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ لا ینال عهدی الظالمین ﴾ (پ ۱ ع ۱۵)

''میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا'' (کنز الایمان)

اس عہد سے مراد یا عہد نبوت ہے یا عہد امامت " فان کان المراد عهد النبوة وجب ان لا تثبت النبوة للظالمین " اگر اس عہد سے مراد عہد نبوت ہو تو ضروری ہے کہ نبوت ظالموں کو نہ ملے کیونکہ ظالم گناہگار ہے اور نبی گناہوں سے پاک ہے۔ اور اگر اس عہد سے مراد عہد امامت ہو تو ضروری ہے کہ امامت ظالموں کو نہ ملے اور جب امامت ظالموں کو نہیں مل سکتی:

" وجب ان لا تثبت النبوة للظالمین لان کل نبی لابد وان یکون امام یوتم ویقتدی به "

تو ضروری ہے کہ نبوت بھی ظالموں کو نہ مل سکے اس لئے کہ ہر نبی امام بھی ضرور ہوتا ہے تا کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ جب ظالم یعنی گناہگار کی اقتداء سے ممانعت ہے تو نبی کا گناہوں سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔

﴿ فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾

☆ ''پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی بیشک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان''

☆ ''پھر آدم نے اپنے رب کے کلمات کا استقبال کیا۔تو اللہ نے ان کی توبہ کو قبول کیا بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا''

مختصر وضاحت: آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتار دیا۔تو آدم علیہ السلام کے پاس رب تعالیٰ کی طرف سے کچھ کلمات آ گئے، جن میں آپ کو توبہ کرنے کا طریقہ سکھایا گیا۔آپ نے ان کلمات کو دل وجان سے قبول کیا، گویا کہ آپ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، اور رب تعالیٰ کے حضور توبہ کی، رب تعالیٰ نے آپ کی توبہ کو قبول فرما لیا، بیشک وہی بہت زیادہ توبہ کرنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ فَتَلَقّٰى ﴾: " قیل معناه فهم وفطن وقیل معنی تلقی ، تلقن ، وهذا فی المعنی صحیح "

" تلقی " کا معنی بعض حضرات نے بیان کیا ہے سمجھنا اور فطانت (زیرکی)۔بعض حضرات نے کہا ہے " تلقی " کا معنی ہے سیکھ لینا، یہی معنی صحیح ہے اعلیٰ حضرت کا یہی ترجمہ ہے: " وقیل قبل واخذ " بعض حضرات نے کہا ہے "فتلقی" کا معنی یہ ہے متوجہ ہوئے، استقبال کیا اور قبول کیا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے:

" وكان علیه السلام یتلقی الوحی ، ای یستقبله ویاخذه "
''نبی کریم ﷺ وحی کا استقبال کرتے اور اسے قبول فرماتے''

اسی طرح کہا جاتا ہے " خرجنا فتلقی الجمیع " ہم گھروں سے باہر نکلے تا کہ حاجیوں کا استقبال کریں۔

(قرطبی)

"(فتلقی آدم من ربه کلمات) استقبلها بالآخذ والقبول والعمل بها

حین علمھا" (بیضاوی)

"آدم علیہ السلام نے اپنے رب کے کلمات کو حاصل کرنے اور قبول کرنے میں ان کا استقبال کیا اور جب آپ کو وہ حاصل ہوئے جب آپ نے وہ کلمات سیکھ لئے تو ان پر عمل کیا"۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کے اس معنی میں بھی عجیب ذوق پایا جاتا ہے، اسی لئے راقم نے یہی معنی ذکر کر دیا۔

خیال رہے کہ ابن کثیر کی قراءت میں "آدم" پر نصب اور "کلمات" پر رفع پڑھا گیا ہے۔اس قراءت کے لحاظ پر معنی یہ ہوگا۔رب کے کلمات نے آدم علیہ السلام کا استقبال کیا۔ (از قرطبی)

یعنی آدم علیہ السلام کی عاجزی، گریہ وزاری کی وجہ سے رب تعالیٰ نے آپ کو جو کلمات سکھائے، وہ کلمات بے تابی سے آپ کے پاس آئے کہ آپ اپنی آہ و بکا کو ختم کر دیں۔

آدم علیہ السلام کو کون سے کلمات سکھائے گئے:

وہ کلمات یہ ہیں:

﴿ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین﴾

طبرانی نے معجم اوسط میں ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کی قبولیت کا وقت قریب آ گیا تو آپ نے کعبہ کے قریب کھڑے ہو کر دو رکعت ادا کر کے یہ دعاء پڑھی:

" اللھم انک تعلم سری وعلانیتی فاقبل معذرتی وتعلم حاجتی فاعطنی سوالی وتعلم ما فی نفسی فاغفرلی ذنبی اللھم انی اسئلک ایمانا یباشر قلبی ویقینا صادقا حتی اعلم انہ لا یصیبنی الا ما کتبت لی وارضنی بما قسمت لی"

اسی طرح اور ان کلمات کا ذکر کیا گیا ہے:

" لا الہ الا انت سبحانک وبحمدک عملت سوء وظلمت نفسی، فارحمنی فتب علی انک انت التواب الرحیم"

☆ طبرانی نے معجم صغیر میں اور حاکم نے مستدرک میں، اور بیہقی نے حضرت امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام جب بھول گئے لغزش واقع ہوگئی۔ اور رب تعالیٰ کے عتاب میں آ گئے اپنی توبہ کے قبول ہونے میں حیران تھے ،تو آپ کو یاد آ گیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جب پیدا کیا اور اپنی طرف سے خاص روح مجھ میں پھونکی تو اس وقت میں نے عرش کی جانب سر اٹھایا تھا۔ وہاں میں نے لکھا ہوا دیکھا تھا:

﴿ لا اله الا الله محمد رسول الله (ﷺ) ﴾ مستدرک جلد دوم

اسی سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی ذات رب تعالیٰ کے ہاں اس ذات سے برگزیدہ نہیں جس کے نام کو اس نے اپنے نام کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے۔ آپ نے سوچا کہ اسی ذات کے وسیلہ سے دعاء کروں تو مغفرت ہو جائے گی۔ آپ نے کہا "اسئلک بحق محمد ان غفرت لی" میں تجھ سے محمد ﷺ کا واسطہ دے کر مغفرت چاہتا ہوں۔

☆ ابن منذر نے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ آدم علیہ السلام نے یہ الفاظ پڑھے:

"اللھم اسالک بجاہ محمد عبدک و کرامته علیک ان تغفرلی خطیئتی"

''اے اللہ میں تجھ سے اس ذات کے مرتبہ کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جن کا اسم گرامی محمد ﷺ ہے جو تیرے خاص بندے ہیں اور تیرے ہاں مکرم ہیں کہ تو مجھے معاف فرما دے''

(از عزیزی)

☆ "وقیل رأی مکتوبا علی ساق العرش محمد رسول الله فتشفع به و اذا اطلقت الکلمة علی عیسی علیه السلام فلتطلق الکلمات علی الروح الاعظم والحبیب الاکرم ﷺ فما عیسی بل وما موسی بل وما وما الا بعض من ظهور انواره وزهرة من ریاض انواره ﷺ"

(روح المعانی)

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آپ نے ساق عرش پر " محمد رسول الله ﷺ" لکھا ہوا دیکھا تھا (تو یاد آنے پر) حضور کو ہی شفاعت کا ذریعہ بنایا یعنی وہ کلمات " محمد رسول الله " ہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام پر " کلمة الله "کا اطلاق پایا گیا ہے، تو نبی کریم ﷺ جو روح اعظم اور حبیب اکرم ہیں ان پر " کلمات الله " کا اطلاق تو بطریق اولی صحیح ہونا ہی ہے۔ نہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور نہ موسیٰ علیہ السلام ہیں بلکہ کائنات میں کوئی بھی نہیں جو نبی کریم ﷺ کے نور سے ظاہر نہ ہوا ہو۔ اور کوئی بھی ایسا نہیں جو نبی کریم ﷺ کے انوار کے باغ کا مہکتا ہوا پھول نہ ہو۔

☆ " وقالت طائفة، رآى مكتوبا على ساق العرش " محمد رسول الله " فتشفع بذلک فهي الكلمات " (قرطبی)

بہت سے علماء نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام نے ساق عرش پر " محمد رسول الله " لکھا ہوا دیکھا تھا، اسی کے شفاعت حاصل کی، یہی اللہ تعالیٰ کے کلمات ہیں۔

راقم کا موقف: کون سے کلمات آپ کو سکھائے اور آپ نے وہ ادا فرمائے تو آپ کی مغفرت فرما دی گئی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ بلکہ سب کا مقصد ایک ہی ہے۔ سب سے پہلے آپ نے عرض کیا۔ جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے:

" قال يا رب الم تخلقني بيدک قال بلى قال يا رب الم تنفع في الروح من روحک قال بلى قال يا رب انى تبت واصلحت اراجعي انت الى الجنة قال نعم " (بیضاوی)

(آپ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا) اے میرے رب کیا تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا نہیں کیا؟ رب تعالیٰ نے فرمایا ہاں میں نے اپنے دست قدرت سے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر آپ نے کہا اے میرے رب کیا تو نے خود اپنی طرف سے مجھ میں خاص روح نہیں پھونکی، رب تعالیٰ نے کہا ہاں میں نے ہی یہ کیا ہے۔ پھر آپ نے کہا اے میری رب اگر میں توبہ کروں اور کوشش کروں کہ مجھ سے کوئی لغزش واقع نہ ہو کیا تو مجھے جنت میں لوٹا دے گا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: ہاں توبہ کرنے پر (بالآخر) جنت میں لوٹا دوں گا۔

اس کے بعد آپ کے دل میں مختلف دعائیں ڈال دی گئیں آپ وہ دعائیں پڑھتے رہے۔ پھر

آپ کے دل میں ﴿ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین﴾ کوڈال دیا گیا۔ جس کی برکت سے آپ کو یاد آیا کہ عرش پر ایک جلیل القدر ہستی کا نام لکھا ہوا دیکھا تھا۔ تو آپ نے اسی نام کے وسیلہ جلیلہ سے دعا کی تو آپ کی توبہ کو قبول کرلیا گیا۔

اگر نام محمد را بیاو ردے شفیع آدم نہ آدم یافت توبہ نہ نوح از غرق نجینا

اگر آدم علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے اسم گرامی کو بطور وسیلہ نہ پیش کرتے اور اسی طرح نوح علیہ السلام آپ کے اسم گرامی کا وسیلہ نہ لاتے تو نہ آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوتی اور نہ نوح علیہ السلام غرق سے نجات حاصل کرتے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے دل پر کلمات القاء کئے تو آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے وہ کلمات سیکھ لئے اور ان کو پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ کو قبول فرمالیا اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوا:

"ان الذاکر لا ینتفع بالذکر ولا بنور باطنہ الا اذا کان الشیخ عارفا واذنہ فی ذلک والذاکر مشتاقا کتلقی آدم الکلمات"

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا اس وقت تک ذکر سے کامل نفع نہیں حاصل کرسکتا اور نہ ہی اپنے باطن کو منور کرسکتا ہے جب تک کہ اس کا شیخ کامل نہ ہو اور یہاں تک کہ شیخ اس کو اجازت دے اور ذکر کرنے والا مشتاق ہو جس طرح کہ کلمات سکھانے والا رب تعالیٰ ہے، سیکھنے والے آدم علیہ السلام جو ان کلمات کے مشتاق تھے اور منتظر تھے۔ (از صاوی)

﴿فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾: "تو اللہ نے ان کی توبہ کو قبول کیا، بیشک وہی بہت توبہ قبول کرنیوالا، رحم کرنیوالا ہے"

"تاب" کا مصدر "توبۃ" ہے۔ جس کا معنی ہے رجوع کرنا، جب اس کی نسبت بندے کی طرف ہو یوں کہا جائے "تاب العبد" تو اس کا معنی ہوتا ہے "رجع الی طاعۃ ربہ" بندے نے اپنے رب کی طرف رجوع کیا۔ اور جب رب تعالیٰ کی طرف نسبت کی جائے، جس طرح یہاں ہے "فتاب علیہ" تو اس کا معنی یہ ہوگا "قبل توبتہ او وفقہ للتوبۃ" کہ رب تعالیٰ نے ان کی توبہ کو

قبول کیا۔ یا یہ معنی ہوگا کہ رب تعالیٰ نے ان کو توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

"تواب" خواہ بندے کی طرف منسوب ہو یا رب تعالیٰ کی طرف اس کے معنی میں مبالغہ پایا جاتا ہے جو کثرت پر دلالت کرتا ہے:

"عبد تواب" رب تعالیٰ کی طرف بندے کا زیادہ رجوع کرنا:

"انه هو التواب" اسم ان معرفہ ہے اور خبر بھی معرفہ ہے درمیان میں ضمیر فصل کو لایا گیا جو حصر پر دلالت کر رہی ہے اور

"تواب" میں کثرت کا معنی پایا گیا ہے (بہت توبہ قبول کرنے والا)۔

"رحیم" رحم کرنے والا، زیادہ وضاحت اس لفظ مبارک کی سورۃ فاتحہ میں بیان ہو چکی ہے۔

اعتراض: جب حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا دونوں کو ہی درخت کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے " ولا تقربا " فرمایا جو کہ تثنیہ کا صغیہ ہے۔ اور دعاء میں بھی جمع کے صیغے ہیں " ربنا ظلمنا .....الخ " جس سے واضح ہے کہ دونوں نے ہی دعاء کی۔ تو کیا وجہ ہے کہ " فتاب علیه " کہا ہے " فتاب علیهما " نہیں کہا کہ دونوں کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہو جاتا۔

جواب: " لما كانت المرأة تابعة للرجل فى غالب الامر لم تذكر " (از قرطبی)

''عورت اکثر طور پر تمام امور میں مرد کے تابع ہوتی ہے اس لئے اس کا علیحدہ ذکر نہیں کیا''

تنبیہ: " تاب یتوب توبة " سے اسم فاعل " تائب " ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو تائب نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ رب تعالیٰ نے اور نبی کریم ﷺ نے اور مؤمنین نے اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ " تائب " استعمال نہیں کیا۔ اس لئے اگرچہ لغوی معنی کے لحاظ پر جائز تھا لیکن پھر بھی استعمال کرنا درست نہیں۔ رب تعالیٰ نے جب خود اپنے لئے " تواب " کا ذکر فرمایا تو یہی لفظ رب تعالیٰ کے لئے استعمال ہوگا اور اس کے معنی میں کثرت بھی ہے جو ''تائب'' میں نہیں۔ (از قرطبی)

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کس دن قبول ہوئی:

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ جمعہ کو قبول ہوئی۔ آپ کی پیدائش اور جنت سے باہر تشریف لانا

بھی جمعہ کے دن ہی تھا اور وہ عاشورہ یعنی دس محرم کا دن تھا۔

خیال رہے کہ عاشورہ جمعہ کو بڑے اہم واقعات ہوئے۔ آدم علیہ السلام کی توبہ، نوح علیہ السلام کی کشتی کا زمین پر آنا، یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ سے باہر آنا، ایوب علیہ السلام کی شفاء، موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے نجات پانا، اور فرعون کا غرق ہونا، یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام سے ملنا، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا کربلا میں شہید ہونا سب دسویں محرم کو واقع ہوئے۔ ان بزرگوں نے گیارھویں شب راحت کی گزاری۔

اہل سنت و جماعت گیارھویں رات کو حضرت غوث پاک کے ایصال ثواب کا اہتمام کرتے ہیں وہ در حقیقت ان تمام بزرگوں کو حاصل ہونے والے انعامات پر اظہار خوشی بھی ہوتا ہے۔ (از نعیمی)

آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے مکالمہ پر حدیث نبوی:

" عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ احتج آدم و موسی عند ربهما فحج آدم موسی قال موسی انت آدم الذی خلقک الله بیده و نفخ فیک من روحه و اسجدلک ملائکته و اسکنک فی جنته ثم اهبطت الناس بخطیئتک الی الارض ، قال آدم موسی الذی اصطفاک الله برسالته و بکلامه اعطاک الالواح فیها تبیان کل شئی و قربک نجیا فبکم وجدت الله کتب التوراة قبل ان اخلق قال موسی باربعین عاما قال آدم فهل وجدت فیها فعصی آدم ربه فغوی قال نعم قال افتلومنی علی ان عملت عملا کتبه الله علی ان اعمله قبل ان یخلقنی باربعین سنة قال رسول الله ﷺ فحج آدم موسی "

(رواه مسلم ، مشکوة کتاب الوسوسة)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کے ہاں ایک دوسرے سے دلائل طلب کئے۔ آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تم وہی آدم ہو جن کو رب تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور اپنی طرف سے خاص روح تم میں پھونکی۔ اور اپنے فرشتوں سے تمہیں سجدہ کرایا۔ اور تمہیں جنت میں ٹھہرایا، پھر تم نے اپنی لغزش سے لوگوں کو زمین پر اتار دیا؟

آدم علیہ السلام نے فرمایا تم وہی موسیٰ ہو کہ رب تعالیٰ نے تمہیں اپنی طرف سے رسالت عطاء کر کے اور تم سے کلام کر کے تمہیں برگزیدہ بنایا، اور تمہیں توراۃ کی تختیاں عطاء کیں جن میں ہر چیز کو بیان فرمایا، اور تمہیں اپنا خاص راز دان بنایا، میری پیدائش سے پہلے کتنے سال توراۃ کو لکھا گیا؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا چالیس سال۔

آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم نے اس میں یہ لکھا ہوا پایا" فعصى آدم ربه فغوى " (آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ نہ پائی) موسیٰ علیہ السلام نے کہاں ہاں (یعنی یہ تو لکھا ہوا میں نے توراۃ میں پایا ہے) آدم علیہ السلام نے کہا کیا تم مجھے ملامت کرتے ہو میرے اس عمل پر جو اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے لکھ دیا کہ میں نے یہ عمل کرنا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔

وضاحت حدیث:

" احتج ای تحاج (جھگڑا کیا) ای طلب کل منهما الحجة من صاحبه علی ما یقول "

''یعنی ہر ایک نے ایک دوسرے سے حجت (دلیل) طلب کی کہ وہ اپنے قول پر دلائل پیش کرے''

یہ مکالمہ کس حال میں ہوا:

یا تو یہ مکالمہ عالم غیب میں روحانی طور پر ہوا " عند ربهما " کے الفاظ اس کی تائید کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی طرف سے تجلیات کے ذریعے ایک دوسرے پر کلام کرنا اور ایک دوسرے کو دیکھنا منکشف کر دیا۔

ہو سکتا ہے کہ یہ مکالمہ ان کا جسمانی طور پر ہو، کہ ان کو ظاہری حیات عطاء کر کے، یا موسیٰ علیہ السلام کی ظاہری حیات میں آدم علیہ السلام کو بھی ظاہری طور پر حیات کر کے اپنی رحمت خاصہ کے سایہ میں جمع کر کے، ان کو اپنا قرب عطاء کر کے ایک دوسرے سے کلام کرنے کا شرف عطاء کیا ہو۔

یا یہ ہو کہ مکالمہ تو جسمانی طور پر تھا لیکن ظاہری زمین پر نہیں، بلکہ اپنی اپنی قبور میں دونوں تھے، درمیان سے حجاب اٹھا دیئے گئے اور ان کو شرف کلام عطاء کر دیا گیا۔ جیسا کہ واضح طور پر ثابت ہے اور اس پر علماء ربانین کا اجماع ہے:

" ان الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون "

''بیشک انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں وہ نماز پڑھتے ہیں''

" بیدہ " اور " من روحہ " اور " فی جنتہ " میں اضافت تشریفی ہے۔ یعنی بغیر ماں باپ کے واسطہ کے اور بغیر کسی نمونہ کے رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمایا اسے ہی دست قدرت سے تعبیر کر دیا گیا۔ اور اپنی طرف سے خاص روح آدم علیہ السلام میں پھونکی اسی طرح خصوصی جنت میں آپ کو ٹھہرایا۔

" ثم اھبطت الناس بخطیئتک " ''پھر تم نے اپنی خطاء سی لوگوں کو زمین پر اتار دیا''

اکثر طور پر لوگ اس قسم کے الفاظ کو نہ سمجھ کر غلط معانی بیان کر کے ضال و مضل (گمراہ اور گمراہ کرنے والے) بن جاتے ہیں۔ آیئے دیکھئے ملا علی قاری رحمہ اللہ کیا خوب بیان فرماتے ہیں:

" (بخطیئتک) ای التی صدرت منک غیر لائقۃ بعلو مقامک وھی الکلک من الشجرۃ وان کان نسیانا "

''آدم علیہ السلام نے بھول کر درخت سے جو کھالیا تھا اسے بھی خطاء سے تعبیر کر دیا گیا کیونکہ آپ کا مقام بہت بلند تھا اور آپ کا بھولنا اور کامل توجہ نہ کرنا آپ کے لئے گرفت کا سبب بن گیا''۔

" او خطأ فی الاجتھاد لان الکمل یعاتبون ویؤاخذون بما لا یؤ اخذ بہ غیرھم فان حسنات الابرار سیآت المقربین "

یا آپ کی اجتہادی غلطی تھی۔ لیکن خیال رہے کہ اجتہادی غلطی اس وقت ہو سکتی ہے جب ان مفسرین کے قول کو تسلیم کیا جائے جنہوں نے یہ کہا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ سمجھا تھا کہ مجھے خاص معین درخت سے منع گیا ہے، حالانکہ آپ کو اس درخت کی پوری جنس سے روکا گیا تھا۔ آپ نے معین درخت سے نہیں کھایا تھا۔ بلکہ اسی جنس کے دوسرے درخت سے کھایا تھا جو گرفت کا ذریعہ بنا۔

وجہ دونوں صورتوں میں کوئی بھی ہو، حقیقت یہی ہے کہ جو لوگ کامل درجہ رکھتے ہیں یعنی انبیاء کرام ان کو معمولی سی لغزش پر بھی عتاب ہوتا ہے اور گرفت ہوتی ہے جب کہ دوسرے لوگوں کو اس پر گرفت نہیں ہوتی۔ اس لئے عام نیک لوگوں کی نیکیاں بھی بعض اوقات مقرب لوگوں کے لئے لغزش اور غلطی سمجھی جاتی ہیں۔ (از مرقاۃ)

آیئے ایک درخشاں مثال آپ کے سامنے پیش کروں شائد کہ آپ کو سمجھ آ جائے اور آپ کا ذہن قبول کر لے، سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ کا قافلہ ایک مرتبہ مدینہ شریف کے سفر کے دوران وادیٔ حمرا میں شب باش (رات گزارنے کے لئے قیام کرنا) ہوا۔ بدوؤں کے حملے اور قافلے والوں کے خوف وہراس اور اضطراب کی وجہ سے حضرت قبلہ عالم نماز عشاء کی ابتدائی سنتیں ادا نہ کر سکے تو خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ آل رسول کو سنت ترک نہیں کرنا چاہئے۔ (از مہر منیر ص ۱۰۵)

واضح ہوا کہ سنت غیر مؤکدہ کے ترک پر کسی کو گرفت نہیں، لیکن نبی کریم ﷺ نے اپنے مقرب اور اپنی آل سے برگزیدہ شخص پر صرف سنت غیر مؤکدہ کی ترک پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور نبی کریم ﷺ کی زیارت کے دوبارہ شوق کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

لاہو مکھ تھیں مخطط بردیمن   من بھانوری جھلک دکھاؤ سجن

اوہو مٹھیاں گالی الاؤ مٹھن   جو حمراء وادی سن کریاں

یعنی اے نبی کریم ﷺ آپ نے جو دھاری دار چادر یمنی اوڑھ رکھی ہے (مراد کفن ہے) وہ ذرا اتار کر اپنے محب کو اس کے دل کو بھانے والی اپنے چہرا مبارک کی جھلک دکھا دو (یعنی ایک مرتبہ پھر زیارت کرا دو) وہی میٹھی میٹھی باتیں جو آپ نے میرے ساتھ حمرا وادی میں کی تھیں وہی باتیں ذرا اب بھی فرما دیں۔ ہو سکتا ہے اس مثال پر کوئی اعتراض کرے کہ سنت مؤکدہ چھوڑنا مباح ہے، نیکی نہیں۔ اس لئے یہ مثال بیان کرنا درست نہیں کہ بعض اوقات نیک لوگوں کی نیکیاں بھی مقرب لوگوں کے لئے

باعث مؤاخذہ ہوتی ہیں۔ آیئے احادیث کی روشنی میں اور مثالیں دیکھئے جس سے اس اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

☆ "عن انس قال کنا مع النبی ﷺ فی السفر فمنا الصائم ومنا المفطر فنزلنا منزلا فی یوم حار فسقط الصوامون وقام المفطرون فضربوا الابنیة وسقوا الرکاب فقال رسول اللہ ﷺ ذھب المفطرون الیوم بالاجر" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صوم المسافر)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کی معیت میں (ساتھ) ایک سفر میں تھے کچھ ہم میں سے روزہ دار تھے اور کچھ لوگ افطار کر رہے تھے، ہم ایک سخت گرم مقام میں اترے روزہ دار لوگ گر گئے (یعنی نڈھال ہو کر لوٹ گئے) اور جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا ہوا تھا افطار کرنے والے تھے وہ کھڑے رہے (یعنی صحیح سلامت حالت میں رہے) انہوں نے خیمے لگائے اور سواریوں کو پانی پلایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا آج افطار کرنے والے اجر لے گئے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ یہ بدر کا واقعہ ہے، وہاں روزہ افطار کرنا افضل تھا، اور روزہ رکھنا افضل نہیں تھا۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے افطار کرنے والوں کی فوقیت بیان کی۔

☆ "عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج عام الفتح ای مکة فی رمضان فصام حتی بلغ کراع الغیم فصام الناس ثم دعا بقدح من ماء فرفعه حتی نظر الناس الیه ثم شرب فقیل له بعد ذلک ان بعض الناس قد صام فقال اولئک العصاة اولئک العصاة"

(رواہ مسلم، مشکوۃ باب صوم المسافر)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال رمضان میں تشریف لے گئے۔ آپ نے روزہ رکھا ہوا تھا یہاں تک کہ آپ جب کراع غیم مقام پر پہنچے تو لوگوں نے بھی روزہ رکھا ہوا تھا آپ نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا اسی اٹھا کر بلند کیا، لوگ دیکھ رہے تھے آپ نے پانی پی لیا، آپ کو اس کے بعد بتایا گیا کہ کچھ لوگوں نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ نافرمان ہیں وہ نافرمان ہیں۔ حدیث پاک کی طرف ذرا غور تو فرمائیں کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کی روزہ کی حالت میں مشقت کو دیکھ کر روزہ افطار کر دیا اب کامل اتباع اسی میں تھی کہ صحابہ کرام صرف دیکھ کر ہی روزہ افطار کر لیں۔ جن لوگوں نے روزہ اس کے بعد بھی رکھا، ان کے روزہ رکھنے کو نافرمانی

سے تعبیر کیا۔ حالانکہ وہ مقرب نہ ہوتے تو روزہ رکھنا نیکی ہوتا۔ لیکن مقربین کے لئے حکم ہی یہ ہے کہ وہ دیکھ کر ہی اتباع کریں۔

شرعی ضابطہ ہی جب یہ ہے کہ جب تک منع نہ کیا جائے وہ کام مباح رہتا ہے تو صحابہ کرام نے کون سا جرم کیا تھا؟ بات صرف یہ ہے کہ عام نیک لوگوں کی نیکی بھی مقربین کے لئے بعض اوقات قابل گرفت ہوتی ہے اسے بھی خطاء کہہ لیا جاتا ہے۔

آدم علیہ السلام کے موسیٰ علیہ السلام پر غالب آنے کی وجہ:

آدم علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اے موسیٰ جب اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے پہلے چالیس سال لکھ دیا تھا کہ مجھ سے بھول ہوئی ہے اور لغزش ہوئی ہے تو وہ مجھ سے واقع تو ضرور ہونی تھی خواہ میں اس سے بچنے کی کوشش بھی کرتا۔ لیکن تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ایسا کلام کرو:

" فلم تلومني على ذلك ولان اللوم على الذنب شرعي لاعقلي واذا تاب الله تعالىٰ على آدم وغفرله زال عنه اللوم فمن لامه كان محجوجا بالشرع "

تم مجھے کیسے ملامت کر رہے ہو۔ شرعی گناہ پر تو ملامت ہو سکتی ہے جو گناہ ہی نہ ہو صرف عقل کہے یہ خطاء ہے اس پر ملامت کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں اور خصوصاً جب میں نے توبہ بھی کر لی رب تعالیٰ نے میری بھول اور لغزش کو بھی معاف کر دیا تو اب ملامت نہیں ہو سکتی۔ ورنہ شرعی طور پر حجت اس کے خلاف قائم ہوگی۔ پس یہی وجہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام پر غلبہ حاصل ہو گیا۔
(از نووی ج ۲ ص ۳۴۳)

" ومن هذا المقام قول الجيلي " اسی مقام پر جیلی رحمہ اللہ نے کیا خوبصورت اشعار بیان فرمائے:

ولی نکتة غراهنا ساقولها	وحق لها ان ترعوبها المسامع
هی الفرق ما بین الولی وفاسق	تنبه لها فالا مر فيه بدائع
وما هو الا انه قبل وقعة	يخبر قلبی بالذی هو واقع
فاجنی الذی يقضيه فی مرادها	وعينی لها قبل الفعال تطالع
فكنت اری منها الارادة قبل ما	اری الفعل منی والاسير مطاوع
اذا كنت فی امر الشريعة عاصيا	فانی فی حكم الحقيقة طائع

مجھے خوب چمکدار نکتہ سمجھ آیا ہے جسے میں بیان کرتا ہوں

اور حق یہی ہے کہ کانوں پر اسے کھٹکایا

ولی اور فاسق میں یہی فرق ہے

اس (نکتہ) پر متنبہ ہو جائے وہ عجیب بات پر مشتمل ہے

اور وہ نہیں ہے مگر یہی کہ واقعہ سے پہلے

میرا دل اسی چیز کی خبر دیتا ہے جو واقع ہونے والا ہوتا ہے

اسی آنے والے واقعہ کی مراد کے تقاضا پر بظاہر جنایت ہو جاتی ہے

میری آنکھیں فعل سے پہلے ہی اسکا مطالعہ کر لیتی ہیں

میں اسی ارادہ کے مطابق دیکھ لیتا ہوں اس سے پہلے

کہ وہ فعل مجھے نظر آئے قیدی شخص نے مطیع ہونا ہی ہے

امر شریعت میں ہو سکتا ہے مجھے کوئی عاصی سمجھے

بیشک حقیقت میں، میں اللہ تعالیٰ کا مطیع ہوتا ہوں

مقصد اس کا بھی یہی ہے کہ فاسق اپنی مرضی سے گناہ کرتا ہے توبہ نہیں کرتا پھر کہتا ہے تقدیر میں یہی تھا، اسے یہ نہیں سمجھ آتا کہ مجھے رب تعالیٰ نے فاعل مختار بنایا ہے۔

لیکن اللہ کے ولی کی نظر کام سے پہلے بھی تقدیر پر ہوتی ہے کام وہ بھی اپنے اختیار سے کرتا ہے لیکن اگر لغزش واقع ہو جائے تو وہ صرف یہ کہہ کر ٹال نہیں دیتا کہ تقدیر میں یہی تھا بلکہ وہ رو رو کر اپنی معمولی لغزش کی بھی معافی چاہتا ہے۔ اس کا بھول کر معاف کرا لینا حقیقت میں رب تعالیٰ کی فرمانبرداری ہوتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس کا بھول جانا شریعت کے مخالف نظر آتا ہے۔

☆☆☆

﴿توبہ کا بیان﴾

یہی آیۃ جس کی بحث کی جارہی ہے ﴿ فتاب علیه انه هو التواب الرحيم ﴾ اسی کی تفسیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا۔ اوراسی طرح شیخ زادہ میں بھی اسی مقام پر توبہ کی بحث کا ذکر کیا گیا ہے۔

راقم نے اپنی کتاب ''موت کا منظر مع احوال حشر ونشر'' میں توبہ نصوح کے متعلق تفصیلی مضمون لکھا تھا، اسی کو یہاں شامل کیا جارہا ہے جو کہ تقریباً تفسیر کبیر اور شیخ زادہ سے کچھ نہ کچھ ملتی جلتی بحث ہے۔ اور خاص کر کے وجہ یہ بھی ہے کہ کام بہت دیر سے شروع کیا۔ کہاں پہلا پارہ اور کہاں اٹھائیسواں پارہ وہاں تک پہنچنے کی کوئی خاص امید نظر نہیں آتی اللہ تعالیٰ مہربانی فرمادے تو کوئی بعید بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ☆ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾

اے ایمان والو اللہ کی طرف ایسی توبہ کرو جو آگے کو نصیحت ہو جائے (سچی توبہ کرو) قریب ہے کہ تمہارا رب تمہاری برائیاں تم سے اتار دے اور تمہیں باغوں (جنات) میں لے جائے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔

''نصوحا'' مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے زیادہ نصیحت کرنا، یہ توبة کی صفت ہے یعنی بہت نصیحت کرنے والی توبہ، یعنی ایسی توبہ ہو جو توبہ کرنے والے شخص کو جن گناہوں سے وہ توبہ کر رہا ہے ان کی طرف آئندہ نہ لوٹنے کی نصیحت کرنے والی ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مقصد یہ ہوگا، کہ اتنی خالص سچی توبہ ہو کہ جس سے توبہ کرنے والے حضرات خود ہی اپنے نفسوں کو نصیحت کرسکیں۔ (تفسیر کبیر)

حضرت معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا:

''یا رسول الله ما التوبة النصوح؟'' یارسول اللہ! ''توبہ نصوح'' کیا چیز ہے؟

نبی کریم ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا: ''ان يندم العبد على الذنب الذى اصاب فيعتذر الى

اللہ تعالیٰ ثم لایعود الیه کما لا یعود اللبن الی الضرع ''

انسان اپنے گناہوں پر نادم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور عذر پیش کرے (یعنی گناہوں کی معافی طلب کرے) پھر کبھی ان گناہوں کی طرف نہ لوٹے (یعنی پختہ ارادہ کرے کہ آئندہ یہ گناہ کبھی نہیں کروں گا۔) جیسے (دوہا ہوا) دودھ تھنوں کی طرف نہیں لوٹتا۔

اہل عرب نصاحة الثوب کا لفظ بولتے ہیں جس کا معنی لیتے ہیں'' کپڑے کو سینا اور رفو کرنا'' اس طرح التوبة النصوح کا معنی ہوگا کہ انسان کے گناہوں کی وجہ سے اس کے دین میں جو خلل واقع ہوا ہے، اس شخص کی توبہ سے اللہ تعالیٰ اسے پر کردے گا، گویا، توبہ سے اس کے دین کی چادر کے سوراخ رفو ہو جاتے ہیں۔ عربی زبان میں عسل ناصح بولتے ہیں جس کا معنی ہوتا ہے خالص شہد یعنی ملاوٹ سے پاک وصاف، اب توبہ نصوح کا معنی ہوگا خالص توبہ، سچے دل سے توبہ ہو جس پر انسان قائم رہنے کا عزم صمیم (پختہ ارادہ) کرے اور پہلے نصیحت گناہوں پر نادم ہو، آئندہ گناہوں کی طرف نہ لوٹنے کا وعدہ کرے۔

النصوح: بہت نصیحت کرنا، اس معنی کے لحاظ پر ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی توبہ ہو جو دوسرے لوگوں کو نصیحت کرنے والی ہو، یعنی لوگ جب توبہ کرنے والے کو دیکھیں کہ یہ شخص کتنا ہی گنہگار تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے فضل و کرم سے کیسے توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔ کہ اب یہ نیک، متقی، صالح ہو گیا، ہمیں بھی چاہئے کہ ہم بھی گناہوں سے توبہ کریں، نیک متقی بن جائیں تا کہ اللہ تعالیٰ کے عفو و مغفرت اور اس کے فضل و کرم سے ہم بھی بہرہ ور ہو جائیں۔

امور اسلامیہ میں سب سے اہم چیز توبہ، مقامات ایمانیہ میں سب سے اول توبہ، سالکین کے راستہ کا مبدأ توبہ، واصل باللہ ہونے والے حضرات کے دروازہ کی چابی توبہ ہے۔

توبہ اس وقت حقیقت میں توبہ ہوگی جب گناہ کو گناہ سمجھ کر توبہ کرے اور صرف اللہ تعالیٰ کا خوف مدنظر ہو۔ اگر کسی آدمی کو کسی گناہ سے بدن میں کوئی ضرر پہنچے یا مال متاع میں کوئی نقصان ہو وہ ان نقصانات کی وجہ سے گناہ چھوڑنے کا ارادہ کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے کہ میں گناہ کو چھوڑ رہا ہوں تا کہ ان

نقصانات سے بچ سکوں ایسی توبہ درحقیقت توبہ نہیں، اس کی قبولیت کی کوئی امید نہیں۔ (تفسیر روح المعانی)

صوفیائے کرام کا تقویٰ تو یہاں تک ہے کہ توبہ کرتے وقت جنت میں داخل ہونے کا طمع اور جھنم سے بچنے کا خوف بھی مدنظر نہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا خوف ہو، جب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے حاصل ہو جائیں گے۔

حضرت علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:

" التوبة مااستجمعت ثلاثه امور ، ان يقلع عن المعصية ، وان يندم علىٰ فعلها وان يعزم عزما جاريا على ان لا يعود الىٰ مثلها ابدا فان كانت تتعلق بآدمى لزم رد الظلامة الى صاحبها او وارثه اوتحصيل البرائة منه ، وركنها الاعظم الندم " (تفسير روح المعانى)

علامہ آلوسیؒ نے فرمایا کہ حقیقی توبہ یہ ہے کہ اس میں تین چیزیں پائی جائیں۔

(۱) گناہ کو چھوڑ دے (۲) پہلے جو گناہ کر چکا ہے اس پر نادم ہو۔

(۳) آئندہ کے لئے پختہ ارادہ کہ میں گناہ کبھی نہیں کروں گا۔

حقوق اللہ میں یہ تین چیزیں ہیں۔ لیکن حقوق العباد میں ان تین کے علاوہ ایک چوتھی چیز بھی ہے، وہ یہ ہے کہ جس کسی کا حق دبایا ہوا ہے وہ اسے لوٹا دے۔ وہ فوت ہو چکا ہو تو اس کے وارثوں کو لوٹا دے۔ یا اس شخص سے برائت حاصل کر لے، یعنی وہ اسے معاف کر کے بریٔ الذمہ قرار دے دے توبہ کا سب سے بڑا رکن کئے ہوئے گناہوں پر نادم ہونا ہے۔

" وعلامة الندم طول الحسرة والخوف وانسكاب الدمع " (روح المعانى)

نادم ہونے کی تین علامتیں ہیں۔

(۱) لمبی حسرت یعنی بہت پشیمان رہنا، ہر وقت پشیمان رہنا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا خوف طاری ہونا۔

(۳) آنسو بہانا یعنی گناہوں کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا خیال کر کے رونا۔

ضابطہء قبولیت جس گناہ کا وہ ارتکاب کر رہا ہے، اس کو توبہ کے لئے چھوڑنا ضروری ہے، کافر کی توبہ کفر سے باز آنا۔ مشرک کی توبہ شرک کو ترک کرنا اور منافق کی توبہ منافقت کو چھوڑنا ہے۔

قاعدہ: صرف توبہ سے ہی گناہ کبیرہ معاف ہوتے ہیں، باقی عبادات سے صغائر تو معاف ہوتے ہیں کبائر معاف نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے صغائر یا کبائر معاف فرمادے تو اس کی مہربانی ہوگی البتہ شرک کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (پ د ۱۵)

بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کا کوئی شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہے معاف فرمادیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾

(اے محبوب) آپ فرمادیجئے! اے میرے بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

جب نفسانی جذبات مشتعل ہوجاتے ہیں تو بڑے بڑے دانشمندوں سے انتہائی قبیح حرکتیں سرزد ہوجاتی ہیں، جب انتقام کے شعلے بھڑکتے ہیں تو بڑے بڑے حلیم الطبع لوگوں کے ہاتھ سے بھی عدل وانصاف کا دامن چھوٹ جاتا ہے، غلط ماحول کے باعث غلط نظریات دل میں جم جاتے ہیں، ان حالات میں اگر کوئی شخص گناہوں اور بدکرداریوں سے اپنا دامن آلودہ کرلے اور اس کے لئے توبہ کا دروازہ بند کردیا جائے، تو وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوگا اور گناہ وعصیاں کی دلدل میں بڑی بے باکی سے بڑھتا چلا جائے گا، اس طرح خود بھی برباد ہوگا اور کئی معصوم زندگیوں کو بھی دفن کرکے رکھ دے گا۔

اسی طرح اگر یہ بات کسی کے ذہن نشین ہوجائے کہ گناہ کرنے سے کوئی مضرت نہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ کے سامنے ہمارے ان گناہوں کی کیا حقیقت ہے ہم کچھ بھی کرتے رہیں وہ بخش دے گا اور جنت کے دروازے ہمارے لئے کھول دئے جائیں گے، ایسا انسان بھی عمر بھر اپنی نفسانی خواہشات کے ہاتھوں کھلونا بنا رہتا ہے۔ خونریزی، بدکاری، راہزنی، حق تلفی سے اسے کوئی نفرت نہیں رہتی لوگوں کے حقوق پامال کرنے کے باوجود اور ملک میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے کے باوجود اس

کے دل میں خلش بھی پیدا ہوتی جو اس کو بے چین کر دے۔ یہ دونوں کیفیتیں انسان کے لئے سمّ قاتل (قتل کرنے والا زہر) ہیں اس طرح وہ نہ فقط دوسروں کے لئے وبال جان بن جاتا ہے، بلکہ اپنی ذات پر بھی ظلم عظیم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کو جو تعمیری صلاحیتیں اور نیکی کی قوتیں بخشی گئی تھیں ان سے اگر وہ صحیح کام لیتا تو آسمان شہرت پر مہر وماہ (سورج وچاند) بن کر چمکتا اور قیامت تک دنیا اس کی نیکیوں کو یاد کرتی اسے دعائیں دیتی، اب وہ بیکار پڑی رہیں۔ اور برگ وبار (بارش اور ہوا سے جھڑے ہوئے پتے) لائے بغیر ختم ہو گئیں۔

اسلام جو دین فطرت ہے جس کا مقصد اولین فرد کی صحیح نشو ونما اور راہنمائی کرنا ہے تاکہ سلجھے اور اصلاح یافتہ افراد سے ایک ایسی قوم معرض وجود میں آئے جو قیادت امم (امتوں) کی ذمہ داری سنبھال سکے اور ساری انسانیت کی راہنمائی کا فریضہ ادا کر سکے، اس لئے اسلام نے انسان کو نہ تو بالکل بے لگام چھوڑ دیا ہے کہ وہ خرمستیاں (گدھے کی طرح مستیاں) کرتا رہے، چمن حیات کی نازک اور معصوم کلیوں کو مسلتا رہے۔ اور ان کی رنگ ونکہت کو لوٹتا رہے اور اس کے باوجود دل میں اپنی بخشش کا بھی یقین رکھے اور نہ ہی اسلام نے انسان کو مایوسیوں اور ناامیدیوں کے گہرے گڑھے میں دھکیل دیا بلکہ صحیح خطوط پر اس کی تربیت کا پروگرام پیش کیا۔

ایک طرف اسے اپنے اعمال نیک وبد کا ذمہ ٹھہرایا اور اسے ان نتائج سے آگاہ کیا جو اس کے اچھے یا برے اعمال پر سنت الہی کے مطابق مرتب ہو کر رہیں گے۔ تاکہ قبول کرنے کے لئے تیار ہے اس کے ساتھ اس کو مایوس بھی نہیں ہونے دیا۔ اسے بتا دیا کہ گناہوں اور بدکاریوں سے تائب ہو کر جب اور جہاں سے وہ نئی پاکیزہ زندگی شروع کرنے کا عزم کر چکے ہو تو تمہارے گناہ بے شمار اور نہایت سنگین کیوں نہ ہوں معاف کر دئے جائیں گے تمہیں یہاں سے مایوس نہیں لوٹایا جائے گا۔

(تفسیر ضیاء القرآن)

اس آیت کریمہ میں انسان کو کئی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی امید دلائی ہے تاکہ انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر گناہ گار ہی اس دنیا سے رخصت نہ ہو جائے، بلکہ سچے دل سے توبہ کر کے اپنے گناہوں کی مغفرت حاصل کرے۔

(۱) گناہگار انسان کو عبد کہا، عبد کا مطلب ہے محتاج، مسکین، اپنے آپ کو حقیر سمجھنے والا، کریم و رحیم ذات کے لائق ہی یہ ہے کہ وہ رحمت و خیر کا فیضان محتاج و مسکین کو پہچائے۔

(۲) رب تعالیٰ نے گناہگار بندوں کو اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا ''یا عبادی'' اے میرے بندو گویا اس سے یہ بتایا گیا کہ ایمان والے انسان اگر تو اپنے نفس پر زیادتیاں کر بھی لے تو میں تجھے پھر بھی اپنا بندہ سمجھ کر توبہ کی مہلت دیتا ہوں کیونکہ کوئی اپنے بندے کو بلا وجہ عذاب نہیں دیتا بلکہ مولیٰ تو اپنے بندے کو جہاں تک ممکن ہو کوشش کرتا ہے عذاب سے بچانے کی۔

(۳) ''اسرفوا علٰی انفسھم'' (جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں) کہہ کر اشارہ فرمایا کہ گناہوں کا نقصان تمہیں ہے تمہارے گناہوں سے مجھے کوئی نقصان نہیں اگر تم گناہوں سے توبہ کر کے اپنے آپ سے ضرر مٹالو تو مجھے معاف کرنے میں کیا نقصان ہے۔ اگر تم گناہوں سے زنگ آلودہ ہو کر مرتے تو تمہیں جھنم کی آگ کی بھٹی میں صاف کرنا پڑتا لیکن اگر توبہ سے تم نے اپنے گناہوں کے زنگ کو مٹا دیا تو اب میں اپنے وسیع فضل و کرم سے تمہیں معاف کر دوں گا۔

(۴) اور فرمایا ''لا تقنطوا من رحمة الله'' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو گویا کہ اپنے کرم کے متعلق فرمایا کہ میں کریم ہوں، لہٰذا تمہیں چاہیے کہ کریم کے کرم سے ناامید نہ ہو وہ اپنے دربار میں آئے ہوئے، معافی کی طلب کا دامن پھیلائے ہوئے، اپنے جرموں پر نادم ہونے والے اور آئندہ نہ جرم کرنے کا عزم صمیم (پختہ ارادہ) رکھنے والے اپنے عاجز بندوں کو اپنے کرم سے کبھی مایوس نہیں فرمائے گا۔

(۵) پہلے فرمایا ''یا عبادی'' اے میرے بندو، اس کے بعد عربی محاورہ اور انسانی عقل کے تقاضا کے پیش نظر ''لا تقنطوا من رحمتی'' (میری رحمت سے ناامید نہ ہو) ہونا چاہیے تھا لیکن اسے چھوڑ کر جب رب کائنات نے اپنی حکمت کے مطابق اس طرح ارشاد فرمایا ''لا تقنطوا من رحمة الله'' اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، تو اس سے یہ واضح کیا کہ میرا اسم گرامی اللّٰہ ہے جو تمام کامل صفات کا جامع ہے۔ یعنی تمام کامل صفات اس لفظ اللّٰہ میں جمع ہیں جو اللّٰہ ہو وہ رحمٰن، رحیم، کریم، غفور، اور رحیم بھی ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ جبار و قہار بھی ہوتا ہے۔

اگر تم جرائم کے مرتکب ہوئے، میرے احکام کے باغی ہوئے تو مجھے اللہ سمجھتے ہوئے میری صفات قہر و جبر کو مدنظر رکھنا اور اگر تم عاجز بندے بن کر گناہوں کی معافی طلب کرنے کی غرض سے میرے دربار میں آ گئے تو مجھے رحمٰن ورحیم سمجھنا کیونکہ میں اللہ ہوں۔ جو اللہ ہوتا وہ رحمٰن ورحیم بھی ہوتا ہے۔

(۶) "لاتقنطوا من رحمة اللّٰه" کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا" ان اللّٰه یغفر الذنوب جمیعا "اگر تم نے سچے دل سے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ بھی تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا، یہ نہیں کہ بعض گناہ معاف کرے اور بعض نہ معاف کرے دوبارہ اپنا اسم گرامی ذکر کیا اور کہا" ان اللّٰه" اور "انه" نہیں کہا۔ تو اس سے بھی یہ واضح کیا کہ میں تمہیں بار بار بتا رہا ہوں کہ میں اللہ ہوں میرے رحمت کے دامن میں آ کر تو دیکھو کہ میں کسی طرح بخشش کرتا ہوں۔

(۷) "ان اللّٰه یغفر الذنوب" (بے شک اللہ گناہوں کو بخشے گا) سے مقصد تقریباً حاصل تھا لیکن پھر بطور تاکید لفظ جمیعا کو ذکر کر کے اپنی وسعت رحمت کا اعلان فرمایا، کہ میں تمام گناہوں کو بخشنے والا ہوں۔

(۸) اپنی صفت غفور ذکر فرمائی جس کے معنی میں مبالغہ ہے یعنی بہت بخشنے والا۔ اس طرح جب انسان توجہ کرے گا کہ میرا رب کریم ہے۔ بہت بخشنے والا ہے تو مجھے بھی چاہئے کہ میں اپنے گناہوں کی معافی طلب کر کے اس کی مغفرت سے فائدہ حاصل کر لوں، تاکہ روز قیامت عذاب میں مبتلاء نہ ہونا پڑے۔

(۹) رب تعالیٰ نے اپنے غفور ہونے کے بعد رحیم ہونے کا ذکر فرمایا کہ مغفرت کے بعد میری رحمت بھی ہوگی۔ میں اپنے انعامات سے بھی نوازوں گا، اس طرح انسان کو متوجہ کیا کہ اے انسان میری مغفرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر اپنے آپ کو پاک صاف کرنے کے ساتھ ساتھ میری رحمت کے ہیرے اور موتی بھی حاصل کر لے۔

(۱۰) "انه هو الغفور الرحیم" میں لفظ "انه" کے بعد "هو" کو ذکر کیا، جو عربی گرائمر کے مطابق اس میں حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے جس کا مطلب ہے کہ غفور اور رحیم صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے بغیر کوئی غفور ورحیم نہیں، لہٰذا اپنے گناہوں کی معافی اسی سے مانگو وہی تمہیں معاف فرمائے گا۔

سچی توبہ سے ڈاکوؤں کا سردار زمانہ کا ولی بن گیا:

حضرت فضیل ابن عیاضؒ اپنی زندگی میں چوروں کے سردار تھے۔ بیابان میں خیمہ لگایا ہوا تھا، خوبصورت موٹا لباس اور صوف کی کلاہ پہنے ہوئے اپنے خیمہ میں بیٹھے رہتے تھے آپ کے احباب و آشنا تمام چور اور ڈاکو تھے، چرایا ہوا مال اور ڈاکہ سے لوٹا ہوا مال ان کے پاس لاتے تھے۔ یہ ہی ان میں تقسیم کرتے تھے ایک رات کو ایک قافلہ کہیں جا رہا تھا اس میں ایک شخص یہ آیہ کریمہ پڑھ رہا تھا۔

﴿ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ﴾

کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا؟ اہل ایمان کے لئے کہ جھک جائیں۔ ان کے دل یاد الٰہی کے لئے اور اس سچے کلام کے لئے جو اترا ہے۔

یہ آیہ مبارکہ سن کر آپ کے دل پر رقت طاری ہوگئی۔ اور آپ کو راہ ہدایت دکھائی گئی۔ آپ نے اپنے دل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کب تک تو رہزنی کرتا رہے گا؟ کیا تو نے خدا کے حکم کو نہیں سنا؟ یہ کہتے ہی آپ نے ایک چیخ ماری اور روتے ہوئے عرض کرنے لگے: اے مولائے کائنات! اب وہ وقت آگیا ہے کہ میں توبہ کر رہا ہوں، تیرے دربار کی طرف رجوع کر رہا ہوں، اس طرح روتے ہوئے خیمہ سے نکل کر جنگل کی راہ لی۔ وہاں پر ایک قافلہ اترا ہوا تھا جو آپ کے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے کہ فضیل ڈاکوؤں کا سردار ہے، اس کے ساتھی لوگوں کا مال لوٹ لیتے ہیں۔ ڈاکو ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک عورت پر بھی عاشق ہونے کی وجہ سے راہ راست سے بھٹکا ہوا انسان ہے وہ کب سیدھی راہ پر آسکتا ہے؟ آپ نے ان کی باتوں کو سن کر اپنا تعارف کرایا کہ فضیل میں ہی ہوں میں اللہ کے فضل و کرم سے آج سے توبہ کر چکا ہوں، آئندہ مجھے اس جنگل میں کبھی ڈاکہ مارتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ فضیل نے سچے دل سے توبہ کر لی۔

حضرت فضیل کا مقام ولایت:

ایک رات ہارون الرشید نے اپنے وزیر فضل برمکی سے کہا کہ مجھے آج کی شب کسی ایسے بزرگ کے پاس لے چلو جس سے میرے قلب کو سکون و راحت ہو۔ وزیر، ہارون الرشید کو سفیان کے پاس لے

گیا، جب ان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو سفیان نے پوچھا کون ہے؟ کہا امیر المومنین۔ سفیان نے کہا مجھے پہلے کیوں نہیں خبر دی تا کہ میں خود ہی حاضر ہو جاتا۔ یہ سن کر ہارون الرشید نے اپنے وزیر کو کہا کہ یہ وہ شخص نہیں جس سے میرا دل مطمئن ہو سکے۔ تو وزیر نے کہا، جس شخص کی آپ کو تلاش ہے وہ فضیل ابن عیاضؒ ہو سکتے ہیں۔ ہارون الرشید اور اس کے وزیر جب حضرت فضیل کے گھر پہنچے تو آپ یہ آیۃ کریم تلاوت کر رہے تھے:

﴿ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ كَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ﴾

یعنی بد اعمال لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو نیک اعمال اشخاص کے برابر مرتبہ دیں گے۔

یہ سن کر ہارون الرشید نے کہا کہ اگر چہ میرے لئے یہی کافی ہے، لیکن پھر بھی دروازہ کھٹکٹاؤ، وزیر نے دستک دی آپ نے پوچھا کون؟ وزیر نے کہا، امیر المومنین۔ آپ نے فرمایا امیر المومنین کو مجھ سے کیا کام اور مجھے اس سے کیا واسطہ؟ جاؤ اپنا کام کرو میرا وقت ضائع نہ کرو۔ وزیر نے کہا بادشاہ کی اطاعت لازم ہے آپ نے پھر فرمایا مجھے پریشان نہ کرو۔

وزیر نے کہا ہم حکماً داخل ہونا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اجازت تو نہیں دیتا البتہ اگر تم شاہانہ حکم سے آنا چاہتے ہو تو میں رد نہیں کر سکتا، اس طرح ہارون الرشید اور اس کا وزیر آپ کے پاس پہنچے تو آپ نے اپنا چراغ گل کر دیا تا کہ بادشاہ مجھے دیکھ نہ سکے، اسی دوران ہارون کا ہاتھ کہیں آپ کے ساتھ چھو گیا آپ نے فرمایا کتنا نرم ہاتھ ہے۔ کاش کہ دوزخ کی آگ سے بچ جائے، یہ کہہ کر آپ پھر اپنی نماز میں مشغول ہو گئے بادشاہ آپ کی اس بے توجہی کو دیکھ کر رونے لگا۔ اور عرض کیا کچھ فرمایئے!

آپ نے فرمایا تمہارا باپ نبی کریم ﷺ کا چچا تھا (یعنی تم عباسیہ خاندان کے ہو) انہوں نے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ سے کسی صوبہ کی امارت (گورنری) طلب کی تو آپ نے فرمایا اے چچا تمہیں تمہارے نفس کا امیر بنایا جاتا ہے۔ یعنی مخلوق کی ہزار سال طاعت کرنے سے نفس کا خالق کی طاعت میں رہنا بہتر ہے۔

ہارون الرشید نے کہا اور کچھ نصیحت فرمائیں:

”آپ نے کہا حضرت عمرو بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے چند بزرگوں کو بلا کر

پوچھا کہ میں اس بارگراں (بھاری بوجھ) کو کیسے اٹھا سکوں گا'' انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر تم قیامت کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو ضعیف مسلمانوں کو باپ کی طرح، نوجوانوں کو بھائیوں کی طرح، چھوٹوں کو بچوں کی طرح اور عورتوں کو بہنوں کی طرح سمجھو!

ہارون الرشید نے عرض کیا کچھ اور ارشاد فرمایئے!

آپ نے فرمایا: اسلامی ملک ریاست کو گھر کے برابر سمجھو، تمام مخلوق کو ماں، باپ، بہن بھائی اور بچوں کے برابر سمجھو، ان سے اچھا سلوک رکھو۔ یہ خوف ذہن میں ہمہ وقت رکھو کہ کتنے ہی خوبصورت چہرے آگ میں پڑ کر بدصورت ہو جائیں گے اور کتنے ہی سردار وہاں قید ہو جائیں گے۔ ہر غریب کے حقوق اس تک پہنچاؤ۔ ورنہ قیامت کے دن وہ غریب بڑھیا عورت بھی تمہارے دامن کو پکڑنے والی ہوگی جو یہاں بھوکی سوگئی۔

آپ کی یہ نصیحتیں سن کر ہارون الرشید پر گریہ وزاری طاری ہوگیا۔ روتے روتے بے ہوش ہوگیا پھر ہارون نے آپ سے پوچھا کہ تم نے کسی کا قرض تو نہیں دینا، آپ نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا قرض میرے ذمہ ہے اگر اس میں کوتاہی ہوگئی، ادا نہ کرسکا تو میری حالت افسوسناک ہوگی۔

ہارون نے کہا میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ نے دنیا میں کسی انسان کا قرض تو نہیں دینا، آپ نے فرمایا نہیں اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بہت نعمتیں حاصل ہیں۔

ہارون نے آپ کی خدمت میں ایک ہزار دیناروں کی تھیلی پیش کی، آپ نے کہا افسوس میری نصیحتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں۔ غصہ سے دیناروں کی تھیلی واپس کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے بادشاہ اور اس کا وزیر بھی مجبوراً اٹھے، آپ نے دروازہ بند کردیا۔ ہارون نے وزیر سے کہا کہ واقعی فضیل بن عیاض اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے ولی ہیں۔ (ماخوذ از تذکرۃ الاولیاء)

سبحان اللہ! یہ فضیل بن عیاض ایک عورت کا عاشق، تمام مال و دولت اور راتیں اس پر قربان کرنے والا، ڈاکو، راہزن، چور، لٹیرہ، ڈاکوؤں کا سردار۔ لیکن توبہ کرنے سے، اپنے گناہوں پر نادم ہونے گناہوں کو چھوڑنے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کے عزم صمیم سے ولایت کے بہت بلند مقام پر فائز ہوگیا۔

گناہگار بندے کی توبہ سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" للہ اشد فرحا بتوبۃ احدکم من احدکم بضالتہ اذا وجدھا "

(مسلم شریف ج ۲ کتاب التوبۃ)

اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ سے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنی گم شدہ چیز کو پا کر خوش ہوتا ہے

دوسری حدیث شریف میں زیادہ وضاحت ہے۔

حضرت حارث بن سوید فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہؓ کے پاس ان کی حالت مرض میں عیادت کے لئے حاضر ہوا، آپ نے مجھے دو حدیثیں بیان فرمائیں ایک حدیث اپنی طرف سے اور ایک حدیث رسول اللہ ﷺ کی طرف سے، آپ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرمارہے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کی توبہ سے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو خوفناک بے آب وگیاہ جنگل میں ہو اس کے ساتھ ایک سواری ہو جس پر اس کا کھانے، پینے کا سامان لدا ہوا ہو تو یہ شخص سو جائے جب بیدار ہو تو دیکھے کہ میری سواری غائب ہے اس کی تلاش میں نکلے، پیاس غالب آجائے (عاجز آکر) کہے۔ کہ جہاں سے آیا تھا وہاں ہی واپس جا کر سو جاتا ہوں تاکہ موت ہی آجائے۔ واپس آکر اپنا سر کلائی کے اوپر رکھ کر سو جاتا ہے تاکہ موت آجائے۔ لیکن کچھ دیر بعد جاگتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی سواری بمع کھانے پینے کے سامان کے اس کے پاس کھڑی ہے، اس وقت اس شخص کو اپنی سواری اور کھانے، پینے کی اشیاء دیکھ کر جتنی خوشی ہوگی، اللہ تعالیٰ کو اپنے مومن بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوشی ہوگی۔

کتنی ہی مرتبہ غلطی سرزد ہو پھر بھی توبہ کرتا ہی رہے:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ما اصر من استغفر وان عاد فی الیوم سبعین مرۃ "

(ترمذی، ابو داؤد، مشکواۃ باب الاستغفار التوبہ)

جو شخص استغفار کرتا ہے وہ اپنے گناہوں پر مصر (قائم رہنا) نہیں رہتا، اگرچہ ایک دن میں ستر مرتبہ بھی اس سے غلطی کیوں نہ سرزد ہو۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ انسان کو چاہیے کہ وہ گناہوں سے توبہ کرتا رہے، غلطی سے کئی مرتبہ بھی اس کے گناہ سرزد ہو جائیں تو توبہ کرنے سے شرم محسوس نہ کرے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ توبہ نہ کرنا، گناہ پر نادم نہ ہونا، یہ گناہ پر اصرار ہے اور گناہ پر اصرار سے گناہوں میں زیادتی ہوتی ہے۔

حدیث پاک میں ہے "لا صغیرة مع الاصرار ولا کبیرة مع الاستغفار" اصرار سے صغیرہ نہیں اور استغفار سے کبیرہ نہیں رہتا۔ یعنی گناہ پر اصرار (بار بار کرنے) سے وہ صغیرہ اپنی پہلی حیثیت پر صغیرہ نہیں رہتا بلکہ کبیرہ بن جاتا ہے۔ اور اگر کبیرہ بھی سرزد ہو جائے تو توبہ و استغفار کرنے سے وہ کبیرہ نہیں رہتا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے معاف فرما دیتا ہے۔

انسان تو گناہگار ہی ہے لیکن رب تعالیٰ "غفار" ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" والذی نفسی بیده لولم تذنبوا لذهب الله بکم ولجاء یقوم یذنبون فیستغفرون الله فیغفرلهم "

(مسلم، مشکوٰة باب التوبة)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ تمہیں لے جاتا، ایک اور قوم کو لے آتا جو گناہ کرتے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرماتا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ انسان کا گناہوں سے معصوم ہونا فرشتوں کی طرح ہمہ وقت نیکیوں میں مشغول ہونا اس نظام دنیا کے ہی مخالف ہے، کیونکہ دنیا کو امتحان گاہ بنایا کہ کون ایمان لاتا ہے اسی طرح کون نیکیاں کرتا ہے اور کون برائیاں پھر برائیوں سے کون توبہ کرتا ہے اور کون برائیوں پر قائم رہتا ہے توبہ کرنے والوں کو رب تعالیٰ معاف فرماتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کو نیک لوگوں کو انعامات دینا پسند ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پسند ہے کہ گناہ گار اس سے معافی طلب کریں تو وہ انہیں معاف فرمائے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" کل بنی آدم خطاء وخیر الخطائین التوابون "

(ترمذی، ابن ماجه، دارمی، مشکوٰة باب الاستغفار والتوبة)

ہر انسان خطاء کار ہے لیکن اچھے لوگ وہ ہیں جو غلطی کے ارتکاب کے بعد توبہ کر لیتے ہیں یعنی انسان ہے ہی بھولنے والا کثیر غلطیاں کرتا رہتا ہے لیکن رب تعالیٰ مغفرت فرمانے والا ہے انسان کا کام ہے غلطیاں کرنا لیکن رب کی طرف رجوع کرنے توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کام ہے اپنے رحمت سے مغفرت فرمانا۔

لیکن انبیائے کرام گناہوں سے پاک ہیں۔ اسی لئے اس حدیث کی شرح میں ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں:

" واما الانبیاء صلوات اللہ علیھم فاما مخصوصون عن ذالک واما انھم اصحاب صغائر والاول اولیٰ"

جو حکم عمومی ذکر کیا ہے کہ ہر انسان خطاء کار ہے اس سے انبیائے کرام خاص ہیں۔ یا بعض لوگوں کا قول ہے کہ انبیاء کرام سے صغائر سرزد ہوتے ہیں۔ لیکن پہلا قول ہی معتبر ہے کیونکہ صحیح محققین کا مسلک یہی ہے کہ انبیاء کرام صغائر سے بھی پاک ہوتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان المؤمن اذا اذنب کانت نکتة سوداء فی قلبه فان تاب واستغفر صقل قلبه وان زاد زادت حتی تعلو قلبه فذلکم الران الذی ذکر اللہ تعالیٰ ﴿ کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون﴾ " (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجه، مشکواة باب الاستغفار والتوبة)

بے شک مومن جب گناہ کرتا ہے اس کے دل میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتا ہے اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ اگر وہ گناہ زیادہ کرنے شروع کر دے تو اس کے دل کی سیاہی زیادہ ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ تمام دل پر چھا جاتی ہے۔ یہ ان کے دلوں پر زنگ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (پ۳۰)

نہیں نہیں درحقیقت زنگ چڑھ گیا ہے ان کے دلوں پر ان کے کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔

حدیث شریف سے واضح ہو رہا ہے کہ جس طرح نیک اعمال سے دلوں میں نورانیت پیدا ہوتی

ہے۔ان کے دل کا آئینہ صاف وشفاف ہوتا ہے اسی طرح گناہوں سے دل سیاہ ہو جاتا ہے نورانیت و چمک، دمک ختم ہو جاتی ہے۔دل زنگ آلود ہو جاتا ہے۔جس طرح لوہے کے زنگ صقل (نکل) سے دور کیا جاتا ہے اسی طرح دل کے زنگ کو توبہ سے دور کیا جاتا ہے۔

ایک شخص کی توبہ کا عجیب واقعہ:

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں میں سے ایک شخص نے ننانوے قتل کئے، پھر علاقہ میں جو شخص بڑا عالم تھا اس سے سوال کیا (کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے) اس نے ایک راہب کی راہنمائی کی، وہ شخص اس کے پاس آیا، اسے بتایا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں کیا میری توبہ بھی قبول ہو سکتی ہے۔راہب نے کہا نہیں۔اس نے راہب کو بھی قتل کر دیا۔ اسی طرح اس نے سو قتل مکمل کر لئے۔پھر علاقہ کے کسی بڑے عالم سے سوال کیا۔اس نے اس کی ایک اور عالم کی راہنمائی کی کہ اس سے سوال کرو، اس عالم کے پاس آ کر اس شخص نے بتایا کہ میں نے سو قتل کئے کیا میری توبہ بھی قبول ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا ہاں ...... یقیناً توبہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا...... کون سی چیز ہے جو تمہارے اور توبہ کے درمیان حائل ہے؟...... جو توبہ قبول نہ ہونے دے...... تم فلاں جگہ چلے جاؤ وہاں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں۔تم بھی ان کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اپنی زمین (اپنے علاقہ) کی طرف لوٹ کر نہ آنا۔کیونکہ یہ برائیوں والی زمین ہے۔

وہ شخص چل پڑا...... جہاں عبادت گذار لوگوں کے پاس جانا تھا اس کا...... ابھی نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ وہ فوت ہو گیا۔تو اب رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے اس شخص کے بارے میں جھگڑا کرنے لگے۔رحمت کے فرشتے کہنے لگے...... اس کی روح ہم لے کر جائیں گے...... کیونکہ یہ سچے دل سے توبہ کی غرض سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھا...... اس لئے اتنے دور سے نیک لوگوں کے پاس جا رہا تھا...... عذاب کے فرشتے کہنے لگے...... اس کی روح ہم لے کر جائیں...... اس نے کوئی نیک کام آج تک کیا ہی نہیں۔اتنے میں ایک اور فرشتہ انسانی شکل میں آ گیا۔ان فرشتوں نے یہ معاملہ اپنے جھگڑے کا اس کے سامنے پیش کیا۔اس نے کہا کہ دونوں طرف کی زمین کو ناپ لو جس طرف کی زمین تھوڑی ہے یہ شخص ان کے لئے ہی ہوگا۔یعنی اگر وہ زمین قریب ہے جس میں نیک لوگ عبادت کر

رہے ہیں تو یہ نیک لوگوں کا ساتھی متصور ہوگا ؛ کیونکہ یہ زیادہ فاصلہ طے کر چکا تھا تھوڑا باقی رہ گیا تھا۔ اور اگر وہ زمین جو گناہوں والی ہے جہاں سے یہ آ رہا تھا تو ابھی گناہگار ہی متصور ہوگا کیونکہ ابھی اس نے تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا اور زیادہ باقی رہتا تھا) جب انہوں نے زمین کو ناپا تو وہ زمین قریب تھی جہاں جا رہا تھا۔ تو اس طرح اس کی روح کو ملائکہ رحمت نے لے لیا۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت حسنؒ نے ہمیں بتایا کہ جب اس شخص پر موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے سینہ کو اٹھایا۔ (یعنی صرف سینہ کا اس سرزمین کی طرف ہونا ہی اس کی بخشش کا سبب بنا)۔

حدیث پاک سے حاصل ہونیوالے فوائد:

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ رب کتنا ہی رحیم ہے انسان جب اپنے جرائم پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دامن میں لے کر اسے معاف فرما دیتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتا یہ کتنا بڑا مجرم ہے۔

☆ یہ واقع پہلی امتوں کا ہے۔ ہماری شریعت میں ارادۃً قتل کرنے سے توبہ کے ساتھ ساتھ مقتول کے ورثاء کا معاف کرنا بھی ضروری ہے۔ قتل کے اقسام واحکام کی تفصیلی بحث گذر چکی ہے

☆ عابد سے عالم بہتر ہے، کیونکہ پہلے وہ شخص راہب کے پاس گیا جو عبادت گذار تو تھا لیکن صاحب علم نہیں تھا اس لئے وہ اسکی صحیح راہنمائی نہ کر سکا اور خود بھی قتل ہو گیا۔ پھر وہ شخص دوسری مرتبہ ایک عالم کے پاس گیا جس نے اس کی بہتر طریقہ سے راہنمائی کی تو وہ توبہ کی غرض سے جا رہا تھا، باوجود منزل مقصود تک نہ پہنچنے کے وہ بخشا گیا۔ یہ عالم باعمل کی نیک اور درست راہنمائی کا ہی نتیجہ تھا

حضرت ابن عباد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" فقيه واحد اشد على الشيطان من الف عابد " (ترمذی ، ابن ماجہ ، مشکوٰۃ کتاب العلم)

ایک عالم فقیہ بنسبت ہزار عابد کے شیطان پر غالب ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ عابد فقط اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہوتا ہے اور عالم باعمل اپنے آپ کو بچانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی بچانے کی سعی کرتا ہے۔

☆ انسان جب نیکی کا پختہ ارادہ کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر بھی ثواب مرتب کرتا ہے، جس طرح یہ

شخص اپنی منزل مقصود تک نہ پہنچ سکا، لیکن نیکی کے ارادہ اور توبہ کی غرض سے جارہا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا، نیکی کے پختہ ارادہ پر ثواب مرتب فرمادیا۔

☆ جس سرزمین پر برائیاں ہو رہی ہوں، اسے چھوڑ دینا چاہئے، کسی دوسری جگہ انسان کو چلا جانا چاہئے تاکہ برائیوں کی نحوست سے بچ سکے۔

☆ نیک لوگوں کی محفل میں بیٹھنے سے ان کی نیکیوں کے اثرات حاصل ہوتے ہیں انسان دیکھ کر ان کی نیکیوں جیسی نیکیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے قرب کی وجہ سے اس کو بھی نیک بنادیتا ہے اور توبہ کی توفیق فرمادیتا ہے۔

فائدہ: سوال کرنے سے کسی کے علم کی نفی نہیں ہوتی۔ سوال کرنے میں کئی حکمتیں ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے سوال کیا: تونے ایسا کیوں کیا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ اس طرح نبی کریم ﷺ نے کئی مواقع پر جاننے کے باوجود سوال فرمائے۔ اس سے آپ کے علم کی نفی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی بخشش اس لئے فرمادی کہ وہ حقیقتاً سچا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا خوف اسے دامن گیر تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے جاہل تھا۔ جو عیب تو ہے مگر جرم نہیں۔ اور اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ مسلمان کو جلانا حرام ہے۔ تو پھر اسے جائز سمجھ کر اس قسم کی وصیت کرے (مجھے جلادینا وغیرہ) تو کافر ہو جائے گا۔

موت کے یقین ہونے سے پہلے توبہ کرے:

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ان الله يقبل توبة العبد مالم يغرر"

(ترمذی، ابن ماجه، مشكوٰة، باب الاستغفار والتوبة)

بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک اس کی جان حلقوم میں نہ آجائے یعنی جب موت کا یقین نہ ہو تو توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا۔ اگر موت کا یقین آجائے تو توبہ قبول نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی متعلق اس طرح ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ

تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ﴾

اور وہ توبہ ان کی نہیں جو گناہوں میں لگے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں کسی کو موت آئے تو کہے اب میں نے توبہ کی اور نہ ان کی (توبہ) جو کافر مرے۔ یعنی جو لوگ ساری زندگی گناہوں میں گذار دیتے ہیں، اپنی نادانی، بے وقوفی کی وجہ سے توبہ نہیں کرتے، زندگی میں تو عیش وعشرت، طرب و نشاط نے انہیں گناہ میں مبتلاء رکھا، ہر قسم کے فسق و فجور میں ملوث رہے، لیکن جب موت کا وقت آ گیا پھر کہنے لگے ہائے میری توبہ، اللہ مجھے معاف فرما۔ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرنے کا اللہ تعالیٰ کا وعدہ نہیں، البتہ اس کی مرضی ہو تو معاف فرمادے تو اس کی مہربانی۔

موت کا یقین ہونے پر جان کا حلقوم میں آ جانے پر کافر کی توبہ تو قبول نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرعون کے متعلق ذکر فرمایا:

﴿ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ☆ آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ☆ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴾ (پ ۱۱ ع ۱۴)

اور ہم بنی اسرائیل کو دریا پار لے گئے تو فرعون اور اس کے لشکروں نے ان کا پیچھا کیا سرکشی اور ظلم سے یہاں تک کہ جب اسے ڈوبنے نے آ لیا بولا میں ایمان لایا کہ کوئی سچا معبود نہیں سوا اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمان ہوں۔ کیا اب (تو ایمان لاتا ہے، توبہ کرتا ہے) اور پہلے سے نافرمان رہا اور تو فسادی تھا، آج ہم تیری لاش کو اتار دیں گے کہ تو اپنے پچھلوں کے لئے نشانی ہو اور بے شک لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہیں۔

یہاں سے واضح ہوا کہ موت کے یقین آنے پر فرعون کو ایمان لانا فائدہ نہ پہنچا سکا۔ اس کی توبہ اس حال میں قبول نہیں ہوئی، حلقوم میں جان آنے پر کافر کی توبہ کا قبول نہ ہونا واضح ہوا۔

مومن اس وقت توبہ کرے جب اسے موت کا یقین ہو جائے تو اس کی توبہ کو ضرور قبول کرنے کا اللہ تعالیٰ نے کوئی وعدہ نہیں فرمایا، البتہ اس کی مرضی پر موقوف ہے، چاہے تو قبول فرمائے چاہے تو نہ قبول فرمائے۔

اہل علم نے یہ قید اس لئے لگائی ہے کہ ابھی جس آیۃ کریمہ اور حدیث شریف کو ذکر کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ موت کے وقت بالکل توبہ قبول ہی نہیں لیکن دوسری حدیث سے روح المعانی نے نقل فرمائی اس سے پتہ چلتا ہے کہ جان حلقوم میں بھی ہو تو پھر بھی توبہ کا وقت ہے۔ تو اس طرح ان میں تطبیق ہو جائے گی کہ قبول کرنے کا تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا، ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾

اور توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے فضل سے لازم کرلیا ہے وہ انہیں کی ہے جو نادانی سے برائی کر بیٹھیں پھر تھوڑی دیر میں توبہ کرلیں۔ ایسوں پر اللہ اپنی رحمت سے رجوع کرتا ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔

وہ حدیث جو روح المعانی نے نقل فرمائی جس سے پتہ چلتا ہے کہ حلقوم میں جان آنے پر توبہ کی جائے، اس کا ترجمہ یہ ہے۔

"رسول اللہ ﷺ نے ایک اپنے خطبہ کے آخر میں ارشاد فرمایا جو شخص اپنی موت سے پہلے ایک سال توبہ کرلے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا، پھر فرمایا جس شخص نے موت سے ایک مہینہ پہلے توبہ کرلی اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا، پھر ارشاد فرمایا جس شخص نے اپنی موت سے ایک دن پہلے توبہ کی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا، پھر فرمایا دن بھی بہت ہے جو موت سے ایک گھڑی پہلے توبہ کرے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا، پھر فرمایا، گھڑی بھی بہت ہے۔ یہ فرما کر اپنے حلق مبارک کی طرف اپنے ہاتھ مبارک سے اشارہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص جان کے یہاں تک آنے پر بھی توبہ کرے تو قبول ہے"

ان آیات اور احادیث میں تطبیق اسی طرح ممکن ہے جیسے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مومن موت کے یقین سے پہلے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا وعدہ فرمالیا، اس کی قبولیت کا یقین ہے، اور اگر موت کے وقت توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ چاہے تو قبول فرمائے اور چاہے تو نہ قبول فرمائے، لہٰذا انسان کو چاہئے کہ اپنے جرائم پر قائم رہنے کے بجائے معافی طلب کرے، تاخیر نہ کرے بلکہ جلدی کرے دیر سے یعنی موت کے وقت پر توبہ کی قبولیت پر یقین نہ رکھے۔

نیک انسان بھی توبہ واستغفار کرتا رہے:

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" واللہ انی لاستغفر اللہ واتوب الیه فی الیوم اکثر من سبعین مرة

(بخاری ، مشکوٰۃ باب الاستغفار و التوبة)

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں ہر دن ستر مرتبہ سے زیادہ توبہ واستغفار کرتا ہوں۔

حدیث شریف میں جو ستر مرتبہ ذکر ہے اس سے مراد کثرت ہے کہ میں بہت ہی زیادہ توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ کیونکہ دوسری حدیث میں سو مرتبہ استغفار کا ذکر ہے۔

حضرت ابن الملکؒ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی توبہ واستغفار " لیس لذنب لانه معصوم " کسی گناہ کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی کیونکہ آپ تو معصوم ہیں۔ آپ یہ خیال کر کے توبہ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ذوالجلال والاکرام ہے اس کے حضور کھڑے ہو کر میں اس کی عبادت اور عجز و انکساری میں کہیں کوتاہی نہ کر دیتا ہوں یہ خیال کر کے اپنے عجز کا اظہار کرنے کے لئے توبہ فرماتے تھے سبحان اللہ ! کیا ہی شان ہے رب تعالیٰ کی بلند شانوں والے بھی کہتے ہیں " ماعرفناك حق معرفتک وما عبدناك حق عبادتک " ہم نے تجھے ایسے نہیں پہچانا جیسے پہچاننے کا حق ہے اور ہم نے تیری ایسی عبادت نہیں کی جیسے عبادت کرنے کا حق ہے۔

نبی کریم ﷺ کے توبہ کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی:

" وحث لامته علی التوبة والاستغفار فانه ﷺ مع كونه معصوما وكونه خير المخلوقات اذا استغفر و تاب الی ربه فی كل يوم اكثر من سبعين مرة فكيف بالمذنبين "

اور آپ نے تعلیم امت کے لئے توبہ فرمائی، امت کو اس پر برانگیختہ کرنا تھا کہ جب آپ ﷺ باوجود معصوم ہونے اور تمام مخلوقات سے اعلیٰ ہونے کے باوجود ہر دن میں ستر مرتبہ سے زائد توبہ واستغفار فرماتے ہیں تو گناہگاروں کا کیا حال ہوگا ؟ کہ وہ توبہ واستغفار نہ کریں۔ (ماخوذ از مرقاۃ المفاتیح)

جب نبی کریم ﷺ سے شان کے لحاظ پر کوئی بلند و بالا نہیں ہو سکتا تو کوئی شخص اپنی نمازوں صدقات و خیرات اور نیکیوں پر ناز نہ کرے بلکہ ہر حال میں اپنے آپ کو عاجز سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں کی معافی طلب کرتا رہے، اس سے مدارج بلند ہوں گے۔

کسی مسلمان کے متعلق نہ کہو کہ اس کی بخشش نہیں ہوگی:

حضرت جندبؓ سے مروی ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا:

" ان رجلا قال واللہ لایغفر اللہ لفلان وان اللہ تعالیٰ قال من ذا الذی یتألی علی انی لا اغفر لفلان فانی غفرت لفلان واحبطت عملک " (او کما قال)

(مسلم، مشکوۃ باب الاستغفار والتوبۃ)

ایک شخص نے کہا کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی فلاں شخص کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا۔ (اللہ تعالیٰ کے دربار میں جب پہنچے) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تجھے کس نے کہا تھا؟ کہ تم قسم اٹھاؤ کہ میں فلاں کی مغفرت نہیں کروں گا۔ بے شک میں نے فلاں کی مغفرت کردی اور تمہارے عمل کو ضائع کردیا، (او کما قال ﷺ).

حدیث پاک سے معلوم ہوا:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے آنے والے حالات کو اپنی زندگی مطہرہ میں دیکھ کر بیان فرمادیا۔ یہ مکالمہ قیامت کو ہوگا لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ اور اس کے بندے میں گویا کہ یہ بات چیت ہوچکی ہے۔

(۲) انسان کسی کی برائیوں کو زیادہ سمجھ کر اور اپنی نیکیوں پر ناز کرتے ہوئے تکبرانہ انداز سے یہ نہ کہے کہ فلاں کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا۔

(۳) اللہ تعالیٰ اس شخص کو جھوٹی قسم کی سزا دینے کے لئے اور اسے ذلیل کرنے کے لئے اس دوسرے شخص کو بخش دے گا اور اس کے اعمال کو ضائع کردے گا، اعمال کے ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سزا ان پر غالب آجائے گی جب عذاب میں مبتلاء ہوگا [تو گویا کہ اس کے نیک اعمال نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔

یہ خیال رہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ گستاخ رسول ﷺ کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا۔ صحابہ کرام، اہل بیت اطہار کی شان میں گستاخیاں کرنے والوں کو کبھی بھی اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا، شرک کرنے والوں کو، کفر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ اس طرح کہنا جائز ہوگا؛ کیونکہ یہ سب کافر ہیں، یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو نہیں بخشے گا۔

﴿ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ☆ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

(۱) ''ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اتر جاؤ، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا اسے نہ کوئی اندیشہ نہ کچھ غم، اور وہ جو کفر کریں اور میری آیتیں جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ان کو ہمیشہ اس میں رہنا''

(۲) ''ہم نے کہا اترنے کے بعد جو تم سب زمین میں ہی رہو پھر اگر آ جائے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت تو جس نے میری ہدایت کی تابعداری کی اسے نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی ان کو کوئی غم ہوگا ☆ اور جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو وہ لوگ آگ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گی''۔

تفصیلی وضاحت :

پہلے بیان کئے ہوئے مضامین جب ذہن میں ہوں گے تو مختصر وضاحت تو صرف ترجمہ سے ہی حاصل ہو جائے گی اس لئے تفصیلی وضاحت کو ذکر کیا جا رہا ہے ﴿ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ﴾ کہنے کا مطلب کیا ہے جب کہ یہی حکم پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں مفسرین کرام کے کئی اقوال ہیں۔ جن کو ذکر کیا جاتا ہے تا کہ سمجھنے میں کوئی مشکل در پیش نہ آئے:

'' كرر الامر بالهبوط ايذانا بتحتم مقتضاه وتحققه لا محالة ''

''دو مرتبہ جنت سے اترنے کا حکم دیا گیا تا کہ آدم علیہ السلام کو معلوم ہو جائے کہ یہ حکم یقینی ہے اور اس نے واقع ہونا ہی ہے'' (ابو سعود)

کیونکہ ممکن تھا کہ آدم علیہ السلام کے دل میں خیال آتا کہ ہو سکتا ہے کہ جنت سے اتر جانے سے پہلے ہی توبہ قبول ہو جائے اور اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی فرما دے۔ البتہ پھر یہ خیال کیا جائے کہ یہ تکرار کیوں

پایا گیا ہے۔اس میں ایک قول یہ ہے کہ یہ تاکید کیلئے ہے " كما تقول لرجل قم قم " جیسا کہ تو کسی کو کہے اٹھ جا، اٹھ جا۔اس صورت میں صرف لفظی تکرار ہوگا معنی میں تکرار نہیں ہوگا۔ (قرطبی)

دوسرا قول یہ ہے کہ لفظی اور معنوی لحاظ پر تکرار ہے کیونکہ پہلا حکم علیحدہ قیود سے مقید ہے اور دوسرا حکم علیحدہ قیود سے مقید ہے:

" فان الاول دل على ان هبوطهم إلى دار بلية يتعادون فيها ولا يخلدون والثانی اشعر بانهم للتكليف فمن اهتدى الهدى نجا ومن ضله هلک " (بیضاوی)

دونوں حکم ہی جنت سے اترنے سے پہلے آگے پیچھے دیئے گئے پہلے حکم میں یہ بتایا گیا کہ تم سب جنت سے اتر جاؤ اس مقام کی طرف جو آزمائش کا مقام ہے (یعنی زمین پر چلے جاؤ) وہاں تم ایک دوسرے سے دشمنی کرو گے یعنی آدم علیہ السلام کو کہا تمہاری اولاد بعض بعض کی دشمن ہوگی۔اور تم نے وہاں بھی ہمیشہ نہیں رہنا بلکہ ایک وقت مقررہ تک تم نے زمین میں نفع حاصل کرنا ہے پھر تم پر موت نے آجانا ہے۔

اور دوسرا حکم دیتے وقت یہ بتا دیا گیا کہ زمین میں جو تمہیں اترنے کا حکم دیا گیا ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ زمین ہی دار تکلیف ہے۔جب تمہارے پاس ہدایت آجائے جو اسے قبول کرے اور اس پر قائم رہے وہ نجات پا جائے گا۔اور جس نے اس ہدایت پر عمل نہ کیا اور بھٹک گیا وہ ہلاک ہو جائے گا۔

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ان اقوال کے مطابق ہی ہے کہ دونوں حکم جنت سے اتر جانے کے متعلق ہیں (دونوں حکموں میں تاکید ہو، یا علیحدہ علیحدہ قیود کا اعتبار ہو)

تنبیہ: اگرچہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ تحریر فرمایا ہے:

" والتنبيه على ان مخافة الاهباط والمقترن باحدهذين الامرين كافية للحازم ان تعوقه عن مخالفة حكم الله تعالىٰ فكيف بالمقترن بهما ولكنه نسى ولم تجد له عزما "

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتر جانے کا جو حکم دیا اسے دو قسم کے امور سے ملایا ایک یہ کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تم نے زمین میں ہمیشہ نہیں رہنا اور دوسرا حکم یہ ہے کہ زمین ہی دار تکلیف ہے اس پر جزاء مرتب ہونی ہے۔ان دونوں قسم کے امور میں سے ایک ہی یقین کر لینے کے لئے کافی ہے کہ

اللہ تعالیٰ کے حکم سے لغزش نہ واقع ہو۔لیکن جب اترنے کے حکم کو دونوں قسم کے امور سے ملا کر ذکر کر دیا گیا تو پھر آپ سے لغزش کیسے واقع ہوئی۔تو اس کا جواب قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے دیا کہ آپ بھول گئے۔

لیکن راقم کے خیال میں اس تنبیہ کو ذکر کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ بھول پہلے واقع ہوئی اور جنت سے اترنے کا حکم دو قسم کے امور سے ملا کر بعد میں دیا۔ہاں البتہ بعد میں جو قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے اسے اس حکم پر مرتب کرنا صحیح ہے:

" وان کل واحد منهما کفی به نکالا لمن اراد ان یذکر "

آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے اس کے لئے ایک حکم کے ساتھ ذکر ہونیوالی قیود ہی نصیحت دینے کے لئے کافی ہیں۔لیکن جو دونوں حکم علیحدہ علیحدہ قیود سے مقید ہیں تو یقیناً یہ ارشادات الاھیہ بہت عظیم نصیحت آموز ہیں۔

☆ اور قول یہ ہے " الاول من الجنة الی سماء الدنیا والثانی منها الی الارض " کہ یہ دونوں حکم ہی علیحدہ علیحدہ ہیں۔پہلا حکم جنت سے آسمان دنیا کی طرف اتر جانے کا ہے اور دوسرا حکم آسمان دنیا سے زمین پر اترنے کا ہے۔ (بیضاوی)

لیکن اس معنی کے متعلق خازن میں یہ ذکر کیا گیا ہے " وفیه ضعف " اس معنی میں ضعف پایا گیا ہے۔

☆ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوسری مرتبہ جو " اهبطوا " فرمایا گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو لغزش کی وجہ سے جنت سے اترنے کا حکم دے دیا گیا آپ نے رب تعالیٰ کی طرف سے کلمات سیکھ لئے۔آپ کی توبہ کو قبول کر لیا گیا:

" ووقع فی قلبهما ان الامر بالهبوط لما کان بسبب الزلة فبعد التوبة وجب ان لا یبقی الامر بالهبوط فاعاد الله تعالیٰ الامر بالهبوط مرة ثانیة لعلما ان الامر بالهبوط ما کان جزاء علی ارتکاب الزلة حتی یزول بزوالها بل الامر بالهبوط باق بعد التوبة لان الامر به کان تحقیقا للوعد المتقدم فی قوله (انی جاعل فی الارض خلیفة) " (کبیر)

تو ان دونوں کے دل میں یہ بات آئی کہ ہمیں جنت سے اترنے کا حکم ہماری لغزش کی وجہ سے دیا

گیا تھا توبہ کے بعد ضروری ہو گیا کہ ہمیں "ھبوط" کا حکم نہیں دیا جائے گا۔ رب تعالیٰ نے "ھبوط" کے حکم کو دوبارہ لوٹایا۔ تاکہ ان کو معلوم ہو جائے گا جنت سے اترنے کا حکم درحقیقت لغزش کی وجہ سے نہیں تھا (یہ تو ظاہر طور پر تھا) کہ توبہ قبول کرنے کے بعد یہ حکم ختم ہو گیا بلکہ توبہ کے بعد بھی یہ حکم برقرار رہے گا، کیونکہ میں نے تمہاری پیدائش سے پہلے ہی کہہ دیا تھا:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ ''میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں''

میری مشیت کا تقاضا ہی تمہیں زمین میں آباد کرنا اور تم سے جمال محمدی کو ظاہر کرنا ہے۔ لیکن خیال رہے کہ اس قول کے مطابق "ھبوط" کا معنی اترنا نہیں۔ بلکہ تبصیر الرحمٰن سے اس معنی کو دیکھئے

"(قُلْنَا اهْبِطُوْا) ای استقروا بمکان الھبوط (منھا) ای من اثر تلک المعصیة" (تبصیر الرحمن)

ہم نے کہا جہاں تمہیں اتارا وہیں قائم رہو اب "منھا" کا مطلب یہ ہوگا کہ لغزش کے اثر سے جہاں تمہیں اتارا وہیں قرار پکڑو۔

راقم نے یہی معنی تحریر کیا ہے تاکہ یہ بحث بھی طلباء کرام کو ذہن نشین ہو جائے۔

مقام توجہ: ابھی جو بحث کی اس سے یہ پتہ چلا کہ آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارنا تقاضا و حکمت کے مطابق تھا تو اسی سے معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع صاحب کے ان الفاظ (اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے میں غالباً حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین پر اتارنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا) پر علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے گرفت کی ہے کہ سزا کے طور پر اتارنے کا مقصد ہی نہیں لہٰذا یہ جملے غلط ہیں

﴿جَمِیْعًا﴾: "حال من فاعل اھبطوا الی مجتمعین" (شیخ زادہ) پہلے معانی کے لحاظ پر معنی یہ ہوگا تم سب مجتمع ہو کر اتر جاؤ کیونکہ "جمیعا" "اھبطوا" کے فاعل سے حال واقع ہے جو "مجتمعین" کے معنی میں ہے۔ یہ حکم بھی آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو ہے کہ تم دونوں اپنی اولاد کے ساتھ (جس نے زمین میں پیدا ہونا ہے) زمین پر اتر جاؤ۔ اور اگر "ھبوط" کا معنی تفسیر تبصیر الرحمٰن کے مطابق کیا جائے تو معنی ہوگا، اس سے اترنے کے بعد زمین میں ہی سب مجتمع ہو کر قرار پکڑے رہو۔

﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی﴾: یعنی جب ہدایت کا آنا تمہارے لئے متحقق ہو جائے۔

تو دلائل عقلیہ اور معجزات قولیہ اور فعلیہ کے ذریعے معلوم ہو جائے کہ یہ ہدایت میری طرف سے ہی ہے

﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ ﴾: جس شخص نے میری ہدایت کی تابعداری کی کہ یہ ہدایت تو رب تعالیٰ سے ہی حاصل ہے یہ ہدایت کسی گمراہ کرنے والے کی طرف سے تو کبھی نہیں آسکتی۔ (از تبصیر الرحمن)

﴿ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾: " تو ان کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی ان کو غم حاصل ہوگا"۔

خوف وحزن میں فرق:

" زوال الخوف يتضمن السلامة من جميع الآفات وزوال الحزن يقتضي الوصول الى كل اللذات والمرادات "۔ (کبیر)

خوف کہتے ہیں آفات وبلیات کے آنے کا جو ڈر لاحق ہو جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ﴾ ان پر کوئی خوف نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام آفات وبلیات سے محفوظ رہیں گے۔ اور حزن اس غم کو کہا جاتا ہے جو لذت وذوق والی چیز کے زوال کی فکر سے ہو۔ اور جب رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ اور ان کو کوئی حزن نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو کسی قسم کی لذت والی چیز اور ان کی مراد کے زوال کا غم نہیں ہوگا۔

" فلا خوف عليهم فضلا عن ان يحل بهم مكروه ولا هم ممن يفوت عنهم محبوب فيحزنوا عليه " (بیضاوی)

ان کی شان کے یہ لائق ہی نہیں کہ وہ کسی مکروہ چیز کے لاحق ہونے کا خوف کریں۔ کوئی مکروہ چیز ان پر واقع ہو جائے یہ تو دور کی بات ہے۔

خیال رہے کہ اس مکروہ سے مراد عذاب ہے۔ دنیاوی تکالیف نہیں، دنیاوی تکالیف اللہ تعالیٰ کے محبوب کو زیادہ حاصل ہوتی ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" خص البلاء بالانبياء ثم الاولياء ثم الامثل ثم الامثل "

" مصیبتیں انبیاء کرام پر زیادہ آتی ہیں پھر اولیاء کرام پھر اسی طرح درجہ بدرجہ "

حزن یہ ہے کہ ان کو کسی محبوب چیز کے فوت ہونے (ضائع ہونے) کا غم ہوتا ہے۔ یعنی ہدایت

کے آنے پر وہ اس کی تابعداری کرتے ہیں۔ طاعات اور عبادات واجبہ اور مستحبہ جوان کو محبوب ہوتی ہیں۔ ان کے چھوٹ جانے کا ان کو حزن نہیں ہوتا۔ (از شیخ زادہ)

فائدہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے جب عصا زمین پر ڈال دینے کا حکم دیا تو آپ نے عصا کو ڈالا وہ سانپ بن گیا۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ﴾ اس کو پکڑ لیں اور خوف نہ کریں (یہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکے گا بلکہ پکڑنے پر پھر پہلی حالت میں عصا بن جائے گا) اور جب نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غار ثور میں تھے۔ تو مشرکین آپ کی تلاش میں وہاں پہنچ گئے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ مشرکین تو غار کے منہ پر پہنچ گئے ہیں اگر وہ اپنے قدموں کی طرف بھی دیکھیں تو ہمیں دیکھ لیں گے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو چونکہ خوف یہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں یہ لوگ میرے محبوب ﷺ کو شہید نہ کر دیں۔ آپ کے اسی غم کو دور کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے جو ارشاد فرمایا رب تعالیٰ نے اس کی حکایت بیان فرماتے ہوئے ذکر کیا:

﴿ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ اور تم غم نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے

اگر آپ کو اپنی فکر ہوتی تو " ولا تخف " کہا جاتا۔ (راقم)

خوف وحزن میں اور فرق یہ ہے:

" فالخوف علی المتوقع والحزن علی الواقع " (بیضاوی)

خوف کا تعلق مستقبل سے ہے۔ اور حزن کا تعلق حال سے ہے۔ اگرچہ معانی وہی ہیں جو بیان کئے جا چکے ہیں۔ خوف اور حزن کی نفی کر کے کامل طور پر مؤکد طریقہ سے ان سے عذاب کی نفی کی گئی اور ثواب ان کے لئے ثابت کیا گیا۔

فائدہ: رب تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ ﴾ اس سے مراد ہر دلالت اور ہر بیان جسے عقل کہے کہ یہی راستہ سیدھا ہے۔ اور اسی طرح نبی پر نازل ہونے والا کلام جس میں ہدایت پائی جائے۔ جو شخص ہدایت کی تابعداری کرے گا یعنی اسے قبول کرے اور اس پر قائم رہے گا اس پر کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ یعنی اسے جہنم کے عذاب سے بچایا جائے گا، اور جنت کی نعمتیں عطاء کی جائیں گی۔

" وفیہ تنبیہ علی عظم نعمۃ اللہ تعالیٰ علی آدم و حواء فکانہ قال وان احبتکم من الجنۃ الی الارض فقد انعمت علیکم بما یؤدیکم مرۃ اخری الی الجنۃ مع الدوام الذی لا ینقطع "

رب تعالیٰ نے اپنے اسی کلام سے اس پر متنبہ کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے یوں فرمایا اگرچہ میں نے تمہیں جنت سے زمین پر اتارا ہے تحقیق میں نے تم پر یہ انعام کیا ہے کہ تمہیں یہ حکم دیا ہے جب میری طرف سے ہدایت آ جائے تو اس کی تابعداری کرنا تا کہ تمہیں دوبارہ پھر جنت میں پہنچا دیا جائے، اب جب جنت میں آ ؤ گے تو ہمیشہ کے لئے رہو گے۔ (از کبیر)

عدم خوف کو عدم حزن پر مقدم کرنے کی وجہ:

ان پر خوف نہیں ہوگا اسے پہلے ذکر کیا اوران کو غم نہیں ہوگا اسے بعد میں ذکر کیا اس کی وجہ یہ ہے " لان زوال ما لا ینبغی مقدم علی طلب ما ینبغی " کہ غیر مناسب چیزوں کا زوال پہلے پایا جاتا ہے پھر مناسب چیزوں کی طلب پائی جاتی ہے۔

﴿ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ﴾ ان مختصر الفاظ مبارکہ سے یہ مطلب حاصل ہوا:

" ان المکلف الذی اطاع اللہ تعالیٰ لا یلحقہ خوف فی القبر ولا عند البعث ولا عند حضور الموقف ولا عند تطایر الکتب ولا عند نصب الموازین ولا عند الصراط کما قال اللہ تعالیٰ لا یحزنھم الفزع الاکبر وتتلقاھم الملئکۃ ھذا یومکم الذی کنتم توعدون "

بیشک مکلف جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے تو اسے قبر کا خوف نہیں ہوگا، قیامت میں اٹھنے وقت خوف نہیں ہوگا۔ حساب وکتاب کی انتظار میں کھڑے ہوتے وقت خوف نہیں ہوگا، نامہ اعمال کھولتے وقت اسے خوف نہیں ہوگا اور میزان قائم کرتے وقت اسے خوف نہیں ہوگا صراط کے وقت اسے کوئی خوف نہیں ہوگا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' انہیں غم میں نہیں ڈالے گی وہ بڑی گھبراہٹ اور فرشتے ان کی

پیشوائی کو آئیں گے کہ یہ ہے تمہارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ تھا''

(از کبیر)

فائدہ: ﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا:

" ان الهدى قد ثبت و لا اهتداء "

کہ بعض اوقات ہدایت پائی جاتی لیکن اسے قبول نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے وہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا ''جس نے میری ہدایت کی تابعداری کی'' اسے ہی خوف اور غم نہیں۔ اور فائدہ یہ حاصل ہوا:

" ان باتباع الهدى تستحق الجنة "

کہ بیشک انسان ہدایت کی تابعداری کر کے جنت کا مستحق بن جاتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

اہل سنت و جماعت حنفی مسلک کا عقیدہ یہ ہے کہ اصول میں تقلید نہیں بلکہ فروع میں تقلید ہے علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی کئی مقامات میں اصول میں تقلید کی نفی کی لیکن غیر مقلدین جہلاء کو کبیر کی عبارت دکھا کر گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی مقام پر علامہ رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" ابطال التقليد لان المقلد لا يكون متبعا للهدى "

آپ کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ ﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ ﴾ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تقلید باطل ہے کیونکہ ہدایت میں تقلید کرنے والا ہدایت کی تابعداری کرنے والا نہیں۔

مسئلہ واضح ہے کہ ہدایت کی تابعداری عقائد سے تعلق رکھتی ہے اور عقائد میں تقلید نہیں۔ اس عبارت سے کوئی شخص مغالطہ ڈالنے کی کوشش کرے تو اس سے ہوشیار رہیں۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

☆ ''جب اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تابعداری کرنے والوں سے وعدہ فرمایا کہ وہ عذاب اور حزن سے امن میں رہیں گے''۔

☆ ''تو اسکے بعد ذکر فرمایا جو لوگ کفر کریں گی اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ جہنم کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے اور وہ اسمیں ہمیشہ رہیں''۔

یہ عذاب کافروں کے لئے ہے خواہ وہ انسانوں میں سے کافر ہوں یا جنوں میں سے، ان کو عذاب ہمیشہ کے لئے دیا جاتا ہے اس عذاب میں کسی وقت بھی انقطاع لازم نہیں آتا۔ (از کبیر)

نصیحت آموز کلام: حضرت احمد بن حارث فرماتے ہیں:

'' یا صاحب الذنوب الم یان لک ان تتوب یا صاحب الذنوب ان الذنب في الديوان مكتوب يا صاحب الذنوب انت بها في القبر مكروب يا صاحب الذنوب انت غدا بالذنوب مطلوب ''

''اے گنہگار شخص کیا تیری توبہ کا وقت نہیں آیا، اے گنہگار شخص بیشک تیرے گناہ تیرے نامہ اعمال میں لکھے ہوں گے، اے گنہگار انسان گناہوں کی وجہ سے تجھے قبر میں مصیبت اٹھانی ہے، اے گنہگار انسان کل تجھے گناہوں کی وجہ سے طلب کیا جائے گا'' (کبیر)

انتباہ: '' ان آدم عليه السلام لما لم يستغن عن التوبة مع علو شانه فالواحد اولى بذالك ''

بیشک آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی اور برگزیدہ شان والے ہونے کے باوجود اپنی بھول اور لغزش سے جب توبہ کر رہے ہیں۔ تو اے عام انسان تیرا تو زیادہ حق بنتا ہے کہ تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہے۔ (از کبیر)

آدم علیہ السلام کی توبہ کب قبول ہوئی:

یہ مسئلہ تو اتفاقی ہے کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کلمات سکھائے آپ نے ان کے ذریعے توبہ کی جو قبول کر لی گئی۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ توبہ کب قبول ہوئی تفسیر عزیزی میں یہ ہے کہ آدم

علیہ السلام زمین پر تشریف لا کر دو سو سال تک روتے رہے پھر آپ کی توبہ قبول ہوئی۔ اسی قول کو مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔

لیکن روح البیان میں یہ ہے کہ جنت سے باہر آتے ہی آپ کو اللہ تعالیٰ نے کلمات سکھا دیئے اور آپ کی توبہ کو قبول فرمالیا۔ تاہم آپ کا رونا، گریہ زاری ثابت ہے ہوسکتا ہے وہ توبہ کے قبول کرنے کے بعد ہو کہ آپ لغزش کو یاد کر کے روتے ہوئے ہوں علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے اسی قول کو پسند کیا ہے

(واللہ اعلم بالصواب)

حضرت آدم علیہ السلام کا رونا:

حضرت آدم علیہ السلام جب اپنی لغزش کو یاد کر کے روتے رہے تو اس میں ہمارے لئے تنبیہ ہے کہ ہم زیادہ حق رکھتے ہیں بنسبت حضرت آدم علیہ السلام کے کہ ہم روئیں۔ اس لئے کہ وہ تو اللہ کے نبی ہیں اور ہم گنہگار ہیں۔ جب نیکوکار روتا رہا تو گنہگار کیوں نہ روئے۔

" روی عن رسول اللہ ﷺ انہ قال لو جمع بکاء اھل الدنیا الی بکاء داؤد لکان بکاء داؤد اکثر ولو جمع بکاء اھل الدنیا وبکاء داؤد الی بکاء نوح لکان بکاء نوح اکثر ولو جمع بکاء اھل الدنیا وبکاء داؤد وبکاء نوح علیھما السلام الی بکاء آدم علی خطیئتہ لکان بکاء آدم اکثر "

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تمام دنیا والوں کے رونے کا تقابل داؤد علیہ السلام کے رونے سے کیا جائے تو داؤد علیہ السلام کا رونا زیادہ ہوگا۔ اور اگر تمام دنیا والوں کے رونے اور داؤد علیہ السلام کے رونے کو نوح علیہ السلام کے رونے سے تقابل کیا جائے تو نوح علیہ السلام کا رونا زیادہ ثابت ہوگا، اور اگر تمام دنیا والوں کے رونے اور داؤد علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے رونے کو آدم علیہ السلام کے رونے سے مقابلہ کیا جائے تو آدم علیہ السلام کا رونا زیادہ ثابت ہوگا۔

(کبیر)

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کی ملاقات:

جب دونوں زمین پر تشریف لائے تو حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان کے علاقہ سراندیپ کے پہاڑ پر اترے اور حضرت حوا جدہ میں اتریں۔ توبہ قبول ہونے کے بعد دونوں کی ملاقات عرفات کے

مقام پر ہوئی دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اسی لئے اس میدان کو عرفات کہتے ہیں یعنی پہچاننے کی جگہ۔

جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے آئے تھے تو ان سے عربی زبان بھی لے لی گئی تھی یعنی بھلا دی گئی تھی۔ اتنے روز تک سریانی زبان میں کلام فرمایا توبہ قبول ہونے کے بعد عربی زبان پھر عطا ہوئی۔ پھر حضرت جبرائیل نے تمام عالم کے جانوروں کو آواز دی کہ اے جانورو حق تعالیٰ نے تم پر اپنا خلیفہ بھیجا ہے۔ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو، دریائی جانوروں نے سر اٹھا کر اطاعت ظاہر کی اور خشکی کے جانور آپ کے آس پاس جمع ہو گئے آدم علیہ السلام ان پر ہاتھ پھیرنے لگے جس پر ان کا ہاتھ پہنچ گیا وہ اہل اور خانگی بن گئے۔ جیسے گھوڑا، اونٹ، بکری، کتا، بلی وغیرہ اور جس پر آپ کا ہاتھ نہ پہنچا وہ جنگلی وحشی رہا جیسے ہرن وغیرہ۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے حق میں دعاء:

اس واقعہ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ میری اولاد بہت کمزور ہے اور ابلیس کا فریب بہت سخت ہے۔ اے اللہ اگر تو ان کی امداد نہیں کرے گا تو وہ شیطان کے فریب سے بچ نہیں سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم آپکے پاس آیا اے آدم تمہارے اور احکام تھے اور آپ کی اولاد کے احکام اور ہوں گے ہم ہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ رکھیں گے۔ آپ نے یہ سن کر خوش ہو کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ (از عزیزی)

آدم علیہ السلام کی اولاد:

حضرت حوا بیس یا چالیس مرتبہ حاملہ ہوئیں ہر حمل میں دو دو بچے پیدا ہوئے ایک مذکر اور ایک مؤنث ایک حمل کے بچوں کا دوسرے حمل کے بچوں کا ایسا حکم تھا جیسا کہ مختلف ماں باپ کے بچوں کا ہوتا ہے یعنی پہلے حمل کے بچے کا دوسرے حمل کی بچی سے نکاح ہوتا، اسی طرح دوسرے حمل کے لڑکے کا پہلے حمل کی لڑکی سے نکاح ہوتا۔ (صاوی زیر آیۃ، وبث منھما رجالا کثیر ونسا، پ۴ ع۱۲)

تنبیہ: حضرت آدم علیہ السلام کے دو دو بچے ہر حمل سے ہوئے سوائے حضرت شیث علیہ السلام کے

"وضعت شیثا وحدہ کرامۃ سیدنا محمد ﷺ فان نورہ انتقل من آدم الی شیث"

(مواھب لدنیہ، مرقاۃ باب فضائل سید المرسلین، انوار محمدیہ ص ۱۵)

حضرت حوا نے حضرت شیث کو صرف اکیلا ہی جنا۔ ان کے ساتھ جڑواں کوئی بچی نہیں تھی۔ یہ صرف نبی کریم ﷺ کی عزت وتکریم کے لئے مالک الملک نے ایک بچے سے حاملہ کیا کیونکہ نبی کریم ﷺ کا نور آدم علیہ السلام سے منتقل ہو کر حضرت شیث کے پاس آ گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں وصیت کی کہ یہ نور پاک عورت کی طرف منتقل کرنا ہے۔ یہی وصیت کا سلسلہ چلتا رہا۔ نبی کریم ﷺ کا نور پاک پشتوں سے منتقل ہوتا رہا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد اور اولاد کی اولاد وغیرہ آپ کی وفات کے وقت تک چالیس ہزار سے زائد ہوگئی تھی بلکہ صاوی وجمل وغیرہ میں ایک لاکھ تک پہنچ جانے کا ذکر ملتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت آدم علیہ السلام کی وفات:

جب حضرت آدم علیہ السلام کے وصال کا وقت آ گیا تو آپ کو جنتی میوے کھانے کی تمنا ہوئی، اپنے بیٹوں کو کہا تم کعبہ شریف کے پاس جا کر دعاء کرو کہ اللہ تعالیٰ میری یہ تمنا پوری کر دے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے اپنے باپ کے حکم سے جب وہاں پہنچے تو ان کی ملاقات حضرت جبرائیل اور کچھ اور دوسرے فرشتوں سے ہوئی۔

آپ کے بیٹوں نے ان سے آدم علیہ السلام کی فرمائش کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا تم ہمارے ساتھ چلو ہم جنت کے میوے تمہارے باپ کے حضور پیش کر دیں گے۔ جب یہ سب حضرت آدم علیہ السلام کے پاس پہنچے تو حضرت حوا فرشتوں کو دیکھ کر ڈرنے لگیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دامن میں چھپنا چاہا لیکن آپ نے فرمایا اے حوا اب تم مجھ سے جدا ہی رہو۔ میرے اور میرے رب کے قاصدوں کے درمیان رکاوٹ نہ بنو۔ اس طرح فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی روح قبض کر لی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تجہیز وتکفین فرشتوں نے کی:

فرشتوں نے آدم علیہ السلام کے بیٹوں کو کہا کہ تم دیکھو جس طرح ہم تمہارے باپ کو کفن دیں گے اور دفن کریں گے اسی طرح تم نے فوت ہونے والے لوگوں کے کفن ودفن کا انتظام کرنا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام جنت کی مرکب خوشبو اور جنتی جوڑے کا کفن اور جنتی بیری کے کچھ پتے ساتھ لائے تھے

انہوں نے غسل دیا اور کفن پہنایا اور خوشبو ملی۔ اور ملائکہ آپ کے جسم مبارکہ کو کعبہ میں لائے اور ان پر فرشتوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ جس میں حضرت جبرائیل امام تھے اور دوسرے فرشتے مقتدی۔

اس نماز میں چار تکبریں کہی گئیں جیسے آج بھی چار تکبریں ہی ادا کی جاتی ہیں۔ پھر مکہ مکرمہ سے مقام منی میں لے گئے جہاں کہ حاجی قربانی کرتے ہیں اور اسی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی۔ وہاں مسجد خیف کے قریب بغل قبر (لحد) کھود کر ان کو دفن کیا اور ان کی قبر کو اونٹ کی کوہان کی طرح ڈھلوان بنایا اور حضرت حوا کی قبر جدہ میں ہے۔

بعض روایات کے مطابق دونوں کی قبریں حرم میں طواف کی جگہ میں ہیں۔

(واللہ اعلم بالصواب ، از عزیزی)

راقم کی نظر میں زیادہ کتب میں طواف کی جگہ ہی دونوں کی قبروں کا ذکر گزرا ہے۔ قارئین کرام حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر بالترتیب اور ایک ہی جگہ راقم کی کتاب تذکرۃ الانبیاء میں دیکھئے

تفہیم القرآن کے اغلوطے:

ابھی تک حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر معتبر تفاسیر سے جو بیان کیا ہے اور انبیاء کرام کا گناہوں سے پاک ہونا دلائل سے بیان کیا ہے۔ اسے مدنظر رکھتے ہوئے تفہیم القرآن میں مودودی صاحب کے سنگین الفاظ کو دیکھئے کہ اللہ کے نبی کی شان کا وہ پاس نہ کر سکے:

(۱) یعنی آدم کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انہوں نے نافرمانی سے پھر فرمانبرداری کی طرف رجوع کرنا چاہا۔ (تفہیم القرآن ج ا ص ۶۷ حاشیہ ۵۱)

آدم علیہ السلام کی طرف قصور یا نافرمانی کے الفاظ کی نسبت غلط ہے رب تعالیٰ کے ارشاد "فنسی" (وہ بھول گئے) کے سراسر منافی ہے۔

(۲) اس کا معنی یہ ہوئے کہ آدم اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے۔ گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھوڈالا گیا۔ (تفہیم ج ا ص ۶۸ حاشیہ ۵۳)

یہاں بھی نافرمانی اور گناہ گاری جیسے الفاظ آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا شدید غلطی ہے

(۳) ﴿ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے) یہ ترجمہ کرنے کے بعد تفسیر یوں لکھتے ہیں۔ظالم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے ''ظلم'' دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے، جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے اولاً خدا کے حقوق ثانیاً ان تم چیزوں کے حقوق جن کو اس نے نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا اعضاء جسمانی وغیرہ۔ثالثاً خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔

(تفہیم ج ۱ ص ۶۶ حاشیہ ۴۹ بالاختصار)

یہاں ترجمہ میں ظلم کی نسبت آدم علیہ السلام کی طرف کر دی گئی۔پھر تین قسمیں ظلم کی بیان کیں جن کا تعلق عام انسان سے تو ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نبی سے ان کا تعلق نہیں ہو سکتا۔سی مقام پر مودودی صاحب نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ لہٰذا تفہیم سمجھانے سے تو قاصر رہی البتہ عام انسان کو الجھانے میں موزوں ثابت ہوئی کہ عام انسان یہ سمجھے کہ شائد یہ تینوں ظلم اللہ کے نبی میں بھی پائے گئے ہیں

(۴) ﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ﴾

''پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے''

اگرچہ کئی مفسرین نے سجدہ کا معنی انحناء کیا ہے جس کا معنی جھکنا ہے لیکن یہ معنی معتبر نہیں جیسا کہ راقم نے بیان کر دیا ہے۔اس آیت کی مکمل تفسیر علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے تفہیم سے لے کر اس پر گرفت فرمائی آیئے آپ بھی دیکھئے:

اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقہ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کے لئے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔چونکہ اس علاقے میں اللہ کے حکم سے انسان کو خلیفہ بنایا جا رہا تھا، اس لئے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط، جس کام میں بھی انسان اپنے ان اختیارات کو جو ہم اسے عطاء کر رہے ہیں استعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مشیت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں، تو تمہارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرہ عمل سے وہ کام متعلق ہو وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے، نیکی کرنا چاہے یا

بدی کے ارتکاب کے لئے جائے۔ دونوں صورتوں میں جب تک ہم اسے اس کی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمہیں اس کے لئے ساز گاری کرنی ہوگی مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ ایک فرمان روا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی صوبے یا ضلع کا حاکم مقرر کرتا ہے تو اس علاقے میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اور جب تک فرمانروا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع دے اس وقت تک اس کا ساتھ دیتے رہیں قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح کام میں ان اختیارات کو استعمال کر رہا ہے یا غلط کام میں۔ البتہ جب جس کام کے بارے میں بھی فرمانروا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انہیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ سارے علاقے کے اہل کاروں نے ہڑتال کر دی ہے۔ حتی کہ جس وقت فرمانروا کی طرف سے ان حاکم صاحب کی معزولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو وہی ماتحت و خدام جو کل تک ان کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر انہیں کشاں کشاں دار الفاسقین کی طرف لے جاتے ہیں فرشتوں کو آدم کے لئے سربسجود ہونے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ (تفہیم ج ۱ ص ۶۴ حاشیہ ۴۵)

علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے یوں گرفت فرمائی:

مترجم مذکور نے ترجمہ اور تشریح میں عامہ مترجمین و مفسرین کے خلاف اپنا الگ راستہ اختیار کیا مترجمین نے " اسجدوا " کا ترجمہ سجدہ کنید، سجدہ کرو، اور سجدے میں گر جاؤ" کیا اور مفسرین کے نزدیک سجدہ کے معنی صرف جھکنا جسے عربی میں "انحناء" کہتے ہیں قوی نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ نص قرآنی" فقعوا له ساجدين " جمہور کے اس قول کی قوی دلیل ہے۔

پھر مترجم مذکور کے کلام میں زمین سے تعلق رکھنے والے (گویا علاقائی اور طبقاتی) فرشتوں کی تقسیم اور تخصیص بھی مفسرین کے خلاف ہے جمہور کا قول یہی ہے کہ بلا تخصیص سب فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کا حکم ہوا۔ بغیر کسی استثناء کے سب فرشتے آدم کے لئے سجدہ میں گر پڑے ظاہر نص قرآنی " فسجد الملائكة كلهم اجمعون " مفسرین کے قول کی روشن دلیل ہے۔ اس

طویل اقتباس کی رو سے مترجم کے نزدیک ہر انسان خلیفۃ اللہ ہے خواہ مومن ہو یا کافر، ظالم ہو یا مظلوم اور وہ ہر ایک کے لئے فرشتوں کو مطیع و مسخر مانتا ہے۔

ایسی صورت میں سوچنا پڑے گا کہ اگر ظالم و مظلوم، مؤمن و کافر آپس میں آمادہ قتال ہو جائیں تو فرشتے کس کا ساتھ دیں گے؟ یا وہ بھی آپس میں قتال کریں گے؟ فکر صحیح یہی جواب دے گی کہ ہر مومن و کافر اور ظالم و مظلوم کا خلیفہ ہونا درست نہیں۔ اس کے بعد یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مترجم مذکور نے دنیاوی فرمانرواؤں اور ان کے مقرر کردہ حاکموں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے مقرر کردہ خلفاء کی مثال قرار دیا۔

حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور اللہ تعالیٰ کے خلفاء کے حق میں سخت بے ادبی ہے اور یہ کتنی بڑی جسارت ہے کہ خلفاء اللہ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ان کی معصیت و نافرمانی کی بنا پر ان کے مطیع فرمان فرشتے انہیں گرفتار کر کے دار الفاسقین تک پہنچاتے ہیں۔ (التبیان مع البیان پارہ اول ص ۱۲۹)

راقم کی مزید وضاحت:

تفہیم میں مثال بیان کرنے کے بعد بہت واضح طور پر یہ بیان کیا گیا ہے ''فرشتوں کو آدم کے لئے سربسجود ہونے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعت کچھ اسی قسم کی تھی''۔

اب ذرا مثال کو واضح الفاظ میں سمجھئے، مثال کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بادشاہ یا صدر یا وزیر اعظم کسی شخص کو صوبے کا گورنر بنا دے یا ضلع کا حاکم بنا دے جب تک وہ اس منصب پر قائم ہے پولیس والے اسکا احترام کرتے ہیں۔ خواہ وہ اچھے کام کرے یا برے لیکن جب اسے معزول کر دیا جائے تو وہی پولیس والے اسے ہتھکڑیاں لگا کر دار الفاسقین میں پہنچا دیتے ہیں یعنی اسے جیل میں پہنچا دیتے ہیں جہاں اور مجرم بھی رہتے ہیں یعنی اب گورنر صاحب اور ڈی سی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

اس مثال کے بعد جب یہ کہا گیا ہے کہ فرشتوں کو آدم کے سامنے سربسجود ہونے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی بھی یہی نوعیت ہے اب ذرا مثال کو اور آدم علیہ السلام اور فرشتوں کو سامنے رکھ کر مثال کو ممثل لہ (جس

کی مثال دی گئی) پر منطبق کریں تو سمجھ آئے گا کہ کتنی بڑی جسارت کی گئی، کتنا ظلم عظیم کیا گیا

کیونکہ مثال سے یوں سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا اور فرشتوں کو آپ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا لیکن فرشتے اسی وقت تک احترام کریں گے جب تک خلیفہ اپنے منصب پر قائم رہے گا خواہ اچھے کام کرے یا برے (معاذ اللہ نبی سے برے کام کرنا متصور نہیں) پھر جب خلیفہ کو معزول کر دیا جائے (نبی معزول نہیں ہوتا معاذ اللہ) تو وہی فرشتے اس خلیفہ کو پکڑ کر دار الفاسقین تک لے جائیں گے۔ (معاذ اللہ)

فرشتے لوگوں کو جس دار الفاسقین تک پہنچاتے ہیں اسے جہنم کہا جاتا ہے۔ فرشتون کی کیا مجال کی نبی کو پکڑ کر معاذ اللہ جہنم میں لے جائیں۔ خدرا انصاف کیجئے کہ اس مثال میں زہر کو نہیں ملایا گیا تو اور کیا ہے۔ رب تعالیٰ اور انبیاء کرام اور فرشتوں کی شان میں گستاخی نہیں پائی گئی تو اور کیا ہے۔

طویل اقتباس میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انسان نماز ادا کرے یا چوری کرے رب تعالیٰ کا اس میں اذن پایا جاتا ہے حالانکہ یہ بھی سراسر غلط ہے رب برے کاموں کی اجازت نہیں دیتا البتہ بندے کو مختار بناتا ہے وہ بندہ اپنے اختیار سے برے کام کرتا ہے۔

ضیاء القرآن کی خوبی:

تفہیم القرآن کے مقابل حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کی تفسیر ضیاء القرآن کا اس مقام پر مطالعہ کریں تو ایمان افروز تفسیر نظر آئے گی۔ نبی کی شان سمجھ آئے گی کہ نبی گناہوں سے پاک ہیں۔ لمبی عبارت کو نقل کرنا تو ممکن نہیں البتہ قارئین کو دعوت دیتا ہوں کہ اسی مقام پر ضیاء القرآن کا مطالعہ کر کے خود ہی اس کی خوبیوں کا اندازہ کریں۔

☆☆☆☆☆

﴿ یٰبَنِیٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوْا بِعَھْدِیٓ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنَ ﴾

(۱) ''اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور خاص میرا ہی ڈر رکھو''

(۲) ''اے اولادِ یعقوب یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے انعام کی ہیں تم پر اور پورا کرو میرا وعدہ میں پورا کروں گا تمہارا وعدہ اور مجھ سے ہی تم ڈرو''

ما قبل سے تعلق: جب اللہ تعالیٰ نے توحید اور نبوت اور قیامت پر دلائل قائم فرمائے اس کے بعد عام نعمتوں کا ذکر فرمایا جن کا تعلق عام انسانوں سے ہے یعنی انسانوں کو پیدا کرنا، ان کو موت دینا اور پھر زندہ کرنا، زمین کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے نفع مند بنانا آدم علیہ السلام کو تمام علوم عطاء فرمانا یہ بھی تمام اولاد پر نعمت ہے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کرانا وغیرہ

اب ان خاص نعمتوں کی یاد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو دلائی جا رہی ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پائے جانے والے یہود کے آباء واجداد پر تھیں۔

مختصر وضاحت:

آدم علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بعد اور اولادِ آدم علیہ السلام کو اپنی نعمتیں یاد دلانے کے بعد بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھی، انھیں رب تعالیٰ نے اپنی وہ نعمتیں یاد دلائیں جو ان کے آباء وجداد پر تھیں کہ ان کو یاد کرتے ہوئے اور ان کا شکر ادا کرو اور میرے وعدہ کو پورا کرو، یعنی توراۃ میں جو وعدہ لیا گیا تھا کہ آخر الزمان نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ جب آئیں تو ان پر ایمان لانا، اسی وعدہ کو پورا کرو، میں تمہیں جزاء عطاء کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا، تم میرا وعدہ توڑنے اور میرے احکام کی خلاف ورزی کرنے میں مجھ سے ہی ڈرو۔

تفصیلی وضاحت:

یا: حرف نداء ہے، جو قریب و بعید کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کا معنی ہے ''اے''۔

بنی: جمع ہے'' ابن'' کی اصل میں'' بنین '' ہے، نون اضافت کی وجہ سے حذف ہو گیا (گر گیا) ابن کی جمع ابناء بھی آتی ہے۔ (از قرطبی)

اسرا: عجمی لفظ ہے یعنی عبرانی زبان کا لفظ ہے اس کے چار معانی ہیں بندہ ، انسان ،مہاجر (چھوڑنے والا) اور برگزیدہ۔

ایل: عبرانی زبان میں اس کا معنی ہے ''اللہ'' اب یہاں 'اسرا' کے دو معنی معتبر ہیں، یعنی اسرائیل کا معنی'' اللہ کا بندہ' اور یا معنی یہ ہے، اللہ تعالی کا پسندیدہ اور برگزیدہ،، (از روح المعانی)

تاہم تفسیر کبیر میں ان معانی کے علاوہ'' رجل اللہ (اللہ کا مرد) بھی معنی مراد لیا گیا ہے۔ اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں، یعنی یہ آپ کا عبرانی زبان میں نام ہے۔ (عجمہ اور علم کی وجہ سے غیر منصرف ہے)

" عن ابن مسعود قال اسرائیل هو یعقوب"اخرجه عبد بن حمید و ابن جریر و ابن المنذر وابن ابی حاتم"......................(درمنثور)

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔

" واخرج ابن جریر عن ابن عباس ان اسرائیل ومیکائیل وجبریل واسرافیل کفولک عبد الله " (در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اسرائیل اور میکائیل اور جبرئیل اور اسرافیل (ان تمام) کا معنی'' اللہ کا بندہ' ہے۔

ابوالفرج جوزی نے اپنی کتاب " فهوم الآثار " میں بیان کیا ہے:

" لیس فی الانبیاء من له اسمان غیره الانبینا محمد ﷺ فان له اسماء کثیرة " ...... (قرطبی)

انبیاء کرام میں دو نام صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے ہیں۔ ہاں البتہ ہمارے نبی کریم محمد مصطفی ﷺ کے بہت نام ہے۔

تاہم علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا یہ درست نہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے علاوہ کسی اور نبی کے دو نام نہیں۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے چار نام ہے۔ عیسیٰ...... مسیح...... کلمۃ اللہ...... روح اللہ

اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کا دوسرا نام ''ذوالنون'' ہے۔ اور حضرت الیاس علیہ السلام کا دوسرا نام ''ذوالکفل'' ہے۔

یبنی اسرائیل کہنے کی وجہ:

یابنی یعقوب نہیں کہا، بلکہ یابنی اسرائیل کہا۔ اس لئے کہ ان کو اسلام میں داخل ہونے، اور نبی کریم ﷺ کی تابعداری کا حکم دیا گیا۔ ان کے باپ کے کمالات کو ذکر کر کے ان کو اس پر برانگیختہ کیا گیا۔ یہ مقصد لفظ ''یعقوب'' سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا جیسا کہ ''اسرائیل'' سے حاصل ہوا۔ اس لئے کہ حاصل کلام یہ ہوا۔

" یا بنی العبد الصالح المطیع للہ و کونوا مثل ابیکم فی متابعۃ الحق "

اے نیک اور اللہ تعالیٰ کے مطیع بندے کی اولاد اللہ تعالیٰ کی تابعداری میں اپنے باپ کی طرح ہو جاؤ۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:

" یا ابن الکریم افعل کذا " اے کریم کے بیٹے تو بھی اپنے باپ کی طرح کرم کر۔

" یا ابن الشجاع بارز الابطال " اے بہادر شخص کے بیٹے تو میدان جنگ میں بہادر لوگوں کا مقابلہ کر۔

" یا ابن العالم اطلب العلم " اے عالم کے بیٹے تو بھی اپنے باپ کی طرح علم طلب کر۔

مقصد یہ ہے کہ باپ کے کمالات سے اولاد کو خوشی ہوتی ہے۔ اسی لئے باپ کا نام ہی وہ ذکر کیا جو کمالات پر دلالت کر رہا ہے...... (از ابن کثیر)، یعنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ ان کی اولاد اور خاندان کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے، اگرچہ آپ کی اولاد میں خواہ یہودی ہوں یا عیسائی ہوں سب بنی اسرائیل ہیں۔ تاہم آج کل صرف یہودیوں کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل:

اصل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جن کی اولاد سے

نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔اور دوسرے بیٹے ان کے حضرت اسحٰق علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک اور بھائی تھے جن کا نام عیص تھا۔یہ دونوں بھائی جوڑا تھے،یعنی ایک ہی حمل سے دونوں جڑواں پیدا ہوئے،لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش بعد میں ہوئی اسی لئے آپ کا نام ہی یعقوب رکھ لیا گیا،کیونکہ عقب کا معنی ہے پیچھے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ حضرت یعقوب اور عیص کے نانا حضرت لوط علیہ السلام ہیں،کیونکہ اسحٰق علیہ السلام کی زوجہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی ہے جس کے یہ دونوں بیٹے ہیں۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی کے بیٹے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسحٰق علیہ السلام حضرت سارہ کے بطن سے پیدا ہوئے،اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔یہ دونوں بیٹے زیادہ مشہور ہیں کیونکہ ان کو نبوت حاصل ہوئی ورنہ حضرت ہاجرہ کے چھ بیٹے اور بھی تھے جن کے نام یہ ہے،زمران......یسقان......مدان......مدیان......اسیاق......سوج.........واللہ اعلم بالصواب۔ (از حقانی)

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے ان کے ناموں سے ہی بارہ قبیلے بنے ہر قبیلے کو سبط کہا گیا،جس کی اسباط ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔

ان قبائل کو بنی اسرائیل کہا گیا،یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد،ان میں ہی جلیل القدر انبیاء کرام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ (از عزیزی)

﴿ اذْكُرُوْا ﴾: "یادکرو" یہ ماخوذ ہے "ذکر" سے خواہ دال کے کسرہ سے ہو یا ضمہ سے،دونوں صورتوں میں اس کے دونوں معانی استعمال ہیں،زبان سے یاد کرنا اور دل سے یاد کرنا۔

"الذکر بالقلب ضد النسیان و الذکر باللسان ضد الانصات"

دل سے یاد کرنا بھولنے کی ضد ہے،اور زبان سے یاد کرنا خاموش رہنے کی ضد ہے۔

"وقال الکسائی ما کان بالضمیر فھو مضموم الذال وما کان باللسان فھو مکسور الذال"

تاہم کسائی رحمہ اللہ نے فرق بیان کیا ہے کہ جو لفظ ذال کے ضمہ سے ہوگا اس کا معنی ہے دل سے یاد کرنا اور جو ذال کے کسرہ سے ہے اس کا معنی ہے زبان سے یاد کرنا۔

آیۃ کریمہ میں بنی اسرائیل کو نعمتوں کے یاد کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم میری نعمتوں کو یاد کر کے ان کا شکریہ ادا کرو۔ نعمت کے ذکر کرنے سے شکر خود سمجھ آ رہا تھا اسلئے اسے حذف کر دیا گیا۔ بعض حضرات نے کہا یہاں مقصود یہ ہے کہ "میری نعمتوں کو دل سے یاد کرو"۔

﴿ اِیْ لَا تَغْفِلُوْا عَنْ نِعْمَتِیَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَلَا تَنَاسُوْھَا وَھُوَ حُسْنٌ ﴾

یعنی میری نعمتوں سے غافل نہ ہو جو میں نے تم پر انعام کی ہیں اور ان کو بھلاؤ نہیں۔

یہ معنی مراد لینا اچھا ہے۔ نعمۃ اسم جنس ہے مراد اس سے جمع ہے اگرچہ صیغہ مفرد کا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْھَا ﴾ یہاں بھی نعمۃ کا معنی جمع والا ہے۔ یعنی "اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہیں کر سکو گے"۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو ہر انسان پر ان گنت ہیں اور ہر قبیلے پر بے شمار نعمتیں ہیں تاہم بنی اسرائیل کو کچھ خصوصی نعمتوں کی یاد دلائی گئی ہے آل فرعون سے نجات دینا ان میں انبیاء کرام کو مبعوث کرنا، ان پر کتب (توراۃ، انجیل، زبور) کو نازل کرنا، من اور سلویٰ نازل کرنا، پتھر سے بارہ چشمے جاری کرنا، توراۃ میں نبی کریم ﷺ کی نبوت و رسالت کا ذکر آنا، اور آپ کے اوصاف کو ذکر کرنا وغیرہ۔

فائدہ جلیلہ: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کہا ﴿ اُذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ ﴾ میری نعمتوں کو یاد کرو۔ لیکن نبی کریم ﷺ کو فرمایا ﴿ فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ ﴾ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا نبی کریم ﷺ کی امت کو نعمتوں کی یاد نہیں دلائی، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے۔

" لیکون نظر الامم من النعمة الی المنعم ونظر امة محمد ﷺ من المنعم الی النعمة "

کہ واضح ہو جائے کہ باقی امتوں کی نظر نعمتوں کے واسطے سے منعم (ذات باری تعالیٰ) کی طرف ہے، لیکن نبی کریم ﷺ کی امت کی نظر منعم سے نعمت کی طرف ہے۔

کیا خوب مقام ہے امت مصطفیٰ ﷺ کہ ان کی نظر رب تعالیٰ پر ہوتی ہے کہ اے اللہ تو راضی

ہو جا۔ جب رب تعالیٰ راضی ہوگا تو نعمتیں بھی حاصل ہوں گی۔لیکن باقی امتیں نعمتوں کے حصول کی دعائیں کرتی رہیں۔نعمتیں ملیں تو رب تعالیٰ کو بھی یاد کیا اگر کہیں آزمائش میں آ گئے تو رب تعالیٰ کو بھی بھول گئے۔ (از قرطبی)

نعمت کی تعریف:

" النعمة الی المنفعة المفعولة علی جهة الاحسان الی الغیر "

نعمت اسے کہا جاتا ہے کہ غیر کو نفع پہنچانے کی غرض سے اس پر احسان کرنا۔

اگر غیر کو نقصان پہنچایا جائے تو اسے نعمت نہیں کہا جائے گا۔کیونکہ نعمت منفعت کا نام ہے مضرت کا نہیں۔اسی طرح نعمت کا مطلب ہے کہ کسی غیر پر احسان کر کے اسے نفع پہنچایا جائے۔اگر وہ نفع اپنی ذات کی طرف ہی لوٹے تو اسے نعمت نہیں کہتے ،جس طرح اپنے ہی غلام یا غلامہ پر اس طرح کا احسان کریں جس کا نفع اپنی طرف لوٹ آئے اسے نعمت نہیں کہا جائے گا۔جو کچھ بھی ہمیں حاصل ہے خواہ وہ نفع مند ہو یا ضرر کو دور کرے دن کو حاصل ہو یا رات کو حاصل ہو، دنیا میں اس کا حصول ہو یا آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہے۔جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ ﴾ ''جو بھی نعمت تمہیں حاصل ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے''

تین طرح کی نعمتیں:

(1) وہ نعمت جس میں اللہ تعالیٰ منفرد (اکیلا) ہے جس میں کوئی واسطہ نہیں پایا گیا۔جس طرح اللہ تعالیٰ کا بندوں کو پیدا کرنا، ان کو حیات عطا کرنا، ان کو موت عطا کرنا وغیرہ۔

(2) وہ نعمت جو ہمیں بظاہر غیر کی طرف سے حاصل ہو وہ بھی درحقیقت رب تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہے، اس لئے کہ نعمت کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، منعم کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، منعم کو نعمت عطاء کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔اور منعم کو دوسرے پر مہربانی کرنے کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہے۔

اگر چہ انعام عطاء کرنے والے بندے کا شکریہ بھی ادا کرنا ہوگا لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا ہی

شکر یہ ادا کرنا لازم ہوگا رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ ﴾ میرا شکر یہ ادا کرو، اور اپنے والدین کا شکر یہ ادا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر پہلے فرمایا اور والدین کا بعد میں ۔ نبی کریم ﷺ کا بھی ارشاد ہے:

﴿ لَا یَشْکُرِ اللّٰہَ مَنْ لَّا یَشْکُرِ النَّاسَ ﴾ اللہ تعالیٰ کا وہ شکر گزار نہیں جو لوگوں کا شکر گزار نہیں نبی کریم ﷺ نے بھی اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے شکر کو پہلے ذکر فرمایا، اور بندوں کے شکر کو بعد میں اور یہ ارشاد فرمایا کہ بندوں کا شکر یہ ادا کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرنا ہی ہے۔

(3) بعض اوقات ہماری طاعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں نعمتیں عطاء کرتا ہے۔ ان نعمتوں میں اگر چہ طاعات وسیلہ ہیں لیکن درحقیقت وہ نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہیں۔ اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں طاعت کی توفیق عطا نہ کرتا اور ہماری امداد نہ فرماتا طاعت کرنے پر، اور ہمیں طاعت کی ہدایت نہ دیتا اور عذر زائل نہ کرتا تو ہم کبھی طاعت نہ کر سکتے، معلوم ہوا کہ طاعت کہ وجہ سے حاصل ہونے والی نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہیں۔

اس تقریر کے بعد رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

﴿ وَمَا بِکُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ ﴾ (جو نعمتیں بھی تمہیں حاصل ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں) کو سمجھنا آسان ہوگیا۔

<u>اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان گنت ہیں</u>: اس لئے کہ ہر وہ چیز جو ہمارے نفع کے لئے، اور اس سے لذت حاصل ہوتی ہے اور اعضاء کو جو ہم نفع حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور نقصان دہ چیزوں کے دفاع کے لئے استعمال کرتے ہیں یہ سب نعمتیں ہیں۔ جب نفع مند اشیاء اور نقصان دہ چیزوں کو جن کا اندفاع نعمت ہے ان کا شمار کرنا ممکن نہیں، تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح طور پر سمجھ آ گیا:

﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا ﴾

اور اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہیں کرسکو گے۔

اعتراض: جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شمار میں نہیں آ سکتیں تو بنی اسرائیل کو ان نعمتوں کے یاد کرنے کا حکم کیسے دیا گیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شخصی یا نوعی طور پر تو شمار سے باہر آئیں، البتہ جنس کے اعتبار سے کسی حد تک انکو ذہن میں لانا، یاد کرنا اور ان کا شکریہ ادا کرنا ممکن ہے۔

فائدہ: جب یہ واضح ہو گیا کہ سب نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ منعم ذات کا شکریہ ادا کرنا اور اس کی حمد ثناء ضروری ہے " ثبت انه سبحانه و تعالیٰ وهو المستحق محمد الحامدین "

اسی سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام حمد کرنے والوں کی حمد کا مستحق ہے کیونکہ جس کی حمد کریں گے وہی آخر کار رب تعالیٰ کی حمد ہی ہوتی ہے، کیونکہ تمام چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

عقیدہ:

" وقال اهل السنة انه سبحانه كما خلق المنافع خلق المضار ولا اعتراض لاحد عليه ولهذا سمى نفسه النافع والضار ، ولا يسأل عما يفعل "

اہل سنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح نفع مند چیزوں کا خالق ہے اسی طرح ضرر انداز چیزوں کا بھی وہی خالق ہے، اس ذات پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی " النافع " اور " الضار " دونوں ہی ہیں۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ وہ کیا کرتا ہے (اور کیوں کرتا ہے) لیکن اس کے خلاف معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف نفع مند چیزوں کا خالق ہے، ضرر انداز چیزوں کا وہ خالق نہیں، بلکہ مقصد تخلیق ہی یہ ہے نفع پہنچایا جائے۔

عقیدہ: معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکلفین پر دینی اور دنیاوی انعامات عطا کئے ہیں لہٰذا اس میں سب برابر ہیں یعنی خواہ مومن ہوں یا کافر ہوں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان پر دینی اور دنیاوی پائی گئی ہیں۔

اہل سنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ کافروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عذاب تیار کر رکھا ہے اور ان کو جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، ان کا عذاب کبھی منقطع نہیں ہوگا اس لئے کافروں پر اللہ تعالیٰ کی دنیاوی نعمتیں تو ہیں لیکن دینی نعمتیں نہیں۔ دنیاوی نعمتوں کے پائے جانے پر نقل و عقل شاہد ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو بھی کان، آنکھیں، عقل وغیرہ عطا

کئے دنیاوی مال و دولت عطا کیا تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن پاک میں جو ذکر ہے:

﴿ جعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً ﴾

''تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت''

یہ حکم عام ہے مومنوں اور کافروں سب کو شامل ہے۔ اس طرح ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ﴾ میں موت و حیات کو نعمت قرار دیا گیا جو مومنوں اور کافروں سب کو یہ نعمتیں عطا ہیں اسی طرح یہی آیۃ جس کی وضاحت بیان ہو رہی ہے اسی میں مدینہ طیبہ کے غیر مسلم یہود کو کہا گیا ہے۔

﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ﴾ اس میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ اگرچہ ان کے آباؤ اجداد کی نعمتوں کا ذکر بھی تو پھر ان میں سے بھی بہت کافر ہوئے ہیں۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ دنیاوی نعمتیں ان کے لئے درحقیقت نقصان دہ ہی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو مہلت دیتا ہے اور مال و دولت دیتا ہے وہ اور زیادہ کفر میں سرکش ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ اور اسی طرح رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی اور وضاحت کر رہا ہے:

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ﴾

ہرگز کافر گمان نہ کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے ہم تو مہلت ان کو صرف اس لئے دیتے ہیں کہ وہ اور زیادہ گناہ کرلیں۔

واضح ہوا کہ ان کو دنیاوی نعمتیں کتنی زیادہ سے زیادہ کیوں نہ دے دی جائیں وہ درحقیقت ان کیلئے نقصان دہ ہی ہیں کیونکہ جب ان کو آخرت میں دائمی عذاب دیا جانا ہے تو ان کی نعمتوں کی یہی حیثیت ہوگئی کہ ان کو زہر ملا کر مٹھائی دے دی گئی۔ جس طرح زہر آلود مٹھائی بظاہر میٹھی لیکن حقیقت میں ہلاک کرنے والی ہے، یہی حال انکی دنیاوی نعمتوں کا ہے جنکے بعد ان کو ہمیشہ عذاب میں مبتلا کرنا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نعمتوں کی یاد دلائی کہ تم ان کو یاد کر کے میرا شکریہ ادا کرو، اس

کی وجہ کیا ہے؟اس کی چند وجوہ ہیں:

(1) ایک یہ ہے کہ ان پر جو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تھیں ان میں سے توراۃ، انجیل اور زبور بھی تھیں جو نبی کریم ﷺ کی صداقت و نبوت پر شہادت دے رہی تھیں تو اس نعمت کی یاد دلانے کا مطلب یہ تھا کہ تم نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آ ؤ۔

(2) جب اللہ تعالیٰ نے ان کو کثیر نعمتیں عطاء کی تھیں تو ان کا انکار عظیم معصیت تھا، ان کو نعمتیں یاد دلا کر یہ بتایا گیا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور قرآن پاک پر ایمان لانے کی جو تمہیں دعوت دی گئی اس کی مخالفت بہت بڑے دائمی عذاب کا سبب ہے لہٰذا ایمان قبول کر کے اپنے آپ کو عذاب سے بچالو۔

(3) اللہ تعالیٰ کی جب کثیر نعمتیں ان پر تھیں، لیکن وہ پھر بھی رب تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے تھے، نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لا رہے تھے تو ان کی نعمتیں یاد دلا کر اظہارِ مخالفت پر حیاء دلانی مقصود تھی۔

(4) کثیر نعمتوں کی یاد دلانے کا یہ بھی مقصد تھا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر بنسبت باقی لوگوں کے خصوصی فیضان کیا ہے، جب اس نے تمہیں ابتدائی طور پر نعمتیں عطاء کی ہیں تو وہی ان نعمتوں کو باقی رکھنے والا بھی ہے، لہٰذا تمہیں بھی چاہئے کہ اس کے احکام پر عمل کرو اور اس کی مخالفت نہ کرو۔

اعتراض: خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے۔ اور جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ان لوگوں پر نہیں تھیں، بلکہ ان کے آباؤ اجداد پر تھیں ان کو یاد دلانے کا کیا مقصد ہے۔

جواب: اگر یہ نعمتیں ان کے آباؤ اجداد پر نہ ہوتیں تو وہ باقی ہی نہ رہتے اور نہ ہی ان کی نسل ہوتی، لہٰذا ان لوگوں کے آباء پر نعمتیں گویا کہ ان کی اولاد پر بھی تھیں۔ اور وہ یہ تھی کہ یہ بتانا مقصود تھا کہ تمہارے آباء واجداد پر اللہ تعالیٰ کی دینی اور دنیاوی عظیم نعمتیں تھیں لہٰذا وہ نعمتیں اولاد کے حق میں بھی پائی گئی ہیں۔

اور وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو ایمان لانے کی رغبت دلانی اور کفر سے روکنا مقصود تھا کیونکہ یہ بتایا گیا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارے آباء کو یہ نعمتیں ان کی طاعت کی وجہ سے ہی دی گئی تھیں چونکہ اولاد کی عادت یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آباء کے طریقہ پر چلتے ہیں۔ (از کبیر)

﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ﴾: ''اور تم پورا کرو میرا وعدہ میں پورا کروں گا تمہارا وعدہ'' بندوں کا رب تعالیٰ سے وعدہ کیا ہے اور رب تعالیٰ کا بندوں سے وعدہ کیا ہے اس میں مفسرین کے اقوال

دیکھنے سے قرآن پاک کی عظمت واضح ہوتی ہے کہ مختصر الفاظ میں کتنے مطالب پائے جاتے ہیں۔

"﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ﴾ فی اداء الفرائض علی السنة والاخلاص ﴿ اُوْفِ﴾ بقبولها منکم ومجازاتکم علیها"

تم فرائض کو سنت کے مطابق اور اخلاص سے ادا کر کے میرا وعدہ پورا کرو، میں تم سے اس عبادت کو قبول کر کے اور اس پر جزاء عطا کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

"﴿اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ﴾ (فی العبادات ﴿ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ ای اوصلکم الی منازل الرعایات"

تم عبادات میں میرے وعدہ کو پورا کرو، میں تمہیں رعایت (مہربانی) کے مقام پر پہنچا کر اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ (از قرطبی)

"﴿ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ ﴾ فی حفظ آداب الظواهر ﴿ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ بتزیین سرائرکم"

تم ظاہری آداب کی حفاظت کر کے میرا وعدہ پورا کرو، میں تمہارے باطن کو مزین کر کے وعدہ کو پورا کروں گا۔ (از قرطبی)

"﴿ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ ﴾ باداء الفرائض وترک الکبائر ﴿اُوْفِ﴾ بالمغفرة والثواب"

تم فرائض کو ادا کر کے اور کبائر (کبیرہ گناہوں) کو چھوڑ کر میرا وعدہ پورا کرو، میں مغفرت وثواب عطا کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

"﴿ اَوْفُوْا ﴾ بالاستقامة علی الطریق المستقیم ﴿ اُوْفِ ﴾ بالکرامة والنعیم المقیم"

تم سیدھی راہ پر قائم رہ کر میرا وعدہ پورا کرو، میں تمہیں عزت عطاء کر کے اور ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں (یعنی جنت کی نعمتیں) عطا کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ (از بیضاوی)

تمام معانی ان دو معنوں میں سمٹ کر آ جائیں گے:

(۱)...... ومارُوی عن ابن عباس رضی الله عنهما ﴿ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ ﴾ فی اتباع محمد ﷺ (اوف بعهدکم) فی رفع الآصار والاغلال"

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا یہ مطلب ہے تم محمد ﷺ کی اتباع کر کے (جس کا وعدہ تم سے توراۃ میں لیا گیا) اپنا وعدہ پورا کرو میں تم سے ثقل ومشقت اٹھا کر اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

(۲)...... اوفوا ٭ بما عاهدتمونی من الایمان والتزام الطاعة ٭ اوف ٭ بما عاهدتکم من حسن الاثابة"

تم ایمان قبول کر کے اور طاعت کو لازم پکڑ کر میرا وعدہ پورا کرو، میں تمہیں بہتر ثواب عطا کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ (از بیضاوی)

ان دو معانی کو ایک جگہ جمع کرلیا گیا:

" (وافوا بعهدی) بالایمان بکل هدی تحقق مجیئه منی سیما هدی محمد ﷺ الماخوذ فیه میثاق الانبیاء علیهم السلام (اوف بعهدکم) بازالة الخوف والحزن وتکفیر السیآت وتضعیف الحسنات ورفع الآصار والاغلال"

جو ہدایت میں نے تمہیں دی ہے اس پر ایمان لا کر خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیاء کرام جو بتاتے رہے کہ وہ آخری نبی ہوں گے ان پر ایمان لانا اس ہدایت پر تم ایمان لا کر میرا وعدہ پورا کرو، میں خوف اور حزن کو زائل کر کے، گناہوں کو مٹا کر، نیکیوں کو بڑھا کر، ثقل و مشقت کو اٹھا کر اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

دونوں معاہدوں کی دو طرفیں: بندے اپنا وعدہ پورا کریں رب تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے گا، اس میں بہت بڑی وسعت ہے بہت چیزوں کو یہ شامل ہے تاہم اس وعدہ کی ابتداء اور انتہاء بیان کی جارہی ہے جس سے درمیان والی صورتوں کی وسعت کا اندازہ خود ہو جائے گا۔

" فاول مراتب الوفاء منا هو الاتیان بکلمتی الشهادة ومن الله تعالیٰ حقن الدم والمال"

وعدہ کی وفاء کا پہلا مرتبہ بندوں کی جانب سے یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت کی شہادت دیں، اور رب تعالیٰ کی طرف سے وعدہ کو پورا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایمان لانے والوں کے مال اور جان کی حفاظت فرمائے گا۔

مطلب واضح ہے کہ جب کوئی شخص ایمان لے آئے تو اس کی جان محفوظ ہو جاتی ہے کہ مومن اسے کافر سمجھ کر قتل نہیں کریں گے اور اس کا مال بھی محفوظ ہو جاتا ہے کہ مومن اس کے مال کو بطور مال غنیمت حاصل نہیں کرتے۔

" وآخرها الاستغراق فی بحر التوحید بحیث یغفل عن نفسه

فضلا عن غیرہ ومن اللہ تعالیٰ الفوز باللقاء الدائم "

ایفاء عہد کی آخری حد بندوں کی طرف سے یہ ہے کہ وہ بحر توحید میں مستغرق ہو جائیں یہاں تک کہ اوروں کا خیال آنا تو دور کی بات ہے بلکہ وہ اپنے آپ سے بھی غافل ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایفاء عہد کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ وہ بندوں کو اپنی دائمی ملاقات یعنی تجلیات سے منور کرنے کا شرف عطا کرے گا۔ (از بیضاوی)

عہد کی تعریف:

" العهد حفظ الشئى ومراعته حالا بعد حال وسمى الموثق الذى يلزم مراعاته عهدا "

عہد کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کہ حفاظت کرنا اور وقتاً فوقتاً اس کی رعایت کرنا پختہ کلام جس کی رعایت لازم ہو جائے اسے عہد کہا جاتا ہے۔ (عہد کی نسبت وعدہ کرنے والے کی طرف بھی ہوتی ہے جیسے کہا جائے " **عهد فلان الى فلان** " فلاں نے فلاں سے وعدہ کیا۔ اور جس نے عہد کیا جائے اس کی طرف نسبت بھی ہوتی ہے " **عهد فلان من فلان** " فلاں نے فلاں سے وعدہ لیا۔

معاھد اور ذوعہد:

" والمعاهد فى عرف الشرع يختص بمن يدخل من الكفار فى عهد المسلمين وكذالک ذوالعهد قال صلى الله عليه وسلم لا يقتل مؤمن بكافر ولا ذوعهد فى عهده "

شرعی اصطلاح میں کفار سے کوئی شخص مسلمانوں کے عہد میں داخل ہو جائے یعنی مسلمانوں سے کوئی عہد لے لے تو اسے معاھد اور ذوعہد کہا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی مؤمن کافر کو اور ذوعھد اپنے عہد میں قتل کرے۔

وباعتبار الحفظ قبل الوثقية بين المتعاقدين عهدة (بضم العين)

متعاقدین (ایک دوسرے سے عقد کرنے والے) کے درمیان وثقیہ سے پہلے حفاظت کا اعتبار کرنا عہدہ کہلاتا ہے۔ (مفردات غالب)

وعدو وعید: نبی کریم ﷺ نے منافقین کی علامات کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا " واذا

وعد اخلف " جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے۔اور دوسری حدیث میں ارشاد نبوی ہے " اذا عاھد غدر " جب معاہدہ کرے تو اس میں دھوکہ بازی کرے۔

علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿ وَاِذَا وَعَدَ ﴾ اخبر بخیر فی المستقبل ، اذ وعد یغلب فی الخیر واوعد فی الشر " جب مستقبل کی بہتر خبر دی جائے کہ ایسا کروں گا تو اسے وعد کہتے ہیں۔اور جب شر خبر دی جائے تو اسے وعید کہا جاتا ہے یعنی انعام وغیرہ کا وعدہ "وعد" کہلاتا ہے اور سزا وغیرہ کی دھمکی "وعید" کہلاتی ہے۔

وایضا الخلف فی الوعید من مکارم الاخلاق ......قال الشاعر

" وانی اذا وعدته او وعدته لمختلف ایعادی ومنجز وعدی "

" بیشک میں وعید بھی کرتا ہوں اور وعد بھی کرتا ہوں......البتہ وعید کو معاف کر کے اس کے خلاف کرتا ہوں اور وعد کو پورا کرتا ہوں......یعنی خلف فی الوعید (وعید کے خلاف کام کرنا) مکارم اخلاق میں سے ہے۔ (مرقاۃ ج ۱ ص ۱۲۶)

فائدہ عظیمہ : جب پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ ﴾ کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو پہلی کتاب میں نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا تم سے وعدہ لیا گیا ہے اسے پورا کرو۔اس کی وجہ بہت واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کی آمد کی بشارت پہلی کتب میں مختلف طریقوں سے دی گئی۔

☆ توراۃ میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ہاجرہ حضرت سارہ سے ناراض ہوگئیں۔ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک فرشتہ ملا۔اس نے پوچھا اے ہاجرہ کہاں کا ارادہ رکھتی ہو کس طرف متوجہ ہو؟ انہوں نے کہا میں اپنی سیدہ سارہ سے بھاگ کر جا رہی ہوں فرشتے نے کہا تم اپنی سیدہ کے پاس لوٹ جاؤ اچھے طریقہ سے ان کے ساتھ رہو۔اللہ تعالیٰ تمہیں بہت کھیتی باڑی عطا کرے گا،اور اولاد تمہیں عطا کرے گا اور تمہارے ہاں بیٹا ہوگا اس کا نام اسمٰعیل رکھنا۔اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری ابتلاء اور خشوع کو سنا ہے (تمہاری اولاد سے ایک شخص ہوگا)۔

" وھو یکون عین الناس وتکون یدہ فوق الجمیع وید الجمیع مبسوطۃ الیہ بالخضوع "

وہ تمام لوگوں کا سردار ہوگا، اس کا ہاتھ تمام پر ہوگا اور تمام لوگ ہاتھ عاجزی سے اس کی طرف پھیلائے ہوں گے۔ یہ صفات یقینی طور پر حضرت اسمعیل علیہ السلام میں نہیں تھیں فرشتہ جھوٹ سے پاک ہونے کی وجہ سے بات سچ اور حق کہہ رہا تھا لہذا یہ بشارت نبی کریم صلی اللہ علیہ کے آنے کے متعلق ہی تھی۔ توراۃ میں ہے۔

" ان الرب الهكم يقيم لكم نبيا مثلى من بينكم ومن اخوانكم "

(موسیٰ علیہ السلام نے کہا) بیشک رب تعالیٰ تمہارا الہ ہے وہ میری مثل تمہارے درمیان نبی کو قائم کرے گا جو تمہارے بھائیوں سے ہوگا۔

توراۃ کی اسی فصل میں مذکور ہے کہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا:

" انی مقيم لهم نبيا مثلک من بين اخوانهم وايما رجل لم يسمع كلماتى التى يؤديها عنى ذلک الرجل باسمى انا انتقم منه "

بیشک میں ان میں آپ کی طرح ان کے بھائیوں سے ایک نبی مبعوث کروں گا وہ نبی میرے کلام کو جب ان لوگوں پر میرا نام لے کر پیش کرے گا تو جو شخص اس کی بات کو نہیں سنے گا (سن کر قبول نہیں کرے گا) تو میں اس سے انتقام لوں گا۔

ان دونوں اقوال سے بہت واضح ہے کہ وہ بنی اسرائیل سے نہیں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بنی ہاشم کو یہ کہا جائے " انه سيكون من اخوانكم اماما " بے شک وہ تمہارے بھائیوں سے امام ہوگا۔ تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ بنی ہاشم سے نہیں ہوگا، بلکہ ان کے ساتھ متعلق دوسرے قبیلہ سے ہوگا۔

اب مسئلہ کو سمجھنا آسان ہوگیا کہ موسیٰ علیہ السلام جس نبی کی بشارت دے رہے ہیں اور " من اخوانکم " کہہ رہے ہیں اس نے بنی اسرائیل سے نہیں ہونا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام خود بنی اسرائیل سے ہیں۔ جب یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ "اسرائیل" حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ہے ان سے تعلق رکھنے والا قبیلہ یا تو ان کے بھائی عیص کا خاندان ہے۔ آپ کا ایک بھائی عیص تھا، عیص کی اولاد میں صرف ایک نبی ہوئے حضرت ایوب علیہ السلام جو کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے دنیا سے تشریف لے جا چکے تھے یقینی بات ہے کہ یہ بشارت حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق تو نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسرا خاندان جو یعقوب علیہ السلام سے متعلق تھا وہ آپ کے باپ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بھائی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا تھا۔ یہ بھی واضح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء کرام حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے، یعنی بنی اسرائیل سے تھے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے صرف نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی تھے، لہذا یقینی طور پر یہی کہا جائے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بشارت نبی کریم ﷺ کے متعلق ہی تھی۔

اعتراض: ابھی جو تم نے توراۃ سے روایات ذکر کی ہیں ان میں " من بینکم " کے الفاظ بھی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جس نبی کے آنے کی بشارت دی وہ بنی اسرائیل سے آنے کی خبر دی کیونکہ " من بینکم " کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ تمہارے خاندان سے ہوگا۔ کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ بشارت نبی کریم ﷺ کے متعلق دی گئی؟

جواب: ابھی ہم نے پہلے واضح کر دیا ہے کہ اس میں " من اخوانکم " سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے بنی اسرائیل کو یہ بتایا کہ وہ نبی تمہارے خاندان سے تو نہیں ہوں گے، البتہ تمہارے خاندان کے قریبی خاندان سے ہوں گے "من بینکم "کا مطلب یہ ہے " قام من بینکم " وہ تمہارے درمیان قائم رہیں گے۔ چونکہ مدینہ طیبہ اور اس کے اردگرد یہود محصور تھے جیسا کہ خیبر کے یہود، بنی نضیر، بنی قینقاع وغیرہ اسی طرح " من بینکم " کا مفہوم واضح ہوگیا۔

☆ توراۃ میں ذکر ہے:

" ان الرب تعالیٰ جاء فی طور سیناء وطلع لنا من ساعیر وظهر من جبال فاران "

بے شک رب تعالیٰ کا نور طور سیناء میں آیا اور ہمارے پاس روشنی میں نمودار ہوا اور فاران کے پہاڑوں میں ظاہر ہوا۔

اور کتاب حقوق میں مذکور ہے:

" وهو جاء الله من طور سینا والقدس من جبل فاران وانكشفت السماء من بهاء محمد وامتلأت الارض من حمده يكون شعاع منظره مثل النور "

وہ اللہ تعالیٰ (کا نور) طور سیناء سے آ گیا اور ذات قدس فاران کے پہاڑ سے ظاہر ہوئی اور محمد ﷺ کے حسن و جمال سے آسمان منکشف ہو گئے اور زمین آپ کی حمد سے بھر گئی۔ اور آپ کے منظر کی شعائیں نور کی طرح ہیں۔

ابوالحسین رحمہ اللہ نے کتاب الغرر میں نقل کیا ہے کہ مجھے نصاری کی نقول میں ملا:

" وظهر من جبال فاران لقد تقطعت السماء من بهاء محمد المحمود "

اس تمام کلام سے یہ واضح ہو گیا کہ تورات میں جو الفاظ " الرب تعالیٰ جاء " ہیں یا " ظهر الرب من جبل فاران " کے الفاظ ہیں۔ ان سے مراد خود رب تعالیٰ کا آنا نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے

" معناه ظهور شخص موصوف بهذه الصفات وما ذاک الا رسولنا محمد ﷺ "

معنیٰ اس کا یہ ہے کہ ایسا شخص ظاہر ہو گا جو ان صفات سے متصف ہو گا۔ وہ تمام صفات صرف ہمارے رسول محمد ﷺ میں پائی گئی ہیں۔ کیونکہ ان صفات میں یہ بھی ہے کہ اس کے دائیں طرف قدسی ہوں گے " فمنحهم العز " ان کو عزت عطاء فرمائے گا، یہ صفت صرف نبی کریم ﷺ کو ہی حاصل ہے۔

اعتراض: کتاب الغرر سے جو عبارت نقل کی گئی ہے اس کے آخر میں تو یہ بھی ہے " وانقاذ مسیحک " اور اس سے تمہارے مسیح کا چھڑانا ثابت ہو گا۔ اس سے تو یہ ہی پتہ چلتا ہے کہ " الرب تعالیٰ جاء " کا ظاہری معنیٰ ہی درست ہے کہ رب تعالیٰ ظاہر ہو گا اور مسیح کو چھڑائے گا اس سے مراد نبی کریم ﷺ کیسے ہو سکتے ہیں۔

جواب: " (وانقاذ مسیحک) فان محمدا علیه السلام انقذ المسیح من کذب الیهود والنصاری "

مسیح کو چھڑانے سے مراد یہ ہے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح شان بیان کر کے (کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ کے نبی ہیں آپ کی والدہ مکرمہ پاک دامن ہیں) ان کو یہود اور نصاری کے جھوٹ سے چھڑایا کیونکہ یہود آپ کو نبی نہیں مانتے تھے بلکہ معاذ اللہ آپ کی پیدائش کو پاکیزہ نہیں مانتے تھے یہ سراسر کذب بیانی تھی اسی طرح نصاری آپکو خدا یا دوسرا فرقہ آپ کو خدا کا بیٹا کہتا تھا، یہ بھی جھوٹ تھا۔

کتاب اشعیاء کی بائیسویں فصل میں ہے:

"قومی فازهری مصباحک (یرید مکة) فقدد ناوقتک وکرامة الله طالعة علیک فقد تجلل الارض الظلام وغطی علی الامم الضباب والرب یشرق علیک اشراقا ویظهر کرامته علیک تسیر الامم الی نورک والمملوک الی ضوء طلوعک وارفعی بصرکت الی ما حولک وتأملی فانهم مستجمعون عندک ویحجونک ویأتیک ولدک من بعید لأنک ام القری فأولاد سائرا البلاد کانهم اولاد مکة وتتزین ثیابک علی الارائک والسرور حین ترین ذلک تسرین وتبتهجین من اجل انه یمیل الیک ذخائر البحار ویحج الیک عساکر الامم ویساق الیک کباش مدینه ویاتیک اهل سبا ویتحدثون بنغم الله ویتمجدونه وتسیر الیک اغنام فاران ویرفع الی مذبحی ما یرضینی واحدث حینئذ لبیت محمدتی حمدا"

گویا مکہ مکرمہ کو رب تعالیٰ کی طرف سے خطاب کیا گیا (تمام صیغے اور ضمائر مؤنث کی ہیں) اے مکہ اٹھ کھڑا ہو اپنے چراغ روشن کر دے تیرا وقت قریب آ چکا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجھ پر تکریم کا ستارہ طلوع ہونے والا ہے تاریک زمین روشن ہو جائے گی قوموں پر سفید نورانی چادر چھا جائے گی۔ رب تعالیٰ کی تجلیات تجھ پر روشن ہو جائیں گی۔ اور ان تجلیات کی کرامات تجھ پر ظاہر ہوں گی۔ قومیں تیری نورانیت کی طرف کھچا کھچ چلی آئیں گی۔ بادشاہ تجھ پر طلوع ہونے والی روشنی کی طرف آئیں گے۔ (اے مکہ) تو اپنی نظر اٹھا کر اپنے ارد گرد کو دیکھ اور تأمل کر (سوچ) کہ سب لوگ تیرے پاس ہی جمع ہوں گے۔ اور تیرے پاس آ کر ہی حج کریں گے۔ اور سارے شہر تیری اولاد کی حیثیت ہیں کیونکہ تو "ام القری" ہے اور سارے شہروں کے باشندے گویا کہ مکہ کے ہی باشندے ہیں۔ (اے مکہ) اپنے تختوں کو خوبصورت کپڑوں سے مزین کرے اور جب تو اس (طلوع ہونے والے ستارے) کو تو دیکھے خوش ہونا اور اس لئے بھی خوش ہو جانا کہ تمام دریاؤں، سمندروں کے ذخیرے تری طرف ہی میلان کریں گے اور سب امتوں کے لشکر تیری طرف ہی حج کرنے آئیں گے۔ اور مدین سے دنبے تیری طرف ہی چلائے جائیں گے اہل سبا تیرے پاس آئیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے متعلق کلام کریں گے۔ اور رب تعالیٰ کی بزرگی بیان کریں گے اور فاران سے بھیڑ، بکریاں تیری طرف ہی چلائی جائیں گی۔ ان کو میری رضاء کے لئے ہی ذبح کی جگہ لایا جائے گا۔ اور اس وقت میری تعریف کا گھر نیا تعمیر کیا جائے گا۔

اس سے واضح ہوا کہ یہ تمام صفات مکہ مکرمہ کو ہی حاصل ہیں اور مکہ مکرمہ میں ظاہر ہونے والی روشنی اور طلوع ہونے والا ستارہ اور مکہ کو مکرمہ بنانے والی ہستی ہمارے نبی کریم محمد مصطفی ﷺ کی ذات ہی تھی۔" واحدث لبیت محمدتی حمدا " کا مطلب یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب لوگ حج میں یہ تلبیہ پڑھتے تھے:

" لبیک لا شریک لک لبیک اللہ شریک ھو لک تملکه و ما ملک "

اس تلبیہ میں اللہ تعالیٰ کا شریک ثابت کیا گیا اور یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے شرکاء کو خود ہی مالک بنایا ہے لیکن اسلام کے آنے کے بعد یہ تلبیہ پڑھا گیا " لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک " اس تلبیہ میں میں مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے شریکوں کی نفی کی گئی۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی تعریف میں غلط الفاظ کو نکال کر صحیح تعریف کر کے حمد کی تجدید کی گئی۔

☆ توراۃ میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ میں نے اسمٰعیل کے متعلق تمہاری دعا کو قبول کر لیا ہے اور ان کو برکت وعظمت سے سرفراز کر دیا ہے اور ان کی اولاد میں وہ عظیم شخص ہوں گے " واجعله لامة عظیمة " میں ان کو عظیم امت کا نبی بناؤں گا۔

یہ بشارت بھی نبی کریم ﷺ کے متعلق ہی ہے کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے عظیم امت کا عظیم نبی ہمارے نبی کریم ﷺ کے بغیر کوئی تھا ہی نہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جب کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انہوں نے ہمارے نبی کریم ﷺ کے لئے ہی مکہ مکرمہ میں مبعوث ہونے کے لئے ان الفاظ میں دعا کی۔

﴿ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴾

اور اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا " انا دعوة ابی ابرھیم وبشارة عیسیٰ " میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں اور عیسیٰ کی بشارت ہوں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی جس کا ذکر قرآن پاک میں ان الفاظ مبارکہ سے کیا گیا ہے:

﴿ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ ﴾

آپ نے اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دی کہ ان کا نام (احمد ہوگا)

" فانه مشتق من الحمد والاسم المشتق من الحمد لیس الانبینا فان اسمه محمد واحمد ومحمود "

حمد سے مشتق ہوگا حمد سے مشتق صرف ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے کیونکہ آپ کا نام محمد اور احمد اور محمود ہے۔

☆ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کی بشارت یوں دی گئی:

" ان مولده بمكة ومسكنه بطيبة وملكه بالشام وامته الحمادون "

بیشک ان کا مقام پیدائش مکہ ہوگا، وہ مدینہ طیبہ میں رہیں گے، ان کی بادشاہت شام میں ہوگی، ان کی امت حمد کرنے والی ہوگی۔

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین کو کہا:

" انا اذهب وسيأتكم الفار قليط روح الحق الذى لا يتكلم من قبل نفسه انما يقول كما يقول له "

میں جارہا ہوں اور عنقریب تمہارے پاس "فارقلیط" آئیں گے جو اللہ تعالیٰ کے مظہر ہوں گے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے خصوصی روح ان کو عطاء کر رکھی ہوگی۔ وہ اپنی طرف سے کلام نہیں کریں گے بلکہ وہی کہیں جو ان کو ارشاد ہوگا۔

یعنی آسان لفظوں میں یوں کہہ دیا جائے ان کو دیکھنا خدا کو دیکھنا ہوگا ان کا بولنا خدا کا بولنا ہوگا۔ اس کی تائید قرآن پاک کے ان الفاظ مبارکہ سے ہو رہی:

﴿ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ ﴾ میں نہیں تابعداری کرتا مگر اسی چیز کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے

"الفارقلیط" کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ایک یہ ہے کہ وہ میرے بعد آنے والے نبی شافع ومشفع ہوں گے یعنی شفاعت کرنے والے ہوں گے اور ان کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا۔ اور دوسرا معنی یہ ہے " هو الذى يفرق بين الحق والباطل " وہ حق اور باطل میں فرق کرنے والے ہوں گے۔

فائدہ: عیسیٰ علیہ السلام کے کلام میں ہے " انا اذهب " میں جارہا ہوں۔ کیا خوب الفاظ ذکر فرمائے جو واضح طور پر اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ آپ زندہ ہی آسمانوں پر جارہے ہیں کیونکہ آپ نے یہ نہیں فرمایا " انا اموت " میں فوت ہو رہا ہوں میری وفات کے بعد "فارقلیط" آئیں گے۔ بلکہ فرمایا میں جارہا ہوں میرے جانے کے بعد آئیں گے۔

سبحان اللہ، اللہ کے نبی کا کیا مقام ہے کہ آپ نے صدیوں پہلے اشارہ فرما دیا کہ لوگ میری

وفات کو ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے اور اپنے جھوٹے نبی کو مسیح موعود ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کریں گے لیکن ناکام ہی رہیں گے۔

" فھذہ ھی البشارات الوارد ۃ فی الکتب المقدمۃ بمبعث رسولنا محمد ﷺ "

یہ وہ بشارتیں ہیں جن کا ذکر پہلی کتب میں موجود ہے ، یہ بشارتیں ہمارے رسول محمد مصطفیٰ ﷺ کے مبعوث ہونے کے متعلق ہیں۔(ماخوذ از کبیر)

﴿ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴾ : دینی مدارس کے چھوٹی کلاسوں کے طلباء یہ خیال رکھیں کہ " ایای " ضمیر منصوب منفصل ہے جس کو فعل سے پہلے ذکر کیا گیا ہے جو حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔

" ارھبوا " جمع مذکر حاضر امر حاضر معلوم کا صیغہ ہے اس کے بعد نون مکسور ہے بظاہر چھوٹی کلاسوں کے طلباء غلطی میں پڑ جاتے ہیں کہ واوَ جمع کے بعد نون مفتوح ہوتا ہے یہاں نون مکسور کیوں ہے؟ تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ نون وقایہ ہے (نون جمع اور نون اعرابی نہیں) اس کے بعد یاء متکلم محذوف ہے اصل عبارت یہ ہے ﴿ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِیْ ﴾ اور مجھ سے ہی ڈرو۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ " فَارْهَبُوْنِ " میں فاء جزائیہ ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے " ان کنتم راھبین فایای ارھبوا " اگر تم ڈر رکھتے ہو تو مجھ سے ہی ڈرو۔ (از قرطبی)

" ارھبوا " ماخوذ ہے " رھبۃ " سے " رھبۃ " کا معنی ہے خوف۔ متکلمین حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرتا رہے۔ مکلّف کے خوف کی دو وجہ ہیں " احدھما مع العلم والآخر مع الظن " ان میں سے ایک وہ ہے جو یقین سے حاصل ہوتا ہے۔ اور دوسری قسم خوف کی وہ ہے جو ظن (گمان) سے حاصل ہوتا ہے۔ یقین کے ساتھ حاصل ہونے والے خوف کا یہ مطلب ہے کہ انسان کو یہ یقین ہو کہ میں نے تمام اوامر پر عمل کر لیا ہے اور تمام نواہی سے میں محفوظ رہا ہوں۔

" فان خوفہ انما یکون عن المستقبل " بیشک اسے مستقبل کا خوف ہو کہ ابھی تک تو اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہے کہ میں اوامر پر عمل کرتا رہا اور نواہی سے بچتا رہا، کہیں آگے جا کر شیطان اور نفس کے جال میں پھنس کر غلطی کا شکار نہ ہو جاؤں۔

وہ خوف جس کا تعلق ظن سے ہے وہ یہ ہے کہ اسے یہ یقین نہ ہو کہ اس نے تمام اوامر پر عمل کرلیا ہے اور تمام نواہی سے بچتا رہا" فحینئذ یخاف ان لا یکون من اهل الثواب " تو ایسی صورت میں وہ خوف رکھے گا کہ مجھے کامل ثواب تو حاصل نہیں ہوگا کہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔

تنبیہ : " واعلم ان کل من کان خوفه فی الدنیا اشد کان خوفة فی الدنیا اشد کان امنه یوم القیامة اکثر وبالعکس "

جان لیں بیشک ہر وہ شخص جسے دنیا میں زیادہ خوف حاصل ہوگا اسے قیامت کے دن بہت ہی زیادہ امن حاصل ہوگا۔ اس کے عکس میں عکس ہوگا یعنی جس شخص کو دنیا میں امن حاصل ہوا اللہ تعالیٰ کا خوف اس نے دل میں نہ رکھا وہ قیامت کے دن خوف میں مبتلا ہوگا۔

> " روی انه ینادی مناد یوم القیامة وعزتی وجلالی انی لا اجمع علی عبدی خوفین ولا امنین من امننی فی الدنیا خوفته یوم القیامة ومن خافنی فی الدنیا امنته یوم القیامة "
>
> قیامت کے دن رب تعالیٰ کی طرف سے نداء دی جائے گی مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم بیشک میں اپنے بندے کو دو خوف اور دو امن نہیں دیتا۔ جو شخص دنیا میں مجھ سے بے خوف رہا آج قیامت کے دن میں اسے خوف دوں گا اور جو شخص دنیا میں مجھ سے خوف رکھتا رہا آج قیامت کے دن میں اسے امن میں رکھوں گا۔

عارفین کا ارشاد گرامی:

> " الخوف خوفان خوف العقاب وخوف الجلال والاول نصیب اهل الظاهر والثانی نصیب اهل القلب والاول یزول والثانی لا یزول "

خوف کی دو قسمیں ہیں ایک وہ خوف ہے جو عذاب کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرا وہ خوف ہے جو اللہ تعالیٰ کے جلال کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ پہلا خوف اہل ظاہر کا حصہ ہے اور دوسرا خوف اہل قلب (یعنی صوفیاء کرام، اولیاء عظام) کا حصہ ہے جو عام لوگوں کو خوف حاصل ہے اس کی دارومدر چونکہ عذاب پر ہے جب عذاب کا خطرہ ٹل گیا تو خوف بھی جاتا رہے گا، لیکن وہ خوف جو اولیاء کرام کو حاصل ہے اس کی دارومدار اللہ تعالیٰ کے جلال پر ہے نہ اللہ تعالیٰ کے جلال میں زوال ہے اور نہ ہی اولیاء کرام کے خوف میں زوال ہونا ہے۔

آیۂ کریمہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

" واعلم ان فی الآیة دلالة علی ان کثرة النعم تعظم المعصیة و دلالة علی ان تقدم العهد بعظم المخالفة و دلالة علی ان الرسول کما کان مبعوثا الی العرب کان مبعوثا الی بنی اسرائیل "

اس آیۂ کریمہ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ کثیر نعمتیں عظیم معصیت کا سبب ہیں کیونکہ جب عظیم منعم کا انسان شکر گزار نہیں ہوگا تو اس کے لئے یہ بہت بڑی معصیت ہوگی۔ اور یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ وعدہ جب پرانا ہو جائے اس کی خلاف ورزی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ جس طرح عرب کی طرف مبعوث ہوئے اسی طرح بنی اسرائیل کی طرف بھی مبعوث ہوئے بلکہ آپ ساری کائنات کے نبی ہیں۔

انتباہ: " وایای فارهبون " اس پر دلالت کر رہا ہے کہ انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کا خوف رکھے کسی اور کا خوف نہ رکھے اور اسی طرح امید بھی صرف اللہ تعالیٰ پر رکھے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز رب تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہے اگر بندہ بھی مستقل بالفعل ہو تو بندے سے خوف رکھنا بھی ضروری ہو جائے گا اس صورت میں حصر فوت ہو جائے گی کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا "صرف مجھ سے ہی ڈرو"۔

" بل کان یجب ان لا یرهب الا نفسه لان مفاتیح الثواب و العقاب بیده لابید الله تعالیٰ فوجب ان لا یخاف الا نفسه و ان لا یخاف الله البتة "

بلکہ انسان کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ صرف اپنے نفس سے ڈرے کیونکہ ثواب اور عذاب کی چابیاں رب تعالیٰ نے اسے ہی دے دی ہیں اپنے دست قدرت میں ان کو رکھا ہی نہیں کہ انسان پر جبر نہ ہو۔ اسلئے ضروری ہے کہ انسان صرف اپنے آپ سے ڈرے، اپنے آپ سے ڈرنا ہی درحقیقت رب تعالیٰ سے ڈرنا ہے اسی سے یہ واضح ہوا کہ انسان کا طاعت کرنا ہی اصل میں خوف اور امید ہے۔ (از کبیر)

<u>صوفیا حضرات نے فرمایا:</u> خوف ہوتا ہے عذاب سے، یعنی عذاب سے ڈرا کر خوف دلایا جائے اور رھبۃ وہ خوف ہے جو ناراضگی، قہر، اعراض اور پردہ کر لینے کے ڈر کی وجہ سے ہوتا ہے اور خشیۃ اخص ہے رھبۃ سے کیونکہ اس کا تعلق صرف احتجاب ذات سے ہے اور رھبۃ کا تعلق عظمت ذات کی وجہ سے خوف سے ہے۔ (ابن عربی)

﴿ وَاٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ وَلَا تَكُوۡنُوۡٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوۡنِ ﴾

☆ ''اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے ساتھ ہے اور سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو اور مجھی سے ڈرو''۔

☆ ''اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے نازل کیا ہے تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے اور نہ ہو جاؤ تم پہلے اس کے انکار کرنے والے اور نہ حاصل کرو میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام، اور مجھ سے ہی ڈرو''۔

آیۃ کریمہ کا ماقبل سے تعلق:

اس آیۃ کریمہ میں بھی خطاب بنی اسرائیل کو ہی ہے، کیونکہ پہلے رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ﴾ ''میری نعمتیں یاد کرو''۔ پھر فرمایا ﴿ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡٓ ﴾ میرا وعدہ پورا کرو اب فرمایا: ﴿وَاٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلۡتُ﴾ جو میں نے نازل کیا اس پر ایمان لاؤ۔ اسی طرح ﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ ﴾ بھی اسی کی تصدیق کر رہا ہے کہ یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہی ہے کیونکہ قرآن پاک ان کے پاس جو آسمانی کتب تھیں ان کی تصدیق کر رہا ہے۔

شان نزول:

" عن ابن عباس رضي الله عنهما ان رؤساء اليهود مثل كعب بن الاشرف وحيى بن اخطب امثالهما كانوا يأخذون من فقراء اليهود الهدايا وعلموا انهم لو اتبعوا محمد الا نقطعت عنهم تلك الهدايا يا فاصروا علي الكفر لئلا ينقطع عنهم ذلك القدر المحضر "(از کبیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہود کے سردار کعب بن اشرف اور حی بن اخطب جیسے اور دوسرے سردار لوگ بھی یہود کے فقراء سے ہدیئے قبول کرتے تھے۔ انہیں

یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اگر انہوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا تو ان کے یہ حقیر ہدیے ختم ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ کفر پر ہی قائم رہے تا کہ ان کے ہدیے بھی قائم رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں ہی اس آیۂ کریمہ کو نازل کیا کہ تم علم والے ہو کر رب کے کلام کا سب سے پہلے انکار کر کے کافر نہ بنو، بلکہ رب تعالیٰ کے نازل کردہ کلام پر ایمان لاؤ، یہ تو وہ کلام جو تمہارے پاس آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ ﴾: ''اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے نازل کیا'' ﴿ مَا اَنْزَلْتُ ﴾ سے مراد قرآن پاک ہے اس پر دو دلیلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ رب تعالیٰ نے اس کی صفت بیان کی نازل کرنے سے، اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اس کی دوسری صفت بیان کی ﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾ (تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے) سے۔

ان دونوں چیزوں پر دوسری آیۃ واضح طور پر دلالت کر رہی، جس میں یہ دونوں صفتیں قرآن پاک کی بیان کی گئی ہیں:

﴿ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلِ ﴾ (آل عمران آیۃ ٣)

اس نے تم پر سچی کتاب اتاری، اگلی کتابوں کی تصدیق فرمائی اور اس نے اس سے پہلے توراۃ اور انجیل اتاری

" وقال قتادہ المراد ﴿ آمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتَ ﴾ من كتاب ورسول تجدونه مكتوبا في التوراة والانجيل "

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ﴿ آمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتَ ﴾ سے مراد قرآن پاک اور رسول اللہ ﷺ ہیں یعنی ان کو یہ حکم دیا کہ تم توراۃ اور انجیل میں جس نبی کے آنے اور اس پر اترنے والے کلام یعنی قرآن پاک کا تذکرہ پاتے ہو وہ آ چکے ہیں ان پر ایمان لاؤ

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾: کی دو تفسیریں ہیں ایک یہ کہ قرآن پاک میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام حق ہیں اور بیشک توراۃ و انجیل حق ہیں، اور بیشک توراۃ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ قرآن پاک پر ایمان لانا درحقیقت توراۃ اور انجیل پر

ایمان لانے کی تاکید ہے۔ گویا کہ ان کو یوں کہا گیا:

" ان کنتم تریدون المبالغة فی الایمان بالتوراة والانجیل فآمنوا بالقرآن فان الایمان به یؤکد الایمان بالتوراة والانجیل "

اگر تم توراۃ اور انجیل پر ایمان میں اور زیادہ کمال پیدا کرنا چاہتے ہو تو قرآن پاک پر ایمان لے آؤ اس لئے کہ قرآن پاک پر ایمان لانے سے ہی توراۃ وانجیل پر ایمان میں پختگی ہوگی۔ اور دوسری تفسیر، توراۃ وانجیل میں نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت دی گئی اور قرآن پاک کے نازل ہونے کی بشارت دی گئی۔ اب اس سے واضح ہوا:

" الایمان ب محمد وبالقرآن تصدیق للتوراة والانجیل وتکذیب محمد والقرآن تکذیب للتوراة والانجیل "

کہ نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک پر ایمان لانا توراۃ وانجیل کی تصدیق ہے اور نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک کی تکذیب توراۃ وانجیل کی تکذیب ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ دوسری تفسیر زیادہ بہتر ہے کیونکہ پہلی تفسیر سے اتنا تو واضح ہے کہ قرآن پاک توراۃ وانجیل کی تصدیق کرتا ہے لیکن یہ ثابت نہیں کہ ﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾ سے ہی نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے یہ دوسری تفسیر سے ہی واضح ہو رہا ہے۔

فائدہ: دوسری تفسیر نبی کریم ﷺ کی نبوت پر بھی دو وجہ سے دلالت کر رہی ہے:

" الاول ان شهادة کتب الانبیاء علیهم السلام لا تکون الا حقا "

پہلی وجہ یہ ہے کہ جب انبیاء کرام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتابوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کی خبر دی تو یقیناً انبیاء کرام پر نازل ہونے والی کتابوں کی خبر حق ہے۔

" والثانی انه علیه السلام اخبر عن کتبهم ولم یکن له معرفة الا من قبل الوحی "

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے آسمانی کتابوں کی خبر دی ان کی حقانیت کی تصدیق فرمائی تو آپ کو یہ معرفت یقیناً صرف وحی کے ذریعے حاصل ہوئی۔ اور جس ذات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئے وہ نبی ہی تو ہوتا ہے۔ (از کبیر)

قرآن پاک نے کتب سماویہ کی کن امور میں تصدیق کی؟

قرآن پاک توراۃ (وانجیل) کے ساتھ توحید اور نبوت اور اخبار اور نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان کرنے میں موافق ہے۔ اسی طرح قصص اور مواعید اور توحید کی دعوت دینے اور عبادت کا حکم دینے اور لوگوں کے درمیان عدل کرنے کا حکم دینے میں اور گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے روکنے میں قرآن پاک پہلی آسمانی کتابوں کے موافق ہے۔ تمام انبیاء کرام توحید کی دعوت دینے میں اور پانچ عبادات کا حکم دینے میں اور حلال وحرام کے احکام بیان کرنے میں اور زجر کرنے میں متفق رہے۔

اس سے واضح ہوا کہ دینوں اور ملتوں کے اختلاف اور زمانے کے اختلاف سے اصول اور کلیات شرعیہ میں اتفاق رہا جزئیات اور فروع میں اختلاف رہا۔ (از بیضاوی)

اعتراض: نبی کریم ﷺ کی شریعت تو پہلی شریعتوں کی ناسخ ہے تصدیق کرنے والی کیسے ہے؟

جواب: "والنسخ ليس بتكذيب بل بيان لانتهاء الحكم بانتهاء مصلحته التي شرع لها" (تبصير الرحمن)

نسخ تکذیب نہیں بلکہ حکم کی انتہاء کا بیان ہے۔ کیونکہ جو احکام منسوخ ہوتے ہیں وہ مختلف زمانوں اور قوموں کی مصلحت کے لئے نافذ ہوتے ہیں۔ جب تک ان کا قائم رہنا بہتر ہوتا ہے ان کو ثابت رکھا جاتا ہے اور جب ان احکام کے ختم کرنے میں مصلحت ہوتی ہے ان کو منسوخ کردیا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح مرض کی دوا مختلف زمانوں، مختلف اشخاص کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ جو حکیم ہے اس نے اپنی حکمت کے پیش نظر مختلف قوموں کے مزاج کے مطابق احکام نافذ فرمائے۔ جیسا کہ مسند احمد میں ہے:

"عن جابر انه ﷺ قال حين قرأ بين يديه عمر رضي الله عنه شيئا من التوراة لو كان موسى حيا لما وسعه الا اتباعي"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو توراۃ کا کچھ حصہ پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔

اور دارمی کی روایت میں ہے:

" والذی نفس محمد بیده لو بدالکم موسی فاتبعتموه وتر کتمونی لضللتم عن سواء السبیل ولو کان حیاء ادرک نبوتی لا تبعنی "

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے اگر تمہارے پاس موسیٰ آ جائیں تم ان کی تابعداری کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے اور اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور میری نبوت کو پالیتے تو وہ ضروری میری تابعداری کرتے۔ (از روح المعانی)

﴿ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ ﴾: "اور نہ ہو تم پہلے پہلے کفر کرنے والے اس کے ساتھ"

اعتراض: جب یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے۔ جو مدینہ طیبہ میں تھے تو یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ تم سب سے پہلے قرآن پاک کا انکار کرنے والے نہ بنو۔ حالانکہ ان سے پہلے مکہ کے مشرکین قرآن پاک اور نبی کریم ﷺ کا انکار کر چکے تھے۔

جواب نمبر ۱: یہ کلام بطور تعریض کی گئی یعنی ظاہری طور پر اور مطلب لیا گیا اور درحقیت اور ہے گویا کہ ان کو یہ کہا گیا ہے کہ تم پر واجب ہے کہ نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لاؤ کیونکہ تم تو علم رکھتے ہو اور نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی تم دوسرے لوگوں کو بھی بشارت دیتے رہے اور آپ کے تشریف لانے سے پہلے تم ان کے وسیلہ سے کافروں پر فتح بھی طلب کرتے رہے۔ لیکن جب آپ تشریف لائے تو تم نے الٹا عمل شروع کر دیا کہ انکار کرنے لگے۔

جواب نمبر ۲: ہوسکتا ہے کہ یہاں حذف مضاف ہو۔ اصل مقصد یوں ہو:

﴿ وَلَا تَكُونُوٓا مِثْلَ أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ ﴾

تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے قرآن پاک سے پہلے پہلے کفر کیا۔

وہ مشرکین تو آپ کی شان کو جانتے ہی نہیں تھے لیکن اے بنی اسرائیل تم تو توراۃ وانجیل میں آپ کے اوصاف اور آپ کی تشریف آوری کو پڑھ چکے ہو۔ تمہارا انکار کرنا اور ہی باعث تعجب ہے۔

جواب نمبر ۳: خطاب جب یہود کو ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل علم تم تمام یہودیوں سے پہلے کفر کرنے والے نہ بنو کیونکہ باقی یہودی تو علم نہیں رکھتے، تمہارا سب سے پہلے انکار کرنا اور ہی باعث تعجب ہے۔

جواب نمبر ۴: اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے تم اپنی کتاب سے کفر نہ کرو کیونکہ نبی کریم ﷺ کی تکذیب درحقیقت ان کی اپنی کتب کی تکذیب تھی، کیونکہ ان میں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا تھا۔

(از کبیر)

زیادہ بہتر جواب یہ ہے: کہ تجارتی طور پر مشرکین مکہ کا مدینہ میں آنا جانا تھا۔ مشرکین جاہل تھے وہ بعض اوقات یہود کے علماء سے کئی مسائل پوچھتے رہتے تھے، نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت کے بعد بھی مشرکین نے ممکن ہے یہود سے مشورہ لیا ہو، انہوں نے نبی کریم ﷺ کی تکذیب کی ہو، اس لحاظ پر سب سے پہلے کفر کرنے والے حقیقت میں وہی تھے۔

اعتراض و جواب کے بغیر ترجمہ:

﴿ وَلَا تَكُونُوٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ﴾ ای لا تسارعو الی الکفر به "

تم کفر کی طرف جلدی نہ کرو یہ ترجمہ کرنے سے اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا نہ جواب دینے کی ضرورت ہے۔

(از روح المعانی)

﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ : اشتراء کا معنی خریدنا۔ اور بیچنے والے اور خریدنے والے کے درمیان جو رقم طے ہو جائے اسے ثمن کہا جاتا ہے۔ دو شخص مہارت رکھنے والے جو رقم طے کریں کہ یہ چیز اتنے کی ہوگی، اسے قیمت کہا جاتا ہے۔ آیۃ کریمہ میں اشتراء اور " ثمن " کا معنی حقیقی مراد نہیں لیا جا سکتا۔ بلکہ مجازی معنی مراد ہوگا۔ اس لئے " اشتراء " کا معنی ہے " استبدال " (تبدیل کرنا) اور ثمن کا معنی دنیاوی مال بطور رشوت لے لینا جیسا کہ شان نزول سے واضح ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے مومنوں کے لئے جو نعمتیں تیار کی گئی ہیں وہ عظیم ہیں اور ہمیشہ رہنے والی ہیں اسی مسئلہ کو ان الفاظ میں دیکھئے:

" وما اعد الله تعالیٰ للمؤمنین من النعیم العظیم الابدی "

لیکن دنیاوی مال کی یہ حیثیت ہے " حظوظ الدنیا الفانیة القلیلة المسترذلة " دنیاوی مال فانی اور قلیل اور گھٹیا ہے۔

اب مفہوم واضح ہو گیا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے ”میری آیتوں پر ایمان لانا جو اخروی عظیم نعمتوں کا ذریعہ ہے جو نعمتیں ہمیشہ رہنی ہیں فنا نہیں ہونی ان کے بدلے (یعنی ایمان نہ لا کر ان کے بدلے) دنیا کا فانی اور گھٹیا مال حاصل نہ کرو جو اخروی نعمتوں کے مقابل قلیل ہے۔ (از روح المعانی)

اس تفسیر سے یہ اعتراض خود بخود اٹھ گیا کہ رب تعالیٰ نے تھوڑے دام حاصل کرنے سے منع فرمایا ہے کیا زیادہ دام لے کر اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو بدلا جا سکتا ہے؟

تو اس کا جواب واضح ہے کہ ساری دنیا کے خزانے اخروی نعمتوں کے مقابل قلیل ہیں۔ لہذا ساری دنیا حاصل کر کے بھی رب تعالیٰ کی آیات کو بدلنا کفر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کو مدنظر رکھنے سے یہ مسئلہ بہت واضح ہو جاتا ہے ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ اے محبوب فرمادیں دنیا کا مال قلیل ہے۔

اعتراض: آیات پر ایمان نہ لانے کے بدلے دنیا کا مال حاصل کرنے سے منع کرنا تو اس وقت درست ہو سکتا ہے جب کہ انہوں نے پہلے ایمان لایا ہوا ہو۔ پھر کہا جائے کہ میری آیات کے بدلے تھوڑا مال حاصل نہ کرو، ان کا تو ایمان تھا ہی نہیں۔ ان کو آیات کے بدلے تھوڑا مال لینے سے منع کرنے کا کیا مقصد ہے۔

جواب: اس کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے توراۃ پر ایمان لایا ہوا تھا۔ اسی توراۃ کی آیات کے بدلے وہ دنیا کا مال حاصل کرتے تھے جو گھٹیا اور فانی اور قلیل تھا۔ اس سے ان کو منع کیا گیا کہ اے توراۃ پر ایمان لانے والو نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لا کر توراۃ کی آیات کو نہ بدلو۔ (از روح المعانی)

﴿وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ﴾: (اور مجھ سے ہی ڈرو) (ترکیب یہاں بھی ﴿وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ﴾ کی طرح ہی ہے)۔

یعنی تم تقوی اختیار کرو، میرا خوف اپنے دل میں رکھو تا کہ تم ایمان لاؤ، اور حق کی تابعداری کر سکو، اور میری آیات کے بدلے دنیا کا گھٹیا مال حاصل کرنے سے بچ سکو۔

نکتہ: پہلی آیت میں خطاب ہے بنی اسرائیل کے عوام کو اس لئے اس میں ﴿وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ﴾ کہا کیونکہ رھبۃ تقوی کا مقدمہ ہے لیکن اس آیۃ میں خطاب ہے بنی اسرائیل کے علماء کو، اس لئے یہاں تقوی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ اس کی انتہاء ہے۔ (از مظہری)

یعنی رھبۃ کا مقام تقوی سے کم ہے، اس لئے کہ پہلے رھبۃ دل میں آئے پھر تقوی حاصل ہوتا ہے، اسی لئے خوف کا اعلیٰ مقام تقوی میں ہی پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کو خطاب کرتے ہوئے تقوی کا ذکر کیا۔

(از روح المعانی)

دنیا کے گھٹیا ہونے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ذیشان:

" قد اربع الناس فی الدنیا باربعة ..... اکل وشرب وملبوس ومکنوح .....
ومرجع الکل ان فکرت فیه الی ..... روث وبول ومطروح ومفضوح "

لوگ دنیا میں چار چیزوں کے بدلے چار چیزیں حاصل کرتے ہیں..... کھانا اور پینا اور لباس اور شادی ..... اگر تو ان سب میں فکر کرے تو ان سے حاصل ہونے والی چیزیں..... پیشاب، پاخانہ اور پھٹے ہوئے لباس کو پھینک دینا اور شادی کے بعد پریشانی۔

(از عزیزی)

بنی اسرائیل کے طور طریقے مسلمانوں میں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل چلے گئے لیکن وہ اپنے طور طریقے غیروں میں چھوڑ گئے۔

☆ بنی اسرائیل کا طریقہ رکھنے والا پہلا فرقہ بدقماش علماء کا ہے جو دنیا داروں اور ظالموں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ اپنی لذات اور خواہشات کو پورا کرنے کیلئے ان کے مظالم اور ان کے گھٹیا اور ناجائز کاموں کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے ناجائز کاموں کو جائز کرنے کیلئے حیلے تلاش کرتے رہتے ہیں۔

☆ بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چلنے والا (دوسرا فرقہ رشوت خور قاضیوں (ججوں) اور بے باک مفتیوں کا ہے جو رشوت حاصل کرنے کے لئے شریعت کے حکم کو تبدیل کر دیتے ہیں، مدعی کو مدعا علیہ بنا دیتے ہیں اور مدعا علیہ کو مدعی بنا دیتے ہیں یوں سمجھیں آئین کے پاسبان آئین کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں۔

چور اور ڈاکو ان سے اس لئے اچھے ہوئے ہیں کہ وہ ظاہر طور پر آئین کی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں لیکن یہ بظاہر آئین کے محافظ بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ درحقیقت آئین کا مزاح اڑانے والے یہی ہوتے ہیں۔ جدھر پیسہ گیا ادھر فیصلہ گیا۔ جدھر ڈنڈے والوں نے فیصلہ کرنے کا اشارہ دیا وہی فیصلہ کر دیا۔ لیٹروں اور غاصبوں کا ساتھ دینا کون سا انصاف ہے۔ آئین کی رو سے معطل شدہ کو نہ صرف بحال کرنا بلکہ اس کو مراعات دینا، اسے محافظ بنا دینا، اسے سیاہ وسفید کا مالک بنا دینا کون سا انصاف ہے؟

☆ بنی اسرائیل کے طرز عمل پر چلنے والا تیسرا فرقہ ظالم بادشاہوں اور بے انصاف حاکموں کا ہے جو مظلوموں کو انصاف نہیں دلاتے اور نہ ہی اپنے کارندوں کے غلط فیصلوں سے انہیں پوچھتے ہیں، ان کے ہر سیاہ و سفید کام پر آنکھیں بند کیے رہتے ہیں، ملک و ملت کے سب سے بڑے دشمن یہی ہیں۔

☆ چوتھا طبقہ جو بنی اسرائیل کا طریقہ رکھتا ہے وہ معلمین اور واعظین کا ہے جو بغیر دنیاوی مال حاصل کرنے کے کسی کو کوئی مسئلہ نہ بتائیں۔ اگر کوئی علم دین کی بات پوچھے تو انہوں نے اس کی قیمت مقرر رکھی ہو کہ ایک مسئلہ پوچھنے پر اتنی رقم دینی ہوگی اور دو پر اتنی رقم ہوگی۔

خیال رہے کہ کسی مدرسہ وغیرہ میں تعلیم دینا اور تنخواہ حاصل کرنا اس حکم میں نہیں، اس کا ذکر انشاء اللہ تفصیلی طور پر آگے آئے گا۔

☆ پانچواں طبقہ بنی اسرائیل کا طریقہ رکھنے والا وزراء اور دفاتر کے آفیسران کا ہے جو رعایا کا مال ناجائز طریقہ سے حاصل کرنے میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں رکھتے۔

حقیقت یہی ہے کہ ہم اپنے ملک "پاکستان" کو دیکھتے ہیں قرضے لے لے کر ملک کو برباد کر دیا۔ قرض کو بامقصد کم اور بے مقصد زیادہ خرچ کرنے والے اور خود ذاتی طور پر ملک و ملت کے پیسے کو ہڑپ کرنے والے ہی اس ملک کو دولخت کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ وہی لوگ دوسرے لوگوں کو پیسے دے کر اپنا آلہ کار بنانے والے اور دوسروں سے لڑانے والے، ملک میں افراتفری پیدا کرنے والے ہیں۔

تعلیم و تدریس، امامت و خطابت پر اجرت لینے کا مسئلہ:

خیال رہے کہ اس مسئلہ میں دو رخ ہیں۔ ایک جائز ہے اور دوسرا ناجائز ہے۔

پہلا رخ جو جائز ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی کو تعلیم و تدریس کیلئے ایک جگہ مقرر کر دیا جائے کہ تم نے یہاں اتنے وقت کے لئے پڑھانا ہے اس پر اجرت مقرر کرنا یعنی تنخواہ لینا جائز ہے، یہ درحقیقت نیکی کے کام کی اجرت نہیں بلکہ اپنا وقت صرف کرنا اور اپنے آپ کو ایک جگہ پابند کرنے کی وجہ سے تنخواہ لینا ہے۔

یہی صورت امامت و خطابت کی ہے جب کسی کو ایک مسجد میں نماز پڑھانے اور جمعہ کا خطبہ دینے کے لئے مقرر کر دیا جائے تو وہ اپنے وقت کی پابندی اور ایک جگہ اپنے آپ کو پابند رکھنے کی تنخواہ لے سکتا ہے۔ بلکہ آج کل کے دور میں اس قسم کا نظام قائم کرنا بہت بہتر ہے تاکہ علم دین میں

کمی واقع نہ ہو۔

" قال فی الهداية وبعض مشائخنا رحمهم الله تعالیٰ استحسنوا الاستئجار علی تعليم القرآن اليوم لظهور التوانی فی الامور الدينية ففی الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوی " (شافی ج ۵ ص ۳۸)

علماء ومشائخ کا فتویٰ اسی پر ہے کہ ایک جگہ مقرر کر کے قرآن پاک کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے خصوصاً ہمارے دور میں جبکہ امور دینیہ میں سستی ہوگئی ہے اگر اس طرح انتظام نہ کیا جائے تو قرآن پاک کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جائے۔

دوسرا رخ جو ناجائز ہے، وہ یہ ہے کسی سے مسئلہ پوچھا اس نے کہا مجھے اتنی اجرت دو تو میں مسئلہ بتاؤں گا کسی کو کہا مجھے قرآن پاک کا یہ سبق بتا دو اس نے کہا مجھے اتنی رقم دو میں تمہیں قرآن پاک کے یہ الفاظ پڑھاؤں گا، کہیں نماز کا وقت ہوگیا کسی کو کہا آپ امامت کرا دیں وہ صاحب کہیں مجھے اتنے پیسے دو تو میں نماز پڑھاؤں گا۔ ان تمام صورتوں میں وقت مقرر نہیں جگہ مقرر نہیں کسی کو پابند نہیں کیا گیا یہ خالص نیکی کے کام کی اجرت لی جا رہی ہے جو ناجائز ہے۔

یہ بات نہ بھولئے:

" درزمان سابق ائمه وخطباء ومؤذنین " حسبة لله "، بایں اعمال مشغول میشدند چنانچه قاضیاں ومفتیان ومحتسبان وتحصیل کنندگان خراج وعشر وزکوة نیز بهمیں نیت خالصه بایں مشغول میگشتند وچوں خلفای راشدین وسلاطین عادلین دیدند که ایں جماعت خودرا مشغول باقامت ایں عبادات ساخته اند برای معاش آنها ازمال مسلمین امدادی مقرر کردندنه باجرت بلکه بنا براعانت " (عزیزی)

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں لوگ صرف اللہ تعالیٰ کے رضاء کے لئے امامت وخطابت کے فرائض سرانجام دیتے تھے اسی طرح قاضی، مفتی، محتسب حضرات بھی اپنے منصب پر صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے قائم رہتے لیکن ان کی معاونت عشر، خراج اور زکواۃ کے مال سے کی جاتی تھی، تا کہ یہ لوگ دل جمعی سے یہ کام کرسکیں کہیں معاش کی تنگی کی وجہ سے یہ نیکی کے کام نہ چھوڑ دیں، بلکہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں ان کی معاونت کے لئے خصوصی فنڈ مقرر کیا جاتا تھا وجہ وہی تھی کہ یہ لوگ مطمئن ہو کر نیکی کے کاموں میں مشغول رہیں۔

اسی سے یہ واضح ہوا کہ کسی شخص کو کسی جگہ وقت کا پابند کر کے اس سے امامت وخطابت، تعلیم تدریس کا کام لیا جائے اور اسے تنخواہ دی جائے تو " این اجرت بر نفس ایں عبادات نیست بلکه بر اداى آں عبادات در مکانی خاص یا درزمانی خاص این خصوصیت داخل عبادت نیست جائز داشته اند " یہ اجرت عبادات کی نہیں بلکہ ان عبادات کو مخصوص مکان میں ادا کرنا، یا مخصوص زمانہ میں ادا کرنا اور ان کی اجرت مقرر کرنا یہ جائز ہے کیونکہ وقت اور جگہ کا خاص کر کے پابند کرنا عبادت کا حصہ نہیں۔ (از عزیزی)

ھدیہ اور رشوت میں فرق:

ھدیہ جائز ہے اور رشوت حرام ہے لہٰذا ان میں فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

" الصدقة ما ينفق على الفقراء ويراد به ثواب الآخرة ولا يكافى وفيه ذل للمعطى له والهدية يراد بها الاكرام للمهدى او ينفق على الاغنياء "

جو مال فقراء پر خرچ کیا جائے اس میں آخرت کے ثواب کی نیت پائی جائے اور اس کے بدلے میں کوئی چیز حاصل نہ کی جائے اسے صدقہ کہا جاتا ہے اس میں جسے صدقہ دیا جاتا ہے اس کی حقارت ہوتی ہے۔ (لمعات حاشیه مشکوة ص ۱۶۱)

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی اہل پر صدقہ حرام قرار دیا، لیکن وہ مال جو کسی کو دیا جائے اس کی عزت افزائی کے لئے خواہ فقیر کو دیں یا غنی کو اسے ہدیہ کہا جائے گا۔ یہ بھی خیال رہے کہ ہدیہ میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی لیکن ثواب از خود حاصل ضرور ہوتا ہے کیونکہ فقیر کو مال صرف اس کی عزت افزائی کے لئے دیا جائے، صرف تعلقات کے قائم کرنے کی غرض سے دیا جائے تو پھر بھی اس میں فقیر کی معاونت پائی گئی جو باعث ثواب ہے۔

اگر غنی کو ہدیہ دیں، ثواب کی نیت نہیں لیکن ثواب اس لئے خود حاصل ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادِ گرامی " تهادوا تحابوا " (او كما قال صلى الله عليه وسلم) (ایک دوسرے کو ہدیہ دو جو باہمی محبت کا ذریعہ) پر عمل ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی پر عمل یقیناً باعث ثواب ہے۔

رشوة: "الرشوة بتثلیث الراء ما یعطیه الشخص الحاکم وغیره لیحکم له اویحمله علی ما یرید"

جب کوئی شخص حاکم وغیرہ کو مال دے تا کہ یہ میرے حق میں فیصلہ کریں یا میرے ارادہ کے مطابق میری امداد کرنے پر یہ مال ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا کردے اسے رشوۃ کہا جاتا ہے۔

رشوت کی چار قسمیں ہیں:

نمبر ۱: "ما هو حرام علی الآخذ والمعطی وهو الرشوة علی تقلید القضاء والامارة"

یعنی ان میں سے پہلی قسم یہ ہے جو لینے والے اور دینے والے کے لئے حرام ہے یہ وہ رشوت ہے جس سے کوئی منصب حاصل کیا مثلاً جج بنا تو رشوت دے کر، حاکم بنا تو رشوت دے کر، اسی طرح حقدار نہ ہونے کے باوجود بغیر میرٹ کے دوسروں کی حق تلفی کر کے کوئی منصب حاصل کرے رشوت دے کر یہ حرام ہے اوراس کی حرمت لینے اور دینے والے کے لئے ایک طرح ہی ہے۔

نمبر ۲: "ارتشاء القاضی لیحکم وهو کذالک ولو القضاء بحق لانه واجب علیه"

جج اس لئے پیسے لے کر یہ رقم مجھے دو تو میں فیصلہ دوں گا ورنہ میں اس میں تاخیر کرتا رہوں گا، قاضی کا یہ رقم لینا اور مقدمہ والے شخصوں کا مال دینا دونوں کے لئے حرام ہے کیونکہ قاضی (جج) پر مقدمہ کا فیصلہ کرنا شرعاً واجب ہے اگر ایک رقم دے کر فیصلہ کرائے تو قاضی کو ہمیشہ کے لئے حرام خور بنا دیا گیا یہی وجہ ہے کہ قاضی کا حرام خور ہونا اور قاضی کو حرام خور بنانا دونوں ناجائز ہیں۔

نمبر ۳: بادشاہ سے مال لینا تا کہ بادشاہ کے پاس میرا مرتبہ بلند ہو اور بادشاہ کی طرف سے مجھے کوئی نقصان نہ ہو یہ مال لینا حرام ہے۔

"الثالث اخذ المال لیسوی امره عند السلطان دفعا للضرر او جلبا للنفع وهو حرام علی الاخذ فقط"

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ بادشاہ کو کسی کو مال دینا اس وقت حرام نہیں ہوگا جب وہ اپنا حلال طریقہ سے کمایا ہوا مال دے حرام طریقہ سے کسب کیا ہوا مال بادشاہ کا دینا بھی حرام ہوگا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ قومی خزانہ ایسے بکاؤ لوگوں پر لٹانا بھی حرام ہے۔

کئی مولویوں اور پیروں کی شکل والے لیٹروں کو دیکھتا ہوں کہ ہر حکومت کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔حق و باطل میں وہ فرق کر ہی نہیں سکتے ورنہ ان کو دیا جانے والا ان کا مال بند ہو جائے گا۔ایسے لوگوں کی داڑھیوں کو نہ دیکھیں،ان کے میک اپ کو نہ دیکھیں،ان کے جبہ ودستار کو نہ دیکھیں،ان کی شیروانی وقراقلی ٹوپی کو نہ دیکھیں،عورتوں کی طرح نکالے ہوئے ان کے گھونگٹ کو نہ دیکھیں،اخبارات میں ان کی تصاویر کو نہ دیکھیں اخبارات میں ان کے بیانات کو نہ دیکھیں صرف یہ دیکھیں کہ یہ ہر حکومت کی تعریف کرنے والے،ہر ظالم وفاسق کو ولی اور شریعت کا پاسبان کہنے والے اپنے ہی ملک کو فتح کرنے والے بزدل کو بہادر کہنے والے ہیں۔ہاں یہ بھی بنی اسرائیل کی طرح رب تعالیٰ کی آیات کے بدلے دنیا کا حقیر مال بٹور کر ملک وملت اور دین کے دشمن ہیں۔

نمبر ۴: " الرابع ما یدفع لدفع الخوف من المدفوع الیه علی نفسه او ماله حلال للدافع حرام علی الآخذ لان دفع الضرر عن المسلم واجب ولا یجوز لیفعل الواجب "

رشوت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو ڈرایا دھمکایا جائے اسے قتل کرنے،قید کرنے وغیرہ کی دھمکیاں دی جائیں،اس کا مال چھین لینے کے اسے دھمکیاں دی جائیں۔جب کہ وہ مجرم بھی نہیں،تو وہ مال دے کر اپنی جان بچاتا ہے اور اپنا مال بچاتا ہے تو اس صورت میں مال دینا تو جائز ہے وہ شخص تو گنہگار نہیں ہوگا،لیکن لینے والا حرام مال لے رہا ہے اس لئے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو جانی اور مالی نقصان نہ پہنچائے۔

خصوصاً ارباب اختیار اور حکام کی ذمہ داری ہی یہی ہے۔اگر وہ لوگ جو محافظ ہیں ظالم بن کر لوگوں سے مال ان ناجائز ہتھکنڈوں سے حاصل کریں تو یقیناً وہ حرام کا ارتکاب کر رہے ہیں۔
(از شامی ج ۴ ص ۳۳۷)

قاضی کے لئے ہدیہ قبول کرنے کا حکم:

قاضی کو جو شخص ہدیہ دے رہا ہے اسے دیکھا جائے کہ اس کا مقدمہ قاضی کے پاس ہے یا نہیں اگر اس کا مقدمہ قاضی کے پاس ہے یعنی وہ اپنے جھگڑے کا فیصلہ اسی شخص سے کرانا چاہتا ہے جسے ہدیہ دے رہا ہے تو قاضی کا یہ ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں۔یہ حکم عام ہے خواہ ہدیہ دینے والا اس کا قریبی رشتہ دار

ہو یا وہ قاضی کو پہلے بھی ہدیہ دیتا رہتا ہو۔ کیونکہ اب اس کا مقدمہ قاضی کے پاس ہے لہٰذا قاضی اگر اس سے ہدیہ قبول کرے گا تو اس کے لئے اس میں تہمت پائی جائے گی۔

اگر اس شخص کا مقدمہ قاضی کے پاس نہیں لیکن وہ قاضی کا قریبی ذی رحم رشتہ دار بھی نہیں اور اس کی قاضی کو قاضی بننے سے پہلے ہدیہ دینے کی عادت بھی جاری نہیں تو اس شخص سے بھی قاضی کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے وہ قاضی سے حمایت حاصل کرنا چاہتا ہو۔

ہاں اگر ایک شخص کا مقدمہ قاضی کے پاس نہیں اور وہ قاضی کا ذی رحم رشتہ دار ہے تو اس سے ہدیہ قبول کرنا جائز ہے کیونکہ ہدیہ قبول کرنے میں صلہ رحمی ہے اور ہدیہ نہ قبول کرنے میں قطع رحمی ہے اور قطع رحمی ناجائز ہے۔ اسی طرح ایک شخص کا مقدمہ قاضی کے پاس نہیں، لیکن وہ قاضی سے تعلقات رکھتا ہے، قاضی کو قاضی بننے سے پہلے بھی وہ ہدیہ دیتا رہتا تھا، اس شخص سے قاضی کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے کیونکہ یہ پرانی عادت کے مطابق ہے، یہ ہدیہ قاضی کو اس کے منصب قضاء کی وجہ سے نہیں دیا گیا۔

اصل میں بخاری و مسلم کی روایت ہے جو ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں:

" استعمل النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلا من الازد یقال لہ ابن اللتبیة علی الصدقة فلما قدم قال ھذا لکم وھذا لی قال علیہ الصلوة والسلام ھلا جلس فی بیت ابیہ اوبیت امہ فینظر ا یھدی لہ ام لا "

نبی کریم ﷺ نے ازد قبیلہ کے ایک شخص کو عامل بنا کر بھیجا، اس شخص کو ابن اللتبیۃ کہا جاتا تھا۔ جب وہ صدقات کا مال لائے تو کہنے لگے یہ مال تمہارا ہے اور یہ میرا ہے (مجھے ہدیہ دیا گیا) نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر کیوں نہیں بیٹھ رہا۔ پھر وہ دیکھتا کہ اسے ہدیہ دیا جاتا یا نہ دیا جاتا۔

فرمان عمر بن عبدالعزیز:

" قال عمر بن عبد العزیز کانت الھدیة علی عھد رسول اللہ ﷺ ھدیة والیوم رشوة "

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ھدیہ واقعی ھدیہ ہوتا تھا لیکن آج کے دور میں ہدیہ رشوت کے درجہ میں آ گیا۔

یعنی نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ہدیہ دینے والا اس ہدیہ کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ کرانے کا تصور بھی نہیں کرتا تھا لیکن آج لوگ قاضیوں کو ہدیہ دے کر غلط فیصلے کرانا چاہتے ہیں۔

(ماخوذ از هدایه ، عنایه ، فتح القدیر ۳۷۱ ، کتاب القاضی ج ۲)

قاضی کا دعوت کو قبول کرنا:

" ولا یحضر دعوة الا اذا کانت عامة ولا خصومة لصاحب الولیمة العامة ویدخل فی هذا الجواب قریبه فلا یجیب دعوته الا اذا کانت عامة ولا خصومة له " (فتح القدیر ج ٦ ص ۳۷۲)

قاضی عام دعوت ولیمہ میں جا سکتا ہے وہ بھی اس وقت جب دعوت ولیمہ کرنے والا کا مقدمہ قاضی کے پاس نہ ہو۔ دعوت عامہ کا یہ مطلب ہے کہ قاضی کے جانے یا نہ جانے میں اس دعوت میں کوئی فرق نہ پڑے اور قاضی کے کہنے پر وہ تاریخ مقرر نہ کی گئی ہو۔

قاضی اپنے رشتہ داروں کی دعوت ولیمہ میں اسی وقت شریک ہوسکتا ہے جب ان کا مقدمہ قاضی کے پاس نہ ہو۔ اگر ان کا مقدمہ قاضی کے پاس ہو تو پھر اپنے رشتہ داروں کی دعوت ولیمہ میں بھی اسے شریک ہونا جائز نہیں۔

حرام کاموں کی اجرت لینا بھی حرام ہے:

" ولا تصح الاجارة لاجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی "

(در مختار باب الاجارة)

گناہوں کے کاموں پر اجرت لینا ناجائز ہے جیسا کہ گانا گانے کی اجرت لینا اور میت پر نوحہ کرنے کی اجرت لینا، اسی طرح ڈھول باجا وغیرہ پر اجرت لینا ناجائز ہے۔ ہاں البتہ نکاح کا اعلان کرنے کے لئے دف بجانا، یا جہاد کا اعلان کرنے کے لئے دف بجانا بھی جائز ہے، اور اس پر اجرت لینا بھی جائز ہے۔

دم اور تعویذ اور ان پر ھدیہ لینے کا حکم:

اصل بات یہ ہے کہ مسئلہ کو جب واضح طور پر بیان کر دیا جائے کہ کون سی صورتیں ناجائز ہیں اور کون سی جائز ہیں تو مسئلہ میں نہ کوئی اختلاف رہے گا اور نہ کوئی جھگڑا، جب مسئلہ کی ایک صورت کو بیان

کر دیا جائے اور دوسری کو چھوڑ دیا تو یقیناً وہ جھگڑے کا سبب بنے گا۔

آیئے اس پر احادیث کو دیکھئے دونوں رخ واضح ہو جائیں گے کہ کون سے تعویذات یا دم ناجائز ہیں اور کون سے جائز ہیں۔

☆ "عن زینب امرأة عبد الله بن مسعود ان عبد الله رأى في عنقي خيطا فقال ما هذا فقلت خيط رقي لي فيه قالت فاخذه فقطعه ثم قال انتم آل عبد الله لاغنياء عن الشرک سمعت رسول الله ﷺ يقول ان الرقى والتمائم والتولة شرک فقلت لم تقول هكذا لقد كانت عيني تقذف وكنت اختلف الى فلان اليهودى فاذا رقاها سكنت فقال عبد الله انما ذلک عمل الشيطان كان ينخسها بيده فاذا رقى كف عنها انما كان يكفيک ان تقولى كما كان رسول الله ﷺ يقول اذهب البأس رب الناس واشف انت الشافي لا شفاء الا شفاؤک شفاء لا يغادر سقما رواه ابو داؤد" (مشکوۃ کتاب الطب والرقی)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ زینب کہتی ہیں کہ بیشک (ان کے خاوند) عبداللہ نے میری گردن میں ایک دھاگہ دیکھا جس میں منتر پڑھا گیا تھا۔ وہ کہتی ہیں انہوں نے اسے پکڑ کر کاٹ دیا، پھر کہا تم کو اے آل عبداللہ شرک سے دور رہنا ضروری ہے۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا بیشک منتر، تعویذات اور جادو شرک ہیں (ان کی زوجہ کہتی ہیں) میں نے کہا یہ تم کیسے کہہ رہے ہو حالانکہ مجھے ایک مرتبہ نظر لگی ہوئی تھی تو میں نے ایک یہودی سے منتر پڑھوایا تو ٹھیک ہوگئی۔ انہوں نے کہا یہ شیطان کا عمل ہے وہی اپنا ہاتھ وہاں لگاتا ہے جب وہ منتر پڑھتا ہے تو وہ تکلیف رک جاتی ہے۔ (ہاں اگر تم دم کرنا ہی چاہتی ہو) تو تمہارے لئے وہ الفاظ کافی ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے (دم کرتے ہوئے) کہے (وہ الفاظ یہ ہیں):

"اذهب البأس رب الناس واشف انت الشافي لا شفاء الا شفاؤک شفاء لا يغادر سقما"

وضاحت حدیث:

یہ ایک حدیث ہی مکمل سمجھ آ جائے تو سارا مسئلہ نکھر کر سامنے آ جائے گا۔ "انتم آل عبد الله" لفظ آل پر نصب ہے، حرف ندا محذوف ہے اصل میں "یا آل عبد الله" ہے "لاغنياء" میں لام تاکید کے لئے ہے اب معنی واضح سمجھ آ گیا کہ اے آل عبداللہ تم شرک سے دور رہو۔

حدیث پاک سے بہت عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ صحابی رسول اللہ ﷺ نے اپنی زوجہ کو اپنی اہل میں شامل کیا تو پتہ چلا کہ زوجہ اہل میں داخل ہے۔ ازواج مطہرات کو اہل میں داخل نہ کرنا اور آیہ تطہیر سے خارج کرنا بہت بڑی بے انصافی ہے۔

" (ان الرقی) ای رقیة فیها اسم صنم او شیطان او کلمة کفر او غیرها مما لا یجوز شرعا ومنها ما لم یعرف معناها "

وہ کون سا دم اور کون سا منتر شرک ہے وہ یہ ہے کہ جس میں بتوں کا نام ہو اور شیطان کا نام ہو، اور کفریہ کلمات ہوں، یا ان کے علاوہ ایسے الفاظ ہوں جو شرعا جائز نہیں، یا ان الفاظ کے معانی کا ہی پتہ نہ ہو کہ یہ شریعت میں جائز ہیں یا نہیں۔

" التمائم جمع تمیمة وهی التعویذة التی تعلق علی الصبی لا یکون فیها اسماء اللہ تعالیٰ وآیاته المتلوة والدعوات الماثورة "

تعویذات سے مراد وہ تعویذ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی نہ ہوں قرآن پاک کی آیات نہ ہوں، احادیث مبارکہ میں پائی جانی والی دعائیں نہ ہو۔ ایسے تعویذ بچے کے گلے میں لٹکانا شرک کا ذریعہ ہیں۔

" وقیل هی خزرات کانت للعرب تعلق علی الصبی لدفع العین بزعمهم "

اسی طرح عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں نظر بد سے بچنے کے لئے گلے میں منکے ڈالتے تھے اور ان کو مؤثر حقیقی مانتے تھے۔ ان کو شرک کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ (والتولة) تاء پر ضمہ بھی ہے اور کسرہ بھی اور واؤ پر فتحہ ہے یہ جادو کی ایک قسم ہے جس کو شرک کا ذریعہ قرار دیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہودی کے دم کرنے کو شیطان کا عمل قرار دیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہو سکتا ہے وہ ایسے الفاظ استعمال کرے جو ہماری شریعت میں جائز نہ ہوں۔ لیکن انہوں نے وہ دم پڑھنے کی اجازت فرمائی جو نبی کریم ﷺ پڑھا کرتے تھے۔

اس لئے واضح ہوا کہ آیات قرآنیہ اور ادعیہ ماثورہ سے دم کرنا یا ان کو لکھ کر گلے میں ڈال لینا جائز ہے۔ البتہ عقیدہ یہی رکھے کہ اس میں تاثیر اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے مؤثر حقیقی وہی ہے۔

(از مرقاۃ ج۸ ص ۳۵۹)

☆ عن جابر قال سئل النبی ﷺ عن النشرة فقال هو من عمل الشیطان رواه ابوداؤد . (مشکوۃ کتاب الطب والرقی)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سے نشرہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا یہ شیطانی عمل ہی۔ نشرہ (بضم النون وسکون الشین المعجمة) زمانہ جاہلیت میں کوئی منتر پڑھا جاتا تھا خیال یہ کیا جاتا تھا کہ اس سے شیطان وجن منتشر ہو جاتے ہیں۔

. اس سے تو نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا " ثم نشره بقل اعوذ برب الناس " لیکن اس کے بعد سورۃ الناس کے ذریعے جنوں کو دور کرنے کی اجازت عطاء فرمائی۔

" (فقال) ای النبی صلی الله علیه وسلم (هو من عمل الشیطان) النوع الذی کان اهل الجاهلیة یعالجون به ویعتقدون فیه واماما کان من الآیات القرآنیة والاسماء والصفات الربانیة والدعوات الماثورة النبویة فلا بأس بل یستحب سواء کان تعویذا اور رقیة او نشرة "

نبی کریم ﷺ نے جس منتر اور جھاڑن سے منع فرمایا وہ زمانہ جاہلیت والا تھا جادو کی ایک قسم تھی، جس کو وہ کامل مؤثر سمجھتے تھے۔لیکن قرآنی آیات اور اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات اور احادیث میں مذکور دعاؤں سے علاج کرنا جائز ہے بلکہ مستحب ہے خواہ ان سے دم کریں یا ان کو لکھ کر گلے میں ڈال لیں یا ان کے ذریعے آسیب زدہ کا علاج کریں۔ (از مرقاۃ ج ۸ ص ۳۶۰)

☆ " عن عائشة قالت امر النبی ﷺ ان یسترقی من العین ...... بخاری ومسلم "
(مشکوۃ کتاب الطب والرقی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ ہمیں نظر کا دم کرانے کے متعلق حکم فرماتے تھے۔نظر کے دم سے مراد وہ ہے جو بخاری اور مسلم اور ابوداؤد اور نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

" انه صلی الله علیه وسلم کان یقرأ علی نفسه بالمعوذات وینفث "

نبی کریم ﷺ معوذات کو پڑھ کر اپنے آپ پر پھونکتے یعنی اپنے آپ کو دم کرتے تھے۔اپنے آپ پر کیسے پھونکتے تھے " ینفث علی یدیه ثم یمسح بهما وجهه وجسده " آپ پڑھ کر

اپنے ہاتھوں پر پھونکتے پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے اور جسم پر پھیرتے۔

معوذات سے مراد یا تو صرف سورۃ الفلق اور الناس ہے دو کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے ہوسکتا ہے آپ سورۃ اخلاص بھی ساتھ پڑھتے ہوں البتہ تغلیب کے طور پر ذکر معوذات کا کر دیا گیا ہو۔

" ویمکن ان یضم معها قل یا ایها الکافرون علی ما هو المتعارف فی بعض البلاد قراء ة و کتابة وتعلیقا وشربا "

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ان کے ساتھ قل یا ایها الکفرون سورۃ بھی ملا لیتے ہوں جیسا کہ ہمارے شہروں میں متعارف ہے کہ اس سورۃ کو بھی پڑھ کر دم کیا جاتا ہے اس کو لکھ کر گلے میں تعویذ ڈال کر اس سے نفع حاصل کیا جاتا ہے اور اسے لکھ کر پانی میں گھول کر پیا جاتا ہے یعنی چار قل پڑھ کر دم کیا جاتا ہے۔ (از مرقاۃ ج ۸ ص ۳۴۹)

☆ عن عوف بن مالک الا شجعی قال کنا نرقی فی الجاهلیة فقلنا یا رسول الله کیف تری فی ذلک فقال اعرضوا علی رقاکم لا بأس بالرقی ما لم یکن فیه شرک ...... روه مسلم" (مشکوۃ کتاب الطب والرقی)

حضرت عوف بن مالک اشجعی کہتے ہیں ہم زمانہ جاہلیت میں دم کرتے تھے ہم نے کہا یا رسول اللہ آپ اس میں کیسے دیکھتے ہیں آپ نے فرمایا اپنے دم مجھ پر پیش کرو (یعنی مجھے پڑھ کر سناؤ) وہ دم کرنے جائز ہیں جن میں شرک کے الفاظ نہیں۔

اب اس سے بہت واضح ہوا کہ صرف وہ دم اور تعویذات منع ہوں گے جن میں کلمات شرکیہ اور کفریہ پائے جائیں گے لہذا اس مسئلہ میں فیصلہ کن بات یہی ہے کہ قرآن پاک کی آیات احادیث مبارکہ میں پائی جانے والی دعائیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات نبی کریم ﷺ کے اسماء گرامی غرضیکہ ہر وہ الفاظ جن کے معانی معلوم ہوں اور ان میں شرک وکفر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور نبی کریم ﷺ کی تعریف پائی گئی ہو وہ جائز ہے۔ مرقاۃ کے حوالہ سے جو عبارات ذکر کی ہیں ان کے قریب ہی نووی علی المسلم جلد ثانی ص ۲۲۷ میں بھی دیکھیں۔

☆ عن ابی سعید الخدری ان ناسا من اصحاب رسول الله ﷺ کانوا فی سفر فمروا بحی من احیاء العرب فاستضافوهم فلم یضیفوهم فقالوا لهم هل فیکم راق فان سید الحی لدیغ او مصاب فقال رجل منهم نعم فاتاه فرقاة بفاتحة الکتاب فبرأ الرجل فاعطی قطیعا

من غنم فابی ان یقبلها وقال حتی اذکر ذلک للنبی ﷺ فاتی النبی ﷺ فذکر ذلک له فقال یا رسول الله والله ما رقیت الا بفاتحة الکتاب فتبسم وقال وما ادراک ثم قال خذوا منهم واضربوا لی بسهم معکم.

(مسلم جلد ثانی باب جواز اخذ الاجرة علی الرقیة بالقرآن والاذکار)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے کچھ لوگ سفر میں تھے۔ عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ پر ان کا گزر ہوا۔ ان سے انہوں نے مہمانی طلب کی (یعنی کھانا طلب کیا) انہوں نے ان کی مہمانی نہ کی پھر وہ صحابہ کو کہنے لگے کیا تم میں سے کوئی دم کرنے والا بھی ہے؟ بیشک ہمارے قبیلہ کے سردار کو (سانپ نے) ڈس لیا ہے۔ صحابہ کرام میں سے ایک شخص نے کہا ہاں (یعنی ہم میں دم کرنے والا موجود ہے) وہ شخص آیا اس نے اس ڈسے ہوئے شخص پر سورۃ فاتحہ کی تلاوت کی وہ ٹھیک ہو گیا۔ اس شخص نے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ دم کرنے والے کو دیا۔ لیکن اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کروں گا۔ (اگر آپ نے اجازت دی تو قبول کرلوں گا)۔

وہ صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اپنے اس واقعہ کا ذکر کیا تو یہ بھی عرض کیا کہ یا رسول اللہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے اور کوئی دم تو نہیں پڑھا صرف سورۃ فاتحہ ہی پڑھی رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور آپ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ بھی دم ہے۔ پھر آپ نے فرمایا ان لوگوں سے بکریاں لے لو اور اپنے ساتھ میرا حصہ بھی مقرر کر لینا۔

وضاحت حدیث:

مسلم کی اس حدیث میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے دم کرنے والے شخص کا ذکر صیغہ غائب سے ذکر فرمایا لیکن وہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی تھے " هذا الراقی هو ابو سعید الخدری الراوی کذا جاء مبینا فی روایة اخری غیر مسلم " مسلم کے بغیر دوسری ایک روایت میں واضح طور پر ذکر ہے کہ وہ دم کرنے والے حضرت ابوسعید خدری تھے جو حدیث کے راوی ہیں۔ " فاعطی قطیعا من الغنم " قطیع کا معنی ریوڑ، گلہ دس سے لے کر

چالیس تک جس میں تعداد ہو اسے بھی قطیع کہا جاتا ہے اور پندرہ سے پچیس تک جس میں تعداد ہو وہ بھی قطیع ہے۔

" والمراد بالقطيع المذكور فى هذا الحديث ثلاثون شاة كذا جاء مبينا "

حدیث شریف میں جس قطیع کا ذکر ہے اس سے مراد تیس بکریاں ہیں کیونکہ دوسری حدیث میں واضح طور پر تیس بکریوں کا ذکر پایا گیا ہے۔

" (ما ادراک انها رقية) فيه التصريح بانها رقية فيستحب ان يقرأ بها على اللديغ والمريض وسائر اصحابه الاسقام والعاهات "

" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کیا تمہیں معلوم نہیں یہ دم ہے اس سے واضح ہو گیا کہ سورۃ فاتحہ دم ہے ڈسے ہوئے شخص پر اور مریض پر، اور ہر قسم کی بیماری والے پر، اور ہر قسم کے مصیبت زدہ پر سورۃ فاتحہ پڑھنا مستحب ہے"۔

ہاں البتہ یہ خیال کیا جائے کہ پڑھنے والا جتنا زیادہ نیک ہوگا، جتنا زیادہ کسی ولی اللہ کا مقرب ہوگا جسے کسی نیک شخص نے پڑھنے کی اجازت دے رکھی ہوگی یقیناً زیادہ اثر ہوگا۔

" (قوله صلى الله عليه وسلم خذوا منهم واضربوا لى بسهم معكم) هذا تصريح بجواز اخذ الاجرة على الرقية بالفاتحة والذكر وانها حلال لا كراهية فيها وكذا الاجرة على تعليم القرآن "

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ وہ بکریاں ان سے لے لو اور اپنے ساتھ ان میں میرا حصہ بھی مقرر کر دینا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا جائے یا کوئی اور ذکر ہو جس کے ذریعے دم کیا جائے اس پر ہدیہ لینا جائز ہے اور اسی طرح قرآن پاک کی تعلیم پر ہدیہ لینا بھی جائز ہے۔

اور خاص کر کے اگر یہ خیال کریں کہ محدث رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کا عنوان کیا مقرر کیا ہے تو مسئلہ ہی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ عنوان کا نام ہی یہ ہے " قرآن پاک اور دوسرے اذکار کے ذریعے دم پر اجرت (ہدیہ) لینے کے بیان میں۔

" (قوله صلى الله عليه وسلم واضربوا لى بسهم معكم) فانما قاله تطييبا لقلوبهم ومبالغة فى تعريفهم انه حلال لا شبهة فيه "

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ اپنے ساتھ میرا حصہ بھی مقرر کر لینا اس کا مطلب یہ تھا کہ اس سے صحابہ کرام کے دلوں کو خوش کرنا مقصود تھا کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کو ہدیہ دے کر خوشی محسوس کرتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کو کامل طرح پہچان کرانی مقصود تھی کہ یہ حلال ہے اس کے حلال ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ سبحان اللہ جس چیز کو نبی کریم ﷺ نے بغیر شک وشبہ کے حلال قرار دیا ہو اس کے حلال میں کوئی شک کرے یا حرام ہونے کا فتویٰ لگاتا پھرے تو وہ اپنی جہالت پر روئے۔

ایک یہ بھی خیال رہے کہ اصل میں اس ہدیہ کے مالک تو صرف حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ تھے لیکن ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وہ بکریاں تمام ساتھیوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا جو اس قافلہ میں شریک تھے اور اپنا حصہ بھی مقرر کرنے کا حکم دیا اس کی وجہ صرف یہ تھی:

"فهذه القسمة من باب المروات والتبرعات ومواساات الاصحاب والرفاق"

تاکہ ان کے درمیان بھائی چارہ قائم ہو ایک دوسرے پر مہربانی کرنے کا طریقہ آئے اپنی خوشی سے ایک دوسرے پر مہربانی کریں۔ (ماخوذ از نووی)

قرآن خوانی اور ہدیہ:

اس مسئلہ میں بھی نزاع صرف اسی وجہ سے پایا جاتا ہے کہ ہر فریق ایک شق کو ذکر کرتا ہے دوسری کو چھوڑ دیتا ہے اگر مسئلہ واضح طور پر بیان کیا جائے تو کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ اگر اجرت مقرر کر کے قرآن خوانی کرائی جائے کہ ایک پارہ پڑھنے کی اتنی رقم دی جائے گی تو یہ ناجائز ہے اور ایسے طریقہ سے قرآن پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ شامی نے اس مسئلہ کو بہت واضح بیان کیا ہے۔ لیکن قرآن پڑھنے والے اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کے لئے پڑھیں اور پڑھانے والے میت کو ثواب پہنچانے کی غرض سے بطور صدقہ ان کو کھانا کھلائیں یا نقد ہدیہ دیں تو جائز ہے۔

بلکہ یہ بھی خیال میں رہے کہ عبادات کو مخصوص وقت اور مخصوص جگہ میں ادا کرنے کا پابند کیا جائے تو وقت کی اجرت مقرر کرنا بھی جائز ہے یہ مسئلہ پہلے واضح کر دیا گیا ہے، اگر کوئی شخص کسی طالب علم یا حافظ قرآن کو کہتا ہے تم نے اتنے دن اتنے وقت کے لئے میرے فلاں رشتہ دار کی قبر پر قرآن

پاک پڑھنا ہے تو وہ اجرت مقرر کر بھی لے تو جائز ہے۔

لیکن راقم کے خیال کے مطابق اس گئے گزرے ہوئے دور میں بھی ایسا کرتے ہوئے کسی کو دیکھا نہیں گیا۔ کچہریوں میں جا کر کوئی کاغذ لکھوا کر بھی دیکھ لیں اور علماء سے فتاوی لکھا کر بھی دیکھ لیں آپ کو خود بخود سمجھ آ جائے گا کہ بفضلہ تعالیٰ علماء اور عوامی لوگوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

راقم جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی میں آنے والے سوالات کے جوابات تحریر کرتا ہے۔ کبھی کبھی میرے چھٹی کر کے آ جانے کے بعد فتوی لکھانے والے میرے مسکن پر بھی آ جاتے ہیں۔ کئی لوگ از خود ہدیہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ کتنا ہدیہ پیش کیا جائے لیکن میں نے بفضلہ تعالیٰ کبھی کسی سے کوئی ہدیہ قبول نہیں کیا خواہ کوئی اپنی خوشی سے ہی دینے کی کوشش کیوں نہ کرے

سب سے بڑی وجہ اس کی یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ میں نے پیسے دے کر اپنی مرضی کا فتوی حاصل کر لیا ہے اللہ کے فضل و کرم سے کبھی کوئی مسئلہ راقم نے کسی سے مرعوب ہو کر یا مرغوب ہو کر نہیں لکھا۔ جنڈ کے علاقہ کے کسی ابوجہل کو غلط فہمی ہوئی جیسا کہ اس نے میرے ایک فتوی کے متعلق تحریر کیا ہے کہ یہ فتوی مرعوب ہو کر یا مرغوب ہو کر لکھا گیا:

" اللهم انا نعوذبک من الجاهلين المتعصبين "

☆☆☆☆☆

وَلاَ تَلبِسُوا الُحَقَّ بِالُبَاطِلِ وَتَكتُمُوا الُحَقَّ وَاَنتُم تَعلَمُونَ

☆ اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور دیدہ دانستہ حق نہ چھپاؤ۔

☆ اور نہ ملاؤ حق سے باطل کو اور حق کو نہ چھپاؤ جان بوجھ کر۔

﴿ وَلاَ تَلبِسُوا ﴾: ''خلط ملط نہ کرو'' بعض حضرات نے فرق بیان کیا ہے کہ '' لبس '' کے لام پر جب زبر ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے خلط ملط کرنا، ملا جلا دینا اور لام پر پیش ہو تو اس کا معنی لباس پہننا، تاہم مفردات راغب میں لام کی زبر سے معنی لباس پہننا کیا گیا ہے چونکہ لباس کا مطلب ہے ڈھانپنا اور جب ایک چیز کا دوسری سے التباس لازم آئے تو وہاں بھی ستر کا معنی پایا جاتا ہے۔ گویا کہ لباس پہننا اور خلط ملط کرنا دونوں کا ایک مادہ لیا گیا ہے ''لبس'' لام کے فتحہ سے۔

﴿ اُلحَقَّ ﴾: حق کا اصل معنی مطابقۃ اور موافقۃ۔

☆ پھر حکمت کے تقاضا کے مطابق کسی سبب کی وجہ سے کسی چیز کے ایجاد کرنے والے کو بھی حق کہا جاتا ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ کے متعلق بھی کہا گیا'' وھو الحق '' یعنی اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی بھی حق ہے۔

☆ اسی طرح سبب کے لحاظ کے بغیر حکمت کے تقاضا کے مطابق ایجاد کرنیوالے کو بھی حق کہا جاتا ہے

☆ اور کوئی چیز بذاتہ جیسی ہو اس کے مطابق اس کا اعتقاد رکھنا بھی حق کہلاتا ہے جیسا کہ کہا جائے

'' اعتقاد فلان فی البعث والثواب والعقاب والجنة والنار حق ''

فلاں کا اعتقاد قیامت اور ثواب اور عذاب اور جنت اور دوزخ کے متعلق حق ہے۔

☆ اس قول اور فعل کو بھی حق کہا جاتا ہے جو اسی طرح واقع ہو جس طرح واجب ہے اور اسی قدر کے مطابق جتنی مقدار میں واجب ہے۔ اور اسی وقت میں ہو جس میں واجب ہو۔ جیسے کہا جائے ''فعلک حق وقولک حق '' تمہارا فعل حق ہے اور تمہارا قول حق ہے۔ (از مفردات راغب)

﴿ بِالُبَاطِلِ ﴾: '' الباطل نقیض الحق وھو مالا ثبات له ''

باطل حق کی نقیض ہے یعنی جس چیز میں ثبات نہ پایا جائے اسے باطل کہا جاتا ہے۔

(مفردات راغب)

" والباطل هو الزائل كما فی قول لبید "

باطل زائل ہونے والی چیز کو بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ لبید کے اس شعر میں یہی معنی ہے۔

الا كل شئی ما خلا الله الباطل　　　و كل نعيم لا محالة زائل

خبردار اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز زائل ہونے والی ہے　　　اور ہر نعمت عطا کرنے والے نے یقیناً زائل ہونا ہی ہے

مقام توجہ: ﴿وَلاَ تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ایک معنی یہ ہے

" لا تخلطوا الحق المنزل فی التوراة بالباطل الذی اخترعتموه وكتبتموه "

توراۃ میں جو حق نازل ہے اسے اس باطل سے نہ ملاؤ جو تم نے خود اختراع کیا ہے (گھڑا ہے) اور تم نے وہ خود ہی لکھا ہے

دوسرا معنی یہ ہے:"لا تجعلوا ذلک ملتبسا مشتبها غير واضح لا يدركه الناس بسبب الباطل وذكره"

باطل کو حق کے ساتھ ملا کر حق میں التباس اور اشتباہ نہ ثابت کرو کہ جس سے وہ واضح ہی نہ رہے اور لوگ اسے سمجھ ہی نہ سکیں۔اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے یہ دوسرا معنی ہی ذکر فرمایا"اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ" راقم نے بھی اعلیٰ حضرت کے معنی کو ہی نقل کیا ہے اور اسی معنی کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے راجح قرار دیا

دو معنی جو ذکر کئے گئے ہیں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان کو ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد فرمایا:

" ولعل الاول ارجح لانه اظهر واكثر لا ، لان جعل وجود الباطل سببا لالتباس الحق ليس اولى من العكس لما انه لما كان المذموم هو التباس الحق بالباطل وان لزمه العكس وكان هذا طارئا على ذلک استحق الاولوية التی نفيت "

شائد پہلا معنی راجح ہو کیونکہ وہ ظاہر ہے اور اکثر حضرات نے اسے استعمال کیا ہے لیکن ایسا ہے نہیں اس لئے کہ حق کو باطل سے ملایا جائے اور باطل حق میں التباس پیدا کرے یہ معنی بہتر نہیں۔بلکہ بہتر معنی یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ باطل کو حق سے ملا کر التباس واشتباہ پیدا نہ کرو کیونکہ حقیقت میں یہی فعل قابل مذمت ہے۔اگر یہ کہنا زیادہ بہتر ہوتا کہ حق کو باطل سے ملا کر حق میں التباس پیدا نہ کرو تو اسے اولی اور راجح قرار دیا جاتا لیکن میں نے اس کی

اولویت (بہتر ہونے) کی نفی کر دی ہے۔ (از روح المعانی)

حق و باطل سے مراد یہاں کیا ہے؟

اس میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) "ولا تکتبوا فی التورة ما لیس فیها فیختلط الحق المنزل بالباطل الذی کتبتم"

توراۃ میں وہ نہ لکھو جو اس میں نہیں کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو باطل تم نے اپنے ہاتھوں سے خود لکھا اسے حق سے ملا دیا گیا اور حق کو باطل سے خلط ملط کر دیا گیا۔

(۲) ولا تخلطوا الحق الذی انزل علیکم من صفة محمد صلی الله علیه وسلم فی التوراة بالباطل الذی تکتبونه بایدیکم من تغییر صفته"

اور وہ حق جو توراۃ میں اللہ تعالیٰ نے نازل کیا یعنی محمد مصطفیٰ ﷺ کی صفات کو ذکر کیا اس کے ساتھ اس باطل کو نہ ملاؤ جو تم اپنے ہاتھوں سے لکھ کر نبی کریم ﷺ کی صفات کو بدل رہے ہو

(۳) ولا تخلطوا صفة محمد ﷺ هی الحق بالباطل ای بصفة الدجال وذلک انه لما بعث رسول الله ﷺ حسده الیهود وقالوا لیس هو الذی تنتظره وانما هو المسیح بن داؤد یعنی الدجال وکذبوا فیما قالوا"

نبی کریم ﷺ کی صفات حق ہیں ان کے ساتھ باطل کو نہ ملاؤ جو تم (معاذ اللہ) ان میں دجال کی صفات کو بیان کرتے ہو اس کی وجہ یہ تھی کہ جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو یہود آپ سے حسد کرنے لگے اور انہوں نے کہا کہ یہ وہ نبی نہیں جن کی تم انتظار کر رہے تھے، یہ تو داؤد علیہ السلام کی اولاد سے آنے والا شخص مسیح دجال ہے (معاذ اللہ) یہ ان کا قول سراسر جھوٹ پر مبنی تھا۔ (خازن)

(۴) ولا تلبسوا الیهودیة والنصرانیة بالاسلام وانتم تعلمون ان دین الله الاسلام وان الیهودیة والنصرانیة بدعة لیست من الله"

اسلام کے ساتھ یہودیت اور نصرانیت کو نہ ملاؤ۔ اس لئے کہ تمہیں معلوم ہے کہ اسلام حق ہے اور یہودیت و نصرانیت جو تمہاری ایجاد کردہ ہیں وہ باطل ہیں۔ (ابن کثیر)

تمام معانی کا جامع معنی: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے:

" لا تخلطوا ما عندکم من الحق فی الکتاب بالباطل " (قرطبی)

تمہارے پاس کتاب میں جو بھی مذکور ہے وہ حق ہے اس کے ساتھ باطل کو نہ ملاؤ۔

البتہ یہ خیال رہے کہ وہ زیادہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف وکمالات کو ہی چھپاتے تھے تا کہ لوگ آپ پر ایمان نہ لے آئیں، کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ سے حسد کرتے تھے وہ چاہتے یہ تھے کہ آپ کو ماننے والے کم ہوں لیکن ایمان والوں کی تعداد بڑھتی رہی آج بھی یہودی اور نصرانی علماء کو ختم کرنے کے درپے ہیں لیکن انشاءاللہ وہ ذلیل ہوتے رہیں گے، علماء کی تعداد بڑھتی رہے گی۔

﴿ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ ﴾ : ''اور نہ چھپاؤ حق کو'' "تکتموا" کا عطف ہے "تلبسوا" پر اسلئے "لا" اس کے ساتھ بھی ملے گا، کیونکہ معطوف علیہ سے پہلے جو عبارت ہوتی ہے وہ معطوف سے پہلے بھی ہوتی ہے۔ اسلئے اب عبارت یہ ہوگی ﴿ولا تکتموا الحق﴾ اور حق کو نہ چھپاؤ۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ " تکتموا " منصوب ہو اور " ان " اس میں مقدر ہو۔ اب اس کا معنی یہاں ہوگا:

" لا یکن منکم لبس الحق و کتمانه "

تم سے حق چھپانے اور اس کے ساتھ باطل کو خلط ملط کرنے کا طریقہ واقع نہیں ہونا چاہیے۔ (قرطبی)

﴿ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ : یہ جملہ حالیہ ہے اور " تعلمون " کا مفعول محذوف ہے تا کہ اختصار ہو سکے یعنی اب معنوی لحاظ پر عبارت کا مطلب یہ ہو گیا:

" وانتم من ذوی العلم ولا یناسب من کان عالما ان یتصف بالحال الذی انتم علیه "

اور تم علم والے ہو، جو شخص عالم ہو اس کے مناسب نہیں کہ وہ اس حال سے متصف ہو جس سے تم ہو۔

یا معنوی طور پر اصل عبارت اس طرح ہو جائے " وانتم تعلمون انکم لا بسون کاتمون " حالانکہ تم اپنے متعلق جانتے بھی ہو کہ تم حق چھپانے والے ہو اور حق کے ساتھ باطل کو ملانے والے ہو۔ یا مقصد یہ ہو " وانتم تعلمون صفة محمد ﷺ او البعث والجزاء " حالانکہ تم نبی کریم ﷺ کی صفات کو جانتے ہو قیامت کے آنے کو جانتے ہو، جزاء دیئے جانے کا تمہیں پتہ ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ " وانتم تعلمون " جملہ حالیہ ہے جس کا معنی ہے" حالانکہ تم جانتے ہو" لیکن اس

کے ساتھ جب تک محذوف الفاظ نہ ملائے جائیں اس وقت تک معنی مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ (از روح المعانی)

لمبی عبارات کا مفہوم پھر خصوصا محذوف عبارتیں مختلف قسم کی تھیں ان کے معانی بہت مختصر عبارت میں اعلی حضرت نے شامل کر لئے ہیں، راقم نے بھی وہی معنی ذکر کیا صرف الفاظ مختلف ہیں۔اعلیٰ حضرت کا ترجمہ دیکھیں کیا خوب کیا مختصر ''وتکتموا الحق وانتم تعلمون'' اور دیدہ دانستہ حق نہ چھپاؤ۔

حاصل کلام: پہلی آیۃ کریمہ '' وآمنوا بما انزلت ''......الخ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کفر اور گمراہی کے چھوڑنے کا حکم دیا اور اس آیۃ کریمہ میں ان کو''لوگوں کو گمراہ کرنے اور بھٹکانے'' سے منع کیا

کسی دوسرے کو گمراہ کرنے کے دو طریقے ہیں۔اس لئے حق کے دلائل سننے اور نہ سننے کے لحاظ پر لوگ دو قسم پر ہیں۔اس لئے کہ بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جنہوں نے حق کے دلائل کو سنا ہوا ہوتا ہے۔ ان کو گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان دلائل کے ساتھ باطل کو ملا دو۔ایسا ان کا حلیہ بگاڑ دو کہ جس نے وہ دلائل سنے ہوئے تھے اس کا ذہن منتشر ہو جائے وہ ان گمراہ کرنے والوں کے جال میں پھنس جائے کہ یہ ہی سچے ہیں۔اس قسم کے گمراہ کرنے والے گروہ کو رب تعالیٰ نے ﴿ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ﴾ کہہ کر باطل کو حق سے ملا کر لوگوں کو گمراہ کرنے سے منع فرمایا۔

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کے دلائل سنے ہی نہیں ہوتے ان کو گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان تک حق کے دلائل پہنچنے ہی نہ دیئے جائیں اور ان دلائل کو چھپا کر رکھا جائے۔ایسے گمراہ کرنے والے لوگوں کو رب تعالیٰ نے فرمایا:﴿ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ اور حق نہ چھپاؤ جان بوجھ کر اب ﴿ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ کا ایک مطلب یہ بھی ہو گیا کہ تم جانتے ہو کہ مخلوق کو گمراہ کرنا بہت بڑے نقصان کا سبب ہے جو قیامت میں وہ ضرر عظیم تمہاری طرف ہی لوٹتا ہے۔اور یہ تمہارا ''باطل کو حق سے ملانا'' مخلوق کو قیامت تک حق سے پھیرنے اور گمراہ کرنے کا ذریعہ ہے۔اور یہ تمہارا طریقہ لوگوں کو ہمیشہ گمراہی پر قائم رکھنے کا ذریعہ ہے،لہٰذا تمہارے اس عظیم جرم کی وجہ سے تمہیں عذاب بھی عظیم ہوگا۔

(از کبیر)

تنبیہ: '' وهذا الخطاب وان وردفيهم فهو تنبيه لسائر الخلق وتحذير من مثله

فصار الخطاب وان کان خاصا فی الصورة لکنه عام فی المعنی

اگرچہ بظاہر یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے لیکن اس میں تمام مخلوق کو متنبہ کیا گیا ہے اور اگرچہ یہ خطاب ظاہر کے لحاظ سے خاص ہے لیکن حقیقت کے لحاظ سے عام ہے۔ (از کبیر)

واضح ہوا کہ کوئی شخص بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کے دلائل اور ان کو بیان کرنے والی احادیث کو ضعیف کہہ کر یا دلائل کو مخفی رکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے دور رکھنے والا ہو۔ اسے یہی خطاب ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام، اہل بیت، اولیاء کرام کی شان میں دلائل کو رد کرنا اور دلائل کو چھپانا بھی یہی حکم رکھتا ہے۔ اگر میں یوں کہہ دوں کہ وہ بھی یہودیوں اور نصرانیوں کا لبادہ اوڑھنے والا ہے تو کہنا حق ہے بے جا نہیں۔

اعتراض: رب تعالیٰ نے تو فرمایا کہ حق نہ چھپاؤ جان بوجھ کر۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف علماء کیلئے حق چھپانا جائز نہیں۔ لیکن جہلاء حق چھپالیں تو کوئی حرج نہیں یہ کس طرح صحیح ہے؟

جواب: اصل مسئلہ اس طرح ہے کہ جب کسی کو علم ہی نہ ہو کہ یہ حق ہے یا باطل ہے اور اسے یہ بھی علم نہ ہو کہ میرے اس قول سے باطل کا حق سے ملانا لازم آ رہا ہے تو اسے توقف کرنا چاہئے بغیر علم کے نفی یا اثبات کا کوئی حکم لگانا اس کے لئے نا جائز ہے۔

ہاں البتہ آیۃ کریمہ میں علم سے مقید کرنا یعنی یہ فرمانا کہ ''علم رکھنے کے باوجود حق نہ چھپاؤ'' اس سے یہ واضح ہوا کہ علماء کے لئے حق چھپانا بہت ہی برا ہے اگرچہ جہلاء کے لئے بھی بے علم بات کرنا، حق کو نہ جاننے کے باوجود حق بنا کر پیش کرنا برا ہے۔ لیکن بنسبت علماء کے اس میں کم غلطی ہے۔ (از کبیر)

فائدہ: ''والآیة دالة علی ان العالم بالحق یجب علیه اظهاره ویحرم علیه کتمانه والله اعلم''

آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بیشک حق کے عالم کے لئے واجب ہے کہ وہ حق کو ظاہر کرے اور اس پر حق کو چھپانا حرام ہے۔ (از کبیر)

حق کہنے کا ایک عظیم واقعہ:

دارمی نے روایت ذکر کی ہے کہ ضحاک بن موسی کہتے ہیں ایک مرتبہ (وقت کا حاکم)

سلیمان بن عبد الملک مکہ شریف میں جاتے ہوئے مدینہ طیبہ سے گزرا۔ وہاں اس نے چند دن قیام کیا۔ اس نے پوچھا کیا مدینہ طیبہ میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں سے کسی ایک کو پایا ہو؟ لوگوں نے بتایا کہ ہاں ابو حازم ہیں۔

سلیمان بن عبد الملک نے ابو حازم کی طرف پیغام بھیجا (کہ مجھے ملنے کیلئے آؤ) وہ جب آئے تو سلیمان نے انہیں کہا اے ابو حازم یہ کیا جفاء ہے؟ ابو حازم نے کہا اے امیر المؤمنین تم نے مجھ میں کیا جفاء دیکھی ہے؟ اس نے کہا مجھے مدینہ طیبہ کے سب لوگ ملنے کیلئے آئے تم نہیں آئے۔ ابو حازم نے کہا اے امیر المؤمنین میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ تم کوئی ایسی بات کہو جو درست نہ ہو اس سے پہلے جب تم مجھے نہیں پہچانتے تھے اور میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا (تو میں تمہیں کیسے ملتا؟) سلیمان نے محمد بن شہاب زہری کی طرف توجہ کی تو اس نے کہا شیخ نے درست کہا اور تم نے خطا کی ہے۔ سلیمان نے کہا اے ابو حازم کیا وجہ ہے ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں۔ ابو حازم نے کہا:

"لانکم اخربتم الآخرة وعمرتم الدنیا فکرھتم ان تنتقلوا من العمران الی الخراب"

اس لئے کہ تم نے آخرت کو (اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے) برباد کر دیا اور دنیا کو آباد کر لیا ہے اب تمہیں یہ پسند نہیں کہ تم آباد جگہ سے برباد جگہ کی طرف منتقل ہو جاؤ۔

سلیمان نے کہا اے ابو حازم تم نے درست کہا ہے اور یہ بتاؤ کہ کل اللہ تعالیٰ کے پاس کیسے جانا ہو گا؟ ابو حازم نے کہا کہ نیکیاں کرنے والے تو رب تعالیٰ کے حضور اس طرح خوشی خوشی حاضر ہوں گے جس طرح کوئی شخص سفر سے اپنے گھر اہل وعیال کے پاس خوشی سے لوٹ کر آتا ہے۔ لیکن برائیاں کرنے والے رب تعالیٰ کے حضور بڑی ندامت سے حاضر ہوں گے، جیسا کہ بھاگے ہوئے غلام کو مالک کے پاس لوٹ کر آنے میں ندامت ہوتی ہے۔

ابو حازم کی یہ بات سن کر سلیمان رونے لگ گیا، کہنے لگا کاش مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرا مقام رب تعالیٰ کے ہاں کیسا ہے اور میری حاضری اس کے ہاں کیسے ہو گی۔ ابو حازم نے کہا اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن پاک پر پیش کر کے اندازہ کر لو، خود سمجھ آ جائے گا۔ سلیمان نے کہا قرآن پاک کی کن آیات سے مجھے یہ پتہ چلے گا؟

ابوحازم نے کہا ان آیات کو پڑھو:

﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ، وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ﴾

''بیشک نیک لوگ نعمتوں (جنت) میں ہوں گے اور بیشک گنہگار جہنم میں ہوں گے''

پھر سلیمان نے پوچھا اے ابوحازم اللہ تعالیٰ کی رحمت کہاں ہے نزدیک ہے یا دور؟ ابوحازم نے کہا ﴿ اِنَّ رَحْمَةَ اللهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت احسان کرنے (نیکی کرنے) والوں کے قریب ہے۔ سلیمان نے ابوحازم سے پوچھا اے ابوحازم '' **فای عباد الله اکرم** '' اللہ کے بندوں میں سے کون سے مکرم ہیں؟ ابوحازم نے کہا '' **اولوا المروء ة والنهی** '' مروت اور عقل رکھنے والے لوگ مکرم ہیں۔ سلیمان نے ان سے پوچھا '' **ای الاعمال افضل** '' کون سے اعمال افضل ہیں؟ ابوحازم نے کہا '' **اداء الفرائض مع اجتناب المحارم** '' فرائض کا ادا کرنا اور ساتھ ہی حرام کاموں سے اجتناب کرنا۔ سلیمان نے کہا '' **فای الدعاء اسمع** '' کون سی دعاء مقام قبولیت میں زیادہ آتی ہے۔ ابوحازم نے کہا '' **دعاء المحسن اليه للمحسن** '' جس پر احسان کیا جائے وہ دعاء کرے احسان کرنے والے کے لئے۔

سلیمان نے کہا '' **ای الصدقة افضل** '' کون سا صدقہ افضل ہے؟ ابوحازم نے کہا '' **للسائل البائس وجهد المقل ، ليس فيها من ولا اذى** '' زیادہ حاجت مند فقیر کو صدقہ دینا ، اور کم مال کی وجہ سے جو شخص پریشان حال ہو اسے صدقہ دینا افضل ہے بشرطیکہ اس میں احسان نہ جتالیا جائے اور جسے مال بطور صدقہ دیا جائے اسے اذیت نہ پہنچائی جائی۔ سلیمان نے پوچھا '' **فای القول اعدل** '' کون سی بات عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ ابوحازم نے کہا '' **قول الحق عند من تخافه او ترجوه** '' حق بات کہنا خواہ تم اس سے خوف رکھتے ہو یا اس سے امید کرتے ہو۔ سلیمان نے پوچھا '' **فای المؤمنين اكيس** ''. مومنوں میں سے عقلمند کون ہے؟

ابوحازم نے کہا '' **رجل عمل بطاعة الله ودل الناس عليها** '' جو شخص اللہ تعالیٰ کی طاعت کے مطابق عمل کرے اور لوگوں کو بھی اسی پر عمل کرنے کی تلقین کرے۔ سلیمان نے پوچھا '' **فای المؤمنين احمق** '' مومنوں میں سے بے وقوف کون ہے؟ ابوحازم نے کہا:

" رجل انحط فی ھوی اخیه وھو ظالم فباع آخرته بدنیا غیره "
وہ شخص جس نے ظالمانہ طریقہ سے اپنے بھائی کی ظلم میں امداد کی وہ سب سے زیادہ
بے وقوف ہے کیونکہ اس نے غیر کی دنیا کے بدلے اپنی آخرت کو بیچ دیا ہے

یعنی کسی مومن بھائی کو دنیاوی نقصان پہنچانا ظلم ہے اور اس سے اپنی آخرت کو برباد کر دینا لازم آئے گا کیونکہ ظالم کی امداد کرنا دراصل مظلوم کو نقصان پہنچانا ہے۔سلیمان نے ابو حازم سے کہا "اصبت" تم نے درست کہا ہے۔پھر سلیمان نے کہا " فما تقول فیما نحن فیه " ہمارے متعلق تم کیا کہتے ہو یعنی ہماری بادشاہت وحاکمیت کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ ابو حازم نے کہا یہ سوال نہ پوچھئے بلکہ مجھے معاف رکھئے۔لیکن سلیمان نے کہا نہیں مجھے ضرور نصیحت کریں اور بتائیں کہ ہماری حاکمیت کیسی ہے؟ ابو حازم نے کہا اے امیر المؤمنین:

" ان آباءک قھروا الناس بالسیف واخذوا ھذا الملک عنوة علی غیر مشورة من المسلمین ورضاھم "
بیشک تمہارے آباء نے لوگوں پر تلوار سے قہر وجبر کیا اور یہ ملک مسلمانوں کے مشورہ اور ان کی رضاء مندی کے بغیر طاقت سے حاصل کیا۔

یہاں تک کہ بہت سے مسلمانوں کو انہوں نے قتل کیا لیکن وہ بھی اس دنیا سے کوچ کر گئے کاش کہ تمہیں معلوم ہو کہ اب وہ کیا کہہ رہے ان کو کیا کہا جارہا ہے (یعنی قبر میں ان کے متعلق تمہیں معلوم ہو کہ ان سے کیا سلوک کیا جارہا ہے تو تم پر دہشت طاری ہو جائے)۔

بادشاہ کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا اے ابو حازم تم نے بہت برا کیا ہے۔ابو حازم نے کہا جھوٹے تم ہو "ان اللہ اخذ میثاق العلماء لیبیننه للناس ولا یکتمونه " بیشک اللہ تعالیٰ نے علماء سے وعدہ لیا ہے کہ لوگوں کے سامنے حق بیان کرنا اور حق کو چھپانا نہیں۔سلیمان نے ابو حازم سے پوچھا " فکیف لنا ان نصلح " ہم اپنی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں؟ ابو حازم نے کہا:

" تدعون الصلف وتمسکون بالمروة وتقسمون بالسویة "
تم تکبر چھوڑ دو اور مروت سے کام لو، اور لوگوں میں برابر برابر تقسیم کرو۔

سلیمان نے پوچھا ہم اسے کیسے حاصل کر سکتے ہیں ابو حازم نے کہا " تاخذہ من حله وتضعه

فی اهله " تم حلال مال حاصل کرو اور اس کے حقدار لوگوں میں وہ تقسیم کر دو۔ سلیمان نے ابو حازم سے کہا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم ہمارے ساتھ رہو۔ تمہیں ہم سے نفع ہو، ہمیں تم سے نفع ہو۔ ابو حازم نے کہا "اعوذ باللہ "اللہ کی پناہ۔ سلیمان نے کہا تم نے یہ کیوں کہا؟ ابو حازم نے کہا:

" اخشی ان ارکن الیکم شیأ قلیلا فیذیقنی اللہ ضعف الحیوۃ وضعف المماۃ "

میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں تمہارے مال کی وجہ سے جو گھٹیا اور حقیر ہے تمہاری طرف میلان کر کے زندگی اور موت میں اللہ تعالیٰ کی شدید گرفت میں نہ آ جاؤں۔

سلیمان نے کہا اگر تمہیں ہم سے کوئی حاجت ہو تو بتاؤ تا کہ ہم اسے پورا کر دیں۔ ابو حازم نے کہا ہاں ہمیں تم سے یہ حاجت ہے " تنجینی من النار وتدخلنی الجنۃ " مجھے آگ سے نجات دو اور جنت میں داخل کر دو۔ سلیمان نے ابو حازم کی خدمت میں عرض کیا " لیس ذاک الی " یہ کام تو میری طاقت میں نہیں۔ ابو حازم نے کہا " فما لی الیک حاجۃ غیرھا " پھر مجھے بھی اس کے علاوہ تم سے اور کوئی حاجت نہیں۔ سلیمان نے کہا " فادع لی " تو میرے لئے دعاء ہی کر دو۔ ابو حازم نے ایک حاکم وقت کے لئے یہ دعا کی:

" اللھم ان کان سلیمان ولیک فیسرہ لخیر الدنیا والآخرۃ وان کان عدوک فخذ بناصیتہ الی ما تحب وترضی "

اے اللہ اگر سلیمان تیرا دوست ہے تو اس کے لئے دنیا اور آخرت آسان کر دے اور اگر وہ تیرا دشمن ہے تو اس کی پیشانی سے اس کے بالوں کو پکڑ کر اس طرف لے آ جو تجھے محبوب ہے اور تجھے پسند ہے۔

سلیمان نے کہا ہاں ایسا ہی ہو جائے ابو حازم نے کہا مختصر اور زیادہ بات یہی ہے کہ اگر تم اس کے اہل ہوئے تو بہتر اور اگر تم اس کے اہل نہ ہوئے تو یہ مناسب نہیں کہ میں ایسا تیر چلاؤں جس میں وتر ہی نہ ہو۔ سلیمان نے کہا مجھے کچھ وصیت فرما دیں، ابو حازم نے کہا ہاں میں تمہیں وصیت کرتا ہوں وہ وصیت مختصر طور پر یہ ہے:

" عظم ربک ونزھہ ان یراک حیث نھاک او یفقدک حیث امرک "

اپنے رب کی عظمت بیان کرو اور اس کی تنزیہ (پاکیزگی) بیان کرو (اس کا خیال یہاں تک رکھو

کہ ایسا نہ ہو) کہ وہ تمہیں وہاں دیکھے جہاں سے اس نے تمہیں روکا ہے یا تمہیں وہاں نہ پائے جہاں اس نے تمہیں حکم دیا ہے۔

جب بادشاہ ابو حازم کی محفل سے اٹھ کر باہر گیا تو اس نے ابو حازم کے پاس ایک سو دینار بھیجے کہ ان کو خرچ کر لو، اور ساتھ ہی یہ پیغام بھیجا کہ تمہارے لئے میرے پاس اس قسم کے کثیر عطیات کیلئے ہر وقت دروازے کھلے ہیں۔ ابو حازم نے وہ رقم واپس لوٹا دی اور اسکی طرف لکھا اے امیر المؤمنین:

" فان كانت هذه المائة دينار عوضا لما حدثت فالميتة والدم ولحم الخنزير في حال الاضطرار احل من هذه ، وان كان لحق في بيت المال فلي فيها نظراء فان ساويت بيننا والا فليس لي فيها حاجة "

اگر یہ سو دینار میری باتوں، نصیحتوں کا عوض ہے تو میرے نزدیک یہ مردہ جانور، اور خون اور خنزیر کے گوشت کی طرح ہیں، جو صرف حالت اضطرار میں جائز ہیں۔ اور اگر یہ مجھے اس لئے دیئے گئے ہیں کہ میرا بیت المال میں حق ہے تو میرے جیسے اور بھی بہت ہیں۔ اگر سب کو برابر طور پر اتنا ہی مال دیا گیا ہے تو میں بھی یہ مال لینے کا حقدار ہوں۔ اگر سب کو اتنا مال نہیں دیا گیا تو مجھے اس مال کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ بیت المال کے مال میں ناجائز تصرف کا حق حاکم کو حاصل نہیں۔ (از قرطبی ج اول از ص ۳۳۷)

اس واقعہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

حضرت ابو حازم سو دینار پر بکے نہیں بلکہ آپ نے وہ واپس کر کے خودداری کا عملی نمونہ پیش فرما دیا۔ حق بیان کرنے میں آپ کو بادشاہ کا خوف اور بادشاہ کا رعب کوئی نقصان نہ پہنچا سکا بلکہ آپ نے بلا خطر حق بیان فرما کر آنے والے علماء کو سبق دے دیا کہ بادشاہوں کے ٹکڑوں پر بک کر دین کے مسائل کو بدل کر ان میں لچک پیدا کر کے دین کا ستیاناس نہ کر دینا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" لا يمنعن احدكم هيبة احد ان يقول او يقوم بالحق حيث كان "

تم میں سے کسی ایک کو بھی کسی کا رعب حق بات کہنے سے اور حق پر قائم رہنے سے ہرگز نہ روکے۔

رب تعالیٰ نے نیک بندوں کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ﴾
وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں (یعنی حق بات کہنے میں کوشش کرتے ہیں) اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں رکھتے۔ (از قرطبی حوالہ مذکور)

راقم کے نزدیک اس واقعہ سے اور عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مسلمانوں کے مشورہ اور مرضی کے بغیر طاقت سے مسلط ہونے والا لیٹرا اور غاصب تو ہوسکتا ہے اسے حاکم نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ بادشاہ کے سامنے حق بیان کرنا سلف صالحین کا طریقہ رہا، لیکن ساتھ ہی بادشاہوں کے پیچھے حق کو باطل کہنے والے بھی رہے۔ یہی طریقہ آج تک چلا آ رہا ہے۔ مولوی ٹکٹوں پر نہ بکیں تو دین میں بگاڑ نہ واقع ہو۔ لیکن افسوس کہ بکاؤ مال دین کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے سیاہ سفید کو صحیح قرار دے دیتے ہیں۔

حق چھپانے پر وعید:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من سئل عن علم علمه ثم كتمه الجم يوم القيامة بلجام من نار "

(رواه احمد و ابو داؤد و الترمذی و رواه ابن ماجه عن انس، مشکوۃ کتاب العلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شخص سے علم کے متعلق پوچھا جائے وہ چھپائے تو قیامت کے دن اسے آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔

یعنی مسائل امور دینیہ میں علم کا محتاج ہو تو اسے مسئلہ نہ بتایا جائے اور اسے کتاب نہ دیکھنے دی جائے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کا لگام ڈالا جائے گا، کیونکہ منہ ہی کلام کرنے اور جواب دینے کا محل تھا لہٰذا اسی میں آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔ ایسے عالم کو حیوان سے تشبیہ دی گئی، کیونکہ علم پڑھنے کا مقصد تو یہ تھا کہ اسے آگے پھیلایا جائے اور لوگوں کو اس کے ذریعے نفع پہنچایا جائے، لیکن جب اس نے علم کو چھپا دیا تو علم پڑھنے کی کامل غرض کو زائل کر دیا، اس لئے وہ علماء اور حکماء کے درجہ سے دور ہو کر حیوانوں کے درجہ میں پہنچ گیا۔ (از مرقاۃ)

اسی سے واضح ہوا کہ جب علم کا مسئلہ پوچھنے پر نہ بتانا اتنا عظیم جرم ہے تو باطل کو حق سے ملا کر حق کو چھپانا کتنا ہی زیادہ عظیم جرم ہوگا۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ

☆ ''اور صحیح ادا کرو نماز اور زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو''۔

☆ ''اور نماز قائم رکھو، اور زکوۃ دو، اور رکوع کرو ساتھ رکوع کرنے والوں کے''۔

رب تعالیٰ نے پہلے ان (بنی اسرائیل) کو ایمان لانے کا حکم دیا ﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾ سے پھر ان کو کفر کرنے سے منع کیا، پھر ان کو حق کے ساتھ باطل کو ملانے سے منع فرمایا پھر ان کو نبی کریم ﷺ کی نبوت کے دلائل چھپانے سے منع فرمایا۔ اب ان کو شرعی احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ ایمان اصل العبادات ہے، ایمان کے بغیر کوئی عبادت معتبر نہیں۔

پھر احکام شرائع میں پہلے نماز کا حکم دیا کیونکہ " هی اعظم العبادات البدنية " یہ بدنی عبادات میں سے عظیم عبادت ہے اس کے بعد زکواۃ ادا کرنے کا حکم دیا کیونکہ " هی اعظم العبادات المالية " یہ مالی عبادات میں عظیم عبادت ہے۔ (از کبیر)

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾: " يامركم الله اليهود بالدخول فی الاسلام واقامة الصلوة علی ما بينه محمد ﷺ وفصله وسنه " (زبدة التفسير من فتح القدير)

اے یہود یو اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اسلام میں داخل ہو جاؤ اسلام میں داخل ہونے کے بعد نماز اس طرح قائم کرو جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اسے بیان فرمایا اور اس کی تفصیل بیان فرمائی اور اس کا طریقہ بیان فرمایا۔

مقاتل نے کہا کہ ﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ کا مطلب یہ ہے " امرهم ان يصلوا مع النبی ﷺ " کہ ان کو رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ نبی کریم ﷺ کی معیت میں نماز ادا کرو۔ (صابونی)

" (وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ) يعنی صلوة المسلمين وزكاتهم فان غيرهما كلاصلوة ولا زكوة " (بيضاوی)

مسلمانوں کی نماز کی طرح نماز ادا کرو اور ان کی زکوۃ کی طرح زکوۃ ادا کرو، بیشک ان کے طریقہ سے ہٹ کر نماز ادا کرنا یا زکوۃ ادا کرنا درحقیقت نماز ادا کرنا اور زکوۃ ادا کرنا نہیں ثابت ہو سکتا۔

یعنی اگر چہ یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے جو نماز ادا کرتے تھے اور زکوۃ بھی ادا کرتے تھے لیکن وہ اپنے طریقہ کے مطابق اس پر عمل کرتے تھے اس لئے ان کے عمل کو غیر معتبر سمجھ کر ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کے طریقہ پر عمل کرو گے تو وہی معتبر ہوگا۔ اس تفصیل کے بعد " واقیموا الصلوۃ " کا ترجمہ حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کا ضیاء القرآن میں عظیم تر نظر آئے گا" اور صحیح ادا کرو نماز" تاہم مسلمانوں کو ہمیشہ نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا اس لئے اعلی حضرت کا ترجمہ بھی باکمال ہے" اور نماز قائم رکھو" علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے معنی بیان کیا ہے:

(وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ) بمراقبۃ القلوب " (روح المعانی) دل کو حاضر کر کے نماز ادا کرو۔

اس معنی سے بھی پیر صاحب کے ترجمہ کو تائید ملتی ہے کہ" صحیح ادا کرو نماز" یعنی اس میں خلوص پایا جائے حضور قلب سے نماز ادا ہو اس میں ریاء کاری نہ پائی جائے۔

﴿ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ﴾: " ایتاء " اور " اعطاء " کا ایک ہی معنی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "آتیتہ ، اعطیتہ " دونوں کا ایک ہی معنی ہے" میں نے اسے دیا" اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ لئن آتانا من فضلہ لنصدقن ﴾ اسی معنی میں استعمال ہے۔ اتیتہ بالقصر بغیر مد کے جب استعمال ہو تو پھر اس کا معنی ہوتا ہے" آنا" یعنی" میں اس کے پاس آیا" ہاں البتہ مستقبل کے صیغوں میں مد کے ساتھ بھی آنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں:

" ولآتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلأ خبرنہ "

میں ضرور برضرور رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر ان کو خبر دوں گا

ایتان کا معنی جب آنا ہو تو اس کے ساتھ " باء " لگا دیں تو متعدی ہو جائے گا جیسا کہ کہا جائے "ایت بالماء " پانی لاؤ۔

﴿ وَاَقِیْمُوْا ﴾ امر معناہ الوجوب (وآتوا) امر ایضا یقتضی الوجوب "

" اقیموا " اور " آتوا " دونوں ہی امر کے صیغے ہیں اور ان دونوں مقاموں میں امر وجوب کے لئے آیا ہوا ہے۔ یعنی نماز قائم کرنا، اور زکواۃ ادا کرنا فرض ہیں۔

''زکوۃ'' ماخوذ ہے " زکی الشی " سے۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی چیز بڑھ جائے اور زیادہ ہو جائے اسی طرح کہا جاتا ہے " زکا الزرع " کھیتی بڑھ گئی اور کہا جاتا " والمال یزکو " مال زیادہ ہو جائے گا اور کہا جاتا ہے " رجل زکی " مرد زیادہ خیرات دینے والا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مال کی زکواۃ ادا کرنے کو زکوۃ کہنے کی بظاہر وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ ظاہر طور پر تو مال کم ہو رہا ہے لیکن اس کو اس لئے زکواۃ کہا جاتا ہے " یتمو بالبرکۃ او بالاجر الذی یثاب بہ المزکی " کہ مال میں زکواۃ ادا کرنے سے برکت ہوتی ہے جس سے وہ مال بڑھتا ہے اور زکواۃ دینے والے کے ثواب میں زیادتی ہوتی ہے اس لئے بھی اسے زکواۃ کہا جاتا ہے۔

اسی معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے " زکات الناقۃ بولدھا " اونٹنی نے بچہ جنا یعنی بچہ اس کے پاؤں میں ہے بچے کی وجہ سے اونٹنی ایک سے دو بن گئی۔ اسی معنی لحاظ پر کہا جاتا ہے " زکا الفرد " متفرد شخص زوج بن گیا۔ یعنی شادی کر کے ایک سے دو بن گیا۔ ''زکوۃ'' کا اور معنی یہ ہے " وقیل اصلھا الثناء الجمیل " اور بعض حضرات نے کہا اصل اس کا معنی اچھی تعریف ہے اسی معنی کے لحاظ پر کہا جاتا ہے " زکی القاضی الشاھد " قاضی نے گواہ کی اچھی تعریف کی۔

زکواۃ ادا کرنے والا جب بھی زکواۃ ادا کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو قابل تعریف بنالیتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی تعریف فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بندے بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ''زکوۃ'' کا اور معنی یہ ہے " وقیل الزکاۃ ماخوذ من التطھیر " بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ زکواۃ کا معنی ہے پاکیزہ کرنا۔

چونکہ زکواۃ دینے والا جب اپنے مال سے زکواۃ ادا کرتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اسی نے میرے مال میں مسکینوں کا حق رکھا ہے۔ لہذا مسکینوں کو مال دینا اسی کے حکم کی تابعداری ہے، تو اس سے وہ اپنے مال کو پاکیزہ کر لیتا ہے، کیونکہ جب تک زکواۃ کا مال اس کے مال میں رہے گا تو اس کا مال میل کچیل سے پاک نہیں ہوگا۔

" الا تری ان النبی ﷺ سمی ما یخرج من الزکوۃ او ساخ الناس "

کیا تم دیکھتے نہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے زکواۃ والے مال کو لوگوں کی میل قرار دیا ہے

اور رب تعالیٰ نے بھی فرمایا:

﴿ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا ﴾

اے محبوب ان کے مال میں سے زکواۃ حاصل کرو جس سے تم ان کو ستھرا اور پاکیزہ کردو۔

یہاں زکواۃ سے مراد کیا ہے؟ آیۂ کریمہ میں بنی اسرائیل کو جو خطاب ہے " وآتوا الزکوۃ " زکواۃ ادا کرو اس سے مراد کیا ہے؟ اس میں مختلف اقوال ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ زکواۃ سے مراد وہی ہے جو مشہور ہے یعنی فرض زکواۃ یہی معنی مراد لینا بہتر ہے اور اسی پر اکثر علماء ہیں اس کی وجہ اس لئے بھی واضح ہے کہ " واقیموا الصلوۃ " کے ساتھ " وآتوا الزکوۃ " کو ذکر کیا ہے۔ بعض حضرات نے ذکر کیا ہے کہ اس مقام میں زکواۃ سے مراد صدقہ فطر ہے یہ قول ابن قاسم کا ہے جو امام مالک رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ قرآن پاک میں صدقہ فطر کا ذکر نہیں۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ نے ﴿ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَكّٰى ﴾ میں تاویل بیان کی ہے کہ اس سے مراد صدقہ فطر ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

"(وآتوا الزکوۃ) ای بالغوا فی تزکیۃ النفس عن الصفات الزمیمۃ لتحصل لکم التحلیۃ بعد التخلیۃ ادوا زکوۃ الھھم فان لھا زکوۃ کزکوۃ النعم بل ان لکل شئی زکوۃ کما قیل"

کل شی له زکوة تؤدی   وزکوة الجمال رحمة مثلی

" وآتوا الزکوۃ " کا مطلب ہے کہ بری صفات سے نفس کو پاک کرنے میں مبالغہ کرو، تاکہ بری صفات کے زوال کے بعد اچھی صفات سے تم مزین ہو جاؤ۔ یا مراد یہ ہے کہ اپنی ہمتوں (اپنی ہمت کے مطابق ہر کام) کی زکواۃ ادا کرو کیونکہ ہمتوں کی زکواۃ ادا کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ نعمتوں کی زکواۃ کو ادا کرنا ہے بلکہ ہر چیز کی زکواۃ ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

ہر چیز کی زکواۃ ادا کی جاتی ہے   اور خوبصورتی کی زکواۃ میرے جیسوں پر رحم کرنا ہے

(از روح المعانی)

مختصر مسئلہ: زکواۃ اور عشر کے مسائل اور ان کے مصارف کا ذکر تو اپنی اپنی جگہ آئیگا۔

البتہ مختصر طور پر یہ سمجھا جائے کہ رب تعالیٰ نے زکواۃ کو مجمل طور پر ذکر فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی:

" عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال لیس فی حب و لا تمر صدقة حتی یبلغ خمسة اوسق و لا فیما دون خمسة ذود صدقة و لا فیما دون خمسة اواق صدقة وقال البخاری خمس اواق من الورق "

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا دانوں اور کھجوروں میں صدقہ اس وقت تک نہیں جب تک وہ پانچ وسق کو نہ پہنچ جائیں اور پانچ اونٹوں سے کم میں صدقہ نہیں، اور پانچ اوقیہ چاندی سے کم میں صدقہ نہیں۔ (از قرطبی)

خیال رہے وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے صاع تقریباً چار کلو کا ہے۔ اور اوقیہ چالیس درھم کا وزن ہے یعنی دو سو درھم چاندی کا نصاب ہے جس کا وزن ساڑھے باون تولے بنتا ہے۔ سونے کا نصاب بیس مثقال ہے۔ جس کا وزن ساڑھے سات تولے بنتا ہے۔ روپوں کا حساب چاندی کے نصاب سے کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں فقیر کا بھلا ہے۔ یعنی فقیر کے لئے بہتر یہی ہے کہ نصاب چاندی کا ہی حساب میں لایا جائے، اس سے نصاب جلدی مکمل ہو جاتا ہے:

" وروی البخاری عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال فیما سقت السماء والعیون او کان عشریا (بفتح المهملة والثاء المثلثة وکسر الراء وتشد الیاء النخیل الذی یشرب بعزوقة من ماء المطر یجتمع فی حفیرة) وما سقی بالنضح (بفتح النون وسکون المعجمة بعدها مهملة ، ما سقی من آلابار) نصف العشر " (قرطبی بمع حاشیه)

بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس زمین کو بارش سے، چشموں سے اور زمین میں گڑھا کھود کر بارش کا پانی جمع کر کے اس سے سیراب کیا جائے اس میں دسواں حصہ پیداوار کا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور جس زمین کو کنوئیں کے پانی سے سیراب کیا جائے اس میں بیسواں حصہ دیا جائے۔

فائدہ: رب تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرنے سے چھ فائدے حاصل ہوتے ہیں تین دنیا میں

اور تین آخرت میں:

" فاما التی فی الدنیا فتزید فی الرزق وتکثر المال وتعمر الدیار "

دنیا میں جو فائدے حاصل ہوتے ہیں وہ یہ ہیں رزق میں زیادتی ہوتی ہے، اور مال میں کثرت ہوتی ہے، اور گھر اور شہر آباد ہوتے ہیں۔

" واما التی فی الآخرۃ فتستر العورۃ وتصیر ظلا فوق الرأس وتکون سترا من النار "

لیکن آخرت میں حاصل ہونے والے فوائد یہ ہیں کہ صدقہ انسان کی پردہ پوشی کرے گا، اور اس کے سر پر سایہ کرے گا اور اسے جہنم کی آگ سے بچائے گا۔ (کبیر)

تاریخ فرضیت زکواۃ: بعض حضرات نے کہا زکواۃ روزہ، صدقہ فطر کا حکم دو ھجری میں دیا گیا۔

" والمعتمد ان الزکوۃ فرضت بمکۃ اجمالا ویثبت بالمدینۃ تفصیلا جمعا بین الآیات تدل علی فرضیتها بمکۃ وغیرها من الآیات والادلۃ واللہ اعلم " (مرقاۃ ج ۴ ص ۱۱۸)

زیادہ اعتماد اس بات پر ہے کہ بیشک زکواۃ مکہ میں فرض ہوگئی تھی لیکن وہ مجمل ہی رہی، اس کی تفصیل مدینہ طیبہ میں بیان کی گئی اس بیان سے آیات اور احادیث میں تطبیق ثابت ہو جائے گی، کیونکہ کچھ آیات واحادیث مکہ میں فرضیت پر دلالت کرتی ہیں اور کچھ مدینہ طیبہ میں فرضیت پر دلالت کرتی ہیں۔

﴿ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾: " اور رکوع کرو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ، یعنی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرو"۔

ذکر جزء مراد کل: رکوع کا ذکر کر کے مراد نماز لی گئی ہے۔ یعنی جزء کا ذکر کر کے مراد کل لیا گیا ہے۔ یہ ضابطہ کئی جگہ پر جاری ہے جیسا کہ ذکر قراءۃ کا اور مراد نماز ہے رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا:

﴿ (وَقُرْآنَ الْفَجْرِ) ای صَلٰوۃَ الْفَجْرِ ﴾

یعنی قرآن پاک میں جو قرآن الفجر ذکر ہے اس سے مراد صلوۃ فجر ہے۔

اور اہل حجاز ذکر سجدہ کا کرتے ہیں اور اس سے مراد رکعت لیتے ہیں اسی محاورہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بھی ہے " من ادرک سجدۃ من الصلوۃ فقد ادرک الصلوۃ " جس

شخص نے نماز کی ایک رکعت (امام کے ساتھ پالی) تحقیق اس نے نماز پالی۔ اس حدیث پاک میں بھی ذکر سجدہ کا ہے لیکن مراد رکعت ہے۔

رکوع کے ذکر کی خصوصیت کیوں؟

یہ قانون تو سمجھ آ گیا کہ بعض اوقات ذکر جزء کا ہوتا اور مراد اس سے کل لیا جاتا ہے یہاں بھی ذکر رکوع کا ہے اور مراد نماز ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ رکوع کا ہی ذکر کیوں کیا، سجدہ کا ذکر کیوں نہیں کیا، قراءت کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے:

" انما خص الرکوع بالذکر لان بنی اسرائیل لم یکن فی صلوتھم رکوع "

رکوع کا ذکر خصوصی طور پر اس لئے کیا گیا کہ بنی اسرائیل کی نماز میں رکوع نہیں تھا

گویا کہ ان کو کہا گیا ہے کہ اب پہلی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں لہذا تم اپنی نماز ادا نہ کرو، بلکہ مسلمانوں والی نماز ادا کرو، یعنی نماز جماعت سے ادا کرو اور اس نماز میں رکوع بھی کرو جیسا کہ مسلمان اپنی نماز میں رکوع کرتے ہیں۔

(قرطبی)

تنبیہ: یہ وجہ اگرچہ مفسرین کرام نے بیان تو کی ہے لیکن اس وجہ کو بیان کرتے ہوئے " یا مریم اقنتی لربک واسجدی وارکعی مع الراکعین " میں تعارض آئے گا اس میں پھر توجیہات کی ضرورت درپیش آئے گی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ رکوع کے تخصیص کی وجہ یہ بیان کی جائے

" لانہ کان اثقل علی القوم فی الجاھلیة "

رکوع کا خصوصی طور پر اس لئے حکم دیا گیا کہ زمانہ جاہلیت میں رکوع کرنا ان کو بھاری محسوس ہوتا تھا۔

(قرطبی)

یعنی رکوع تو اگرچہ یہود کی نماز میں بھی تھا لیکن وہ اس پر عمل کرنے میں پہلو تہی کرتے تھے واللہ اعلم۔ اس قول پر تقریبا اس مسئلہ سے تائید حاصل ہوتی ہے۔ شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے "شرح التاویلات" میں ذکر فرمایا ہے کہ جماعت سے نماز ادا کرنا واجب ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا۔ اس سے واضح ہے کہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع میں شریک ہونے کا حکم دیا گیا ہے لہذا جماعت سے نماز ادا کرنا۔ ' 'مامور بھا " (جس کا حکم دیا

جائے)ہوگیا۔" والامر المطلق الوجوب" مطلق امر وجوب کے لئے آتا ہے۔لیکن علامہ سعدالدین تفتازانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" بانهم كانوا يصلون وحدانا فامروا بان يصلوا مع النبی ﷺ واصحابه بالجماعة للمنع مما كانوا عليه من عادة الانفراد فيكفی فی ذلك كونها سنة مؤكدة "

وہ اکیلے اکیلے نماز ادا کرتے تھے ان کو حکم دیا گیا کہ نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ کے ساتھ مل کر جماعت سے نماز ادا کرو ان کی جو عادت تھی اکیلے نماز ادا کرنے کی اس سے ان کو منع کیا گیا لہذا جماعت سے نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے بس اتنا ذکر کرنا کافی ہے۔ (از شیخ زادہ)

راقم کے نزدیک رکوع بھی حکماً سجدہ کے قریب ہے اسی وجہ سے رکوع میں سجدہ تلاوت کی نیت کرنے سے سجدہ تلاوت ادا ہو جاتا ہے صرف رکوع کے اہم ہونے کی وجہ سے اسے ذکر کر کے مراد کل لیا گیا ہے۔

رکوع کا لغوی معنی: " الركوع هو الانحناء " رکوع کا معنی ہے جھکنا۔ (مفردات راغب)

رکوع کا شرعی معنی: " الركوع هو الخضوع والانقياد " رکوع کا معنی خضوع کرنا یعنی تکبر کو چھوڑنا، عجز اختیار کرنا، رکوع بمعنی خضوع کے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں استعمال ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ﴾

اور رکوع کا معنی پست ہونا یعنی انحطاط، جیسا کہ اضبط سعدی نے بیان کیا:

لا تذلك الضعيف علك ان تر　　　كع يوما والدهر قدر فعه

کسی کمزور کو ذلیل نہ کر، ہوسکتا ہے تو پست ہو جائے ایک دن اور زمانہ اسے بلند کر دے۔

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

رکوع کیسے کیا جائے؟ اپنی پیٹھ، گردن، سرین کو برابر رکھے، اپنی انگلیوں کو کھلا رکھے، ان سے گھٹنوں کو پکڑے، پھر مطمئن ہو کر رکوع کرے اور کم از کم رکوع میں تین مرتبہ "سبحان ربی العظیم" پڑھے۔

☆ مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مذکور ہے:

" كان رسول الله ﷺ يستفتح الصلوة بالتكبير والقراء بالحمد لله

رب العلمین ، و کان اذا رکع لم یشخص راسه ولم یصوبه ولکن بین ذلک "
نبی کریم ﷺ نماز کو تکبیر سے شروع فرماتے اور قراءت کو " الحمد للہ رب العلمین " سے شروع فرماتے اور جو رکوع کرتے تو سر کو نہ اوپر کرتے اور نہ نیچے کرتے بلکہ ان کے درمیان رکھتے۔

☆ بخاری شریف میں حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:
" قال رأیت رسول اللہ ﷺ اذا کبر جعل یدیه حذو منکبیه واذا رکع امکن یدیه من رکبتیه ثم هصر ظهره ......الخ "
وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ نے جب تکبیر کہی تو ہاتھوں (کی ہتھیلیوں) کو کندھے کے برابر کیا اور جب رکوع کیا تو اپنے ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑا پھر پیٹھ کو جھکایا۔ (از قرطبی)

نماز میں رکوع فرض ہے اسی طرح سجدہ بھی نماز میں فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی سورۃ حج کے آخر میں ہے:

﴿ یا اَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوا ارْکَعُوا وَاسْجُدُوا ﴾ اے ایمان والو رکوع کرو، اور سجدہ کرو۔

حدیث پاک میں رکوع اور سجود کو اطمینان سے ادا کرنے کا حکم ہے کہ کم از کم تین تین مرتبہ تسبیحات دونوں میں پڑھی جائیں۔ سجدہ کرنے کا طریقہ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے۔

" ان النبی ﷺ کان اذا سجد مکن جبهته وانفه من الارض ونحی یدیه عن جنبیه ووضع کفیه حذو منکبیه ...... خرجه الترمذی وقال حدیث حسن صحیح "
بیشک نبی کریم ﷺ جب سجدہ کرتے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر لگاتے اور اپنے بازوؤں کو اپنے پہلوؤں سے دور رکھتے اور اپنی ہتھیلیوں کو اپنے کندھوں کے برابر رکھتے ... یہ حدیث ترمذی نے ذکر فرمائی اور اسے حسن صحیح قرار دیا"

مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے آپ فرماتے ہیں:
" قال رسول اللہ ﷺ اعتدلوا فی السجود ولا یبسط احدکم ذراعیه انبساط الکلب "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا سجدہ میں اعتدال سے کام لو، تم میں سے کوئی ایک آدمی اپنی کلائیوں کو اس طرح نہ بچھائے جس طرح کتا بچھاتا ہے۔

" وعن البراء قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا سجدت فضع کفیک وارفع مرفقیک "

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم سجدہ کرو اپنی ہتھیلیوں کو (زمین پر) رکھو اور اپنی کہنیوں کو اٹھا کر رکھو۔

" وعن میمونة زوج النبی ﷺ قالت کان رسول الله ﷺ اذا سجد خوی بیدیه یعنی جنح حتی یری وضح ابطیه من ورائه واذا قعد اطمان علی فخذه الیسری "

نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ جب سجدہ فرماتے تو اپنے بازوؤں کو پہلوؤں سے ہٹا کر رکھتے، یہاں تک آپ کی بغلوں کو پیچھے کی جانب سے واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا اور جب آپ بیٹھتے تو اپنی بائیں ران پر اطمینان سے بیٹھتے۔ (قرطبی)

" عن وائل بن حجر قال رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا سجد وضع رکبتیه قبل یدیه واذا نهض رفع یدیه قبل رکبتیه "

(رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجه والدارمی، (مشکوۃ باب السجود)

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ سجدہ فرماتے تو اپنے گھٹنے اپنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھتے اور جب اٹھتے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے۔

جماعت سے نماز ادا کرنا اور اس کی فضیلت:

" عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ صلوۃ الجماعة تفضل صلوۃ الفذ بسبع وعشرین درجة " (بخاری، مسلم) (مشکوۃ باب الجماعة وفضلها)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جماعت سے نماز ادا کرنا ستائیس درجہ افضل ہے بنسبت اکیلے نماز ادا کرنے سے۔

وضاحت حدیث:

" الفذ بتشدید الذال المعجمة ای الفرد بمعنی المنفرد ای علی صلوۃ الواحد الذی ترک الجماعة "

حدیث پاک میں جو لفظ ''الفذ'' استعمال ہے اس کا معنی ہے اکیلا ہونا یعنی جو شخص اکیلے نماز ادا کرے اور جماعت کو چھوڑ دے اس کی نماز پر جماعت سے نماز ادا کرنے والے کی نماز ستائیس درجہ افضل ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب کوئی شخص بغیر عذر کے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا ترک کر دے:

" ان الواحد اذا صلی منفردا بعذر یحصل له ثواب الجماعة "
بیشک جب بھی کوئی شخص اکیلے نماز ادا کرے لیکن کسی عذر کی وجہ سے حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ جماعت سے نماز ادا کروں تو اسے جماعت کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے

اسی سے اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ اکیلے نماز ادا کرنے سے نماز ہو تو جائے گی لیکن ثواب میں کمی واقع ہو گی

" وفیه دلالة علی ان الجماعة لیست شرطا لصحة الصلوة ولا فرض عین "
اور اس حدیث میں اس مسئلہ پر دلیل موجود ہے کہ جماعت سے نماز ادا کرنا نماز کی صحت کے لئے شرط نہیں اور نہ ہی فرض عین ہے۔

استفسار: اس حدیث شریف میں جماعت سے نماز ادا کرنا ستائیس درجہ افضل قرار دیا گی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں پچیس درجہ افضل قرار دیا گیا ہے ان میں وجہ توفیق کی ہے۔

وضاحتی بیان: اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے عرف میں یہ واضح طور پر پایا جاتا ہے " ان الزائد متأخر عن الناقص " بیشک زائد متأخر ہوتا ہے ناقص سے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے بندوں کو زیادہ اجر و ثواب تو عطا فرماتا ہے لیکن جو وعدہ فرما دے اس میں کمی نہیں کرتا۔ بیشک نبی کریم ﷺ نے پہلے ایک مقدار کی مومنوں کو بشارت دی۔ پھر جب اپنے آپ پر اور اپنی امت پر اللہ تعالیٰ کے مزید احسان کو دیکھا تو اس کی بشارت دے دی۔ اور جماعت سے نماز ادا کرنے پر ان کو ابھارا۔ ہاں البتہ کبھی پچیس درجہ افضل ہونا اور کبھی ستائیس درجہ افضل ہونا" فمرجعه الی العلوم النبویة التی لا یدرکه العقلاء اجمالا فضلا عن التفصیل " اس کا علم نبی کریم ﷺ کو ہی حاصل تھا عقلاء اسے اجمالی طور پر بھی نہیں سمجھ سکتے تفصیلی طور پر سمجھنا تو دور کی بات ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے ان دونوں حدیثوں میں تطبیق دیتے ہوئے تین وجہ ذکر فرمائی ہیں:

(۱) " ان ذکر القلیل لا ینفی الکثیر " بیشک قلیل کا ذکر کثیر کو باطل نہیں کرتا۔ یعنی پچیس کے

ذکر سے ستائیس کی نفی نہیں ہوتی۔ طلباء کرام یہ ضابطہ اچھی طرح یاد کرلیں انشاء اللہ بہت مسائل میں ان کو فائدہ دے گا۔

(۲) "ومفھوم اللقب باطل" مفہوم لقب باطل ہے یعنی ایک کے ذکر سے دوسرے کی نفی نہیں ہوتی، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کو ذکر کرنے میں خصوصیت آگئی ہے ستائیس خصوصی لقب ہے جو پچیس کی نفی کرتا ہے اور پچیس ایک خاص لقب ہے جو ستائیس کی نفی کرتا ہے، یہ کہنا باطل ہے۔

(۳) "انہ یختلف باختلاف حال المصلی" یہ فرق نمازیوں کے مختلف احوال سے ہے کوئی نماز ادا کرے گا جس میں زیادہ خشوع پایا جائے اسے زیادہ ثواب حاصل ہوگا، اور کسی نمازی کی نماز میں کم خشوع پایا جائے اسے ثواب بھی کم حاصل ہوگا۔

رب تعالیٰ کی رحمت ہی رحمت: جماعت سے نماز ادا کرنے پر ستائیس درجہ فضیلت حاصل ہو گئی۔ پھر جہاں نماز ادا کر رہا ہے اگر وہ مقام متبرک ہے تو اور زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔ اسی طرح جس امام کی اقتداء میں نماز ادا کر رہا ہے اگر وہ نیک ہے تو اس کی نیکیوں اور تقوی کی وجہ سے مقتدی کو بھی زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔ (از مرقاۃ ج ۳ ص ۵۱)

فائدہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں یہ حصہ بھی مذکور ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"وصلوته (صلوة الرجل) فی مسجدی بخمسین الف صلوة وصلوته فی المسجد الحرام بمائة الف صلوة"

(ابن ماجه باب ماجاء فی الصلوة فی المسجد الجامع)

کہ جو شخص میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز ادا کرے گا اسے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا اور جو شخص مسجد حرام میں نماز ادا کرے گا اسے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا۔

"ان السبعة والعشرین تحصل فی جماعة المسجد الحرام مضاعفة فی مائة الف صلوة الحاصلة للمصلی منفردا" (مرقاۃ ج ۳ ص ۵۱)

جب یہ واضح ہے کہ اکیلے مسجد حرام میں ایک نماز ادا کرنے سے ایک لاکھ نماز کا ثواب حاصل ہوتا ہے تو اسی سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مسجد حرام میں جماعت سے نماز ادا کرنا ستائیس لاکھ نماز کا درجہ رکھتا ہے۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی خود بخود سمجھ آ گیا کہ مسجد نبوی میں ایک نماز با جماعت ادا کرنے سے پچاس ہزار پرستائیس گنازائد ثواب رکھتا ہے۔(یعنی تیرہ لاکھ پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا)۔

فائدہ جلیلہ: اگر چہ مسجد حرام میں تعداد کے لحاظ پر زیادہ ثواب ہے اور مسجد نبوی میں کم ہے۔ لیکن مسجد نبوی میں ثواب کیفیت کے لحاظ پر افضلیت رکھتا ہے جیسا کہ حج کے دنوں میں جو نمازیں منیٰ میں ادا کرنی ہیں، وہاں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب ایک کا ہی ہے اور وہ نماز مسجد حرام میں ادا کریں تو ثواب ایک لاکھ کا ہوگا لیکن منی میں ادا کی ہوئی نماز باوجود ایک کا ثواب رکھنے کے بھاری ہے اس نماز پر جو اسی دن سنت کے خلاف کوئی شخص مسجد حرام میں آ کر ادا کرے۔اسی طرح مسجد نبوی میں ادا کی ہوئی نماز پچاس ہزار کا ثواب رکھنے کے باوجود بھاری ہے مسجد حرام کی نماز پر حالانکہ ثواب مسجد حرام میں ایک لاکھ کا ہے۔اصل وجہ اس میں یہ ہے:

" نقل عياض وقبله ابو الوليد الباجي وغيرهما الاجماع على تفضيل ما ضم الاعضاء الشريفة حتى على الكعبة كما قال ابن عساكر في تحفته وغيره بل نقل التاج السبكي عن ابن عقيل انها افضل من العرش وصرح التاج الفاكهي بتفضيلها على السموات قال بل الظاهر المتعين تفضيل جميع الارض على السماء لحلوله ﷺ "

(جواهر البحار ج ۳ ص ۷)

قاضی عیاض اور ابو الولید باجی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ اس پر اجماع امت ہے کہ زمین کے جس ٹکڑے سے نبی کریم ﷺ کے جسم اطہر کے اعضاء شریفہ متصل ہیں (یعنی قبر شریف کا اندرونی حصہ) وہ کعبہ شریف سے بھی افضل ہے۔ابن عساکر نے ذکر فرمایا اور تاج الدین سبکی رحمہ اللہ نے ابن عقیل حنبلی رحمہ اللہ سے نقل فرمایا کہ وہ مقام عرش سے بھی افضل ہے۔ تاج الدین فاکہی رحمہما اللہ نے بیان فرمایا کہ وہ مقام تمام آسمانوں سے افضل ہے۔بلکہ ظاہر یہ ہے کہ تمام زمینوں کو تمام آسمانوں پر اسی لئے فضیلت حاصل ہے کہ زمین میں نبی کریم ﷺ حلول (زمین کے اندر حصے میں تشریف فرما ہیں) کئے ہوئے ہیں۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اور علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے مرقاۃ شرح مشکوۃ میں تقریباً یہی مضمون تحریر فرمایا ہے۔

جماعت کی ترک پر رحمۃ للعلمین کا غصہ:

وہ ذات جو سراپا رحمت ہے وہ ذات جو رحمت کی جان ہے وہ ذات جسے زخمی کیا جاتا ہے، دانت کو شہید کیا جاتا ہے لیکن قوم کے لئے یوں دعا کی جاتی ہے:
" اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون " اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے بیشک وہ بے علم ہیں۔
اس ذات پاک کو بھی اگر غصہ آتا ہے تو جماعت سے نماز نہ ادا کرنے والوں پر، ان پر ناراضگی کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے:

" عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال لو لا ما فی البیوت من النساء و الذریۃ اقمت صلوۃ العشاء و امرت فتیانی یحرقون ما فی البیوت بالنار "

(مسند احمد مشکوۃ باب الجماعۃ وفضلھا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں عشاء کی نماز قائم کرنے کا حکم دیتا اور نوجوانوں کو حکم دیتا کہ وہ آگ سے ان کو جلا دیں جو گھروں میں ہیں۔

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ نے نماز کی جماعت کے وقت فارغ بیٹھ کر جماعت کی ترک کرنے والوں کی مذمت بیان کی۔ اور نبی کریم ﷺ نے " ما فی البیوت " فرما کر ایک عجیب لطیف اشارہ فرمادیا کہ " ما " غیر ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جماعت ہو رہی ہو اور لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں تو وہ حیوانوں کی طرح ہیں۔
تاہم یہ خیال رہے کہ یہ راقم کی سوچ ہے اگر چہ علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمایا کہ پہلا " ما " جو کہ " لو لا ما فی البیوت " میں ہے وہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ عورتیں اور چھوٹے بچے غیر ذوی العقول کی طرح ہیں۔ لیکن دوسرا " ما " جو کہ " یحرقون ما فی البیوت " میں ہے وہ بمعنی " من " کے ہے جو ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (از مرقاۃ)
لیکن امید ہے کہ اہل علم راقم کی سوچ سے اتفاق کرتے ہوئے فرمان مصطفوی کا ذیشان مطلب

حاصل کریں گے۔

حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ عورتوں کا جماعت میں حاضر ہونا ضروری نہیں ورنہ نبی کریم ﷺ یہ ارشاد نہ فرماتے " لو لا ما فی البیوت من النساء " (اگر گھروں میں عورتیں نہ ہوتیں) اسی مسئلہ پر (کہ عورتوں کا جماعت میں شریک ہونا لازم نہیں) ایک حدیث پاک کا مشاہدہ فرمائیں۔

" عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ صلوة المرأة فی بیتها افضل من صلوتها فی حجرتها و صلاتها فی مخدعها افضل من صلوتها فی بیتها "

(رواہ ابو داود، مشکوۃ باب الجماعۃ وفضلها)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت کا نماز کمرے میں ادا کرنا افضل ہے بنسبت صحن میں ادا کرنے سے، اور کمرے کے اندر کمرے میں نماز ادا کرنا زیادہ بہتر ہے بنسبت کمرے میں ادا کرنے کے۔

وضاحت حدیث:

فی بیتها، سے مراد کمرے کا اندرونی حصہ ہے اس میں نماز ادا کرنا افضل ہے تاکہ اس کے کامل پردہ کا لحاظ کیا جاسکے " فی حجرتها ای صحن الدار " نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی میں " فی حجرتها " سے مراد گھر کا صحن ہے۔ تاہم ایک قول یہ بھی ہے کہ گھروں کے دروازے کے باہر بالکونی جو برآمدہ نما ہوتی ہے اسے حجرۃ کہا گیا ہے۔

" مخدع " میم پر تینوں حرکتوں کو پڑھا گیا ہے دال پر فتحہ ہے مراد "کمرے میں کمرہ" ہے اس تمام ترتیب کی دارومدار اس پر ہے " لان مبنی امرها علی التستر " کہ عورت کے پردے کا لحاظ کیا گیا ہے عورت حقیقت میں اسی وقت عورت ہے جب وہ باپردہ اور باحیاء ہو۔ انسان اور حیوان میں فرق ہی حیاء سے سمجھ میں آتا ہے جب حیاء ہی نہ ہو تو انسان کو حیوان سے اشرف سمجھنا حماقت سے خالی نہیں

اعتراض: نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے تو پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع نہ کیا جائے تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ عورتوں کا گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے احادیث میں تطبیق کیسے ہوگی۔ حدیث پاک کو دیکھیں۔

" عن ابن عمر قال قال رسول النبی ﷺ اذا استأذنت امرأة احدكم

الی المسجد فلا یمنعنها " (بخاری ، مسلم ، مشکوۃ باب الجماعۃ وفضلها)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک سے عورت مسجد میں جانے کی اجازت طلب کرے تو اسے ہرگز منع نہ کرو۔

جواب: اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس حدیث میں مسجد میں نماز ادا کرنا بہتر نہیں فرمایا بلکہ صرف یہ فرمایا کہ عورت اگر مسجد میں جانے کی اجازت طلب کرے تو اسے روکو نہیں۔ اس کی تائید میں ایک اور حدیث پاک کو دیکھیں جس سے واضح ہو جائے گا کہ ہر حال میں عورت کا گھر میں نماز پڑھنا ہی بہتر ہے

" عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تمنعوا نساء کم المساجد وبیوتهن خیر لهن " (رواہ ابوداؤد مشکوۃ باب الجماعۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی عورتوں کو مساجد سے نہ روکو اور ان کے گھر ان کے لئے بہتر ہیں۔ حدیث شریف کی شرح علامہ علی قاری رحمہ اللہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

" (لا تمنعوا نساء کم المساجد) ای للصلوۃ **والطواف (وبیوتهن)** ای عبادتهن فیها (خیر لهن) مطلقا **ویستثنی طواف الحج والعمرۃ او** من الصلوۃ فی المسجد " (مرقاۃ)

عورتوں کو مساجد سے نہ روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو نماز اور طواف سے نہ روکو اور ان کا اپنے گھر میں عبادت کرنا ان کے لئے مطلقا بہتر ہے۔ البتہ حج اور عمرہ کا طواف یا مسجد میں نماز ادا کرنا اس سے مستثنیٰ ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ عورت کا نماز اپنے گھر میں ادا کرنا ہر حال میں اس کے لئے بہتر ہے۔ البتہ حج اور عمرہ کا طواف کرنا اور اسی حج اور عمرہ کے دوران مسجد میں نماز ادا کرنے سے منع کرنا جائز نہیں۔ ہمارے زمانہ میں عورتوں کا مساجد میں نماز ادا کرنا مطلقا مکروہ ہے۔ کیونکہ اب فتنہ کا دور ہے فتنہ سے بچنا ممکن نہیں۔

" قال المظهر فیه دلیل علی جواز خروجهن الی المسجد للصلوۃ لکن فی زماننا مکروہ قال ابن الملک لفتنۃ قلت ویؤیدہ خبر الشیخین عن عائشۃ لو ان رسول اللہ ﷺ رای ما احدث النساء

لمنعهن المسجد كما منعت نساء بنی اسرائیل "(مرقاۃ ج ۳ ص ۵٦)

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں عورتوں کا مساجد میں جانا جائز تھا۔ لیکن ہمارے زمانہ میں مکروہ ہے کیونکہ یہ فتنہ کا دور ہے اور اسی مسئلہ کو بخاری و مسلم کی حدیث سے تائید حاصل ہوتی ہے۔ وہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یقینی بات ہے اگر رسول اللہ ﷺ اس حال کو دیکھتے جو آج عورتوں میں پایا جاتا ہے تو آپ عورتوں کو مساجد سے آنے سے منع فرماتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا۔

سبحان اللہ یہ تو صحابہ کرام کے زمانہ اور سلف صالحین کے زمانہ کی بات ہے۔ اب جب ہم نے یہود و ہنود کو خوش کرنے کے لئے ترقی پذیر ہونے اور آزادی نسواں کا نعرہ بلند کیا۔ تو آج مسلمانوں کی عورتیں عریانی میں ان کی عورتوں سے پیچھے نہیں بلکہ دو قدم آگے ہیں۔ اس لئے اگر ان کو مساجد میں آنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو مساجد کا تقدس پائمال ہو کر رہ جائے، رحمٰن کے خوش ہونے کے بجائے شیطان خوش ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نابینا صحابی کی حدیث کی وضاحت:

"عن ابی هريرة قال اتی النبی ﷺ رجل اعمی فقال يا رسول الله انه ليس لي قائد يقودني الى المسجد فسأل رسول الله ﷺ ان يرخص له فيصلي في بيته فرخص له فلما ولى دعاه فقال هل تسمع النداء بالصلوة قال نعم قال فاجب" (رواه مسلم، مشكوة باب الجماعة وفضلها)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک نابینا صحابی حاضر ہوئے، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا کوئی قائد نہیں جو مجھے مسجد میں لائے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے رخصت طلب کی کہ وہ گھر ہی نماز ادا کر لیا کریں۔ آپ نے ان کو رخصت دے دی۔ جب وہ واپس لوٹنے لگے تو آپ نے ان سے پوچھا کیا تم نماز کے لئے اذان سنتے ہو انہوں نے عرض کیا ہاں، آپ نے فرمایا پھر قبول کرو (یعنی پھر تم مسجد میں آ کر ہی نماز جماعت سے ادا کیا کرو)۔

اس حدیث سے بعض حضرات نے جماعت سے نماز ادا کرنا فرض عین قرار دیا۔ اور بعض حضرات نے فرض کفایہ کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ واجب ہے۔ (مرقاۃ)

لیکن صحیح یہ ہے " الجماعة سنة مؤكدة ای قوية يشبه الواجب في القوة " (ھدایہ مع حاشیہ) جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے البتہ اس میں بہت قوی تاکید پائی گئی لہٰذا واجب کے قریب ہے۔اصل میں حدیث پاک کا مطلب یہ ہے " لا اجد لک رخصة تحصل لک فضيلة الجماعة من غير حضورها " کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں اس طرح رخصت نہیں دیتا کہ تمہیں جماعت میں حاضر ہونے کے بغیر ہی جماعت کا ثواب حاصل ہو جائے۔ نبی کریم ﷺ کو یہ علم عطا کر دیا گیا تھا کہ ان کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں جماعت میں نہ حاضر ہوں لیکن مجھے ثواب جماعت کامل جائے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ کا مذہب یہ ہے کہ نابینا کو جماعت میں حاضر ہونا ضروری نہیں۔اس کا مطلب واضح ہے کہ نابینا شخص یا کوئی اور معذور جماعت میں حاضر نہ ہو تو اس پر ترک جماعت کی وعید نہیں۔البتہ جماعت کا ثواب جماعت سے نماز ادا کرنے سے ہی حاصل ہوگا۔

" ولحديث الصحيحين انه عليه السلام رخص لعتبان حيث شكا بصره ان يصلي في بيته "
(مرقاۃ ج ۳ ص ۵۴)

امام صاحب رحمہ اللہ کے مذہب کو بخاری اور مسلم کی حدیث سے تائید حاصل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عتبان بن مالک کو گھر نماز ادا کرنے کی اجازت فرمائی جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اپنی نظر (کی خرابی) کے متعلق عرض کیا۔

فائدہ: " والجماعة من خصائص الدين فانها لم تكن مشروعة في دين من الاديان " (عنایہ)

یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا اس دین یعنی شریعت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے کیونکہ پہلے کسی دین میں جماعت نہیں تھی۔اور ﴿ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ سے ایک اور مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت میں رکوع میں امام کے ساتھ مل گیا تو اس نے رکعت کو پالیا۔جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

" من ادرک الامام راکعا فرکع قبل ان يرفع الامام رأسه فقد ادرک تلک الرکعة " (بیہقی ج ۲ ص ۹۰)

یعنی جس شخص نے امام کے سر اٹھانے سے پہلے اس کے ساتھ رکوع کو پالیا اس نے اس

رکعت کو پالیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

" من لم یدرک الامام راکعا لم یدرک تلک الرکعة " (بیھقی ج ۲ ص ۹۰)

جس نے امام کے ساتھ رکوع کو نہ پایا اس نے اس رکعت کو نہیں پایا۔

دونوں حدیثوں سے مسئلہ مکمل طور پر سمجھ میں آ گیا کہ امام کے ساتھ رکوع کو پالینا رکعت کو پالینا ہے اور امام کے ساتھ رکوع کو نہ پانا رکعت کو نہ پانا ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ موقوف حدیث جو عقل سے ثابت نہ ہو سکے وہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتی ہے۔ مرفوع احادیث سے بھی یہی مسئلہ ثابت ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من ادرک رکعة من الصلوة مع الامام فقد ادرک الصلوة " (مسلم ج ۱ ص ۲۲۱)

جس شخص نے امام کے ساتھ نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز کو پالیا۔

" ان رسول الله ﷺ قال من ادرک رکعة من صلوة من الصلوات فقد ادرکها الا انه یقضی مافاته "

(نسائی ج ۱ ص ۹۵)

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے نمازوں میں سے کسی نماز کی رکعت کو پالیا اس نے نماز کو پالیا۔ ہاں مگر جو اس سے رکعتیں رہ گئیں ان کو مکمل کرلے۔

(ماخوذ از التبیان مع البیان للکاظمی)

ایک حدیث پاک سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں:

" عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول الله ﷺ اثنان فما فوقهما جماعة "

(ابن ماجه ، مشکوة باب الجماعة وفضلها)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو اور دو سے زیادہ شخص جماعت ہیں۔

بخاری شریف کی ایک حدیث پاک بھی اس کی تائید کرتی ہے:

" اذا حضرت الصلوة فاذ ناثم اقیما فلیؤمکما اکبر کما "

جب نماز کا وقت ہو جائے تو اذان کہو پھر اقامت کہو پھر تم دونوں میں سے جو بڑا ہو وہ امامت کرائے

ان احادیث سے واضح ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو دو آدمی ہوں یا دو سے زیادہ ہوں وہ

اذان کہہ کر اور اقامت کہہ کر جماعت کرالیں۔ لیکن یہ ایک مرتبہ کی بات ہے۔ یا دوران سفر کی بات ہے یار لوگوں نے سمجھا کہ گھر بیٹھ کر گپ شپ لگاتے رہو۔ گلی کوچے میں بیٹھ کر راہ گزرنے والوں کو تنگ کرتے رہو، کرکٹ کھیلتے رہو پھر مسجد میں خواہ جماعت ہو چکی ہو۔ پھر دو ہو جاؤ تو اور ایک مرتبہ جماعت کرالو، پھر دو اور جا کر نماز پڑھالو۔ اس طرح دو دو مسجد میں آتے رہو جماعتیں کراتے رہو، امام اور مقتدی سر سے ننگے۔ امام صاحب سنت رسول اللہ ﷺ کے تارک داڑھی چٹ۔

اگر اس حدیث کا یہی مقصد ہے جو ایک خاص نظریئے والوں نے سمجھ رکھا ہے تو مساجد بنانے اور جماعت کرانے کے مقاصد ہی فوت ہو جائیں گے۔ جماعت کے مقاصد میں تو اجتماعیت ہے۔ دو دو کے گروہوں میں آ کر بار بار جماعت کرانے میں تو انفرادیت ہے۔

مسجد میں دوسری جماعت کا حکم:

"ویکرہ تکرار الجماعۃ باذان و اقامۃ فی مسجد محلۃ لا فی مسجد طریق او مسجد لا امام و لا مؤذن" (در مختار باب الامامۃ)

محلّہ کی مسجد اذان و اقامت کے ساتھ دوسری جماعت کرانا مکروہ ہے البتہ راستہ کی مسجد ہو، یا ایسی مسجد ہو جہاں کوئی امام اور مؤذن نہ ہو وہاں دوسری جماعت جائز ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ " ولان فی الاطلاق ھکذا تقلیل الجماعۃ معنی فانھم لا یجتمعون اذا علموا انھم لا تفوتھم " (شامی) اس لئے کہ اگر مطلقاً دوسری جماعت کو جائز قرار دے دیا جائے تو اس سے جماعت میں کمی واقع ہوگی۔ جماعت کی وجہ درحقیقت لوگوں کا مجتمع ہونا ہے وہ اجتماعیت ختم ہو جائے گی، اس لئے کہ جب ہر شخص کو پتہ ہوگا کہ دو مل کر جائیں گے تو پھر جماعت کرالیں گے، ہماری جماعت تو نہیں رہ سکتی، تو یقیناً جماعت میں ملنے کی کوئی کوشش نہیں کرے گا۔

بوقت عذر جماعت کو ترک کرنا جائز ہے:

" عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ اذا وضع عشاء احدکم و اقیمت الصلوٰۃ فابدؤا بالعشاء و لا یعجل حتی یفرغ منہ و کان ابن عمر یوضع لہ الطعام و یقام الصلوٰۃ فلا یاتیھا حتی یفرغ منہ و انہ لیسمع قراءۃ الامام " (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الجماعۃ وفضلھا)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب شام کا کھانا تم میں سے کسی ایک کے پاس رکھ دیا جائے اور جماعت کھڑی ہو جائے تو (نماز کی طرف آنے کی) جلدی نہ کرو۔ پہلے کھانا کھالو، یہاں تک کہ کھانے سے فارغ ہو جاؤ (تو نماز ادا کرو) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے جب طعام رکھ دیا جاتا اور جماعت کھڑی ہو جاتی تو آپ جماعت میں شریک نہیں ہوتے تھے یہاں تک کہ کھانے سے فارغ ہو جاتے حالانکہ آپ امام کی قراءت سن رہے ہوتے۔

☆ **" وعن عائشة رضی اللہ عنهما انها قالت سمعت رسول اللہ ﷺ لا صلوة بحضرة طعام ولا هو يدافعه الاخبثان "** (رواه مسلم، مشکوة باب الجماعة وفضلها)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، طعام کے حاضر ہونے پر نماز ادا نہ کی جائے اور پیشاب، پاخانہ کی حاجت کے وقت نماز ادا نہ کی جائے۔

وضاحت: ان دونوں احادیث کا مطلب علامہ نووی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے واضح ہو جاتا ہے۔

" قال النووی کراهة الصلوة بحضرة الطعام الذی یرید اکله لما فیه من اشتغال القلب وذهاب کمال الخشوع وکذالک کراهتها مع مدافعة الاخبثین ویلحق ما فی معناه وهذا اذا کان فی الوقت سعة فلو تضیق الوقت اشتغل بالصلوة علی حالة حرمة للوقت " (مرقاة ج ۳ ص ۵۵)

علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا طعام کے حاضر ہوتے وقت نماز تب مکروہ ہوگی جب کہ آدمی کو کھانے کی بہت زیادہ خواہش ہو کہ نماز وہ حضور قلب (دل کے حاضر ہونے کے ساتھ) سے ادا نہ کر سکے، اگر کھانے کی اتنی خواہش نہیں تو نماز پہلے ادا کرنی ضروری ہے یہی حال پیشاب، پاخانہ کی حاجت کا ہے۔ اگر حاجت اس طرح ہے کہ نماز ادا کرنی مشکل ہو تو نماز ادا کرنا مکروہ ہے اور اگر حاجت اس طرح نہیں تو مکروہ نہیں۔

اسی طرح ہر عذر جو ان عذروں کی طرح ہو اس کا یہی حکم ہے کہ شدید عذر کے وقت جماعت کے ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں یہ تمام صورتیں اس وقت ہیں جب وقت میں وسعت پائی جائے اگر وقت میں گنجائش نہیں، وقت کے فوت ہونے کا خطرہ ہے تو وقت کا احترام کرتے ہوئے جہاں تک ممکن ہو سکے نماز پہلے ادا کرے۔ ''جہاں تک ممکن ہو سکے'' کی قید راقم نے اس لئے لگائی ہے کہ پیشاب پاخانہ کی شدید حاجت میں نماز ادا کرنا ممکن ہی نہیں۔

عالم شخص کو امام مقرر کیا جائے:

" عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ یؤم القوم اقرؤھم لکتاب الله فان کانوا فی القراء ة سواء فاعلمھم بالسنة فان کانوا فی السنة سواء فاقدمھم ھجرة فان کانوا فی الھجرة سواء فاقدمھم سنا "

(مسلم مشکوۃ باب الامامة)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قوم کی امامت کرائے جو کتاب اللہ کا ان سے زیادہ قاری ہو اگر قراءت میں برابر ہوں تو عالم بالسنۃ امامت کرائے۔ اگر علم میں برابر ہوں تو ان میں سے جو پہلے ہجرت کرنے والا ہو وہ امامت کرائے۔ اگر ہجرت میں برابر ہوں یعنی ایک ساتھ ہجرت کرنے والے ہوں تو وہ شخص امامت کرائے جو ان میں سے زیادہ عمر والا ہو۔

اعتراض: تم نے عنوان میں یہ ذکر کیا ہے کہ عالم شخص کو امام مقرر کیا جائے، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے پہلے قاری کا ذکر فرمائے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قاری کا حق پہلے ہے۔

جواب: نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد اپنے زمانہ کے صحابہ کرام کو فرمایا صحابہ کرام کے منصب کو دیکھ کر ہی حدیث پاک کو سمجھا جا سکتا ہے۔

" انما قدم النبی ﷺ الا قرأ لان الأ قرأ فی زمانه کان افقه اذلو تعارض فضل القراء ة فضل الفقه قدم الافقه اذا کان یحسن من القراء ة ما تصح به الصلوة وعلیه اکثر العلماء "

اکثر علماء سلف صالحین نے حدیث پاک کی وضاحت میں یہی بیان فرمایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قراءت میں فضیلت رکھنے والے کو پہلے ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں تمام قاری حضرات عالم ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب تمام قراء عالم نہیں ہوتے اس لئے اگر قاری بھی ہوں اور علماء بھی ہوں تو علماء کو امامت کے لئے منتخب کیا جائے جب کہ عالم اس طرح قرآن پاک پڑھ سکتا ہو جس سے نماز درست ہو جائے۔

مقام افسوس: آج کل امامت کے انتخاب کیلئے جہلاء کی کمیٹیاں ہوتی ہیں، جو دین سے بے خبر ہوتے ہیں فقہی مسائل سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ جب ایسے جہلاء نے امام کو منتخب کرنا ہے تو

یقیناً وہ جاہل کا ہی انتخاب کریں گے صرف آواز دیکھیں گے، اسکے شعر پڑھنے کو دیکھیں گے، یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے کہیں اسکے لغویات کفر تک پہنچانے والے تو نہیں۔ سینکڑوں مثالوں میں سے ذرا دو مثالیں دیکھئے ہاں جی ہمارے مولوی صاحب نے غوث پاک کی بڑی خوب شان بیان کی۔

آپ نے بتایا ہے کہ نبی ﷺ جب معراج کو گئے تو ایک مشکل مقام پر غوث پاک نے آپ کو کندھا دیا، ایک اور مثال دیکھئے، ہاں جی ہمارے مولوی صاحب نے بتایا کہ غوث پاک حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بلند شان رکھتے ہیں، وہ کیسے؟ جی آپ نے بڑی دلیل سے بیان کیا ہے، دلیل آپ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ غوث پاک نے بیان فرمایا ہے:

" قدمی هذه علی رقبة کل ولی الله " میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے تمام ولیوں کی گردنوں پر میرا یہ قدم ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بھی نبی کریم ﷺ کے امتی ہونے کی حیثیت میں تشریف لانا ہے۔ لہٰذا ان کی گردن پر بھی غوث پاک کا قدم ہے۔ (معاذ اللہ)

معاذ اللہ ثم معاذ اللہ کیسے لغویات ہیں یہ جو کفر تک پہنچا رہے ہیں لیکن ہمارے عوام کالانعام ایک جاہل کالحمار سے سن کر سر دھن رہے ہیں، عش عش کر رہے ہیں کہ جاہل مطلق نے ان کو سریلی آواز سے بیان کیا ہے، عوام نے کہا واہ کیا خوب۔

راقم نے یہ مثالیں دے کر حق بیان کر دیا ہے۔ بات واضح ہے کہ حضرت غوث اعظم شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا مقام اولیاء کرام میں بہت ہی بلند ہے لیکن آپ کسی صحابی کے مقام کو نہ پاسکے۔ اور کوئی صحابی کسی نبی کے مقام کو نہیں پہنچ سکا۔ تو یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ نبی کریم ﷺ بھی غوث پاک کے محتاج ہوئے اور یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ غوث پاک کو عیسیٰ علیہ السلام پر معاذ اللہ برتری حاصل ہے۔

ائمہ حضرات اور مقتدی یہ ضرور یاد کریں:

" وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ثلاثة لا تقبل منهم صلوتهم من تقدم قوما وهم له كارهون ورجل اتى الصلوة دبارا والدبار ان ياتيها بعد ان تفوته ورجل اعتبد محررة "

(رواه ابو داؤد و ابن ماجه، مشكوة باب الامامة)

حضرت عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی نماز قبول نہیں ہوتی:

(۱) جو شخص قوم کی امامت کرائے اور وہ اسے ناپسند کرتے ہوں۔

(۲) جو شخص وقت کے نکل جانے پر نماز ادا کرے۔

(۳) اور وہ شخص جو غلام ہو اور اپنے آپ کو آزاد سمجھے۔

وضاحت حدیث: وہ امام جس کو لوگ ناپسند سمجھیں اس امام کا ان لوگوں کو نماز پڑھانا مذموم ہے اور اس امام کی نماز قبول نہیں ہوگی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سا امام اس حدیث پاک کی زد میں آتا ہے

" (وامام قوم) ای الامامة الکبری او امامة الصلوة (وھم له) وفی نسخة لھا ای الامامة (کارھون) ای لمعنی مذموم فی الشرع وان کرھوا لخلاف ذلک فالعیب علیھم ولا کراھة قال ابن الملک ای کارھون لبدعته او فسقه او جھله اما اذا کان بینه وبینھم کراھة وعداوة بسبب امر دنیوی فلا یکون له ھذا الحکم فی شرح السنة قیل المراد امام ظالم واما من اقام السنة فاللوم علی من کرھه وقیل ھو امام الصلوة ولیس من اھلھا فیتغلب فان کان مستحقا لھا فاللوم علی من کرھه قال احمد اذا کرھه واحد او اثنان او ثلاثة فله ان یصلی بھم حتی یکرھه اکثر الجماعة "

(مرقاۃ ج ۳ ص ۴۷)

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی " امام قوم " سے مراد عام ہے خواہ وہ امامت کبری کا امام ہے یعنی ملک کا حاکم ہے، یا مسجد کا امام ہو، لوگ اسے ناپسند سمجھیں لیکن ان کی ناپسندیدگی امام کی شرعی برائی کی وجہ سے ہو اگر وہ شرعی برائی کے بغیر ہی کسی اور وجہ سے امام کو برا سمجھیں تو عیب ان لوگوں پر ہوگا، امام کا نماز پڑھانا بغیر کسی کراہت کے صحیح ہے، ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لوگ امام کو اس کی بدعات اور اس کے فسق اور اس کی جہالت کی وجہ سے ناپسند کریں تو امام کا امامت کرانا مکروہ ہے لیکن اگر لوگ امام کو صرف دنیاوی ناراضگی کی وجہ سے ناپسند کریں تو امام کی امامت شرعی طور پر درست ہے شرعاً اسے مکروہ کہنا جرم ہوگا، اسی طرح حاکم اگر لوگوں پر ظلم کرے اور لوگ اسے برا سمجھیں تو اس حاکم کو حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ لیکن حاکم اگر سنت کے مطابق عمل کر رہا ہو شرعی حدود کو نافذ کر رہا ہو۔ لوگوں کو قومی خزانہ لوٹنے سے منع کرتا ہو خود بھی قومی خزانہ کو نہ لوٹ رہا ہو تو اسے لوگ ناپسند سمجھیں تو

وہ لوگ برے ہیں لیکن حاکم اچھا ہے۔ اسی طرح مسجد کا امام اگر امامت کا شرعی طور پر مستحق نہیں اور وہ لوگوں پر غالب ہے اور امامت سے چمٹا ہوا ہے تو لوگوں کا ناپسند کرنا صحیح ہے اور اس کا امامت کرانا مکروہ ہے۔ لیکن اگر امام شرعی طور پر امامت کا مستحق ہے لوگ اس کی مخالفت دنیاداری طور پر کر رہے ہیں تو ملامت کے مستحق وہ لوگ ہیں جو امام پر اعتراض کر رہے ہیں۔ حضرت امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک، دو، تین یعنی چند آدمیوں کو امام کا ناپسند کرنا امام کو امامت کے استحقاق سے زائل نہیں کرتا۔ ہاں جب اکثر لوگ امام کو ناپسند سمجھیں تو پھر امام خود ہی ہٹ جائے تو یہی امام کے لئے بہتر ہے۔

راقم کو اکثر طور پر اصلاحی کمیٹیوں میں شرکت سے یہ معلوم ہوا کہ زیادہ طور پر سیاسی اختلافات، دنیاوی اختلافات اور ذاتی اختلافات کی وجہ سے کمینے لوگوں نے ائمہ کرام پر بدکاری جیسے الزامات لگائے ہیں۔ ایسے کمینے لوگوں سے بچنے کے لئے ائمہ کرام خود ہی معزول ہو جائیں تو ان کے لئے یہی بہتر ہوتا ہے۔

دبار کی وضاحت خود ہی حدیث پاک میں موجود ہے کہ وقت کے نکل جانے پر نماز ادا کرے، یا وقت کے نکلنے کے قریب مکروہ وقت میں نماز ادا کرنا کامل مقبولیت کا سبب نہیں ہے۔

رجل اعتبد محررة کے دو معانی بیان کئے گئے ہیں ایک یہ ہے کہ انسان غلام ہو یا لونڈی وہ مالک کی خدمت نہ کریں اس کے حکم کی پرواہ نہ کریں تو ان کی نماز کی قبولیت میں کمال نہیں ہوا۔ اس معنی کو دوسری حدیث سے تائید بھی حاصل ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ جو غلام بھاگ جائے اس کی نماز کامل طور پر قبول نہیں ہوتی۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ آزاد شخص ہر وقت حکام وغیرہ کی خدمت میں غلاموں کی طرح مصروف رہے اور نماز جلدی جلدی آکر ادا کرے اس کی نماز بھی کامل طور پر قبول نہیں ہوتی۔

تنبیہ: دوسری احادیث میں یہ بھی ذکر ہے جس عورت کا خاوند اس پر رات ناراضگی میں گزارے اس عورت کی نماز بھی کامل طور پر قبول نہیں ہوتی۔ دو مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہیں، فتنہ و فساد برپا رکھیں تو ان کی نماز بھی کامل طور پر قبول نہیں ہوتی۔

مفتیان کرام یہ مسئلہ یاد رکھیں:

" ولا بأس بامامة الاعمی والاعرج والاشل والاقطع والخصی والعبد اذا کان کل واحد منهم عالما بالصلوة وقال ابن وهب لا اری ان یؤم الا قطع والاشل لانه منتقص عن درجة الکمال وکرهت امامته لاجل النقص وخالفه جمهور اصحابه وهو الصحیح لانه عضوا لا یمنع فقده فرضا من فروض الصلوة فجازت الامامة الراتبة مع فقده کالعین وقدروی انس ان النبی ﷺ استخلف ابن ام مکتوم یؤم الناس وهو اعمی وکذا الاعرج والاقطع والاشل والخصی قیاسا ونظرا ...... والله اعلم...... وقدروی عن انس بن مالک انه قال فی الاعمی وما حاجتهم الیه وکان ابن عباس وعتبان بن مالک یؤمان وکلاهما اعمی وعلیه عامة العلماء "

(قرطبی ج ۱ ص ۳۵۴)

امام اگر عالم ہو خواہ نابینا ہو، یا لنگڑا ہو اس کے ہاتھ پاؤں شل ہوں یا کٹے ہوئے ہوں، خصی ہو یا غلام ہو ہر حال میں اس کی امامت صحیح ہے۔ اس میں کوئی کراہت نہیں۔ فقہاء کرام بھی نابینا یا غلام کی امامت کو اسی لئے مکروہ قرار دیتے ہیں کہ وہ اکثر اوقات جاہل ہوتے ہیں۔ لیکن جب عالم ہوں تو ان کی امامت صحیح ہے۔ صرف ابن وہب کا قول ہے کہ جس شخص کے ہاتھ پاؤں شل ہوں یا کٹے ہوئے ہوں وہ درجہ کمال سے ناقص ہے لہذا اس کی امامت اس نقص کی وجہ سے مکروہ ہے۔ لیکن ابن وہب کا قول جمہور کے مذہب کے مخالف ہے۔ صحیح وہی ہے جو جمہور نے کہا ہے کہ کسی عضو کا ناقص ہونا نماز کے ارکان میں خلل انداز نہیں جس طرح ایک آنکھ کے ضائع ہونے سے امامت میں کوئی نقص نہیں۔ اسی طرح کسی عضو سے معذور ہونے سے بھی اس کی امامت میں کوئی فرق نہیں پڑتا...... حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ (جب غزوہ میں تشریف لے گئے) نے اپنا خلیفہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ طیبہ میں خلیفہ بنایا وہ لوگوں کی امامت بھی کراتے رہے حالانکہ وہ نابینا تھے۔

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ نابینا شخص کی امامت پر لوگوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے جب کہ حضرت ابن عباس اور عتبان بن مالک رضی اللہ عنہما امامت کراتے رہے حالانکہ وہ دونوں نابینا تھے۔

صفوں کو سیدھا رکھنا:

" وعن انس قال اقیمت الصلوۃ فاقبل علینا رسول اللہ ﷺ بوجھہ فقال اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظھری "

(رواہ البخاری ، مشکوۃ باب تسویۃ الصفوف)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نماز کے لئے اقامت کی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے ہماری طرف توجہ فرمائی اور ارشاد فرمایا اپنی صفوں کو سیدھا برابر رکھو اور ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہو ، بیشک میں تمہیں پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

وضاحت حدیث:

اقیمت الصلوۃ: " ای فعلت اقامۃ الصلوۃ " یعنی نماز کے لئے اقامت کہی گئی ، یا یوں کہیں جب نماز کو قائم کرنے کی تیاری کی گئی۔ (اقیموا صفوفکم) ای عدلوا واتموا " حدیث شریف میں جو لفظ " اقیموا صفوفکم " کے استعمال ہیں ان کا معنی یہ ہے صفوں کو سیدھا برابر رکھو اور صفوں کو مکمل کرو۔

(از مرقاۃ)

☆ " عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ رصوا صفوفکم وقاربوا بینھا وحاذوا بالاعناق فوالذی نفسی بیدہ انی لاری الشیطان یدخل من خل الصف کانھا الخذف "

(رواہ ابو داؤد ، مشکوۃ باب تسویۃ الصفوف)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صفوں کو درست رکھو ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہو صفوں میں ایک دوسرے کے قریب ہو جاؤ اور گردنوں کو برابر کرو ، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بیشک میں شیطان کو صف کی خالی جگہ میں ایسے گھستے ہوئے دیکھ رہا ہوں جیسے بھیڑ بکری کا چھوٹا بچہ خالی جگہ میں گھس جاتا ہے۔

وضاحت حدیث:

" رصوا صفوفکم " کا معنی یہ کہ صفوں کو سیدھا رکھو اور ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہوں درمیان میں خالی جگہ نہ رہے ، خیال رہے " رصوا " اور " تراصوا " کے معانی " بنیان مرصوص " سے لئے ہوئے ہیں۔ (وقاربوا بینھا) یعنی صفوں کے درمیان قرب رکھو ایسا نہ ہو کہ دو صفوں کے درمیان اتنی کشادگی رکھو کی ان کے درمیان ایک اور صف سما سکے۔ تمہارا صفوں میں جسمانی

طور پر ایک دوسرے مل کر کھڑا ہونا تمہاری روحوں کے درمیان اتصال کا ذریعہ ہوگا۔ یعنی تمہارے دل ایک دوسرے کے قریب ہوں گے ۔ اور شیطان تمہارے درمیان گھس کر تمہارے درمیان نفاق (منافقت) پیدا نہیں کرے گا۔

" والظاهر ان محله حيث لا عذر كحر او برد شديد " اگر کسی عذر کی وجہ سے صف میں اس طرح کھڑے ہوں کہ ایک دوسرے سے معمولی فاصلہ رہے تو کوئی حرج نہیں جیسا کہ شدید گرمی اور شدید سردی میں ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ فاصلہ رہے۔ گرمی میں تو واضح ہے اور سردیوں میں اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ لوگوں نے چادریں اوڑھ رکھی ہوتی ہیں بہت قرب اور بہت زیادہ مل کر کھڑا ہونا رکوع اور سجدہ کرنے میں دشواری کا سبب بنتا ہے۔

﴿وَحَاذُوا بِالْأَعْنَاقِ﴾: اس کا ظاہری معنی یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ گردنیں برابر رکھو احادیث کا ظاہری ترجمہ دیکھنے والے مطالب کو نہ سمجھنے والے یار لوگ ایک جیسے قد والے لوگ تلاش کر کے ایک دوسرے کے ساتھ کھڑا کریں تب اس پر عمل ہو سکے گا۔ نہیں نہیں اس کا یہ مطلب ہی نہیں اسی لئے علامہ طیبی رحمہ اللہ نے واضح طور پر بیان فرمایا:

" ولا عبرة بالاعناق اذ ليس على الطويل ان يجعل عنقه محاذ يا للقصير "
حدیث شریف کا ظاہری معنی معتبر ہی نہیں اس لئے کہ لمبے قد والے شخص کی گردن چھوٹے قد والے کی گردن کے برابر نہیں ہو سکتی۔

ہاں ذرا غور کیجیے حدیث پاک کا مطلب کیا ہے؟

" (وحاذوا بالاعناق) اى بان لا يترفع بعضكم على بعض بان يقف في مكان ارفع من مكان الآخر "
یعنی بعض کو بعض سے اوپر، نیچے کھڑا ہونے سے منع کیا گیا ہے۔ (از مرقاة ج ۳ ص ۷۱)

یہ بھی خیال رہے کہ امام کے ساتھ کچھ صفیں برابر جگہ پر ہوں، پھر اور صفیں کچھ اوپر دوسری منزل میں ہوں اور کچھ نیچے تہہ خانہ وغیرہ میں ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس حدیث کی وضاحت سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا:

ایک اور حدیث پاک کی طرف توجہ کیجیے۔

" عن انس عن النبی ﷺ قال اقيموا صفوفكم فانى اراكم من وراء

ظهری و کان احدنا یلزق منکبه بمنکب صاحبه و قدمه بقدمه "

(بخاری باب الزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم فی الصف)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنی صفوں کو درست رکھو بیشک میں تمہیں پیٹھ کے پیچھے دیکھتا ہوں اور ہم سے کوئی ایک اپنے کندھے کو دوسرے کے کندھے سے ملاتا اور قدم کو قدم سے ملاتا۔

☆ " وقال النعام بن بشر رأیت الرجل منا یلزق کعبه بکعب صاحب "

نعمان بن بشیر کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ایک شخص اپنے کعب کو دوسرے کے کعب سے ملاتا جب پہلی حدیث سے واضح کیا جا چکا ہے کہ گردنوں کا برابر کرنے کا حکم اپنے ظاہر پر نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کہ ایک دوسرے سے ایک ہی صف میں اوپر نیچے نہ کھڑے ہو۔ اسی طرح ان دونوں حدیث کا بھی مقصد یہ ہے " المراد بذلک المبالغة فی تعدیل الصف و سد خلله " کہ صفوں کو درست کرنے اور ان میں کشادگی کو بند کرنے کو بہت مبالغہ سے ثابت کیا گیا ہے۔

کئی احادیث میں صفوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا ہے کہ درمیان میں خالی جگہ نہ چھوڑ و مختلف احادیث میں مختلف الفاظ مذکور ہیں تاہم ابوداؤد اور صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث مذکور ہے جس کے الفاظ تمام احادیثوں کے الفاظ کو جامع ہیں۔

" ان رسول اللہ ﷺ قال اقیموا الصفوف وحاذوا بین المناکب وسدو الخلل ولا تذروا فرجات للشیطان ومن وصل صفا وصله اللہ ومن قطع صفا قطع اللہ "

(فتح الباری ج ۲ ص ۲۴۷)

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صفوں کو سیدھا رکھو اور کندھوں کو برابر رکھو اور درمیان میں کشادگی کو بند کرو اور درمیان میں شیطان کے لئے خالی جگہ نہ چھوڑو جس نے صف کو ملایا اللہ تعالیٰ اسے ملائے گا (یعنی ان کے دل ایک دوسرے سے مل جائیں گے) اور جس نے صف کو منقطع کیا اللہ تعالیٰ اسے منقطع کرے گا۔

جن دو حدیثوں کا ذکر کیا جا رہا ہے ان سے یہ ثابت کرنا کہ صف میں کندھے سے کندھا ملانا اور ٹخنے سے ٹخنہ ملانا ضروری ہے یہ ناکام کوشش ہے اس کی وجوہ دیکھیں مسئلہ خود واضح ہو جائے۔ ایک وجہ تو یہ ہے " و کان احدنا " کا مفہوم یہ ثابت کرنا یقینی نہیں کہ اس کا یہ ہی ترجمہ کیا جائے کہ ہم میں سے

ہر ایک (کندھے سے کندھا ملاتا) بلکہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک کندھے کو کندھے سے ملاتا۔

پھر " یلزق " کا معنی ملانا اور چمٹانا کرنا بھی ضروری نہیں۔اس لئے کہ " ملزق "منہ بولے بیٹے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اسے اپنی طرف منسوب تو کیا جا سکتا ہے لیکن متصل ہونا اور چمٹنا معنی مراد لینا درست ہی نہیں پھر کعب کا معنی ٹخنہ کرنا ضروری نہیں اس لئے کہ وضوء کے مسائل میں " کعب " کا معنی ٹخنہ ہے حج کے مسائل میں " کعب " کا معنی " معقد الشراک " لیا گیا ہے یعنی پاؤں کا اوپر ہڈی والا حصہ جہاں تسمہ ہوتا ہے اور " کعب " کا معنی ایڑی بھی لیا گیا۔

تمام احادیث کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ کندھے کو کندھے کے برابر رکھو، قدم کو قدم کے برابر رکھو، صف کو درست رکھو درمیان میں جگہ خالی نہ چھوڑو۔اس لئے کندھے چڑھا کر، یا کندھے نیچے کر کے دوسرے کے کندھے سے ملانا اور پاؤں پھیلا کر ایک دوسرے کے ٹخنوں سے ٹخنے ملانا احادیث کا مطلب نہیں۔اور بہت واضح بات ہے کہ رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تکلف کا حکم نہیں دیا گیا۔کندھوں کو کندھوں سے ملانا اور ٹخنوں کو ٹخنوں سے ملانا، اور کھڑے ہونا اور اسی حال میں رکوع اور سجدہ کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں اس پر عمل کرنے کی ناکام جسارت ہے۔اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا کوئی عمل ایسا نہیں جسے لوگ عیب سمجھیں۔

سب حضرات کو دعوت فکر دیتا ہوں اور انصاف کی توقع رکھتا ہوں کہ ذرا غور کریں اور انصاف کی آنکھ سے غیر مقلدوں کو بھی نماز جماعت سے ادا کرتے ہوئے دیکھو اور حنفیوں کو بھی دیکھو تو خود بخود سمجھ آجائے گا کہ اونٹ کی طرح پاؤں پھیلا کر کھڑا ہونا اور طبعی طور پر پاؤں جتنے کھلے ہوتے ہیں اسی مقدار میں کھلے رکھ کر کھڑا ہونا ان میں سے مہذب طریقہ کون سا ہے اور عیب دار کون سا ہے۔اور لطف کی بات ہے کہ حدیث میں صف کو درست کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کے ظاہری الفاظ سے غلطی کھانا اور حقیقی مطلب کو نہ سمجھنا تو غیر مقلدوں کا طریقہ چلا آ رہا ہے لیکن ان احادیث سے اکیلے نماز پڑھتے ہوئے پاؤں کو پھیلا کر کھڑا ہونا کہاں سے ثابت ہے۔

دینی مدارس کے طلباء اس مسئلہ کو بھی بخوبی سمجھتے ہیں کہ " با " الصاق کے لئے آتی ہے اور الصاق کا معنی ہے "اتصال الشئی بالشئی "ایک چیز کا دوسری چیز سے متصل ہونا پھر اتصال کی دو قسمیں ہیں۔

اتصال حقیقی اور اتصال مجازی۔ اتصال حقیقی کی مثال " بـــه داء " ہے جس کا معنی ہے اس کے ساتھ بیماری حقیقی طور پر متصل ہے۔ اور اتصال مجازی کی مثال ہے " مررت بزید " جس کا معنی میں زید کے قریب سے گزرا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں زید سے چمٹ کر، اپنے جسم کو اس کے جسم سے ملا کر گزرا۔ جب " الـصـاق " اور " الـزاق " کا تقریبا ایک معنی ہے تو کیا وجہ ہے کہ الصاق کا مجازی معنی لے لیا جائے اور الزاق کا مجازی معنی نہ لیا جائے؟ وجہ صرف یہی ہے کہ علمی کمزوری ہے ظاہری معنی کو دیکھنا اور کسی عبارت کی اصل روح کو نہ سمجھنا ہے ورنہ اور کوئی وجہ ہی نہیں۔

﴿ اَتَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾

۱) "کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں"

۲) "کیا حکم دیتے ہو تم لوگوں کو بھلائی کا، اور چھوڑتے ہو اپنے نفسوں کو، حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب کیا تم عقل نہیں رکھتے"

شان نزول:

(۱) یہود کے علماء کو یہ خطاب ہے کیونکہ ان کے کئی رشتہ دار اسلام لے آئے تھے جب وہ ان کو ملتے تو یہ ان کو نصیحت کرتے تھے کہ تم نے جو اسلام قبول کیا ہے اس پر قائم رہو وہ سچا دین ہے اور محمد ﷺ تمہیں جس چیز کا حکم دیں اسے تسلیم کرو، اس لئے کہ وہ سچے نبی ہیں، لیکن وہ خود اسلام نہیں لا رہے تھے، اور نہ ہی نبی کریم ﷺ کو سچا نبی تسلیم کیا، تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

(۲) یہود کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے مشرکین عرب کو خبر دیتے تھے کہ بیشک آخری رسول تم میں سے ہی ظاہر ہوں گے اور حق کی دعوت دیں گے ہم بھی تمنا رکھتے ہیں کہ وہ تشریف لے آئیں تو ہم ان کی تابعداری کریں۔ لیکن جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے حسد کیا اور ان سے کفر کیا، تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ تمہیں کیا ہوا کہ تم تو مشرکین عرب کو آخری نبی پر ایمان لانے کی ترغیب دے رہے تھے لیکن ان کے آنے پر تم خود ہی پھر گئے۔

(۳) یہود کے علماء لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طاعت کا حکم دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم گناہوں سے دور رہو، لیکن وہ خود اس کے الٹ کام کرتے تھے، یعنی برائیوں کا ارتکاب کرتے اور نیکیوں پر عمل کرنے کو چھوڑ دیتے تھے۔

(۴) یہود کے علماء لوگوں کو نماز پڑھنے اور زکواۃ دینے کا حکم دیتے تھے، لیکن خود نہ نماز ادا کرتے اور نہ زکواۃ دیتے تھے تو ان کی مذمت میں یہ آیۃ نازل ہوئی۔

(۵) لوگوں کو رب تعالیٰ کی راہ میں بطور صدقہ مال خرچ کرنے کا حکم دیتے تھے لیکن خود بخل کرتے تھے رب تعالیٰ کی راہ میں مال نہیں خرچ کرتے تھے، رب تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ان کے دل سخت تھے وہ سود کھاتے تھے، اور حرام مال حاصل کرتے تھے تو ان کی مذمت میں یہ آیۃ نازل ہوئی۔

(۶) یہود میں سے منافقین لوگوں کو ظاہر طور پر ایمان لانے کا حکم دیتے تھے اور دل سے انکار کرتے تھے اور مخالفت کرتے تھے تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

(۷) یہود لوگوں کو توراۃ کی تابعداری کرنے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیتے تھے، لیکن نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد خود انہوں نے توراۃ کی تابعداری کرنی چھوڑ دی اس لئے کہ توراۃ میں تو ذکر تھا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ سچے نبی ہیں جب تشریف لائیں تو ان پر ایمان لانا۔ آپ کے آنے پر ایمان نہ لانا درحقیقت توراۃ کی تابعداری سے منہ موڑنا تھا۔

تنبیہ: مختلف جو شان نزول بیان کئے گئے ہیں ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے کہ یہ تمام واقعات پہلے پیش آئے تو بعد میں آیۃ کریمہ کا نزول ہوا لہذا یہ تمام وجوہ ہی شان نزول ہیں۔ (از کبیر)

﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ ﴾: ہمزہ استفہام کیلئے ہے جس میں تقریر مع توبیخ پائی گئی ہے یا تقریر مع تعجیب پائی گئی ہے تقریر مع توبیخ کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دے رہے۔ خود اس پر عمل چھوڑ رہے ہو تم ایسا کر تو رہے ہو لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

تقریر مع تعجیب کا یہ مطلب ہے کہ تعجب ہے تم پر کہ لوگوں کو تم نیکی کا حکم دیتے ہو لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے "البر" جب باء کے نیچے زیر ہو تو اس کا معنی ہے "نیکی" اور جب "باء" پر زبر ہو تو اس کا معنی وسیع فضاء اس لئے البر بالکسر ماخوذ ہے البر بالفتح سے لہذا نیکی میں بھی وسعت معتبر ہے۔ (از بیضاوی)

'' البــرا '' بالفتح کا معنی ''اجلال اور تعظیم'' بھی ہے اسی معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے
''ولدبر وبار '' یعنی اولاد اپنے والدین کی تعظیم اور تکریم کرتی ہے۔ (از قرطبی)

'' البر '' کے معنی میں وسعت کیسے ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:
'' واما البر فهو اسم جامع لاعمال الخير '' یعنی ہر قسم کے نیکی کے کام کو '' البر '' کہا جاتا ہے۔
اسی معنی کے لحاظ سے کہا جاتا '' بـر الـوالـديـن '' والدین کی فرمانبرداری کرنا اور کہا جاتا ہے
''عـمـل مبـرور اى قد رضيه الله تعالىٰ ''یعنی جس کام میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی پائی جائے اسے
''عمل مبرور'' کہا جاتا ہے۔ اور '' بر '' بمعنی صدق بھی استعمال ہے جیسا کہا جاتا ہے '' بـر فی يمينه ''
وہ اپنی قسم میں سچا رہا، اس نے قسم کو توڑا نہیں اور اسی طرح کہا جاتا ہے '' صدقت وبررت '' تم نے سچ
اور حق کہا ہے۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ (وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى) فَاَخْبَرَ اَنِ الْبِرَّ جَامِعٌ لِلتَّقْوٰى ﴾

یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ نیکی وہی ہوسکتی ہے جس میں تقوی پایا جائے۔

''بر'' کی تین قسمیں:

(۱) '' بـرفـي مـعـاملة الله تعالىٰ وعبادته '' ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے جو معاملہ ہے اس میں نیکی کا کام کرے اور رب تعالیٰ کی عبادت کرے۔

(۲) '' وبـر فـي مـعاملة الاقارب ومراعات حقوقهم '' اور دوسری قسم یہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں سے نیکی اور بھلائی سے درپیش آئے اور ان کے حقوق کی رعایت کرے۔

(۳) '' وبـرفـي مـعـاملة الاجانب وانصافهم'' اور تیسری قسم یہ ہے کہ اجنبی لوگوں سے اچھا سلوک رکھنا اور ان سے انصاف سے درپیش آنا۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

﴿ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ : '' اى تـتـركـون انـفـسـكـم والنسيان (بكسر النون) يكون بمعنى الترک وهو المراد هنا وفي قوله تعالىٰ (نسوا الله فنسيهم) ''

یعنی مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ تم اپنی جانوں کو چھوڑتے ہو، نسیان (نون کی زیر سے) کا معنی ترک کرنا بھی آتا ہے اور وہی مرد ہے یہاں جیسا کہ '' نسـوا الله فـنسيهـم '' میں یہی معنی معتبر ہے کہ

انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا اور اللہ نے ان کو چھوڑ دیا۔ (قرطبی)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس سے بھی زیادہ واضح تحریر فرمایا ہے:

" والمراد به هنا الترک لان احدا لا ینسی نفسه بل یحرمها ویترکها "

یہاں نسیان کا معنی ترک کرنا ہے کیونکہ کوئی شخص اپنے آپ کو بھولتا نہیں البتہ اپنے آپ کو محروم کر دیتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے۔

گویا کہ ان کی غفلت کو مبالغہ سے ثابت کیا گیا کہ وہ خود نیکیوں کو چھوڑ کر اتنے غافل ہو گئے جیسا کہ جو چیز بھول جائے تو انسان اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ (از روح المعانی)

نسیان اور سہو میں فرق: لغوی معنی کے لحاظ پر تو نسیان اور سہو کا فرق نہیں۔ دونوں کا معنی یہ ہے "عدم الاستحضار فی وقت الحاجة" ضرورت کے وقت کسی چیز کا یاد نہ آنا۔ البتہ اصطلاح فقہاء میں یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ ایک چیز کا نفس میں حاضر ہونے کے بعد غائب ہو جانا نسیان کہلاتا ہے اور سہو عام ہے کیونکہ کبھی علم کے بعد بھولنے کو سہو کہا جاتا ہے۔ اور کبھی علم حاصل ہونے کے بغیر ہی کسی چیز کا ذہن میں موجود نہ ہونے کو سہو کہا جاتا ہے۔ (البحر الرائق)

نسیان کی دو قسمیں: نسیان کی ایک قسم یہ ہے کہ انسان کے ذہن سے کوئی چیز نکل جائے اسے یاد نہ رہے لیکن اس کے ارادہ کو اس میں دخل نہ ہو اس کی طرف سے اس بھول میں کوئی اسباب نہ پائے جائیں۔ یہ بھول معاف ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا "رفع عن امتی الخطا والنسیان" میری امت سے خطا اور نسیان کو اٹھا لیا گیا ہے۔ یعنی میری امت کو خطا اور نسیان پر کوئی گرفت (پکڑ) نہیں۔

نسیان کی دوسری قسم یہ ہے کہ انسان خود اپنے ارادہ سے غافل ہو جائے، اس کے بھولنے میں اس کے اپنے اسباب کو دخل ہو کہ وہ یاد رکھنے کے اسباب کا لحاظ نہ رکھے۔ اس بھولنے پر گرفت ہو گی۔ اسی نسیان کے متعلق رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

﴿ فَكَذٰلِكَ اَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيْتَهَا ﴾

اس طرح تمہارے پاس ہمارے آیات آئیں تم نے ان کو بھلا دیا۔

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

" من حفظ القرآن ثم نسیه لقی الله تعالیٰ هو اجذم "

جس نے قرآن یاد کیا پھر اسے بھلا دیا تو وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا جب کہ یہ شخص اجذم ہوگا۔

اجذم کا معنی کسی عضو کا کٹ جانا بے برکت ہونا، گویا کہ یوں کہہ دیا جائے کہ اس کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوگی تو اس شخص کی اللہ تعالیٰ کے تقرب کی ناک کٹی ہوگی یعنی اسے رب تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوگا۔

﴿ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ﴾ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ ان الفاظ مبارکہ سے ان کی اور زیادہ مذمت بیان کی گئی ہے کہ تم توراۃ پڑھتے ہو تمہیں معلوم ہے کہ عناد کرنے پر رب تعالیٰ کا عذاب ہوتا ہے اور نیکی کے چھوڑنے پر رب تعالیٰ کا مؤاخذہ ہوتا ہے اور عمل کا قول کے مخالف ہونا اور ہی مذموم ہے۔ تو تم بھی سمجھ لو کہ اگر تم نے نبی کریم ﷺ کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾: عقل کا معنی ہے روکنا اس لئے معنی یہ ہوگا " افلا تمنعون انفسكم من مواقعة هذه الحال المردية لكم " تم اپنے آپ کو اس ہلاکت والے مقام میں واقع ہونے سے روکتے کیوں نہیں۔ عقل کا معنی جب روکنا ہے تو اس کے مناسب چند الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے طلباء کرام ان الفاظ اور ان کے معانی کو مدنظر رکھیں تا کہ انہیں سمجھنے میں دشواری درپیش نہ آئے:

"عقال البعير " اونٹ کو باندھنے والی رسی کو کہا جاتا ہے کہ وہ اونٹ کو چلنے، پھرنے سے روکتی ہے۔

" العقل " کا ایک معنی دیت بھی ہے کیونکہ قاتل جب مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کر دیتا ہے تو گویا کہ ان کو روک دیتا ہے کہ اب تم مجھے قتل نہیں کر سکتے کیونکہ میں نے دیت ادا کر دی۔ پیٹ کے بند ہونے کو اعتقال البطن اور زبان کے بند ہونے کو اعتقال اللسان اور قلعہ کو معقل کہا جاتا ہے اور عقل جہالت کی نقیض کو بھی کہا جاتا ہے یعنی کبھی علم اور عقل کا ایک ہی معنی لیا جاتا ہے۔ سرخ رنگ کا کپڑا جو عرب عورتیں اپنے ہودج پر ڈالتی تھیں کہ اس سے پردہ ہو جائے اسے بھی عقل کہا جاتا تھا۔

علم کے مطابق عمل نہ ہونے پر وعید:

"عن انس قال قال رسول الله ﷺ ليلة اسرى بى مررت على ناس تقرض شفاههم بمقاريض من نار فقلت يا جبريل من هؤلاء قال هؤلاء الخطباء من اهل الدنيا يا مرون الناس بالبر وينسون انفسهم وهم

يتلون الكتاب افلا يعقلون" (كذا في مسند احمد قرطبي و كبير)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معراج کی رات کو میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے میں نے کہا اے جبرائیل یہ کون لوگ ہیں تو جبرائیل نے کہا یہ لوگ دنیا والوں میں خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور خود ان پر عمل چھوڑ دیتے تھے حالانکہ وہ کتاب پڑھتے تھے یہ عقل کیوں نہیں رکھتے تھے۔

☆ عن اسامة بن زيد قال سمعت رسول الله ﷺ يقول يؤتى بالرجل يوم القيامة فيلقى في النار فتندلق اقتاب بطنه فيدوربها كما يدور الحمار (بالرحى) فيجتمع اليه اهل النار فيقولون يا فلان مالك الم (تكن) تامر بالمعروف وتنهى عن المنكر فيقول بلى قد كنت آمر بالمعروف ولا آتيه وانهى عن المنكر و آتيه"

(مسلم، قرطبي، كبير، مسند، بخاري، صابوني)

حضرت اسامہ بن زید کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ایک شخص کو قیامت کے دن لایا جائے گا اسے آگ میں ڈالا جائے گا، اس کے پیٹ کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی وہ ان کو لے کر چکر کاٹ رہا ہوگا جیسا گدھا (چکی کے اردگرد) چکر کاٹ رہا ہوتا ہے۔ جہنم والے لوگ جمع ہو جائیں گے وہ کہیں گے اے فلاں شخص تجھے کیا ہو گیا۔ کیا تو اچھے کاموں کا حکم نہیں دیتا تھا کیا تو برے کاموں سے روکتا نہیں تھا۔ وہ کہے گا کیوں نہیں، تحقیق میں اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا لیکن خود ان پر عمل نہیں کرتا تھا اور برے کاموں سے روکتا تھا لیکن خود وہی کام کرتا تھا۔

(الاقتاب : الامعاء : انتڑیاں فتندلق : فتخرج بسرعة : جلدی سے نکلنا)

☆ "وقال عليه الصلوة والسلام ان في النار رجلا يتاذى اهل النار بريحه فقيل من هو يا رسول الله ؟ قال عالم لا ينتفع به"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بیشک آگ میں ایک شخص ہوگا جس کی (آگ میں جلنے سے) بو سے لوگوں کو بڑی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ وہ کون ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ عالم جس نے اپنے علم سے نفع حاصل نہیں کیا ہوگا۔

☆ "وقال عليه الصلوة والسلام مثل الذي يعلم الناس الخير ولا يعمل به كالسراج يضئ للناس ويحرق نفسه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کو نیکی کا حکم دے اور خود اس پر عمل نہ کرے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ چراغ کی بتی لوگوں کو روشنی مہیا کرتی ہے۔ اور خود جلتی ہے۔

☆ " وعن الشعبی یطلع قوم من اهل الجنة الی قوم من اهل النار فیقولون لم دخلتم النار ونحن انما دخلنا الجنة بفضل تعلیمکم فقالوا انا کنا نأمر بالخیر ولا نفعله "

(من ابن عساکر فی ترجمة الولید بن عقبه ، کبیر ، صابونی)

شعبی کہتے ہیں جنت کے کچھ لوگ جہنم میں کچھ لوگوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے تم آگ میں کیوں داخل ہوئے ہو؟ حالانکہ ہم تمہاری تعلیم کی برکت وفضیلت کی وجہ سے جنت میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ کہیں گے بیشک ہم نیکی کا حکم دیتے تھے اور خود اس پر عمل نہیں کرت تھے۔

☆ " من وعظ بقوله ضاع کلامه "　　ومن وعظ بفعله نفذت سهامه "

جس شخص نے صرف زبانی زبانی وعظ کیا عمل نہ کیا اس نے اپنے کلام کو ضائع کر دیا اور جس نے اپنے اچھے اعمال سے وعظ کیا اس کا تیر لوگوں کے دلوں کے نشانہ پر لگا:

یعنی عامل کی سادہ گفتگو دلوں پر اثر کرتی ہے　　اور بے عمل کی خوبصورت تقریر بھی رائیگاں چلی جاتی ہے

☆ کسی شاعر نے کیا خوبصورت شعر نصیحت آموز کہے۔

یا ایها الرجل المعلم غیره　هلالنفسک کان ذا التعلیم

اے شخص غیر کو تعلیم دینے والے　　وہی تعلیم تو اپنے آپ کو کیوں نہیں دیتا

تو اور بیماروں اور کینہ رکھنے والوں کے لئے دواء کا انتخاب کرتا ہے کہ وہ صحیح ہو جائیں تو خود بیمار ہی ہے

ابدأ بنفسک فانهماعن غیها　　فاذ انتهت عنه فانت حکیم

اپنے نفس سے ابتداء کرواسے بھٹکنے سے روکو　　جب وہ بھٹکنے سے رک گیا تو تم حکیم ہو گے۔

فهناک یقبل ان وعظت ویقتدی　　بالرای منک وینفع التعلیم

پس اس وقت تیرے وعظ کو قبول کیا جائے گا اور اقتداء کی جائے گی تیری رائے کی اور تعلیم نفع دے گی۔

بیان کیا گیا ہے کہ یزید بن ہارون بہت نیک، زاہد وعظ کرنے والے شخص تھے، جب وہ فوت ہو گئے تو ان سے خواب میں کسی شخص نے پوچھا، آپ سے رب تعالیٰ نے کیا سلوک کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرما دی۔ میرے پاس قبر میں سوال کرنے دو فرشتے "منکر ونکیر"

آئے انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ '' من ربک '' تیرارب کون ہے؟ میں نے ان سے کہا:

'' اما تستحیان من شیخ دعا الناس الی اللہ تعالیٰ کذا و کذا سنة فتقولان له من ربک ''

کیا تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ شیخ تو کئی سال لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کی طرف بلاتا رہا تم اس سے پوچھ رہے ہو تیرا رب کون ہے۔

☆ پہلے بزرگوں میں سے ایک بزرگ حضرت شبلی رحمہ اللہ ہوئے ہیں (سیرت کے نام پر کتاب لکھ کر زہر اگلنے والے شبلی مراد نہیں) ان پر وفات کا وقت قریب آ گیا تو کسی شخص نے تلقین کرتے ہوئے کہا '' لا الہ الا اللہ '' کہو۔ آپ نے رب تعالیٰ کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ عرض کیا

ان بیتا انت ساکنه　　　غیر محتاج الی السرج

بیشک وہ گھر جس میں تو رہتا ہو اس میں چراغ جلانے کی ضرورت نہیں

مطلب یہ تھا کہ اے اللہ تعالیٰ میرا دل تو تیری تجلیات کا مرکز ہے وہ تیری تجلیات میرے دل میں ضوء فگن (روشنی ڈالنے والی) ہیں ان میرے دل میں لوگ ظاہری '' لا الـــہ الا اللہ '' کا چراغ جلانے کی تلقین کر رہے ہیں۔ ان کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس دل سے کبھی '' لا الـہ الا اللہ '' کی صدائیں غائب ہوئی ہی نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: واعظ باعمل کی شان ﴿ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ﴾ (ای آخر آلایتین) میں بیان ہو چکی ہے علماء اور علم کی فضیلت کا وہاں مطالعہ کریں۔

بے عمل واعظ اپنے وعظ کو نہ چھوڑے:

اس آیۃ کریمہ سے اور دوسری آیۃ:

﴿ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴾

کیسی سخت ناپسند ہے اللہ کو وہ بات کہ وہ کہو جو نہ کرو۔

بظاہر طور پر یہ سمجھ آ رہا ہے کہ کسی کو اچھے کام کرنے کا حکم دینا اور برائی سے روکنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود نیک ہو اچھے کام کرتا ہو اور برے کاموں سے روکتا ہو اگر گنہگار ہو تو وہ دوسرے کو وعظ و نصیحت نہیں کر سکتا۔ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کی بہت خوب وضاحت کی ہے کہ اس کا یہ

مطلب نہیں جو معتزلہ یا ان کے ہمنوا لوگوں نے سمجھا:

" والمراد بها حث الواعظ على تزكية النفس والاقبال عليها بالتكميل ليقوم فيقيم غيره لا منع الفاسق عن الوعظ فان الاخلال باحد الامرين المامور بهما لا يوجب الاخلال بالآخر " (بیضاوی)

بلکہ اس آیۃ کریمہ سے مراد یہ ہے کہ وعظ کرنے والے کو اس پر برانگیختہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پاکیزہ کرے اور اس کو پاکیزہ کرنے سے کامل بنانے کی طرف مکمل توجہ کرے تا کہ دوسروں کو بھی پاکیزہ کر سکے، اور ان کے نفوس کو بھی کامل بنا سکے۔ فاسق کو وعظ کرنے سے منع کرنا مقصود نہیں۔ اس لئے کہ جب دو چیزوں کا حکم دیا جائے تو ان میں سے ایک میں خلل واقع ہونے سے دوسری سے نہیں روکا جاسکتا۔ یعنی رب تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دو چیزوں کا علیحدہ علیحدہ حکم دیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اچھے کاموں کا لوگوں کو حکم دو۔ اور برے کاموں سے روکو اور دوسرا اس چیز کا حکم دیا گیا ہے کہ وعظ کرنے والا خود بھی نیکی کے کام کرے اور برے کاموں سے اجتناب کرے۔ اس لئے اگر وہ خود نیک نہیں تو اس کو جو دو حکم دیئے گئے تھے ان میں سے ایک میں خلل واقع ہوا ہے لہٰذا دوسرے حکم سے (یعنی اچھے کاموں کا حکم دینے اور برے کاموں سے روکنے سے) اسے منع نہیں کیا جاسکتا۔

☆ " قال الحسن لمطرف بن عبد الله " عظ اصحابک " فقال انی اخاف ان اقول مالا افعل قال یرحمک الله واینا یفعل ما یقول ویود الشیطان انه قد ظفر بهذا فلم یا مر احد بالمعروف ولم ینه عن المنکر "

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے مطرف بن عبد اللہ کو کہا اپنے اصحاب کو وعظ کرو (نصیحت دو) وہ کہنے لگے مجھے اس سے خوف آتا ہے کہ کہیں میں وہ نہ کہوں جو خود نہیں کرتا۔ حضرت حسن نے فرمایا۔ اللہ تم پر رحم کرے ہم میں سے وہ کون شخص ہے جو اپنے کہنے کے مطابق کامل طور پر عمل کرسکتا ہے شیطان کو تو یہی پسند ہے اور وہ اسی میں اپنی کامیابی سمجھتا ہے کہ کوئی دوسرے کو اچھے کام کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا نہ ہو۔ (از قرطبی)

منطقی کتب کے روس ثمانیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بہت ہی خوبصورت قول نقل کیا گیا ہے آپ فرماتے ہیں "لا تنظر الی من قال وانظر الی ما قال " کہنے والے کو نہ دیکھ کہ وہ کیسا ہے

بلکہ یہ دیکھ کہ اس نے کہا کیا ہے۔

راقم کا تو یہی خیال ہے کہ جن واعظین کا عمل قول کے مطابق نہیں ہوتا ان کے وعظ کرنے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات ذکر کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کو نیک بنا دیتا ہے اکثر طلباء، علماء واعظین کو اسی طرح دیکھا گیا کہ کئی حضرات جن میں کچھ خامیاں پائی گئیں، ان کو زہد وتقوی کے اعلیٰ مقام پر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مقام حاصل ہوگیا۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ☆ الَّذِينَ يَظُنُّونَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

☆ ''اور صبر اور نماز سے مدد چاہو اور بیشک نماز ضرور بھاری ہے مگران پر جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا''

☆ ''اور امداد طلب کرو صبر اور نماز سے اور بیشک یہ ضرور بھاری ہے سوائے خشوع کرنے والوں کے (خشوع کرنے والے) وہ لوگ ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک ان کو ملنا ہے اپنے رب سے اور بیشک انہوں نے اسی کی طرف لوٹنا ہے''

انسانی عادات اور ان کے خلاف حکم:

انسان کی عادت یہ ہے کہ وہ مال و دولت سے محبت کرتا ہے، مال و دولت کی محبت کی وجہ سے بخل اور کنجوسی سے کام لیتا ہے جس کی وجہ سے زکواۃ ادا نہیں کرے گا اور صدقات واجبہ ادا کرنے سے پہلو تہی کرے گا۔ پھر مال زیادہ سے زیادہ جمع کرنے میں ہر قسم کے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے میں دریغ نہیں کرتا، رشوت، کم تولنا، کم ناپنا، ملاوٹ غرضیکہ اس کی صرف تمنا یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال حاصل ہو سکے اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں اپنے مومن بھائیوں کو کتنا نقصان پہنچا رہا ہوں۔

اسے مال جمع کرنے کی اتنی زیادہ ہوس رہتی ہے کہ اسے جتنا بھی مال مل جائے اس کی آنکھ سیر نہیں ہوتی، مال اسے ملتا رہے اس سے غلط فتوے حاصل کرتے رہو اس سے ملک کے خلاف کام کراتے رہو ایسے یہودیوں کے ایجنٹ جو مال اور حاکمیت کے حصول کے لئے اور بظاہر اپنی شان بلند کرنے کے لئے اور وہ جو حقیقت ملک وملت کے محافظ تھے، قومی خزانہ کو چاٹ چکے تھے انہوں نے ملک کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

غرضیکہ مال و دولت اور حکمرانی کو چاہنے والوں نے اپنے مسلمان بھائیوں اور ملک کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان لوگوں کو نماز اور صبر سے امداد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ ان پر عمل کر کے اپنی عادات کو چھوڑ دیں۔

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾: اور امداد طلب کرو صبر اور نماز سے۔ الصبر: الحبس فی اللغة، جس کا لغوی معنی روکنا جس طرح کہا جاتا ہے "قتل فلان صبرا" فلاں شخص کو محبوس رکھ کر ہلاک کر دیا گیا اور کہا جاتا ہے "صبرت نفسی علی شئی" میں نے اپنے نفس کو فلاں چیز پر روک کر رکھا۔ (قرطبی)

صبر کی تین قسمیں: (۱) طاعت پر صبر۔ (۲) لذات گناہ سے صبر۔ (۳) مصائب پر صبر۔

پہلی دو قسمیں تقریباً ایک ساتھ ہی پائی جاتی ہیں کیونکہ طاعت پر صبر اسی وقت ہو سکے گا جب وہ شخص معصیت سے رکے گا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ "الصبر من المعاصی" اور چیز ہے اور "الصبر علی المعاصی" اور چیز ہے۔ پہلے کا مطلب ہے گناہوں سے رکنا اور دوسرے کا مطلب ہے گناہوں پر رکنا یعنی گناہ کرنا۔ اس لئے صابر اسے ہی کہا جائے گا جو گناہوں سے رکے گا۔ اس شخص کو صابر نہیں کہا جائے گا جو گناہوں پر قائم رہے۔ جب مطلق صبر ذکر کیا جائے تو اس وقت یہی معنی مراد ہوتا ہے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ (بیشک صبر کرنے والوں کو پورا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا) کا یہی مطلب ہے۔

تیسری قسم مصیبت پر صبر کرنا یعنی جزع و فزع نہ کرنا، کوئی شکایت زبان پر نہ لانا، اور رضا مندی کے خلاف کوئی حرکات اس سے سرزد نہ ہوں۔ یہ تینوں قسم کے صبر جس شخص کو حاصل ہوں۔ یعنی وہ طاعت پر صبر کرے، معاصی سے صبر کرے اور مصیبت پر صبر کرے اسے نفس پر غلبہ حاصل ہوتا ہے یعنی اس کا نفس مغلوب ہو جاتا ہے اور عقل و علم اس کا غالب ہو جاتا ہے۔ اسے انبیاء کرام اور صالحین کے اخلاق حاصل ہو جاتے ہیں۔

یحییٰ بن یمان کہتے ہیں " الصبر الا تتنمی حالة سوی ما رزقک الله " صبر یہ ہے کہ خبردار اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں رزق عطا کیا ہے اس کے بغیر تم کسی چیز کی تمنا نہ کرو۔

" والرضاء بما قضی الله من امر دیناک وآخرتک "

اور صبر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت کے امور میں جو تمہارے حق میں فیصلہ کر دیا ہے اس پر راضی رہنا۔

حدیث شریف میں ہے:

" الایمان نصفان نصف فی الصبر ونصف فی الشکور "

(رواہ البیهقی فی شعب الایمان مرفوعا)

ایمان کے دو حصے ہیں آدھا حصہ صبر میں ہے اور آدھا شکر میں ہے۔

گویا کہ حدیث پاک سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ ایمان صحت کی طرح ہے صحت کی دارومدار دو چیزوں پر ہے ایک پرہیز اور دوسری دوا۔ اگر دوا ہو پرہیز نہ ہو تو پھر بھی کوئی فائدہ نہیں اور پرہیز ہو دوا نہ ہو تو پھر بھی صحت کا حصول نہیں۔ اسی طرح ایمان کیلئے صبر پرہیز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور شکر دوا کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" الصبر من الایمان بمنزلة الرأس من الجسد "

صبر ایمان کا اس طرح حصہ ہے جیسا کہ سر جسم کا حصہ ہے۔

یقینی بات ہے کہ سر ہے تو اسی وقت جسم کی بھی کوئی حیثیت ہے اور سر نہیں تو جسم بھی بے حقیقت ہے اسی طرح صبر ہے تو ایمان میں بھی کمال ہے اور صبر نہیں تو ایمان میں بھی کمال نہیں۔ عبید بن عمیر یشی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا " ما الایمان " ایمان کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا " الصبر والسماحة " صبر اور سخاوت۔ صحاح ستہ میں یہ حدیث مروی ہے "ما اعطی احد عطاء خیرا اوسع من الصبر " کسی ایک کو صبر سے بہتر کوئی چیز نہیں عطا کی گئی۔

حکیم ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نوادر الوصول میں نقل کی ہے آپ فرماتے ہیں میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کی سواری پر سوار تھا، آپ نے فرمایا کیا میں تمہیں چند نفع مند چیزوں کی تعلیم نہ دوں؟ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ آپ فرمائیں۔ آپ نے فرمایا:

"علیک بالعلم فان العلم خلیل المؤمن والحلم وزیرۃ والعقل دلیلۃ والرفق اخوہ والصبر امیر جنودہ"

علم حاصل کرو کیونکہ علم مومن کا خیر خواہ دوست ہے حلم یعنی بردباری کو اختیار کرو کیونکہ حلم وزیر ہے۔ اور عقل سے کام لو عقل اس کی راہنماء ہے اور نرمی اختیار کرو کیونکہ نرمی کو بھائی کی حیثیت حاصل ہے اور صبر اختیار کرو کیونکہ صبر اس کے تمام لشکر کا امیر ہے۔

بیہقی نے اشعث بن سلامہ سے روایت ذکر کی ہے کہ ابوحاصرہ اسدی سے انہوں نے سنا، وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہو کر آپ کی مجلس اختیار کرتے، اس شخص کو آپ نے چند دن نہ دیکھا، ان کے متعلق دوستوں سے پوچھا وہ کہاں گئے ہیں۔ اصحاب نے بتایا کہ فلاں جنگل میں علیحدہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے اور وہاں عبادت میں مشغول ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کو میرے پاس بلاؤ، وہ جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا تمہیں کیا ہو گیا کہ پہاڑوں میں تم نے لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لی؟ وہ کہنے لگے کہ لوگوں کے ساتھ رہ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں خلل پڑتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان کو دوسروں سے مل کر رہنے میں جو تکالیف پہنچیں ان پر صبر کرنا علیحدہ جنگل میں ساٹھ سال اکیلے عبادت کرنے سے بہتر ہے۔ (ماخوذ از عزیزی وقرطبی)

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے اعمال کی جزاء کی ایک حد اور نہایت بیان فرمائی ﴿ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ جو ایک نیکی لائے تو اس کے لئے اس جیسی دس ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیا جانے والا صدقہ کی جزاء اس سے زیادہ بیان فرمائی ﴿ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ ﴾ اس آیت میں صدقہ کی جزاء سات سو گنا، بلکہ اس سے زائد کا بھی ذکر فرمایا گیا۔ اور صبر کرنے والوں کا اجر بغیر حساب کے بیان فرمایا صبر والوں کی مدح میں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴾

بیشک صابروں کو ہی پورا پورا اجر دیا جائے گا بغیر حساب کے۔

اور رب تعالیٰ نے صبر کی مدح میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾

اور جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو یہ ضرور ہمت کے کام ہیں۔ (قرطبی)

صبر بمعنی روزہ:

" وقد قیل ان المراد بالصابرین فی قوله " انما یوفی الصابرون " ای الصائمون "

آیۃ کریمہ ﴿ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴾ میں کئی مفسرین کرام نے " صابرون " کا معنی " صائمون " روزہ رکھنے والے بھی کیا ہے اسی وجہ سے رمضان کا نام شہر الصبر بھی ہے حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " **الصوم نصف الصبر** " روزہ نصف صبر ہے۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ الصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ ﴾ "روزہ میرے لئے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دیتا ہوں"۔

اس حدیث شریف میں روزہ کی جزاء کی کوئی حد نہیں بیان کی گئی جیسا کہ صبر کی جزاء کی کوئی حد بیان نہیں ہوئی۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے صبر کو اپنی طرف منسوب فرمایا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" لیس احد او لیس شئی اصبر علی اذی سمعه من الله تعالیٰ انهم لیدعون ولدا وانه لیعافیهم ویرزقهم " (بخاری)

اذیت ناک کلام سن کر کوئی بھی اتنا صبر نہیں کرتا جتنا رب تعالیٰ صبر کرتا ہے کہ بیشک لوگ اس کی اولاد مانتے ہیں وہ ان کو معاف کر دیتا ہے اور رزق دیتا ہے۔

" قال علماؤنا وصف الله تعالیٰ بالصبر انما هو بمعنی الحلم ومعنی وصفه تعالیٰ بالحلم هو تاخیر العقوبة عن المستحقین لها "

اللہ تعالیٰ کی صفت حلم ہے کیونکہ وہ حلیم ہے حلیم وہی ہے جو مستحقین عذاب کو عذاب دینے میں تاخیر کرے یہی صبر ہے اور اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی صبور بھی ہے۔ (قرطبی)

نماز سے امداد طلب کرنا: خیال رہے کہ مشہور معنی اس مقام پر " صلوۃ " کا نماز ہی ہے تاہم بعض حضرات نے " صلوۃ " کا معنی اس مقام پر "دعاء" بھی کیا ہے اگر معنی دعاء کیا جائے تو اس آیۃ کریمہ

اور ﴿ اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْکُرُوْا اللّٰهَ ﴾ (جب تم کسی جماعت سے ملوتو ثابت قدم (صابر) رہواور اللہ کا ذکر کرو) کا مفہوم تقریباً مشابہ ہوگا۔ (از قرطبی)

☆ " ان الصلوة من اکبر العون علی الثبات فی الامر "

بیشک نماز کسی امر پر ثابت کرنے کے لئے بہت بڑی مددگار ہے

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ ﴾

اے محبوب پڑھو جو کتاب تمہاری طرف وحی کی گئی اور نماز قائم فرماؤ، بیشک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور بری بات سے اور بیشک اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔ (ابن کثیر)

☆ " قال الامام احمد...... قال حذیفة یعنی ابن الیمان رضی اللہ عنه کان رسول اللہ ﷺ اذا حزبه امر صلی "

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز ادا کرتے۔ (ابن کثیر)

" (اذا حزبه امر) حز بالحاء والزاء الی اذا صابه ونزل به هم وغم فزع الی الصلوة ای التجاء الیها والمفزع ای الملجاء " (شیخ زادہ)

☆ بیضاوی میں حدیث پاک کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں:

" انه علیه الصلوة والسلام کان اذا حزبه امر فزع الی الصلوة "

بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کوئی غم لاحق ہوتا تو آپ نماز کے ذریعے اس سے پناہ حاصل کرتے۔

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیٹ میں درد تھا نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے؟ انہوں نے عرض کیا ہاں تو آپ نے فرمایا: " قم فصل فان الصلوة شفاء " اٹھو نماز ادا کرو بیشک نماز شفاء ہے۔

☆ عیینہ بن عبدالرحمٰن اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کو ان کے

بھائی قثم کی وفات کی خبر ملی آپ اس وقت سفر میں تھے آپ نے " انا للہ وانا الیہ راجعون " پڑھا۔ پھر راستہ سے ہٹ کر ایک طرف اونٹنی کو بٹھایا:

" فصلی رکعتین اطال فیهما الجلوس ثم قام یمشی الی راحلته وهو یقول واستعینوا بالصبر والصلوة "

پھر آپ نے دو رکعت پڑھیں ان میں بہت دیر بیٹھے، پھر اپنی سواری کی طرف آئے اور آپ یہی آیۃ پڑھ رہے تھے "واستعینوا بالصبر والصلوة " صبر اور نماز سے امداد طلب کرو۔ (ابن کثیر)

☆ نسائی اور ابن حبان نے صہیب رومی سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" کان الانبیاء یفزعون اذا فزعوا الی الصلوة "

تمام انبیاء کرام پریشانی کے وقت نماز سے امداد طلب کرتے تھے۔

☆ ابن عساکر اور ابن ابی الدنیا نے ابوالدرداء سے روایت کی کہ:

" کان رسول اللہ ﷺ اذا کانت لیلة ریح کان مغزعه الی المسجد حتی تسکن واذا حدث فی السماء حدث من کسوف الشمس او قمر کان مفزعه الی الصلوة حتی ینجلی "

جب کبھی رات کو آندھی چلتی تو رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرماتے یہاں تک کہ آندھی رک جاتی اور سورج کے گرہن پر اور چاند کے گرہن پر نماز ادا فرماتے یہاں تک کہ وہ روشن ہو جاتے۔ (عزیزی)

مطلب واضح ہے کہ ہر مصیبت پر انسان نماز سے امداد طلب کرے اللہ تعالیٰ نماز کی برکت سے اسے دور فرمادے گا۔

عبادات میں سے نماز کی تخصیص کیوں؟

تمام عبادات میں سے نماز سے امداد طلب کرنے کا اس لئے حکم دیا کہ نماز تمام عبادات بدنیہ اور نفسانیہ کو شامل ہے۔ نماز میں طہارت اور ستر عورت (یعنی ننگیز کو ڈھانپنا) ضروری ہے۔ پھر طہارت کے لئے پانی کی اور ستر عورت کے لئے کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ان پر مال بھی خرچ ہوتا ہے۔ تو

گویا کہ ان دو چیزوں کی وجہ سے نماز عبادات مالیہ کو بھی شامل ہے۔ پھر نماز میں خشوع پایا جانا چاہئے۔ اور نیت میں خلوص پایا جائے اور دل کو ایک طرف متوجہ کیا جائے اور اپنے فکروں کو رب تعالیٰ کی مناجات کی طرف مختص کیا جائے اور شیطان کی مدافعت کے لئے مجاہدہ پایا جائے ان سب چیزوں کا تعلق قلب (دل) سے ہے۔ اس لئے نماز عبادات قلبیہ پر بھی مشتمل ہے۔ پھر نماز میں کعبہ شریف کا استقبال ایک جگہ قائم ہونا یعنی حرکت نہ کرنا چلنا پھرنا نہیں، اور قرآن پڑھنا، اور شہادتین کو زبان پر لانا یعنی " اشهد ان لا اله الاالله واشهد ان محمدا عبده ورسوله " پڑھنا اور اپنے نفس کو دو پاکیزہ چیزوں سے روکنا یعنی اپنے آپ کو کھانے پینے، اور جماع کرنے سے روکنا یہ سب چیزیں بدن سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا نماز عبادات بدنیہ پر بھی مشتمل ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ نماز سے امداد طلب کرنے کا حکم دے کہ گویا کہ عبادات مالیہ، عبادات قلبیہ اور عبادات بدنیہ سے امداد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴾: ''اور بیشک یہ ضرور بھاری ہے سوائے خشوع کرنے والوں کے''۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں: " وانها " کی ضمیر میں تین احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ یہ ضمیر استعانۃ کی طرف لوٹے جو " واستعينوا " کے ضمن میں ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ ''بیشک استعانت ضرور بھاری ہے سوائے خشوع والوں کے'' اس معنی کے لحاظ پر ''نماز اور صبر'' دونوں مراد ہوں گے کیونکہ دونوں سے امداد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تو اب مطلب یہ ہوگا کہ جن چیزوں سے تمہیں امداد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے بیشک ان سے امداد طلب کرنا ضرور ضرور بھاری ہے سوائے خشوع والوں کے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع " جملة ما امر وابه ونهوا عنه " بنی اسرائیل کو جن چیزوں کا حکم دیا گیا ہے اور جن سے روکا گیا ہے وہ تمام ہی مراد ہوں کہ وہ تمام کام ضرور بھاری ہیں سوائے خشوع والوں کے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع " صلوة " ہو بیشک نماز ضرور بھاری ہے سوائے خشوع والوں

کے۔ "وتخصیصها بردا لضمیر الیها لعظم شانها واستجماعها ضروبا من الصبر "
البتہ ضمیر کا "صلوۃ" (نماز) کی طرف خصوصی طور پر لوٹانا نماز کی عظمت شان کے پیش نظر ہے اور اس میں تمام عبادات جب آ گئیں تو ان میں صبر بھی آ گیا جیسا کہ ایک جگہ قیام چلنے پھرنے سے رکنا، اور کھانے پینے سے رکنا یہ صبر ہی تو ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

خشوع: پست زمین جس میں ریت پائی گئی ہو اسے خبت کہتے ہیں۔ اور پست زمین کی طرف جھکنا، اسے اخبات کہتے ہیں اور اسے ہی خشوع کہا جاتا ہے یعنی ظاہری اعضاء کو نماز میں بلاوجہ حرکت نہ دینا، اطمینان سے کھڑا ہونا خشوع کہلاتا ہے۔

دل میں نرمی پائی جائے اور دل رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اسے خضوع کہا جاتا ہے اور اسے ہی کبھی خشوع بھی کہا جاتا ہے یہاں خشوع بمعنی خضوع ہے اب مطلب یہ ہوا کہ نماز اور صبر سے امداد طلب کرنا اگرچہ عام لوگوں پر بھاری ہے لیکن جن کے دل رب تعالیٰ کی طرف جھکنے والے ہیں ان پر نماز بھاری نہیں۔ (از بیضاوی)

تنبیہ: اگر دل میں خشوع نہ ہو تو صرف سر جھکانے کا کوئی مقصد نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک جوان کو دیکھا جس نے اپنا سر جھکایا ہوا ہے آپ نے فرمایا:

"یا هذا ارفع رأسک فان الخشوع لا یزید علی ما فی قلبک"

اے شخص اپنا سر اٹھالے، خشوع وہی ہے جو دل میں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "الخشوع فی القلب" خشوع دل میں ہے۔ نماز میں جس خشوع کی تعریف کی گئی ہے وہ بھی دل کا خشوع ہی ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾

"تحقیق کامیاب ہوئے وہ مومن جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں"

"فمن اظهر للناس خشوعا فوق ما فی قلبه فانما اظهر نفاقا علی نفاق"

جس شخص نے دل کے خشوع سے زیادہ ظاہری طور پر خشوع کیا وہ خشوع نہیں بلکہ منافقت بر منافقت ہے۔

☆ " قال سهل بن عبد الله لا یکون خاشعا حتی تخشع کل شعرة علی جسده ،لقول الله تعالیٰ (تقشعر منه جلود الذین یخشون ربهم)

حضرت سہل بن عبداللہ نے فرماتے ہیں کہ اس وقت تک خشوع کامل نہیں ہوتا جب تک جسم کا ہر بال خشوع نہ کرے اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا، اس سے (اللہ کی کتاب سے) بال کھڑے ہوتے ہیں ان کے بدن پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

" قلت هذا هو الخشوع المحمود ، لان الخوف اذا سکن القلب اوجب خشوع الظاهر فلا یملک صاحبه دفعه فتراه متطرقا متأدبا متزللا وقد کان السلف یجتهدون فی ستر ما یظهر من ذلک "

میں کہتا ہوں یہی خشوع قابل تعریف ہے اس لئے کہ جب دل میں خشوع پیدا ہوگا تو دل کو سکون حاصل ہوگا ، اسی سے ظاہری طور پر بھی خشوع کے اثرات نمایاں نظر آئیں گے ۔ وہ شخص اس خشوع کو مندفع نہیں کرسکتا (ہٹا نہیں سکتا) تم اسے دیکھو گے کہ بغیر اختیار کے اس کا سر جھکا ہوگا وہ ادب کرتے ہوئے نظر آئے گا اس کی عاجزی اس سے واضح ہوگی ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خشوع جو بغیر اختیار کے حاصل ہوتا ہے، سلف صالحین اسے چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔

" واما المذموم فتکلفه والتباکی ومطأ طأة الرأس کما یفعله الجهال لیروا بعین البر والاجلال وذلک خدع من الشیطان وتسویل من نفس الانسان "

ظاہری خشوع وہ برا ہے جس میں تکلف پایا جائے ، اور بناوٹی طور پر رونے کی شکل بنائی جائے اور سر کو جھکایا جائے جیسا کہ جاہل لوگ کرتے ہیں کہ لوگ ہمیں نیک اور بزرگ سمجھیں ،تو یہ شیطان کی طرف سے دھوکا ہے اور نفس کی جانب سے بناوٹ ہے ۔ (قرطبی)

راقم کے نزدیک جب تک ریاء کاری نہ ہو، بلکہ ظاہری خشوع کرنے والے کی یہ نیت ہو کہ اے اللہ نیک لوگوں کو جو دل اور ظاہری جسم سے خشوع حاصل ہے وہ تو ہمیں حاصل نہیں ، البتہ ہم بزرگوں کی طرح ظاہری طور پر خشوع کر رہے ہیں ، کسی کو دھوکا دینا مقصود نہیں ، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اے اللہ ہوسکتا ہے تیری مہربانی سے ہمارا ظاہر حقیقت بن جائے تو اس کی مذمت نہیں کی جاسکتی۔

﴿ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ ﴾ : " الذین فی موضع خفض علی النعت للخاشعین " یہ جملہ محل جر میں ہے خاشعین کی صفت ہے۔ " والظن هنا فی قول الجمهور بمعنی الیقین " جمہور مفسرین کرام کا یہ قول ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں "ظن" یقین کے معنی میں ہے۔ (قرطبی)

" (الذین یظنون انهم ملاقوا ربهم) ای یعلمون انهم محشورون الیه یوم القیامة معروضون علیه (وانهم الیه راجعون) ای امورهم راجعة الی مشیئته یحکم فیها ما یشاء بعد له فلهذا لما ایقنوا بالمعاد والجزاء سهل علیهم فعل الطاعات وترک المنکرات " (ابن کثیر)

یعنی خشوع کرنے والے وہ لوگ ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک ان کو قیامت کے دن ایک جگہ جمع کیا جانا ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ پر پیش کیا جانا ہے اور ان کے تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں اور اس نے اپنی مشیت سے عدل وانصاف سے فیصلہ کرنا ہے جب انسان کو یہ یقین ہوگیا کہ قیامت بھی آنی ہے ہمیں رب تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے، ہمارے اعمال کا بدلہ بھی ہمیں دیا جانا ہے تو اس پر نیکی کے کام کرنے اور برے کام چھوڑنے آسان ہو جائیں گے۔

تنبیہ : علامہ رازی اور علامہ بیضاوی رحمہما اللہ نے بیان کیا ہے کہ ﴿ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ ﴾ میں "ظن" بمعنی یقین کے بھی ہوسکتا ہے اور ظن بمعنی توقع اور گمان کے بھی ہوسکتا ہے۔ جب توقع کا معنی کیا جائیگا تو یوں کہا جائے گا " یتوقعون لقاء الله تعالیٰ ونیل ما عنده " وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس کے پاس جو نعمتیں ہیں ان کو حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔ اور جب ظن کا معنی یقین کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا " یتیقنون انهم یحشرون الی الله فیجازیهم " وہ یقین رکھتے ہیں کہ بیشک ان کو رب تعالیٰ کے حضور جمع کیا جانا ہے اور اس نے ہمیں ہمارے اعمال کی جزا دینی ہے۔ لیکن زیادہ مفسرین کرام نے یہی بیان کیا ہے کہ اس مقام میں ظن کا معنی یقین کرنا ہی بہتر ہے، اعلیٰ حضرت نے بھی یہی معنی ذکر کیا راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے۔

تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان کا ایک ورق:

اسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے راقم کی کتاب تسکین الجنان سے ایک ورق دیکھئے تو انشاء اللہ مسئلہ

آسانی سے سمجھ آئے گا۔

﴿ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ ﴾ (ب ۱ ع ۵)

مگر انہی پر جن کے دل پگھلے ہیں جن کو خیال ہے۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

مگر ان فرماں بردار بندوں کے لئے مشکل نہیں جو سمجھتے۔ (مودودی صاحب)

مگر انہی عاجزوں پر جن کو خیال ہے۔ (محمود الحسن صاحب)

وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال کرتے ہیں۔ (اشرف علی صاحب)

مگر خشوع رکھنے والوں پر (نہیں) جنہیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انہیں پروردگار سے ملنا (بھی) ہے (عبد الماجد)

مگر ان پر جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں جنہیں یقین ہے۔ (اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلویؒ)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے "یظنون" کا معنی یقین کیا ہے اور دیگر حضرات نے خیال اور سمجھا۔ لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ زیادہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ اکثر مفسرین کرام نے بھی بمعنی یقین کے لیا ہے۔ مدارک میں ذکر کیا گیا ہے:

" وفسر یظنون بتیقنون لقراءۃ عبد اللہ یعلمون ای یعلمون انہ لابد من لقاء الجزاء فیعلمون علی حسب ذلک واما من لم یوقن بالجزاء ولم یرج الثواب کانت علیہ مشقۃ خالصۃ "

چونکہ یہاں مقصد بیان یہ ہے کہ نماز لوگوں پر مشقت ہے وہ اسے گراں (بھاری) سمجھتے ہیں لیکن جن لوگوں کو یقین ہے کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں ان پر گراں نہیں۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "یظنون" کی تفسیر "تیقنون" سے کی گئی ہے اس لئے کہ حضرت عبداللہ کی قرأت میں "یعلمون" آیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ یقین کرتے ہیں کہ بیشک ضرور اللہ سے ملاقات ہونی ہے اور ضرور جزاء حاصل ہونی ہے اور جس کو یہ یقین ہو اس کو یہ یقین کافی ہے وہ نماز کو گراں نہیں جانے گا۔ لیکن جس کو جزاء کا یقین نہیں ہوگا اس کو ثواب کی امید نہیں ہوگی۔ اس پر نماز خالص مشقت ہوگی۔

اس طرح شیخ زادہ علی البیضاوی میں بیان کیا گیا ہے:

" بیان لوجه استعمال الظن بمعنى اليقين مع ان الظن هو الاعتقاد الراجح الذى يحتمل النقض ، واليقين هو الاعتقاد الراجح الذى لا يحتمل النقض فانهما لما تشابها من حيث ان كل واحد منها اعتقاد راجح صح ان يستعار كل واحد منها للآخر بحسب اقتضاء المقام فاستعير لفظ الظن ههنا بمعنى اليقين "

یہاں یہ وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ ظن بمعنی یقین ہے اس لئے کہ ظن کہتے ہیں اعتقاد راجح کو جو نقض کا احتمال رکھے۔ یقین کہتے ہیں اعتقاد راجح کو جو نقض کا احتمال نہ رکھے اس لئے دونوں میں اعتقاد راجح پایا گیا ہے لہٰذا یہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لئے ہر دو کو ایک دوسرے کو جگہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا اسی مشابہت کی وجہ سے اس مقام میں ظن بمعنی یقین ہے۔

اسی طرح جلالین میں بھی یظنون کی تفسیر یوقنون سے کی گئی ہے اور پھر اس پر حاشیہ میں یہ ذکر کیا گیا ہے " اشارة الى ان الظن ههنا بمعنى اليقين " یعنی یہاں یہ اشارہ ہے کہ ظن بمعنی یقین ہے۔
اب تفاسیر کی عبارات دیکھنے سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت مخفی نہ رہی بلکہ خوبی واضح ہوگئی

(تسکین الجنان ص ۳۳، ۳۴)

☆☆☆☆☆